عنوانات

نیادور

جلد ۳۲ نمبر ۱

مئی ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اترپردیش

سرورق: قیصر سرمست

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیادور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری نرائن دت تیواری کی قیادت میں پردیش کی نئی وزارت نے ۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی اس طرح ۲۹ اپریل کو نئی وزارت کے ۱۰۰ دن پورے ہو گئے۔ اس مدت میں ریاست کی ترقیاتی اسکیموں خاص طور سے ملک کی محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد اہم اور دور رس اقدامات کیے گئے۔ شری نرائن دت تیواری نے وزارت اعلا کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد ہی یہ اعلان کیا کہ ان کی حکومت کا خاص مقصد بیس نکاتی معاشی پروگرام اور ریاست کی ترقیاتی اسکیموں پر تیز رفتار عملدرآمد کرنا اور ان کو اس طرح سے بروئے کار لانا ہے جس سے سماج کے ان بھی کمزور طبقوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے جن کے لیے یہ پروگرام اور اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ریاستی حکومت نے آئندہ جون تک بیس نکاتی معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مستحکم ارادہ کر لیا ہے۔ اسی لیے سرکاری مشینری کو چاق و چوبند اور مستعد بنانے کے لیے سخت احکامات جاری کیے گئے اور متنبہ کیا گیا کہ جو بھی افسران یا ملازمین ان اسکیموں پر عمل درآمد میں کسی قسم کی بے قاعدگی یا تساہلی برتیں گے ان کو کسی طرح معاف نہیں کیا جائے گا۔ ترقیاتی اسکیموں کے لیے سرمایہ کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اتر پردیش کے سالانہ منصوبے کے لیے ۴ء۵ کروڑ روپیہ کی رقم فراہم کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو رضامند کر لیا ہے۔ ترقیاتی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے عوام کے اشتراک کی اشد ضرورت ہوتی ہے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر وزیر اعلا نے عوام اور ان کے نمائندوں سے تعاون کی اپیل کی اور اس سلسلے میں ان کو بھرپور تعاون بھی ملا ہے۔

بیس نکاتی معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے میں ایک کے بعد ایک متعدد قدم اٹھائے گئے۔ نئی وزارت کی تشکیل ہوتے ہی سب سے پہلے جو اہم فیصلے کیے گئے ان میں سے ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ ہریجنوں اور اقلیتوں کی بہبود کی اسکیموں کو اولیت دی جائے گی اسی مقصد کے پیش نظر نئی صنعتوں میں بھی اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے جگہیں محفوظ کی گئیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے اتر پردیش اردو اکاڈمی کو ملنے والی مالی امداد ۵ لاکھ روپیہ سے بڑھا کر ۸ ½ لاکھ روپیہ کر دی گئی۔ ضروری اشیا کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنے کے لیے تحصیل اور بلاک سطح پر نگراں کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کسانوں کی ہر ممکن طریقے سے ہمت افزائی کی گئی۔ زراعت، آبپاشی اور بجلی کی ترقی کے لیے ایک کثیر رقم کا بندوبست کیا گیا۔ تعلیم کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں کی گئیں۔ ریاست کے پسماندہ علاقوں میں عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے صنعتوں کے قیام کے لیے مخصوص سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مزدوروں کے لیے بھی کئی فلاحی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ جہیز جیسی سماجی لعنت کو ختم کرنے کے لیے ایک آرڈی ننس کا مسودہ منظور کیا گیا۔ ان تمام مروجہ قوانین میں تبدیلی کی گئی جو بیس نکاتی معاشی پروگرام کے عمل درآمد میں مخل ہو رہے تھے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جن بے زمین افراد کو زمینیں الاٹ کی گئی ہیں ان کو نہ صرف تین سال تک مال گزاری کی ادائیگی سے مستثنا کر دیا جائے گا بلکہ ان میں سے ہر ایک کو زرعی آلات، کھاد اور بیج کی خریداری کے لیے ۲۵۰ روپیہ بطور گرانٹ دیا جائے گا۔ ہر بے زمین شخص کو کم سے کم ایک ایکڑ زمین الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ان افراد کو الاٹ کی جانے والی زمین پر قبضہ دلانے کے لیے بھی خصوصی انتظامات کیے گئے۔ محکمۂ مال کے ۲۰ ہزار ملازمین کو صرف اس کام پر تعینات کیا گیا کہ وہ دیکھیں کہ ان بے زمین افراد کو زمین پر واقعی قبضہ مل گیا ہے۔ حکومت نے ۱۸ فروری کو یہ بھی فیصلہ کیا کہ شہری زمین کی حدبندی سے متعلق مرکزی قانون کو ریاست کے ۲۲ بڑے شہروں میں نافذ کیا جائے اور بعد میں رفتہ رفتہ اس کا دوسرے شہروں میں نفاذ کیا جائے۔ پابند مزدوری سے نجات پانے والے غریب اور نادار لوگوں کی بحالی کے لیے ایک مخصوص اسکیم وضع کی گئی۔ حکومت کو عوام کے نزدیک لانے اور مقامی مسائل کا موقع پر ہی حل تلاش کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ کابینہ کا جلسہ صدر مقام لکھنؤ کے علاوہ ریاست کے دوسرے مقامات پر بھی کیا جائے۔ چنانچہ رائے بریلی اور بلند شہر میں کابینہ کے جلسے منعقد بھی ہو چکے ہیں۔ سرکاری ملازمین کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کئی اہم فیصلے کیے جا چکے ہیں۔ سب سے پہلے تو پے ڈسپیریٹی کمیٹی (تنخواہ سے متعلق بے قاعدگیوں کی کمیٹی) کی رپورٹ منظور کی گئی جس سے تقریباً ایک لاکھ ملازمین مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کو اضافی مہنگائی بھتہ کی ایک مزید قسط دینے اور پنشن کی رقم میں ۱۰ روپیہ سے ۲۰ روپیہ تک اضافہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ سب سے بڑا انقلابی فیصلہ یہ کیا گیا کہ یکم مارچ سے تمام سرکاری ملازمین کے لیے ۱۲۰۰۰ روپیہ کی شرح سے مجموعی بیمہ اسکیم شروع کی جائے۔ بڑھاپا پنشن کی شرح ۳۰ روپیہ ماہوار سے بڑھا کر ۴۰ روپیہ ماہوار کر دی گئی۔

مذکورہ بالا اقدامات کے نتیجے میں ان ۱۰۰ دنوں کی قلیل مدت میں ریاست کی ہمہ جہت ترقی کی رفتار میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ضروری اشیا کی قیمتوں پر بھی پوری طرح سے قابو حاصل کر لیا گیا ہے اور خاص بات تو یہ کہ سماج کے کمزور اور دبے کچلے طبقے میں خود اعتمادی اور بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

—— ایڈیٹر

سیّد نواب افسرؔ

غزل

ہم نے حیاتِ عشق کے سب غم بھلا دیئے
لیکن وہ غم جو اس نے بہ نامِ وفا دیئے

صرف اس لیے کہ آے نہ کوئی ہمارے ساتھ
ہم نے خود اپنی راہ میں کانٹے بچھا دیئے

تجھ کو خبر بھی ہے ترے در پر ترے گدا
آئے بھی اور چلے بھی گئے بے صدا دیئے

اب یہ ادا نکالی ہے دیتے نہیں جواب
جب ہم نے کوئی بات کہی مسکرا دیئے

اک جائزہ لیا چمنِ آرزو کا آج
جو خشک ہو گئے تھے وہ پتے جلا دیئے

وہ شوق وہ فریبِ کرم وہ مآلِ کار
ایک اشکِ غم نے کتنے فسانے سنا دیئے

ساقی کے اعتماد کا جب آ گیا سوال
رندانِ تشنہ کام نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے

افسرؔ جنوں نوازئ فطرت تو دیکھیے
تارِ نفس بھی تارِ گریباں بنا دیئے

شمس تبریز خاں

شاد عارفی

شاد عارفی جتنے اچھے فن کار تھے اتنی ہی ان کی زندگی تلخیوں میں گزری۔ وہ ہمارے سماج کے مظلوم فن کار کی ایک سچی تصویر تھے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایسے مشکل حالات اور حوصلہ شکن ماحول میں اپنے فن کی انفرادیت برقرار رکھی۔ وہ زہر پی کر معاشرے کے لیے امرت برساتے رہے اور حوصلہ شکن حوادث سے ان کے حوصلے کو مہمیز ملتی رہی۔ وہ چونکہ لڑنے کے عادی تھے، اپنے گرد و پیش سے بھی لڑتے رہے اور ہندستانی سماج کے کمزور پہلوؤں سے بھی نبرد آزما رہے۔ اس کشمکش اور تصادم و پیکار نے ان کے مزاج میں وہ تلخی اور تیزی پیدا کر دی تھی جس سے حقیقی طنز کی آبیاری ہوتی ہے۔ ناخوشگوار تجربوں نے ان کے اندر کلبیت (CYNICISM) کو پروان چڑھایا تھا جس سے انھوں نے کسی نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہونے کے بجائے اسے ادبی رنگ اور فنی پیرایۂ اظہار دے دیا۔ ان کے فن کے پیچھے ان کی زندگی ایک حقیقی پس منظر اور ان کے آئینۂ کلام کے لیے زنگار کا کام دیتی تھی۔ حالات کے تقاضوں اور ان کے لازمی نتائج کے برخلاف شاد نے اپنے کلام میں بڑے فنی ضبط اور ہنر مندانہ تحمل سے کام لیا ہے۔ انھوں نے طنز نگاری (SATIRE) کو ایک نیا آب و رنگ اور طرز و آہنگ دیا ہے۔ وہ ایک فن کارانہ مزاج اور تخلیقی ذہن رکھتے تھے، روزمرہ کے حالات و حوادث کی حقیقی نفسیات کو ان کا ذہن بڑی آسانی اور چابک دستی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتا تھا، ان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طنز و تعریض کو منفی پہلو اور تخریب و لذت کوشی کے لیے نہیں بلکہ تعمیر و اصلاح کے لیے استعمال کیا۔ وہ سماج میں پھیلی ہوئی خرابیوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ان سے نفرت کرتے اور معاشرہ کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی ذہنیت مریض نہیں بلکہ تشخیص مرض کی عادی ہے اور اپنی صحت مندی کے بھرم سے سماجی برائیوں کو چھیڑتی اور ان کے مد مقابل ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کسی لاگ اور لگاؤ کے بغیر اپنا فیصلہ صادر کرتی اور ان کا بھانڈا پھوڑتی ہے۔

صائب فکر، متوازن رائے اور صحت مند و تعمیری نقطۂ نظر آج کے ادب میں جنس نایاب بن گئی ہیں۔ اس لیے یہ چیزیں قدر دانی اور ستائش کی مستحق ہیں، شاد نے کہیں بھی جنسی چٹخارہ سے قاری کی دلچسپی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اباحت پسندی (PERMISSIVENESS) کے خلاف اپنا سارا زور لگا دیا ہے اور موجودہ دور کی تقریباً تمام کمزوریوں پر گرفت کی ہے اور اپنے اصلاحی نشتر سے معاشرے کے سرطانوں کو چیرا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے شاد کی فن کاری کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

شاد عارفی بڑے البیلے شاعر تھے، نہایت غیرت مند خوددار بڑے پکے محب وطن، آزادی و جمہوریت کے دلدادہ، ترقی پسند خیالات رکھنے والے، بول چال کی زبان کے امکانات کو اور واضح کرنے والے، سماج کے فاسد مادہ پر نشتر زنی کرنے والے اپنے رنگ کے منفرد اور اپنے طرز کے انوکھے، جدید اردو شاعری کو کئی غیر فانی نظمیں بخشنے والے[1]

انھوں نے دوسری جگہ لکھا ہے:

---

[1] ایک تھا شاعر: مرتبہ مظفر حنفی ص۲۵

"شاد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے، محبت و نفسیات انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایزرا پاؤنڈ "حقیقی نفسیات" کو زبان دی ہے اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی"[۱]

انھوں نے غزلیں بھی بہت لکھی ہیں جن کی تعداد نظموں کے برابر ہے لیکن دراصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کو بھی ایک نیا انداز دینے کی کوشش کی ہے اس میں روزمرہ کے تجربات و واقعات اور بول چال داخل کی ہے۔ اسے واقعیت سے قریب لائے ہیں اور تیکھا انداز اور نوکیلا (POINTED) طرز بھی دیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ غزل سے ان کو مزاجاً مناسبت نہیں۔ غزل گوئی کے آداب برتنے کے بجائے انھوں نے غزل کو اپنے مخصوص انداز و آہنگ کے مطابق کرنا چاہا جس سے غزلیں نظموں کے مقابلے میں بے لطف سی ہو گئی ہیں۔ جو لوگ غزل میں اصلاح اور روایتی طرز سے الگ اسلوب کے جویا ہیں انھیں شاد کی غزلیں ضرور دیکھنی چاہئیں ان میں بڑی جدت طرفگی اور تازگی ہے روایتی انداز میں تو ان کے یہاں چند ہی شعر نکلیں گے۔ زبان و بیان پر انھیں اساتذہ کی سی قدرت حاصل ہے۔ فنی کمزوریاں ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں، قادر الکلامی ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے یہاں عجز کلام کا کہیں سے اظہار نہیں ہوتا لیکن حد سے زیادہ جدت پسندی کے سبب وہ غزل کی روایت اور اس کی دلکشی کو برقرار نہیں رکھ پائے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی زیادہ تر طنزیہ مضامین آئے ہیں اور روایتی مضامین سے انھوں نے صرف نظر کیا ہے لیکن غزل کا خوددار مزاج ان سے کہاں تک صلح کرتا، وہاں تو بادہ و ساغر کے بغیر کوئی بات بنتی ہی نہیں۔ اپنے ذاتی انتخاب سے ان کی غزلوں کے یہ چند شعر حاضر ہیں جن میں ان کے ذاتی واردات بھی آ گئے ہیں:

بے رونقی شمع تمنا د پوچھیے ۔۔۔ جیسے کوئی چراغ کسی قبر پر جلے

پھولوں کی طرح آپ ہیں کانٹوں کی طرح ہم
کس پر اثر گردش دوراں نہیں ہوتا

غلط بیانیوں کے عہد نو میں شاد عارفی
مرا کمال فن یہ ہے کہ صرف ماجرا ہوا

کبھی کوئی کرم کوئی عنایت ہو بھی جاتی ہے
کبھی بیتابیٔ دل عین راحت ہو بھی جاتی ہے

کبھی کوئی گھٹا ایسی بھی اٹھتی ہے کہ بہ جلیے
کبھی جام و سبو کی ہم سے خدمت ہو بھی جاتی ہے

نہ کہنا خرمن پندار پر بجلی نہیں گرتی
نہ رہنا اس بھروسے میں محبت ہو بھی جاتی ہے

مری غزل میں مرے تلخ تجربے کے ساتھ
دل شکستہ و محروم کی صدا بھی ہے

جاب حسن کر جو شادی تھی اٹھا لا ساقی!
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں کوئی

شاد ضعیف العمر ہے لیکن شعر تو اس کے جواں ہیں
ایسے لوگ کہاں ہوتے تھے ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

نظم نگاری شاد کا مخصوص فن ہے جس میں ان کے جوہر کھلتے ہیں اور ان کی انفرادیت ہر شخص کو متاثر کرتی ہے۔ جدید شاعری میں طنز نگاری کے وہ بانی کہے جا سکتے ہیں، اور جدید نظم کے پیشرووں میں ان کا بھی شمار کیا جانا چاہیے انھوں نے نظموں میں سپاٹ اور سیدھا سادا انداز اختیار کرنے کے بجائے ڈرامائی عناصر اور تمثیلی رنگ کی آمیزش بھی کی اور غزلوں کی طرح نظموں میں بھی بات چیت کا انداز برقرار رکھا بلکہ ایجاز نگاری کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی مصرع میں دو تین شخصوں کی گفتگو بھی نقل کر دیتے ہیں جس سے نظم کے دروبست میں ایک دلآویزی سی آجاتی ہے اور نظم، کسی موضوع کی حکایت کے بجائے تصویر بن جاتی

---

[۱] کلیات شاد عارفی ص ۷

ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہیں، ان کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ شمالی ہند بلکہ رام پور کے ماحول کی عکاسی انھوں نے ایسی فن کارانہ چابکدستی سے کی ہے کہ اس میں مقامی رنگ اور محدود ہونے کے بجائے لامحدودیت اور ان کے طنز میں عمومیت اور اتھاہ پن پیدا ہو گیا ہے جو طنز کی جان ہے۔

انھوں نے ہر طرح کی نظمیں لکھی ہیں جن میں بیانیہ رنگ اور منظر نگاری اور تصویر کشی کے لیے ان کی نظمیں گوالن، گاؤں، شہر سے دور، مالن، بسنت، برسات کی شروعات، ممتاز ہیں، وہ بڑے محب وطن تھے، جس کی گواہ ان کی متعدد نظمیں ہیں لیکن دوسری خرابیوں کے خلاف ان کا قلم چوکا نہیں ہے۔ تعمیری و اصلاحی نظموں میں "رسمی قید خانے" یہ عبادِ یہ رسوم" "جہیز" خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

معاشرتی نظموں میں جنسی بے راہ روی اور اباحت پسندی، مغرب زدگی، اور دوسری بدعنوانیوں کے خلاف ان کا قلم تیر و نشتر بن گیا ہے ایسے مواقع پر ان کے لہجہ کی آبداری اور ان کے لفظوں کی کاٹ دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ خاص طور پر "ملازمہ" "شوفر" ان کے اونچے اونچے محلوں میں" "مرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے" "مرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری" اور "آپ کی تعریف" بھرپور طنز کی بہترین مثالیں کہی جا سکتی ہیں، آخری نظم میں انھوں نے معاشرہ کے ہر طبقے پر طنز کے بھرپور وار کیے ہیں اور زندگی کے ہر کمزور پہلو کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"آپ کی تعریف" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

نثر ہے ان کو کسی چڑیا کا نام — شعر جیسے آشیانے زیر دام
دعویٰ علم ہجا کیا کیا غلط — سربسر انشا غلط، املا غلط
چھاپتے ہیں فلم اسٹاروں کے نام — تاکہ ہو جن بہائے ان پرِ نسل ساز
مشتہر ہیں، شہرۂ آفاق ہیں
یہ مدیرانِ سیہ اوراق ہیں

نظم "ادبار آتا ہے" میں قوموں کے زوال کے اسباب بتلاتے ہیں:

نطق سے مجروح جب ہو جائے لفظ ارتقا — جب دماغوں میں چلے جہل مرکب کی ہوا
علم جب اخلاق کے معنی بتانا چھوڑ دے — جب داداری مروت کا ٹھکانا چھوڑ دے
زعم خود بینی اٹھا دے جب تمیز نیک و بد — جا ملے حیوان کی سرحد سے جب انساں کی حد

"حریت" میں آزادہ روی اور آزادی پسندی کی بڑی اچھی تلقین ملتی ہے:

صدر ہو، نیتا ہو یا سرمایہ دار — جو کچھ تجھ سے اسے ٹھوکر پہ مار
ہے بہت انمول انسانی وقار — لقمۂ تر کا نہیں کچھ اعتبار
جو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ!

بزدلی ہے "جی بجا" یا "جی حضور" — توڑ دے نخوت شعاروں کا غرور
رہ فریب آرزو سے دور دور — لقمۂ تر زندگی کو کیا ضرور
جو کی روٹی کھا، مگر آزاد رہ!

شاد صاحب کے یہاں ایک بات یہ کھٹکتی ہے کہ عالمی موضوعات اور دوسرے ہمہ گیر تصورات پر بہت کم نظمیں ملتی ہیں، اس قسم کی چیزوں میں "عالمی امن" کے موضوع پر "چاند کی نو آبادی" کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ یہ مزائل یہ جوہری بم میں گے کب تک
جواب یہ ہے کہ فیصلہ کن لڑی نہ جائے گی جنگ جب تک
وہاں بھی کیا سام و حام مل جل کر ریچھ کی کمیا کریں گے
نہیں، مگر دوسروں سے وعدے لپیٹ کر ہم مڑ کریں گے

آخر میں ہم ان کے ہم وطن فاضل محقق کی رائے درج کرتے ہیں جو بہت صائب ہے مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی لکھتے ہیں:

"تیکھا طنز، لہجے کی تیزی اور نوکیلا پن ان کا مزاج بن گیا تھا، ان کی آواز میں رامپور کا مردانہ لہجہ، اور پٹھانوں کا بانکپن الگ پہچانے جاتے ہیں وہ اردو شاعری میں رامپور اسکول کی جانب سے قابل فخر اضافہ ہیں"[1]

★

---

[1] ایک تماشا عرص

ایس۔ ایں۔ سنہا

ہمیں تو جب بھی کوئی چشم تر نظر آئی
وہ دل ملا ہے کہ اپنی بھی آنکھ بھر آئی

بہ یادِ ساقیٔ مہوش بہ فیضِ بادہ و جام
جو شام آئی بہ تابانیٔ سحر آئی

ہمیں نے اشک بہائے ہوں ایسی بات نہیں
یہ واقعہ ہے کہ اُن کی بھی آنکھ بھر آئی

جہاں میں کس کو قرار و ثبات حاصل ہے
حیاتِ عشق ہی کچھ معتبر نظر آئی

نگاہِ شوق گئی تھی نگاہِ ناز کی سمت
شراب و شعر کی موجوں میں ڈوب کر آئی

اسی کے دم سے تھی دنیائے آرزو شاداب
وہ ایک یاد جو رہ رہ کے عمر بھر آئی

قدم قدم پہ تمنّا کے پھول کھلتے ہیں
نظر کے سامنے یہ کس کی رہ گزر آئی

دل اک سرائے ہے بوسیدہ سی کہ جس میں کبھی
امید آئی تو آمادۂ سفر آئی

بیان کر نہ سکیں نام دے سکیں نہ جسے
نگاہ ناز میں وہ کیفیت نظر آئی

نظر کی بات ہے تاریکیوں کے پردے میں
ہمیں تو روشنی ہی روشنی نظر آئی

شکوہِ دل کی تمنا میں زندگی سنہاؔ
اس انجمن سے نکل کر نہ راہ پر آئی

ڈاکٹر سلام سندیلوی

گورکھپور کا پہلا اردو شاعر

حضرت سیّد احمد علی شاہ

اب تک گورکھ پور کی شاعری کے سلسلے میں جو کچھ سراغ مل سکا ہے اس کی روشنی میں میرے نقطۂ نظر سے اس شہر کے پہلے اردو شاعر سید احمد علی شاہ صاحب ہیں جو امام باڑہ اسٹیٹ گورکھ پور کے دوسرے جانشین تھے۔

امام باڑہ اسٹیٹ گورکھ پور کے پہلے جانشین حضرت روشن علی شاہ گزرے ہیں جو سید غلام اشرف کے صاحبزادے تھے۔ حضرت روشن علی شاہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ امام باڑہ اسٹیٹ کے ریکارڈ میں صرف ایک جگہ ان کے دستخط ہندی میں موجود ہیں۔ مگر وہ ایک خدارسیدہ بزرگ تھے اور ان کی نظر میں ہندو مسلم برابر تھے۔ اس لیے ان کی شہرت گورکھ پور کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے زہد و تقویٰ اور ان کی عبادت و ریاضت سے متاثر ہو کر رودر پور کے راجا پہلوان سنگھ نے ان کو ۱۷۹۳ء میں موضع کسمی مع جنگل بخش دیا تھا۔

جب نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء – ۱۷۹۷ء) سیر و شکار کے سلسلے میں گورکھ پور کے علاقہ میں پہونچے تو انھوں نے حضرت روشن علی شاہ کی بزرگی کی تعریف سنی اور وہ ان کی خدمت میں مع مصاحبین حاضر ہوئے۔ نواب آصف الدولہ نے حضرت روشن علی شاہ پر کچھ مراعات کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود نواب صاحب نے بخشش کے لیے اصرار کیا۔ تب حضرت روشن علی شاہ نے فرمایا کہ اگر آپ مجھ پر کچھ مہربانی ہی فرمانا چاہتے ہیں تو عزاداری حسینؑ کے لیے آپ ایک امام باڑہ بنوا دیجیے اور اس کے اخراجات کے لیے کچھ زمین وقف کر دیجیے۔ نواب آصف الدولہ ان کی اس تجویز سے خوش ہوئے اور انھوں نے حضرت روشن علی شاہ کو ۱۶ علاقے بخش دیئے۔ امام باڑہ اسٹیٹ کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقے حضرت روشن علی شاہ کو ۱۷۹۵ء میں بخشش میں ملے تھے۔

علاقہ ملنے کے بعد حضرت روشن علی شاہ نے امام باڑہ کی تعمیر کرائی۔ آج جہاں امام باڑہ موجود ہے پہلے یہاں جنگل تھا اور یہ علاقہ داؤد چک کہلاتا تھا۔ مگر امام باڑہ کی تعمیر کے بعد عزاداری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور عبادت و ریاضت میں ساری زندگی گزار دی۔ بالآخر ۱۸۰۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت روشن علی شاہ کے چھوٹے بھائی کا نام فولاد علی تھا۔ فولاد علی نے اپنے بیٹے سید احمد علی کو امام باڑہ کے لیے وقف کر دیا۔ امام باڑہ اسٹیٹ کے ریکارڈ میں ایک جگہ سید احمد علی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"در امام باڑہ بہ خدمت شاہ صاحب قبلہ خداوند نعمت شاہ روشن علی صاحب دام اقبالہٗ ہبہ نمودم و بخشیدم۔ مالک و مختار طفل مسطور شاہ موصوف ہستند۔ من بعد مرا و وارثان را ہیچ دعویٰ از طفل مذکور نیست و نماندہ۔ اگر کسے از وارثان و متعلقان و لواحقان من دعویٰ نماید در شرع شریعت باطل و کاذب باشد۔ بنابر ان این چند کلمہ بطریق نیاز نامہ و ہبہ نامہ نوشتہ داریم کہ تا فی الحال سند باشد۔"

تحریر بتاریخ یازدہم شہر رجب المرجب سنہ ۱۲۱۳ فصلی مطابق سنہ ۱۲۲۰ھ

اس ہبہ نامہ کے بموجب حضرت روشن علی شاہ کی وفات کے بعد سید احمد علی شاہ امام باڑہ اسٹیٹ کے جانشین ہوگئے اور وہ یہاں عام طور سے میاں صاحب کے نام سے موسوم ہوے۔ سید احمد علی شاہ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوے اور ۱۸۰۵ء میں امام باڑہ اسٹیٹ کیلئے ہبہ کیے گئے۔ جب وہ اسٹیٹ کے جانشین ہوئے تو انھوں نے امام باڑہ کے پورب پھاٹک پر ایک بازار لگوایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ایک ذاتی بازار کی بنیاد ڈالی۔ اس بازار کے لگنے کے بعد اس محلے کا نام امام گنج کے بجائے میاں بازار ہوگیا اور یہ محلہ آج بھی اسی نام سے موسوم ہے۔

حضرت روشن علی شاہ اور جناب فولاد علی نے سید احمد علی شاہ کی تعلیم اور تربیت پر مکمل طور سے توجہ کی۔ چنانچہ چند برسوں میں ان کو عربی فارسی اور اردو پر عبور حاصل ہوگیا۔ ان کے اردو کلام میں عربی اور فارسی کے ٹکڑے جابجا نظر آتے ہیں۔ سید احمد علی شاہ نے اردو شاعری کی طرف تقریباً سترہ سال کی عمر میں توجہ کی۔ یعنی انھوں نے تقریباً ۱۸۱۷ء میں اردو شاعری کا آغاز کیا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ سید احمد علی شاہ اور مرزا غالب ہم عصر تھے، اور گورکھپور میں غالب کے عہد میں اردو شاعری کا آغاز ہوچکا تھا۔

سید احمد علی شاہ کی شعر و شاعری کی تین مطبوعات کتب امام باڑہ اسٹیٹ کی لائبریری میں موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) کشف البغاوت۔ مطبوعہ ۱۸۶۰ء۔ از فن اسکول پریس مرزاپور، باہتمام پادری ایم۔ اے۔ شیرنگ صاحب۔

(۲) ذو حقیقت۔ مطبوعہ ۱۸۶۱ء۔ مطبع حیدری آگرہ۔ باہتمام مرزا علی حسین۔

(۳) محبوب التواریخ۔ مطبوعہ ۱۸۶۳ء۔ مطبع حیدری آگرہ۔ باہتمام مرزا علی حسین۔

اس مضمون میں ان تینوں کتب پر مختصر تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

کشف البغاوت۔ کا تعلق غدر ۱۸۵۷ء سے ہے۔ سید احمد علی شاہ نے "کشف البغاوت" میں شعر و شاعری کی قدیم روش کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے حمد نظم کی ہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کروں پہلے توحید رب جلیل — کیا جس نے پیدا کثیر و قلیل
خداوند ماہ نجوم و سپہر — خداوند عرش و خداوند مہر
وہ حاجت روا اور ہے بے نیاز — وہی اپنے بندوں کا ہے کارساز
کریم اور رحیم اور رزاق ہے
دو عالم کا لاریب خلاق ہے

اس کے بعد شاہ صاحب نے نعت رسول پیش کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کروں بعد اس کے ثنائے رسولؐ
جو ہیں در یکتائے بحر قبول

پھر انھوں نے زمانے کے حالات پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی بے مہری کی شکایت ان اشعار میں کی ہے:

ہمیشہ سے دنیا کا یہ حال ہے — عجائب طلسموں کا جنجال ہے
ذری اس میں بوے وفا کچھ نہیں — بھرا سم سے ہے آسمان و زمیں
مٹھائی ہیں ظاہر ہے پوشیدہ سم
سیہ رو قلم ہے بہ وقت رقم

یہ اشعار سید احمد علی شاہ کے حسب حال ہیں۔ انھوں نے بھی دنیا میں بوے وفا نہیں محسوس کی کیونکہ جب غدر ہوا تو ان کو کافی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے "کشف البغاوت" میں بہت تفصیل کے ساتھ غدر کے حالات نظم کیے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ غدر کا آغاز میرٹھ سے مئی ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ اس بات کو انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کیا ہے: ؎

گر پہلے میرٹھ سے آغاز ہے — عیاں ہم پر اخبار سے راز ہے
مئی کا مہینہ تھا اے ہوشیار — اور تاریخ دسویں رہے آشکار
تھے اعداد بارہ صد و شصت و چار — اسی فصلی سن میں ہوا اخر فشار
سن ہجری بارہ سو ہفتاد و سہ — ہوے متفق دونوں سن ہے یہ یہ
مناسب ہے اب عیسوی سن لکھوں — تھا اٹھارہ سو پر ستاون فزوں
مہینہ تھا روزہ کا گرمی کی فصل — ہوا شہر میرٹھ سے آغاز جدل

یکایک یہ سلطان سے باغی ہوئی
سب افواج دہلی کو راہی ہوئی

اس موقع پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ سید احمد علی شاہ انگریزوں کی موافقت کر رہے تھے اور وہ ہندستانیوں کے خلاف تھے۔ اسی لیے انھوں نے بغاوت کا الزام اہل ہند پر رکھا ہے اور انگریزوں کی مختلف مقامات پر تعریف کی ہے۔

سید احمد علی شاہ کا قول ہے کہ اس کے بعد اعظم گڈھ میں بغاوت ہوئی۔ وہ اعظم گڈھ کی بغاوت کا حال یوں بیش کرتے ہیں:

اعظم گڈھ کا احوال آگے سنو   ذرا باغیوں پر تاسف کرو
مخالف یہاں کا بھی لشکر ہوا   مثال شتر وہ بھی دلی چلا
ضلع اور قریہ کو تاراج کر   ہوے باغیوں میں وہ سب مشتہر
نہیں ان کا اب آدمی میں حساب
کہ دھوبی کے کتے سے اب ہیں خراب

شاہ صاحب نے گورکھپور کی بغاوت کا بھی ذکر کیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں:

گورکھپور کا آگے احوال ہے   یہاں کی حقیقت میں یہ قال ہے
یہاں کی بھی افواج باغی ہوئی   شرارت سے اپنی دداعی ہوئی
یہاں پر جو دو کمپنی فوج تھی   بہت بھیڑ سے موج در موج تھی
اعظم گڈھ کا احوال اس نے سنا   کہ حاکم سے سب نے بغاوت کیا
لوٹا مال و اسباب حکام کا   بغاوت کی دل میں سمائی ہوا
خزانے کے لینے پہ تیار ہو
ہوے مستعد وہ کہ پیکار ہو

سید احمد علی شاہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گورکھپور کے رسا انگریزوں کے موافق تھے۔ ان کا قول ہے:

کیا گرچہ افواج نے انحراف
رو سار مگر یہاں کے تھے پاک صاف
معاون تھے حکام کے اس قدر
نہ آنے دیا ان پہ ہرگز ضرر

خود سید احمد علی شاہ نے انگریزوں کی مدد کی۔ وہ فرماتے ہیں:

ہوے یہاں جو حکام رونق فروز   شب تیرہ میری ہوئی مثل روز
جب حکام نے آکے مسکن کیا   عزا خانہ ماوا د ملجا بنا
سبھی آل و اطفال تھے صاحباں   رہے خوش و خورم بہت مہرباں
دعا گوے حکام ہوں میں فقیر
بھلا مجھ سے راضی نہ کیوں ہوں امیر

اس کے بعد سید احمد علی شاہ نے گورکھپور کے انگریز افسروں کی مداح سرائی کی ہے۔

یہاں کے کلکٹر بہت ہیں دلیر   دلیری بسالت میں ہیں مثل شیر
سشن جج جو ہیں یہاں کے عالی تبار   گورنر کے نزدیک ہیں باوقار
اور کپتان رسل شامل رہے   ارسطو منش وہ بھی عاقل رہے
بترسن مجسٹر بہادر رہے
ہمارے بشر کے وہ داور رہے

جب انگریز حکام نے گورکھپور میں سکون دیکھا تو وہ دوسرے مقامات کی بغاوت فرد کرنے کے لیے چلے گئے۔ ایسے موقع پر باغیوں نے امام باڑہ پر حملہ کر دیا۔ غدر ہی کے دوران میں محرم کا مہینہ پڑا۔ امام باڑہ کے انتظام کے لیے شاہ صاحب نے برٹ جنٹ صاحب سے کچھ سپاہی مانگے۔ برٹ صاحب نے تمن دار کو حکم دیا کہ کچھ سپاہی لے کر امام باڑہ چلے جاؤ اور اس کی حفاظت کرو، مگر تمن دار نے سپاہی نہیں روانہ کیے۔ یہی نہیں بلکہ محمد حسن کے حکم سے باغی امام باڑہ میں داخل ہو گیے۔ اس وقت مشرف، عالی حسن، فیض بخش، فضل علی اور خود تمن دار نے امام باڑہ کے سامان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اور ان کے مکان پر پہرہ بٹھا دیا۔ باغیوں نے سید احمد علی شاہ کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا جو سامان امام باڑہ میں تھا اس کو ضبط کر لیا۔ ایک کوٹھری میں سونے اور چاندی کا سامان رکھا تھا، وہ نکال لاے۔ ان واقعات کا ذکر سید احمد علی شاہ یوں کرتے ہیں: ؎

کروں اس کی تفصیل گر میں رقم   تو یک جز سے ہرگز نہ ہووے گا کم
جو تھا مال میرا و حکام کا   جہاں تک بنا خوب غارت کیا
جو چیزیں کہ حکام نے مجھ کو دیں   بطرز امانت وہ سب تھیں رکھیں

ہر اک کوٹھری سے وہ لائے نکال — رکھا تھا جہاں سونے چاندی کا مال
سوا میرے اسباب کے اور بھی — عزا خانہ کی اس میں سب چیز تھی
وہ سب بخشی نواب آصف کی تھی — پئے زینت کربلا تھی رکھی
ہیا کیا تھا بزرگوں نے سب
محافظ تھا میں اس کا واقف ہے رب

جب غدر فرو ہو گیا تو انگریزوں نے سید احمد علی شاہ پر نوازشات کیں اور ان کو تسلی دی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

خبر میری حکام لیتے رہے — مرے حال پر حیف کرتے رہے
کلکٹر، کمشنر، سشن جج یہاں — کیا ہم کو ممتاز یہ صاحباں
ہوئی عید دیکھا جو حکام کو — ملاقات کی ہم سے خوشنود ہو
تشفی کیا میری حکام نے
کہا کچھ نہ اب رنج دل میں رہے

آخر میں سید احمد علی شاہ انگریزوں کو دعا دیتے ہیں:

رہے جب تلک پر ضیا آسماں — منور رہے نور سے یہ زمین و زماں
رہے ملک قبضہ میں سرکار کے — رعیت کو آرام ان سے ملے
سردار پر شعم ہو سرفراز
یہ ہے خواہش احمد پاک باز

غرضیکہ کشف البغاوت میں سید احمد علی شاہ نے غدر کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ مگر انھوں نے ہندوستانیوں کی مذمت کی ہے اور انگریزوں کی تعریف کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستانیوں نے اما باڑہ لوٹا اور انگریزوں نے ان کی مدد کی۔

سید احمد شاہ کی دوسری تصنیف "نور حقیقت" ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں بھی قدیم روایت کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے حمد نظم کی ہے۔ اس کے بعد نعت رسول کہی ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اپنے مرشد کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وہ مرشد مرے شاہ روشن علی
جو تھے رازدار خفی و جلی
عیاں ہو گئے ان سے اسرار حق
وہ تھے مطلع نور انوار حق

اس کے بعد شاہ صاحب نے مدح کرمعظم کی ہے۔

سر سرفراز ان عالی تبار — وہ بلقیس دوراں سلیماں وقار
عقیل و اولوالعزم و گیتی پناہ — ملک دربان و فلک بارگاہ
دم گیر اگر ہے تو کشورستاں
دم داد ہے تاج بخش جہاں

ان روایتی بیانات کے بعد سید احمد علی شاہ نے سبب تالیف کتاب ظاہر کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ایک بار شب قدر کو وہ سو رہے تھے کہ ہاتف نے ان کو صدا دی کہ تو محو خواب کیوں ہے؟ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ اس وقت ان کو القا ہوا اور انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے کہ تو ایسی مثنوی نظم کر جس سے تیرا نام قیامت تک باقی رہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک مثنوی کہی اور اس کا نام نور حقیقت رکھا۔

نور حقیقت میں سید احمد علی شاہ نے مذہبی موضوعات نظم کئے ہیں مثلاً "کوائف حالات زمانہ" عنوان کے تحت انھوں نے وصال رسول اکرم کا بیان پیش کیا ہے۔ اس کے بعد "کوائف علمائے سلف صفت آنہا" عنوان قائم کیا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے پرانے عالموں کے اصولوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ زمین و آسمان پر ہر سو مخلوق خدا کی عبادت کرتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

زمیں سے نظر کیجئے تا فلک — پری آدمی دیو و حور و ملک
کیا حق نے جس جس کو یہاں آشکار — ہیں سب اس کی تسبیح خواں بار بار
عبادت سے غافل نہیں کوئی شے — ہر اک شغل میں اپنے مصروف ہے

جہاںتک ہیں خار وخس و برگ و بار زمیں آسماں اور لیل و نہار
عبادت میں مشغول ہیں یک قلم
اسی کی عبادت کا بھرتے ہیں دم

شاہ صاحب نے یہ اشعار بہت صاف ستھرے کہے ہیں. اس قسم کے اشعار ان کی کتاب کشف البغادت میں مشکل سے ملیں گے.

سید احمد علی شاہ نے ایک عنوان "در بیان محفل حال وقال" قائم کیا ہے اور اس میں سماع کو جائز قرار دیا ہے. وہ فرماتے ہیں:

یہ محفل جو ہوتی ہے ہر اک برس
وہاں جمع ہوتے ہیں بسیار کس
یہ مجلس فقیروں کی ہے اے حبیب
سب آتے ہیں اس میں امیر و غریب
جہاں ہوتی ہے مجلس حال وقال
خدا کا بھی ہوتا ہے وہاں قیل وقال
خدا کی جو گاتے ہیں وہاں معرفت
عجب لطف ہے اس میں کچھ پوچھو مت
نہ رکھا اسے عالموں نے روا
یہ فتویٰ ہے کیسا جو سب کو دیا
نہ سن شاہ احمد تو ان کے کلام تو صوفی ہے کیا تجھ کو جھگڑے سے کام

سید احمد شاہ نے نور حقیقت مثنوی میں اسی قسم کے مختلف عنوانات قائم کئے ہیں. اور ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے. اس مثنوی میں "بیان جہاد" "حکایت دہلی" "بیان آیات توریت" "حکایت شداد" "بیان باہر آنے ابراہیم خلیل کا" "بیان مارے جانے نمرود کا" "در بیان قربانی حضرت اسمٰعیل" "رسیدن موسیٰ علیہ السلام بہ درِ رسالت" اور "بیان تولد شدن حضرت عیسیٰ علیہ السلام" وغیرہ عنوانات ملتے ہیں.

حضرت احمد علی شاہ کی تیسری نثری کتاب "محبوب التاریخ" ہے. اس کتاب کا تعلق گورکھ پور کی تاریخ سے ہے. مگر شاہ صاحب نے گورکھپور کی تاریخ سے قبل دنیا اور ہندوستان کی تاریخ پیش کی ہے اور اس کی آبادی کا ذکر کیا ہے. چنانچہ انھوں نے یورپ، ایشیا، امریکا، اور افریقہ کی آبادی کو بیان کیا ہے. اس کے بعد ہندستان کی آبادی اس کے محصول اور اس کے لشکر پر روشنی ڈالی ہے. مگر اس موضوع پر شاہ صاحب کے سارے اشعار بے لطف اور بے کیف ہیں. مثلاً وہ فرماتے ہیں:

ہے محصول اس ملک کا دو کرور
یہ ہے الف پنجہ سہ کا بھی جوڑ
رعایا ہے برہما میں بتیس تک
نہ اس میں غلط ہے نہ اس میں ہے شک
ہے لشکر بھی یک لکھ و پنجہ ہزار
نہیں اس میں کچھ جائے شک زینہار

احمد علی شاہ نے ہندستان کی تاریخ کو بھی نظم کیا ہے. چنانچہ پہلے انھوں نے بدھ شٹر کی حکومت کا ذکر کیا ہے. پھر شہاب الدین اور تیمور لنگ کے حملوں کا بیان ہے. اس کے ساتھ ہی مغلیہ حکومت کی تفصیلات بھی موجود ہیں. آخر میں بہادر شاہ کی حکومت کا بیان ہے. مگر محبوب التاریخ میں بہت سے تاریخی واقعات ترتیب سے نہیں ہیں. سید احمد علی شاہ نے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی قید کے بعد بنگال کے نوابوں کا ذکر چھیڑ دیا ہے اور نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے. سراج الدولہ بنگال کا نواب ۱۷۵۶ء میں ہوا ہے. یعنی شاہ صاحب تقریباً سو سال پیچھے پلٹ گئے. اسی سلسلے میں شاہ صاحب نے جنگ بکسر کا نقشہ کھینچا ہے. جو ۱۷۶۴ء میں میر قاسم نواب بنگال اور انگریزوں کے درمیان ہوئی تھی.

گورکھ پور کی اصل تاریخ وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں انھوں نے "حکایت بنائے شہر گورکھ پور" عنوان قائم کیا ہے. شاہ صاحب کا قول ہے کہ گورکھپور پہلے ایک صحرا تھا. چنانچہ فرماتے ہیں

کہ یہ شہر صحراؤ ویران تھا
سواد چراگاہِ حیوان تھا
کسی کو نہ اس شہر سے کام تھا
فقط شہر کا نام ہی نام تھا

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ گورکھ پور مغلوں کی حکومت میں شامل تھا اور شاہجہاں بادشاہ اس کے مالک تھے۔ شاہجہاں کے انتقال کے بعد گورکھ پور اورنگ زیب کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ جب اورنگ زیب کی وفات ہوگئی تو گورکھپور اس کے بیٹے معظم کے قبضہ میں آگیا۔

سید احمد علی شاہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس شہر کا نام گورکھپور کیوں پڑا۔ ان کا قول ہے کہ یہاں ایک درویش گورکھناتھ رہتا تھا اس نے اس شہر کو آباد کیا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام گورکھ پور پڑا۔ بقول شاہ صاحب ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے یہ علاقہ جنگل تھا جس میں گورر یعنی جانور چرا کرتے تھے۔ گورر لفظ کی مناسبت سے اس شہر کا نام گورکھ پور پڑا۔ شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس شہر کا نام معظم آباد کیوں پڑا۔ ان کا قول ہے کہ شہزادہ معظم اپنے باپ سے ناراض ہوکر گورکھ پور کی طرف آگیا۔ اس نے اس شہر کو ویران پایا۔ اس لیئے اس نے اس کو آباد کرنا شروع کیا۔ اور اس کا نام معظم آباد رکھا۔

وہ فرماتے ہیں :

کہ جو تھا معظم شہ کامراں
وہ آیا تھا ناخوش پدر سے یہاں
جو آیا تو یہ شہر ویران دیکھ
بیابان صحرا و میدان دیکھ
حکومت سے اپنی بسایا اسے
غرض شہر پورا بنایا اسے

اس شہر کا نام شہزادے نے معظم آباد ۱۰۷۰ھ میں رکھا جیسا کہ سید احمد علی شاہ فرماتے ہیں :

زہجری سنے الف و ہفتاد بود
کہ آباد ایں شہر را شہ نمود

۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء کے ہے۔ اس زمانے میں معظم شاہزادہ ہی تھا۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ شاہزادہ معظم نے

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

غزل

صلاح الدین نیر

فریاد بن کے جاتا ہے کس کس کے گھر مجھے
تم نے نہیں تو کس نے کیا در بدر مجھے

میری نگاہ، جلوہ طلب ہے تو کیا کروں
تم نے ہی خود کیا ہے شریکِ نظر مجھے

تیرے بغیر شہرِ تمنّا، اُداس ہے
اب اجنبی سا لگتا ہے خود اپنا گھر مجھے

میں بھی دیارِ شوق کا زندہ مزار ہوں
اے زندگی! تو دیکھ تو لے اک نظر مجھے

حالانکہ چھن گئی مری آنکھوں سے روشنی
دنیا سمجھ رہی ہے ابھی دیدہ ور مجھے

نیّر! یہ شخص لگتا ہے مجھ سے بھی معتبر
رسوائی لے کے آئی بھی تو کس کے گھر مجھے

غزلیں

کرشن بہاری نور

جس کا کوئی بھی نہیں اس کا خدا ہے یارو
میں نہیں کہتا کتابوں میں لکھا ہے یارو

مڑ کے دیکھوں تو کدھر اور صدا دوں تو کسے
میرے ماضی نے مجھے چھوڑ دیا ہے یارو

اس سزا سے تو طبیعت ہی نہیں بھرتی ہے
زندگی کیسے گناہوں کی سزا ہے یارو

شب ہے اس وقت کوئی گھر نہ کھلا پاؤ گے
آؤ میخانے کا دروازہ کھلا ہے یارو

کوئی کرتا ہے دعائیں تو یہ جل جاتا ہے
میرا جیون کسی مندر کا دیا ہے یارو

میں اندھیرے میں ہوں یا میں اجالے میں ہوں
ایسا لگتا ہے کوئی دیکھ رہا ہے یارو

حال کا زخم تو ماضی سے بہت گہرا ہے
آج زخمی مرا سایہ بھی ہوا ہے یارو

انتظار آج کے دن کا تھا بڑی مدت سے
آج اس نے مجھے دیوانہ کہا ہے یارو

چندر پرکاش جوہر بجنوری

تم دور رہو، یا پاس رہو، ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے
اک روز کا کٹنا کیا معنی، اک عمر بسر ہو جاتی ہے

کہتے ہیں کہ خونِ اہلِ وفا، لاتا ہے یقیناً رنگ آخر
سنتا ہوں کہ میرے ذکر پہ اب تو آنکھ بھی تر ہو جاتی ہے

اس حسنِ نظارہ کے صدقے، اس رخ سے نقاب اٹھے نہ اٹھے
تکمیلِ طلب ہو جاتی ہے تسکینِ نظر ہو جاتی ہے

آتا ہے شبستانِ گل میں اک وقتِ طرب ایسا بھی کہ جب
ہلکی سی صدائے غنچہ بھی پیغامِ سحر ہو جاتی ہے

جب ذوقِ جنوں کی منزل میں سب دوست جدا ہو جاتے ہیں
خود گردِ سفر ہی اٹھ اٹھ کر دمسازِ سفر ہو جاتی ہے

رندی بھی اسی کی ہے رندی مستی بھی اسی کی ہے مستی
میخانے میں جس کی لغزش پر ساقی کی نظر ہو جاتی ہے

آغازِ محبت میں جوہرؔ دیکھا ہے یہی ہم نے اکثر
جو کوئی تصادم ہوتا ہے دنیا کو خبر ہو جاتی ہے

بدیع الزماں اعظمی

ہر ملک کے اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ دنیا کے فلاں فلاں خطے میں بہت ہی روشن اشیاء خلاء میں برق رفتاری کے ساتھ اُڑتی ہوئی دیکھی گئیں۔ ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ توے کی طرح گول ہوتی ہیں یا سگار کی طرح لانبی۔ انھیں عرف عام میں اڑن طشتریاں کہا جاتا ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ تقریباً ایک چوتھائی صدی سے ان کے دیکھے جانے کی خبریں برابر آ رہی ہیں۔

۲۴ جون سنہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ امریکہ کے شہر اڈاہو (IDAHO) کا ایک تاجر مسمی کینیتھ آرنلڈ ایک پرائیویٹ طیارہ پر ملک کے شمالی مغربی پہاڑی خطّہ میں ماؤنٹ رینیئر (MT. RAINIER) کے قریب پرواز کر رہا تھا۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے کسی خوش نما پہاڑی کا طواف کرتے ہوئے عجیب الخلقت طیاروں کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ پربت اپنے دل فریب مناظر کے لیے مشہور ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ یہ طیارے پہاڑی چوٹیوں کا چکّر کاٹ رہے تھے اور دیکھنے میں معلوم پڑتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ اُن کی قطار غالباً پانچ میل لمبی رہی ہوگی۔ وہ سب کے سب توے کی طرح گول اور چپٹے تھے اور مثل آئینہ سورج کی شعاعوں کو منعکس کر رہے تھے۔

جب آرنلڈ نے اپنے مشاہدہ کی رپورٹ پریس کو دی تو ایک زبردست سنسنی پھیل گئی۔ یہ گول گول اُڑن طشتریاں عوام میں موضوعِ گفتگو بن گئیں۔ چند دنوں کے بعد ملک کے دوسرے حصّوں سے بھی ان کے دیکھے جانے کی رپورٹیں آئیں۔ ان میں کچھ تو ہوائی جہازوں سے دیکھی گئیں، کچھ زمین پر ہی سے مشاہدہ کی گئیں اور کچھ راڈار اسکرین پر دیکھی گئیں۔ جن جن لوگوں نے ان اُڑن طشتریوں کو دیکھا اُن میں بعض تجربہ کار ماہر فلکیات تھے، بعض راڈار آپریٹر تھے، بعض ہوائی جہازوں کے پائلٹ تھے، بعض ہوائی اڈوں کے کنٹرولر تھے اور بعض ماہر موسمیات تھے۔

اُڑن طشتریاں ریاست ہائے متحدہ کے مختلف حصّوں بالخصوص جنوبی مغربی حصّہ کے ریگستانی علاقہ میں دیکھی گئیں۔ ان کے مشاہدہ کی خبریں مختلف اوقات میں میکسیکو، کینیڈا، یورپ، افریقہ، بھارت، جنوبی مشرقی ایشیا کے بعض ممالک، اسٹریلیا، جزائر ہوائی، جنوبی امریکہ، گرین لینڈ اور انٹارکٹیکا یا اعظم سے بھی آئیں۔ جنوبی امریکہ سے جو خبر آئی وہ افسانوی رنگ کی بہت ہی سنسنی خیز تھی۔ یہ خبر ملک برازیل کی راجدھانی ریو ڈی جنیرو کے اخبار (COR REI DA MANA) میں جلی سرنامہ کے ساتھ شائع ہوئی جس سے وہاں کے لوگوں میں سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ واقعہ یوں تحریر تھا کہ ۱۹ راگست سنہ ۱۹۶۳ء کے موسم سرما کی ایک رات کو ایک شخص مع اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے برازیل کے ایک شہر میں اپنے چھوٹے سے مکان میں سو رہا تھا۔ تینوں بچوں کا باپ مسمی ریوالینو (RIVALINO) ہیرے کی تلاش میں کان کنی کرتا تھا۔ ایک سال قبل اس کی رفیقۂ حیات اُسے داغِ مفارقت دے چکی تھی۔ تینوں بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا بار اُسی کے سر تھا۔ سب سے بڑا

بیٹا ریمنڈو (RAIMUNDO) صرف بارہ سال کا تھا۔ رات کے سناٹے میں اُس نے مکان کے اندر دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اس نے بیڈ سوئچ آن کی اور چاروں طرف متحیرانہ نگاہ ڈالی۔ ہوش رُبا منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ چند عجیب الخلقت مخلوق جن پر نہ تو انسان ہونے کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ حیوان کا پرچھائیوں کے مانند کمرہ میں پھُدک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی شے یا کسی شخص کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ چند لمحات تک بچوں کے اوپر منڈلاتی رہیں اور پھر ریوالینو کے بستر کے قریب آئیں اور اسے گھور گھور کر دیکھنے لگیں۔

ریوالینو نے خطرہ کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے منت سماجت شروع کر دی۔ خیریت یہ ہوئی کہ وہ جملہ مخلوق چند ساعت بعد روپوش ہو گئیں۔ اس واقعہ کے چند دنوں قبل اس نے ویسی ہی دو عدد مخلوق کو اپنے مکان کے قریب بل کھودتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ قد میں مشکل سے تین فٹ کی ہوں گی۔ جب ریوالینو اُن کی طرف بڑھا تو وہ بھاگ کر ایک جھاڑی میں چھپ گئیں۔ چند منٹ بعد اس نے دیکھا کہ جھاڑی سے ایک عجیب و غریب شے تیزی سے اُڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ شے ہیٹ کی شکل کی تھی جس کا حاشیہ دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سُرخ اور روشن تھا۔ ریوالینو نے یہ واقعہ اپنے دونوں کان کنوں سے بیان کر کے انھیں بھی متحیر بنا دیا تھا۔

دوسرے دن صبح کو سب سے پہلے بڑا بیٹا ریمنڈو مکان سے باہر آیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دو بڑی بڑی گول اور چمکدار اشیاء زمین سے چند فٹ کی اونچائی پر تیرتی ہوئی دیکھیں۔ ان سے عجیب و غریب قسم کی آواز بھی نکل رہی تھی اور چمکتی ہوئی تیز روشنی بھی۔ ایک غیر معمولی شے دیکھ کر وہ فرطِ مسرت سے چلّا اٹھا۔ اس کی آواز پر جب ریوالینو مکان سے باہر آیا تو دونوں تیرتی ہوئی اشیاء ٹوٹ کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں اور ان سے گندھکی رنگ کا گرم اور گہرا دھواں نکلنے لگا۔ دھوئیں کے بادل نے ریوالینو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب دھواں فضا میں غائب ہو گیا تو ریوالینو کے وجود کا نشان تک باقی نہ رہا۔ بے چارہ ریمنڈو اس طور پر اپنے باپ کے اغوا کیے جانے پر بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ اس کے نزدیک یا تو کالا جادو تھا یا سائنسی شعبدہ۔ اس نے اپنے ڈیڈی کو تلاش کرنے میں ایک ایک جھاڑی کو چھان مارا مگر کہیں اس کا پتہ نہ تھا۔ بالآخر مایوس ہو کر وہ کان کنوں کو ساتھ لے کر پولیس میں رپورٹ درج کرانے چلا گیا۔ لفٹننٹ لیسوبا (LT. LISOBA) کو اگرچہ ریمنڈو کی ہوش رُبا کہانی پر یقین نہ آیا مگر اس نے اس واقعہ کی تفصیلی جانچ کرنے کا حکم دے ہی دیا۔

پولیس نے سب سے پہلے کان کنوں سے پوچھ گچھ کی۔ ریوالینو کی نجی زندگی کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ریوالینو کی موت یا قتل یا اغوا کا باعث نجی عداوت نہیں ہو سکتی اور یہ بات بھی خارج از امکان تھی کہ بارہ سالہ ریمنڈو اپنی جان سے زیادہ عزیز باپ کی جان لے لیتا۔ دونوں کان کنوں نے بھی چند دن قبل والا واقعہ بیان کر کے قتل کا اشتباہ بھی دور کر دیا۔ اب سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ ریمنڈو کے بیان پر مہرِ تصدیق ثبت کی جائے۔

اخبار میں اس خبر کے شائع ہوتے ہی عوام میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر ایک کو ایک فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں اس کا بھی حشر ریوالینو جیسا نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ پچھلے دنوں کی یاد ابھر کر ہر ایک کے سامنے آ گئی جب سب نے کوئی گول گول اور روشن شے فضا میں تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھی تھی۔ بہر حال وہ اُڑن طشتریاں پھر نہ دیکھی گئیں اور نہ بدقسمت ریوالینو کا کوئی سراغ مل سکا۔

اس عجیب و غریب حیرت انگیز واقعہ کے ضمن میں اگرچہ معقولات کا کوئی دخل نہیں مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ خلائی

میں اُڑنے والی برق رفتار اشیاء خواہ وہ طشتری کی طرح
گول ہوں یا سگار کی طرح لانبی ہوں یا ایک کُرہ کی شکل
کی ہوں دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں دیکھی
گئی ہیں۔ انھیں عرف عام میں اڑن طشتریاں کہا جاتا ہے
جن کا سائنسی نام (U.F.O) ہے مگر ان میں سے کسی ایک
کے ساتھ ایسی کوئی افتاد منسوب نہیں جیسا کہ ریاالٹو کے
ساتھ پیش آئی۔ ہاں! ایک ہوائی جہاز کے گرنے کا
حادثہ ان اُڑن طشتریوں کی ٹکر سے ضرور منسوب کیا
جاتا ہے۔

ان اڑن طشتریوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے
ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی فضائیہ نے تحقیقات کی کئی
مہمیں چلائیں۔ اس سلسلے میں فضائیہ نے ایک ایسا سوالنامہ
تشکیل دیا تھا کہ جس کی روشنی میں نظر آنے والی اڑن طشتریوں
کے بارے میں اگر صحیح صحیح جوابات دیے جاتے تو کسی نتیجہ
پر پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوتی مگر کسی نے بھی جواب دینے کی
زحمت نہ اٹھائی یا کسی سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑا چنانچہ
فضائیہ کے سکریٹری مسٹر تھامس فن لیٹر نے ۴ جون ۱۹۵۳ء
کو ایک بیان دیا کہ اگرچہ اڑن طشتریوں کے نظر آنے کی
کئی ایک رپورٹیں موصول ہو چکی ہیں مگر فضائیہ اب تک
کسی خاص نتیجہ پر پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ اسی سال
حکومت کینیڈا کی رائل ایئر فورس نے بھی ملک کینیڈا میں دیکھی
جانے والی اڑن طشتریوں کا راز معلوم کرنے کا ایک منصوبہ
بنایا مگر وہ بھی لاحاصل رہا۔

اڑن طشتریوں کے بارے میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے
کہ یہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی اور بڑی دونوں سائزوں
میں دیکھی گئی ہیں۔ ان کا اوسط قطر لگ بھگ ننانوے فٹ ہوتا
ہے۔ یہ حیرت ناک طریق پر چکر کاٹتی ہیں۔ یہ فضا میں منڈلاتی ہوئی
کبھی کبھی ساکت ہو جاتی ہیں اور پھر ایک راکٹ کی
تیزی کے ساتھ آسمان کا رخ کرتی ہیں اور پھر یک دم
پلٹ پڑتی ہیں۔ ان کی رفتار کا اندازہ ہزاروں میل فی سکنڈ
لگایا گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے
اڑن طشتریوں کے خلابازوں کو بھی دیکھا ہے مگر یہ نہ بتایا
کہ عالم بیداری میں یا عالم خواب میں! ایک کتاب
'BEHIND THE FLYING SAUCERS' جسے ہنری ہولٹ
اینڈ کمپنی (HENRY HOLT & CO.) نے سنہ ۱۹۵۰ء
میں شائع کی تھی جس میں مسٹر فرینک اسکلی نے اس امر کی نشان دہی
کی ہے کہ سیارہ زہرہ کے خلابازوں کے ڈھانچے نیو میکسیکو
اور کولوریڈو کے ریگستانی علاقے میں دیکھے گئے۔ گمان غالب
ہے کہ اُن کا خلائی راکٹ (اڑن طشتری) کسی حادثہ سے
پھٹ کر زمین پر گر پڑا ہوگا۔ موصوف کا کہنا یہ ہے کہ سیارہ
زہرہ کی یہ مخلوق قد میں مشکل سے ۳۸ سے ۴۴ انچ کی رہی
ہوگی۔ آگے چل کر وہ رقم طراز ہیں کہ ایک بار سائنس دانوں کی
ایک ٹولی نے زہرہ کی مخلوق کو دیکھ کر انھیں پکڑنے کی لاحاصل
کوشش بھی کی تھی۔ اس امر کا اشتباہ ہے کہ وہ مخلوق
ابھی تک اریزونا (امریکہ) کے بے آب و گیاہ ویران اور
سنسان ریگستانی علاقہ کی چھان بین کر رہی ہے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پُراسرار طریق پر پرواز
کرنے والی اڑن طشتریوں کے وجود کو ہم کیسے ثابت کر سکتے
ہیں۔ کیا یہ واقعی خلائی راکٹ ہیں جو ہمارے خلائی راکٹوں
کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں؟

شروع میں کچھ لوگوں کا یقین تھا کہ اڑن طشتریاں دراصل
روسی خلائی راکٹ تھے اور کچھ لوگ اس خیال کے تھے
کہ اڑن طشتریاں خود امریکی راکٹوں کی ترقی یافتہ شکلیں تھیں
مگر امریکہ کی فضائیہ کے سربراہ اور خود آنجہانی صدر ٹرومین
نے اس خیال کی پُرزور الفاظ میں تردید کر دی اور یہ بات
بھی بعید از قیاس قرار پائی کہ روسیوں نے ایسے برق رفتار
غیر معمولی صلاحیت کے راکٹ بنا لیے ہیں۔ پھر تو یہ خیال راسخ
ہو گیا کہ یہ پُراسرار اڑن طشتریاں یقیناً سیارہ مریخ یا سیارہ

زہرہ یا کسی دوسرے نظامِ شمسی کے سیارگان میں سے کسی سیارہ کے خلائی راکٹ ہی ہو سکتے ہیں چنانچہ خلائی راکٹ سازی سے ربط رکھنے والے سائنس داں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ آج جب کہ ہم چاند یا دوسرے سیاروں پر پہنچنے کے لیے خلائی راکٹ بنانے میں مصروف ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ دوسرے سیاروں کی مخلوق جو ہمارے مقابلہ میں سائنس اور ٹکنالوجی میں بہت آگے ہو دوسرے سیاروں پر اترنے کے لیے خلائی راکٹ بنانے میں ہم سے سبقت لے گئی ہو۔ اس قسم کے بہت سارے خیالات پیش کیے گئے جن کی ایک فہرست اڑن طشتریوں کے بہت بڑے حامی میجر ڈونلڈ۔ ای۔ کیہی MAJOR DONALD KEYHOE نے نمبروار قلم بند کیا ہے۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ خلائی مخلوق کو ہمارے ایٹمی تجربوں اور خلائی راکٹوں کی مشقوں سے یہ اندیشہ پیدا ہو کہ جب ہم خلاء میں پرواز کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو ہم نیوکلیائی اسلحوں سے اُن پر حملہ آور ہوں گے۔ اس لیے اُنھوں نے ہمارے منصوبوں کی جانکاری کے لیے اُڑن طشتریاں بھیجی ہوں۔

۲۔ خلائی مخلوق کو اس بات کا کبھی اندیشہ ہوگا کہ اگر خدانخواستہ کرۂ ارض اپنے جوہری اسلحوں کے استعمال سے خود فنا ہو جائے تو اُن کے مضر اثرات اُن کے کرہ پر بھی پڑنا لازمی ہوں گے۔

۳۔ خلائی مخلوق ہم سے دوستانہ تعلقات کبھی قائم کرنا چاہے گی بہ شرطیکہ انھیں یقین ہو جائے کہ ہماری خلائی دوڑ دھوپ سے انھیں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

۴۔ خلائی مخلوق کرۂ ارض یا دوسرے سیاروں پر اپنا پرچم نصب کرنا چاہتی ہوگی۔

۵۔ اس کے بھی امکان ہیں کہ خود اُن کا سیارہ ایسے دور سے گذر رہا ہو جب کہ ترپوسیت آب و ہوائی تبدیلی متوقع ہو جس کی وجہ سے اُن کی چند نسلوں بعد وہاں بود و باش کرنا ممکن نہ ہو سکے۔ اس لیے وہ ہمارے کرۂ باد کا مطالعہ کر رہی ہیں کہ اگر حالات اُن کے سازگار ہوں تو پھر یہیں منتقل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آبادکاری کے لیے وہ خصوصیت کے ساتھ دنیا کے غیر آباد علاقوں کا جائزہ لے رہی ہیں۔

اس قسم کے خیالات تو مفروضات ہی کی حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ قیاس کہ اُڑن طشتریاں دوسرے سیاروں سے آتی رہتی ہیں اپنی جگہ پر ہمارے لیے یقیناً بے حد تشویش ناک ہیں۔ خوش قسمتی سے اس نظریہ کو حق بہ جانب قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی معقول جواز نہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے مشہور سائنس دان مسٹر ڈونلڈ۔ ایچ۔ منزل (DONALD H. MENZIL) کا یہ نظریہ ہے کہ اڑن طشتریوں کا وجود کرۂ باد میں بکھرے ہوئے برف کے معلّق ٹکڑوں پر آفتاب یا ماہتاب کی شعاعوں کے انعکاس سے ہوتا ہے۔ جب ایسے بلوریں ٹکڑے سُرعت کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں یا کرۂ باد میں منڈلاتے رہتے ہیں تو آفتاب یا ماہتاب کی کرنیں ان سے منعکس ہو کر عجیب و غریب منظر پیش کرتی رہتی ہیں جسے سائنس مدتوں سے مشاہدہ بھی کرتے آ رہے ہیں۔ یہ منعکس کرنیں بسا اوقات آفتاب یا ماہتاب کے گرد حلقہ ہائے نور بناتی رہتی ہیں۔ بعض وقت اس حلقۂ نور کا کچھ حصہ اتنا روشن ہو جاتا ہے جتنا کہ خود آفتاب۔ اسے ہم آفتاب کاذب کا لقب دیتے ہیں۔ چاند کے ہالہ میں پیدا ہونے والے ایسے روشن حصہ کو ہم ماہتاب کاذب کہتے ہیں۔ آفتاب کاذب یا ماہتاب کاذب کی تشکیل جن منعکس برق رفتار شعاعوں کی بدولت ہوتی رہتی ہے انھیں کو ہم اپنی لاعلمی کی بنا پر خلائی راکٹ یا اڑن طشتری کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس لیے اڑن طشتریاں دراصل ہماری نظر کا فریب ہی ہو سکتی ہیں۔

جس طرح آسمان پر بکھرے ہوئے تارے اور سیارے دیکھنے میں روشنی کے نقطے سے نظر آتے ہیں مگر ان کی اصلیت

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

شاغل ادیب

۲۷ مئی ۱۹۷۶ء — نہرو جی کی بارھویں برسی پر

(منظوم فیچر)

(مدھم مدھم ماتمی سنگیت)

زنانی آواز:—

آج کے روز بارہ سال ہوئے
اک قیامت سی ہم پہ ٹوٹی تھی
یک بیک ہم سے چھٹ گیا تھا کوئی
یا کہ تقدیر ہند پھوٹی تھی

آج کے روز بارہ سال ہوئے
چل بسا تھا عظیم راہ نما
موت پر ہند کے جواہر کی
ساری دنیا تھی سربسر نوحہ

(سنگیت کا شور)

مردانی آواز:—

عظیم ہند کے اے رہبر عظیم سلام
لبوں پہ اب بھی ہے قصاں جھلکتے تیرا نام
تمام اہل جہاں سے تجھے محبت تھی
تمام قوموں کی دل میں ترے عقیدت تھی
تو ہند ہی کا نہیں تھا تمام دیسوں کا
تمام دہر کا تو شہری مہذب تھا
ترا وہ امن جہاں کا پیام زندہ باد
وہ پنچ شیل کا اونچا مقام زندہ باد
دراصل تھا تو سیاست کا ایک زریں باب
کھلے ہیں اب بھی جہاں میں ترے ہنر کے گلاب

(سنگیت کا شور)

زنانی آواز:—

وطن میں اب بھی تری قدر کا ہے قد اونچا
ترے لیے ہے جھکا اب بھی سر ہمالہ کا

مردانی آواز:—

لبوں پہ گنگ و جمن کے ہیں اب بھی تیرے گیت
اک ایک نقش اجنتا ہے اب بھی تیرا میت

زنانی آواز:—

جمال صبح بنارس ہے اب بھی تجھ پہ نثار
اودھ کی شام کے دل میں ہے اب بھی تیرا پیار

مردانی آواز:—

وقارِ عظمتِ ہندوستاں ہے تو نہرو
ہمارے اعلیٰ تمدن کی آبرو ہے تو

(سنگیت کا شور)

کورس:—

ہے جے جے توہی ہے ترا نام زندہ
وطن میں ہے نہرو ترا کام زندہ
بھلائیں گے کس طرح ہم تیرے احساں
بنایا ہے تونے ہمیں ایک انساں
غلامی کی زنجیر پگھلائی تونے
اصولوں کی ہر راہ چمکائی تونے
نظریات آزادی تیرے نرالے
کہ آزادیاں ساری ہر کوئی پالے
غریبوں کی ننگوں کی حالت ہو بہتر
پہنچ جائیں برتر کے درجے پہ کمتر
ہو آزادی ہر اک معاشی، سماجی
ملے ہر ترقی شعوری، سیاسی
رہے اب نہ تفریق و تقسیم فرقہ
رہے اب نہ جھگڑا کوئی مذہبوں کا
کیا نفس کو پاک تونے ہمارے
بتائی نئی راہ جینے کی تونے
ہر اک ذہن چمکا ترے فلسفوں سے
عمل سے ملا ارتقا ہم کو تیرے
بہت رنگ لائی تری خاک نہرو
نہیں ہم میں پھر بھی، ہر اک سمت ہے تو

(سنگیت کا شور)

زنانی آواز:—

تجھ کو اٹھے جہاں سے بیتے ہیں سال بارہ
لیکن ہے اب بھی مشرق، مغرب میں سوگ تیرا
تاریخ ہند کا تو، زریں باب نہرو
انساں کی عظمتوں کا رنگین باب نہرو
نہرو تو جگمگاتا سورج تمدنوں کا
انسان دوستی کا تو اک حسیں سویرا
اقوام کی بقا کا تھا ایک تو مسیحا
امن جہاں کا نہرو دراصل تو خضر تھا

مردانی آواز:—

بے باک مرد تھا تو، تھا عزم سربسر تو
جمہور کا مجاہد، تھا زیست کی سحر تو
تونے مخالفت کی ہر بے روی کی بڑھ کر
نہرو بلند نظری تونے دکھائی اکثر
تو ذہن و فکر و فن کا معمار تھا نرالا
اتہاس تھا عظیم اک، فنکار تھا نرالا
نہرو تو اک مثالی انسان تھا جہاں کا
ہندوستاں میں پیدا تجھ سا کوئی نہ ہوگا

(سنگیت کا شور)

مردانی آواز: سلام ہند کے مرد جواں، سلام سلام
زنانی آواز: سلام ہمدم اہل جہاں، سلام سلام
مردانی آواز: سلام تجھ پہ تو تھا ہند کا بڑا سیاس
زنانی آواز: سلام، تھا تجھے سارے جہان کا احساس
مردانی آواز: سلام تجھ پہ دکھی ہند کے دلوں کی پکار
زنانی آواز: سلام عظمت عالم کے قافلہ سالار
مردانی آواز: سلام تجھ پہ روایات کے حسیں پیکر
زنانی آواز: سلام، تو کہ تھا تہذیب نو کا پیغمبر
مردانی آواز: سلام، مشرقی آداب کے عظیم انساں
زنانی آواز: سلام مغربی کردار کے بلند نشاں
مردانی آواز: سلام، دشمن قید و غلامی تجھ پہ سلام
زنانی آواز: زمانے بھر میں کیا تونے شانتی کو عام

(سنگیت کا شور)

(مردانی اور زنانی آوازیں)

گو تجھ کو اٹھے جہاں سے ہوئے برس بارہ
ہر ایک ذہن میں لیکن ہے آج بھی زندہ

عظیم ہند کے رہبر سدا امر ہے تو
بھلا سکے گی نہ دنیا تجھے کبھی نہرو

عتیق الرحمٰن قاسمی

باغ وبہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ

داستان گوئی کا فن ایک ایسے غیر مہذب لیکن معصوم دَور کی یاد دلاتا ہے جب انسان کا شعور اتنا شائستہ، اس قدر مہذب، بالیدہ اور تراشیدہ نہیں تھا جتنا اب ہے۔ تہذیب انسانی کا تیز گام قافلہ جیسے جیسے منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا، اس کے ادب، موسیقی، مصوری، ہتھیار سازی اور معماری کے فن میں بھی نکھار آتا گیا اور وہ کارواں جو 'داستان' سے چلا تھا اب مختصر افسانہ تک آ پہنچا ہے۔

عصری معاشرت جتنی کھل کر داستان اور مثنوی میں ہمارے سامنے آئی ہے اتنی بے حجاب ہو کر کسی اور صنف سخن میں نہیں آئی۔ داستانِ کیتکی، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، فسانۂ عجائب، باغ وبہار، اور دوسری داستانیں پڑھ جائیے، نہ صرف عشق و معاشقہ کی داستان اور جن و پری کے وجود سے آراستہ کہانی ملے گی بلکہ اپنے دَور کے معاشرے کی سچی تصویر بھی چلتی پھرتی نظر آئے گی۔ پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں:

"ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں متداول نظر آتے ہیں وہ مختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے تخیل سے آبیاری ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کے تخیل کی ابتدائی نوخیز قوت پرواز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم تتلاہٹ سنائی دیتی ہے۔"

ہمارے ادب بالخصوص نثری ادب کی ابتدا انہیں داستانوں سے ہوئی لیکن افسوس ہے کہ نثری ادب کا چراغ شعری ادب کے سامنے جھلملا کر رہ گیا، یہ شکوہ اور تاسف بجا ہے کہ نثر کے ساتھ سوتیلی اولاد جیسا سلوک کیا گیا تاہم نثری ادب کا سرمایہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو داستان گوئی کی اولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فن اتنا ہی قدیم ہے جتنی انسان کی تہذیب۔

"داستان" کا مقصد تنشیطِ طبع ہے، جس سے کسل، اضمحلال اور تکان دُور ہو جاتی ہے اور تھکا ماندہ انسان قصہ سننے کے بعد ایک نشاط، سرور، انبساط اور کیف محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک عزم، حوصلہ، ہمت، استقلال اور حصولِ مقصد کے لیے انتھک جد و جہد کر کے کسی ماورائی طاقت کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچ جانے کا جذبہ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

ایک وقت تھا جب "داستان" نیم تیرہ شبی میں بڑی بوڑھیوں کے پوپلے منہ سے بچوں اور بڑوں سب ہی کو لطف اندوزی کا سامان فراہم کرتی تھی، اور گاؤں والے بھی برسات کی تاریک راتوں میں خوب جھوم جھوم کر پڑھا اور سنا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ جہاں سماج کی دوسری قدریں بدلیں، سامان تفریح بھی بدل گئے۔ اور اب تنشیطِ طبع کے لیے ناول، فلم اور دوسرے بہت سے ادارے وجود میں آ گئے۔

غالب نے میر مجروح کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"ہر چند خردمند بیدار مغز تواریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے
لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل

ہوں گے۔"

آگے چل کر مزید لکھا ہے:

"داستان طرازی من جملہ فنون سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔"

ممتاز حسین داستانوں سے بڑھتی ہوئی لگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"داستانوں سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کم نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس کچھ اور بڑھی ہے کیونکہ اب ہم داستانوں کی داخلی اور جذباتی گرفت سے آزاد ہوگئے۔ آج ہم ان کا تجزیہ خارجی انداز سے کرنے پر قادر ہیں۔"

داستانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں مافوق الفطرت اشیاء کا ذکر ہوتا ہے۔ اگر اس سے پیشتر یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ ادب اپنے سماج سے ہٹ کر کچھ نہیں ہوتا تو یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جائے گا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے ایک سیمینار میں کہا تھا کہ تنقید کرتے وقت شاعر یا ادیب کے دور کا بغائر مطالعہ کرنا ہوگا اور اس پر تنقید اس کے دور کے حالات کو سامنے رکھ کر کرنی ہوگی۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو اعتراض کی نوعیت خود ہی واضح ہو جائے گی کیونکہ ابتدائی عہد میں انسان فطرت کا شیدائی تھا اور اس کی یہ وارفتگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ جس چیز سے فائدہ یا نقصان پہنچتا اسی کو دیوتا سمجھنے لگتا تھا۔ توہمات کے بے شمار بتوں سے اس کا صنم کدہ آباد تھا لیکن تہذیب کی رفتار کے ساتھ یہ زنجیریں بھی ٹوٹ گئیں۔

یہ تو درحقیقت داستان کی ایک خصوصیت ہے کہ اس میں سسپنس (suspense) ہوتا ہے اور تشنگی کا احساس بھی، ہر موڑ پر یہی جستجو رہتی ہے اب کیا ہوگا؟ بادشاہ زادی کی شرط پوری بھی ہو سکے گی یا نہیں، وہاں تو بھوت پریت رہتے ہیں، نجات کا پہرہ ہے پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یا تو الہ دین کا چراغ مل جاتا ہے یا انگشتری سلیمانی یا اور کوئی ماورائی تدبیر نکل آتی ہے۔

آج کل کی فلموں میں تو سسپنس ہی سب کچھ بن گیا ہے۔ ناولوں میں بھی دلچسپی کا سبب بن جاتا ہے اور مختصر افسانہ میں افسانہ نگار اسی کے سہارے ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتا ہے۔

بہرحال اب تک کی تحقیق کے مطابق "بوستان خیال" ہی کو پہلی داستان مانا گیا ہے جو "دیار عظیم" کے بقول محمد شاہ رنگیلے کے دور میں لکھی گئی اس کا مصنف محمد تقی خیال (۱۷۷۲ء) ہے جو گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آکر مقیم ہوا۔ اس کی جائے اقامت کے قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا جس میں داستان گوئی ہوا کرتی تھی اور داستان گو دوسروں کے قصوں کو اپنی طرف منسوب کر کے بڑے فخر سے سنایا کرتے تھے۔ خیال نے قہوہ خانہ کی گفتگو کا مفصل حال لکھا ہے، ایک روز خیال نے بھی دوستوں کے اصرار پر ایک قصہ کی تمہید لکھ کر اس محفل میں سنائی جس کے سننے والوں نے خاطر خواہ داد دی اور ہر طرف اس کی داستان گوئی کا چرچا ہو نکلا۔ اس نے نواب رشید الدین خاں بہادر کی فرمائش پر "بوستان خیال" باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔

اردو کی بیشتر داستانیں انیسویں صدی میں لکھی گئی ہیں نثر میں سب سے پہلے داستان تحسین کی "نوطرز مرصع" کو بھی بتایا جاتا ہے جو ۱۷۷۵ء اور ۱۷۸۱ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس کے بعد پھر ان قصوں کا دور آتا ہے جو "فورٹ ولیم کالج" کے زیر اثر لکھے گئے، جن میں "باغ و بہار"، "آرائش محفل"، "طوطا کہانی"، اشک کی داستان (امیر حمزہ) اور سنگھاسن بتیسی وغیرہ ہیں۔

۱۸۲۴ء میں سرور کی فسانۂ عجائب لکھی گئی پھر گلزار سرور، شگوفۂ محبت اور "شرر عشق" لکھی گئیں۔

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب دو مختلف مکاتب فکر کا نظریاتی اور لسانیاتی تصادم ہے جس کے پس منظر میں لکھنؤ اور دہلی کی دو تہذیبوں کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ اول الذکر کتاب میر امن دہلوی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو ۱۸۰۱ء کے آس پاس میں تالیف ہوئی۔ یہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ خود مؤلف کے بیان کے مطابق میر خسرو کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن مولوی عبدالحق نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی

ہیں کہ یہ تحسین کی "نوطرز مرصع" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی جیسا کہ کئی
جگہ کی عبارت میں مماثلت سے ظاہر ہوتا ہے۔
"فسانۂ عجائب" کو باغ و بہار کے خلاف ایک
ردعمل سمجھنا چاہیے جس سے دل کا غبار نکالنے کی کوشش کی گئی ہے
اور باغ و بہار سے تقریباً چوبیس برس بعد میں لکھی گئی ہے اس
کو طبع زاد بتایا جاتا ہے۔
ان دونوں اہم کتابوں کے مابین وجہ نزاع صرف یہ بتائی جاتی
ہے کہ میر امن نے باغ و بہار میں تعلّی سے کام لے کر دہلی کی زبان کو
کیوں ترجیح دی۔ حالانکہ بہ نظر انصاف اگر دیکھا جائے تو یہ عبارت اتنی
معتوب نہیں جتنی سرور اور ان کے احباب نے سمجھ لی ہے:
"سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک
بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے، میں کہیں اور تم کہیں ہو کر جہاں
جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے، جس ملک میں پہنچے وہاں
کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور
بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور
رہے۔ وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں
گے اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس
پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے
اور میلے ٹھیلے، عرس چھڑیاں، سیر تماشہ اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت
تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں
رکھا ہوگا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی اس شہر کی سیر
کرتا اور تماشہ دیکھتا یہاں تک پہنچا ہے۔"
یہ ہے وہ عبارت جس پر سرور اور اس کے ہم نوا چراغ پا ہو گئے
اور ردعمل کے طور پر فسانۂ عجائب لکھ ڈالی، اور پھر اعتراض
اور جواب اعتراض کا سلسلہ ہو گیا۔ میر امن کے عقیدت مندوں نے
"سروشِ سخن" سے فسانۂ عجائب کا جواب دیا تو اس
کا جواب "طلسمِ حیرت" سے دیا گیا۔
باغ و بہار اور فسانۂ عجائب میں بنیادی فرق یہ
ہے کہ باغ و بہار کی تالیف کا مقصد جتنا اہم اور اعلیٰ ہے
اتنا فسانۂ عجائب کا نہیں۔ میر امن نے اس لیے یہ کتاب لکھی کہ اردو
کو فروغ ہو اور اسے آسان سمجھ کر لوگ زیادہ فیض یاب ہوں گے اور کم
پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی یہ مفید ہوگی چنانچہ خود لکھا ہے:
"اب خداوند نعمت صاحب نخوت نجیبوں کے قدر دان جان
گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک
گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی
گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے،
خاص و عام آپس میں بولتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے
میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا
ہے۔"
اب ذرا فسانۂ عجائب کا مقصد تصنیف بھی ملاحظہ فرمائیے لکھتے
ہیں:
"آخر الامر بمقتضائے عادت تلاش معاش کے حیلے میں فلک
تفرقہ پرداز گردوں عربدہ ساز نے صورت مفارقت کی دکھائی،
مہاجرت استقبال کو آئی۔"
آگے چل کر اصل مقصد کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:
"اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر
لائے یا اس فسانہ کو بہ نظر ثانی کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہان آباد
کہ مسکن اہل زبان بیت السلطنت ہندوستان کبھی تھا وہاں چند
بود و باش کرتا اور فصیحوں کو تلاش تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن
صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے
دہن کے حصّہ میں یہ زبان آئی۔ دلّی کے روڑے ہیں پر محاوروں
کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی عقل پر یہی خیال انسان
کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ
کب سزاوار ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار
ہے، مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ وہی مثل سننے میں
آئی کہ اپنے منہ سے دھنا بائی۔"
اس پورے اقتباس کو پڑھنے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ
اس فسانہ کا مقصد سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ

بسیار کوشش کے بعد بھی قبولیت عوام کا جو اعزاز باغ و بہار کو حاصل تھا اسے نہ ہو سکا بلکہ تصنیف سے پہلے سرور کے احباب نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا وہ بھی پورا ہو گیا :

"فقط ہماری خوشی مد نظر رکھ جیسا رطب و یابس کہے گا ہمیں پسند آئے گا بشرطیکہ جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیٔ عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔"

اگرچہ سرور اپنے متعلق خود یہ لکھتے ہیں :

"نیازمند کو اس تحریر سے نمود نظم و نثر، جودتِ طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربی، فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اُسے دُور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا رہنے دیا۔"

ان کی اس کتر بیونت کے بعد بھی مشکل الفاظ کی اتنی بھرمار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قاری پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں اسی لیے غالب کو کہنا پڑا "وہ تو بھٹیارخانہ ہے۔" اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔" ساری کتاب میں تنبول بالائی اور بقال، حلوائی ہی آپ کو نظر آئیں گے جب کسی جگہ کا ذکر ہو رہا ہو تو اس کی صفات کے بیان کرنے میں استنے محو ہو جاتے ہیں کہ اصل مسئلہ کا بہت دیر میں جا کے خیال آتا ہے۔ غیر ضروری الفاظ کی ٹھونسا ٹھانس ہر جگہ ملے گی۔ بھرتی کے الفاظ صرف تک بندی کے لیے لائے گئے ہیں۔ سرزمین ختن کا ذکر یوں کرتے ہیں :

"سرزمین ختن میں ایک شہر تھا، مینو سواد، بہشت نژاد، پسند خاطر محبوبانِ جہاں، قابل بود و باش خوباں زماں، شمیم صفت، اس کی معطر کن دماغ جاں، مسکن الکتاب قلب واقع خفقان، زمین اس کی رشک چرخ بریں رفعت و شان چشمک زن بلندی، فلک ہفتمیں، گلی کوچہ خجلت دہ گلشن آبادی گلزار بساں تختہ اچمن بازار ہر ایک بے آزار مصفا ہموار۔"

اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ ایک خوب صورت شہر تھا۔

ایسی ہی ایک جگہ باغ و بہار کی عبارت یہ ہے "آگے روم کے ملک میں کوئی بادشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی" کتنی سادی زبان اور مختصر الفاظ میں وہ بات کہہ دی جو سرور چار پانچ سطور میں کہہ پاے۔ اسی لیے پروفیسر کلیم الدین جیسے نقاد کو بھی اعتراف کرنا پڑا "باغ و بہار کی سادگی سپاٹ نہیں اس میں ناگوار نیرنگی نہیں اور یہاں سادگی و پرکاری بیک وقت جمع ہیں میر امن کی عبارت میں ایک خاص آہنگ ہے اور اس کے جملوں میں ساخت، ترتیب اور حرکت کی باریکی تناسب اور جاذبیت ہے۔" اسی لیے پڑھنے والا تھکتا نہیں بلکہ یہ ہلکی پھلکی عبارت اس کے لیے شراب دو آتشہ بن جاتی ہے، اس کے برعکس فسانۂ عجائب میں قدم قدم پر تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے اور قاری جلد ہی اس کی بوجھل عبارت سے اُوب جاتا ہے۔ وقار عظیم نے لکھا ہے :

"میر امن کی سادگی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر کسی جگہ اکتاہٹ یا تھکاوٹ کا بوجھ نہیں ڈالتی، میر امن کو زبان و بیان پر جو قدرت ہے اور ان کے تصرف میں الفاظ کا جو سرمایہ ہے وہ بات میں تکرار نہیں پیدا ہونے دیتا اور نہ اُسے خشک اور بے مزا بناتا ہے۔"

میر امن کی سادگی کا کمال اور عمومیت کا کرشمہ یہ ہے کہ ایک توازن برقرار رکھتے ہیں اور تہذیبی سطح سے ذرا بھی نیچے نہیں اترتے اور اپنی سادہ عبارت میں ابتذال کی بو تک بھی نہیں آنے دیتے۔ ان کے قصہ کو کہیں سے بھی پڑھ لیجیے عبارت یکساں نظر آئے گی۔

فسانۂ عجائب اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں وہ یکسانیت نہیں "کہیں تو زبان طرازی کی ایسی حد کر دی کہ حافظ، رومی اور جامی کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں" لیکن یہ زور زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا جب الفاظ کا ترکش خالی ہو جاتا ہے تو پھر جاسوسی ناول سے بھی زیادہ خشکی آجاتی ہے ایک طرف تو یہ غلغلہ ؛

"گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگان فسانۂ کہن یعنی محرران رنگین تحریر و مورخاں جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو

میدانِ وسعت بیان میں باکرشمۂ سحرساز و لطیفہائے حیرت پرداز
گرم عنان و جولاں یوں کیا ہے ؟"

یہ طمطراق ہر جگہ نہیں ہے ایک جگہ اتنی سطحیت آگئی ہے :

"اب روز چڑیمار کی ترقی ہونے لگی تھوڑے دنوں میں گھربار
کپڑا لتّا گہنا پاتا سب درست ہوگیا تھا ، کوئی بڑا تاجر سرا میں اس
بھٹیاری کے گھر میں اترا جس کی دیوار تلے چڑیمار رہتا ہے ؟"

پوری باغ و بہار میں ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا جہاں میر امّن کو تشبیہ و استعارہ میں کوئی دقت اٹھانی پڑی ہو۔ جو کچھ ذہن میں آیا لکھ دیا۔

"ایک روز طاق میں ایک جلد کتاب نظر آئی اُتار کر دیکھا تو سارے علم دین و دنیا کے اس میں جمع کیے تھے گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا تھا۔" اس تشبیہ کے باندھنے میں میر امّن کو کوئی تکلف نہ ہوا ہوگا۔ برخلاف اس کے فسانۂ عجائب میں جا و بیجا تشبیہات ملتی ہیں اور ایسی تشبیہات لائی گئی ہیں کہ ذوقِ سلیم پر بار گذرتی ہیں۔

یہ حقیقت ہو کہ میر امّن نے جملوں کی ترتیب اور ساخت میں نحوی و صرفی قواعد کو ملحوظ نہیں رکھا پھر بھی ایک حسن ہے۔

"سب موجود تھا لیکن فرزند کہ زندگانی کا پھل ہے۔ اس کی
قسمت کے باغ میں نہ تھا"

اگر قواعد کا خیال رکھا جائے تو یوں ہونا چاہیے کہ اس قسمت کے باغ میں فرزند جو کہ زندگانی کا پھل ہوتا ہے نہ تھا۔

لیکن قواعد کے عدم لحاظ سے جو خوب صورتی پیدا ہوگئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور پھر "کہ" کے لفظ نے کئی لفظوں کو حذف کر کے مطلب واضح کر دیا اور اختصار کا فائدہ بھی ہوگیا۔ وقار عظیم نے لکھا ہے "میر امّن معمولی باتوں سے غیر معمولی نتائج پیدا کر دیتے ہیں"
الفاظ کا برمحل استعمال بھی باغ و بہار کی ایسی خوبی ہے جو فسانۂ عجائب میں نہیں ہے۔ میر امّن لکھتے ہیں :

"جس طرح اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی
دونوں کے پرزے پرزے کروں۔ تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو نہیں
تو اس غصّہ کی آگ میں پھُنک رہی ہوں آخر جل کر بھوبھل
ہو جاؤں گی۔"

پھُنک اور بھوبھل دونوں لفظ صرف اہل زبان ہی استعمال کر سکتا ہے اور بھوبھل کا استعمال کتنا موزوں ہے۔

باغ و بہار میں ہندی الفاظ کو بھی مناسب مواقع پر استعمال کر لیا گیا ہے جیسے "پرچار" "سندر" وغیرہ جبکہ فسانۂ عجائب میں عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ لانے کی کاوش کی گئی ہے اسی طرح میر امّن نے بالکل گفتگو کا سا انداز اختیار کیا ہے۔ "جورو جتا" اور "ڈھونڈ ڈھانڈ" وغیرہ قسم کے مہملات جو دن رات گفتگو میں آتے ہیں لا کر طرز تحریر میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ البتہ کہیں متروکات بھی آگئے ہیں لیکن اس دور میں مروج تھے۔ اگر "کسو" "یاتلک" وغیرہ چند الفاظ کو نکال دیا جائے تو باغ و بہار اسی دور کی تصنیف معلوم ہوگی۔

سرور نے وہی پرانا طریقہ اپنایا ہے جو اس زمانہ میں بھی معیوب تھا اور پرشکوہ الفاظ کا سہارا لیا جس سے وہ عوام سے دور ہوگئے واقعہ یہ ہے کہ "داستان" کا تعلق پڑھنے سے زیادہ سننے سے ہوتا ہے اور سننے والا اتنی غیر ضروری طوالت کو گوارہ نہیں کر سکتا۔

تعجب ہے کہ عزیز احمد کو اس میں ناول کے خدوخال کیسے نظر آگئے ؟ کیا ناول میں اتنی ادق زبان استعمال کی جاتی ہے۔ داستان گو کو جن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے سرور میں وہ مفقود ہیں۔ نرمی، توازن اور ٹھہراؤ، البتہ باغ و بہار میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فسانۂ عجائب میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ اس میں معاشرتی فضا پوری طرح جلوہ گر ہے :

"برات کا احوال سنو، دیوان خاص سے دلہن کا مکان پانچ کوس
تھا دونوں طرف بلّور کا جھاڑ آدمی کے قد سے دو چند، سو سو تیر
پانچ چھ گز کے فاصلہ سے روشن اور دس گز جدا، نقرئی طلائی
جلتا ان سے کچھ دور، ہزاروں مزدور ٹھاٹھروں پر روشنی کرتے
جھاڑ رشک سرو خانہ جابجا ترپولئے اور نوبت خانے بنے، کتھک
اتھک اس پر ناچتے، نوبت بجتی منرق شامیانے تنے، اس کے
قریب آتش بازی گڑی، روشنی یہ روشن تھی کہ چیونٹی سوار کو پہچیت

صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد ۱۳؍مارچ ۱۹۷۶ء کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے
جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر خطاب کرتے ہوئے

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۱۳؍مارچ ۱۹۷۶ء کو بھدوہی (وارانسی) میں اونی قالین
کے لیے دھاگے کی کتائی مل کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں

گورنر اتر پردیش شری ایم۔ چنا ریڈی ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کو ۳،۷۷،۴۴ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہونے والی لکھنؤ کچہری کی نئی عمارت (پہلی منزل) کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کو ۲ مارچ ۱۹۷۶ء کو بریلی نگر پالیکا کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ تصویر میں وزیر اعلا نگر پالیکا کے چیرمین سے سپاسنامہ قبول کر رہے ہیں

وزیر اعلا اتر پردیش ۱۷ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنی جائے رہائش پر زندگی بیمہ کارپوریشن کے سینیر ڈویژنل منیجر شری ایم۔ کلیان رمن سے ۵ لاکھ روپیہ کا چیک قبول کر رہے ہیں۔ کارپوریشن نے یہ رقم خصوصی سیلاب امدادی قرض کی شکل میں ریاستی حکومت کو دی ہے

ودھان سبھا کے اسپیکر شری واسدیو سنگھ ۲۵ مارچ ۱۹۷۶ء کو تلک ہال ودھان بھون میں
سچیوالیہ ہندی پریشد کے زیر اہتمام منعقدہ ہولی ملن کی تقریب میں تقریر کر رہے ہیں

چھوٹی صنعتوں کی وزیر بیگم محسنہ قدوائی ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو جم خانہ کلب
قیصر باغ لکھنؤ میں کرلوسکر نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے

یوتھ لیڈر شری سنجے گاندھی سئی ندی پر نو تعمیر پل کا افتتاح کر رہے ہیں

وزیر تعمیرات عامہ شری بلدیو سنگھ آریہ نے ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو تلسی پور (ضلع گونڈہ) میں
۱۱۶ کیلو میٹر لمبے بھابھر پل کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

مفصل معلوم ہوتی تھی "

اسی بات کو میر امّن کی زبان سے سنئے :

" دروازے پر دھوم دھام ہو رہی تھی، گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یساول عصابردار کھڑے ہیں، دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جابجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں، پان دان، گلاب دان، عطردان، پیک دان، نرگس دان قرینے سے لگی ہیں، طاقوں میں رنگترے، کنولے، نارنگیاں، اور گلابیاں رنگ برنگ چنی ہیں "

باغ و بہار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں کرداروں کی مصوری میں جس چیز سے سب سے زیادہ مدد لی گئی ہے وہ زبان ہے ہر کردار کے موافق حال تصویر کشی کی گئی ہے :

" الٰہی تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے، میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں دردزہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کو ادھی کا تیل جلاؤں، کھانے پینے کو کہاں سے لاؤں، اگر مر گئی تو گور و کفن کیوں کر کروں گی اور جنے تو دائی جنائی کو کیا دوں گی "

میر امّن نے جو کردار پیش کیا اس کے الفاظ سے خیالات، احساسات اور مزاج صاف جھلکتا ہے۔ باغ و بہار میں اشعار بھی فسانۂ عجائب کے مقابلہ میں کم ہی استعمال کیے گئے ہیں، لیکن جو ہیں وہ برمحل ہیں۔ کہتے ہیں " سچ ہے اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں وہ قصائی ہے " اس کے بعد ایک شعر ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

فسانۂ عجائب کے اشعار اتنے موزوں اور جان دار نہیں ہیں اشعار سے زیادہ زور خود ان جملوں میں ہے جن کی تائید اور رنگ آرائی کے لیے اشعار لائے گئے۔ ان اشعار کو بڑھ چڑھ کر ایک تاثر یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سرور کو اپنے اشعار سنانے کا زیادہ شوق ہے۔ جب جانِ عالم مہر نگار سے رخصت ہو کر انجمن آرا کی تلاش میں جاتا ہے تو ملکہ بحر غم میں ڈوب جاتی ہے وہاں پر سرور کے ایک شعر کے بعد اپنے دو شعر دے مارے ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین نے فسانۂ عجائب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

" مصنف نے روح کو نہیں جسم کو اہم سمجھا ہے اور گویا کسی حسین لیکن بے جان مجسمہ کو زرق برق لباس اور رنگین چمکیلے اور قیمتی زیورات سے سجایا ہے۔ فسانۂ عجائب کی عبارت نہایت مرصع اور پُر تکلف ہے۔ داستان امیر حمزہ میں بھی جابجا اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں لیکن جس انہماک سے اس مصنوعی طرز کو فسانۂ عجائب میں شروع سے آخر تک برتا گیا ہے اس کی مثال اردو میں بہت کم ملے گی "

جہاں تک مقامی رنگ کا تعلق ہے وہ دونوں کتابوں میں ہے۔ دونوں نے ہندستان ہی کی فضا میں یہ کتابیں لکھیں اور کامیاب رہے۔ باغ و بہار میں اگرچہ قصہ روم کا ہے لیکن فضا ہندستانی ہے۔ مولوی عبدالحق نے باغ و بہار کے بارے میں لکھا ہے :

" اپنے وقت کی نہایت فصیح و سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی "

درحقیقت یہی وہ کتاب ہے جس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ آئندہ اردو کو کیا ہونا ہے۔ جو راہ باغ و بہار نے دکھائی سرسید اور حالی نے اس کو ہموار کیا اور آج یہی شاہراہ عوام و خواص بنی ہوئی ہے۔ لیکن " فسانۂ عجائب کا دامن باغ و بہار کے دامن کے ساتھ کچھ اس طرح بندھا ہوا ہے کہ باغ و بہار کا نام ذہن میں آتے ہی فسانۂ عجائب کا تصور خود بخود سامنے آجاتا ہے "۔ یہ دونوں کتابیں بہت اہم ہیں اگر ایک نے اردو کو عام فہم بنایا تو دوسری نے نئی تشبیہات اور الفاظ سے مالا مال کیا۔

★

مہدی پرتاپگڑھی

معجزہ

رگِ حیات میں فاسد لہو کے بہنے سے
شعور و فکر کی سب قوتیں ہوئیں مفلوج
ہر آن ملنے لگا پھر مذاقِ شر کو عروج

کچھ اس طرح سے چلیں مفسدوں کی تحریکیں
رگوں میں زیست کی پھیلا تمام زہر ہی زہر
ہر ایک سمت تھا تقریبِ حادثات کا قہر

تھے انحطاط پذیر اس طرح سے جاہل ذہن
کہ آفتاب کو مٹھی میں بند کرنے چلے
شکستہ جام میں آبِ حیات بھرنے چلے

شبِ سیہ کے پرستار، ظلمتوں کے امام
رخِ حیات پہ پھیلا رہے تھے موت کا رنگ
مگر خود ان کی ہی قسمت پہ لگ رہا تھا زنگ

دیارِ دانش و حکمت کچھ اس ادا سے کھلا
کہ سوچ بھی نہ سکے جس کو ظلمتوں کے نقیب
انھیں ڈبو گئی، ان کے ہی ذہن کی تخریب

وطن فروشوں کی سازش نہ کامیاب ہوئی
امینِ عظمتِ بھارت ہیں اندرا گاندھی
کہ ان کا دستِ حنائی ہے دستِ فولادی

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا

غزل

زخم کے پھول بصد ناز کھلائے رکھیے
رشکِ گلشن یونہی سینے کو بنائے رکھیے

کیا خبر خانۂ دل میں کوئی کب آ جائے
اس کو ہر وقت سلیقے سے سجائے رکھیے

آتی جاتی ہوئی سانسوں کو بڑے چاؤ کے ساتھ
یادِ محبوب کی خوشبو سے بسائے رکھیے

گھُپ اندھیرا سا ہے چھایا ہوا جیون پتھ پر
دیکھیے پیار کی قندیل جلائے رکھیے

لگ نہ جائے اسے بیدرد زمانے کی نظر
خوشنما غم جو ملے اس کو چھپائے رکھیے

لطفِ ہستی کی حقیقت میں تمنا ہے تو پھر
روح کو غم کی صلیبوں پہ چڑھائے رکھیے

بزمِ ساقی کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
جام خالی بھی ہونٹوں سے لگائے رکھیے

لب ہلانے سے دعاؤں کا بھرم کھلتا ہے
مانگنا ہے تو فقط ہاتھ اٹھائے رکھیے

آندھیاں لاکھ چلیں راہِ طلب میں منشا
عزمِ محکم سے قدم اپنے جمائے رکھیے

مزاحیہ

استادِ محترم

عزیز مراد آبادی

سائنس کا یہ اصول ہے کہ جتنے زیادہ ٹکڑوں میں منقسم کیا جائے ان کی قوت اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اسی زرّیں اصول کے تحت ایٹم بم کی ولادت سعید ہوئی جس نے اپنی طاقت کا تاریخی مظاہرہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے حسین طول و عرض میں کیا تھا۔ اب تو اس سائنسی اصول کی صداقت کے ثبوت کے لیے ہائیڈروجن بم بھی پیش کیا جا سکتا ہے ـــــ شاید اسی اصول کی نقل کر کے اردو ادب نے بھی ادبی اصول وضع کر لیا ہے۔ اردو جیسے مہتاب و آفتاب نما ذرہ کو روز بروز ٹکڑوں میں منقسم کر کے اردو شاعری کی طاقت کو مزید تقویت پہنچائی جا رہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی طرح شعرائے کرام بھی عالمِ وجود میں آ رہے ہیں۔ یہ اصولی عمل پچھلی ربع صدی سے انتہائی لگن اور خلوص کے ساتھ جاری و ساری ہے ـــ سائنسی اور ادبی اصول میں فرق صرف اتنا سا ہے کہ ایٹم بموں کی تعداد کے مقابلے میں شاعر کئی صد گنا پروڈیوس ہو رہے ہیں۔ شاعروں کے ایک سیلاب میں ہم بھی اوندھے منھ گر کر ایک بار بڑی آن بان کے ساتھ بہہ نکلے تھے۔

اگر ہمیں ایک استاد نما شاعر سہارا نہ دیتے تو بہت ممکن تھا اس تنکے کے سہارے کی عدم موجودگی میں ہم غرقابِ شاعری ہو کر اپنا ادبی تشخص ہمیشہ کے لیے ڈبو بیٹھتے اور شاعری کا بھوت ہمارے سر پر منڈلاتا۔ مگر جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو اس کے بھاگنے پر کوئی پابندی کیوں عائد کرے!؟ ہمارے استاد نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم ان کی طرف دوڑ پڑے۔ انھوں نے ہماری چند ابتدائی غزلوں پر حق اصلاح جتا کر وہ غزلیں اپنی تحویل میں لے لیں اور جلد ہی اصلاح کے بعد سپردِ خاک کر دیں۔ ہم نے ان کی ہدایات کے مطابق ان مسخ شدہ غزلوں کو کئی کئی بار ترنم کے ساتھ پڑھا، یہاں تک کہ وہ ہمیں ازبر ہو گئیں۔ اس طرح ہم چند گھنٹوں کے خون پسینے کے بعد مستند شاعر بن بیٹھے۔ استاد نے جب اپنے شاگردِ رشید میں بے پناہ صلاحیتوں کا طوفان امنڈتا دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا اور ہمارے اعزاز میں ایک عدد خصوصی نشست کا اہتمام اپنے ہی دولتکدہ پر فرما لیا جس کا سارا بار از روئے اردو قانون، ہماری خمیدہ کمر پر لاد دیا گیا تھا۔ ہم بھی اس بھاری بھر کم بوجھ سے "چیں" اس لیے نہیں بولے تھے کہ نئے ذوق اور نئی بیوی کے حضور جان تک قربان کر دینے کا ولولہ دل میں موجزن رہتا ہے ـــ لیکن نشست کے اختتام پر، سامعین و شعرا ایں جناب کو بحیثیت شاعر جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں البتہ ہمارے استادِ محترم کو بحیثیت استاد ضرور جان گئے تھے۔ استاد کو ہماری پبلسٹی کرنے سے اس قدر فائدہ تو ضرور پہنچا تھا کہ کئی ایرے غیرے کاسۂ شاگردی لے کر ان کی خدمت میں جلد ہی حاضر ہو گئے تھے، جس سے ان کا مرتبہ استاد الشعرا تک اوپر اٹھ گیا تھا اور ان کی اہمیت و حیثیت گلی کوچوں میں شہرت کے کاندھوں پر سوار ہو کر گشت کرنے لگی تھی۔ اس گشتی اہمیت کے حامل استاد نے ہمیں سیدھے بھولے کا جاہل خیال کر کے فنِ شاعری کے ایسے ایسے نکات و رموز سے آگاہ کیا کہ ہم اپنی عقل کے سارے گھوڑے کھولنے کے باوجود بھی انھیں انگیز نہ کر سکے اور نتیجتاً ایک سوال معمہ کا روپ دھار کر ہمارے اور

استاد کے درمیان دیوارِ چین بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ استاد محترم شاعری کے خود ساختہ اصولوں پر اڑے ہوئے تھے یا فن شاعری سے ہماری ہی طرح کورے تھے؟ اور معمہ یہ تھا کہ ہم استاد کی نظر میں کہیں ناقص العقل اور گاؤدی قسم کے شاعر تو نہیں تھے؟ —— یہ مکروہ دیوار اس وقت زیرِ تعمیر آئی تھی جب ہم نے کئی بار استاد سے شاعری کی باریک باتوں کا تسلی بخش جواب پانے کا مطالبہ کیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم بھی نرے جاہل تو تھے نہیں کہ ان کی اوٹ پٹانگ علمی و فنی معلومات کو بھی ہاضمے کا چورن سمجھ کر چاٹتے رہتے۔ ہمیں جس گھڑی جس جگہ کوئی الجھن محسوس ہوتی تو ہم سرگرمِ شعر گوئی ذہن کو تسکین بہم پہنچانے کی درخواست کرتے اور ہمارے استاد محترم دو چار اِدھر اُدھر کی غیر ضروری باتیں کر کے ٹائیں ٹائیں کرنے لگتے —— اس غیر یقینی صورت حال سے ہمیں سخت مایوسی ہوئی اور ہماری نئی نویلی شاعری کو عظیم دھکا لگا۔ کامیابی و کامرانی بحرِ شعر کے ساحل پر کھڑے ہو کر ہمیں منہ چڑھانے لگی۔ اس نازک صورت حال کے باوجود بھی ہم نے از روئے احترام استاد سے نگاہ نہ پھیری اور خالی مولی استاد شاگردی کا چکر چلنے دیا۔ لیکن ہمارے استاد تاڑنے کے معاملے میں قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ ہماری نالائقی کو فوراً سونگھ لیا اور اپنی خصوصی توجہ ہماری بے سر و پا شاعری سے ہٹا کر ایرا غیرا کی شاعری پر مرکوز کر دی اور ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے منوں بوجھ ہمارے ذہن پر سے ہٹا دیا گیا ہو۔ اس حادثہ کے بعد ہماری طبیعت کا رجحان پھر سے نثر نگاری کی طرف ہو گیا تھا جو فطری طور پر ہمارا مزاج تھا اور ہم پھر سے میدانِ نثر میں قلمی گھوڑے دوڑانے لگے تھے۔ ہمارے استاد جب بھی ہماری کوئی نثری تخلیق کسی رسالے میں دیکھتے تو نفرت سے یوں منہ پھیر لیتے جیسے کسی پاگل اور گندی لڑکی کو برہنہ دیکھ لیا ہو! بقول معتبر راوی انھوں نے بارہا ہماری نثری تخلیقات کو "واہیات" کے ٹائیٹل سے بھی نوازا تھا۔ مختصر یہ کہ ہم نااہل شاعر اور ناقدرے شاگرد ہونے کی وجہ سے استاد محترم کے تیزابی غصے سے کہاں تک بچتے!؟ پھر بھی ان کی بھلمنساہٹ، بردباری، انکساری، استقلال اور خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ ہم سے ہمیشہ بحیثیت رفیق و شفیق استاد کے ہی ملا کرتے تھے اور استادانہ عظمت کا احساس دلانے کے لیے کبھی کبھار ہم سے پوچھ بھی لیا کرتے تھے "کہو بھئی! کوئی نئی چیز نکالی کہ نہیں؟" ہم جواباً سفید براق جھوٹ اگل دیتے "جی ہاں! ایک تازہ غزل مجلت میں نکل آئی تھی جو نکلتے ہی سیدھی ایک رسالے کے دفتر میں پہنچ گئی ہے۔"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ! ذرا سناؤ تو کچھ شعر؟" وہ خندہ پیشانی کے ساتھ فرماتے۔

"لفظ بہ لفظ، بحر بہ بحر اور ردیف بہ ردیف تو پورے یقین کے ساتھ یاد نہیں رہے ہیں البتہ اس وقت کچھ دھندلا سا عکس ذہن کے گوشے میں محفوظ ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو عرض کروں؟" ہم بے جا کسرِ نفسی سے شرما کر پھر جھوٹ کا بول بالا اور سچ کا منہ کالا کرتے۔

"ارے بھائی! چاول کا ایک دانہ دیکھ کر پکنے نہ پکنے یا گلنے نہ گلنے کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ تو پتہ چل ہی جائے گا کہ کس قدر فکر کی بلندی کو چھو کر اشعار نکالے گئے ہیں!" وہ استادانہ وقار اور ٹھسّے کے ساتھ فرماتے۔

"تو عرض ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ....." "کہہ کر ہم کہیں کا اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" ہو کر ان کی خدمت اقدس میں پیش کر دیتے۔ ہماری اس نازیبا حرکت کی وجہ سے وہ مکمل شعر پر تو نہیں البتہ شعر میں شامل ایک دو الفاظ پر ضرور بھڑک اٹھتے تھے۔ اس انداز دلیرانہ سے بھڑک اٹھنے کی وجہ بھی ظاہر ہے، نہایت ہی معقول تھی۔ بھڑکنے کے بعد جب ذرا پرسکون ہوتے متانت کا غازہ چہرۂ پر نور پر مل کر ارشاد فرماتے ——

"اصلاح کے بغیر غزل کسی رسالے کو بھیجنا اچھی بات نہیں ہے۔ اپنی ساکھ خراب کرنا ہے۔ ذرا سی غلطی سارے کیے دھرے پر جھاڑو پھیر دیتی ہے۔"

"استاد! میں نے عرض کیا کہ غزل عجلت میں وارد ہوئی تھی۔ اگر اطمینان و یکسوئی کے عالم میں عالمِ وجود میں لائی جاتی تو یقیناً آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ مجبوری کے آگے تو رستم کی بھی نہ چلی تھی جس نے اپنے بیٹے سہراب کو اپنے ہی ہاتھوں سے تہہ تیغ کر ڈالا تھا۔" ہم اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ہلکا سا مذاق فرماتے تو وہ چیں

بے جیں ہو کر صرف اتنا کہتے اور خاموش ہو جاتے "ارے! ہمارا کام تو تمھاری رہنمائی کرنا ہے۔ سیدھی راہ چلو یا نہ چلو یہ تمھارے اختیار میں ہے۔ ہاں، استاد دھیان رکھتا کہ شاگرد کی بدنامی کے ساتھ استاد کی پگڑی نہ اچھلنے پائے!"

ایک دن اچانک خلاف توقع استاد محترم کا نوکر ہماری خدمت میں نازل ہوا اور منجانب استاد مذکور ڈنر (DINNER) پر مدعو کیا گیا۔ اس طرح کی غیر ضروری دعوت کا ہمارے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ ہم نے کان بہت کھڑے کیے۔ دعوت کی اہمیت و ضرورت کو ہر پہلو سے دیکھا، غور کیا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ استاد نے کوئی معرکتہ الآرا غزل وغیرہ کہہ ڈالی ہوگی جسے سننے کے لیے کوئی معقول یا نامعقول سامع میسر نہ آیا ہوگا۔ جی میں تو ہمارے آیا تھا کہ سمع خراشی سے بچنے کے لیے گول کر جائیں دعوت کو! لیکن معاملہ دعوت کا تھا یعنی مرغن غذاؤں سے پیٹ بھرنے کا! اور ظاہر ہے پیٹ بھرنے کے لیے سارا کارخانۂ حیات سرگرم عمل ہے۔ پیٹ کا مسئلہ نہ رہے تو دنیا کی ساری رونقیں ایک دم بجھ کر رہ جائیں گی۔ اس عالمگیر حقیقت کے رعب میں آکر ہم نے دعوت اڑانے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور یوں بھی استاد کی دعوت شاگرد اڑائے۔ بلّی کے بھاگوں آج کل چھیکے بھی شاذ و نادر ہی ٹوٹتے ہیں۔

اپنی خاطر تواضع کرانے کے بعد ہم نے کھانے کے لذیذ آئیٹم کی بلا امتیاز، ضرورت سے کچھ ہی زیادہ تعریف کی ورنہ کھانا جیسا تھا اسے ہماری قوتِ ذائقہ خوب جانتی ہے ۔۔۔! تعریف و توصیف کے بعد جواباً استاد نے ہمارا شکریہ رسماً مخصوص انداز میں اس طرح ادا کیا جیسے ہم نے ان کی غزل کو سراہا ہو! بعد از رسم و رواج کام کی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

"بھئی! ماشاء اللہ خوب لکھ رہے ہیں آج کل تو! ایک ہفتہ قبل تمھاری غزل بھی کسی پرچے میں نظر سے گزری تھی جس میں کلام کی پختگی، فکر کی بلندی اور اسلوب کی شستگی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ نثر نگاری میں تو لگتا ہے برسوں ثانی نہ پیدا ہو سکے گا تمھارا! مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرا کوئی تو شاگرد ہے جو ترقی کی بلندیوں پر بے تکان چڑھتا چلا جا رہا ہے . . . . . !" لیکن حقیقت یہ تھی کہ چند نثری تخلیقات کے علاوہ ہماری ایک بھی معیاری یا غیر معیاری غزل مہینوں سے شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے دل ہی دل میں قہقہہ لگاتے ہوئے منکسر المزاجی کے ساتھ عرض کیا۔

"قبلہ! یہ سب آپ کے فیوض کی برکات ہیں ورنہ خاکسار کو تو شعر پڑھنا تک نہیں آتا۔ رہا نثر نگاری کا معاملہ تو اس میدان میں میں نے قدرت کے آگے زانوے ادب تہہ کیے ہیں ۔۔۔ میں نے بھی حال ہی میں آپ کے کلام کے نادر نمونے دیکھے ہیں جو سبھی لاجواب و لافانی ہیں . . . !" ہم نے بھی کورا جھوٹ ارشاد کیا ۔۔۔ ترکی بہ ترکی جھوٹ بولنے میں مضائقہ بھی کیا تھا!

"اور سناؤ! ادبی مشغولیات کا کیا حال ہے؟ اب تو بہت سے رسالوں سے راہ و رسم ہو گئی ہوگی!" انھوں نے یونہی پوچھ لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو بات چیت کو آگے بڑھانے کے لیے چاہیئے تھا۔

"آپ کی دعا سے اچھی خاصی جان پہچان سی ہو گئی ہے!" ہم نے سچ بولنے کی ذرا سی کوشش کی، اور ایسے سانچ کو آنچ ہی کب آتی ہے جس میں متکلم کی شان بڑھتی ہو!

"خوب، بہت خوب! میں نے حال ہی میں مختصر طور پر اپنی سوانح حیات اور خصوصیات کلام کو لے کر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ چاہتا ہوں تمھارے نام سے شائع ہو جائے۔ اس طرح تمھاری شہرت و اہمیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ لوگ تمھیں مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی جان لیں گے۔ کیا رکھا ہے بھلا افسانہ نویسی اور مزاح نگاری میں!؟ ارے، مقالہ نگار بنو تا کہ کسی بھی شخصیت پر بے جھجک قلم اٹھا سکو اور نام کما سکو . . . !" استاد محترم نے دعوت کی غرض و غایت پر بھرپور روشنی ڈالی تو ہمارے ذہن میں شعلے سے لپک اٹھے۔ دل چاہا کہ اپنے حلق میں انگلی ڈال کر سارا کھایا پیا اگل دیں، لیکن ہماری سعادت مندی کے جذبے نے ہمیں اس کارروائی سے باز رکھا۔ لہٰذا ہم نے احتراماً "ہاں" کہہ دیا۔ سنتے آئے ہیں کہ استاد کا درجہ قطب مینار سے بھی بلند ہے۔ اس

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

مخمور سعیدی

غزل

بیتے موسم جو ساتھ لاتی ہیں
وہ ہوائیں کدھر سے آتی ہیں

سن رہا ہوں یہ آہٹیں کیسی
جو ابھرتے ہی ڈوب جاتی ہیں

گھر سے کیا سیر کے لیے نکلیں
رونقیں اب تو دل دکھاتی ہیں

دور تر تجھ سے ہو گئے تو کھلا
قربتیں فاصلہ بڑھاتی ہیں

جو امیدیں تھیں روشنی دل کی
غم کی آندھی میں بجھتی جاتی ہیں

دن نکلتا نظر نہیں آتا
اور راتیں گزرتی جاتی ہیں

آ رہی ہے گھڑی زوال کی پھر
خواہشیں دل میں سر اٹھاتی ہیں

روشنی میں بھٹکنے والوں کو
ظلمتیں راستہ دکھاتی ہیں

میری شوریدگی کا افسانہ
اس کی خاموشیاں سناتی ہیں

دل کے مرقد پہ اب بھی کچھ یادیں
حسرتوں کے دیے جلاتی ہیں

جو بھلا دیں سبھی نے اے مخمورؔ
مجھ کو باتیں وہ یاد آتی ہیں

عروج سلونوی

قدم مِلا کے چلو

وطن کو آج ضرورت ہے کیا بتا کے چلو — پکار وقت کی جمہور کو سنا کے چلو
دلوں سے جذبۂ تفریق کو مٹا کے چلو — چلو تو مشعلِ راہِ وفا جلا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

زباں پہ امن و مساوات کا فسانہ ہو — وطن کی دل میں لگن قوم کا ترانہ ہو
غرض ہر ایک سے برتاؤ دوستانہ ہو — جو ہیں غریب انھیں بھی گلے لگا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

اب اونچ نیچ کے جھگڑے نہ باقی آ نہ سکیں — جو زور دار ہیں کمزور کو دبا نہ سکیں
چراغ زیست غریبوں کے جھلملا نہ سکیں — ذرا خلوص و محبت کی لو بڑھا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

کہاں ہے اب وہ زمیندار کی زمینداری — مجال کیا جو کوئی لے کسی سے بیگاری
سب اپنے ظلم و تشدد سے ہو گئے عاری — یہ ہم نہ کہتے تھے قصرِ غرور ڈھا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

اب اپنے دیش میں قانون بن گیا ایسا — طلسم ٹوٹ گیا بے زمیں کی کھیتی کا
بس ایک ضرب نے غربت کی جڑ کو کاٹ دیا — ہر اک کو باغِ ترقی کا پھل چکھا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

کسان بن کے تمھیں کامیاب ہونا ہے — طرح طرح کی ترقی کا بیج بونا ہے
تمھارے دیش کی مٹی نہیں ہے سونا ہے — جفاکشی کی کسوٹی پہ آزما کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

یہاں بہار بھی ساقی بھی اور جام بھی ہے — نظر نواز نظاروں کا اہتمام بھی ہے
بہارِ صبح بنارس اودھ کی شام بھی ہے — وقارِ دیش کا شانِ وطن بڑھا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

پیام درسِ عمل تھا خیال باپو کا — عروجؔ لعل و جواہر ہے قول نہرو کا
قدم ملا کے چلو میں اثر ہے جادو کا — تمھیں بھی چاہیے نعرہ یہی لگا کے چلو

قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

احمد ابراهیم علوی

انگلستان میں اردو

آج ہندوستان میں اردو کے حق میں ایسے حالات ہیں کہ بڑے بڑے یاس پسند بھی کہنے لگے ہیں کہ اب اردو کے اچھے دن آگئے ہیں اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت بھی ہے۔ واقعی آج اردو کے سلسلے میں حالات جتنے سازگار ہیں اتنے گذشتہ ۲۷ برسوں میں کبھی نہیں رہے۔ لیکن اس صورتِ حال کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اب اردو صرف ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں بولی اور سمجھی جاتی بلکہ اس نے اپنی جڑیں برطانیہ، امریکا، کینیڈا اور روس تک پھیلا دی ہیں اور اب ہر جگہ اس کے شیدائی موجود ہیں۔

برطانیہ میں کچھ اس طرح اردو فروغ پا رہی ہے کہ ہندوستان میں رہنے بسنے والے افراد کے لیے اس کے بارے میں کچھ سن کر یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ کوئی بھی یہ آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوگا کہ برطانیہ میں جگہ جگہ اردو کے سائن بورڈ نظر آتے ہیں اور ان پر جلی حروف میں "حلال گوشت" یا "مرغ مسلم" یا "مغل کری" لکھا ہوا ہوتا ہے اکثر بیشتر چیزوں کے پیکٹوں پر صرف اردو ہی میں چھپا ہوا ہوتا ہے ٹریفک ہدایات کا کتابچہ اردو میں بھی ہوتا ہے۔

راقم الحروف نے عام طور سے گھروں میں استعمال کیے جانے والے گھی کے ڈبے کو ہمیشہ بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا جس پر سب کچھ اردو ہی میں چھپا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کا نام بھی اردو میں ہوتا ہے۔ اردو میں چھپے کلنڈر اور ڈائریاں بھی توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔

سات سمندر پار لندن، بریڈفورڈ، شفیلڈ، برمنگھم، نیوپورٹ، کارڈف، اور برسٹل جیسے بڑے بڑے شہروں میں اردو کے جاننے اور سمجھنے والے اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ اردو ایک طرح سے رابطے کی زبان بن گئی ہے۔ اگر لندن میں آپ کسی سے اردو میں مخاطب ہوں تو کوئی عجیب نہیں کہ آپ سے ہمکلام ہونے والا خالص انگریز آپ کو آپ سے بہتر اردو لہجے میں جواب دے۔ شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں آپ کو جا بجا اردو کے سائن بورڈ نظر آئیں گے اور اکثر لوگ "اردو" ہی بولتے ملیں گے۔ ساوتھ ہال ہیتھرو ایرپورٹ کے پشت کے علاقے کے علاوہ ویسٹ منسٹر برج، پکیڈلی یا ٹرافلگر اسکوائر پر آپ کو خصوصیت سے اردو سمجھنے والے دستیاب ہو سکتے ہیں اور یہ صرف ہندوستانی یا پاکستانی تارکین وطن نہیں ہوں گے بلکہ مقامی باشندے بھی ہوں گے۔ یہاں اردو بولنا کسرِ شان نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور دنیا میں اس کے بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

لندن یونیورسٹی میں باقاعدہ ایک اردو شعبہ ہے جس کے صدر مسٹر رالف رسل ہیں جو ہندوستان کے اردو دان طبقے کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں کیونکہ انھوں نے

درشعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ماتحت مل کر اردو میں تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا خاصا کام کیا ہے وہ ہند و پاک کی سیاحت کر چکے ہیں اور دونوں ممالک کے مقتدر اردو ادیبوں اور شاعروں سے ان کے گہرے تعلقات بھی ہیں۔ عرصہ ہوا کہ میں ان سے ملا تھا اور میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آخر لندن میں لوگ کیوں اردو پڑھتے ہیں انھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو سے بھی لوگوں کو دل چسپی ہے اور وہ اس کو اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پڑھتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ ہندستان یا پاکستان کی سیاحت کرنا چاہتے ہیں اور وہ وہاں گونگے بہرے بن کر نہیں رہنا چاہتے تیسرے یہ کہ لڑکیاں اس لیے بھی اردو پڑھتی ہیں کہ وہ ہندستانی یا پاکستانی مردوں سے شادی کرنے میں دل چسپی رکھتی ہیں۔

برطانیہ میں لندن کے علاوہ دوسری یونی ورسٹیوں میں بھی اردو تعلیم کا معقول انتظام ہے اور جہاں بھی لوگ اس کی تعلیم میں دل چسپی دکھاتے ہیں اس کا ضروری بند و بست کر دیا جاتا ہے۔

ایسے قابلِ ذکر اردو ادیبوں اور شاعروں کی بھی برطانیہ میں معقول تعداد ہے جن کو ہندستان کے رسائل میں نمایاں جگہ ملتی ہے۔ یہ لوگ لندن، بریڈ فورڈ، برمنگھم اور نیو پورٹ جیسے شہروں میں رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر تارکینِ وطن ہیں بعض بعض تو ہندستان اور دوسرے ملکوں سے ہی شہرت ساتھ لے کر آئے تھے اور بعض نے یہیں آکر ابتدا کی اور اب مقبول اور مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کے مضامین، افسانوں اور کلام کے مجموعے یہیں سے بہت ہی خوب صورت اور نفیس دیدہ زیب شائع ہوتے ہیں جو بہ آسانی فروخت ہوتے ہیں۔

بی بی سی، ٹیلی ویژن پر ہفتے میں دو بار ایشیائی تارکینِ وطن کے لیے آدھ گھنٹے کا پروگرام ہوتا ہے جسے بہت دل چسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی زبان صاف اور شستہ اردو ہوتی ہے کبھی کبھی مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ہند و پاک سے آنے والے شاعروں اور ادیبوں سے انٹرویو بھی لیا جاتا ہے اور قابلِ ذکر کتب کا تعارف کرایا جاتا ہے یا ان پر تبصرہ ہوتا ہے۔

برطانیہ سے اردو میں روزنامے، ہفت روزہ اور ماہنامے بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں جو سب کے سب فوٹو آفسیٹ کے ذریعے طبع ہوتے ہیں اور ان کا حلقۂ اثر کافی وسیع ہوتا ہے۔ ان میں روزنامہ جنگ ہفت روزہ اخبارِ وطن، ہفت روزہ ملاپ ماہنامہ پیغام وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جو لندن میں اور بڑے بڑے شہروں میں کتب فروشوں سے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ یہاں صرف چند نام دیے گئے ہیں ورنہ اس سے کہیں زیادہ اخبار و رسائل شائع ہوتے ہیں۔

برطانیہ میں بسنے والے تارکینِ وطن اپنے اپنے طور سے اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں اور عموماً ان کے گھروں کا وہی ماحول ہے جو کہ دلّی یا لکھنؤ کا ہوتا ہے۔ ایک بات خصوصیت سے ہندستان میں ان لوگوں کو بتانے کی ہے جو کہ بات بات پر سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کیوں پڑھائیں، وہ اردو پڑھ کر کیا کریں گے، کیا پائیں گے؟ یعنی دوسرے الفاظ میں ان کے خیال میں اردو تعلیم حاصل کرنا ان کے بچوں کے لیے بے سود ہے کیونکہ ان کو اس سے کوئی مالی منفعت نہیں۔ برطانیہ میں جہاں ظاہر ہے ہر شعبۂ حیات میں انگریزی چھائی ہوئی ہے اردو والے اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا بچہ لاکھ انگریزی سیکھ جائے فرانسیسی بولنے لگے لیکن جب تک وہ اپنی زبان اردو نہیں سیکھے گا کسی بھی شعبۂ حیات میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا بچہ اسی وقت ان کا بچہ ہوگا جب کہ ان کی زبان سمجھتا ہو۔ وہ زندگی میں اگر کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے تو اردو پڑھ کر ہی حاصل کر سکتا ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی مادری زبان اردو ہے اور بغیر مادری زبان سیکھے ظاہر ہے کوئی بچہ

کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو زندگی میں اتنی کامیابی نہیں حاصل کر سکتا جتنی کہ مادری زبان سیکھنے والا۔ یہ تمام ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے اور اسی کو مدنظر رکھ کر برطانیہ میں مقیم غیر ملکی لوگ جن میں ہندستانی بھی شامل ہیں اپنے بچوں کو وقت نکال کر اور کافی بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے اردو سکھاتے ہیں جن کا یہ کارآمد نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ اب وہاں باقاعدہ اردو معاشرہ وجود میں آ گیا ہے اور اب انگریز بھی اردو کو ایک زندہ اور عوامی زبان تسلیم کر کے اس کو سیکھ رہے ہیں۔ جہاں جہاں تارکین وطن بڑی تعداد میں رہتے ہیں وہاں پر تعیناتِ پولیس، پوسٹ مین اور دوسری لازمی خدمات کے تحت آنے والے ملازمین کے لیے اردو کا علم ہونا لازمی شرط ہے۔ اس طرح اردو کی تعلیم ملازمت کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہے اور خوب پھل پھول رہی ہے۔

یہ بات ہندستان میں رہنے والے بیشتر افراد کے لیے ناقابل یقین ہوگی کہ برطانیہ میں اٹھارہ اٹھارہ برس سے رہنے والے ایسے ہندستانی بھی موجود ہیں جن کو معمولی سی بھی انگریزی نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کبھی اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی کیونکہ ان کا سارا کام کاج بس اردو ہی کے ذریعہ چل جاتا ہے۔

انجمن ترقی اردو برطانیہ اسی طرح اردو کی بہی خواہ انجمن ہے جس طرح انجمن ترقی اردو ہند۔ یہ بڑی مستعدی سے اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے کوشاں ہے۔ اس کے زیر اہتمام ادبی نشستیں اور مشاعرے وغیرہ منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں ایشیائی تارکین وطن کے علاوہ مقامی انگریز باشندے بھی بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ مشاعرہ جو اردو کی دلفریبی کا باعث ہے یہاں بھی دلوں کو موہ لینے میں کامیاب ہے۔

ہندستانی فلموں اور خصوصیت سے ان فلموں سے جن کی زبان شستہ اردو ہوتی ہے برطانیہ میں بڑی دلچسپی لی جاتی ہے۔ مرزا غالب، مغل اعظم، اور پاکیزہ فلمیں تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے نہ دیکھی ہوں اور مشکل سے کوئی ایسا ایشیائی گھر ملے گا جہاں پاکیزہ کے گانے ٹیپ نہ ہوں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ لوگ اس کے ذریعے ہندستان کی ترقیوں اور کامیابیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے دیکھنے سے ان کو ہندستانی تہذیب و زندگی کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ برطانیہ میں لوگوں نے محض انفرادی طور سے اپنے بچوں کو اردو سکھانے کا بندوبست کیا ہو بلکہ یہاں جگہ جگہ مکاتب اور مدارس کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ ساؤتھ ویلز میں نیو پورٹ ایک شہر ہے جس میں ایشیائی باشندوں کی مجموعی تعداد تین ہزار کے قریب ہے وہاں ایک عمارت میں ایک باقاعدہ مدرسہ ہے جس میں اردو تعلیم کا بڑا معقول انتظام ہے۔ وہاں اردو سیکھنے والے بچوں کی تعداد فی الحال ساٹھ ہے اور یہ وہ بچے ہیں جو اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور شام کو تحصیل کا وقت کم کر کے اردو پڑھتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بچے اسکول کے بعد اردو پڑھنا چاہتے ہیں مگر چونکہ برطانیہ میں ایسا ممکن نہیں ہے کہ کم جگہ پر زیادہ طلباء بھر دیے جائیں اس لیے ابھی اردو پڑھنے والے بچوں کی تعداد خود منتظمین نہیں بڑھا رہے ہیں ان کے پاس ایک بڑا ہال ہے جس میں ۸۰ بچے ہی بیٹھ سکتے ہیں۔ منتظمین کسی اور مناسب اور بڑی جگہ کی تلاش میں ہیں جب جگہ مل جائے گی تو وہاں مزید طلباء کو داخلہ مل سکے گا۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ یہ مدرسہ یا اسکول محبان اردو کی انفرادی کوششوں سے چلتا ہے اور اس کے اخراجات بھی وہ بڑی فراخ دلی اور خوشی سے برداشت کرتے ہیں یعنی مدرسین کی تنخواہ وغیرہ۔ اور لطف یہ ہے کہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔ ایک مدرس کو ۷۵ پونڈ فی ماہ ملتا ہے (ایک پونڈ تقریباً اٹھارہ ہندستانی روپیوں کے برابر ہوتا ہے) بچے بڑی خوشی اور دلچسپی سے اردو پڑھتے ہیں اس مدرسے کے علاوہ برسٹل میں بھی ایسی ہی خوش اسلوبی سے چلنے والے دو مدارس میں اردو سیکھنے والے بچوں کی خاصی تعداد ہے

لندن، برمنگھم، بریڈفورڈ، شفیلڈ جہاں جہاں بھی اردو کے پرستار ہیں وہاں وہاں انفرادی اور اجتماعی طور سے اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔

ہندستان میں محبانِ اردو کا یہ طریقۂ کار ہے کہ انھوں نے اپنا کام بھی حکومت کے لیے چھوڑ رکھا ہے وہ اپنے طور سے اپنے گھر میں اپنے بچوں کو اردو سکھا سکتے ہیں اور اردو کتب، رسائل و اخبارات سے دلچسپی پیدا کرا سکتے ہیں مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرتے بلکہ یہی کہتے نہیں جھجکتے کہ اردو ختم ہو رہی ہے، اس پڑھنے سے نوکری نہیں ملتی، پیسہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس برطانیہ میں لوگ انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں اردو کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سب کوششیں بے لوث ہیں۔ نوکری ملنے، شہرت پانے یا کسی اور لالچ کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ اس کے ذریعے ان کے رشتے ان کے ملک اور ان کی قوم سے مضبوطی سے وابستہ رہیں گے اور ان کے بچے اپنے عظیم تہذیبی، ثقافتی اور قومی ورثے سے محروم نہ ہوسکیں گے۔ دراصل یہی جذبہ ہے جو زبانوں اور قوموں کو زندہ رکھتا ہے اور یہ جذبہ برطانیہ کے ہندستانیوں میں موجود ہے تو پھر خود ہندستان میں یہ جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوسکتا کیونکہ اردو ہندستان کی زبان ہے، اس کو ہندستان میں جنم لینے اور پروان چڑھنے پر فخر حاصل ہے۔ حکومت تو جو کچھ کرسکتی ہے کر رہی ہے مگر ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔

★

اُستادِ مُحترم - (صفحہ ۲۹ کا بقیہ)

...بلندی کی ہیئت ہمارے تخریبی ارادوں پر دیمک کی طرح ہٹ گئی۔

"بس تو یہ لو مسودہ! نظر ڈال لو، جو بات سمجھ میں نہ آئے مجھ سے پوچھ لو اور کسی اچھے سے پرچے کو بھیج دو۔" انھوں نے ایک بوسیدہ اور گرد آلود میز کی دراز سے مڑے تڑے کاغذ کے چند چیتھڑے نکال کر ہماری طرف بڑھا دیے۔ ہم نے ان ردّی کاغذات کو چند ثانیے تک تو پاگلوں کی طرح بہ نظر غایت گھورا اور مواد کو پڑھنے کی جدوجہد میں جُٹ گئے۔ مگر خدا کی پناہ ــــ خط (تحریر)، خطِ شکستہ کے نہیں ٹیڑھے میڑھے چہرے پر بھرپور طمانچہ تھا۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ چیلنج کرسکتے ہیں کہ اس دور کا کوئی ماہرِ فن منشی یا محرّر بھی اس منفرد تحریر کو جھٹکے لے لے کر پڑھے گا بلکہ بہت سے الفاظ سے تو الجھ کر قلابازیاں کھا جائے تو بعید از قیاس نہیں ــــ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ہم نے یوں توں کرکے اس مسودہ کو سمجھا، عبارات کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ ہم نے اقبال یا غالب کی سوانح عمری کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہو بخصوصیات کلام اتنا معیاری لگا کہ آج تک اس پایہ کا قادر الکلام شاعر ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے ..... اس انکشاف کے بعد ہمارا غصہ کئی سو ڈگری ہائی (HIGH) ہوا، لیکن ہم نے شانِ بے نیازی سے غصہ کو شربت انار سمجھ کر پی لیا اور ان کاغذات کو تہہ کرکے اندر کی جیب میں ٹھونس لیا ــــ مضمون گرانمایہ کو چھپوانے کے لیے استادِ محترم اور ہمارے درمیان عاشق و معشوق کی طرح عہد و پیمان ہوئے۔ پھر ہم انھیں بحالت مجبوری جھوٹی تسلیوں کے کھلونوں سے بہلا کر اپنے غریب خانے کو کسی امیر و کبیر کی طرح لوٹ آئے تھے۔

ہم اب تک سوچ رہے ہیں کہ مذکورہ مقالہ کو کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجنے سے پہلے ہمیں خود کو کسی اتفاقیہ امراض کے اسپیشلسٹ کی خدمت میں حاضر کرنا پڑے گا ــــ ایک طرف تو اپنے ناطر العقل قرار دیے جانے کا ڈر اور دوسری طرف استادِ محترم کے پے درپے شکایت آمیز تقاضوں نے ہماری زندگی کے سکون کو درہم برہم کرکے رکھ دیا ہے۔ اس لیے ہم ہر اُس مدیرِ کرام سے دست بستہ درخواست کرتے ہیں جو اس مضمون کو پڑھنے کی غلطی سے دوچار ہو رہا ہو کہ بھائی اگر آپ کو ہماری ذات سے ارد پر سفیدی کے برابر بھی ہمدردی ہو تو ہمیں فوراً لکھیں تاکہ ہم وہ مسوّدہ اور مکمل فارم (ORIGINAL FORM ــــ) میں برائے اشاعت، خود ہی بہ نفسِ نفیس لے کر خدمت میں حاضر کرسکیں!

★

تابش پرتابگڈھی

پیغام

دور باقی نہیں اب رات کی عیاری کا
خاتمہ ہو چکا تخریب کی مکاری کا
ساتھیو جاگو کہ اب وقت پکارے ہے تمھیں
فرض ہے تم پہ گلستاں کی نگہداری کا

وقت کے ساتھ قدم تم کو ملانا ہوگا
رہِ تعمیر سے روڑوں کو ہٹانا ہوگا
اک نئی صبح نے گلشن میں قدم رکھا ہے
خواب خرگوش سے لوگوں کو جگانا ہوگا

تم کو دنیا کو دکھا دینی ہے اپنی جرأت
کھولنا ہے کچھ اس انداز سے بابِ حکمت
شرپسندوں کو سرافرازی میسر بھی نہ ہو
یوں دکھانی ہے تمھیں فہم بشر کی طاقت

ہر سفینے کو کنارے سے لگاتے جاؤ
گر گیا ہو جو بشر اس کو اٹھاتے جاؤ
قومی یکجہتی سے ممکن ہے چمن کی تشکیل
نفرت و بغض کی دیوار گراتے جاؤ

کل کا سورج نئی سوغات لیے آئے گا
نور ہی نور ہر اک سمت بکھر جائے گا
روشنی امن کی پھیلے گی زمانے بھر میں
ہر نفس دہر میں پیغام شگوں لائے گا

آفتاب نقوی سہوانی

آج کل

یہ اندرا کے دور کا احساں ہے آج کل
ہندوستاں پہ رحمتِ یزداں ہے آج کل
پھر وہ نگاہِ ناز مہرباں ہے آج کل
دنیائے عشق گویا غزل خواں ہے آج کل

چہروں پہ اب اداسی کا کوئی نشاں نہیں
ہر فرد اپنے حال میں شاداں ہے آج کل
کلیوں پہ آب و رنگ تو غنچوں پہ ہے نکھار
گلشن میں ایک جوشِ بہاراں ہے آج کل

بادِ خزاں کا خوف نہ برقِ ستم کا ڈر
محفوظ ہر بلا سے گلستاں ہے آج کل
شورش نہیں فساد نہیں کوئی ڈر نہیں
زنداں میں بند فتنۂ دوراں ہے آج کل

تمیزِ خاص و عام نہیں میکدے میں اب
بادہ گسار کوئی ہو یکساں ہے آج کل
مزدور ہو کسان ہو کوئی غریب ہو
ہر اہلِ دل کے درد کا درماں ہے آج کل
اللہ رے آفتاب یہ فیضِ نظام تو
پابندِ نظم و ضبط ہر انساں ہے آج کل

ولی تنویر

آنسو بہار کے

(افسانہ)

ثمینہ برسوں بعد آج پھر میرے سامنے خاموش اور سنجیدہ بنی بیٹھی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے کنارے نم ہو رہے تھے۔!

زندگی خاموش تھی، وقت ٹھہر گیا تھا، آسمان پہ چمکنے والے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر خلاء میں کہیں گم ہو رہے تھے، چاند زرد ہو کر بجھنے لگا تھا۔ نرم خرام ہوا اب کہیں گم ہو چکی تھی۔ کوئی آواز نہیں، کوئی حرکت نہیں کوئی آہٹ نہیں۔ رنگ و نور کے سارے رشتے ختم ہو چکے تھے۔ الفت، محبت اور تہذیب کے سارے اصول مٹ گئے تھے۔ دل کسی شے کا نام نہیں اور اگر کسی شے کا نام دل تھا بھی تو اب اس کا کام دھڑکنا نہیں رہا۔ دل۔ جو کبھی سینے میں دھڑکتا تھا، جس میں الفت محبت اور تہذیب کے اصول بستے اور پلتے تھے رنگ و نور کے رشتے آباد ہوا کرتے تھے خوشبو جنم لیا کرتی تھی۔ دل کی اپنی بھی کوئی آواز ہوا کرتی تھی سب سے الگ سب سے منفرد۔ اور وہی آواز دنیا کا محور ہوا کرتی تھی۔ اب دل وہ دل نہیں رہا تھا۔ ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں لکیریں مٹا دی گئی تھیں۔ انسانیت اب کسی بڑے دھوکے کا تبدیل شدہ نام تھی۔ محبت اور الفت، فریب کی بدلی ہوئی شکل تھی۔!

زندگی کیا ہے۔؟" میں سوچتا!"

محض ذرّات کی حرکت کا نام تو زندگی نہیں ہو سکتا۔! اگر ایسا ہے تو پھر زندگی بے کار ہے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی مقصد نہیں یہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جا کر ختم ہو جاتی ہے کسی کو نہیں معلوم۔!

ثمینہ کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتا ہوں تو ان آنسوؤں کے ایک ایک قطرے میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر ایسی زندگی کس کام کی جس کا کوئی مقصد نہ ہو جس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں۔

"پھول کے باطن میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو، وہاں خلاء کے سوا کچھ نہ ملے گا۔" یہ اصول اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ثمینہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس تجوری کی مانند جس میں اب کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔!

میں جانتا ہوں یہ سب کچھ اس کی نادانی کی وجہ سے ہوا وہ ایک حسین و معصوم لڑکی۔!

اس کے بھولے پن کا زمانے نے خوب فائدہ اٹھایا اور اسے چوسے ہوئے گنّے کی طرح پھر انہی راہوں پر ڈال دیا جہاں وہ مجھے اسی راہ میں مل گئی۔ تاہم وہ میری نظروں میں ویسی ہی باوقار تھی۔ محبت کیے جانے کے قابل جیسی کہ پہلے۔!

زمانے کی تیز روشنی کو دیکھ کر اس نے مجھے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اور روشنی کے ایک پُر فریب دریا میں بہتی ہوئی دور بہت دور نکل گئی تھی۔ اس کو کیا پتہ کہ روشنی تو روشنی ہوتی ہے جو کبھی ہاتھ نہیں آ سکتی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے اس کو اپنی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا!

ثمینہ۔! معصوم و نادان۔! اس کو کیا معلوم کہ زمانے نے ترقی ضرور کی ہے لیکن انداز ستم بھی ساتھ ہی بدل گئے ہیں۔

نیم تاریک کمرے میں کرب ناک خاموشی تھی۔ کھڑکی کے راستے آخری شب کے زرد چاند کی مدھم سی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ماحول بڑا ہی بوجھل اور اداس ہو رہا تھا۔

"ثمینہ"! میرے دل کے گوشے نے آواز دی میرے ہونٹ خاموش تھے افسردہ و شرمندہ وہ بیٹھی تھی۔ دل کی آواز سے اس کے کان آشنا نہیں ہو پائے تھے۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے دائیں پیر کے انگوٹھے سے فرش کو ہولے ہولے کرید رہی تھی۔

زندگی خاموش تھی۔ وقت ٹھہر گیا تھا۔!! باہر وسیع میدانوں میں زرد چاندنی کے ساتھ اداسی بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا کے نرم خرام جھونکے ہنوز گم تھے!

"تم نے غلط سمجھا تھا ثمینہ؟!" دل نے کہا۔ لب بدستور خاموش رہے۔ تم نے میری محبت پر دنیا کی مصنوعی چمک دمک کو ترجیح دی۔ میرے مقابل میں تم نے نعیم کی شخصیت کو قابل بھروسہ سمجھا۔ جس دن میں نے نعیم سے تمھارا تعارف کروایا تھا۔ بس اسی دن سے میں نے محسوس کیا کہ تمھارے رویے میں عجیب سی تبدیلی آ رہی ہے۔ مجھے نعیم پر بھی اتنا ہی اعتماد تھا جتنا کہ خود تم پر۔ تم بے حد سنجیدہ اور کم سخن اور نعیم بذلہ سنج اور فضول گو۔ بھرے بھرے جسم والا خوبرو نعیم تمھارے توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی زبان پر ہمیشہ فلمی دنیا کی رنگینیوں کا ذکر رہتا۔ وہ فلمی دنیا کی ظاہری چمک دمک سے متاثر تھا اور تم بھی اس کی باتوں میں آ گئیں۔ مجھے تمھاری سنجیدہ اور باوقار شخصیت سے ہرگز ایسی امید نہیں تھی کہ نعیم کی باتوں میں آکر مجھ سے بے وفائی کر دوگی۔ حالانکہ میں نے تمھیں اپنی زندگی کا حاصل قرار دیا تھا۔ تمھیں میری محبت و آرزو کا ذرا بھی پاس نہ رہا اور ایک دن تم مجھے تنہا چھوڑ کر نعیم کے ہمراہ چلی گئیں، میں تمھیں کیا بتاؤں کہ تمھاری جدائی نے مجھے کس قدر دکھ پہنچایا۔

اب کیا رہ گیا تھا اس شہر میں میرے لیے۔ تشنہ کام اور ناآسودہ روح لیے میں بھٹکتا رہا، کہیں چین نصیب نہ ہوا۔ دل میں سوز اور تمھارا تصور لیے ایک جنت گم گشتہ کی تلاش میں پھرتا رہا۔

ثمینہ! حسن مجبور سہی، عشق تو مجبور نہیں ہوتا۔ محبت میں وفا کا بھرم قائم رکھنے میں ایک عرصہ تک تمھارا انتظار کرتا رہا۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ تم ضرور ایک نہ ایک دن دنیا کی چمک دمک سے بیزار ہو کر واپس آجاؤ گی۔

مجھے نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ تم شہر سے نعیم کے ہمراہ سیدھے بمبئی پہنچیں۔ تمھارے حسن کی خوشبو سے بمبئی کی فلمی دنیا معطر ہوتی رہی۔ پھر تمھیں کسی فلم کی ہیروئن منتخب کر لیا گیا۔ اس اثنا میں نعیم کا اچانک بے دردانہ قتل ہو گیا۔ مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ نعیم کا قاتل کون تھا اور کس لیے اس کو قتل کیا گیا۔ لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ تم نے نعیم کی موت کا ذرہ برابر بھی غم و ملال کیے بغیر اپنی فلم کے ہیرو سے شادی رچا ڈالی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں تمھاری اس ازدواجی زندگی میں پھوٹ پڑ گئی اور تمھاری زیر تکمیل فلم ادھوری رہ گئی اس کے بعد تم نے کپڑا بننے والی کسی فرم کے مالک سے دوستی پیدا کی۔

پھر اچانک تم بمبئی سے غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد تمھارے بارے مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ میرے دل میں جہاں تمھاری جدائی کا احساس باقی تھا وہیں نعیم کی غیر متوقع موت کا بے حد ملال بھی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں میرے اپنے صرف تم دونوں ہی تھے۔ ایک دوست کی حیثیت سے نعیم اور دوسری تم۔۔۔!!

اور کوئی نہیں۔! لوگوں کے ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا احساس تھا مجھے۔ میری زندگی برسات کی کسی تاریک اور کڑکڑاتی ہوئی سرد بھیانک رات کی مانند گزر رہی تھی۔ زندگی میں چین اور سکون کو تلاش کرنا گویا اندھیری رات میں سورج کی کرن تلاش کرنے کے برابر تھا۔ کوئی ہمنوا تھا نہ کوئی غمگسار۔ اب تو دماغ میں سوجھ بوجھ کی بھی صلاحیت نہ رہی۔ دل میں کوئی امنگ باقی نہ تھی۔ میرے خشک ہونٹ ایک مدت سے مسکراہٹ کے لیے ترس کر رہ گئے تھے۔ دل کی حالت اس دریا کی طرح تھی جو بظاہر خاموش بہتا چلا جاتا ہے لیکن اپنے دامن میں بے شمار طوفان اور ولولے چھپائے ہوتا ہے۔

ایسے میں فرحانہ میرے خزاں بار چمن میں بہار بن کر آئی جس سے زیادہ اس کا محبت بھرا دل میرے درد کا درماں ثابت ہوا۔ فرحانہ کو پا کر مجھے نئی زندگی حاصل ہوئی۔ مجھے زندگی کا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل ہوا۔ اب وہ میرے دو بچوں کی ماں ہے۔!! اس کو میں حد سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اس نے بھی مجھے اٹوٹ پیار دیا ہے۔ میرے بغیر زندگی کے تصور تک کو وہ اپنے تئیں گناہ سمجھتی ہے۔! دن رات میری اور بچوں کی خدمت میں مصروف ہے۔ اب میرے گھر میں ہر وقت آرام چین سکون اور محبت و الفت کی بارش ہوا کرتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود مجھے جب بھی تمھاری یاد آتی ہے دل کی

کچھ عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ جانے کیوں آج بھی تمھارے متعلق سے میرے دل میں وہی محبت اور خلوص باقی ہے۔ میں نے تمھیں پھول کی طرح چاہا ہے۔

عورت کو میں خدا کی طرف سے دیا ہوا ایک مقدس تحفہ تصور کرتا ہوں۔ عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی اور بیوی بھی۔ ! تم میری شریک حیات نہ بن سکیں تو کیا ہوا تم عورت تو ہو۔ تمھیں کسی اور رشتہ سے بھی چاہا جا سکتا ہے۔ !! —— !!

"ثمینہ —!" اب میں نے خیالوں کی دنیا سے باہر آکر کہا۔ میری زبان کی آواز پر اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر نیم آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا، اس کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"چلو ثمینہ اب اندر جا کر سو جاؤ۔ رات بہت بیت چکی ہے۔ صبح اٹھ کر مجھے فرحانہ کو لینے اسٹیشن جانا ہے۔ کل صبح وہ اپنے میکے سے لوٹ رہی ہے۔"

میرے کہنے پر ثمینہ اٹھ کر بھاری اور بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ اندر والے کمرے میں چلی گئی اور میں باہر برآمدے میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کا کوسوں پتہ نہیں۔ کل تک میرے دل میں ثمینہ سے ملنے کی حسرت تھی آج وہ میرے گھر آئی تو بے چینی اور بھی بڑھ گئی کہ صبح فرحانہ سے کیسے سامنا کر سکوں گا۔

فرحانہ لاکھ ترقی پسند خیالات اور کھلے ذہن کی سہی پھر بھی وہ ایک عورت ہے۔ ثمینہ کا اس سے میں کیسے تعارف کراؤں گا۔ اب کیا کیا جائے۔؟ دیر تک میں اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ رات جیسے جیسے صبح کی طرف قدم بڑھا رہی تھی ویسے ویسے ڈر اور خوف بھی بڑھتا جاتا تھا۔!

دوسری صبح میں فرحانہ کو لینے اسٹیشن پہنچا۔ ثمینہ بھی میرے ساتھ آئی۔ اس کی حسین آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے تھے جیسے وہ بھی رات بھر سوئی نہ تھی۔ نیلی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے تھے۔ ادھر میرے دل میں ہلکا ہلکا سا خوف انگڑائیاں لے رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر بعد ثمینہ کو کس طرح فرحانہ سے ملاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی فرحانہ کھل اٹھی بچے تو مارے خوشی کے میرے پیروں میں جھول گئے۔ بڑا ہی عجیب سماں تھا۔ میں نے دل تھام کر ثمینہ کا تعارف کرایا۔

"فرحانہ...! ان سے ملو...... یہ ثمینہ ہیں —!"

"ثمینہ —؟" فرحانہ نے تعجب سے پوچھا۔

"بھول گئیں۔ ارے وہی ثمینہ جس کے متعلق تم میری ڈائری میں پڑھ چکی ہو۔"

"اوہو ثمینہ —! آئی ہی —! سمجھی —! بڑی خوشی ہوئی ثمینہ تم سے مل کر اتنے دن کہاں رہیں —؟"

فرحانہ کے لہجے میں بے پناہ پیار و محبت اور خلوص دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ثمینہ کا دل غم سے بھر آیا، اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ رہے تھے۔ فرحانہ سے ملنے کے لیے وہ آگے بڑھی اور ...... اور پھر اس سے چمٹ کر بے اختیار رونے لگی —! جیسے کوئی بہن برسوں بعد اپنی بہن سے مل کر روتی ہے۔

"بھابی —!" میں بہت گناہ گار ہوں"۔ ثمینہ نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ "شاید خدا بھی مجھے معاف نہ کرے —!" —!

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب سا امنڈ رہا تھا۔

"ثمینہ ...! نہیں ثمینہ اس طرح رنج نہیں کیا کرتے"۔ فرحانہ نے ثمینہ کو اپنے سینے سے لگا کر بڑے اعتماد اور اپنائیت سے کہا — "اب بھی کچھ نہیں ہوا۔ انسان اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی بہت کچھ بن سکتا ہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر کے ندامت کے آنسو بہانا اور پھر غلط راستے کا رخ نہ کرنے کا عہد کر لینا بہت بڑی بات ہے۔ اب تم ایک نئی زندگی کا راستہ اختیار کرو۔ تم بھی عظیم بن سکتی ہو۔"

فرحانہ کے لہجے میں خلوص تھا۔

میرا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں، اور میری ان نم ناک آنکھوں میں ایک معصوم بے گناہ بھولی بھالی اور پاکیزہ سی ثمینہ کا ہیولا سا ابھر آیا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان آنسوؤں میں ثمینہ کی پچھلی زندگی کے سارے گناہ بہہ گئے ہوں۔ میں سوچنے لگا ثمینہ کے ان آنسوؤں کو کیا نام دوں —؟

★

خلیق الزماں سحر

یکجہتی

چلے کچھ ایسی خدایا ہوائے یک جہتی
ہو سازگار ہمیشہ فضائے یک جہتی
خزانے امن و سکوں کے لٹائے یک جہتی
تعصبات کی دیوار ڈھائے یک جہتی
ادا ہے ارضِ وطن کی ادائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

دلوں سے بغض و عداوت کا میل دھونا ہے
خلوص و مہر و محبت کے بیج بونا ہے
مٹا کے جھگڑے من و تو کے درمیاں سے ہمیں
ہزار جسم ہوں پر ایک جان ہونا ہے
کرشمہ اپنا کچھ ایسا دکھائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

یہیں پہ تلسی و غالب کبیر و میر ہوئے
یہیں نسیم اور آتش ہوئے نظیر ہوئے
یہیں پہ فانی و چکبست اور امیر ہوئے
فراق و جوش یہیں ہیں یہیں اسیر ہوئے
خزانے امن و سکوں کے لٹائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

کریں یہ عہد قسم کھائیں آج مل کے سبھی
ہماری آج سے یہ طرز زندگی ہوگی
نہ آنچ آئے گی اب عصمتوں کے دامن پر
فساد و شر کی نہ چنگاریاں اٹھیں گی کبھی
بیان کردو سحر رازہائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

نثار الماس

زندگی کا قافلہ

قدم قدم رواں دواں ہے زندگی کا قافلہ
گہر طراز و گل فشاں ہے زندگی کا قافلہ
حسین خواب سرگراں ہے زندگی کا قافلہ

کبھی نہاں، کبھی عیاں ہے زندگی کا قافلہ

ہر ایک سمت مرحلوں کا سلسلہ ہے دور تک
کئی کلیم ہمسفر ہیں جلوہ گاہِ طور تک
کئی مقام ہیں جنوں کی منزل شعور تک

ہزار ہم پہ مہرباں ہے زندگی کا قافلہ

کہیں بہار رنگ و بو کہیں غبار زرد ہے
کہیں تبسموں کی ضو کہیں حصار درد ہے
کہیں ہے نالۂ جرس کہیں یہ رہ نورد ہے

کہیں خوشی، کہیں فغاں ہے زندگی کا قافلہ

اسی کا نغمۂ طرب ہے ساز آبشار میں
اسی کی آب و تاب ہے جمالِ جلوہ یار میں
لطافتیں اسی کی ہیں تجلیٔ بہار میں

ہر ایک شے کا ترجماں ہے زندگی کا قافلہ

ہزار اس کے روپ ہیں ہزار اس کے زاویے
ازل سے تا ابد ہیں اس کے رنگ و بو کے سلسلے
نثار اس کے بھید بھاؤ آج تک نہ کھل سکے

عجیب طرفہ داستاں ہے زندگی کا قافلہ

اداریہ

اترپردیش بجٹ ۷۷-۱۹۷۶ء

بجٹ تخمینے بابتہ ۷۷-۱۹۷۶ء

مزید وسائل کی فراہمی کی مختلف تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۷۷-۱۹۷۶ء کے آخر میں ۱۶ر۱۵ کروڑ روپیہ کا خسارہ رہ جائے گا۔ محاصل سے آمدنی کا تخمینہ ۹۵۰ر۳۲ کروڑ روپیہ اور سرمایے کے محاصل کا تخمینہ ۳۱۲ر۹۴ کروڑ روپیہ ہے۔ پبلک اکاؤنٹ کے تحت ۵۵ر۳۳ کروڑ روپیہ کی خالص آمدنی ہونے کا اندازہ ہے۔ دوسری طرف سال بھر میں آمدنی کے اخراجات ۹۰۱ر۵۳ کروڑ روپیہ اور سرمایے کے اخراجات ۴۰۸ر۱۲ کروڑ روپیہ ہونے کا تخمینہ ہے۔ اس طرح سال میں کل آمدنی کل اخراجات سے ۶۴ر۷ کروڑ روپیہ کے بہ قدر زیادہ ہونے کا تخمینہ ہے جس کے نتیجہ میں سال کے آخر میں ابتدائی میزان (-) ۷۸ر۳۱ کروڑ روپیہ سے گھٹ کر (-) ۷۰ر۶۷ کروڑ روپیہ رہ جائے گی مندرجہ ذیل گوشوارہ سے صورت حال واضح ہو جائے گی۔

بجٹ ایک نظر میں

آمدنی اور سرمایہ کا گوشوارہ (کروڑ روپیہ میں)

محاصل		مصارف	
ابتدائی میزان (-)	۷۸ر۳۱	آمدنی کے اخراجات	۹۰۱ر۵۳
محاصل سے آمدنی	۹۵۰ر۳۲		
سرمایہ کے محاصل	۳۱۲ر۰۴		
پبلک اکاؤنٹ (خالص)	۵۵ر۳۳	سرمایہ کے اخراجات	۴۰۸ر۶۲
	۱۳۱۷ر۷۹		۱۳۱۰ر۱۵
		اختتامی میزان -	۷۰ر۶۷
کل میزان	۱۲۳۹ر۴۸		۱۲۳۹ر۴۸

بجٹ تخمینوں کے ۷ کروڑ ۶ لاکھ روپیہ کے متوقع خسارہ کو مندرجہ ذیل طریقے سے پورا کرنے کی تجویز ہے :-

(۱) سیلس ٹیکس کی شرحوں پر نظر ثانی کرنے اور انھیں معقول بنانے کی تجویز ہے۔ اگرچہ کچھ معاملوں میں سیلس ٹیکس کی شرح میں اضافہ کیا جائے گا تاہم بعض صورتوں میں کچھ رعایتیں بھی دی جائیں گی۔ تاکہ اس طرح نکاسی اور پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ ٹیکس ماری کو روکنے اور ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ وصولی کے بندوبست کو یقینی بنانے کے لیے نظم و نسق کی مشینری کو مستحکم کیا جائے گا۔ ان اقدامات کے نتیجہ میں بجٹ سال کے دوران ۶ کروڑ ۴ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

(۲) صنعتی الکوہل پر لیوی خریداری ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ٹیکس ماری اسمگلنگ اور شراب کی ناجائز کشیدگی کی روک تھام کی غرض سے محکمہ آبکاری کی انتظامی مشینری کو مستحکم بنایا جائے گا۔ ولایتی شراب کی دوکانوں کی نیلامی کے سابقہ فیصلہ پر عمل درآمد کرنے کی تجویز ہے۔ ان اقدامات سے نہ صرف ریاست میں نشہ بندی پالیسی کو بروئے کار لانے میں مدد ملے گی بلکہ ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

(۳) مختلف محکمہ جاتی فیسوں کی شرحیں بہت پہلے مقرر کی گئی تھیں اور اس وقت سے اب تک سروسوں کی لاگت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے ان شرحوں پر نظر ثانی کی تجویز ہے۔ اس اقدام کے نتیجہ میں پانچ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

(۴) کورٹ فیس اور رجسٹری کی فیس کی شرحوں پر بھی نظر ثانی کی تجویز ہے جس کے نتیجہ میں امید ہے کہ ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی ہوگی۔

(۵) شہری علاقوں میں خالی پڑی ہوئی زمین پر لیوی ٹیکس عائد کرنے کی تجویز ہے۔ اس اقدام سے تخمیناً دو کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوگی۔

(۶) ہاٹ بازار اور مویشی میلوں وغیرہ میں جانوروں اور مویشیوں وغیرہ کی خریداری پر لیوی ٹیکس عائد کر دینے کی تجویز ہے جس کے نتیجہ میں ایک کروڑ ۸۵ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

اس طرح مذکورہ بالا اقدامات سے ۲۴ کروڑ ۸۵ لاکھ روپیہ کی آمدنی متوقع ہے۔ غیر پیداواری اور غیر ضروری مدوں کے اخراجات میں تخفیف کر کے سرکاری مصارف میں کفایت شعاری کی جائے گی۔ سرکاری واجبات کی وصولی اور زیادہ موثر طریقے سے کی جائے گی۔ مالگذاری کو معقول سطح پر لانے کی بھی تجویز ہے تاکہ اس کے دائرہ اثر کو معقول بنایا جا سکے اور زمین کے مالک ادارہ جاتی سرمایہ کاری سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس اقدام کے نتیجہ میں چار کروڑ روپیہ یا اس سے زیادہ کی آمدنی کی توقع ہے۔ بجٹ سال کے دوران مزید وسائل پیدا کرنے کے سلسلے میں بعض دیگر تجاویز پر بھی غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

اتر پردیش بجٹ ۷۷-۱۹۷۶ء کی خاص خاص باتیں

ترقیاتی بجٹ کی حکمت عملی

وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے ۲۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو اتر پردیش ودھان سبھا میں اپنی بجٹ تقریر میں ایک نئی ترقیاتی حکمت عملی کا خاکہ پیش کیا۔ اس حکمت عملی میں خاص زور سائنسی تکنیکی اور جدید طریق کار کا زرعی میدان میں زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ترقی کے عمل کی رفتار کو بڑھانے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں دستکاریوں اور ہینڈلوم کے واحدوں پر خاطر خواہ توجہ اور ان کو مزید امداد دینے پر ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ ان ترقیاتی کاموں کے معاشی فوائد دیہی عوام، کاریگروں اور سماج کے کمزور طبقوں تک مسلسل پہنچتے رہیں۔

(۱) ان مختلف اسکیموں اور پراجکٹوں کے نتیجہ میں آبپاشی کی اضافہ شدہ صلاحیت سے کھیتوں کو سینچائی کی زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچائی جائے گی۔ اس مقصد کے پیش نظر گولوں اور کھیت کی نالیوں کی تعمیر کے کام کو اولیت دی جائے گی۔ بیراجوں اور باندھوں کی تعمیر سے لے کر کھیت کی گولوں تک تعمیر کے کاموں میں تال میل پیدا کیا جائے گا تاکہ جیسے ہی آبپاشی کے مزید وسائل مہیا ہوں

ان سے ضرورت مند کسانوں کو فائدہ پہنچنے لگے۔ پانی کے رسنے کی وجہ سے ضائع ہونے کے امکانات کو کم کرنے کے لیے بعض دوسری ریاستوں کی طرح اتر پردیش میں بھی درمیانی نہروں کو پختہ بنایا جائے گا (۲) کاشتکاروں کو امداد باہمی تحریک کے دائرۂ عمل میں لایا جائے گا تاکہ کیمیاوی کھاد اور بیج وغیرہ کے سلسلے میں ان کی ضرورتوں کو خاطر خواہ طریقے پر پورا کیا جا سکے۔

کاشتکاروں کو امداد باہمی انجمنوں کا ممبر بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں گے اور امداد باہمی ڈھانچہ کو مستحکم بنانے نیز ان کو فنڈ مہیا کرنے کے لیے بھی بڑے پیمانہ پر کوششیں کی جائیں گی۔

(۳) ریاستی فارموں میں شد ھار کر کے انھیں اس قابل بنایا جائے گا کہ ایسے بیج پیدا کر کے کسانوں کو سپلائی کیے جا سکیں گے جو ان بیجوں سے کسی طرح کم تر درجہ کے نہ ہوں۔ جو قومی بیج کارپوریشن اور ترائی بیج کارپوریشن سپلائی کرتے ہیں۔ مٹی کی جانچ کی سہولتیں بھی مہیا کی جائیں گی تاکہ کسان باری باری سے فصلوں کی بوائی کا طریقہ اپنا سکیں جس میں پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان سہولتوں میں مرحلہ وار توسیع کی جائے گی تاکہ تمام ضلعوں کو یہ سہولتیں مہیا ہو جائیں۔

(۴) زراعت کے پیکیج پروگرام پر تیز رفتار سے عملدرآمد کرنے کے لیے بجلی، آبپاشی، زراعت اور امداد باہمی محکموں میں قریبی رابطہ قائم کیا جائے گا۔

(۵) اس امر کی بھی کوشش کی جائے گی کہ کاشتکاروں کو نہ صرف زرعی آلات مناسب قیمتوں پر اور بغیر کسی پریشانی کے مہیا ہو سکیں بلکہ ان کی پیداوار کے مناسب دام بھی ان کو ملنے لگیں۔

۲- ۷۷-۱۹۷۶ء کا سالانہ منصوبہ ۵۴۰ کروڑ رکھا گیا ہے جو کہ گزشتہ سال کے اصل منصوبہ کے مصارف سے ۳۵ فی صد زائد ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کا سالانہ منصوبہ کے لیے ۵۴۰ کروڑ کی مجوزہ رقم میں ۳۷ر۳ کروڑ آبپاشی اور بجلی پر، ۶۷ر۹۰ کروڑ زراعت اور معاون سروسوں پر، ۳۹ر۱۶ کروڑ صنعت اور کان کنی پر، ۲۹ر۸۰ کروڑ نقل و حمل اور مواصلات پر، ۶۳ر۹۰ کروڑ، سماجی اور اجتماعی ترقیات پر، اور ۲ر۹ کروڑ روپیہ دوسری مدوں پر خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد

اس ریاست نے معاشی تعمیر نو سماج کے کمزور طبقوں کی ترقی کے لیے وزیر اعظم کے اعلان کردہ ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں شروع سے ہی زبردست کوششیں کی ہیں۔ اگلے سال ۲۰ نکاتی پروگرام کے عمل درآمد کے لیے ۳۷۱ر۴ کروڑ روپیہ کے مصارف کی تجویز ہے۔ جہاں ضروری سمجھا گیا قانون اور قواعد میں ترمیم بھی کی گئی اور ۲۰ نکاتی پروگرام کے موثر عمل درآمد کے لیے نئے قوانین بھی وضع کیے گئے ہیں

زرعی، صنعتی، دیہی اور شہری صارفین کی قیمتوں میں کافی گراوٹ آئی ہے۔ ریاست بھر میں ضروری اشیاء وافر مقدار میں مناسب شرحوں پر دستیاب ہیں گاؤں سبھا کی آراضی اور جوت حدبندی قانون کے نفاذ کے نتیجے میں فاضل قرار دی گئی زمین کے الاٹمنٹ میں مندرجہ فہرست اقوام و قبائل کے بے زمین مزدوروں کو ترجیح دی گئی ہے اور اس کے لیے قوانین میں ضروری ترمیم کی گئی ہے۔ فروری ۱۹۷۶ء کے آخر تک ۱۶ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین بے زمین اور چھوٹے کسانوں میں تقسیم اور ۱۲ لاکھ خاندانوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمینیں الاٹ کی جا چکی ہیں۔ اس طرح ۹۸ فی صد مستحق خاندانوں کو مکان کی تعمیر کے لیے قطعات آراضی الاٹ کیے جا چکے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ۷۷-۱۹۷۶ء کے بجٹ میں ایک کروڑ روپیہ کی رقم مہیا کرنے کی تجویز ہے۔

پابند مزدوری کو ختم کرنے کے لیے قانون وضع کیا گیا ہے دیہی علاقوں کے بے زمین اور چھوٹے کاشتکاروں کو قرضہ سے نجات دلانے کے لیے بھی قوانین وضع کیے گئے ہیں۔

کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

ادارہ جاتی اقدامات

مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم پر عمل درآمد کی نگرانی کی غرض سے ریاستی منصوبہ بندی ادارہ کے تحت ریاستی سطح کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کی موثر نگرانی اور مقررہ مدت کے

اور انھیں پورا کرلینے کے لیے ہر ڈویژن میں وزیر اعلیٰ کی صدارت میں وزرا کی قائمہ کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔ ڈویژنل کمشنر قائمہ کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ڈویژن کی سطح پر ایک منطقائی ترقیاتی کارپوریشن بھی قائم کیا جائے گا۔ مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت تحقیقاتی و توسیعی مراکز قائم کیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے بجٹ میں ۱۰ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

نظم و نسق کی اصلاحات اور علاحدہ محکمہ نیز انٹرپرائزز بیورو کو مستحکم بنایا جائے گا۔ اس بیورو کے تحت پراجیکٹ تیار کرنے اور اس کی نگرانی سے متعلق ایک ڈویژن قائم کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ افسروں کو مالیاتی انتظامیہ، منصوبہ بندی، کاسٹ اکاؤنٹنسی اور دیگر اہم امور کی تربیت دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مختلف محکموں کے اخراجات سے متعلق اعداد و شمار کو تیز تر رفتار کے ساتھ جمع کرنے اور موثر نگرانی کے بندوبست کو یقینی بنانے کی غرض سے محکمہ مالیات میں اعداد و شمار کے الکٹرانک پروسسنگ کا ایک سنٹر قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کمپیوٹر مرکز قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے

کارکردگی کا جائزہ بجٹ کا طریقہ سن ۷۱-۱۹۷۰ء میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ بجٹ خاندانی منصوبہ بندی، تعمیرات عامہ، آبپاشی، صنعت زراعت، امداد باہمی، گنا، اجتماعی ترقی، نگہداشت مویشیان، مچھلی پالن، تعلیم، تکنیکی تعلیم اور جنگلات کے محکموں کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔ علاج و صحت عامہ کے محکمے سن ۷۷-۱۹۷۶ء کے لیے یہ بجٹ تیار کریں گے۔

حکومت ہند نے اکاؤنٹس اور آڈٹ کو علاحدہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریاستی حکومت اس سلسلے میں اس اقدام کے مضمرات کا جائزہ لے رہی ہے اور اکاؤنٹنٹ جنرل اتر پردیش سے صلاح و مشورہ کر رہی ہے۔

اردو زبان کی ترقی

اردو اکاڈمی کو ملنے والی ۱۰۵ لاکھ روپیہ کی مالی امداد کو بڑھا کر ۵۰ء۸ لاکھ روپیہ سالانہ کر دینے کی تجویز ہے۔ انیس اسمارک ندھی (یادگار انیس کمیٹی) لکھنؤ نے اردو کے عظیم شاعر میر انیس کی رہائش گاہ کی ازسرنو تعمیر نیز ان کے کلام کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کا پروگرام تیار کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک لاکھ روپیے کی غیر متواتر اور پانچ ہزار روپیہ کی متواتر رقم بطور مالی امداد دینے کی تجویز ہے۔ اردو ادب اور بلند پایہ اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے مزید رقم کے بندوبست کی تجویز ہے۔

بجلی کی پیداوار

بجلی کی پیداواری صلاحیت جو سردست ۲۲۰۳ میگا واٹ ہے مارچ سن ۷۷ء تک بڑھا کر ۲۸۶۳ میگا واٹ کرنے کی تجویز ہے جب پنکی (میگا واٹ) رام گنگا کی دوسری اور تیسری مشین (۱۳۲ میگا واٹ) ہردوا گنج مرحلہ ۵ (۱۱۰ میگا واٹ) اور اوبرا تھرمل توسیعی پروجکٹ (۲۰۰ میگا واٹ) کے ذریعہ پیداوار شروع ہو جائے گی۔

آبپاشی کی سہولتیں

اتر پردیش میں سال رواں کے دوران تین لاکھ ۴۸ ہزار ہکٹر رقبہ کی مزید آب پاشی کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے مختلف بڑے اور متوسط آبپاشی پراجکٹوں کے لیے بجٹ میں بندوبست پیدا کیا گیا ہے۔ اس سال شروع کیے گئے ایک تیز رفتار پروگرام کے تحت جون سن ۱۹۷۶ء تک مزید ایک لاکھ ہکٹر رقبہ میں آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی جس کے لیے سال رواں میں تین کروڑ روپے اور اگلے سال کے لیے ۹ کروڑ روپے مہیا کیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ۴۰۰۰ کیلومیٹر لمبی گولوں اور ۸۰۰ کیلومیٹر لمبی نئی چھوٹی نہروں کی تعمیر نیز سینچائی نہروں کی جدید کاری کا کام شروع کیا گیا ہے۔ ریاستی حکومت کوٹھری کے کثیر مقصدی پراجکٹ پر کام شروع کرنے کی اجازت منصوبہ بندی کمیشن سے مل گئی ہے۔ اس پراجکٹ کی تخمینی لاگت ۵ء۳۰ کروڑ روپیہ ہے۔ آبپاشی کی کچھ دوسری بڑی اسکیموں میں جن پر اگلے سال کام شروع ہوگا یہ ہیں سجنام باندھ (للت پور)، بیونی سیتوا (باندہ)، سوہیلی (کھیری) اور بالائی شاردا نہر اور آگرہ نہر وغیرہ کی جدید کاری۔

آبپاشی کی مزید صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ایک ٹیوب ویل و چھوٹی سینچائی کارپوریشن قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ریاست میں سن ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران چھوٹی سینچائی اسکیموں کے ذریعہ ۶ لاکھ ۹۴ ہزار رقبہ کو سینچائی کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ سال کے

دوران ۴۰۰۰ نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کرنے کی تجویز ہے۔

محنت کی عظمت کو سمجھنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے آبپاشی کے بعض اہم پراجکٹوں پر یوتھ مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

بندیلکھنڈ منطقہ میں آبپاشی کی سہولتیں بڑھانے کی مخصوص اسکیموں پر عملدرآمد کرنے کی تجویز ہے۔ ان اسکیموں پر ۲۰۵۰ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ مین پوری، ایٹہ، بستی، گونڈہ، بہرائچ، فتح پور، ہردوئی اور بدایوں میں سینچائی کی مزید سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بھی خصوصی اسکیمیں وضع کی جا رہی ہیں۔ ان اسکیموں پر بھی ۲۰۵۰ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ ان پراجکٹوں کو اولیت کی بنیاد پر بروئے کار لانے کی تجویز ہے۔

صنعتی ترقی۔ اودکھلا میں ایک صنعتی بستی کی تجویز ہے۔ توقع ہے کہ تقریباً دس ہزار صنعتی واحدے قائم ہوں گے جن میں ۵۰۰۰ افراد کو روزگار مل سکے گا۔ اس اسکیم کے لیے ایک ترقیاتی اتھارٹی قائم کی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کروڑ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

ریاست کے بعض مقامات مثلاً مرادآباد، سہارن پور، آگرہ وغیرہ اپنی مخصوص صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ ان مقامات پر صنعتی کمپلکس قائم کرنے کی تجویز ہے تاکہ صنعتی واحدوں کو خام مال بینکوں سے مالی امداد اور خرید و فروخت کی سہولتیں وغیرہ حاصل ہو سکیں۔

سوتی دھاگہ کی سپلائی کو بہتر بنانے کے لیے دس دھاگا ملیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ان میں دو ملیں امداد باہمی زمرہ میں ہوں گی۔ بنکروں کو ڈیزائن کی تیاری اور بنائی کی تربیت دینے کی غرض سے ایٹہ اور گورکھپور میں دو ڈیزائن مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ امداد باہمی خرید و فروخت کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔ ریڈی میڈ کپڑوں کا ایک کمپلیکس شاہجہاں پور میں قائم کیا جا رہا ہے۔

آئندہ تین سال کے دوران میں قالین کی برآمد کے نشانے کو ۴ کروڑ روپیہ سالانہ سے بڑھا کر ۱۰ کروڑ روپیہ کر دینے کی تجویز ہے۔ بنکروں کو ٹریننگ دینے کی غرض سے ۱۰۰ مرکز قائم کیے جائیں گے جس کے نتیجہ میں ان بنکروں کی تعداد ۴۰۰۰ سے بڑھ کر دو لاکھ ہو جائے گی۔

پردیش کے پسماندہ ضلعوں میں صنعتی ترقی مرکز قائم کیے جائیں گے۔ ان مرکزوں میں نئے صنعت کاروں کو رعایتی شرح پر زمین فراہم کی جائے گی۔ اس اسکیم کی مالی ضرورتوں کے لئے ۲ لاکھ روپیہ کی رقم فراہم کی جا رہی ہے۔

تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کے لئے ایک اسکیم تیار کی گئی ہے تاکہ وہ نئے واحدے قائم کر سکیں۔ ان لوگوں کو درکار مجموعی سرمایہ کی ۱۰ فیصد رقم رعایتی شرح سود پر بطور قرض دی جائے گی۔

بلند شہر میں ایک اونی دھاگا کی کتائی مل قائم کی جائے گی۔

تعلیم۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے درجات کی درسی کتابوں کو قومیانے کے لیے کامیاب اقدامات کیے گئے۔ اردو اکاڈمی کی مدد سے پہلے سے آٹھویں درجوں کی قومیائی ہوئی کتابوں کے نظرثانی شدہ اردو ایڈیشن شائع کرنے کی تجویز ہے۔ طالب علموں کو کنٹرول قیمت پر کاپیاں فراہم کی جا رہی ہیں۔

طالب علموں کی سہولت کے لیے تعلیمی اداروں میں کتب بینک قائم کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران ایک کروڑ روپیہ کے بندوبست کی تجویز ہے۔

علاج و صحت۔ لکھنؤ میں میڈیکل سائنسوں کا ایک پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جا رہا ہے جس کے لیے سال رواں کے دوران ۵۰ لاکھ روپے مہیا کیے گئے ہیں۔ سرکاری اسپتالوں میں دواؤں کی فراہمی میں اضافہ کرنے کے لیے بجٹ میں ایک کروڑ روپیہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

ریاست میں سہ مرحلہ طبی خدمت کے تصور کو اصولی طور پر مرحلہ وار بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس سے ابتدائی صحت مرکزوں پر عوام کے لیے صحت سے متعلق زیادہ سے زیادہ

سہولت، تحصیل اور ضلع کی سطح کے اسپتالوں میں طبی مشورہ سروس
فراہم اسپتالوں اور اداروں میں ماہرین کی طبی خدمت کا
بندوبست ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں ابتدائی اقدام کے
طور پر میڈیکل کالجوں اور ضلع اسپتالوں کے ماہرین پر مشتمل گشتی
ٹیمیں قائم کی جائیں گی جو اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے عوام کو فائدہ
پہنچانے کے لیے دیہی علاقوں کا دورہ کریں گی۔

ریاست کے تمام میڈیکل کالجوں میں رضاکارانہ طور پر خون کا
عطیہ دینے کی اسکیم کی توسیع کی جائے گی۔ ضلع اسپتالوں میں قائم
بلڈ بینکوں کو سرگرم بنانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

کوڑھ کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے ایک مہم کے جز کے طور پر
۱۵ کوڑھ کنٹرول یونٹ، ۲۰۰ جائزہ و تعلیمی و علاج و معالجہ
مراکز، ۱۶ شہری کوڑھ کنٹرول یونٹ اور ایک ری کانسٹرکٹو
مرکز قائم کیا جائے گا۔ جائزہ و تعلیمی و علاج و معالجہ مرکزوں کے
دائرۂ عمل میں شہر بھی آئیں گے۔ جہاں بڑی تعداد میں یاتری
آتے رہتے ہیں۔

ہریجنوں کی بہبود و ترقی۔ ہریجنوں کی بہبود و
ترقی کے لیے ایک ہریجن مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن قائم
کیا گیا ہے۔ اسی طرح میدانی علاقہ کو ترائی منطقہ میں رہنے
والے مندرجہ فہرست قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بھی
ایک کارپوریشن قائم کیا گیا ہے۔ ہریجنوں اور کمزور طبقوں
سے متعلق ایک ہاؤسنگ بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جو
ادارہ جاتی وسائل کے ذریعہ سرمایہ فراہم کرے گا اور اقوام و
قبائل مندرجہ فہرست کے لیے مکانات تعمیر کرے گا۔

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے سرکاری محکموں،
سرکاری زمرہ کے اداروں اور لوکل باڈیز کی ملازمتوں میں پہلے
سے ہی نشستیں محفوظ ہیں۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مناسب قانون
وضع کر کے مذکورہ بالا زمرے کے لوگوں کے لیے نجی زمرہ میں بھی
نشستیں محفوظ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

مزدوروں کی بہبود۔ بے زمین کھیت مزدوروں کو
زمین الاٹ کی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کی جانب سے سرمایہ
حصص فراہم کرنے کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں تاکہ
وہ امداد باہمی انجمنوں کے ممبر بن سکیں اور زرعی سامان کی
خریداری کے لیے ضروری قرضے حاصل کر سکیں

بڑھاپے کی پنشن اسکیم کے تحت پنشن کی شرح بھی ۳۰ روپیہ
ماہانہ سے بڑھا کر ۴۰ روپیہ ماہانہ کی جا رہی ہیں۔

کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتیں جو تین روپیہ ۲۰
پیسے اور چار روپیہ ۵۰ پیسے کے درمیان تھیں بڑھا دی گئی ہیں جو اب ساڑھے
چار روپیہ اور ساڑھے چھ روپیہ کے درمیان ہوں گی۔

اسپورٹس۔ کھلاڑیوں کی بہبود سے متعلق ایک ٹرسٹ
قائم کیا گیا ہے تاکہ معمر کھلاڑیوں اور ایسے کھلاڑیوں کو جو مالی دشواریوں
سے دوچار رہیں، مالی امداد دی جا سکے۔

ماحول کے سدھار کے لیے اقدام۔ قدرتی وسائل کے
استعمال اور مناسب ماحول برقرار رکھنے کے سلسلہ میں ایک پالیسی
وضع کرنے کے لیے ماحول اور معیشت کا ایک نیا محکمہ قائم کرنے
کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

ملازمین کی فلاح و بہبود۔ ریاستی ملازمین کو یکم
مارچ ۱۹۷۶ء سے مزید مہنگائی بھتے کی ایک قسط منظور کرنے
کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے سبب سرکاری خزانہ پر ۱۲ کروڑ
روپیہ کا بار پڑے گا۔

ریاستی سرکاری ملازمین کی گروپ انشورنس اسکیم پر عمل درآمد
کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

حکومت اور اس کے نان گزیٹیڈ ملازمین کے درمیان
خیر سگالی کو برقرار رکھنے کے پیش نظر ایک مشترکہ مشاورتی مشنری
کے قیام کی تجویز ہے۔

وہ عارضی ملازمین بھی پنشن کے مستحق قرار دیے جائیں گے
جو دوران ملازمت نابینا یا معذور ہو جائیں گے۔

پنشن پانے والوں کو بھی اُن کی پنشن کی شرحوں میں اضافہ
کر کے راحت دی جائے گی۔ اضافہ کی یہ رقم سو روپیہ تک ماہانہ

نپشن والوں کے معاملے میں دس روپیہ ماہوار، سو روپیہ اور ۲۰۰ روپیہ کے درمیان نپشن پانے والوں کے معاملے میں ۱۵ روپیہ ماہوار اور ۲۰۰ روپیہ سے زائد نپشن پانے والوں کے معاملے میں ۲۰ روپیہ ماہوار ہو گی۔

شجر کاری ۔ تجویز یہ ہے کہ ۱۱ سال سے اوپر کی عمر کے ہر طالب علم کو کم سے کم ایک درخت لگانا ہوگا۔ یہ بڑے پیمانہ کی شجر کاری اسکیم کا ایک جز ہے جس کے تحت تعلیمی اداروں میں ٹیچروں اور طالب علموں کو جنگلات اور باغبانی کے محکموں کے کام سے وابستہ کیا جائے گا۔

ادارہ جاتی مالیات ۔ فروری ۱۹۷۵ء اور ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء کے درمیان ۳۲۸ نئی اسکیمیں جن کی لاگت ۴۴۵٫۴۸ کروڑ روپیہ ہوتی تھی ادارہ جاتی مالیات کے لیے پیش کی گئیں جن میں سے ۴۰٫۵۰۸ کروڑ روپیہ دستیاب ہو سکا۔ ریاست کے تمام اضلاع کو ایکو سینیل رہن کی سہولت بہم پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اتر پردیش کا مغربی منطقہ ریاست میں اناج کی کھیتی تصور کیا جاتا ہے، تاہم زرعی زمرہ میں مزید پیداوار کی گنجائش نکل سکتی ہے بشرطیکہ زرعی آلات آبپاشی کی سہولتیں اور بجلی سپلائی تمام سطحوں پر مہیا ہوں۔ اس کے علاوہ مٹی کی جانچ کی سہولت نیز تحقیقاتی اور تکنیکی رہنمائی فراہم کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ جدید زرعی طریقوں کو اپنایا جا سکے۔ ان مقاصد کے لیے ۳ کروڑ روپیہ کی رقم کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

★

اڑن طشتریاں — (صفحہ ۱۹ کا بقیہ)

کچھ اور ہے اسی طرح اڑن طشتریاں بھی دیکھنے میں اگرچہ خلائی راکٹ معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی حقیقت انعکاس شعاع کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ اس لیے مندرجہ ذیل شعر کا اطلاق اڑن طشتریوں پر بھی ہو سکتا ہے:۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یہ بات قرین قیاس ہے کہ خلائی ٹکنالوجی کے بڑھتے ہوئے علم کی بدولت مسٹر ڈونلڈ۔ ایچ۔ منیزل کا نظریہ کہ اڑن طشتریاں محض منعکس برق رفتار کرنیں ہیں مستقبل قریب میں ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ جائے مگر اس وقت تو اڑن طشتریاں خواہ ان کا وجود ہو یا نہ ہو ہمارے لیے ایک عجوبہ اور ایک معمہ بنی ہوئی ہیں۔

★

سید احمد علی شاہ (صفحہ ۱۳ کا بقیہ)

اس شہر کا نام معظم آباد رکھا۔

محبوب التاریخ کے آخر میں سید احمد علی شاہ نے گورکھپور کے مختلف محلوں، میلوں اور رئیسوں کا ذکر کیا ہے۔

سید احمد علی شاہ کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں شعر گوئی کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن وہ ایک کہنہ مشق شاعر نہیں تھے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کسی استاد فن کی شاگردی اختیار نہیں کی اور نہ کسی سے اصلاح لی۔ اس لیے ان کے کلام میں بہت سی خامیاں فنی موجود

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

دفتر والی سڑک (افسانوی مجموعہ) مصنف۔ ضیا حسنی
ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ دین و ادب۔ ۱۰۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔ ۲۔ سید انفر ضیا حسنی۔ چھوٹی بازار فتح پور (یوپی) قیمت: ۶ روپیہ۔ ضخامت ۱۸۱ صفحات

"دفتر والی سڑک" ضیا حسنی کے انیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، زیر بحث کتاب کا مطالعہ کرتے وقت جس چیز نے سب سے پہلے مجھے متوجہ کیا وہ ضیا صاحب کا "اظہار ذات" ہے یعنی وہ بیشتر افسانوں میں صیغہ واحد متکلم استعمال کرتے ہیں بقول مولانا آزاد مرحوم یہ محض "انا" کی ترجیح نہیں ہے بلکہ ایک "ادبی داؤ" بھی ہے۔ اس (شعوری یا غیر شعوری طور پر) مصنف کی "خودنوشت"، بھی مرتب ہو جاتی ہے اور یہ بھی خدشہ نہیں رہتا کہ کوئی اپنی ہتک پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضیا حسنی کی "میں" صرف فائدہ نمبر ۲ کے لیے ہے۔ فائدہ نمبر ایک ہم اپنے طالب علمان ادب یعنی تحقیق کے دل دادہ خود اٹھالیں گے مثال کے طور پر اس مجموعے کے پہلے ہی افسانہ کا جائزہ لیجیے تو افسانہ کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔

"میں روزانہ اپنی الجھی شخصیت پر سیٹری لین کی بُشرٹ اور پینٹ کا خول چڑھا کر اسے سلجھا لیتا ہوں اور نو بجے گھر سے چل پڑتا ہوں۔" (دفتر والی سڑک صفحہ ۷)

اسی افسانے کا ایک جملہ یہ بھی ہے۔

"میری عجیب کیفیت ہے جیسے دنیا ٹھکراتی ہے اسے میں دوڑ کر سینے سے لگا لیتا ہوں۔" (دفتر والی سڑک صفحہ ۹)

دوسری خصوصیت جو اس کتاب کے مطالعہ کے دوران قاری کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے یہ ہے کہ ضیا حسنی ہر وقت صرف اظہار ذات میں مشغول نہیں رہتے بلکہ وہ دوسروں کے دکھ درد میں بھی شرکت کرتے ہیں ان کا سماجی شعور کافی پختہ اور بالغ ہے مثلاً ان کے خیر سگالی کے یہ جذبات:۔

"شیام اور میں، سوچو تو کتنا فرق ہے دونوں میں، ہزاروں میل دور بستیاں ایک تیش، ایک ملک تو کہلائی جا سکتی ہیں لیکن دو ہم خیال ایک ہی جگہ بسنے والے مل نہیں سکتے اس لیے کہ وہ الگ خانوں میں بٹ چکے ہیں لیکن نہیں، نہیں، دنیا میں اب بھی انسان بستے ہیں کہ یہ زمین کبھی انسانوں سے خالی نہ ہوگا۔ جن لوگوں کے دلوں میں درد ہے، بھائی چارے کا جذبہ ہے، وہ آہنی حدود کو توڑ کر بھی برابر ملتے رہیں گے۔"

ضیا حسنی کے یہاں اکثر لطیف طنز کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو

"شاہد! ہم لوگوں نے عمر کی اس منزل کو چھو لیا ہے کہ اب ان بیگمات کی شان میں قصیدے کہنے ہی میں عافیت ہے۔"
(محبت کا پل صفحہ ۱۵۲)

بعض مقامات پر ضیا حسنی کا قلم بجائے افسانہ نگاری کے شاعری کرنے لگتا ہے وہاں یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگار ہیں یا شاعر؟

غرض "دفتر والی سڑک" ہمیں ایک ایسے ضیا حسنی سے ملواتی ہے جو تعلیم یافتہ، نفیس مزاج اور گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ وہ ایک ایسا باشعور ادیب ہے جو بھرپور اور سرگرم زندگی گزارتا ہے۔ جو اچھی کتابیں پڑھتا ہے، اچھے دوستوں کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے، بیوی بچوں سے پیار کرتا ہے دفتر بھی جاتا ہے، افسانہ نگاری بھی کرتا ہے، شعر بھی کہتا ہے، بیمار بھی ہوتا ہے، حسین و جمیل لڑکیوں سے رومان بھی کرتا ہے۔ گاؤں کا عاشق اور شہری زندگی کا قصیدہ خواں بھی ہے۔

اس کتاب کے مشمولہ افسانے ہماری موجودہ زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں انسانی نفسیات کی باریکیاں بھی ہیں، سیاسی نظریات بھی، قومی یک جہتی کا شعور بھی ہے۔ عورت مرد کے جذبات کا اتار چڑھاؤ بھی۔ عبارت آرائی بھی ہے، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور طنز بھی مختلف مناظر کی تصویر کشی بھی ہے اور روزمرہ کے مسائل کی طرف واضح اشارہ بھی۔

مجھے یقین ہے کہ دفتر والی سڑک ضیا حسنی کو پختگی فن اور بقائے دوام کی اس منزل کی طرف لے جائے گی جو ارفع و اعلیٰ اور روشن و منور ہے۔

—— ڈاکٹر سید مجاہر حسین حسینی

"جدید ہندی شاعری" سمت و رفتار مصنف : ڈاکٹر فضل امام۔
قیمت : سات روپے پچاس پیسے
ضخامت ۸۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ: کتاب نگر دین دیال روڈ۔ لکھنؤ۔

اردو میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ منفرد تصنیف ہے۔ جس میں پہلی بار "جدید ہندی شاعری" کی سمت و رفتار کا آج تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے قبل ان کی تصنیفات و تالیفات اردو اور ہندی میں شایع ہو چکی ہیں۔ جن میں "بھوج پوری ادب کا تعارف"، "امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری" "مثنوی خنجر عشق" اور "اردو ساہتیہ: ایک جھلک" گراں قدر ہیں اور اردو اکاڈمی پٹنہ اور اتر پردیش اکاڈمی، لکھنؤ نے ان کو اپنے گراں قدر انعامات سے نوازا بھی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا آغاز "بھارتیندو عہد" سے ہوتا ہے اور "نئی کویتا" پر اختتام ہوتا ہے۔ اس میں ہندی کے مختلف

شعری رجحانات مثلاً "دویدی عہد"، "چھایا واد" "واد"، "پرگتی واد" "پریوگ واد"، "پرپدیہ واد"، "نئی کویتا" پر مختصر بحث کی گئی ہے۔ چند نمایندہ شعرا پر بھی تنقید و تبصرے سے کام لیا گیا ہے جس سے ہر رجحان کی صحیح شکل اور رفتار واضح ہو گئی ہے۔ آخر میں جدید شعری رجحانات کا مختصر انتخاب بھی شامل ہے۔ جس سے ڈاکٹر فضل امام کی تنقیدی اور تحقیقی نگاہ کے ساتھ وسعت مطالعہ کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ڈاکٹر صاحب نے حواشی کے طور پر مشکل ہندی الفاظ کے معنی اور چند نمائندہ نظموں کا تجزیہ پیش کر دیا ہوتا تو یہ کتاب اور بھی وقیع ہو جاتی۔ بہر یہ تصنیف ان طلبا کے لیے بھی مفید ہے جو ایم۔ اے اردو میں کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ان تمام لوگوں کے لیے بھی مفید ہے جو ہندی زبان و ادب کے سرمایے سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

—— امیر احمد صدیقی

فخر الدین علی احمد مولفہ۔ مہ لقا اعجاز۔ صفحات ۸۰ قیمت پانچ روپے۔ پتہ: اسلامیہ بکڈپو۔ طلاق محل کا نپور۔

اس کتاب میں مہ لقا اعجاز صاحبہ نے صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحب اور ان کے خاندان اور متعلقین کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کا پہلا باب فخر الدین علی احمد صاحب کے صدارتی الیکشن کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف حلقوں کے تاثرات کے بارے میں ہے۔ دوسرے باب میں احمد صاحب کے حالات زندگی ہیں۔ تیسرا باب سلسلۂ نسب اور خاندان سے تعلق ہے۔ اس کے بعد صدر صاحب کے بھائی بہن جس میں خصوصی طور پر حمیدہ سلطانہ صاحبہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد خاتون اول صدر کی بیگم عابدہ احمد صاحبہ اور ان کے والد صاحب کا تذکرہ ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب مہ لقا اعجاز صاحبہ کی صدر صاحب کے بارے میں ایک عقیدت مندانہ کاوش قلم ہے جو قومی اعتبار سے قابل تعریف ضرور کہی جا سکتی ہے۔

شہیدانِ آزادی ہند مصنف۔ ایم۔ اے۔ رؤف۔ صفحات ۱۶۰ قیمت: آٹھ روپے۔ پتہ: اڈیٹر گلزار، یاقوت پورہ۔ حیدر آباد۔ ۲۳

اس کتاب میں ۲۹ شخصیتوں پر مختصر مضامین لکھے گئے ہیں جن کے مصنف شہیدان آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان میں کئی شخصیتوں کی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی، ایسی صورت میں میرے خیال میں ان کو مجاہدین آزادی کے لقب سے یاد کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اسی طرح کتاب کے مختلف مضامین بھی سطحی، غیر تحقیقی مبتدیانہ کوشش معلوم ہوتے ہیں جن کی زبان بھی معمولی اور ناقص ہے۔ شہیدان آزادی اور مجاہدین آزادی کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ رؤف صاحب ایک نظر ان تحریروں پر ڈال لیتے تو بہت اچھا ہوتا۔

ذکی کاکوروی

آئینہ: مجموعہ کلام۔ تاج پیامی ناشر: حلقۂ احباب۔ آرا بہار قیمت: ۳ روپے ۵۰ پیسے۔ صفحات: ۴۳

جیسا کہ درج بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ آئینہ تاج پیامی صاحب کے شعری مجموعہ کا نام ہے۔ جسے حلقۂ احباب آرا نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے اور اردو اکیڈمی بہار نے اس کو انعام سے سرفراز فرمایا ہے۔ تاج صاحب جواں سال شاعر ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم شعرا اور اردو کی روائتی شاعری کے اثرات بہت زیادہ قبول کیے ہیں۔ دہلی اسکول سے تعلق رکھنے کے باوجود قدیم روایتی رنگ سخن کے غزل گو معلوم ہوتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرے اقرار گنہ پر مجھ کو جنت مل گئی
اے فرشتو اب کہو حشر اپنی تم تحریر کا

واعظ ذرا انھیں بھی نصیحت کے چند گھونٹ
جن کو خبر نہیں ہے کہ عاشق کا دل ہے کیا

زاہد بھی میکدے میں نظر آ رہا ہے آج
کیا اس کو ڈر نہیں ہے حساب و کتاب کا

بندھے ہیں سجہ و زنار کے رشتے میں جب دونوں
نہ جانے کیوں ہے اَن بن اس قدر شیخ و برہمن میں

مندرجہ بالا اشعار تاج پیامی صاحب کے مزاج و مذاق کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھیں گے اور خوب سے خوب تر کی جستجو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشتی رہے گی۔

—— ساغر مہدی

جلد ۳۲ نمبر ۲

جون سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

روی موہن سیٹھی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات، اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی، لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی، لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

حال ہی میں ملک کی محبوب رہنما وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے دو اہم تاریخی فیصلے کیے ہیں جو ان کی سوجھ بوجھ، دور اندیشی، صلح جوئی اور امن دوستی کا بیّن ثبوت ہیں۔ ایک تو چین سے سفارتی تعلقات کے درجہ کو بلند کرنا اور دوسرے ہندستان اور پاکستان کے درمیان تمام منقطع رشتوں کی بحالی۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان نے منقطع کر لیے تھے۔ لیکن دونوں ممالک کے باہمی مفاد کا یہ تقاضا تھا کہ دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات اور سفر کی سہولتیں جلد از جلد بحال ہو جائیں۔ چنانچہ وزیر خارجہ ہندستان نے گزشتہ ۱۸ مئی کو جب پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات، فضا، ریل اور سڑک کے ذریعے آمد و رفت کے منقطع رشتے ۱۰ جولائی سے ۲۴ جولائی کے درمیان بحال ہو جائیں گے تو ہر طرف سے نعرہائے تحسین بلند ہوئے۔ اس سلسلے میں ہندستان اور پاکستان میں سکریٹریوں کی سطح پر تین روزہ گفتگو ۱۲ مئی سے ۱۴ مئی تک اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ اس گفتگو کی کامیابی کے لیے ہر طرح سے ماحول سازگار تھا کیونکہ دونوں ممالک نے تعاون اور مفاہمت کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس سمجھوتے سے دونوں ممالک کے درمیان پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور مفاہمت کا ایک نیا ماحول پیدا ہوگا۔ اگر برصغیر میں مفاہمت اور باہمی اعتماد قائم رہے گا تو دونوں ممالک اپنی اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ وزیر خارجہ شری چوان نے اس موقع پر پارلیمنٹ کو مطلع کیا کہ جولائی ۱۹۷۲ء میں شملہ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے وقت سے ہندستان کی پالیسی برابر یہی رہی کہ ہندستان اور پاکستان کے منقطع رشتے نہ صرف بحال ہوں بلکہ دونوں ملکوں کے رشتے اس شملہ سمجھوتے کی روشنی میں استوار بھی کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس درمیان میں کئی مسائل حل کر لیے گئے۔ دونوں کے درمیان ڈاک سروسیں اور ٹیلی مواصلات پھر قائم ہوئے اور سفر کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ویزا سمجھوتہ پر دستخط ہوئے۔ گزشتہ سال جنوری میں جہاز رانی اور تجارت کے بارے میں بھی سمجھوتہ ہوا۔ لیکن شملہ سمجھوتے کی بعض دیگر مدیں جن میں خاص فضائی اور زمینی راستوں سے آمد و رفت اور سفارتی تعلقات کی بحالی تھی، طے نہیں ہو پائی تھیں۔ اب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی خصوصی دلچسپی اور کوششوں سے یہ مسائل بھی طے ہو گئے ہیں جس کا عام طور سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔

ریاست اتر پردیش ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل ہے۔ وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں یہ اعلان کیا کہ حکومت ایسے تمام افراد سے سختی سے پیش آئے گی جو وزیر اعظم کے معاشی پروگرام میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ انھوں نے سرکاری افسر اور ملازمین کو بھی متنبہ کیا کہ اگر وہ پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں کسی قسم کی تساہلی برتیں گے یا دشواریاں پیدا کریں گے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ ہماری ریاست نے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عمل درآمد کرنے میں ابتدا ہی سے بڑی مستعدی دکھائی ہے۔ اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے ایک جامع اسکیم وضع کی گئی جس میں حکومت کے مختلف محکموں، ریاست کے عوام اور ان کے نمائندوں، مالیاتی اور امداد باہمی اداروں وغیرہ کو پوری طرح سے مستعد اور سرگرم عمل بنانے کے اقدامات کیے گئے۔ ہر سطح پر کام کی رفتار کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس پروگرام سے ہر شعبۂ زندگی میں جوش اور امنگ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کافی کام ہو چکا ہے اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے مقررہ نشانہ کو پورا کرنے کے لیے ریاست تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس پروگرام کو آگے بڑھانے اور اس پر عمل درآمد کی نگرانی کے واسطے حکومت کی سطح پر چیف سکریٹری برانچ میں ایک کمشنر کی نگرانی میں مخصوص شعبہ قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی سطح پر ایک عمل درآمد کمیٹی کی بھی تشکیل کی جا چکی ہے۔
اب ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اس عظیم مہم کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت کو اپنا پورا پورا تعاون دیں۔

آئندہ ۲۶ جون کو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا ایک سال پورا ہو جائے گا۔ ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ملک میں بعض سیاسی جماعتوں اور سماج دشمن عناصر نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اگر صدر جمہوریہ ہند نے ایمرجنسی کا اعلان بر وقت نہ کر دیا ہوتا تو ہماری آزادی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ملک میں ہر طرف ضبط و نظم، امن و قانون اور تحفظ کی نہ صرف ایک فضا قائم ہو گئی ہے بلکہ ہر شعبۂ زندگی اور ہر پیداواری زمرے میں ترقی دکھائی دے رہی ہے۔ ایمرجنسی کی عطا کردہ نعمتوں اور اس دوران میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں نیز ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں جو سرگرم کوششیں جاری ہیں ان سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے نیا دور کا ایک خصوصی نمبر "ایمرجنسی کا ایک سال" شائع کیا جا رہا ہے۔ ہمارا یہ خصوصی نمبر ۲۶ جون ۱۹۷۶ء کو شائع ہوگا جو جولائی کا شمارہ تصور کیا جائے گا۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد ہمارا اگست کا نمبر شائع ہوگا۔ قارئین نیا دور نوٹ فرما لیں۔

— ایڈیٹر

اے ہم سفرو!

نازش پرتاب گڑھی

عجب مقام پر آیا تھا کاروانِ وطن
جہاں زمیں پہ لہو تھا تو آسمان پر آگ
ہر ایک سمت اندھیرا تھا تنگ ذہنی کا
ہر ایک موڑ پہ فرقہ پرستیوں کے تھے ناگ

وہ زہر پھیل چکا ہے جو ہر رگ و پے میں
اسے مفاد پرستوں ہی نے اُچھالا تھا
جو شاہراہوں پہ بیٹھا تھا پھن اٹھائے ہوئے
ہمارے دوست نما دشمنوں نے پالا تھا

بھلا وہ دیتے ہمیں کس طرح کوئی تریاق
جو لوگ زہر کو ڈرتے تھے زہر کہتے ہوئے
وہ کیوں تلاش ہی کرتے حیات کا سُورج
جو کانپتے تھے اندھیروں کو قہر کہتے ہوئے

عمل کا نام تو تھا ہر زبان پر لیکن
جو باروَر ہو وہ کوشش کبھی نہ ہوتی تھی
پیامِ امن تو ملتا تھا سب کے ہونٹوں پر
قیامِ امن کی خواہش کبھی نہ ہوتی تھی

وہ قتل و خون وہ غارت گری وہ بربادی
انھیں کی ذات سے تھی جن کے روپ دوہرے تھے

وہ طرح طرح کی سینائیں، فوجی تنظیمیں
کھلاڑی اور کوئی تھا وہ صرف مہرے تھے

ہزار شکر کہ پھیلے ہوئے اندھیروں میں
چراغِ فکر و نظر روبکار آ ہی گیا
نگاہِ شوق کو مل ہی گئے مناظرِ حسن
دلِ غریب کو آخر قرار آ ہی گیا

تباہیوں کا سبب تھا خود اپنی کمزوری
بجا نہ ہوگا جو الزام دوسروں پہ دھریں
یہ دور وہ ہے کہ جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ دور وہ ہے کہ اپنی مدد خود آپ کریں

بجا کہ راہبرِ دور بیں ملا ہے مگر
تم اپنے ذوقِ سفر کو بھی ہوشیار کرو
نہیں ہے اب کوئی کانٹا تمھارے رستے میں
قدم کو تیز، نظر کو بھی ہوشیار کرو

بجا، پیامِ عمل مل گیا تمھیں لیکن
تم اپنی قوتِ عزم و عمل بھی پہچانو
حیات چھین لو وقتِ رواں کے ہاتھوں سے
حیات بھیک میں ملتی نہیں ہے دیوانو

مرزا جعفر حسین

رئیسوں کے دسترخوان

گذشتہ لکھنؤ کی ایک جھلک

ہمارا شہر لکھنؤ نفاست، نزاکت اور تنوع کے لیے مشہور تھا۔ یہاں کے پرانے باشندے اپنی اپنی حسب استطاعت اِن خصوصیات کا ہر موقع اور ہر محل پر خیال رکھتے تھے اس طرح اُن کی جبلت میں یہ اوصاف داخل ہو گئے تھے لہٰذا رہن سہن ہو یا لباس و طعام، زندگی کی ہر ضرورت کی فراہمی میں آرٹ کو دخل تھا۔ رؤسا کے محلوں اور محل سراؤں میں ایجادات و اختراعات ہوتے رہتے تھے اور اُن کے مقربین و مصاحبین کی وساطت سے یہ فنکاریاں عوام تک پہنچ جاتی تھیں اور وہ اپنی حیثیت کے تحت اُن میں رد و بدل کر کے اُن کو اپنا لیتے تھے۔ اس عمل رد و بدل کا لازمی نتیجہ تھا کہ ہر ہر چیز میں رنگ آمیزیاں اور گل کاریاں بڑھتی ہی رہتی تھیں یہی طریقہ کار غذاؤں کے سلسلہ میں بھی تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں نے کھانا پکانے، کھانا کھانے اور کھانا کھلانے کو فن کے درجہ تک پہنچا دیا تھا جس کے نتیجہ میں اس شہر نے بہتر سے بہتر باورچی پیدا کیے اور طرح طرح کے لذیذ، خوش گوار، خوش رنگ و خوش بو غذائیں معرض وجود میں آگئیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک دسترخوانوں کا دور دورہ تھا اور ہر رئیس کے دسترخوان کی کوئی نہ کوئی نعمت ممتاز حیثیت کی مالک تھی۔ ان میں سے اکثر و بیشتر غذائیں تو درکنار ان کے نام تک مفقود ہو گئے اور جو نام یاد بھی ہیں تو ان ناموں کی غذائیں اپنی اصل شکل و صورت اور ذائقہ میں عنقا ہیں۔ مثلاً میرے نانا مرحوم کے دسترخوان کے کباب "کوفتۂ معلائے عجمی" کا نام بھی شاید اب کسی کو یاد ہو یا جد امجد خان علامہ کے دسترخوان کی اکثر و بیشتر غذاؤں میں "سلطانی دال" اور "بادشاہ پسند دال" کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں۔

غذاؤں کی طرح کھانا کھانے میں بھی التزام رہتا تھا۔ رئیسوں کا دسترخوان اُن کی مرضی سے بچھتا تھا کہنے کو وقت مقرر تھا مگر دور جدید کے اسلوب کی طرح وقت کی پابندی نہیں تھی۔ لیکن دو بجے دن کے اندر اندر ہر دسترخوان برخاست ہو جاتا تھا۔ بعض رئیس دونوں وقت محل کے باہر ہی "خاصہ نوش فرماتے تھے" لیکن قریب ہر رئیس کا ایک وقت دسترخوان اُس کی بیرونی نشست گاہ میں ضرور بچھتا تھا اور اس وقت جتنے بھی عزیز و اقارب دوست احباب اور متعلقین و مصاحبین موجود ہوتے سب کا شریک طعام ہونا ضروری تھا۔ انکار کرنا رئیس کی اہانت کے برابر ہوتا تھا۔ تواضع رئیسوں کی خمیر میں داخل تھی اور بعض محل سراؤں میں تو اس کا چلن اجنبی آنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوتا تھا۔ شہزادہ نواب باقر علی خاں کے یہاں ہر ملاقاتی کو کھانا کھانا فرض تھا۔ عذر خواہی شہزادہ موصوف کی شدید ترین غضبناکی کا باعث ہوتی تھی۔ ان کا باورچی خانہ صبح سویرے سے گیارہ بجے رات تک گرم رہتا تھا اور ہر آنے والے کو بہترین اور لذیذ غذاؤں کے علاوہ گرم گرم تازہ چپاتیاں پیش کرنا ضروری تھا۔ وہ خود علیحدہ اور انتہائی نرم اور ہلکی غذائیں کھاتے تھے لیکن دوسروں کو بہترین خوش ذائقہ

کھانے کھلا کے لطف حاصل کرتے تھے۔ شہزادہ موصوف نے لکھنؤ میں دو نئے چلن رائج کر دیے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جن کے یہاں مشاعرہ دن کو منعقد ہوا اور وہ پہلے رئیس تھے جس نے کرسی میز پر کھانا کھایا اور کھلایا۔ اُن کے علاوہ ہر رئیس کے یہاں دسترخوان بچھنا اور دسترخوان پر کھانا کھانا آدابِ تہذیب میں داخل تھا۔

دسترخوان بچھنے کا حکم صادر ہونے اور دسترخوان پر کھانا شروع ہونے میں اچھا خاصا وقت صرف ہو جاتا تھا اور اگر رئیس نے اپنی نشست گاہ ہی میں دسترخوان آ جانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقفہ میں اور زیادہ طوالت ہو جاتی تھی کیونکہ ملازمین کی تعداد زیادہ ہوتے ہوئے بھی انھیں پہلے ہاتھ دُھلانے کے لیے لوٹے اور سلفچیاں لانا پڑتی تھیں، کھانے پر پانی پلانے کا بھی ضروری بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ ان انتظامات کے تکمیل ہو جانے کے بعد دسترخوان بچھتا اور بسرعت تمام ملازمین باورچیخانے سے کھانے لاتے تھے۔ ان ملازمین کی حیثیت قلیوں کی سی ہوتی تھی جو کھانے خوانوں میں اپنے سروں پر لاتے تھے۔ ان کو رئیس کی حضوری میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ان خوانوں سے طشتریوں، پلیٹوں اور پیالیوں میں لگے ہوئے کھانے خدمت گار نکال نکال کے دسترخوان پر لگاتے تھے۔ اُس زمانہ میں ڈشوں اور ڈونگوں میں کھانے پیش کرنے کا دستور نہیں تھا۔ کھانے والے کے سامنے ہر چیز علیحدہ علیحدہ برتنوں میں لگائی جاتی تھی۔ البتہ گرم گرم پلاؤ، مزعفر، متنجن یا اور دوسری مخصوص میٹھی غذائیں بڑی بڑی قابوں میں دسترخوان پر لگا دی جاتی تھیں۔ رئیس کے لیے مخصوص طور پر کم سے کم دو اور کبھی کبھی اس سے زائد اُس کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں تیار کی جاتی تھیں انھیں غذاؤں کے نام سے اُس کا دسترخوان مشہور رہتا تھا۔ یہ غذائیں رئیس خود نوش کرتا اور اپنی حسبِ مرضی دوسروں کو پیش کر دیتا لیکن وضعداری میں داخل تھا کہ نئے شریکِ طعام ہونے والے کو وہ غذائیں پہلے پیش کی جائیں اور مصاحبین میں باری باری ہر ایک کو وہ کھانے بھی ضرور میسر آ جائیں۔

رئیسوں کی دوسرے رئیس کے یہاں ضیافت یا اتفاقیہ طور پر دسترخوان میں شرکت کبھی کبھی مقابلوں کا باعث بن جاتی تھی۔ ایک دوسرے کو مدعو کرتا اور ضیافت میں تنوع یا ذائقہ دراکہ میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس مقابلہ بازی نے باورچیوں کی ہنرمندیوں میں بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ ایسی داستانیں، قصے اور واقعے بکثرت مشہور تھے اور راقم الحروف کے بھی علم و یقین میں آئے جب غذاؤں کے معاملے میں رئیسوں نے مغالطے کھائے تھے لیکن اس سلسلہ میں صرف وہ تاریخی واقعہ پیش کر دینا کافی ہے جو بادشاہ واجد علی شاہ اور مرزا آسمان قدر بہادر کے دسترخوان پر ظہور پذیر ہوا تھا۔ بادشاہ کے یہاں شہزادہ شریکِ طعام تھے بادشاہ کے دسترخوان پر منجملہ دوسری چیزوں کے ایک ایسی غذا بھی موجود تھی جو دیکھنے میں نہایت نفیس اور جاذبِ نظر مربّہ معلوم ہوتی تھی لیکن شہزادہ مرحوم نے نوش کیا تو حیران رہ گئے کیونکہ وہ حقیقتاً گوشت کا نمکین قورمہ تھا۔ پکانے والے نے اپنی ہنرمندی سے مربّہ کی شکل اور صورت بنا دی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ بادشاہ یہ سمجھ کر گئے تھے کہ ان کو دھوکا دیا جائے گا مگر پھر بھی دھوکا کھا گئے شہزادہ بہادر کے دسترخوان پر صدہا کھانے چنے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے پلاؤ، مختلف طرز کے زردہ و مزعفر، متعدد قسم کی بریانی، طرز طرز کے کباب، طرح طرح کے قورمے، بے شمار ترکاریاں، پراٹھے، شیرمالیں، اچار، چٹنیاں غرضکہ ہر نعمت موجود تھی لیکن ہر چیز شکر کی بنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ تمام برتن، دسترخوان، سلفچی اور آفتابہ تک شکر کے بنے ہوئے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ لوگ اس واقعہ کو افسانہ سمجھیں لیکن یہ واقعہ سرتاسر حقیقت ہے جو پرانی قلمی بیاضوں اور تاریخوں میں مندرج ہے۔ اس واقعہ کو میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سُنا تھا۔

مرزا آسمان قدر بہادر کے صاحب زادے مرزا ثریا قدر بہادر کے خویش کی زبانی بھی سنا تھا اور ایک قلمی نسخہ میں بھی پڑھا تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ اور یاد آتا ہے جو مستند ہے۔ نصیر الدین حیدر کے دور میں ایک معزز مہمان غالباً دلی سے تشریف لائے تھے مہمان داری کے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے اُن سے دریافت کیا گیا کہ اُن کو کون غذا مرغوب ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میری رغبت کو جانے دیجیے میں لکھنؤ کی پکی ہوئی ماش کی دال کی کھچڑی چاہتا ہوں جس کی میں نے بہت تعریف سنی ہے۔ چنانچہ اُسی کھچڑی سے اُن کی ضیافت ہوئی۔ شاہی باورچی نے بادام کے سڈول اور صاف چاول اور پستہ کی دال تیار کر کے کھچڑی پکا دی تھی جو دیکھنے میں بجنسہٖ دھوئی ہوئی ماش کی کھچڑی نظر آتی تھی لیکن کھانے میں لذت ہی اور تھی بادشاہوں اور رئیسوں کی قدردانی کی بدولت اس شہر کے باورچیوں نے کھانا پکانے کے فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا تھا چنانچہ یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ محمد علی شاہ کے ایک صاحب زادے نے ایک شادی کے موقع پر اپنے سمدھی صاحب کی دعوت کی تھی تو اُن کے دسترخوان پر میٹھے اور نمکین سب شامل کر کے ستر قسم کے پلاؤ اور مزعفر تھے۔ یہ واقعات و حالات تو طاق نسیاں کی زینت بن چکے ہیں، ان کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ لکھنؤ کے حالات بگڑ جانے کے بعد بھی بیسویں صدی کے اوائل میں اتنے برقرار تھے کہ راقم الحروف کو بھی سات قسم کے پلاؤ کھانا مقدر میں لکھا تھا انھیں سات قسموں میں انار دانہ اور نورتن پلاؤ بھی تھے۔ انار دانہ پلاؤ میں چاول کا ہر دانہ آدھا یاقوت کی طرح سرخ اور آدھا سفید ہوتا تھا۔ نورتن پلاؤ میں نو رنگ کے چاول علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے اور اپنی چمک دمک سے دسترخوان کی زینت بن جاتے تھے۔

بادشاہوں اور شہزادوں کے دسترخوان تو اپنی آپ مثال تھے۔ اسی شہر میں کوئی ایسا رئیس نہیں تھا جس کا دسترخوان کسی نہ کسی نہج سے قابل تعریف نہ رہتا ہو۔ ہر دسترخوان پر ذائقہ، خوشبو اور خوش رنگی کا لحاظ برابر رکھا جاتا تھا اور تمول کے اعتبار سے غذاؤں میں تنوع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں تقریباً تمام ضروری اجزا پاک و صاف اور اعلیٰ قسم کے ملتے تھے۔ زیادہ تر کھانوں میں زعفران اور کیوڑہ برابر استعمال ہوتا تھا، خالص اور خوشبودار مسکا گھی میسر تھا اس لیے لذت اور خوشبو کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں تھی البتہ رنگ اور طرح طرح کے رنگ لانے میں صنعت گری اور فنکاری کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ باورچیوں کا تذکرہ لا حاصل ہے، گھروں کے اندر کھانا پکانے والی مامائیں اور بیگمات بھی بہتر سے بہتر کھانا پکاتی تھیں اور فنکارانہ صلاحیت کی مالک تھیں۔ آخری دور کا ذکر کرتے ہوئے یہ یاد آتا ہے کہ برادر مرحوم جعفر علی خاں اثر کی اہلیہ بہترین شش رنگا تیار کرتی تھیں جو اثر مرحوم کے دسترخوان پر قریب قریب ہر روز رہنا ضروری تھا۔ شش رنگا اپنے رنگ، خوشبو اور ذائقہ کے اعتبار سے بے حد لذیذ اور مفرح میٹھی غذا ہے جو سیب، گاجر، انناس اور سبز چنے سے تیار ہوتا تھا۔ دیکھنے میں ایک ہی برتن میں چھ رنگ علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے جو مجموعی طور سے بے حد جاذب نظر ہوتے تھے اور کھانے میں ہر رنگ والے حصہ کا علیحدہ لطف اور علیحدہ مزا ہوتا تھا۔ شش رنگے کے علاوہ ایک میٹھی غذا بھی دسترخوانوں کی زینت ہوتی تھی اس کو یاقوتی کہتے تھے اور جو بے حد مقوی اور مفرح سمجھی جاتی تھی اس کا رنگ یاقوت کی طرح ہوتا تھا اور اس پر پستہ کی ہوائیاں چھڑک کر اور چاندی کا ورق لگا کے اس کی لطافت و زیبائی کو دوبالا کر دیا جاتا تھا۔ اس غذا کو ہمیشہ مٹی کے برتن میں پکا کر نکالا جاتا تھا تاکہ سوندھا پن بھی آجائے۔

ذائقہ رنگ اور خوشبو کے علاوہ رئیسوں کی اولوالعزم طبیعت کو تنوع کا بھی بہت شوق تھا اور یہ شوق لکھنؤ کے زوال تک برقرار رہا تھا۔ چنانچہ میرے ایک عزیز اور مخلص دوست مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں نے جن کا دسترخوان بھی ایک زمانہ میں بہت وسیع تھا، ایک مرتبہ ناسازی مزاج میں باورچی سے منغّص ہو کر یہ فرمادیا تھا کہ بتیس۳۲ قسم کی چٹنیاں اور تینتیس۳۳ قسم کی کھچڑیاں پکائی جائیں میں نے کوشش کر کے اس دسترخوان پر شرکت کی تھی اور وہاں حقیقتًا اتنی ہی قسم کی چٹنیاں اور کھچڑیاں موجود تھیں لیکن اس تمام ذوق تنوع کے مقابل میں یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ایک خوراک ہر رئیس کے دسترخوان پر دونوں وقت اور ہر روز ضرور رہتی تھی اور وہی اس کی مخصوص ترین غذا ہوتی تھی۔ اس غذا کو قورمہ کہتے تھے جو گوشت کا عمومًا پکتا تھا لیکن موسم سرما میں بادام کا قورمہ بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس غذا کی یہ تعریف تھی کہ بلاناغہ دونوں وقت کھانے کے بعد بھی دل نہیں بھرتا تھا اور اس کا شامل طعام ہونا بیحد ضروری تھا۔ اس کھانے کا اب تک نام باقی ہے۔ ہر سادہ پکا ہوا گوشت قورمہ کہلاتا تھا لیکن وہ چیز جسے قورمہ کہتے تھے اب کہیں نصیب نہیں ہوتی۔ راقم الحروف نے اپنا گھر تو درکنار کسی بڑے سے بڑے تعلقدار یا کسی بڑی سے بڑی ضیافت میں وہ قورمہ نہ دیکھا اور نہ چکھا جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک ہمارے بہت سے خاندانوں میں ہر روز پکتا تھا۔ نہ اس کے لوازمات بازار میں ملتے ہیں اور نہ وہ پکانے والے باقی رہ گئے ہیں۔

دسترخوان پر تمام انواع واقسام کے کھانے لگ جانے کے بعد رئیس معہ اپنے شرکاء طعام کے کھانا کھانے کے لیے صدر مقام پر بیٹھتا، اس کے دونوں جانب احباب، مہمان یا مخصوص مقربین بیٹھتے تھے اور سامنے کی قطار میں ملازمین اور مصاحبین کی جگہ ہوتی تھی۔ یہ دونوں صفیں دسترخوان کی لمبائی میں بیٹھتی تھیں اور چوڑائی میں عمومًا دونوں طرف جگہیں خالی رہتی تھیں، کھانے کا سلسلہ دیر تک چلتا تھا اور اس تمام وقت میں جو جس طرح بیٹھتا بیٹھا رہتا تھا۔ شاعروں میں شعرا تمام رات ایک ہی طرح جیسے بیٹھ گئے بیٹھے رہتے تھے یہی آداب دسترخوان پر بھی ملحوظ رہتا تھا۔ پہلو بدلنا تہذیب سے بعید تھا۔ البتہ مختلف لوگوں کے بیٹھنے کا انداز مختلف ہوتا تھا کھانا بہت آہستہ آہستہ کھاتے تھے اور اس آہستگی میں طوالت کلام سے اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ باتیں سنجیدہ نہیں ہوتی تھیں لیکن پُرلطف اور دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ مصاحبین اپنے رئیس کا دل خوش کرنے کے لیے کسی مخصوص غذا کا نام لے کر ضلع جگت میں ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے، ادبا اور شعرا شریک طعام ہوتے تو وہ اپنے رنگ کی گفتگو کرتے لیکن دوران طعام کسی مابہ النزاع کا تذکرہ آجانا محال تھا بے تکلف دوست مزاح بھی کرلیتے تھے۔ چنانچہ ایک دسترخوان پر میرے حقیقی پھوپھا حکیم محمد باقر مرحوم نے باقوتی کو روغنی سکوری سے کسی قدر کھرچ کر کھایا تھا تو جناب میر علی محمد صاحب عارف[1] مرحوم نے جو شریک طعام تھے برجستہ فرمایا کہ "یہ کیا" انھوں نے جواب دیا کہ بہت سوندھی ہے۔ عارف صاحب مرحوم نے یہ فقرہ کہا کہ دسترخوان پر جو ٹکڑا گر جائے اس کو اٹھا کر کھالینا چاہیے۔ جنت میں حور ملے گی۔ مرحوم مولانا سید محمد رضا صاحب بھی تشریف فرما تھے انھوں نے متبسم ہو کر فرمایا کہ جو دسترخوان کی کھُرچن کھا جائے اس کو ستر حوریں ملنا چاہئیں۔ غرضکہ پڑھے لکھے شائستہ اور جلیل المرتبت لوگوں میں بھی دسترخوان پر مزاح ہو جایا کرتا تھا۔

وہ دور ختم ہوگیا، وہ رئیس مٹ گئے، ان کے دسترخوان اُٹھ گئے، اور کھانا کھانے والوں کے ساتھ کھانا پکانے والوں کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب ہم میز کرسی پر کھانا کھانے کے خوگر

---

[1] جناب عارف مشہور مرثیہ گو میر خورشید علی نفیس کے نواسے اور پوتے اور سید محمد حیدر جلیس کے بیٹے تھے، آپ کی ولادت ۱۸۶۰ء میں ہوئی، وفات ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء کو اپنے ماموں اور شاگرد دولھا صاحب عروج کے یہاں جاتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔ انیس کے انتقال کے وقت عارف کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔

ہیں، دوران طعام باتیں بھی کرتے ہیں لیکن ہماری "ٹیبل ٹاک" حالات کے تحت "بزنس ٹاک" ہوتی ہے اور کثرت کار کے باعث زیادہ وقت بھی میز پر خرچ نہیں کر سکتے یہ تغیر اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ قدریں بدل گئیں، پرانے کلچر کی جگہ نئے کلچر نے حاصل کر لی ہے اور یہ نیا کلچر اتنی شدت کے ساتھ حاوی ہے۔ ہم پرانے زمانے کے طور طریقوں کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور اُس دور کو اکثر تعیش اور اصراف کا عہد قرار دیتے ہیں موجودہ تغیر ناگزیر تھا مگر یہ عیب جوئی بڑی حد تک صحیح نہیں ہے ممکن ہے کہ جو کچھ ہمارے لئے تعیش ہو وہ ہمارے اجداد کی ضرورت رہی ہو اور اصراف کا الزام تو یقیناً غلط ہے۔ ہمارے باورچی خانے کے اخراجات فی زمانتنا پہلے کے مقابلہ میں بدرجہا زائد ہیں اور موجودہ اخراجات خود ہماری ہی کفالت کے لیے حسب مراد کافی نہیں ہیں چہ جائیکہ بے شمار دوسرے لوگوں کو بھی آسودہ کرنا جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ بہر حال ہم کو اپنے ہی زمانہ کی قدر کرنا ہے اور اسی زمانہ میں زندگی بسر کرنا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ لکھنؤ والوں نے کھانا پکانے، کھانا کھانے اور کھانا کھلانے کا جو فن اور ہنر ایک مدت مدید کی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا وہ ہم سے یک لخت جدا ہو گیا اور ان فنکاریوں کے عود کرنے کی اب کوئی توقع نہیں ہے۔

★

نیا دور کے قلمی معاونین سے

۱۔ نیا دور کو اشاعت کی غرض سے بھیجی جانے والی تخلیقات کاغذ کے صرف ایک جانب حاشیہ چھوڑ کر اور بین السطور دے کر خوشخط اور صاف تحریر میں ہونا چاہیے۔

۲۔ ادارہ نیا دور کو جو تخلیقات موصول ہو جاتی ہیں ان کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے تاہم ڈاک میں ان کے ضائع ہو جانے کا امکان بھی رہتا ہے اس لیے قلمی معاونین سے استدعا ہے کہ نیا دور کو بھیجی جانے والی ہر تخلیق کی نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ نیا دور کو اتنی کثیر تعداد میں تخلیقات خاص طور سے غزلیں موصول ہوتی ہیں کہ ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ رسید بھیجنا ممکن نہیں ہے اس لیے رسید یا جواب کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

۴۔ اگر کوئی تخلیق موصول ہونے کے چھ ماہ کے اندر شائع نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اشاعت کے لیے کسی دوسری جگہ بھیجی جا سکتی ہے۔

۵۔ اشاعت کی غرض سے بھیجی جانے والی ہر تخلیق غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہونا چاہیے۔ ترجموں کے سلسلے میں ادارہ کو یہ بھی مطلع کرنا ضروری ہے کہ اس کے ترجمہ کی اجازت مصنف یا پبلشر سے حاصل کر لی گئی ہے۔

۶۔ کسی تخلیق کی اشاعت کے بعد متعلقہ شمارے کی ایک اعزازی کاپی اور نذرانہ قلمی معاونین کو بھیجا جاتا ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں خط و کتابت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ تخلیقات کی واپسی کے لیے ٹکٹ چسپاں اور پتہ لکھا ہوا لفافہ آنا ضروری ہے ورنہ ادارہ پر ان کی واپسی کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

۸۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی تخلیق بھیجنا چاہیے۔

۹۔ زندہ شخصیتوں اور جدید مطبوعہ کتابوں پر مضامین شائع نہیں کیے جاتے۔

غزل

اسلم لکھنوی

درد بھی دے گئے اشک بھی دے گئے
جملہ عنوانِ دل بستگی دے گئے

آنسوؤں کے بجائے ہنسی دے گئے
غم زدوں کو نئی زندگی دے گئے

آنے والے خوشی کے پیامی بنے
جانے والے غمِ زندگی دے گئے

جن کو سمجھے تھے اپنا رفیق سفر
وقت پر ہم کو دھوکا وہی دے گئے

مست نظروں سے کرکے اشارہ ہمیں
آج وہ اِذنِ بادہ کشی دے گئے

اب فسردہ نہیں ہیں مرے داغ دل
ان چراغوں کو وہ روشنی دے گئے

چھین کر مجھ سے سب میری ہوشیاریاں
مجھ کو سرمایۂ بے خودی دے گئے

کیوں ہے شکوہ اگر بے وفا کہہ دیا
یہ سبق تو ہمیں آپ ہی دے گئے

چشمِ حیرت سے ہم دیکھتے ہی رہے
آدمی کو فریب آدمی دے گئے

شکریہ ان کا جو آکے اسلم ہمیں
غنچہ و گل کی خندہ لبی دے گئے

مقبول احمد خاں

دبستانِ لکھنؤ کا ایک ممتاز غزل گو
حکیم محسن علی خاں جوش بریلوی

حکیم محسن علی خاں جوش سترھویں صدی میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد رسمی علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ صرف و نحو، ادب، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کے بعد فن طب کی تکمیل کی۔ بچپن ہی سے ذہین اور طباع رہے۔ پیشہ طبابت کے علاوہ شعر و سخن کی جانب میلان ہوا۔

مقبول حسین خاں ڈپٹی کلکٹر نے (برادر زادہ علاقی) دیباچے میں لکھا ہے کہ "جوش کا خاندان محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آیا۔ یہ لوگ شیوخ عرب سے نسبت رکھتے تھے، یہاں ان کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ یہ خاندان ہندوستان ہی میں ٹھہر گیا۔ دربار میں عزت و احترام کی نظر رہی۔ صواب اندیش خاں اور خیر اندیش خاں مورث اعلیٰ لاہور اور بہار کی گورنری پر فائز ہوئے۔ دہلی اور لاہور میں اس خاندان کے مشہور افراد نے عالیشان اور خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔

مبارک علی خاں نواب صواب اندیش خاں کے پوتے نے ۱۲۶۵ھ میں ایک رسالہ تحریر کیا۔ اس میں بیان کیا ہے کہ:

"شاہ جہاں کے زمانے میں ہمارے خاندان کا ستارہ عروج پر رہا۔ دیگر عنایات شاہی اور خدمات کے پیش نظر عہدہ صوبہ داری اولاد میں بھی جاری رہا۔ اگر کوئی پُر ہوس غنیم ملک پر حملہ آور ہوتا تو خاندان کے ممتاز افراد مدافعت وطن میں جانبازی اور دلیش بھگتی کا ثبوت دیتے۔ نادر شاہ دُرانی کے قیامت خیز حملے میں یہ خاندان منتشر ہوا اور جس کا جدھر سینگ سمایا نکل گیا۔ بریلی میں ہماری کچھ جاگیر تھی۔ ہم بریلی پہنچے۔ حافظ رحمت خاں مرحوم سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ مرحوم نے جاگیر کے علاوہ، چند دیہات کا انتظام بھی سپرد کیا۔ حکومت بدلی تو سرکار انگریزی کے عہد میں۔ سر دیہی کے بدلے طالب علی خاں کا تازیست وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ ہمارے خاندان میں اکثر و بیشتر افراد ذی علم تھے اور علوم متداولہ سے آراستہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد اولاد بھی زیور علم سے بہرہ یاب رہی۔ حکیم طالب علی خاں اور حکیم غالب علی خاں جو اس وقت ہمارے خاندان کے سربرآوردہ تھے۔ اسی نسبت سے ان کی اولاد بھی تعلیم یافتہ تھی۔ حکیم محسن علی خاں کے اساتذہ میں بیشتر ہمارے بزرگوار ہی تھے۔ جنھوں نے تحصیل علم میں محسن علی خاں کی بھرپور امداد کی۔"

جوش کا شاعری سے پیدائشی لگاؤ تھا۔ چنانچہ ابتدا ہی سے مشق سخن جاری رہی۔ اس فن میں مرحوم کے پہلے استاد خلیفہ امیرالدین آزاد رہے۔ لیکن کچھ مدت بعد مرحوم ناسخ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اس وقت ناسخ جہان استاد تھے۔ اور جوش بھی میدان شاعری کے پرجوش شہسوار۔ لہٰذا استاد کی پیروی میں کمال پیدا کیا۔ کلام میں مضامین قدیم اور روایات شاعرانہ کے تحت آمد ہے۔ الفاظ میں صفائی، تراکیب چست، محاورات میں اپنے استاد ناسخ کے ہمرکاب امثال و محاورات میں استعمال کا بڑا لحاظ ہے۔ زبان کے استعمال میں اور مضامین کی ندرت میں عام روش سے بچ کر نیا راستہ پیدا کرتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو مومن مرحوم کے تغزل سے جوش کا رنگ ٹکراتا نظر آتا ہے۔ مومن مرحوم سے اثر پذیری بھی یقینی ہے۔ تغزل کی صداقت پرست

چاشنی نے کلام میں رنگینی پیدا کر دی ہے ۔ رموز و اشارات بھی خصوصیت کے حامل ضرور ہیں مگر کہیں کہیں طرز قدیم بھی غالب آجاتی ہے ۔ اور عشق مجازی آگے بڑھ جاتا ہے ۔ اور عریانیت ٹپک پڑتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہے ۔

طبی اور منطقی اصطلاحات بھی کلام میں موجود ہیں مگر عام بول چال کے لحاظ سے جس سے کہ کلام کا رنگ قائم رہتا ہے ۔ اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے ۔

مرحوم گوشہ نشین تھے، اور علائق دنیا سے آزاد ۔ دیوان ہی ان کی معنوی یادگار ہے ۔ زندگی میں مرحوم کو دیوان کے مرتب کرنے کا خیال تک نہیں آیا ۔ یہ مختصر دیوان مرحوم کے برادر زادہ کے بقول "روایات اور اوراق منتشر سے حاصل ہوا ۔" وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کا دیوان زندگی میں جمع ہو جاتا تو بہت ہی ضخیم ہوتا ۔ فن طب میں حکیم جمال الدین کے شاگرد تھے ۔ حکیم موصوف خود اپنے عہد کے ایک نامور طبیب تھے ۔ لہٰذا جوش بھی ایک حاذق طبیب ہوئے ۔

ادھر ادھر ایسی شہرت پھیلی کہ جوش مرجع خلائق بن گئے ۔ شعر گوئی اور طبابت صرف دو ہی کام تھے ۔ خدمت خلق، اور ذوق شاعرانہ ۔ بہرکیف جس قدر کلام ہے ان کے تخیلات کا آئینہ دار ہے ۔ شاعری سے والہانہ وابستگی نے اس میں اثر پیدا کر دیا ۔ رنگ تغزل ہی ان کے کلام کی روح ہے ۔ اور اس پر ان کی طبع رواں کا رجحان ہے ۔ قطعات و رباعیات کے علاوہ دیگر اصناف یعنی خمسے وغیرہ بھی ہیں اور ان میں بھی ایک خاص ڈھنگ ہے ۔

حمد و نعت کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں ۔ غزلیات میں اس عہد کے مناسب مضامین ہیں ۔ عشق و محبت کے جذبات و واردات کا ذکر اور بیان ایسا پرسوز ہے کہ جس سے پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے رہ نہیں سکتا ۔ خیالات کی بے تکان روانی اور ہجر و فراق کی تصویر نظر کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ لیکن ان کی محبت میں ایک ایسا خلوص ہے، جو ان کی شان کے شایاں ہے ۔ ابتذال سے گریز ہے اور اظہار محبت میں محتاط ہیں ۔ اپنے جذبات پر قابو ہے ۔ زبان بھی اس عہد کے اعتبار سے وہی ہے جیسا کہ طریقہ تھا اور لکھنوی شاعری کا تقاضہ یعنی لفظ و لوازم، محاورات و تلمیحات کی جانب زیادہ توجہ ۔ وہی بات جوش میں پائی جاتی ہے ۔ اردو کی یہ خدمت بھی شعرا کا ہی خاص حصہ رہا ۔ بہرطور اپنے عصری مطالبات زبان پر بہت کچھ اثر ڈالتے ہیں اور ہر دور میں ایسا ہی ہوا ۔ دوست کے گیسوئے پیچاں اور زنجیر محبت کا نتیجہ ملاحظہ ہو ؎

جس نے وہ سلسلۂ گیسوئے پیچاں دیکھا   پا بہ زنجیر ہوا خانۂ زنداں دیکھا

دنیا کی بے ثباتی کا اظہار ؎

کچھ عجب رنگ ترا گردش دوراں دیکھا   کل جہاں باغ تھا واں آج بیاباں دیکھا

جنون محبت میں ایک خاص کیف ہے ؎

شاید اس راہ سے کوئی آبلہ پا گزرا ہے   تر زباں آج ہر اک خار بیاباں دیکھا

درباں تو یار کے در پہ ضرور ہی ہوتا ہو گا اور عاشق وارفتہ مزاج اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن جوش نے تو اسے مالک دوزخ سے بھی آگے بڑھا دیا ہے ؎

شدتیں مالک دوزخ کی سنا کرتے تھے   سخت اس سے تجھے اے یار کے درباں دیکھا

درد سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید ۔ جوش اپنے محبوب سے درد سر کا علاج اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

صندلی دستہ کا خنجر ذبح کو لاتا ہے وہ   شاد ہوئے دل کہ علاج درد سر پیدا ہوا

دوست کی خواب سے بیداری فتنۂ محشر کے قیام سے کم نہیں کیونکہ محبوب تو خود خواب بیدار ہے ؎

جاگے گا ابھی فتنۂ خوابیدۂ محشر   سوتے سے جو وہ فتنۂ بیدار اٹھے گا

محبوب رات کو محو خرام ہوا ۔ اسے سورج قرار دیا ۔ لیکن رات کو سورج اسی لیے تارے فرش راہ بن گئے اور رات دن ہو گئی ۔ استفہام اقراری بصورت انکار ملاحظہ ہو ؎

کیا گیا اس راہ سے وہ آفتاب؟   ہے ستارہ ذرہ ذرہ راہ کا

ہجر میں جوش طول شب جانکاہ کہتے ہیں شب یلدا سے گریز ہے اس لیے کہ جانکاہی میں بات ہی اور ہے ؎

ہجر میں اس ماہ رو کے اے فلک   تھا گلہ طول شب جانکاہ کا

محبوب دولت بیدار ہے ؎

[ا]ب آیا؟ خواب میں میری وہ دولت بیدار کہ مجھ کو طالع خوابیدہ نے جگا دیا

لیکن خواب میں بھی دولت بیدار سے محروم رہے۔

یہ شعر کس قدر پر لطف ہے ؎

مدہوش تری نرگس مخمور کا ساقی محشر میں بھی اٹھے گا تو سرشار اٹھے گا

عاشق کی آہ پر سوز کا اثر آسمان سے گزر کر اندرون آسمان پر بھی اثر

انداز ہے یہی سچی محبت کا ثبوت ہے ؎

آسماں کے سمت ہے رخ آہ کا غل فلک پر ہے معاذ اللہ کا

محبوب کی مست نگاہی کا اثر محتسب کے فرائض پر اتنا ہے کہ

پیرہن رہن ہو رہا ہے ؎

دور چشم مست ساقی ہے یہی تو دیکھنا
محتسب کا پیرہن رہن سبو ہو جائے گا

رقیبوں کی مدارات اور عاشق صادق کی زندگی کا مسئلہ ؎

بھر کے اپنے ہاتھ سے تو نے دیے غیروں کو جام
اب ہماری زیست کا پیمانہ اے جاں بھر گیا

تلوار کی دھار عاشق حسرت زدہ کے لیے آب حیات ہے۔

پلا دے مجھ کو طالب ہوں حیات جاودانی کا
تری تلوار میں قاتل ہے پانی زندگانی کا

دوست سے ملاقات ہوئی تو رقیب (دشمن) نازل ہو گیا ؎

ہوئی خلوت نصیب اس سے تو ناگہ آ گیا دشمن
اسی کو کہتے ہیں آنا بلائے ناگہانی کا

دوست کا وعدہ فردا وعدۂ حشر ہے ؎

آپ کا وعدۂ فردا کبھی ایفا نہ ہوا
وعدۂ حشر ہوا وعدۂ فردا نہ ہوا

غنچہ گلابی اور پھول کا پیمانہ ایک قدرتی تشبیہ کا ایک عمدہ نمونہ ؎

بادہ نوشی کو جو وہ میخوار آیا باغ میں
بن گیا غنچہ گلابی پھول پیمانہ ہوا

زندگی کا فلسفہ گوتم بدھ سے ملتا ہوا۔ علائق دنیا ہی ایک قسم کی قیود ہیں اور انسان ان سے آزاد ہو جائے تو حاصل زندگی سرو آزاد کا استعارہ آزادی کا ثبوت ہے ؎

بے تعلق جو رہا دہر میں ممتاز ہوا
سرو آزاد کو دیکھو کہ سرافراز ہوا

دوست کی بزم اور شاعر اس میں شرکت سے محروم اور مخالفین سب حاضر ؎

اس بزم میں کون اپنا پرایا نہیں جاتا
محروم ہوں اک میں کہ بلایا نہیں جاتا

عشق صادق میں انفرادیت ؎

معلوم نہیں وادیٔ مجنوں میں مرے بعد
جاتا ہے کوئی بے سروپا یا نہیں جاتا

سر تسلیم کہاں خم ہوگا محراب تیغ کے نیچے ؎

وہ تیغ کی محراب ہے جھکتے ہیں جہاں سر
ہر جا سر تسلیم جھکایا نہیں جاتا

تغزل کی گہری چاشنی ؎

گر کف پا اس پری کا دیکھ پائے آفتاب
پھر نہ خجلت سے کسی کو منہ دکھائے آفتاب

کچھ اشعار خاص رنگ کے ملاحظہ کیجیے:

مجنوں ہوا خراب، رہا کوہ کن خراب — اے جوش عاشقی کا سراپا ہے فن خراب
اے جان مضطرب ادب اتنا ضرور ہے — قاتل کا ہو نہ ذبح کے دم پیرہن خراب
خط کا جواب پڑھ کے مرا دم نکل گیا — قاصد ترا برا ہو۔ تو لایا بھلا جواب

ناصح کی جائے جا نصیحت سے جوش سخت نالاں ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے ورنہ چپکے سے جانے کی تلقین نہ ہوتی

میں خانماں خراب نہ آؤں گا راہ پر — ناصح سے کہہ دو چپکے چلا جائے گھر کو اب
جس گھر میں بند ہست ہمارا تھا روز و شب — تکتا ہوں چشم یاس سے میں اس کے در کو اب
یار کی شیریں بیانی پر نہ بھول اے تلخ کام — زہر میٹھا ہے یہ ہوتا ہے کئی اقسام سم
آ گیا ہم کو جو زنداں میں تصور زلف کا — ہو گئی زنجیر بیجاں کا کل پیچاں ہمیں

شیخ صاحب کی خاطر و مدارات کا حادثہ:

شیخ جی کیا کہیں رندوں کی طرف جا نکلے — ثابت آج آپ کا کیوں جبہ و دستار نہیں
یاد جب اس گل کی آئی غنچۂ دل کھل گیا — ہے نسیم صبح کی تاثیر اس کی یاد میں
دم بہ دم موت کی دیتے ہیں خبر آ آ کر — سانس سینہ میں نہیں ہیں اک ہرکارے ہیں
وادی عشق ہے وہ وادی دشوار گزار — قیس و فرہاد سے شاطر بھی جہاں تھکے ہیں

جوش کے حال سے کچھ آپ خبر رکھتے ہیں   اب تو وہ بے خبری وہ دو پہر رکھتے ہیں
کسی قدر طنز بھی ہے اور حقیقت بھی ؎

جب گرہ میں زر نہیں اور زور بازو میں نہیں
پھر شکایت کیا؟ اگر معشوق قابو میں نہیں

حمد و نعت

پس از حمد خدا خالق ہے جو نور محمد کا   زمین و آسماں کا انس و جاں کا دام اور در کا
سر دیواں میں لکھتا ہوں قصیدہ نعت احمد کا   وسیلہ حشر کے دیواں میں تحصیل مقصد کا
نہ ہوتا نقش اگر کرسی نشیں نور محمد کا   قلم کا پھر نشاں ہوتا نہ اس لوح زبرجد کا

خمسہ بر غزل ناسخ کا ایک بند جوش کا زور قلم اور جوش :

پھر بہار آئی ہوئی پھر وحشت پنہاں عیاں   پھر طبیعت سے مٹا اندیشۂ سود و زیاں
پھر نظر آتا نہیں اب جیب و داماں کا نشاں   شوق عریانی نے کیں پھر پیرہن کی دھجیاں
پھر اتر وایا جنوں نے بوجھ میرے دوش کا

بند از خمسہ بر غزل غلام حسین خاں :

آسماں پہ کہیں بھی نہ چمکتی تھی ذرا   بادلوں کے بھی گرجنے کی نہ آتی تھی صدا
نہ ترشح سے زمیں تر تھی نہ چھائی تھی گھٹا   سد راہ کون تھا راتوں میں تمہیں آنے کا
خشک نالے تھے کہیں نام کو برسات نہ تھی

بند خمسہ بر غزل میر

نہ خوش جس سے اے جوش رب قدیر   نہ راضی جناب بشیر و نذیر
ہراساں ہے اس غدغے سے ضمیر   کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تو کیا کر چلے

جوش مرحوم فارسی میں بھی کہتے تھے۔ فارسی پر قابو ہے اظہار خیالات میں روانی اور جوش صلاا پر خمسہ بر غزل حافظ علیہ الرحمۃ تحریر ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ مراد حافظ شیرازی سے ہی ہے لیکن اتنا عرض ہے کہ تحقیق سے یہ غزل حافظ مرحوم کی قطعاً ثابت نہیں ہوتی اس عہد کے حافظ تخلص کسی بزرگ کی غزل ہو تو ہو۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

گردش چرخ بانداز دگر می بینم   منقلب عادت ہر فرد بشر می بینم
نہ ز کس خیر نہ از خیر اثر می بینم   ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

★

غلام مرتضیٰ راہی

غزل

سلسلہ نیند کا جب ٹوٹ گیا رات گئے
کھل کے برسی تری یادوں کی گھٹا رات گئے

آہٹیں غم کی دبی رہتی ہیں ہنگاموں میں
مجھ کو اس بات کا احساس ہوا رات گئے

خواب روشن نظر آیا مجھے سورج کی طرح
آنکھ ملتا ہوا بستر سے اٹھا رات گئے

صبح تک گونجتی رہتی ہے مرے کانوں میں
پردۂ غیب سے آتی ہے صدا رات گئے

چوٹ بن بن کے ابھر آئیں پرانی یادیں
دل کی بستی میں چلی ایسی ہوا رات گئے

ہوگئیں بند دھوئیں سے مری آنکھیں راہی
جب چراغوں میں اجالا نہ رہا رات گئے

ڈاکٹر اصغر زمانی

اردو ڈرامہ پر ایک تنقیدی نظر

ڈرامہ کی ابتدا نقالی سے ہوئی ہے۔ افلاطون سب سے پہلا نقاد ہے جس نے شاعری کو "نقل" قرار دیا ہے۔ ارسطو نے افلاطون کے "نقل" کے تصور سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہ "نقل" کو تو مانتا ہے لیکن "نقل" کی "نقل" کا قائل نہیں۔ ڈرامے کے موضوع پر قدیم ترین تصنیف ارسطو کی بوطیقا ہے[1]۔ اگرچہ اس میں فن شاعری پر بحث کی گئی ہے لیکن اسی ضمن میں اس نے ڈرامائی شاعری المیہ اور طربیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

ارسطو کے بعد مختلف ادوار میں ڈرامے کے سلسلہ میں جو نظریات منظر عام پر آتے رہے وہ اسی "نقالی کے نظریہ" پر مبنی ہیں۔ چنانچہ CICERO کی رائے ہے "زندگی کی نقل، رسم و رواج کا آئینہ اور سچائی کا عکس ہے"[2]۔ یعنی ایک ڈرامہ نگار کا اصل مقصد ایسے حالات کی سچی تصویر کشی ہے جو حقیقتاً رونما ہو چکے ہوں یا وہ زندگی کی ہو بہو تصویر ہوں۔ HUGO نے بھی اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے "ڈرامہ ایک آئینہ ہے جس میں فطرت منعکس ہوتی ہے"[3]۔ اور کولرج کے الفاظ میں "ڈرامہ حقیقت کا اتار نہیں بلکہ فطرت کی نقالی ہے"[4]۔

ڈرامہ نگاری ایک فن ہے، ہر فن کی طرح اس کی بھی اپنی کچھ روایات ہیں تین وحدتوں کا شمار بیا پر ہوتا رہا ہے (۱) وحدتِ زمان (۲) وحدتِ عمل (۳) وحدتِ مکان۔ ارسطو نے وحدت عمل پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ وحدت زمان کے بارے میں صرف اس قدر کہتا ہے کہ المیہ کو "آفتاب کی ایک گردش یا اس سے کچھ زیادہ پر ختم ہونا چاہیئے"۔ وحدت مکان کے تصور نے بعد کو ترقی کی جو اطالوی نقادوں کے ذریعے سڈنی تک پہنچا اور جو بعد کو انگریزی میں منتقل ہوا۔ اقسام کے لحاظ سے ڈرامے کی دو بڑی قسمیں ہیں:

۱:- المیہ یا حزنیہ (چھٹی صدی ق۔م میں اس کا رواج ہوا) ارسطو نے المیہ پر بہت زور دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ المیہ میں انسان کو بہتر دکھایا جاتا ہے۔ MINTURNO (سنہ ۱۵۵۹ء) کے نظریہ کے مطابق المیہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے اندوہناک حالات پر مشتمل ہوتا ہے۔

۲:- طربیہ (پانچویں صدی ق۔م میں اس قسم کے ڈراموں نے جنم لیا) سترھویں صدی سے پہلے تک لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ ڈرامہ جس میں مسخرے اور ادنیٰ طبقے کے لوگ شامل ہوں ان کو طربیہ کہہ سکتے ہیں۔ سترھویں صدی میں اس

---

[1] ارسطو کا زمانۂ حیات ۳۸۴ ق۔م تا ۳۲۲ ق۔م بتلایا جاتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس کی اس تصنیف کا سن تقریباً ۳۳۰ ق۔م ہے۔
[2] [3] [4] دی تھیوری آف ڈرامہ از نکول ص ۲۴، ۲۸-۲۷۔

نظریہ سے اختلاف رونما ہونا شروع ہوا۔

ڈرامے کے دو پہلو ہیں (۱) تمثیلی (۲) ادبی۔

ڈرامہ کا تمثیلی پہلو بہت قدیم ہے، یہ ان جگہوں پر پروان چڑھا جہاں اصنام پرستی کا رواج تھا چنانچہ یونانی اور سنسکرت ادب میں تمثیلی ڈراموں کی کمی نہیں۔

دنیا میں قدیم ترین ڈرامے یونانی ادب میں ملتے ہیں ان ابتدا میں ان کی ادبی اہمیت کم اور مذہبی زیادہ تھی۔ انگلستان میں پہلا ڈرامہ جو سنہ ۱۱۱۰ء میں کھیلا گیا، مذہبی نوعیت کا تھا۔ ایران میں جو چیز "تعزیہ" کی شکل میں ملتی ہے اس کی نوعیت مذہبی تھی۔ شاہ عباس صفوی کے زمانے میں ایام عشرہ کے دوران واقعۂ کربلا کو ڈرامہ کے طور پر سامعین کے سامنے ایک کھلے میدان میں پیش کیا جاتا تھا۔ بعد کو روسیوں نے شہر نفلس میں سنہ ۱۸۵۰ء میں ایک تماشہ خانہ کی بنیاد ڈالی۔

ہندستان میں سنسکرت ڈرامہ نگاری کا آغاز بھاس نے کیا (پانچویں صدی ق۔م) اس کے بعد کالی داس نے (ایک سو صدی ق۔م) ڈرامہ نگاری کو عروج یا جن کا ناٹک شکنتلا بہت مشہور ہوا۔ راماین اور مہابھارت کے عہد تک ڈرامہ نے مذہبی نوعیت کے ساتھ ساتھ ادبی صورت بھی اختیار کرلی۔

جہاں تک اردو ڈرامہ کا سوال ہے اردو ڈرامہ کی عمر مشکل سے سو سال ہے۔ اس سو سال میں ڈرامہ شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہوگیا۔ ڈرامہ کے شباب کا زمانہ بیتاب، احسن، اور حشر کی ڈرامہ نگاری کا زمانہ کہا جاسکتا ہے لیکن اس وقت بھی ڈرامہ عوام ہی کی چیز رہا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی ڈرامے لکھے جاتے رہے۔ عموماً خیال یہ ہے کہ اردو ڈراموں پر انگریزی طرز کی چھاپ ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ بالکلیہ قابل قبول نہیں۔ کیونکہ بہ نظر غور دیکھا جائے تو اردو ڈرامہ پر ہندو دیو مالا کا بہت اثر رہا ہے[1]۔ اردو ڈرامہ نگاروں پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے غیر ملکی ڈراموں میں رد و بدل کرکے اسے اپنا لیا، حالانکہ یہ کوئی ایسا عیب نہیں جس پر انگشت نمائی کی جائے۔ ہمیشہ سے ہی روایات کو نئے قالب میں ڈھالا جاتا رہا ہے۔ کیا شیکسپیر کے ڈراموں کے مواد دوسری زبانوں کے ادبیات سے ماخوذ ہیں؟

اردو ڈرامے کے وجود میں آنے سے پہلے اردو میں ہمیں تین چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جو بڑی حد تک ڈراموں سے قریب تر کہی جاسکتی ہیں (۱) قصہ خوانی یا داستان گوئی[2] (۲) بھانڈوں کی نقلیں (۳) بہروپیوں کے روپ اور سوانگ۔

ڈرامے کے ابتدائی آثار ہمیں نصیر الدین حیدر کے عہد میں نظر آتے ہیں[3]۔ واجد علی شاہ کے عہد میں "رہس" کی قسم کو ہم ڈرامہ کا ابھرتا روپ کہہ سکتے ہیں اور ان کی مثنوی افسانۂ عشق کو اردو ڈرامے کا نقش اول[4]۔ چنانچہ پہلے اردو ڈرامہ نگار واجد علی شاہ ہی قرار دیے جاسکتے ہیں[5]۔ سلیس اور فصیح اردو کے اعتبار سے سید امانت کے اندر سبھا کو اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت ماحول اور معاشرے کے اعتبار سے اسی فضا سے متاثر ہے جہاں کی ہوا میں جام و صہبا کی مستی رچی بسی تھی، رقص و سرود کا نشہ تھا چونکہ معاشرے پر حرکت و عمل کے بجائے جمود و سکون کی

---

[1] اندر سبھا پر صاف ہندو دیو مالا کا اثر ہے۔ اس کے علاوہ سب سے پہلا اردو ترجمہ بھی کالی داس کے شکنتلا کا ہی کیا گیا جس کو نواز نے فرخ سیر کے زمانے میں اردو کا قالب عطا کیا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر مرزا کاظم علی جوان نے اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ [2] آخری باکمال داستان گو دہلی کے میر باقر علی مرحوم تھے۔

[3]، [4]، [5] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم۔

کیفیت طاری تھی اس لیے امانت کا ڈرامہ بھی عمل سے محروم حسن و عشق کی طلسمی داستان کا منظر بن کر نمودار ہوا جس کو ۱۸۵۳ء میں ڈھاکہ میں پہلی بار اسٹیج کیا گیا۔

اردو ڈراموں کو اسٹیج تک لانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہاتھ رہا ہے۔ بنگال میں بنگلہ اسٹیج کے آغاز کی تاریخ ۲۷ فروری ۱۷۹۶ء بتائی جاتی ہے۔ بمبئی میں اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریزی تھیٹر کی تعمیر عمل میں آئی۔ جب ہم ۱۸۷۹ء کے قریب پہنچتے ہیں تو اس وقت بمبئی میں متعدد پارسی کمپنیاں نہایت شان و شوکت سے نئے نئے ڈرامے پیش کر رہی تھیں۔ اس وقت کے ڈرامہ نگاروں میں رونق بنارسی، حسینی، میاں ظریف، مرزا نظیر بیگ، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، منشی غلام علی دیوانہ، آغا حشر کاشمیری، آغا حشر قزلباش دہلوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کا ایک خمس گذرتے گذرتے تھیٹر انحطاط پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ مائل بہ زوال ہو گیا۔ ادبی طبقے نے اسٹیج کی فرسودہ حالت سدھارنے کی کوشش کی اور کئی ادیبوں نے جدید طرز کے نئے ڈرامے لکھے ان میں سید امتیاز علی تاج کا انارکلی، منشی دوارکا پرشاد افق کا سری رام ناٹک، منشی جوالا پرشاد برق کا معشوقۂ فرنگ (رومیو جولیٹ کا ترجمہ) پنڈت سدرشن کا اندھے کی دنیا وغیرہ کافی مشہور رہیں۔

اردو ڈرامے کا ایک انداز جو اسٹیج اور تھیٹر سے بالکل الگ ہے خالص ادبی ہے، اس کے پیش رو محمد حسین آزاد کہے جا سکتے ہیں جنھوں نے ایک تاریخی ڈرامہ اکبر کی ابتدا[1] کی تھی لیکن اپنے مرضِ جنون کے باعث اختتام کو نہ پہنچا سکے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی دو معاشرتی اصلاحی ڈرامے شہید وفا اور میوۂ تلخ لکھے۔ اگرچہ یہ ڈرامے کی فنی خوبیوں سے عاری ہیں لیکن موضوع کی افادیت اور ادبی شان کے حامل ہیں۔ منشی احمد علی شوق قدوائی نے بھی اصلاحی ڈراموں کی طرف خاص توجہ دی، ان کے منظوم ڈرامے میکفرن دوسی اور قاسم و زہرہ خاصے مشہور ہیں۔ لیکن ڈرامائی عنصر سے یکسر خالی ہیں۔ عبدالماجد دریابادی کا زود پشیماں اصلاحی انداز کا خالص معاشرتی ڈرامہ ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا مرادی دادا اور راج دلاری زیادہ مشہور رہیں ان کا طرز تحریر کافی شوخ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنے مخصوص طرز میں ترکی ڈراموں کو اردو کا روپ دیا۔ ان کا ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ بہت مشہور رہے۔ عظیم بیگ چغتائی کا مختصر ڈرامہ مرزا جنگی پروفیسر، سید عابد حسین کا پردۂ غفلت، مولانا نیاز فتح پوری کے دو طویل مشہور ڈرامے جھانسی کی رانی اور اصحاب کہف، فضل حق قریشی کے مولیئر کے ڈرامے کی تلخیص تعلیم زدہ بیوی اور پروفیسر محمد مجیب کی خانہ جنگی وغیرہ خالص ادبی شان کے حامل ہیں۔

دور جدید میں ریڈیائی ڈرامے نے بھی کافی ترقی کی، ان ڈراموں کی تکنیک قدرے مختلف ہوتی ہے۔ پہلی چیز جس کی طرف ڈرامہ نویس کو دھیان دینا ضروری ہے ڈرامہ کا ایجاز و اختصار ہے۔ ڈرامے کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے تھوڑا سا بھی وقفہ (GAP) سامعین کی توجہ کو ہٹا دیتا ہے، چنانچہ اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایسا کوئی وقفہ نہ آنے پائے۔ غیر ضروری صوتی اثرات (SOUNDEFFECT) کی بھرمار بھی سامعین کو ناگوار گذرنے لگتی ہے۔ اس کا بھی دھیان ضروری ہے، اس قسم کے لکھنے والوں میں رفیع پیرزادہ کا لیلیٰ والے تجیر گم گشتہ، ناموس، نقاب، شوکت تھانوی کا خدا حافظ (۱۹۳۸ء میں پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن

---

[1] شیخ عبدالقادر مرحوم نے ۱۹۰۶ء میں اپنے رسالے مخزن میں اس ڈرامے سے کچھ حصے شائع کیے۔ اس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے کی۔

کے لیے لکھا تھا) منشی جی، قاضی جی، کرشن چندر کا سرائے کے باہر، قاہرہ کی شام، سعادت حسین منٹو کا کروٹ، ماچس کی ڈبیہ، قلوپطرہ کی موت، احمد ندیم قاسمی کا دارا شکوہ، عصمت چغتائی کے مختلف ڈرامے راجندر سنگھ بیدی کا نشری ڈراموں کا مجموعہ سات کھیل جاوید اقبال (علامہ اقبال کے صاحبزادے) کا ھیلو' اقا' وغیرہ کافی مشہور رہے۔

اردو میں یوں تو بیشتر ڈرامے لکھے گئے[۵]، لیکن اردو کے اکثر ڈرامے غیر معیاری ہیں۔ اس کا اصل سبب کیا ہے؟ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں چند اہم وجوہات نظر آتے ہیں:-

۱- چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے نقالی سخت ممنوع ہے، لہذا مذہبی نقطۂ نظر سے ڈرامہ نگاری یا اسٹیج وغیرہ کو بہت معیوب سمجھا گیا۔ عربی ادب میں ڈراموں کے فقدان کا اصل سبب یہی رہا ہے۔

۲- اسٹیج پر کام کرنے کو شرفا نے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔

۳- چونکہ فارسی ادب نے ابتدا میں عربی ادب کی پیروی کی اس لیے فارسی کے دور قدیم میں ڈرامہ نگاری کا فقدان رہا۔

۴- فارسی داں حضرات، سنسکرت زبان سے ناواقفیت کی بنا پر بھی اس سے خاطر خواہ اکتساب نہ کر سکے۔

۵- اردو شاعری کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس کی ابتدا صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی۔ ان صوفیائے کرام نے نقالی یا ڈرامے کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔

۶- دہلی کے مغل شہنشاہ اور لکھنؤ کے نوابین ہمیشہ قصیدہ یا غزل کی داد دیتے رہے۔ عموماً ڈرامہ نگاری توجہ کا باعث نہیں رہی۔

۷- ڈراموں کا فروغ غیر ادبی علاقوں میں ہونے کے باعث بھی ادبی و معیاری ڈراموں کی کمی رہی یہ علاقے صرف اپنی بزنس کی خاطر "چلتا ہوا مال" پیش کرتے رہے بہت سے مالکان پارسی تھے اور اردو سے نابلد چنانچہ اس کے حسن و قبح کی پرکھ کرنے سے قطعی معذور تھے۔

ان چند وجوہ کی بنا پر اردو ڈرامہ کو وہ مرتبہ اور ادبی عروج نہ حاصل ہو سکا جو اردو شاعری کو نصیب ہوا۔ لیکن پھر بھی اردو ڈرامے کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اگر اس کی طرف ان زاویوں سے نظر کی جائے:

۱- اردو رسائل کو ڈرامہ نگار اور نقاد پیدا کرنا چاہیے۔

۲- جہاں تک اسٹیج پر ڈرامہ پیش کرنے کا سوال ہے، فن سے واقف کار اس کو اپنے ہاتھ میں لیں۔

۳- ہماری یونیورسٹیوں میں ڈراموں کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ اسی طرح فن ڈرامہ اور اصول تنقید سے نہ صرف واقفیت بڑھے گی بلکہ سنجیدہ اور ادبی مذاق بھی پیدا ہوگا۔

اگر ہماری کوششیں منظم، متحد اور یک جہتی کی صورت میں ہوں تو وہ دن دور نہیں جب اردو میں بھی کوئی شیکسپیر اور برنارڈ شاہ پیدا ہو جائے۔

★

۵- ڈاکٹر عبدالعلیم نامی سندیلوی پرنسپل اورنٹیل کالج بمبئی نے ببلوگرافیا اردو ڈرامہ، جلد اول میں ۹۶۲ ڈرامہ نگاروں کے نام گنائے ہیں، جن کے لکھے ہوئے تقریباً ۲۸۹۰ ڈراموں کی تعداد درج ہے۔

غزلیں

حیات لکھنوی

اس بارِ نامراد کو سر سے اتار دے
تیرے صلے میں تجھ کو زمانہ بھی پیار دے

کب تک رہے گا خواب و حقیقت کا سلسلہ
ٹوٹے نہ جو کسی سے مجھے وہ خمار دے

کیوں منتظر ہے آمدِ فصلِ بہار کا
اپنے لہو سے صحنِ گلستاں نکھار دے

منجدھار میں بھی دامنِ امید کو نہ چھوڑ
کس وقت تجھ کو وقت کا دھارا ابھار دے

میری وفا کی زد سے وہ بچ کر نہ جائے گا
ترکِ تعلقات کی دھمکی ہزار دے

باقی ہے تشنگی ابھی اس راہِ گرم سے
ان آبلوں کو اور بھی کچھ ریگ زار دے

کچھ واسطہ تو میرا عطا و کرم سے ہو
سمجھوں گا مراد جو مشتِ غبار دے

ایسا حیات کون ہے آسودۂ خیال
بکھرے ہوئے وجود کو بڑھ کر سنوار دے

تسنیم فاروقی

ڈوب کر تیرے غم میں کب کوئی سنبھلتا ہے
دھوپ تو بڑی شے ہے چاندنی میں جلتا ہے

روشنی دکھلاتے ہیں سایے کچھ سہاروں کے
غم میں آدمی اکثر خواب سے بہلتا ہے

ہم ہوں آپ ہوں وہ ہوں یا اسی طرح کوئی
دل کی بے قراری پر کس کا زور چلتا ہے

اس کا جسم رعنا ہو یا کوئی جواں پودا
جب بہار آتی ہے ہر درخت پھلتا ہے

اک لطیف رشتہ ہے نور کا سیاہی سے
ہر چراغ کی لو سے کچھ دھواں نکلتا ہے

یاد کے دھندلکوں سے یوں گزر گیا کوئی
بادلوں کے پردے میں چاند جیسے چلتا ہے

راستے میں پیڑوں کی چھاؤں دیکھ کر گہری
لوگ سوتے رہتے ہیں وقت ہاتھ ملتا ہے

چھیڑ اس سے اے تسنیم سہل ہے مگر جیسے
اس کا ہاتھ چھونے سے میرا ہاتھ جلتا ہے

عدیل عباسی جامی چڑیا کوٹی

دھرتی کا چراغ

(افسانہ)

دیوالی کی رات، گھر گھر چراغوں کی برات، سارا شہر رنگین روشنیوں سے بقعۂ نور۔ دکانیں سہاگ رات کی دولہنوں کی طرح حسین اور دلکش، بچے پھلجھڑیاں اور پٹاخے چھوڑنے میں مشغول، سڑکوں کے کنارے ہر موڑ پر مہالکشمی کی خوب صورت اور جاذب نظر مورتیاں باریک چمکتے ہوئے کپڑوں میں ملبوس، جن کے اردگرد نیلے، پیلے ہرے لال چھوٹے چھوٹے برقی قمقمے فروزاں۔ رنگ برنگ کے بجلی کے بلب اور راڈ، روشن۔ ایسا لگتا جیسے سارا نگر روشنی کی گنگا میں نہا رہا ہو۔ ہر طرف خوشی اور مسرت کی لہریں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی جگہ جگہ مائکروفون سے پیار اور محبت کے جوان نغمے پھوٹتے ہوئے ساری فضا پر ایک نشاط انگیز کیفیت، ایک وجدانی عالم طاری۔

لیکن رجنی ان ہنگامہ خیز رنگین خوشیوں اور مسرتوں کے روح پرور نورانی سیلاب سے بے نیاز گھر کے اندر تنہا سوچ میں غرق خاموش بیٹھی ہوئی تھی ـــــ اس کی گھنیری سیاہ پلکوں پر آنسوؤں کے انگنت دیپ روشن تھے۔ وہ زندگی کے بیتے ہوئے سنہرے لمحات کی حسین یادوں میں گم تھی۔ اس کے اس احساس نے کہ وہ پورنما ہو کہ دیوالی کی مسکراتی جگمگاتی رات، تنہائی کے ڈستے ہوئے اندھیروں کو نہ تو دودھیا چاندنی اور نہ ہزاروں لاکھوں ضیا پاش دیئے دور کر سکتے ہیں اُسے اور بھی غمگین اور اداس بنا دیا تھا۔

کھٹ..... کھٹ..... کھٹ، باہری دروازے کی زنجیر بولی۔ رجنی نے جو اب تک حسین خوابوں کی وادیوں میں کھوئی ہوئی تھی چونک پڑی۔ بوجھل قدموں سے چل کر دروازہ کھولا۔ بچھڑے ہوئے جیون ساتھی کی انمول نشانی، اس کا سات سالہ معصوم منّا اپنے ماما کی انگلی پکڑے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم بازار سے لوٹ آئے؟" رجنی نے غم آلود مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں ماں!" "دیکھو ماما جی نے میرے لیے کتنی بہت ساری مٹھائیاں اور کھلونے خریدے ہیں اور....... دیکھو نہ یہ کھلونا ـــ مجھے بہت پسند ہے۔ ماما جی کہتے ہیں یہ مٹی یا چینی کا نہیں، یہ لوہے کا ہندوستانی سپاہی ہے۔ اس میں چابی لگی ہوئی ہے۔ جب بھری جاتی ہے تو سپاہی بندوق چلانے لگتا ہے جیسے دشمن پر گولیاں برسا رہا ہو ـــ ماں! میرے پتا جی بھی تو سپاہی ہیں ـــ وہ کب آئیں گے ـــ وہ دشمنوں کو اپنی بندوق سے مارنے گئے ہیں ـــ" منّا نے نہایت بھولے پن سے رجنی سے کہا۔

"ہاں بیٹا! وہ جلد ہی آئیں گے۔ شاید ابھی کچھ دشمن باقی رہ گئے ہیں جنھیں وہ مارنے میں لگے ہیں" رجنی نے منّا کو تسلی دی۔

"یہ کس کے دشمن ہیں ماں! تمہارے یا پتا جی کے؟" منّا نے ایک اور معصوم سوال کیا۔

"یہ سب کے دشمن ہیں بیٹا! یہ ہمارے دیش کے دشمن ہیں۔ انھوں نے ہماری دھرتی پر دھوکے سے حملہ کر دیا ہے۔ تمھارے پتا انھیں کو ٹھکانے لگانے گئے ہیں ـــ" رجنی نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔

"ماں! میں بھی پتا کے پاس جاؤں گا۔ میں بھی پتا جی کے ساتھ مل کر دشمنوں کو ماروں گا ـــ" منّا کی زبان سے بھارت کی باوقار مٹی بول اٹھی۔ جیسے شکنتلا کا بھرت مچل گیا ہو۔

منا کی پیاری پیاری باتیں سن کر رجنی کا دل بھر آیا ۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا پھوٹ کر بہہ نکلی۔

منا کی نظریں ماں کے بھیگے ہوئے گالوں پر پڑیں وہ چونک پڑا۔

"ارے ماں! تم رو رہی ہو؟" منا نے دکھی ہو کر فکر مند لہجہ میں سوال کیا۔

"نہیں بیٹا! میں رو نہیں رہی ہوں ـــ میں تو تمھیں دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں ـــ دیکھو! میری طرف دیکھو!! میں تو ہنس رہی ہوں۔ آؤ اندر چلو۔" رجنی نے جلدی سے اپنے آنچل سے رخساروں پر پڑی ہوئی آنسوؤں کی لکیروں کو مٹا دیا ۔۔۔۔۔ اور اپنے منا کو تسلی دینے کی خاطر بناوٹی ہنسی ہنسنے لگی۔

رجنی کے ساتھ منا اور اس کے ماما رمیش گھر میں داخل ہوئے۔ منا کھلونوں میں بہل گیا۔

کھانا کھانے کے بعد منا اور رمیش جلد ہی سو گئے لیکن رجنی جاگتی رہی ـــ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی ـــ وہ ان چراغوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ جنھیں منا نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے آنگن کے طاقوں میں سجایا تھا۔ اب یہ سبھی چراغ تیل کی کمی کے باعث جھلملاتے ہوئے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گننے لگے تھے۔ شاید ان کے جیون کی لَو سوکھ چکی تھی۔ رجنی کے دل میں یکایک ایک خیال گزرا کیوں نہ ایسے سبھی چراغ بجھنے سے پہلے ہی گل کر دیے جائیں جن کے جلتے رہنے سے دل کی تاریکی اور بڑھتی ہو۔ مگر فوراً ہی یہ سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا کہ ان دیپکوں کو تو اس کے منا نے اپنے نرم گلابی ہاتھوں سے روشن کیا ہے جو حقیقتاً میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے ـــ اور ۔۔۔۔ پھر رجنی اٹھی اور اس نے تمام بجھتے ہوئے دیوں میں تھوڑا تھوڑا تیل ڈال دیا۔ سسکتے ہوئے چراغوں میں زندگی لوٹ آئی اور وہ دوبارہ تیزی سے جلنے لگے جیسے سرد پانی کے چھینٹوں سے مرجھاتے ہوئے پھول کھل اٹھے ہوں۔

اب پھر رجنی چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔ نظریں اب بھی جلتے ہوئے ننھے ننھے چراغوں پر جمی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی نگاہ سوئے ہوئے اپنے معصوم منا کی دمکتے ہوئے چاند سے مکھڑے سے ٹکرائی ـــ وہ منا کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگی۔

"جیون کا اتنا لمبا سفر۔ سر پر منا کی تعلیم اور پرورش کا بھاری بوجھ ـــ اے بھگوان! یہ سفر کیسے طے ہوگا ـــ اے بھگوان تو ہی منا کی حفاظت کرنا ـــ"

پھر یکایک رجنی کے پردۂ ذہن پر منا کے پتا راکیش کی یادوں کا عکس ابھرا۔ وہ راکیش کی یاد میں کھو گئی۔

"پچھلے سال یہی دیوالی کتنی حسین تھی کتنی خوب صورت تھی۔ اندھیری رات کی سیاہ ناگنوں کے کلیجے مسکراتے ہوئے درخشاں چراغوں سے پھوٹتی ہوئی ننھی ننھی کرنوں نے چیر کر رکھ دیے تھے۔ اجالوں کا پرچم بلند تھا۔ ہر طرف زندگی جوانی کے نشہ میں مخمور رقص کرتی ہوئی دکھائی پڑتی تھی۔ ۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ اس برس راکیش کے بنا یہی دیوالی کتنی سیاہ کتنی کالی اور کس قدر بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

چلتے وقت راکیش نے منا کو پیار کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا ـــ "رجنی! تم گھبرانا نہیں۔ منا کا خیال رکھنا ـــ میں تمھارا پتی اور منا کا پتا ہونے کے علاوہ اپنے دیش کا محافظ بھی ہوں۔ ہمارے وطن کی سرحدوں پر دشمن کے گھناؤنے قدموں کے نشان پھر دکھائی پڑنے لگے ہیں۔ ہمیں ایسے تمام نشانوں کو مٹانا ہے اور حریفوں کو ایسا مزہ چکھانا ہے کہ وہ پھر ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

میں جانتا ہوں رجنی! تمھیں میرے اس طرح چلے جانے کا کتنا دکھ ہوگا۔ ایک طرف منا کی ماں اور منا کی محبت بیڑیاں بن کر میرے پیروں کو جکڑ رہی ہیں۔ دوسری طرف مادرِ وطن کا فرض مجھے آواز دے رہا ہے، مجھے پکار رہا ہے ـــ لیکن میں مادرِ وطن کے مقدس آنچل کو کسی قیمت پر جلنے نہ دوں گا ـــ میں ایسے تمام ہاتھوں کو تراش دوں گا جو میری دھرتی کے دامن کی طرف بری نیت

سے بڑھنے کی کوشش کریں گے ــــ آج ظلم اور تشدد کے جو پجاری ہماری مقدس زمین پر کھڑے ہیں ان کے سر قلم کرکے مادر وطن کے قدموں میں ڈال دوں گا ــــ تم یقین رکھو رجنی! فتح ہمیں کو نصیب ہوگی کیوں کہ ہم حق پر ہیں ــــ ہماری جنگ اصولوں کی جنگ ہے ــــ ہم حملہ آور نہیں ہیں میں اگر جنگ میں شہید ہوجاؤں تو تم غم نہ کرنا ــــ تم میرے لیے آنسو نہ بہانا کیوں کہ شہید کبھی مرتا نہیں۔ وہ تو امر ہوتا ہے۔ شہید کے خون کے قطرے ہمیشہ آسمان پر چاند تارے بن کر چمکتے ہیں میں ہارے ہوئے سپاہی کے روپ میں تمھارے پاس کبھی نہ آؤں گا ــــ بھگوان پر بھروسہ رکھو رجنی! جیت ہماری ہوگی..... ہم میدان جنگ سے فاتح بن کر لوٹیں گے ــــ"

تھپ..... تھپ..... تھپ

دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی..... رجنی کے سارے سپنے ٹوٹ گئے۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی گھبرا کر اٹھ بیٹھی... ..... پو پھٹ چکی تھی۔ صبح کا نور دبے پاؤں رجنی کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا ــــ اُجالوں کا دیوتا نمودار ہونے والا تھا۔ رجنی کا دل کسی انجانے خوف سے لرز گیا ــــ اس نے ڈرتے ڈرتے چل کر دروازہ کھولا۔ بڑی بڑی کٹورے کی مانند آنکھوں، بھرے بھرے بازوؤں، لمبے چھریرے بدن اور چوڑے چکلے سینے والا اُس کا اپنا فولادی راکیش فوجی وردی میں ملبوس فاتحانہ انداز میں کھڑا مسکرا رہا تھا ــــ رجنی اپنے راکیش کو پاکر فرطِ مسرت سے ناچ اٹھی اور اس کی گھنیری سیاہ پلکوں پر مسرت آمیز آنسوؤں کے بے شمار دیپ مسکرانے لگے۔

★

سیّد نظر برنی

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کیا پیارا گلستاں ہے جامعہ اسلامیہ
عظمتِ ہندوستاں ہے جامعہ اسلامیہ

اس میں ہے مختار داجمل اور جوہر کا وقار
ایک رنگین داستاں ہے جامعہ اسلامیہ

کچھ نئے انداز کی تدریس کا ہے اہتمام
وقت کی روح رواں ہے جامعہ اسلامیہ

ذکر ذاکر، فکر عابد کی ہے یہ قندیل شوق
کارواں در کارواں ہے جامعہ اسلامیہ

عشوۂ و ناز و ادا میں ہے یقیناً یہ عجیب
رنگ و بو سے ضو فشاں ہے جامعہ اسلامیہ

علم و حکمت اور فراست کی ہے یہ روشن کتاب
بس ادب کا اک نشاں ہے جامعہ اسلامیہ

مخلصانِ قوم کے حُسنِ تدبر کا ہے عکس
داستاں در داستاں ہے جامعہ اسلامیہ

شانِ حکمت، روحِ حرف اور نازِ حُسن بھی
ہر ادا میں مہرباں ہے جامعہ اسلامیہ

قومی یک جہتی کی جیتی جاگتی تصویرِ شوق
صاف اک آبِ رواں ہے جامعہ اسلامیہ

گاندھی و نہرو کا اس میں دیکھیے اک طمطراق
نازشِ عزمِ جواں ہے جامعہ اسلامیہ

اس میں مستقبل ہمارا صاف آتا ہے نظر
علم کی اک کہکشاں ہے جامعہ اسلامیہ

جوہر نظامی

شباب

زندگی کو خواب سے جس نے جگایا وہ شباب
انتہائے غم میں بھی جو مسکرایا وہ شباب
جو نویدِ شادمانی لے کے آیا وہ شباب
مسکرانا جس نے پھولوں کو سکھایا وہ شباب
زلزلوں میں جو سکونِ زندگی پاتا رہا
جو ازل سے بجلیوں کے ساز پر گاتا رہا
بیخودی کا درس پایا جس نے بزمِ ہوش میں
جو رہا محوِ تبسم یاس کی آغوش میں
جس نے کی ہیں زندگی کی انجمن آرائیاں
جس کی منت کش ہیں فصلِ عیش کی رعنائیاں

ہاں وہی میری جوانی ہاں وہی میرا شباب
مدتوں سے یاد میں تیری ہے نذرِ اضطراب

حسن کے معبود! ان کمزور شانوں پر یہ بار
آرزو کی نرم و نازک ہنکھڑی اور نوکِ خار
زندگی مدت سے بے تقصیر ہے روٹھی ہوئی
کیا کروں مجھ سے مری تقدیر ہے روٹھی ہوئی
میری دنیائے سکوں ہے آشنائے پیچ و تاب
آنسوؤں کی لے میں چھڑتا ہے مرے دل کا رباب
جن دریچوں سے کبھی آتی تھی خوشبوئے بہار
جھانکتا ہے ان دریچوں سے غمِ ناخوشگوار
ہر نفس اک بے قراری، ہر قدم اک اضطراب
زندگی ہے موت کے سایہ میں گویا محوِ خواب
اے خدائے حسن اے پروردگارِ رنگ و بو
تا کجا محرومیاں کب تک یہ سوزِ جستجو؟

چاہتا ہوں اک اشارہ اک نگاہِ التفات
ورنہ اک دن ڈوب جائے گی مری نبضِ حیات

اشرف مالوی

طوطیٔ ہند خسرو

محبوب نظر خسرو، مطلوب نظر خسرو
دنیائے محبت میں اک آئینہ گر خسرو

روشن ہوئے چشم و دل تابانیوں سے جس کی
چمکا شبِ ظلمت میں وہ رشکِ قمر خسرو

سوزِ دلِ دیوانہ، سازِ لبِ مستانہ
بیمارِ وفا خسرو درمانِ بشر خسرو

صوتِ دلِ شاہی بھی محبوبِ الٰہی بھی
فرزانہ بھی خسرو ہے دیوانہ اگر خسرو

اللہ ری خوش باشی دل کعبہ نظر کاشی
یوں رازِ دلِ فطرت وا ہو گئے بر خسرو

کچھ راگ بلا خیز کے ہر تار میں سو جاتے
آتے نہ جگانے کو دنیا کو اگر خسرو

ہیں جمع ادھر عرفی خاقانی و فردوسی
سلطانِ سخن گویاں، تنہا ہے ادھر خسرو

تسکینِ دل و جاں ہے صد رشکِ بہاراں ہے
اک مرکزِ عرفاں ہے اب بھی ترا در خسرو

نقشِ کفِ پا تیرے ہر راہ میں بکھرے ہیں
مرہونِ کرم تیری ہر راہ گزر خسرو

اب تک تری منزل کو پہنچا نہ کوئی رہرو
صدیوں سے تو جاری ہے ذہنوں کا سفر خسرو

چھ صدیوں کی دھول اشرف جس پر نہ جمی ہرگز
مینارِ تجلی ہے اب تک وہ امر خسرو

شمامہ قدوائی

میر کی دلّی

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کا زمانہ بڑے خلفشار اور افراتفری کا زمانہ تھا یہ خلفشار اور افراتفری اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوئی تھی اورنگ زیب نے پچاس سال تک اس ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کی جد وجہد کی ــــ سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی، اس کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جنگ میں بسر ہوا لیکن فوجی قابلیت، سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر اس نے انتشار کی قوتوں کو دبا دیا۔ اور جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے جانشینوں کے لیے ایک عظیم الشان سلطنت چھوڑی۔ خانہ جنگی سے بچانے کے لیے اس نے ملک کو اپنے بیٹوں میں ایک وصیت کے ذریعہ تقسیم کر دیا۔ لیکن اس کے تنگ نظر اور کم ظرف جانشینوں نے وصیت کی طرف کوئی توجہ نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاقت جو تین مرکزوں میں تقسیم ہوکر مخالف قوتوں کے دبانے میں صرف کی جا سکتی تھی آپس میں ہی لڑ کر ختم ہوگئی۔ اورنگ زیب سے پہلے اور اورنگ زیب کے بعد کی تاریخ میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جاگیردارانہ طرز حکومت کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط مضبوط حکمراں کی موجودگی تھی۔ مغل دربار ہمیشہ امرا کی سازشوں کا مرکز رہا تھا لیکن عظیم مغل حکمراں کا رعب اور حکمت عملی کی وجہ سے وہ اس پر قابو پالیے رہتے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد بادشاہوں کے بجائے "بادشاہ گر" پیدا ہو چکے تھے۔

اسی صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوال کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔ مرکزی حکومت کا ڈھانچہ کمزور ہونے لگا اور حکومت کی اس کمزوری کی وجہ سے صوبے آزاد ہونے لگے۔ امرا سر اٹھانے لگے نیز جاگیرداروں نے بدنظمی کی ایک عام فضا پیدا کر دی جس نے اقتصادی زوال اور معاشی انحطاط کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا کہ دہلی اور اس کا بادشاہ بقول شاہ ولی اللہؒ "کاسۂ گدائی در دست گرفتہ[1]" نظر آتا تھا۔ ان حالات میں یہی ہونا بھی چاہیئے تھا کہ ملک کے وہ تمام افراد جو تھوڑی سی بھی قوت جمع کر سکتے ہوں قسمت آزمائی کے لیے تیار ہو جائیں چنانچہ سکھ، مرہٹہ، جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامے پیدا کیے اور صورت حال روز بروز خراب تر ہونے لگی۔ سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور اقتصادی انحطاط کے زمانے میں ایک بیرونی طاقت نے اپنے قدم مستحکم کرنا شروع کر دیے۔

اورنگ زیب کا پہلا جانشین بہادر شاہ اول تھا جو بڑا فیاض اور رحم دل تھا مگر جسے "شاہ بے خبر" کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ اس قدر نکما اور عیش پرستی کا دلدادہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ لال کنور پر ایک سال میں دو کروڑ روپیہ خرچ کر دیئے۔ اس کے دربار میں عیش و طرب

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (مکتوبات دوم ص ۱۱)

محفلیں گرم رہتی تھیں، اور بڑے پیمانہ پر چراغاں کیے جاتے تھے۔ فرخ سیر تخت نشین ہوا تو ملک کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اس کو گھوڑوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے اصطبل میں بیکار بندھے رہتے تھے۔ اس گرتے ہوئے مالی نظام پر نادر شاہ کے حملہ (سنہ ۱۷۳۹ء) نے ضرب آخر کا کام کیا۔ اروِن کے خیال کے مطابق نادر شاہ ستر کروڑ سے زیادہ روپیہ ہندوستان سے باہر اپنے ملک لے گیا۔ اسی کے بعد محلات اور شاہی خزانے خالی ہو گئے۔ محمد شاہ کے زمانے میں خزانے کی یہ حالت تھی کہ ملازمین کی تنخواہیں بڑی مشکل سے ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ فضول خرچی میں بادشاہ کے ساتھ امرا بھی مبتلا تھے۔ اندرونی اختلافات اس قدر اور اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ درباری امرا اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک کو بیچ ڈالنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جب نادر شاہ کی فوجیں منزل بہ منزل بڑھتی ہوئی دہلی کی طرف آ رہی تھیں اور نظام الملک برابر بادشاہ کو مقابلہ کے لیے اکساتا تھا تو دوسرے امرا صرف اس خیال سے بادشاہ کو بہلا پھسلا کر روک رہے تھے کہ نظام الملک کی بات اونچی نہ ہونے پائے۔ آخر کار نادر شاہ کی فوجیں کرنال تک پہنچ گئیں تب شاہی لشکر مقابلہ کے لیے نکلا۔ اس قیامت خیز موقع پر بھی امرا اپنی ذاتی چشمکوں اور خود غرضیوں کے شکار رہے۔ ایسی صورت میں اس جنگ کا انجام معلوم تھا۔

نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا اور رہی سہی عزت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ احمد شاہ کے حملے کئی بار ہوئے (پہلا حملہ سنہ ۱۷۴۷ء، دوسرا سنہ ۱۷۵۰ء، تیسرا سنہ ۱۷۵۱ء، چوتھا سنہ ۱۷۵۲ء، پانچواں سنہ ۱۷۵۷ء، چھٹا سنہ ۱۷۶۱ء، ساتواں سنہ ۱۷۶۲ء، آٹھواں سنہ ۱۷۶۷ء، نواں اور آخری سنہ ۱۷۶۹ء) ان پے در پے حملوں کے دوران ایسا بھی ہوا کہ مرہٹہ اور جاٹ چڑھ آئے اور ایک طوفان بپا کر دیا۔ پانی پت کے مقام پر احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی لیکن جلد ہی وہ اس قابل ہو گئے کہ دہلی پر اپنا تسلط قائم کر سکیں۔ میر نے دہلی کی تباہی و بربادی کے چشم دید حالات اپنی خود نوشت سوانح عمری ذکرِ میر میں لکھے ہیں۔

شاہ عالم کے دور حکومت میں دو تین لڑائیاں ہوئیں جن میں بکسر (سنہ ۱۷۶۴ء) کی جنگ بہت مشہور ہے۔ لگاتار جنگوں نے حکومت کو اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ تمام صوبے آزاد ہو چکے تھے اب مغلیہ حکومت سے مراد صرف دہلی اور اس کے اطراف تھے۔ اور اس کے متعلق یہ مشہور تھا "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم"

ادھر یہ انقلابات رونما ہو رہے تھے ادھر انگریز تاجر مشرقی ہندوستان میں برابر اپنے قدم جما رہے تھے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد وہ تمام صوبہ بنگال پر قابض ہو چکے تھے۔ اور شاہ عالم نے مشرقی اضلاع میں اپنے قیام کے دوران انھیں باقاعدہ بنگال کی دیوانی سپرد کر دی تھی۔ سنہ ۱۸۵۷ء تک یہی کمپنی عملاً ہندوستان پر حکمرانی کرتی رہی۔ شاہی خاندان کے زوال کے بعد ہی سے جب کہ ہندوستان کے مختلف نواب شکستہ سلطنت کے علاقوں کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر صوبہ ان چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیوں سے نالاں تھا ایسٹ انڈیا کمپنی نے بحیثیت مملکت کے سیاسی ترقی اور اہمیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اگر سچ پوچھیے تو حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستان کے لوگ آپس کی خانہ جنگیوں سے اس قدر پریشان تھے کہ ان کو ایسی حکومت کے استقبال کرنے میں خوشی ہوئی جو اُن کے ساتھ مذہبی رواداری برتتی تھی اور ان کے جان و مال کی محافظ تھی۔ اس طرح سنہ ۱۸۵۷ء میں اس پُر درد داستان کا خاتمہ ہو گیا۔

میر نے اپنے زمانے کے عروج و زوال کی پوری داستان صرف اس شعر میں سمو دی ہے۔

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھی سرو و گل کے سائے تھے

سلطنت کی بدحالی کا اثر ہندستانی تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں پر بھی پڑا۔ شاعر جو کہ سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس سیاسی، سماجی اور معاشی زبوں حالی نے نہ صرف اس کا وسیلۂ روزگار چھینا بلکہ اس کے قلب و ذہن کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ در اصل میر کی زندگی

صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد کو دارالعلوم دیوبند
سہارنپور میں ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ء کو ایک سپاسنامہ پیش
کیا گیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے
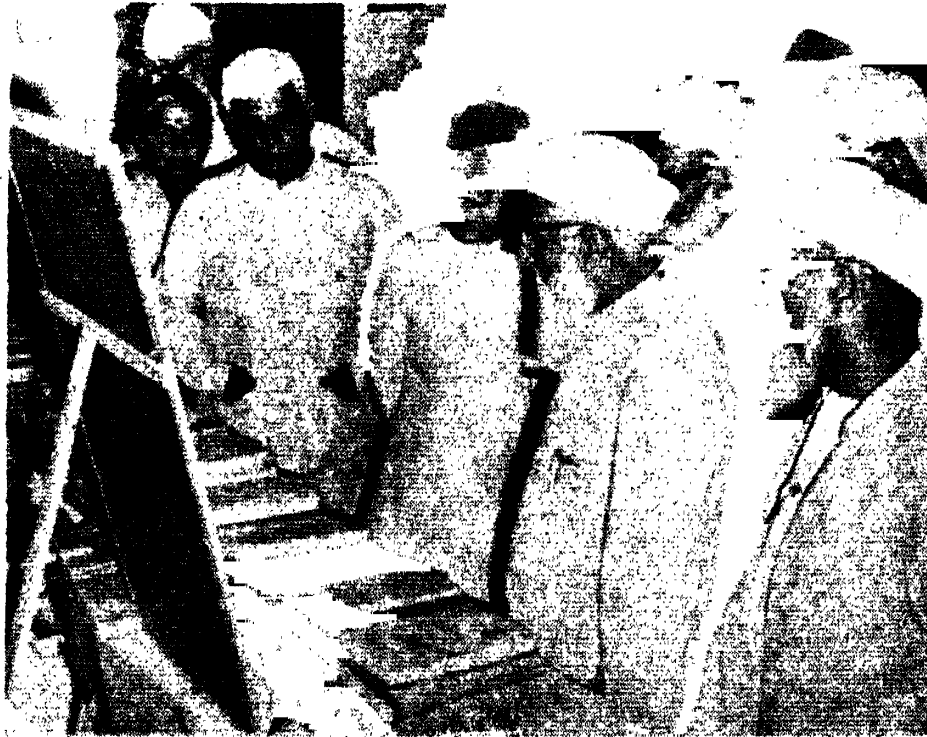
صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد دارالعلوم دیوبند کی لائبریری کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ تصویر میں وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری
صدر جمہوریہ کے ہمراہ (دائیں جانب) دکھائی دے رہے ہیں
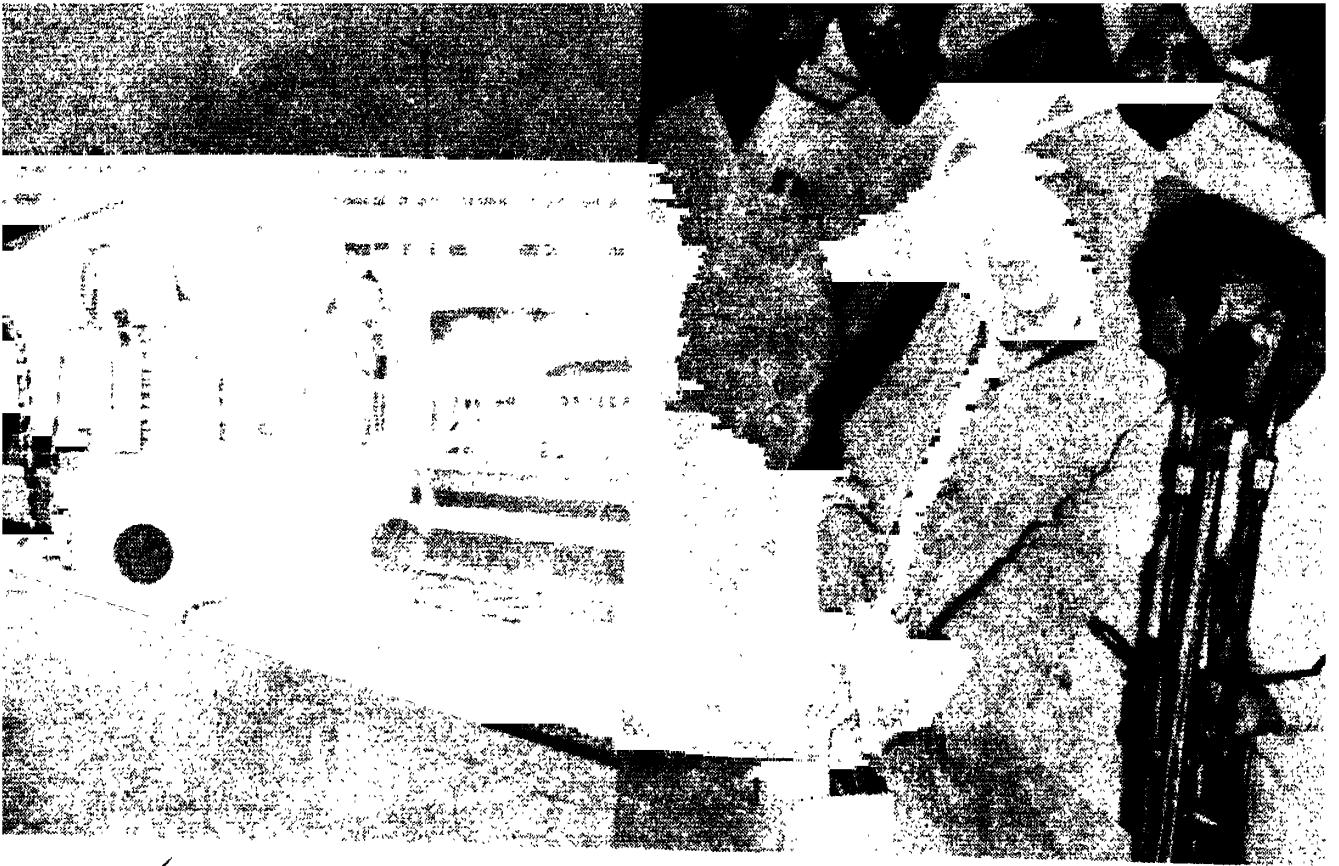
وزیر ریلوے پنڈت کملاپتی ترپاٹھی ۱۰ اپریل ۱۹۷۶ء کو مغل سرائے ریلوے اسٹیشن کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔ (بائیں) نئے مغل سرائے ریلوے اسٹیشن کا ماڈل

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو رائے بریلی
دریاباد۔ ڈلمئو ریلوے لائن پر جو عرصے سے بند پڑی تھی از سرِ نو
ریلوں کی آمد و رفت شروع کیے جانے کی رسم ادا کی
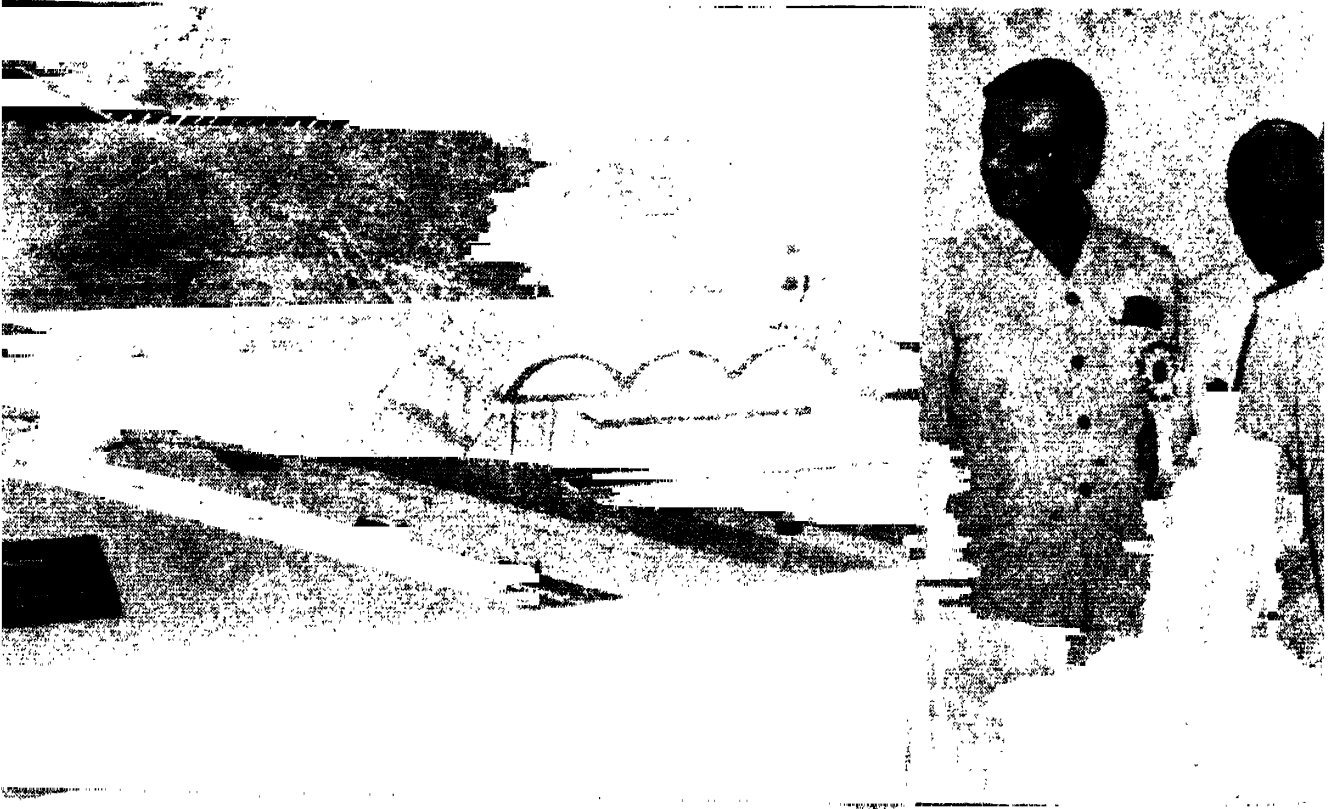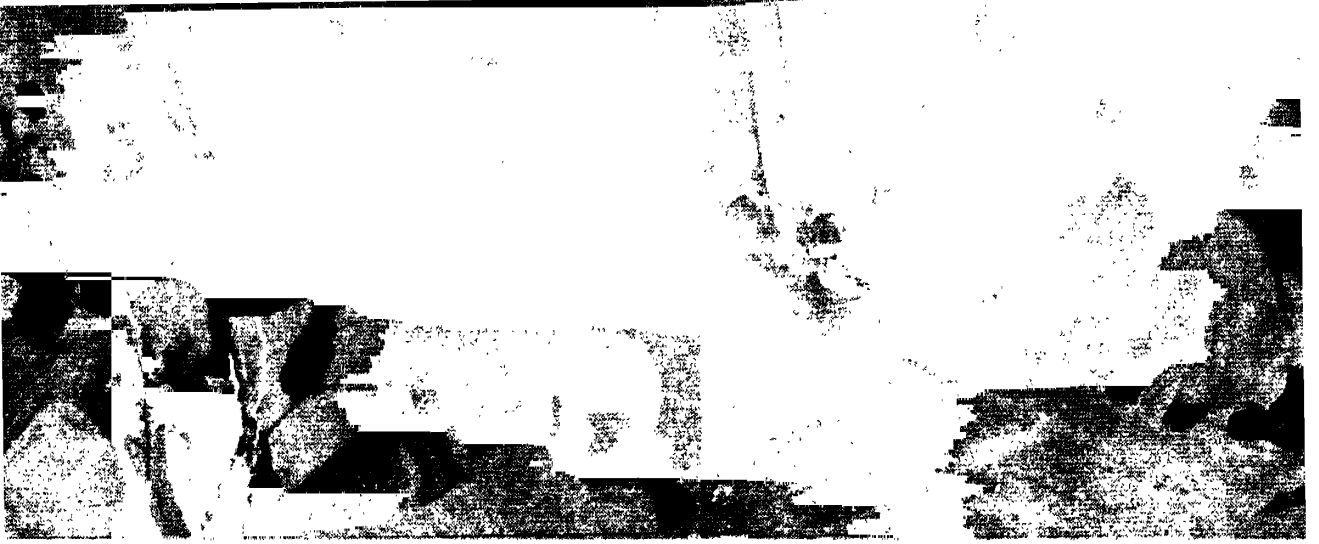
گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی ۱۰ اپریل ۱۹۷۶ء کو راج بھون کے دربار ہال میں شری لچھو مہاراج کے ڈائرکشن میں پیش کیا گیا
ایک کلچرل پروگرام دیکھ رہے ہیں

وزیر اعلا شری تیواری ۱۴ اپریل ۱۹۷۶ء کو بابا صاحب
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کی ۸۵ ویں سالگرہ پران کے
مجسمہ کی گل پوشی کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری تیواری ۱۰ اپریل ۱۹۷۶ء کو آگرہ میں پدیاترا کرتے ہوئے

کے واقعات. اور ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ اسی بدحالی کے اثرات کو پیش کرتا ہے۔ میر کی تمام شاعری اس دور کی دلی اور اس کی تہذیب کی زندگی کے افسانہ کو دہراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں دل اور شہر دلی کی تباہی کا ذکر بار بار آیا ہے:

دیدنی ہے شکستگی دل کی   کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ایک اور جگہ پر انھوں نے کہا ہے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی فضا شاعروں کے لیے مالی اعتبار سے سازگار تھی۔ اگرچہ یہاں کے لوگ حقیقی سیاسی اقتدار سے محروم تھے لیکن دولت و ثروت کی کثرت تھی اس لیے شعراء کی سرپرستی میں بھی کوئی دقت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں دلی کے اکثر شعراء نے ادھر کا رخ کیا۔ انھیں کے عہد میں میر بھی لکھنؤ پہنچے اور یہیں پر بس گئے۔

دلی میں ہر طرح کے مصائب برداشت کرنے کے بعد انھیں یہاں پرسکون فضا ملی تھی لیکن لکھنؤ کی پرتکلف فضا انھیں راس نہ آسکی۔ اور دلی کو ہمیشہ لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے کیونکہ بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

"لکھنؤ میں انھیں جو قدریں ملی تھیں وہ سطحی تھیں یا معنوی۔ لکھنؤ کی تہذیب خوب صورت بھی تھی اور پررونق بھی لیکن اس میں نہ گرمی تھی نہ گداز۔ اس کا حسن نظر کو تو فریب دے سکتا تھا لیکن دل کو نہیں ——— اس لیے وہ باوجود اہل لکھنؤ کی قدردانی کے دلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے کیونکہ اجڑی ہوئی دلی ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔" [1]

ان کے اشعار کو ملاحظہ فرمائیے کس قدر حسرت ٹپک رہی ہے۔

خرابہ دلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا   وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری   نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

ایک دن صبا کے ہاتھوں دلی والوں کو پیغام بھجواتے ہیں دیکھیے لہجہ کس قدر پرتاثیر اور درد انگیز ہے:

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار

★

---

[1] میر تقی میر حیات اور شاعری ص ۲۵۶

اختر نشاط

قطعات (چند یادیں)

اجنبی دیس کے حسیں چہرو
مجھ سے ناآشنا ابھی تم بھی
تم سے کس طرح دل کی بات کہوں
اجنبی میں ہوں اجنبی تم بھی

چھوڑ کے اپنی حسرتوں کے جہاں
میں تمہارے وطن میں آیا ہوں
اپنی دنیا الگ بسانے کو
چند یادیں بھی ساتھ لایا ہوں
ایسی یادیں جو درد بن بن کر
ہر گھڑی سینے میں سلگتی ہیں
ایسی یادیں جو میری پلکوں سے
کبھی تنہائیوں میں ڈھلتی ہیں

یاد ہیں مجھ کو وہ نقوشِ جمیل
جن کو چھو کر صبا بھی آتی تھی
رات سوتی تھی ان کی زلفوں میں
صبح چہرے سے مسکراتی تھی

اب نہ وہ دن پلٹ کے آئیں گے
اور نہ راتیں مجھے بلائیں گی
وجہ تسکین دل جو ہوتی تھیں
اب وہ گھڑیاں کہاں سے آئیں گی

عادل لکھنوی

قطعات

(ترکِ تعلق)

سوچتا ہوں کہ ترے خط تجھے واپس کر دوں
تجھ سے کہہ دوں کہ مرے خواب مجھے لوٹا دے
تجھ سے ان خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکتی
میرے راتوں کے یہ مہتاب مجھے لوٹا دے

میں نے سوچا تھا مرے خوابوں کا آئینہ ہے
تیرے الطاف و عنایات کا اک اک پہلو
میں نے سمجھا تھا مرے ذہن میں بس جائے گی
تیری سانسوں کی مہک تیرے بدن کی خوشبو

یہ ترے خط یہ تری یادوں کے دھندلے سے نقوش
میرے زخموں کا مداوا تو نہیں بن سکتے
چند کاغذ کے حسیں ٹکڑوں پہ کل کے وعدے
یہ مرے غم کا ازالہ تو نہیں بن سکتے

تیری یادوں کے تقاضے ہیں گریزاں مجھ سے
تجھ کو خوابوں کا حسیں تاج محل کیسے کہوں
تیری باتوں میں ہیں بیگانہ وشی کے انداز
تو ہی کہہ دے کہ تجھے جانِ غزل کیسے کہوں

ڈاکٹر محمد یٰسین

شری رام

راجہ دشرتھ اجودھیا کے ایک بہت بڑے راجہ تھے۔ راجہ دشرتھ کے تین رانیاں تھیں۔ کوشلیا، کیکئی اور سمترا۔ کوشلیا سب سے بڑی رانی تھی۔ ان تینوں رانیوں میں کیکئی سب سے چھوٹی اور خوب صورت تھی۔ اس وجہ سے راجہ ان کو بہت پیار کرتے تھے اور عزیز رکھتے تھے۔ لیکن راجہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس وجہ سے وہ بہت غمگین رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے گرو کے مشورے سے ایک بہت بڑا یگیہ کیا تاکہ ان کے یہاں اولاد پیدا ہو۔ راجہ کی دعا قبول ہوئی اور تین رانیوں سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ کوشلیا سے شری رام، کیکئی سے شری بھرت اور سمترا سے شری لکشمن اور شتروگھن۔ یہ دونوں جڑواں تھے۔

شری رام کی پیدائش چیت کے مہینہ میں رام نومی کے روز دوپہر کو ہوئی۔ ان کی پیدائش پر سارے اجودھیا میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ ہندو لوگ شری رام چندر جی کو وشنو بھگوان کا اوتار مانتے ہیں۔ یہ اوتار رشیوں کی رکشا کرنے، راکشسوں کو مارنے اور مریاد ادرست کرنے کے واسطے پیدا ہوا۔

شری رام سب سے بڑے لڑکے تھے۔ وہ بڑے قابل، فرمانبردار، انصاف پسند اور سنجیدہ طبیعت کے تھے۔ شری بھرت کی طبیعت بھی شری رام چندر جی کی طرح تھی۔ لکشمن اور شتروگھن مزاج کے تیز تھے۔ ان چاروں بھائیوں میں رام اور لکشمن زیادہ قریب تھے۔ اسی طرح بھرت اور شتروگھن زیادہ دوست تھے۔

شری رام ابھی لڑکے ہی تھے کہ ایک روز بزرگ رشی وشوامتر راجہ دشرتھ کے پاس آئے اور کہا کہ راکشس ان کو بہت تنگ کرتے ہیں اور پوجا پاٹ میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ انھوں نے راجہ سے استدعا کی کہ وہ رام اور لکشمن کو ان کے ہمراہ بھیج دیں۔ والد کا حکم پاتے ہی یہ دونوں شہزادے وشوامتر کے ساتھ گھنے جنگلوں میں راکشسوں سے لڑنے کے لیے چلے گئے۔ انھوں نے راکشسوں کو شکست دی۔ رشی وشوامتر نے اس موقع پر رام اور لکشمن کو جنگی تربیت دی، کچھ معجزنما ہتھیار دیے اور اپنا آشیرواد اور دعائیں دیں۔

اس کے بعد شری رام اور لکشمن وشوامتر جی کے ساتھ متھلا دیش (بہار) کے راجہ جنک کے دربار میں گئے۔ وہاں پر راجہ جنک کی بیٹی سیتا جی کا سوئمبر ہو رہا تھا۔ سیتا جی بہت خوبصورت تھیں لہٰذا سوئمبر میں حصّہ لینے کے لیے بہت دور دور سے شہزادے، راجے اور مہاراجے آئے تھے۔ سوئمبر میں لنکا کا مشہور اور بہت طاقت ور راجہ راون بھی شریک تھا۔ کہتے ہیں کہ راون اتنا طاقت ور تھا کہ ایک مرتبہ اس نے پورا ہمالیہ پہاڑ اٹھا لیا تھا۔

سوئمبر میں شرط یہ تھی کہ جو شخص شیو جی کی دھنش (کمان) کو اٹھائے گا اسی سے سیتا جی کی شادی ہوگی۔ سب لوگوں نے قسمت آزمائی کی لیکن دھنش کا اٹھانا تو در کنار کوئی اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکا۔ یہ دیکھ کر راجہ جنک بہت ملول ہوئے کیونکہ شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں سیتا جی بن بیاہی رہ جاتیں۔ انھوں نے بڑے دکھ سے مجمع کو خطاب کیا کہ کیا ساری دنیا میں اب کوئی بہادر آدمی رہ ہی نہیں گیا ہے۔

یہ دیکھ کر وشوامتر جی نے شری رام سے کہا کہ بیٹا اٹھو اور دھنش کو توڑ دو۔ حالانکہ راجہ دشرتھ کو دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا تھا اور شری رام سویمبر میں باقاعدہ مدعو نہیں تھے پھر بھی وشوامتر جی کا حکم پاتے ہی وہ اٹھے۔ انھوں نے نہ صرف دھنش کو اٹھایا ہی بلکہ اٹھا کر جھکا دیا اور اتنا جھکایا کہ دھنش دو ٹکڑے ہو گئی۔ سارا دربار مبہوت تھا اور اس طرح شری رام کی شادی سیتا جی سے ہو گئی۔

کچھ سال بعد ایک روز راجہ دشرتھ آئینہ میں اپنا منھ دیکھ رہے تھے کہ یکایک ان کی نظر کچھ سفید بالوں پر پڑی۔ وہ چونکے مطلب یہ کہ بڑھاپا آ گیا۔ راجہ دشرتھ نے اپنے وزیروں کے مشورے سے طے کیا کہ وہ تخت شری رام کو سونپ دیں گے اور خود سنیاس لے لیں گے۔

کہتے ہیں کہ راجہ دشرتھ چاہتے تھے کہ راج تلک خاموشی اور آسانی سے ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے بھرت جی کو ان کے ننہیال بھیج دیا۔ اور راج تلک کی خبر رانی کیکئی کو بھی نہ دی۔ راج تلک سے ایک روز پہلے منتھرا جو رانی کیکئی کی خادمہ تھی اور ان کے ساتھ ان کے میکے سے آئی تھی، رانی کیکئی کے پاس آئی اور کہا کہ وہ محل سے باہر گئی تھی تو اس نے دیکھا کہ شہر میں بڑی چہل پہل ہے کیونکہ کل شری رام کا راج تلک ہے۔ راجہ دشرتھ نے طے کیا ہے کہ وہ رام چندر جی کو راج گدی سونپ کر خود سنیاس لے لیں گے۔ اس طرح بھرت جی یعنی رانی کیکئی کے لڑکے تخت سے محروم ہو جائیں گے۔ رانی کیکئی نے کہا کہ تو کیا ہوا۔ شری رام بھی ان کے لڑکے ہیں اور اپنی ماں سے زیادہ ان کی عزت کرتے ہیں۔ پھر منتھرا نے سمجھایا کہ وہ غلطی کر رہی ہیں۔ جب شری رام راجہ ہو جائیں گے تو کوشلیا راج ماتا ہوں گی اور لکشمن شری رام کے نائب ہوں گے۔ بھرت جی اور خود رانی کیکئی کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

منتھرا نے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ جب راجہ دشرتھ دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور رانی کیکئی رتھ میں ان کے ساتھ تھیں تو رانی نے دیکھا کہ رتھ کے ایک پہیئے کی کیل نکل کر گر گئی ہے اور وہ پہیہ رتھ سے الگ ہونے والا ہے تو رانی نے کیل کی جگہ اپنی انگلی لگا دی۔ جب لڑائی ختم ہو گئی اور راجہ دشرتھ نے رانی کیکئی کی یہ قربانی دیکھی تو انھوں نے خوش ہو کر رانی سے کہا تھا کہ تم کو دو وعدے دیتا ہوں۔ تم دو باتیں یا دو چیزیں جو چاہو مجھ سے مانگ لو میں اسے ہر قیمت پر پورا کروں گا۔ رانی نے کہا اچھی بات ہے۔ پھر کبھی مانگوں گی۔ منتھرا نے کہا کہ یہی موقع ہے کہ تم راجہ سے کہو کہ وہ رام چندر جی کو ۱۴ سال کے لیے بن باس دے دیں اور بھرت جی کو اس عرصہ کے لیے راج گدی سونپ دیں۔ رانی کیکئی نے منتھرا کی بات مان لی۔

اسی دن رات کو جب راجہ دشرتھ رانی کیکئی کے محل میں آئے تو دیکھا کہ رانی منھ اوڑھے لیٹی ہوئی ہے اور بہت ناراض ہے۔ راجہ دشرتھ کانپ گئے۔ انھوں نے رانی سے ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ رانی نے راجہ کو ان کا وعدہ یاد دلایا اور جیسا کہ منتھرا نے سکھلایا تھا اس نے شری رام کے لیے چودہ[۱۴] برس کا بن باس اور بھرت کے لیے چودہ[۱۴] سال تک راج گدی کی مانگ کی۔ پہلے تو راجہ نے سمجھا کہ یہ مذاق ہے لیکن جب رانی اپنی ہٹ پر اڑی رہی اور کسی طرح اس نے اپنی بات واپس نہ لی تو راجہ کے ہوش اڑ گئے اور وہ گر پڑے۔ رات اسی کشمکش میں گزری۔ جب صبح ہوئی تو رانی کیکئی نے شری رام کو اپنے محل میں بلوایا۔ شری رام نے پوچھا بات کیا ہے۔ راجہ اتنے پریشان اور رنجیدہ کیوں ہیں۔ رانی نے پوری بات بتا دی اور کہا کہ راجہ تذبذب میں ہیں کہ کیا کریں۔ شری رام کے چہرے پر کوئی بھی غم کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا کہ باپ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا ؎

گھو کل ریت سدا چلی آئی
پران جائے پر وچن نہ جائی

شری رام وہاں سے اپنی ماں کوشلیا کے پاس آئے۔ ماں نے پوچھا کہ اتنا دن چڑھ آیا ہے اور وہ ابھی تک راج تلک کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ شری رام نے مسکرا کر جواب دیا کہ انھیں ان کے والد

نے جنگل کا راج دیا ہے وہ وہاں جا رہے ہیں۔

اس خبر سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ بہت سے لوگوں نے شری رام کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دیں اور جنگل کو نہ جائیں لیکن انھوں نے کسی کی نہ مانی۔ یہ دیکھ کر لکشمن جی بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ سیتا جی نے بھی کہا کہ وہ بھی شری رام کے ساتھ ہی جائیں گی۔ ان پر بھی سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ان تین آدمیوں کا قافلہ پورے اجودھیا کو روتا ہوا چھوڑ کر جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر یہ لوگ چلے اور ادھر راجہ دشرتھ اس صدمہ کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہو گئے۔

رانی کیکئی کے لڑکے بھرت جی جب اجودھیا پہنچے اور ان کو سارا حال معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض اور غمگین ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ ہرگز راج گدی پر نہیں بیٹھیں گی۔ بھرت جی نے اپنے پورے خاندان کے افراد کو ساتھ لیا اور شری رام کو واپس لانے کے لیے چترکوٹ روانہ ہو گئے۔

جب یہ لوگ چترکوٹ پہنچے تو شری رام سب سے پہلے رانی کیکئی سے ملے۔ وہ کسی طرح واپس آنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ باپ کا وعدہ ضرور نبھائیں گے۔ جب بھرت جی نے دیکھا تو وہ شری رام کی کھڑاؤں لیتے آئے اور اسے راج سنگھاسن پر رکھ کر شری رام کے نائب کی حیثیت سے ان کی غیر موجودگی میں سلطنت کا کام انجام دیتے رہے۔

بھرت جی کی چترکوٹ سے واپسی کے بعد شری رام نے سوچا کہ ان کے خاندان کے لوگوں کو ان کی جائے رہائش کا پتہ چل گیا ہے وہ اکثر وہاں آئیں گے "بن باس" کے معنی صرف جگہ کی تبدیلی نہیں ہے لہٰذا انھوں نے چترکوٹ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ وہاں سے دکھن کی جانب پنچ وٹی چلے گئے۔

پنچ وٹی میں لنکا کے مشہور اور طاقت ور راجہ راون کی بہن سوپ نکھا نے شری رام کو دیکھا۔ ان کو دیکھتے ہی وہ ان پر عاشق ہو گئی اور شری رام کا قرب حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں کرنے لگی۔ شری رام نے اس کو باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ آخرکار شری رام کے اشارے پر لکشمن جی نے سوپ نکھا کی ناک اور کان کاٹ ڈالے۔

سوپ نکھا روتی ہوئی اپنے دو سگے بھائیوں کھر اور دوشن کے پاس گئی۔ کھر اور دوشن اپنے ساتھیوں کو لے کر شری رام سے لڑنے کے لیے آئے لیکن دونوں مارے گئے۔

سوپ نکھا یہ دیکھ کر اپنے سب سے بڑے بھائی راون کے پاس فریاد لے کر گئی۔ اپنی بہن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے راون نے دھوکے سے سیتا جی کو ہر لیا اور لاکر لنکا میں قید کر دیا۔ شری رام نے بندروں کے راجہ سگریو اور ان کے سپاہی شری ہنومان کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کی۔ راون کو شکست فاش ہوئی وہ لڑائی میں مارا گیا۔ سیتا جی کو قید سے رہائی ملی۔

چودہ ۱۴ سال کی مدت پوری ہونے کے بعد شری رام اجودھیا واپس لوٹے۔ بھرت جی نے شری رام چندر جی کا بڑا پرجوش استقبال کیا اور راج گدی شری رام کے حوالے کی۔ سارے بچھڑے ہوئے گلے مل گئے۔

شری رام کی زندگی کے حالات "رامائن" سب سے پہلے والمیکی نے سنسکرت میں لکھی۔ والمیکی نے شری رام کو ایک آئیڈیل انسان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ شہنشاہ اکبر اعظم کے دور حکومت میں تلسی داس نے "رام چرتر مانس" فلسفیانہ انداز میں لکھی اور شری رام کو انسان سے زیادہ اوتار دکھلایا ہے تامل زبان میں کمبن نے رامائن بہت دل کش پیرایہ میں لکھی ہے۔

شری رام انسان کامل تھے۔ آدرش مجسم۔

★

قیام الدین مضطر

اندرا گاندھی سے تخاطب

اے پاسبانِ مملکتِ ہند، نیک خو
شاعر ہوں، تجھ سے ہوتا ہوں مصروفِ گفتگو

ہے تیرا کیا مقام، تو کیا ہے، خبر بھی ہے
میری نظر سے دیکھ، تو خود کو، کہ کیا ہے تو

خورشید و ماہتاب فلک پر ہیں جس طرح
روشن ہے تو زمیں پہ، اسی طرح ہو بہو

تو کیا ہے، گلستانِ عمل کی ہے باغباں
ابرِ کرم ہے، رحمتِ پروردگار تو

تو نے زمینِ ہند کا رتبہ بڑھا دیا
تیرا ہی ذکر، تیرا ہی چرچا ہے چار سو

تو نے وطن کو ایٹمی طاقت بنا دیا
کیا خوب ہے یہ تیرا عمل، تیری جستجو

اس دیش کی غریبی مٹی ہے مٹے گی اور
بیماریِ وطن کی، تو ہی تو ہے چارہ جو

اسمگلروں سے تو نے وطن کو نجات دی
مدت سے پی رہے تھے یہ انسان کا لہو

رستے سے جو ہٹے تھے وہ رستے پہ آ گئے
اپنے کیے پہ سب ہی پشیماں ہیں خیلہ جو

واللہ تیرا بیس نکاتی پروگرام
مخفی ہے اس میں دیش کی تکمیلِ آرزو

وہ جن کو جاننا ہو کہ حبِ وطن ہے کیا
محفل میں تیری آئیں، مگر آئیں با وضو

مضطرؔ میں حق پرست ہوں بھارت کا ہوں ادیب
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی مجھ میں نہیں ہے خو

خان اختر

بیس شعاعیں

خورشید و مہ و انجم سب توڑ کے لانا ہے
اس دیش کی دھرتی کو آکاش بنانا ہے
صحرا کی زمینوں کو پھولوں سے سجانا ہے
اور صحنِ گلستاں کو فردوس بنانا ہے
اک ذہنِ منور سے پھوٹی ہیں شعاعیں جو
ان بیس شعاعوں کو سینے سے لگانا ہے
پائیں گے برابر سے اب اپنی زمینوں کو
بے کھیت کسانوں کی طاقت کو بڑھانا ہے
الفت سے محبت سے چمکائیں گے ہر چہرہ
ہر قرض کے دھبے کو دامن سے مٹانا ہے
زردار کی فطرت کو بدلیں گے بہر صورت
مزدور کی محنت کا پھل اس کو دلانا ہے
محنت سے مشقت سے اور اپنے ہی ہاتھوں سے
بیکار زمینوں کو زرخیز بنانا ہے
آشوبِ زمانہ کے ہاتھوں سے بچا کر اب
امید کی ہر کشتی ساحل سے لگانا ہے
سرکار کی امداد اور جنتا کے تعاون سے
ہر صنعت و حرفت کا معیار بڑھانا ہے
اخلاص کے نغموں سے الفت کے ترانوں سے
بغض اور تعصب کے شعلوں کو بجھانا ہے
مزدور ہوں تاجر ہوں صانع ہوں کہ مل مالک
ان سب کو فرائض کا آئینہ دکھانا ہے
جس بامِ ترقی پر کچھ اور ممالک ہیں
اس بامِ ترقی پر بھارت کو بھی لانا ہے
ان بیس شعاعوں کے اخترؔ جو اشارے ہیں
ان سب پہ عمل کر کے ہم سب کو دکھانا ہے

اختر حسین

ضمیر کی آواز

(افسانہ)

روڈ ویز کی بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سیتاپور بس اسٹیشن پر وہ جوں ہی آکر رکی کچھ مسافر اپنا سامان ہاتھ میں لیے ہوئے بس میں چڑھنے لگے بس میں چڑھتے وقت تمام مسافر ہندستانی روایت کو برقرار رکھے ہوئے تھے یعنی ہر آدمی بس میں پہلے پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن وہ یہ بھول جاتا تھا کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو اس کی جلد بازی اور اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے بس میں داخل نہیں ہو پا رہے تھے۔

اسی درمیان ایک دس سالہ لڑکا جاڑے کے موسم میں بھی ایک گندی سی بنیائن اور نیکر پہنے، ہاتھ میں باسکٹ ٹانگے ہوئے بس میں چڑھتا چلا آ رہا ہے وہ مجمع کو جلد سے جلد چیر کر اوپر آنا چاہتا تھا تاکہ اس کا سودا زیادہ سے زیادہ لوگ خرید سکیں "چار آنے کی پچاس گرام مونگ پھلی ہے جوریہ ہندستانی میوہ چار آنے میں پچاس گرام جور" وہ اسی طرح کی مسلسل آوازیں لگاتا رہا۔ ارشد نے اس کو اپنے نزدیک بلایا اور کہا "پچاس گرام موم پھلی دو بیٹا ——" "ابھی دیا جور" یہ کہہ کر اس نے موم پھلی کا ایک پیکٹ بڑی پھرتی سے نکالا اور ارشد کو تھما دیا، پیسے لے کر وہ آواز لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور جب تک بس وہاں کھڑی رہی وہ برابر یہی آواز لگاتا رہا — پھر بس کے ڈرائیور نے ہارن دیا اور کنڈکٹر نے سیٹی دے دی۔ اور بس اپنی طوفانی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی اور انجن کے اس شور میں لڑکے کی آواز "چار آنے میں پچاس گرام موم پھلی ہے جور" اس طرح ڈوبتی چلی گئی جس طرح رات کے آخری پہر تارے ڈوبتے چلے جاتے ہیں اور ارشد کھڑکی سے باہر مونگ پھلی کے چھلکے پھینکتا رہا یہ چھلکے ہوا میں ایسے اڑ رہے تھے جیسے آپس میں آنکھ مچولی کر رہے ہوں۔

ارشد ایک پرائیوٹ فرم میں کلرک تھا۔ ابھی اس کی عمر صرف تیئیس ہی سال تھی لیکن گھریلو پریشانیوں کے سبب وہ محض بی۔ اے تک تعلیم حاصل کر سکا اور پھر اس کے بعد اپنی تعلیمی زندگی کو خیرباد کہہ کر فکر معاش میں اسے دفتروں کے چکر لگانا پڑے لیکن واہ ری قسمت بی، اے کی فرسٹ ڈویژن بھی اس کو اچھی نوکری نہ دلا سکی۔ بڑی جد و جہد اور دوڑ دھوپ کے بعد اسے دو سو روپیہ ماہوار کی نوکری مل گئی لیکن نوکری دینے والے نے تنخواہ مقرر کرتے وقت یہ بھی محسوس نہ کیا کہ یہ دو سو روپے کی رقم اس کی تعلیمی زندگی میں پیدا شدہ مشکلات کے باعث اپنی ماں کے رہن رکھے ہوئے زیورات کو چھڑانے کے لیے بہت کم ہے جو کافی عرصہ قبل اس امید پر گروی رکھے گئے تھے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس گھر کے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلیں گے لیکن جن پھولوں کے کھلنے کی توقع کی جا رہی تھی وہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے تھے۔ بدرجۂ مجبوری ارشد کو یہ نوکری کرنا پڑی جس کے لیے اسے روز لکھیم پور کھیری سے سیتاپور آنا پڑتا تھا۔

روز مرہ کی زندگی کے تمام معمولات میں اس مونگ پھلی بیچنے والے بچے سے بھی ارشد کی ملاقات ضروری تھی اور ارشد اس سے روز ہی مونگ پھلی خرید لیا کرتا تھا۔ ہر روز وہ اس کی مخصوص آواز سنا کرتا تھا۔ دو سال کے بعد ایک روز وہ لڑکا اس بس میں نہیں دکھائی دیا تو ارشد کو تعجب سا ہوا اس نے کافی دیر تک انتظار کیا لیکن بس اپنے وقت کے مطابق اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ دوسرے دن ارشد نے دیکھا کہ وہ بچہ اب بس اسٹیشن پر خوانچہ لگائے ہوئے لوگوں کو متلاشی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کبھی کبھی وہی پرانی آواز "چار آنے میں پچاس گرام ہے حجور" لگا دیا کرتا ہے۔ ارشد اس کے قریب آ گیا اور پوچھا کیوں بھائی یہ خوانچہ تم نے کب سے لگایا، لڑکے نے جواب دیا ابھی ایک دن ہوا ہے حجور ——— رسمی ملاقات اور مونگ پھلی کی خریداری کے بعد ارشد بس میں چڑھ گیا۔

زندگی کے دن گزرتے رہے وقت کا تیز دھارا زمانہ کو اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ ارشد کی ان تھک محنت اور جانفشانی اس کے کام آئی اب اس کی معاشی حالت کافی اچھی ہو چکی تھی زندگی کی اس تبدیلی میں اس کے پارٹ ٹائم جاب نے بہت ساتھ دیا وہ اپنی زندگی کی راہوں میں کامیابی و ترقی کی بلندی کو چھونے کی کوشش کرتا رہا جس سے اس کو کافی محنت کا سہارا لینا پڑا، اس کی مستقل مزاجی نے اسے کلرک سے آفس سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ ایک دن ارشد نے واپسی میں دیکھا کہ وہ لڑکا اب کافی تندرست اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بس اسٹیشن کے اندر ہی ایک ہوٹل میں ملازمین کے ذریعے چائے تقسیم کروا رہا ہے۔ ارشد کو اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، وہ اس چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہوا تو لڑکے نے اسے بڑے ادب سے سلام کیا ارشد نے اسے مبارک باد دی اور اس تبدیلی کے بارے میں استفسار کیا تو لڑکے نے بتایا کہ حضور یہ سب میری بے پناہ محنت کا نتیجہ ہے۔ ارشد نے کہا ارے بھائی تم مجھ سے اپنا نام تو بتاؤ ——— "حجور میرا نام رئیس ہے۔ میں اسی سیتاپور کی گندی بستی میں پیدا ہوا۔ میرے ماں باپ مجھے بچپن میں ہی بے سہارا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔" یہ کہہ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، "پھر میں حجور پیٹ پالنے کے لیے ادھر ادھر بھٹکتا رہا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد مونگ پھلی بیچنے کا کام میں نے شروع کر دیا۔ میں اپنی روز کی آمدنی اپنے محلے کی ایک بہت ہی رحم دل اور خدا ترس بوڑھی عورت کے پاس رکھ دیا کرتا تھا اور اسی کے یہاں سوتا بھی تھا وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتی تھی، ایک ہی سال کے اندر جب میں نے ایک اچھی خاصی رقم اکٹھا کر لی تو میں نے یہ ہوٹل کر لیا اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد میری دنیا کی سب سے بڑی قیمتی چیز میری بوڑھی ماں، میری سرپرست میری غم خوار مجھے داغِ مفارقت دے گئی" "اب میں اکیلا اسی ہوٹل کے لیے رہ گیا" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ارشد نے اسے بہت تسلی دی۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کی سسکیاں بند ہوئیں تب ارشد نے پوچھا کہ تم اب کہاں رہتے ہو۔ اس نے بتایا کہ اب میں نے اسی جھونپڑے کو پختہ مکان میں تبدیل کر لیا ہے۔ کیونکہ میری بوڑھی ماں نے اپنی کل جائداد مجھ ہی کو دے دی تھی اور اب میں اسی مکان میں رہتا ہوں حجور ——— ارشد نے اس سے ذرا تیکھے انداز میں کہا کہ اب تم یہ حجور حجور نہ کہا کرو ——— رئیس نے جواب دیا کہ آپ سے میری ملاقات بچپن سے ہے اس لیے مجھے آپ کو حجور کہتے ہوئے شرم نہیں محسوس ہوتی۔ ارشد نے کہا وہ تو ٹھیک ہے لیکن جب تم بچپن میں حجور کہہ کر لوگوں کو مخاطب کرتے تھے تب بھی مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت دنیا والوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں حجور کہہ کر مخاطب کرو، چیتھڑوں میں لپٹا ہوا گندہ جسم سفید پوش لوگوں کو حجور کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے لیکن کوئی کیا جانے کہ چیتھڑوں میں کتنی پاکیزگی ہے اور سفید کپڑوں میں کتنی غلاظت ہے۔ اب تم اپنی جد و جہد سے ایک ہوٹل کے مالک ہو گئے ہو اب تو حجور کہہ کر تم مجھے مخاطب نہ کیا کرو اور پھر

تھوڑی دیر کے بعد ارشد اسے کچھ صلاح مشورے دے کر رخصت ہوگیا، رئیس کے کانوں میں ارشد کی آواز گونجتی رہی کہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا گندہ جسم سفید پوش آدمیوں کو حجور کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے۔

زندگی کے صبح و شام اپنے معمول کے مطابق دنوں، مہینوں اور سالوں میں بدلتے رہے، رئیس کا ہوٹل سیتاپور کا بہترین ہوٹل شمار ہونے لگا۔ اب رئیس وہ رئیس نہیں تھا جو بچپن میں تھا لیکن ارشد کے سامنے وہ آج بھی بچپن والا رئیس تھا اور ان دونوں کے درمیان آج بھی وہ رشتہ قائم تھا اب رئیس کا مکان ایک خوبصورت مکان میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہ آج بھی اسی بستی میں رہتا تھا جہاں آج سے دس سال قبل وہ ایک جھونپڑا تھا دولت کی زیادتی نے رئیس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں لیکن ارشد کی نصیحت اکثر اس کے ضمیر کو جھنجوڑ دیتی تھی اور وہ اپنی کم عمری کے دور میں پہنچ جاتا تھا جہاں دوسرے اس کے لیے حجور تھے۔

ایک مرتبہ سیتاپور میں زبردست سیلاب آگیا، بہت لوگ بے گھر ہوگئے اور خاص طور سے رئیس کے محلے والے اس آفت ناگہانی کا شکار بہت زیادہ ہوئے ان کی مفلسی اور فاقے انہیں مجبور کرتے تھے کہ وہ رئیس کے دروازے پر دستک دیں اسی امید سے وہ اس کے گھر کی سمت چلے آتے تھے۔ ایک دن رئیس اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڑھیا اپنے ساتھ ایک جوان لڑکی کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی بڑھیا فاقوں سے بہت ہی نڈھال تھی اور اس لڑکی کا بھوک سے پیٹ چپک گیا تھا جس کے باعث اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ بڑھیا نے بڑے دردناک لہجے میں التجا کی تھی رئیس نے بڑھیا کی بات ان سنی کر دی۔ وہ تو صرف اس لڑکی کے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے جسم کو دیکھ رہا تھا جو چیتھڑوں میں لپٹا ہونے کے باوجود اپنے پورے شباب پر تھا، رئیس نے بڑھیا کا مفہوم سمجھ کر اس کی امداد کر دی اور کہا کہ شام کو اپنی لڑکی کو بھیج دینا تو میں اور بھی زیادہ مدد کر دوں گا تمہارے آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم بہت ضعیف ہوگئی ہو ـــــ اچھا بیٹا اس بڑھیا نے کہا اور ہدیۂ تشکر سے اس لڑکی کی صرف پلکیں جھکیں اور پھر پلکوں کی چلمن اٹھ گئی بڑھیا اور وہ لڑکی رئیس کو دعائیں دیتی ہوئی واپس لوٹ آئیں ـــــ شام کو بڑھیا نے لڑکی کو رئیس کے گھر بھیج دیا رئیس شام سے پہلے ہی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا، وہ لڑکی جیسے ہی مکان میں داخل ہوئی رئیس کی ہوس ناک نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ رئیس نے اس کو اندر آنے کے لیے کہا اور پوچھا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟ لڑکی نے کہا کہ میرے ماں باپ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں رئیس کو ایک ہلکا سا جھٹکا اپنے ذہن پر محسوس ہوا لیکن ہوس کی آگ میں جلتے ہوئے اس کے وجود نے اس ذہنی جھٹکے کا احساس بہت جلد ختم کر دیا رسمی گفتگو کے بعد رئیس نے اس کے جسم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ لڑکی پیچھے ہٹ گئی لیکن رئیس کی مضبوط باہوں نے بہت جلد اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیا...... لڑکی نے کہا کہ حجور میری بڑھیا ماں نے مجھے تمہارے پاس مدد کے واسطے بھیجا ہے لیکن حجور تم یہ میری مدد کر رہے ہو یا میری کسی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہو رئیس نے کہا تم مجھے حجور حجور مت کہو تب لڑکی نے بڑے طنز کے ساتھ جواب دیا کہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا گندہ جسم سفید پوش آدمیوں کو حجور کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے۔ اتنا سنتے ہی رئیس کے بازو ایک دم ڈھیلے پڑ گئے اور وہ دور بستر پر جا گرا۔ ارشد کے الفاظ نے آج لڑکی کے اندر جنم لے کر رئیس کے سارے وجود کو ننگا کر دیا تھا، اس کا ضمیر جاگ اٹھا، وہ انتہائی پشیمان تھا اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا بچپن بہت تیزی سے گھوم رہا تھا اور باہر گلی میں ایک بچہ زور زور سے چلا رہا تھا۔

"مونگ پھلی چار آنے میں پچاس گرام ہے حجور"

★

مومن خاں شوق

نیا دور، نئے عزم

کم کرو باتیں، عمل اپنا دکھاؤ دوستو
دیش کی خاطر سے تن من دھن لٹاؤ دوستو

آئے گی خوش حالی پیداوار کی افراط سے
اپنی پیداوار، محنت سے بڑھاؤ دوستو

دیش کے دشمن ہی پھیلاتے ہیں افواہیں یہاں
دیش بھگتو! منھ پہ افواہیں نہ لاؤ دوستو

آج مستعدی، ڈسپلن وقت کی للکار ہے
کام نپٹا کر، قدم آگے بڑھاؤ دوستو

محنت و کوشش، دیانت کا سبق لو شوق سے
دیش کو اس طرح دشمن سے بچاؤ دوستو

بیس نکاتی پروگرام

غلام مظہر انور سلطانوی

ہم کو دعوت دے رہا ہے بیس نکتوں کا محاذ
متحد ہو کر کریں گے سر ترقی کا محاذ
سیٹھ یا ہو کار کے سر اک نئی افتاد ہے
قرض کے چنگل سے ہر مزدور اب آزاد ہے
کام لے سکتا نہیں جبراً کوئی مزدور سے
سب کو آگاہی ملی ہے تیسرے منشور سے
اب مناسب طور پر مزدور کو اجرت ملے
جس قدر محنت کرے اتنی اُسے قیمت ملے
اور رہائش کے لیے ہر خانداں کو گھر ملے
اب نہ سڑکوں پر لگا مزدور کا بستر ملے
آبپاشی کے طریقوں کا ہو اچھا انتظام
اور بجلی کے فوائد سے ہوں بہرہ ور عوام
طالب علموں کے لیے سستی کتابیں کا بیاں
ہوں حصول علم کی ممکن سبھی آسانیاں
علم میں سرکار کے آجائے شہری جائیداد
ٹیکس چوری کی وبا کا ہو مکمل انسداد
صنعتیں جتنی بھی ہوں بہتر ہو سب کا انتظام
دور ہو بے روزگاری اور ملے ہر اک کو کام
جتنی مزروعہ زمیں ہے اس کی پیمائش بھی ہو
بھومی ہینوں کو زمیں ملنے کی گنجائش بھی ہو
غلہ، صابن اور گھی کپڑے کی اب دقت نہ ہو
زندگی کی ہر ضروری شے کی پھر قلت نہ ہو
ہو ٹرانک کے لیے پرمٹ کا بہتر انتظام
ہو درآمد اور برآمد کا مکمل اہتمام
جو بھی اب سامان اسمگلنگ کا پکڑا جائے گا
اب کسی حالت میں وہ ہرگز نہ چھوڑا جائے گا
چور بازاری کا مٹ جائے گا اب نام و نشاں
گامزن ہے اب صداقت کی طرف ہندوستاں
رہبر ہندوستاں کا اب یہی اعلان ہے
دور حاضر کی صدا ہے وقت کا فرمان ہے
ملک کی اس میں ترقی ہے اسے اپنایئے
بیس نکتوں کو بہر صورت عمل میں لایئے
اب قدم راہ صداقت سے نہ ہٹنا چاہیے
ایکتا کی راہ پر مل جل کے چلنا چاہیے

شفیق احمد صدیقی

طلاق

(افسانہ)

" ہیلو سریتا! "

" ہیلو مسز گپتا...... آؤ آؤ...... آج دفتر بند ہے کیا؟ "

" نہیں آج کچھ موڈ نہیں تھا دفتر جانے کا۔ سوچا تم ہی سے مل آؤں...... کیا بات ہے آج کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟ "

" ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے۔ دراصل آج پھر ان سے جھڑپ ہو گئی۔ "

" اُف! سریتا میں کہتی ہوں روز روز کی اس کشیدگی سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے قانونی علیحدگی اختیار کر لو۔ "

" مسز گپتا۔ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ "

" تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ صاف صاف سنیل سے کہہ دو کہ میں تمھارے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہیں کر سکتی۔ سچ پوچھو سریتا اب دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ اب وہ دن گئے جب عورت گھر کی چہار دیواری کی زینت بن کر مطمئن رہتی تھی۔ میں حیران ہوں کہ تم ایک تعلیم یافتہ عورت ہو کر ہر وقت چولہے چکی کے علاوہ کچھ سوچتی ہی نہیں ہو۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اگر تمھارا جرنلسٹ ہزبینڈ تمھیں اچھے کپڑے اور اچھا کھانا نہیں دے سکتا تو تم سروس کیوں نہیں کر لیتیں۔ اس بددماغ کے ساتھ کب تک زندگی گذارو گی؟ "

" بددماغ! واقعی مسز گپتا سنیل بددماغ ہے ــــ بہت بددماغ! "

" خیر تمھیں احساس تو ہوا کہ وہ بددماغ ہے۔ "

" بددماغ نہیں تو اور کیا؟ میں کیا بننا چاہتی تھی لیکن اس کی بددماغی نے مجھے کچھ بھی تو نہ بننے دیا۔ "

" کیا بننا چاہتی تھیں تم؟ "

" کالج کے ڈراموں میں ہمیشہ اوّل آتی تھی۔ میری سہیلیاں تو یہاں تک کہتی تھیں کہ اگر میں فلمی دنیا میں چلی جاؤں تو ٹاپ کی فلم اسٹار بن سکتی ہوں۔ فلمی دنیا میں ہوتی تو خوب گلیمر کے ساتھ رہتی۔ کشمیر اور دارجلنگ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کی سیر کرتی۔ لیکن سنیل کی بددماغی نے میرے ارمانوں کو کچل کر رکھ دیا۔ "

" سریتا میری بات کا برا نہ مانو تو کہہ دوں کہ تمھارا ہزبینڈ احساس برتری میں مبتلا ہے۔ وہ انگریزی اخبار کا جرنلسٹ کیا بن گیا کہ اپنے آپ کو جارج ہرتارڈ شاہ ہی سمجھنے لگا ہے۔ "

" واقعی آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتا ہے۔ "

" آج کل کے مردوں میں بس یہی تو ایک کمی ہے کہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ عورت کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ عورت بھی برابر کے حقوق رکھتی ہے۔ آج عورت گورنر بن سکتی ہے۔ امبیسڈر بن سکتی ہے۔ آئی پی ایس اور آئی۔ اے۔ ایس کے مقابلے میں شریک ہو کر اعلیٰ عہدے پر پہنچ سکتی ہے۔

...... لیکن سریتا یہ تو بتاؤ کہ آج ہوا کیا تھا؟

" یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ فلم اسٹار بننا چاہتی تھی لیکن سنیل نے مجھے فلمی دنیا میں نہ جانے دیا۔ خیر میں فلم اسٹار تو نہ بن سکی لیکن مجھے فلموں اور فلم اسٹاروں سے تو اب بھی دلچسپی ہے

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ پچھلے ہفتے سے دھرمیندر، ہیما مالنی اور دوسرے کئی اسٹارس کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں دہلی آئے ہوئے ہیں کل پرانے جمنا برج پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ مسز عباس مسز اگروال اور مسز ڈیسوزہ بھی اپنے اپنے ہز بینڈز کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے جا رہی تھیں۔ میں نے سنیل سے کہا کہ وہ مجھے شوٹنگ دکھلانے کے لیے لے چلے تو کہنے لگا کہ مسئلہ خوراک پر اشوکا ہوٹل کے کنونشن ہال میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی خبریں لینے کے لیے جانا ہے۔ جب میں نے کہا کہ کیا میں مسز کپاڈیا کے ساتھ چلی جاؤں تو کہنے لگا نہیں۔"

"کیوں مسز کپاڈیا کے ساتھ بھیجنے میں کیا قباحت تھی اس کو؟"

"کہنے لگا آج تیسرے پہر میرے کچھ انگریز جرنلسٹ دوست گھر پر آئیں گے ان کے لیے چائے اور کافی کا انتظام رکھنا۔"

"جبھی تو میں کہتی ہوں سریتا کہ مرد لوگ اپنی وائف کو بلکہ میڈ سرونٹ سمجھتے ہیں۔ کیا انگریز جرنلسٹ دوستوں کے لیے کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں چائے اور کافی کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا جو اس نے تمھاری فلم کی شوٹنگ دیکھنے کی خواہش کا گلا گھونٹ ڈالا۔"

"ایسا ایک بار نہیں مسز گپتا سیکڑوں بار ہوا ہے۔ میرے ارمانوں کا خون کر کے انھیں بڑا مزہ آتا ہے۔"

"خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا تمھارا۔ یہ تمھاری خوش قسمتی ہی ہے کہ تم دو بچوں کی ستائیس سالہ ماں ہونے کے باوجود بھی میک اپ کے سہارے بن سنور کر انیس سال کی کنواری لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ اگر باہر نکل کر تم اپنے پرستاروں کو ڈھونڈنے نکلو تو ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں رئیس زادے نوجوان عاشق تمھاری راہوں میں آنکھیں بچھائے تیار ملیں گے۔ ان ہی میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام لینا ورنہ اس گھر میں پنجرے کے پنچھی کی طرح کب تک زندگی گزارو گی۔ رہا بچوں کا سوال سنیل جتنا روپیہ تم پر خرچ کرتا اتنے روپیوں میں بچوں کے لیے ایک گورنیس رکھ لے گا۔"

"لیکن اگر اس نے مجھے طلاق دینے سے انکار کر دیا تو؟"

"اس کے لیے تمھیں ذرا ہمت سے کام کرنا ہوگا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"مطلب یہ کہ تم سنیل سے مسٹر کپور کی ایکسپورٹ امپورٹ کی فرم میں نوکری کرنے کی خواہش ظاہر کرنا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بات سن کر وہ چڑ جائے گا۔ تم اس کی پروا کیے بغیر ہی مسٹر کپور کی فرم میں نوکری کر لینا۔ میرے سفارشی خط سے وہ تمھیں کوئی جگہ خالی نہ ہونے پر بھی رکھ لے گا۔ مسٹر کپور آج کل لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ دیکھتی نہیں چانکیہ پوری میں کیا شاندار بنگلہ بنوایا ہے اس نے۔ ابھی امپورٹیڈ امپالہ خریدی ہے۔ جب سے اس نے اپنی جاہل بیوی کو طلاق دی ہے وہ ایک اچھی خوب صورت اور تعلیم یافتہ بیوی کی تلاش میں ہے۔ میں کہتی ہوں ایسا گولڈن چانس پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ زندگی بھر عیش کروگی عیش۔"

"ہیلو سریتا!"

"ہیلو سنیل!"

"کیا بچے ابھی تک اسکول سے نہیں آئے؟"

"بس آتے ہی ہوں گے۔"

"کیا بات ہے کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟"

"پریشان نہ ہوں تو پھر اور کیا ہوں؟ تم ڈیوٹی پر چلے جاتے ہو۔ بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ اس گھر کی چہار دیواری میں بور ہونے کے لیے صرف میں ہی رہ جاتی ہوں۔ مسز خان، مسز عباس، مسز اگروال اور مسز ڈیسوزہ اپنے ہز بینڈز کی غیر موجودگی میں اپنا من بہلانے کے لیے کلب، پکچر، یا پکنک کو بھی چلی جاتی ہیں۔ بازار سے اپنی مرضی کے مطابق شاپنگ کر کے بھی آ جاتی ہیں۔ ایک تم ہو کہ اپنی بیوی کو کہیں جانے نہیں دیتے۔ پہلے تو بچے چھوٹے تھے گھر میں رہتے تو ان کے ساتھ کھیل کود کر دل بہلا رہتا تھا۔ جب سے تم نے پریوار نیوجن کے طریقوں کو اپنایا ہے بچے پیدا ہونے ہی بند ہو گئے۔ گھر میں اگر چھوٹا بچہ ہوتا تو کم از کم اس کے سہارے من تو بہلا رہتا۔"

"دیکھو سریتا اچھی بیوی وہ ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے خیالات و نظریات میں اپنے آپ کو ڈھال لے۔ تم ان لوگوں کے طور و طریقے اپنانا

چاہتی ہو جن کی مالی حیثیت ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے معیارِ زندگی کو دیکھ کر تم دل ہی دل میں کڑھتی ہو اور میرے خلاف الزام تراشی کرتی رہتی ہو۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تم فرصت کے لمحات میں ادبی رسالوں کا مطالعہ کیا کرو۔ اس سے تمھاری قابلیت میں اضافہ بھی ہوگا اور تم خالی وقت میں مصروف بھی رہا کرو گی۔ رہا بچوں کا سوال یہ تم جانتی ہو کہ میں زیادہ بچے نہیں چاہتا۔ بھگوان نے دو دیے ہیں بس یہی کافی ہیں۔"

"لیکن میں بچے چاہتی ہوں۔ تمھارے پریوار نیوجن کے طریقوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ تم اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے میرے جذبات کا گلا گھونٹنے پر تلے ہوئے ہو۔"

"میں جو کچھ سوچتا ہوں، کرتا ہوں یا تم سے کرواتا ہوں اسی میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔"

"بھلا تمھارے پریوار نیوجن سے کیا فائدہ؟"

"یہی کہ ہمارا کنبہ اور نہ بڑھ سکے گا۔ میری تنخواہ زیادہ تو نہیں لیکن اتنی تو ضرور ہے کہ ہمارے گھر کے موجودہ اخراجات آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں۔ کنبہ بڑھے گا تو ہماری اقتصادی حالت خراب ہو جائے گی۔ بچوں کو ٹھیک طرح کھانا پینا اور پہننا بھی میسر نہ ہوگا ایسی صورت میں بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔"

"اسی لیے تو کل میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے مسٹر کپور کی فرم میں ٹیلیفون ریسپشنسٹ کی نوکری کرنے دو۔ آمدنی بڑھنے پر ہم اپنا کنبہ بھی بڑھا سکتے ہیں۔ دو آمدنیوں کے سہارے ہم خوب عیش و آرام کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لیکن تم کب میری سنتے ہو۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہو۔"

دیکھو سریتا۔ تم مجھے آٹھ سال میں بھی نہ سمجھ سکیں جب کہ میں تمھیں آٹھ گھنٹے ہی میں سمجھ گیا تھا۔ تمھیں میری ہر بات الٹی لگتی ہے تمھیں مجھ پر ناحق ہی غصہ آتا ہے۔ اگر تمھاری کسی الٹی بات پر مجھے غصہ بھی آتا ہے تو تمھاری جاذبِ نظر بھولی صورت میرے غصے کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ شاید یہی میری کمزوری رہی ہے جس کی وجہ سے تم روز بہ روز سر پر چڑھتی جا رہی ہو۔ روز میرے سامنے نئے نئے پروپوزل رکھتی ہو۔

"میں پوچھتی ہوں کہ مسٹر کپور کی فرم میں ٹیلیفون ریسپشنسٹ کی نوکری کر لینے میں تمھارا کیا نقصان ہے؟"

"میرے خودکفیل نہ ہونے پر اگر تم نوکری کی بات سوچتیں تو شاید میں اس کی اجازت دے دیتا۔ میں اپنے آپ کو خودکفیل سمجھتا ہوں۔ تمھارے جائز خرچے خوشی سے برداشت کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم جھوٹی شان و شوکت کے لیے ٹیلیفون ریسپشنسٹ کی نوکری کر کے میرے جذبات اور احساسات کو ٹھیس پہنچاؤ۔"

"جب تمھیں ہی میرے جذبات اور احساسات کی پروا نہیں تو میں پھر تمھارے جذبات اور احساسات کی پروا کیوں کروں؟"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جھوٹی شان و شوکت تمھیں اپنے شوہر سے زیادہ عزیز ہے۔"

"جسے تم جھوٹی شان و شوکت کہتے ہو وہ گلیمر ہے اور گلیمر ہی زندگی ہے۔"

"میں تمھاری یہ گلیمر لائف بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو میں بھی تمھاری زیادتیاں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"جنھیں تم زیادتیاں کہتی ہو وہ زیادتیاں نہیں بلکہ اصولِ زندگی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے تمھارا اصولِ زندگی۔"

"دیکھو سریتا تم حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہو۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تم تیز مزاج ہو لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی بددماغ بھی ہو۔"

"بددماغ میں ہوں یا تم؟"

"تم"

"میں نہیں تم —— جب تم میرے پورے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے زندگی کی خوشیاں نہیں دے سکتے تو پھر...."

"ہاں ہاں کہو رک کیوں گئیں؟"

"...... تو پھر مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔"

"........"

"تمھاری فلاسفیکل زندگی سے چھٹکارہ پا کر میں خودمختار بن کر اپنی

زندگی بسر کروں گی۔ نوکری کروں گی پکچر، پکنک، کلب جایا کروں گی۔ عمدہ کپڑے پہنا کروں گی۔ عیش سے زندگی گزار کر خوش رہا کروں گی"

"سریتا! میں نے تمھیں اپنی جان سے زیادہ پیار کیا ہے۔ دنیا کی سب نعمتوں سے بڑھ کر تمھیں چاہا ہے۔ میں تمھیں کسی بھی حالت میں اداس اور پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ اگر واقعی مجھ سے طلاق لے کر تم خوش رہ سکتی ہو تو میں تمھیں طلاق دینے کے لیے تیار ہوں"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ دے دیجیے طلاق ..... آج ..... اسی وقت۔"

"جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے سریتا"

"تو پھر کب"؟

"بیس دن بعد"

"وہ کیوں"؟

امریکی فوجوں نے کمبوڈیا اور جنوبی ویت نام میں وہاں کے بے گناہ عوام کے ساتھ جو خون کی ہولی کھیلی ہے ظلم اور تشدد کی انگنت وارداتیں کی ہیں۔ تباہی اور بربادی کے جو پچھلے سب ریکارڈ توڑے ہیں ان سب باتوں کا جائزہ لینے کے لیے ہندستانی جرنلسٹوں کا جو وفد اگلے ہفتہ کمبوڈیا اور جنوبی ویت نام جا رہا ہے اس میں مجھے بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ ان دونوں ملکوں کے دورے سے واپس آنے پر میں بچوں کے لیے ایک گورنس کا انتظام کروں گا اور پھر تمھیں طلاق دے دوں گا۔

"ہیلو سریتا دیوی"

"ہیلو سر!"

"یہ سر ور کچھ نہیں چلے گا۔ مجھے صرف کپور کہو"

"لیکن آپ میرے باس ہیں سر"

"پھر وہی سر"

"او کے سر"

"اُف!"

"اچھا مسٹر کپور"

"ہاں یہ بات ہوئی نہ"

"کہیے آپ نے مجھے ڈیوٹی کے بعد کیوں رک جانے کے لیے کہا تھا؟"

"دراصل آج آفس میں بہت ضروری کام ہے۔ میں دیر تک یہاں رہوں گا اور ڈنر بھی یہیں کروں گا۔ اکیلے ڈنر کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سوچا آج تمھارے ساتھ ہی ڈنر کروں اور کچھ باتیں بھی"

"..... اور کچھ باتیں بھی ----- کیا مطلب؟"

"باتیں دل کی باتیں!"

"تو پھر کیجیے باتیں ----- اپنے دل کی باتیں"

"سریتا دیوی آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں لیکن مجھے پسند نہیں۔ آپ کی صراحی دار گردن دوسروں کو بہت اچھی لگتی ہے لیکن مجھے نہیں"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"اگر کسی خوب صورت چیز کو صحیح طرح مینٹین نہ کیا جائے تو وہ کم خوب صورت لگتی ہے لیکن بہت خوب صورت نہیں"

"میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"دراصل آپ کے خوب صورت گورے گورے ہاتھوں کی ملائم ملائم انگلیوں میں ایک بھی انگوٹھی نہ ہونے سے یہ انگلیاں خوب صورت تو لگ رہی ہیں لیکن بہت خوب صورت نہیں۔ آپ کی صراحی دار گردن میں قیمتی ہار نہ ہونے پر یہ اچھی ضرور لگ رہی ہے لیکن بہت اچھی نہیں"

"تو پھر .....؟"

"سریتا دیوی میں حسن کا قدر دان ہوں حسن کی بے قدری مجھ سے بالکل نہیں دیکھی جاتی۔ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر یہ انگوٹھی اس انگلی میں اور یہ ہار اپنے گلے میں پہن لیجیے"

"اتنی قیمتی انگوٹھی اور ہار مجھے دے کر آپ کتنے روپیہ ماہانہ میری تنخواہ میں سے کاٹا کریں گے؟"

"میں نے ابھی کہا نہ کہ یہ قیمتی انگوٹھی اور ہار میں آپ کو تحفہ کے طور پر دے رہا ہوں"

"تھینک یو مسٹر کپور تھینک یو ویری مچ! سچ مچ یہ انگوٹھی اور یہ ہار مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں"

" سریتا دیوی میں سوچ رہا تھا ..... "

" ہاں ہاں کہیے رک کیوں گئے؟ "

" سریتا دیوی جب غیر ملکی سفر سے واپس آکر آپ کے ہزبینڈ آپ کے پاس یہ انگوٹھی اور یہ ہار دیکھیں گے تو آپ کیا کہیں گی؟"

" کہہ دوں گی کہ مسٹر کپور نے تحفہ کے طور پر دیے ہیں۔"

" کیا وہ اعتراض نہ کریں گے؟"

" کرنے دو۔ یہ تو کل میں نے آپ کو بتا ہی دیا تھا کہ ہم جلد از جلد علیحدہ ہونے والے ہیں۔ قانونی علیحدگی کے بعد میں بالکل آزاد ہوں گی۔"

" لیکن آپ نے ابھی تک یہ تو بتایا نہیں کہ سنیل کو چھوڑ کر آپ کس سے شادی کریں گی؟"

" ابھی میں شادی کے بارے میں نہیں سنیل سے طلاق کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

" سریتا دیوی آپ کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ دو بچوں کی ماں ہو سکتی ہیں۔ میک اپ سے سنورے ہوئے آپ کے دلکش اور حسین چہرے کو دیکھ کر آپ پر کنوارے پن کا گمان ہوتا ہے۔"

" سچ مسٹر کپور!"

" ہاں بالکل سچ سریتا دیوی۔"

" مسٹر کپور آپ نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق کیوں دی تھی؟"

" وہ ایک جاہل عورت تھی جس سے میری ماں نے کم عمر ہی میں میری شادی کر دی تھی۔ میں اسے فلم دکھانے کے لیے کہتا تو کہتی کہ مجھے رامائن پڑھنی ہے۔ میں اسے کسی دعوت میں لے جانا چاہتا تو کہتی کہ آج میرا برت ہے۔ میں اسے کلب میں لے جانے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ مندر میں کیرتن سننے کی خواہش ظاہر کرتی۔ اب تم ہی بتاؤ اعلا سوسائٹی کے آداب سے ناواقف عورت کے ساتھ میں کیسے زندگی گزار سکتا تھا؟"

" اب آپ نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

" سوچا تو بہت ہے اگر آپ اجازت دیں تو ......؟"

" ہاں ہاں کہیے رک کیوں گئے؟"

" اگر طلاق کے بعد آپ شادی کے بارے میں سوچیں تو آپ مجھے اپنا پہلا امیدوار سمجھئے گا۔ میں بہت ہی پیار اور محبت کرنے والا خاوند ہوں۔ جن خوبیوں والی خاتون کی مجھے ضرورت ہے وہ سب خوبیاں آپ میں موجود ہیں ـــــ مہذب، خلیق اور خوب صورت ـــــ گویا ہر اعتبار سے بھگوان نے آپ کو مکمل لیڈی بنایا ہے۔ آپ کے اندر وقار ہے۔ آپ کے حسین اور دلکش چہرے اور سڈول جسم میں بلا کی کشش ہے۔ آپ کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا، بات کرنا، غرض کہ سب کچھ ایک خاص تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ آپ جیسی لائق، سمجھ دار اور صاحب ذوق خاتون کے ہاتھ اپنی زندگی کو سونپ کر کوئی بھی شخص اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسٹر سنیل آپ جیسی باصلاحیت خاتون کی عزت و قدر نہ کر سکے۔"

" .... "

" کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

" .... جی .... کچھ نہیں .... "

" تو پھر وعدہ کیجیے کہ اگر آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تو آپ مجھے اپنا پہلا امیدوار سمجھیں گی۔"

" ہاں ..... اگر میں نے دوسری شادی کا ارادہ کیا تو ....."

" کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ .... "

" ایسے ناوقت دفتر میں کون آ سکتا ہے۔ تم یہیں بیٹھو میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔"

" کیا مسٹر کپور دفتر میں ہیں؟"

" لیکن اس وقت دفتر بند ہو چکا ہے۔ آپ صبح تشریف لائیے۔"

" اگر آپ ہی مسٹر کپور ہیں تو ہمیں آپ ہی سے کام ہے۔"

" آئیے تشریف لائیے۔ کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ـــ؟"

" میرا نام ایس۔ پی۔ اگروال ہے۔ میں اس علاقے میں نیا سپرنٹنڈنٹ آف پولس تعینات ہوا ہوں۔"

" اور یہ چار آدمی؟"

" یہ میرے ماتحت ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی دفتر کی تلاشی

کا وارنٹ ہے؟"

"وارنٹ! ...... لیکن کس سلسلے میں؟"

"کنٹرا بینڈ چیزوں کی اسمگلنگ کے بارے میں؟"

"لیکن اس وقت تو دفتر میں کوئی نہیں ہے؟"

"اسی لیے تو ہم اس وقت یہاں آئے ہیں۔ ہمیں اسٹاف کی نہیں مالک کی ضرورت ہے...... اور آپ کی تعریف؟"

"میں سریتا ہوں ـــــ مسز سُنیل۔"

"کیا آپ اسی فرم میں کام کرتی ہیں؟"

"جی ہاں ـــــ کل ہی میرا اپوائنٹمنٹ ہوا ہے۔"

"او ـــــ مسٹر کپور تو کہہ رہے تھے کہ اسٹاف کا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"اچھا مسٹر کپور۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"جی نہیں آپ یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ جب تک ہم دفتر کی تلاشی لیں۔ آپ یہیں رہیں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں نے خفیہ تحقیقات کرکے یہاں چھاپا مارا ہے۔ جب تک چھاپا ختم نہیں ہو جاتا آپ یہاں سے نہیں جا سکتیں۔"

"انسپکٹر صاحب آپ اِن کو تو جانے ہی دیجیے۔"

"آپ خاموش رہیے اور اپنی سب الماریوں کی چابیاں عنایت فرمائیے۔"

"وہ میرے پاس نہیں میرے اکاؤنٹنٹ کے پاس ہیں۔"

"مسٹر دلجیت۔ باہر سے تالے توڑ کر سب الماریوں کے سامان کا جائزہ لو۔"

"اوکے سر...."

"........"

"سر! اس الماری میں سے سونے کی یہ اینٹیں برآمد ہوئی ہیں۔"

"سر! دوسری الماری میں سے یہ حشیش اور گانجہ ملا ہے۔"

"سر! تیسری الماری میں سے دیسی شراب ولایتی بوتلوں میں ہے ـــــ"

"تو مسٹر کپور، یہ ہے آپ کا دھندا ـــــ ایکسپورٹ امپورٹ کے بہانے کنٹرا بینڈ چیزوں کی اسمگلنگ ـــــ چلیے میرے ساتھ پولس اسٹیشن۔"

"انسپکٹر صاحب مجھے جیل میں بند کرواکر آپ کو کیا ملے گا کچھ نہیں لیکن مجھے چھوڑ کر......"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ یہ سب سونے کی اینٹیں آپ رکھ لیجیے۔ ایک ایک سونے کی اینٹ ان پولس کانسٹبلوں کو دے کر کیس کو دبا دیجیے۔"

"خبردار اگر آگے کچھ کہا۔ تم مجھے رشوت دے کر خریدنا چاہتے ہو ـــــ مسٹر دلجیت مسٹر کپور کو ہتھکڑی پہنا کر پیدل پولس اسٹیشن لے چلو۔"

"اوکے سر!"

"ارے انسپکٹر صاحب ہتھکڑی پہنا کر پیدل پولس اسٹیشن لے جانے کی کیا ضرورت ہے میں خود ہی اپنی کار میں آپ کے ساتھ پولس اسٹیشن چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"جی نہیں آپ کو ہتھکڑی پہنا کر پولس اسٹیشن پیدل لے جایا جائے گا۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور عوام کو معلوم ہو کہ آپ جیسے "امیر اور شریف" آدمی ہی سماج کے دامن پر بدنما داغ ہیں ـــــ اور شریمتی جی آپ بھی پولس اسٹیشن چلیے۔"

"لیکن میرا قصور؟ ـــــ میں تو اس فرم میں صرف ٹیلیفون ریسپشنسٹ ہوں۔"

"تھانے میں آپ سے بہت سی معلومات کی جائیں گی۔ آپ کے تحریری بیان لیے جائیں گے کہ یہ کنٹرا بینڈ چیزیں ہمیں آپ کی موجودگی میں مسٹر کپور کے دفتر کی الماریوں میں سے برآمد ہوئی ہیں۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو آپ کو اندر بند کر دیا جائے گا اور ضروری نہ سمجھا گیا تو آپ کا تحریری بیان لے کر اور آپ کو پولس کا گواہ بنا کر چھوڑ دیا جائے گا۔"

"ہیلو مسٹر سنیل!"

"ہیلو ڈاکٹر! آئیے تشریف لائیے؟"

"کہیئے کیسی طبیعت ہے؟"

"طبیعت خراب ہے۔ جسم میں کچھ کمزوری بھی محسوس ہو رہی ہے۔ امریکی فوجوں کے کمبوڈیا اور جنوبی ویٹ نام کے بے گناہ عوام پر ظلم اور تشدد اور وہاں کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے جرنلسٹوں کے ایک وفد میں دو ہفتہ کے لیے کمبوڈیا اور جنوبی ویٹ نام گیا تھا۔ دن بھر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہاں ٹھیک طرح کھانا بھی میسر نہ ہو سکا۔ دو ہفتہ تک کچھ بھی آرام نہ مل سکا"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ــــــ لو یہ دوا پی لو۔ شام کو کمپاؤنڈر کے ہاتھ دوسری دوا بھیج دوں گا ــــ مسز سنیل آپ ان کے سر کو ہلکے ہلکے دباتی رہیئے۔ انھیں دواؤں سے زیادہ آپ کی پیار بھری خدمات کی زیادہ ضرورت ہے۔ اچھا مسٹر سنیل اب میں چلتا ہوں"

"اچھا ڈاکٹر...."

"لاؤ میں تمھارا سر دبا دوں۔؟"

"رہنے دو مجھے تمھاری خدمات کی ضرورت نہیں"

"وہ کیوں؟"

"کل تو میں تمھیں طلاق د۔ ہی دوں گا۔ بچے تو کچھ سکھ میں مجھے اکیلا ہی رہنا ہے۔"

"لیکن اگر میں طلاق نہ لوں تو؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا جب تم میرے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ پرلوار نیو جن کے طریقوں کو اپنا کر میرے جذبات کی تسکین نہیں کر سکتے۔ مجھے زندگی کی خوشیاں نہیں دے سکتے تو پھر طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟"

"نہیں سنیل بھگوان کے لیے طلاق کا لفظ اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ اب میرا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔ میں اپنے کیے پر بہت ہی شرمندہ ہوں۔ میرے ناتھ مجھ کو معاف کر دیجیئے"

لیکن میں نے وکیل سے طلاق کے کاغذات منگوا لیے ہیں کچہری میں جا کر بس ان پر تمھارے دستخط ہونے باقی ہیں"

"دیکھوں کہاں ہیں وہ کاغذات؟"

"میرے ہینڈ بیگ میں"

"........"

"ارے ارے...... یہ کیا کر رہی ہو۔ پہلے خود ہی طلاق کے لیے کہا اور اب خود ہی طلاق کے کاغذات پھاڑ رہی ہو"

★

اسعد بدایونی

عورت

کبھی یہ شعلۂ جوالہ ہے کبھی شبنم
نہ ہی پہ چاند کا پرتو ہے اس کا نقش قدم

کبھی ہے مریم و سیتا کبھی یہ دُرگا وتی
کبھی یہ جھانسی کی رانی اودھ کی شہزادی

یہ رُخ ہواؤں کا چاہے تو موڑ سکتی ہے
رہ وفا پہ نشان قدم ہیں ثبت اس کے

ہوائے تند کبھی اور کبھی نسیم سحر
اسی کی ذات سے سرسبز ہیں دلوں کے شجر

کسی مصور فطرت کا شاہکار ہے یہ
خزاں کا ذکر نہیں قصہ بہار ہے یہ

ظہیر الحق

مومن کا رنگ تغزّل

ایک نقاد کے لیے اس سے مشکل کام کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اُسے تنقید و تبصرہ کے لیے کسی ایسے شاعر کا دیوان دے دیا جائے جس کی شاعری کی سب سے اہم صفت دقّت پسندی ہو اور جس پر لکھنے کی بہت کم اصحاب نے جرأت کی ہو۔ مومن کا شمار بھی ایسے ہی چند شعراء میں ہوتا ہے۔ اس کا کلام (میری مراد یہاں صرف غزلوں سے ہے) شروع سے آخر تک نکتہ سنجیوں، معنی آفرینیوں اور ابہام و ایجاز سے بھرپور ہے۔ مومن ایک عام پسند شاعر نہیں ہے۔ مومن پر ہی کیا موقوف ہے ہر بڑا شاعر کبھی بھی عام پسند نہیں ہوتا۔ اس کو سمجھنے میں جس قدر دقّت ہوگی اسی قدر اس کی بڑائی میں اضافہ ہوگا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے لیکن اس کے مستثنیات بھی ہو سکتے ہیں۔

مومن خاں مومن حکیم تھے۔ حکمت کے علاوہ علم نجوم میں بھی انھوں نے زبردست مہارت حاصل کی تھی، ان کی تعلیم کچھ زیادہ نہ ہو سکی لیکن عربی و فارسی میں انھوں نے کافی عبور حاصل کیا۔ مومن فطرتاً شاعر تھے اور حسن پرور اور عشق جُو دل رکھتے تھے۔ مصنف "آب حیات" مومن کے رنگ و روپ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

"رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع۔ خوش لباس کشیدہ قامت۔ سبزہ رنگ۔ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھالے پائنچے۔ اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔"

اور یہی لالی اور یہ نرالی آن بان اُن کی طبیعت کے جمالیاتی ذوق کو ظاہر کرتی ہے جس کا اثر اُن کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مومن کی شاعری خالص عشقیہ شاعری ہے اور ان کی غزلیات میں رنگ تغزل دیگر ہم عصر شعراء کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

غزل جب صرف تغزّل کی حد تک محدود ہو جاتی ہے تو فنی لحاظ سے اس کا مرتبہ کافی بلند ہو جاتا ہے۔ داخلی عناصر کی قیمتی آویزش اس کے رنگ کو نکھارتی اور چمکاتی ہے۔ اسی لیے محمد حسین آزاد نے غزل کو ادبی میناکاری سے تشبیہہ دی ہے۔ اختر اورینوی کے الفاظ میں غزل مختصر تصویروں کا ایک خوبصورت نگارخانہ ہے اور کامیاب اور صحیح غزل گوئی نہایت ہی جمیل و لطیف صناعی سے کچھ کم نہیں اور یہی صناعی اپنی پوری آب و تاب لیے مومن کے ہر شعر میں نظر آتی ہے ـــــ زلف کی درازی جب گھٹا بن جاتی ہے۔ گالوں کی سرخی جب شفق کو جنم دیتی ہے اور لبوں کی نزاکت جب گلاب کی پنکھڑی کو شرماتی ہے تو اس وقت شاعر کے دل و دماغ میں کسی کا پیکر سیمیں اپنی بھرپور جوانی کے ساتھ انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے اور اس کی تمنائیں حریم دل کے گوشوں میں کانپتے ہوئے تاروں کی طرح جھلملاتی ہیں اور شاعر کا حساس دل جذبات کے بہتے ہوئے دھاروں کو الفاظ کی حدوں میں گھیر لیتا ہے۔ شاعری حقیقت میں جذبات دل کی صحیح عکاسی کا دوسرا نام ہے۔ مومن کے ہاں ایسے جذبات کی افراط ہے اس کی شاعری تجربوں کی صداقت سے مزین ہے اور یہ صداقت اشعار میں جان ڈال دیتی ہے۔

عشقیہ شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت دراصل ان احساسات و جذبات کو حاصل ہے جو معشوق کے حُسن کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں اور جو الفاظ کے سانچوں میں ڈھلنے کے بعد بجائے خود ایک حسین شے بن جاتے ہیں اور جن کو پڑھتے ہوئے ہر شخص کو اپنے قلب کے خاموش گوشے میں کسی کے نازک قدموں کی نازک چاپ سنائی دیتی ہے۔ مومن کا ایک شعر ہے ؎

زہر ٹپکے ہے نگاہ یار سے
موت سوجھی نرگس بیمار سے
قتل ہو کر ہم نہ بچے آزار سے
عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے

ان اشعار میں "نگاہ یار" کی زہر افشانی کو مومن نے ایک عجیب انداز سے امرت کی دھارا میں تبدیل کر لیا ہے اور ان کا یہی انداز ان کو دوسرے شعرا سے ممیز کرتا ہے۔ اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

اس شعر میں حُسن کی تعریف ہے۔ عشق کی وارفتگی ہے اور رقیب کا ذکر بھی ہے لیکن نگاہوں کا جادو کچھ اس انداز سے نمایاں ہے کہ ہر پڑھنے والا چشم مخمور کی سحر کاری کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

مومن کی شاعری میں تجربوں کی صداقت کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازی بھی ہے۔ اس کے ہاں احساس کی شدت بہت زیادہ ہے اسی لیے اس کا تخیل اکثر و بیشتر مبالغہ کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ مومن کا یہ شعر اس کی بڑی عمدہ مثال ہے ؎

دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا
اس بت پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

اس شعر میں وہ معشوق کے حُسن کی تعریف کرتے کرتے جذبات کے تیز رو دھاروں میں بہہ جاتے ہیں اور عقل و خرد کے دامن سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مومن کا خدا پر جو ایمان بالغیب ہے وہ اس وقت باقی نہ رہ سکے گا جب ان کا معشوق اپنے چہرے سے نقاب الٹ دے گا۔

مومن نے جہاں مشکل پسندی میں حسن پیدا کیا ہے وہیں انتہائی سادگی میں بھی وہ حُسنِ خیال اور حسین انداز کی تخلیق کرتے ہیں اور اس سادگی میں ڈوبا ہوا ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس شعر کے دوسرے مصرعہ نے شعر میں جان ڈال دی ہے طرز اظہار میں کتنی سادگی ہے۔ لیکن ساتھ ہی کتنی نزاکت و لطافت ہے۔ "ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا" کے مصرعہ سے جس قدر یاس و غم ٹپک رہا ہے اس کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔

مومن کے اشعار میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کا خاص عاشقانہ انداز ہے جو تقریباً ہر شعر میں جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں تصوّف جیسی کوئی چیز نہیں ہے جو عشق کے مرتبہ کو حقیقت و معرفت کی طرف لے جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری (مرحوم) تصوّف کو "غیر تغزلانہ" چیز سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزل سے علیحدہ ہوں کوئی محمودبات نہیں ہے۔ مومن کا ایک مشہور شعر ملاحظہ کیجئے جس میں تصوّف تو نہیں ہے لیکن تصوّر انتہائی عروج پر ہے اور بعض نقّادوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ صرف یہی ایک شعر مومن کی قسمت کے فیصلے کے لیے بالکل کافی تھا۔ وہ مشہور شعر یہ ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ وہی شعر ہے جسے سن کر غالب جیسا عظیم المرتبت شاعر اپنے سینہ پر ہاتھ رکھے رات بھر ٹہلتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ "اے کاش خاں صاحب! اپنا یہ شعر مجھے دے دیں اور مجھ سے میرا دیوان لے لیں۔" شاعر اس میں تصور کے اس بلند مقام پر ہے جہاں پہنچ کر طالب و مطلوب دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ "گویا" کے لفظ نے اس شعر کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

بہر حال مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس شاعر کو خود غالب نے پسند کیا ہو اس کی عظمت کو بھلا کون جھٹلا سکتا ہے بلکہ چند خاص خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب سے زیادہ قریب اگر کوئی شاعر آ سکتا ہے تو وہ مومن ہی ہے۔ مومن کی شاعری دل کی نازک دھڑکنوں کا حسین عکس ہے۔ اس کے تخیلات میں کسی مست شباب کے انداز خرام کی سی نزاکت ہے۔ اس کے انداز بیان میں رس بھرے ہونٹوں کا خاموش تبسم پنہاں ہے اس کی تشبیہوں میں نشیلی آنکھوں کا خمار کروٹیں لیتا ہے اور اس کی زبان میں نازک لبوں کی سی مٹھاس ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے مومن آسمان ادب پر ایک تابندہ ستارے کی طرح دمک رہا ہے۔

★

اتر پردیش شاہ راہِ ترقی پر

بچوں کی شخصیت کو پروان کے لیے بال بھون کا قیام ••• ملک کو سائنس دانوں، انجینیروں اور تکنیکی ماہروں کی ضرورت ••• بیس نکاتی پروگرام پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقی پراجکٹ ••• شہری زمین حد و ضابطہ بندی قانون ۱۹۷۶ء ••• اردو پڑھنے والے ۲۱۱ طالب علموں کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کے وظائف ••• ۱۹۷۵ء میں مطبوعہ اردو کتابوں اور ممتاز مصنفین کو ایک لاکھ روپے کے انعامات۔

گورنر ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی نے عوام سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ ریاست میں بچّوں کے لئے ترقیاتی سرگرمیوں کی توسیع میں بھرپور تعاون دیں۔ انھوں نے کہا کہ سماج کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ وہ بچّوں کی طبعی صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لیے مناسب ماحول پیدا کریں۔ تاکہ بچے آگے چل کر ذمہ دار شہری بن سکیں۔

ڈاکٹر ریڈی نے، جو ریاستی سی۔ ٹی خواتین تربیتی کالج کے قریب بال بھون کا افتتاح کر رہے تھے کہا کہ بچّوں کی شخصیت کی ہمہ گیر ترقی کے لیے صرف اسکول کی تعلیم کافی نہیں ہے اور ان کی ناکافی دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی نشو و نما میں کافی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات انھیں مجرم تک بنا دیتی ہے۔ اس کے برخلاف مناسب ماحول میں بچوں کو اپنی طبعی ذہانت کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔

ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ بچوں کے طبعی رجحانات کی جانچ اور انھیں ان کی پسندیدہ سرگرمیوں سے وابستہ کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو فروغ دے سکیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ بال بھون قسم کے ادارے دور افتادہ مواضعات میں بھی قائم کیے جائیں تاکہ ریاست کے سبھی بچے ان سے مستفید ہو سکیں۔

وزیر تعلیم شری عمار رضوی نے گورنر کا استقبال کرتے ہوئے بتایا کہ تعلیم کے میدان میں بال بھون کا قیام ایک نیا اور انقلابی قدم ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس ادارے کا قیام ایک اچھی شروعات ہے اور مستقبل قریب میں ایسے اداروں کی ترقی کے لیے مزید توجہ دی جائے گی۔ انھوں نے عوام کو یقین دلایا کہ حکومت بچوں کی شخصیت کو پروان چڑھانے سے متعلق سرگرمیوں میں ہر ممکن مدد کرے گی۔

اس بال بھون کا قیام کا مقصد ۵ سے ۱۵ سال تک کی عمر کے بچوں کی نشو و نما کی غرض سے انھیں مختلف سہولتیں مہیا کرنا ہے۔

• وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے کہا کہ مختلف ترقیاتی پروگراموں پر تیز رفتار عملدرآمد کے لیے ملک کو آج سائنس دانوں انجینیروں اور تکنیکی ماہروں کی ضرورت ہے۔

انھوں نے طلبا اور نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سائنسی، انجینیرنگ اور تکنیکی نصاب لیں تاکہ وہ قومی نو تعمیر کے عظیم کام میں ایک اہم رول ادا کر سکیں۔

شری تیواری نے جو سلطان پور سے ۳۳ کیلومیٹر دور امیٹھی میں ایک تعلیمی کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے کہا کہ ایسا تعلیمی نظام ہماری موجودہ ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں جو صرف بابوؤں کی فوج تیار کرے۔ چنانچہ ملک کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اس کانفرنس میں وزیر اعلا نے کہا کہ ہمارے زرعی اداروں اور کالجوں کو زراعت کی ترقی کے لیے اور زیادہ موثر اور سرگرم رول ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ اتر پردیش جدید زرعی طریقے اپنا کر

زراعت میں انقلاب لانا چاہتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ شاردا سہایک پروجکٹ اتر پردیش کا معاشی نقشہ بدل دے گا جیسا کہ بھاکرہ نے پنجاب اور ہریانہ کا نقشہ بدل دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس پروجکٹ کو مقررہ مدت سے دو سال قبل ہی مکمل کرنے کے لیے ۱۴۴ کروڑ روپیہ کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے تاکہ آبپاشی کے لیے کسانوں کے کھیتوں تک پانی بلا تاخیر پہونچ سکے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت ہر کسان کو مستحکم اور مضبوط امداد باہمی تحریک کے دائرۂ عمل میں لانے کا تہیہ کر چکی ہے۔

ریاستی ۲۰ نکاتی پروگرام سے متعلق عملدرآمد کمیٹی کے فیصلہ کے بموجب وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عملدرآمد کی رفتار ترقی اور اس سلسلہ میں درپیش دقتوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک تحقیقی پراجکٹ شروع کیا گیا ہے۔ اس جائزہ کا کام ایک ٹیم کے سپرد کیا گیا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر بی. ایل راوت ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی کے ماہر معاشیات اور ریاستی ۲۰ نکاتی پروگرام سے متعلق عملدرآمد کمیٹی کے ایک ممبر بھی ہیں۔ ٹیم کے دیگر ممبروں میں حکومت اتر پردیش کے مانیٹرنگ ڈویژن کے ڈائرکٹر مسٹر ایس. اے رضوی، محکمۂ مال کے ایک ڈپٹی سکریٹری، ۲۰ نکاتی پروگرام کی برانچ کے ایک انڈر سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری لیبر کمیشن یا متعلقہ منطقہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن شامل ہیں۔ اس پراجکٹ کے تحت موقع پر مطالعہ کے لیے آٹھ اضلاع یعنی ایٹہ، متھرا، میرٹھ، مظفر نگر، مرزاپور، وارانسی، الہ آباد اور کانپور کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان اضلاع میں سے ہر ضلع میں ایک گاؤں کا انتخاب بھرپور مطالعہ خاص طور پر یہ معلوم کرنے کے لیے کیا جائے گا کہ فاضل زمین اور مکانات کی تعمیر کے لیے زمین کی تقسیم کے معاملہ میں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی ہے۔ اور بے زمین ہریجنوں اور دیہی علاقوں کے غریب باشندوں کے دیگر مستحق زمروں کو واقعی قبضہ دے دیا گیا ہے یا نہیں۔

اس کے علاوہ یہ ٹیم منتخب اضلاع میں پابند مزدوری کے مسئلہ اور ڈگری کالجوں میں کتب بنیکوں کے قیام کے معاملہ پر بھی غور کرے گی۔

لوکل سلف، بجلی اور محنت کی وزیر ڈاکٹر شریمتی راجیندر کماری باجپئی نے ودھان سبھا میں اعلان کیا کہ حکومت اتر پردیش کو ریاست کے ۱۲ شہروں میں نافذ شہری زمین (حدود ضابطہ بندی) قانون، ۱۹۷۶ء کے تحت دستیاب کھلی ہوئی زمین کو مفاد عامہ میں خریدنے کے سلسلہ میں پہلی ترجیح حاصل ہوگی۔ اس معاملہ میں دیگر ایجنسیوں یعنی ہاؤسنگ بورڈ کی تعمیر مکانات سے متعلق امداد باہمی انجمنوں اور شہری ترقیاتی حکام کو بھی ترجیح دی جائے گی۔ یہ زمین خاص طور پر کم اور درمیانہ آمدنی والے طبقوں نیز سماج کے کمزور طبقوں کو رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کے سلسلہ منصوبہ بند طریقہ سے استعمال کی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے شہروں میں مجاز افسروں کی تقرری کی گئی ہے

ڈاکٹر باجپئی نے مزید بتایا کہ شہری زمین قانون کی روشنی میں عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں قواعد وضوابط اور ضمنی قوانین پر غور کرنے اور مناسب ترمیمات کا مشورہ دینے اور انھیں کارروائی کے لیے حکومت کو پیش کرنے کی غرض سے ریاستی سطح پر ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے پروفیسر آل احمد سرور اور جناب اختر انصاری کو پانچ پانچ ہزار روپے کے خصوصی انعامات اردو زبان کے لیے ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ تین ہزار، دو ہزار، ڈیڑھ ہزار، ایک ہزار اور پانچ سو روپیوں کے مختلف انعامات، جن کی مجموعی رقم چھیاسی ہزار پانچ سو روپیہ ہے، اٹھاسی اردو کتابوں پر جو ۱۹۷۵ء میں ملک کے ہر حصے میں طبع ہوئی ہیں۔ ان کے مصنفین کو دینا منظور کیا

گیا ہے۔ تین خصوصی انعامات یوپی کے ان تین پبلشروں کو دیئے جا رہے ہیں، جن کی ۱۹۶۵ء کی مطبوعات بہ لحاظ طباعت و دیدہ زیبی پر بہترین سمجھی گئی ہیں۔ اس طرح کل ملاکر ننانوے ہزار پانچ سو روپے (۹۹،۵۰۰) روپے ممتاز اردو مصنفین اور ان کی کتابوں پر انعام کے طور پر منظور کیے گئے ہیں۔

جن کتابوں کو انعام دینا منظور کیا گیا ہے وہ مختلف اصناف ادب مثلاً ادبی تنقید، شاعری، افسانوی ادب (مختصر افسانہ اور ناول) رپورتاژ، قومی یک جہتی، اردو صرف و نحو، بچوں کے ادب وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ دوسری زبانوں کے تراجم پر بھی انعام دیا گیا ہے۔

چھ کتابوں پر تین تین ہزار روپے، سات کتابوں پر دو دو ہزار روپے، تیرہ کتابوں پر ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے، اٹھارہ کتابوں پر ایک ایک ہزار روپے اور چونتیس کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات منظور کیے گئے ہیں۔

تین ہزار روپے کے انعامات پانے والی کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام درج ذیل ہیں:

نام کتاب	نام مصنف	
۱۔ انقلاب	جناب خواجہ احمد عباس	(بمبئی)
۲۔ شاخ نہال غم	ڈاکٹر خورشید الاسلام	(علی گڑھ)
۳۔ بدلتے رنگ	جناب منظور الامین	(لکھنؤ)
۴۔ آج کا پاکستان	جناب احمد سعید ملیح آبادی	(کلکتہ)
۵۔ فکر و ریاض	جناب علی جواد زیدی	(اعظم گڑھ)
۶۔ اقبال اور مغربی مفکرین	جناب جگن ناتھ آزاد	(سری نگر)
۷۔ پریم چند کی ناولوں میں نسوانی کردار	ڈاکٹر شمیم نکہت	(لکھنؤ/دہلی)
۸۔ یادوں کے سائے	محترمہ ممتاز مرزا	(دہلی)
۹۔ اردو شاعری میں سانٹ	جناب حنیف کیفی	(پرانی دہلی)
۱۰۔ لہروں کی آواز	جناب راج نرائن راز	(دہلی)
۱۱۔ مثنوی مولانائے روم	مولانا سجاد حسین	(دہلی)
۱۲۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	ڈاکٹر مجاور حسین	(الہ آباد)
۱۳۔ تنکے کا سہارا	محترمہ شکیلہ اختر	(پٹنہ)

٭ ٭

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ نے اتر پردیش کے مختلف شہروں کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے ۱۱۲ طلبہ و طالبات کو جو چھٹے درجے سے ایم۔ اے فائنل تک اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جن میں وہ ریسرچ اسکالر بھی شامل ہیں جو ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو میں تحقیقی کام کر رہے ہیں، تعلیمی سال (جولائی ۱۹۶۵ء سے جون ۱۹۶۶ء تک) کے لیے پچھتر ہزار روپے کی مجموعی رقم وظیفے کے طور پر دینا منظور کیا ہے۔ ان طلبہ میں وہ طالب علم بھی شامل ہیں جنھیں گزشتہ سال وظیفہ دیا گیا تھا اور اس سال اکاڈمی کے مقررہ قاعدے کے مطابق ان کے وظائف کی تجدید کی گئی ہے۔

اکاڈمی چھٹے اور ساتویں درجے میں دس روپے ماہانہ کا وظیفہ آٹھویں میں بارہ روپے ماہانہ، نویں اور دسویں میں پندرہ روپیہ ماہانہ، گیارہویں اور بارہویں میں بیس روپیہ ماہانہ، بی۔ اے میں تیس روپیہ، ماہانہ، ایم۔ اے میں پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ دیتی ہے اور ریسرچ اسکالر کو دو برس کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ۔

تعلیمی سال رواں میں ہر درجے میں جتنے طالب علموں کو وظائف دیئے گئے ہیں ان کی تعداد درج ذیل ہے۔

چھٹے درجے میں ۱۲ طالب علم، ساتویں درجے میں ۲۸ طالب علم، آٹھویں درجے میں ۲۷ طالب علم، نویں درجے میں ۱۷ طالب علم، دسویں درجے میں (تجدید) ۱۹ طالب علم، گیارہویں درجے میں ۲۴ طالب علم، بارہویں درجے میں (تجدید) ۱۲ طالب علم، بی۔ اے سال اول میں ۲۳ طالب علم، بی۔ اے سال دوم میں (تجدید) ۱۰ طالب علم، ایم۔ اے سال اول میں ۱۰ طالب علم، ایم۔ اے سال دوم میں (تجدید) ۹ طالب علم، ریسرچ اسکالر پہلا سال ۷ طالب علم، ریسرچ اسکالر دوسرا سال (تجدید) ۷ طالب علم۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

شہپر مجموعۂ کلام : سید حرمت الاکرام۔ ناشر پی کے پبلیکیشنز دریا گنج دہلی۔ اشاعت اگست ۱۹۷۲ء۔ قیمت ۸ روپیہ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔

شاعری احساسات اور جذبات کی اس آواز کا نام ہے جو فکر و فن کی ان سرحدوں تک لے جاتی ہے جسے فن کی بلند ترین منزل کہا جاتا ہے۔ شاعر نہ تو مورخ ہوتا ہے اور نہ جغرافیہ کا ماہر۔ وہ نہ سائنسداں ہوتا ہے اور نہ فریب خوردۂ سیاست۔ وہ اپنے نفس کی تیشہ زنی سے کوہکن بھی بنتا ہے اور قیس عامری بھی۔ اس کی جنبش قلم ہیرے کی ایک ایسی کنی ہوتی ہے جو افکار و تصورات کو تراش کر حیات کے صحیح ادراک و آگہی کی سمت موڑ دیتی ہے۔ جناب سید حرمت الاکرام ہمارے ایسے ہی فنکاروں میں ہیں جن کا فن بیک وقت درد کی آگ بھی ہے اور پیچ و خم کی راہ بھی۔ جہاں یادوں کی پرچھائیاں کسی انجان لمحے کا انتظار نہ کرتے ہوئے بھی کسی کڑی دھوپ کی منتظر رہا کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ فنکار کی "انا" ہی سخن شناسی کے اس وقت آڑے آتی ہے جب سوانحی خاکوں کی ترتیب ہمیں کسی نتیجے تک پہنچانے میں ناکام رہتی ہے۔ درحقیقت یہ انا خود شناسی ہوتی ہے خود نمائی نہیں۔ اور خود شناسی عیب نہیں ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ مانگے تانگے کے اجالوں سے اپنے فن کو پیش کرنے والے اسے خود نمائی پر محمول کیا کرتے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ کلام میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ کچھ نظمیں جدید شعری رجحانات کی حامل ہیں اور کچھ نظمیں ۱۸۶۲ء کے بعد پیدا ہونے والے تصورات کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ادوار کا تعین کسی الجھاوے میں نہ ڈال کر سمت و رفتار کی نئی منزلوں کی تفہیم میں مدد دیتا ہے جسے تقویم فن کہہ کر آسانی سے ان نظموں میں منزلوں کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نظموں میں جہاں عالمی ادب کی سطح پر اردو شاعری میں احساسات کی دنیا کو پیش کیا گیا ہے وہیں ارضیت کو بھی گلے لگایا گیا ہے۔ "بکری مرجا پور سنام" ایسی ہی ایک نظم ہے۔

غزلیات میں حرمت الاکرام صاحب نے اپنا ایک نیا رنگ و آہنگ قائم کیا ہے جو ان کی انفرادیت کا ترجمان ہے۔ حرمت الاکرام کی غزلیں عصری آگہی اور حسیت کا ایک ایسا نمونہ ہیں جس پر جدیدیت کی چھاپ نہ لگا کر بھی ہم جدید کہنے پر مجبور ہیں۔ اگر فنکار کسی "ازم" کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے تو اس کی نمود فن کا دائرہ بھی انتہائی محدود ہو جاتا ہے۔ فن ایک لامحدود ضمیر ہے۔ اسے کسی ازم کی میزان پر تولنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اب اس کی وسعتیں سمٹ آئی ہیں۔ اس مجموعۂ کلام کی غزلیں شعریت کی شدت کا وافر سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔

مجموعی طور پر اس مجموعۂ کلام کی نظمیں اور غزلیں بھی معیاری ہیں۔ پھر بھی غزل کی رفتار اور تاریخ کی روشنی میں ان غزلوں کو فن کے اس نگار خانہ میں نہیں رکھ سکتے جہاں آنچ نہ آ سکے۔ اس کے قبل بھی حرمت الاکرام کے متعدد مجموعۂ کلام چھوٹے بڑے قد کے شائع ہو چکے ہیں جن میں "اجالوں کے گیت"، "کلکتہ ایک رباب" "کھیل کھلونے" "ہمارے شاعر" وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ حرمت الاکرام انتہائی پرگو اور زود گو قسم کے شاعر ہیں۔ اگر وہ فکر کو انتخابی شعور عطا کر دیں تو ان کا شعری سرمایہ اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہوگا۔ بچوں کے ادب سے لے کر بڑوں کے ذوق تسکین تک ان کی تخلیقات پر چھوٹے بڑے رسائل میں بکھری ہوئی ہیں۔ جس سے ان کی مقبولیت ایک حقیقت بن چکی ہے۔

کتابت اور طباعت بہتر ہے۔ اردو اکیڈمی اتر پردیش کے ارباب حل و عقد قابل مبارکباد ہیں کہ اس مجموعۂ کلام کی بروقت اشاعت میں ان کے تعاون سے ایک اچھا مجموعۂ کلام منظر عام پر آگیا۔

ڈاکٹر فضل امام

پہچان کا درد مجموعۂ کلام : حمید الماس۔ ناشر شالیمار پبلیکیشنز حیدر آباد اشاعت اکتوبر ۱۹۷۴ء۔ قیمت ۱۲ روپیے ضخامت ۱۲۸ صفحات۔

فنون لطیفہ کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے بعد جب تقسیم کرنے والوں نے ادب کے حصے کو دیکھا ہوگا تو غالباً اس کی دلکشی کائنات دل پر حاوی ہو گئی ہوگی۔ دیگر فنون لطیفہ کی قدر و قیمت اس وجہ سے کم ہے کہ ان کی نمود مادیت کی مرہون منت ہے۔ لیکن ادب ایک ایسا فکری پیکر ہے جہاں فضاؤں کی پہنائیاں بھی ادھر ہو جاتی ہیں۔ ادب میں بھی شاعری کی قدر و قیمت اس نظریۂ حیات کا نام ہے جہاں نظر شدید جذبات کی تپتی ہوئی ریت میں امید کا ایک ہلکا سا تصور پیدا کر کے مردہ دلوں کو زندگی کے آثار عطا کر دیتی ہے۔ حیات و کائنات کی محدود اور لامحدود بحث میں پڑنے سے پہلے اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ شاعری کی حیات کائنات کی حیات سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ ادوار مٹتے ہیں اور بنتے ہیں۔ کائنات اجڑتی ہے اور بستی ہے لیکن دنیائے شاعری اس حیات ابدی کا نام ہے جو پیمانۂ عہد و سال سے نہیں ناپی جا سکتی۔ اس نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھنے کے بعد زیر تبصرہ مجموعۂ کلام پہچان کا درد ہمیں شاعری کی اس روح کے قریب لے جانے میں مدد کرتا ہے جہاں آواز کی لیک۔ لہجہ کی نرمی۔ صداؤں کی بازگشت ایک حسن اختصار میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ پہچان کا درد اردو شعر و ادب کا ایک تجرباتی مجموعۂ کلام ہے جو اردو شاعری کی زندگی کا ثبوت ہے۔ فنی اور ادبی تجربے لازمی بھی ہیں۔ جس ادب میں تجربات کی قوت نہیں وہ موت کے گھاٹ آسانی سے اتر جاتا ہے۔ جدید تجربے اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارے ذہنوں کے دریچے بند نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی فکر و نظر کے دروازوں کو کھولے رکھا ہے۔ لیکن خام تجربات کبھی بھی پختگی عطا نہیں کر سکتے۔ عام طور سے اردو شعر و ادب میں تقلیدی عناصر کی بہتات رہی ہے۔ مغرب سے اٹھنے والی تحریکیں ہندستان تک پہنچتے پہنچتے بہت سی تو باسی ہو جاتی ہیں اور بہت سی راستے میں دم توڑ دیتی ہیں اس لیے مغرب کے شعری اور ادبی تجربات کی رو میں نہ بہہ کر ہمیں خود اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات سے کام لینا ضروری ہے۔ خوشی ہے کہ حمید الماس نے

تو تحریک زدہ ہیں اور نہ تہذیب زدہ وہ فن زندگی کے قائل ضرور ہیں جس میں دلسوزی بھی ہے اور جگر کاوی بھی۔

انسانیت کا ترفع اردو شاعری کے مزاج میں رچا ہوا ہے جسے ہر عہد کے باشعور شعراء نے برتا ہے۔ لیکن حمید الماس شعور و فن میں جب وفور جذبات کو سمو دیتے ہیں تو وہ اس انداز سے کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

چہرے جو ماہتاب سے اترے تھے خواب میں
نکلی سحر تو ڈوب گئے چاندنی کی طرح
باقی رہے نہ دست تصرف میں کوئی شے
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ حصہ بھی چھین لے
یوں نہ محسوس ہو افلاک نشیں ہے کوئی
اس قدر دور سے آواز سنایا نہ کرو
ہم سے کبھی کبھی تو ملو آدمی کی طرح
رہتے ہو کیوں وطن میں کسی اجنبی کی طرح
نفس بادِ صبا ہاتھ نہ آئے گا کبھی
گل کی اڑتی ہوئی خوشبو کا احاطہ نہ کرو
اس دور کا نصیب ہے تنہائیوں کا کرب
ہر شخص اپنی اپنی جگہ ہے بندھا ہوا
بھول جاتا ہوں میں اپنی پہچان کو
دیکھ کر نت نئے روپ انسان کے
وہ ایک چہرہ جو کب سے مری نگاہ میں تھا
وہ آپ اپنی شکستوں کی بارگاہ میں تھا

حمید الماس نے نظموں میں بھی اپنی بلند آہنگی اور فکری سرمایہ سے کام لیا ہے جس میں نہ تو فلک شگاف نعرے ہیں اور نہ زبردستی کا پروپیگنڈہ۔ ہر نظم پر تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے نظموں کے مطالعہ کا جو مجموعی تاثر ہوتا ہے اسے یوں سمجھ لیجیے کہ ایک اچھے فن کار نے اسلوب اور انداز بیان کی دل کشی سے ایک ایسی فضا قائم کر دی ہے جس میں نقرئی قہقہے بھی ہیں اور دبی ہوئی چنگاریاں بھی۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے لیکن قیمت نسبتاً کچھ زیادہ ہے۔ قوی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

— ڈاکٹر فضل امام

مطالعۂ خطوطِ غالب عبدالقوی دسنوی۔ سن اشاعت فروری ۱۹۷۶ء۔ ضخامت [illegible] صفحات قیمت ۳ روپے۔
کتاب شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال نے شائع کی ہے اور وہیں سے طلب کی جا سکتی ہے۔

غالبیات کے میدان میں عبدالقوی دسنوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ غالب پر ان کی جو اہم کتابیں منظر عام پر آکر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں ان میں غالبیات نسخۂ بھوپال، نسخۂ بھوپال ثانی اور بھوپال اور غالب شامل ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں غالب کی اردو مکتوب نگاری کے بارے میں ایسا مواد موجود ہے جو اردو ادب کے پوسٹ گریجویٹ اور ڈگری درجات کے طلبہ کی نصابی ضروریات کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ کتاب میں جن موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے بعض قابل ذکر یہ ہیں: (۱) غالب کی اردو مکتوب نگاری کے آغاز و محرکات پر مفصل بحث (۲) غالب نے فارسی مکتوب نگاری کب تک جاری رکھی۔ (۳) مکاتیب سے غالب کی غیر معمولی دلچسپی (۴) خطوط غالب کی اشاعت کی اولین منزل۔ (۵) خطوط غالب کے وہ خصوصیات جن کے باعث ادب میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اس موضوع پر مثالوں کے ساتھ مفصل بحث کر کے خطوط غالب کا موضوعات و اسلوب دونوں ہی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ (۶) کتاب کے آخر میں (صفحات ۵۰ تا ۷۲) ان مضامین و کتب کی فہرست پیش کی گئی ہے جو خطوطِ غالب کے مطالعے میں مفید ہیں۔ اس فہرست میں اگرچہ ابھی ترمیم و اضافہ دونوں ہی کی گنجائش ہے لیکن اس کے باوجود یہ خطوط غالب پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ ملحوظ رہے کہ اسی قسم کی فہرستیں غالب سے متعلق اور بھی کئی کتابوں میں مل سکتی ہیں جن میں غالبیات از عبدالقوی دسنوی اور غالب ببلیوگرافی از محمد انصار اللہ نظر بھی شامل ہیں۔

بہرحال عبدالقوی دسنوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالب کی اردو مکتوب نگاری کے بارے میں اس مختصر سی کتاب میں ایسا مواد پیش کر دیا ہے جو نہ صرف طالب علموں بلکہ محققین اور عام قارئین کے لیے بھی مفید و دلچسپ ثابت ہوگا۔ کاغذ، طباعت، کتابت اور قیمت ہر اعتبار سے کتاب تسلی بخش ہے۔ امید ہے کہ ادبی اور تعلیمی حلقوں میں کتاب کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا جائے گا۔

★

مراسلہ:

مکرمی تسلیم!

لکھنؤ کے چند نامور شعراء (جلد اول) از ڈاکٹر سید سلیمان حسین پر نیا دور (اپریل ۷۶ء ۱۹ء ص ۴۰) میں شائع ہونے والے راقم الحروف کے تبصرے میں ایک مقام پر لفظ "مزہ" کو عربی لفظ قرار دیا گیا ہے جو سہو قلم ہے۔ "مزہ" در اصل فارسی لفظ ہے۔ براہ کرم یہ چند سطریں بطور وضاحت شائع فرما دیں۔ ممنون ہوں گا۔ زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

نیازمند: کاظم علی خاں

عنوانات

نیا دور

جلد ۳۲ نمبر ۳

۲۶ جون سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

سرورق: بلی آرٹس

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

۲۶ جون ۱۹۷۶ء کے اس شمارہ کو جولائی کا شمارہ تصور کیا جائے
اب اس کے بعد اگست کا شمارہ شائع ہوگا

اپنی بات

ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان کو ایک سال پورا ہو گیا۔ یہ دراصل ایمرجنسی کا نہیں بلکہ ملک کی ہمہ جہت ترقی اور ضبط و نظم کا ایک سال ہے جو پورا ہوا ہے۔ کچھ کوتاہ بین یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایمرجنسی زیادہ دنوں چلنے والی نہیں اور اگر اسے زیادہ دنوں نافذ رکھا گیا تو ملک میں ایک ایسا طوفان آئے گا جس میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا۔ یہ دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو سیاسیات میں کم سوجھ بوجھ اور معمولی درک رکھتے تھے۔ اپنی سیاسی بصیرت کی کمی اور ایمرجنسی سے ٹھیک پہلے کے زبردست مایوسی کے ماحول اور لاقانونیت کی فضا کے باعث یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ برسر اقتدار حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کا لاوا اندر ہی اندر سلگ رہا ہے اور کسی دن بھی آتش فشاں بن کر پھٹ سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مخالف جماعتیں خاموشی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتیں اور وہ اپنے اثرات اور حکمت عملی سے کام لے کر ایسے حالات پیدا کر دیں گی جن میں ایمرجنسی کو جلد ختم کر دینا ناگزیر ہو جائے گا۔ دوسرے تو بعض سیاسی تنظیمیں اور جماعتیں نیز فرقہ وارانہ طاقتیں اپنے سیاسی اغراض اور اپنے ارکان کے ذاتی مفاد کی خاطر ایمرجنسی کے جلد خاتمہ کے لیے کوشاں تھیں اور عوام کو یہ تاثر دے رہی تھیں کہ ان کی کوششوں سے ایمرجنسی کے جلد خاتمہ کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن جلد ہی لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ایمرجنسی زحمت نہیں بلکہ نعمت بن کر آئی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے فائدوں کا احساس اتنا بڑھا کہ مختلف حلقوں سے ایمرجنسی کو باقی رکھنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ان سطور میں ایمرجنسی سے قبل کے چند برسوں میں ملک میں جو صورت حال پیدا کر دی گئی تھی اور ہماری بنیادی پالیسیوں، ہمارے بنیادی طریقوں اور ہمارے بنیادی مقصدوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ البتہ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے پورے ملک نے جس طرح یک زبان ہو کر اس پروگرام کا خیر مقدم اور اس کی عمل آوری کا عزم کیا ہے وہ قابل ستائش اور لائق تحسین ہے۔ ایک سال کی مدت کوئی طویل مدت نہیں ہوتی لیکن اس قلیل مدت میں بھی ضبط و قانون، ڈسپلن، زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافے، فرائض کی انجام دہی کے احساس، تعلیمی اداروں میں تعلیم و تعلم، اشیا کی حصولیابی اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں جو سدھار اور قیمتوں میں جو کمی ہوئی ہے وہ اس ایمرجنسی اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کی دین ہے۔ ہماری ریاست اتر پردیش میں بھی ان کامیابیوں اور ان سہولتوں کی ٹھوس اور روشن مثالیں سامنے ہیں۔ ان عام سہولتوں کے علاوہ ہریجنوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کی راحت کے لیے خاص طور سے جو اقدامات کیے گئے ہیں ان کے نتیجے میں سماج کے اس پس ماندہ اور صدیوں سے استحصال کے شکار طبقے کو جو فائدے پہنچے ہیں ان کی فہرست طویل ہے لیکن دیہی عوام کو قرض سے نجات دلانے، پابند مزدوری کے رواج کے خاتمے، زرعی آراضیات کی حدبندی کر کے فاضل آراضی غریب بے زمینوں میں تقسیم کرنے، ہریجنوں اور بے زمین مزدوروں کو تعمیر مکان کے لیے زمین اور مالی امداد دینے، دیہی اور شہری آراضی کو سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، کھیت مزدوروں کی اجرت کی نئی شرحوں کا تعین اور آب پاشی، بجلی اور ہینڈلوم کی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات بھی قابل ذکر ہیں۔

ایمرجنسی کے ایک سال کے دوران جو کامیابیاں ہوئی ہیں، امن و امان نیز ڈسپلن کی جو فضا تیار ہوئی ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں کارکردگی جس طرح بڑھی ہے اسے منعکس کرنے کے لیے نیا دور کا زیر نظر شمارہ خصوصی شمارہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس شمارے سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح حصول آزادی کی تحریکوں میں، ملک پر بیرونی جارحیت کے موقعوں پر اور دیگر قومی مسائل سے نپٹنے کے سلسلے میں اردو کے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں نے جہاد بالسیف کیا اور قوم میں ایک نئی روح، ایک نئی بیداری اور ایک نیا عزم و ولولہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا، اسی طرح اس موقع پر بھی سماج دشمن عناصر اور فرقہ وارانہ طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا پول کھولنے، ایمرجنسی کی ضرورت و افادیت کو واضح کرنے اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو کامیاب بنانے میں عوام کو سرگرم تعاون دینے کے لیے آمادہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

● قارئین کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جون کے شمارے کے بعد زیر نظر خصوصی شمارہ معاشی ترقی کا ایک سال پورا ہونے کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خصوصی شمارے کو جولائی کا شمارہ تصور کیا جائے۔ اب اس کے بعد اگست کا شمارہ شائع ہوگا اس لیے قارئین اور خریدار حضرات جولائی کے شمارے کا انتظار نہ کریں۔

——— ایڈیٹر

۲۶ جون ۱۹۷۶ء

عشرت علی صدیقی

ایمرجنسی کا اعلان
اور
جمہوریت کا استحکام

جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم آزادی کی قومی تحریک کے تین بنیادی ستون تھے۔ اور انھی ستونوں کی وجہ سے اس تحریک نے عوام میں زبردست مقبولیت اور اتنی طاقت حاصل کر لی کہ عدم تشدد پر عقیدہ رکھنے والوں نے تشدد برتنے والی دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور سامراج کو شکست دے دی۔ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ معاشی جمہوریت کے بغیر سیاسی جمہوریت ادھوری رہ جاتی ہے اور معاشی جمہوریت ہی کا دوسرا نام سوشلزم ہے جس میں سماجی جمہوریت ایک بنیادی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سماجی جمہوریت کو سیکولرزم کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سیکولرزم ایک وسیع تر مفہوم بھی رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا اور سب مذہبوں کے ماننے والوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ جو لوگ معاشی مساوات کے خلاف ہیں وہ سیاسی مساوات کے بھی مخالف ہیں اور سماجی مساوات کے تصور سے گھبراتے ہیں گاندھی جی نے ان تینوں چیزوں کو قومی مزاج کا جز بنا دیا تھا اور جواہر لال جی نے تحریر، تقریر اور عمل کے ذریعے ان کو اتنی تقویت پہنچائی تھی کہ ان کے مخالفوں کو سامنے سے حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن وہ در پردہ کوششوں اور پس پردہ سازشوں میں مصروف تھے۔ ایمرجنسی کے اعلان کا اصل مقصد انھیں سازشوں کی کاٹ کرنا تھا۔

سازشیں

یہ اعلان ۲۶ جون سنہ ۷۵ء کو ہوا۔ لیکن درحقیقت ایمرجنسی کی کیفیت اس سے بہت پہلے پیدا ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں مسز اندرا گاندھی نے ان سازشوں کو بھانپ لیا تھا۔ انھیں قومی ضرورتوں کے علاوہ قومی مزاج کا بھی صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایک جرأت مندانہ اقدام کیا اور اس اقدام میں ان کی جماعت اور ان کے ملک کی زبردست اکثریت نے ان کا ساتھ دیا۔ اس اقدام میں گاندھی جی کی اصول پرستی جھلکتی تھی۔ گاندھی جی کی طرح اندرا جی بھی منزل بہ منزل آگے بڑھنا چاہتی تھیں اور ہر منزل میں عوام کو ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ اس حکمت عملی سے جمہوریت کی جڑیں مستحکم ہو رہی تھیں اور سنہ ۱۹۷۱ء کے الکشن کے نتائج نے ان جڑوں کی مضبوطی کے علاوہ عوام کی امنگوں کو بھی اجاگر کر دیا۔ قوم کے مفاد اور قوم کی مرضی کا تقاضا تھا کہ ترقی کی رفتار تیز تر کر دی جائے۔ دوسری طرف بعض افراد اور طبقوں کی کوشش تھی کہ ملک کو سوشلزم کی سمت آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ سوشلزم کے سب سے زیادہ مخالف وہی لوگ تھے جو سیکولرزم کے سب سے زیادہ مخالف تھے مخالفوں کے بعض گروہ آپس میں بھی اختلاف رکھتے تھے وہ عوام کے سامنے الگ الگ بھیس میں آتے تھے اور الگ الگ اصول پیش کرتے تھے لیکن سوشلزم سے یہ سب ڈرتے تھے۔ جمہوری ذرائع سے اس کی مخالفت میں وہ بار بار ناکام ہو چکے تھے اور اس لیے انھوں نے جمہوریت کے آداب، دستور و قانون کے احترام اور اپنے اصولوں سے وابستگی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایمرجنسی ایک نئی اور بھیانک شکل میں سامنے آ گئی۔

بہانے

خوب ڈھونڈ ڈھونڈ کے بہانے نکالے اور کئی بہانے گڑھ لیے۔ ایک انتخابی مقدمے میں ایک ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے ایک جز کی آڑ لے کر ہڑبونگ مچائی گئی مگر دوسرے جز کو نظر انداز اور سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ جمہوری طریقوں سے منتخب ہونے والی اسمبلیوں اور حکومتوں کو غیر جمہوری طریقوں سے توڑنے کی کوشش کی گئی، کسانوں سے کہا گیا کہ حکومت کے ہاتھ غلہ فروخت نہ کرو اور عوام سے کہا گیا کہ حکومت سے سستے داموں پر مزید غلہ طلب کرو۔ جب ملک کے بعض حصے قلت اور قحط سے دوچار تھے تو غذائی اجناس کی نقل و حمل میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ریلوے ملازمین کو ہڑتال پر اکسایا گیا۔ بعض اخباروں نے کردارکشی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دی گئی۔ طلبا کو پڑھائی چھوڑ دینے کی تلقین کی گئی اور فوج پولیس نیز دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین کو حکم عدولی اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ عدم تشدد کا دم بھرنے والے تشدد سے نہ صرف چشم پوشی کرنے لگے بلکہ اسے حق بجانب بھی بتانے لگے۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرست پروان چڑھتے رہے یہ بحران نہیں ہیجان تھا جس میں پورے ملک کو مبتلا کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ سمستی پور میں ریلوے وزیر کا قتل اور نئی دہلی میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی موٹر کو بم سے اڑا دینے کی کوشش اس سلسلے کی دو اور کڑیاں تھیں۔ ملک کو نراج کے دروازے پر پہنچا دیا گیا تھا۔

آپریشن

ایمرجنسی کے اعلان کی حیثیت ایمرجنسی آپریشن کی تھی۔ یہ آپریشن اچانک اور ایسے وقت ہوتا ہے جب مریض کی جان بچانے کی کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی اس میں جان چلی جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن وزیر اعظم نے یہ خطرہ بدرجۂ مجبوری اور جان بوجھ کر مگر سوچ سمجھ کر مول لیا۔ اس اقدام کے محرکات میں جرأت کے ساتھ فراست بھی شامل تھی۔ انکا اندازہ صحیح نکلا۔ تخریب پسندوں کے دعوے غلط ثابت ہو گئے۔ ہیجان پیدا کرنے والی باتوں ہنگامہ پرور نعروں اور بلڑبازی والی حرکتوں کا طلسم چشم زدن میں ٹوٹ گیا۔ عوام نے ایمرجنسی کے اعلان کا خیر مقدم کیا اور تخریب پسندوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بر وقت کارروائی نے فسطائیت کے حملے کا توڑ کر دیا اور جمہوریت کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ ایک ایسی سازش ناکام ہو گئی جس کی جڑیں ملک کے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان طاقتوں کے منصوبے خاک میں مل گئے جو اپنے کارندوں کے ذریعے دوسرے ملکوں میں حکومتوں کا تختہ الٹوانے کی کوشش کرتی اور بعض اوقات اس کوشش میں کامیاب بھی ہوتی رہی ہیں۔ جس طرح کھسیانی بلی کھمبا نوچنے لگتی ہے اس طرح بعض غیر ملکی مدیروں اور مبصروں نے ہندستان پر لعن طعن شروع کر دی۔ مگر ہندستانیوں نے اس کی پروا نہیں کی اور یہاں حالات کے سدھار نے باہر والے مخالفوں کا منھ بند کر دیا۔ بہتوں نے اپنی رائے بدل دی اور باقی کی عصبیت بے نقاب ہو گئی۔

۲۶ جون ۱۹۷۵ء کے بعد ہی سے قیمتیں جس طرح گرنے لگیں، ریلیں جس طرح وقت پر چلنے لگیں، سرکاری دفتروں کی حاضری اور کارکردگی میں جو چوکسی آ گئی، سڑکوں پر ہنگامہ آرائی جس طرح بند ہو گئی، اسکولوں اور کالجوں میں سنجیدگی کی جو فضا پیدا ہو گئی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ڈسپلن کی جو کیفیت دکھائی دینے لگی اس سے ثابت ہو گیا کہ ایمرجنسی کا اعلان ملک کو لاحق ہو جانے والے امراض کا تیر بہدف علاج تھا۔ آپریشن کامیاب رہا ناامیدی کی جگہ امید پیدا ہو گئی اور لوگ تخریب کے بجائے تعمیر کی فکر کرنے لگے۔ کامیابی کی ایک مثال یہ ہے کہ افراطِ زر کی کیفیت پر جس نے دنیا کے بہت بڑے حصے کو جس میں بڑی طاقتیں بھی شامل ہیں پریشان کر رکھا ہے، یہاں مکمل قابو پا لیا گیا ہے۔ یہ کامیابی ایمرجنسی کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کے ایک مثبت پہلو کی نشان دہی کرتی ہے۔ اور اگرچہ ایمرجنسی کا اعلان شروع میں محض ایک انسدادی یا انتظامی اقدام معلوم ہوتا تھا مگر یکم جولائی کو وزیر اعظم نے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان کر کے ایمرجنسی کے اثباتی پہلو کو اجاگر کر دیا۔

اثباتی اقدام

اگر ایمرجنسی کی حیثیت ایک آپریشن کی تھی جو فاسد مادے کو نکالنے کے لیے ضروری ہو گیا تھا تو ۲۰ نکاتی پروگرام کی حیثیت ان دواؤں کی تھی جو ایسے مادے کے دوبارہ پیدا ہونے کو روکنے اور زخم کے

جلد مندمل ہونے اور مریض کو چلنے پھرنے کے لائق بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں پہلے سے معلوم تھیں اور ان میں سے بیشتر استعمال بھی کی جا رہی تھیں۔ لیکن ایمرجنسی کے اعلان سے پہلے جو حالات ملک میں پیدا ہو گئے تھے اور جو بدنظمی ہنگامہ آرائی اور افراتفری بعض سماج دشمن عناصر پھیلا رہے تھے اس کی وجہ سے ان دواؤں کے استعمال میں رکاوٹ پڑ رہی تھی اور ان کا اثر پوری طرح سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ قیمتیں گرانے، کھیتوں، کارخانوں کی پیداوار بڑھانے، دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کو روکنے، کھیتیہر مزدوروں کو زمین دلانے، مزدوروں کو کارخانوں کے انتظام میں شریک کرنے، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے، اسمگلنگ اور ٹیکس چوری کی روک تھام کرنے مہاجنوں کی بے جا سود خوری کو ختم کرنے اور بندھوا مزدوروں کو آزاد کرانے کی باتیں براہِ راست اور بالواسطہ طور پر دستور میں درج پالیسی کے ہدایتی اصولوں میں شامل تھیں اور ان باتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتیں کوشش بھی کر رہی تھیں مگر ان کوششوں کے نتیجے خاطر خواہ نہیں نکل رہے تھے۔

سماجی انصاف کے ان اقدامات سے سماج پر ناجائز طور سے حاوی ہو جانے والے افراد کے مفاد پر آنچ آتی تھی۔ اور اسی لیے یہ افراد مختلف طریقوں سے ان اقدامات کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہے تھے، طرح طرح کے ہنگامے کھڑے کر کے حکومت اور عوام کی توجہ بنیادی مسائل کی طرف سے ہٹا رہے تھے، معاشی ترقی کے لیے یک جہتی اور یکسوئی کی ضرورت تھی مگر فرقہ وارانہ منافرت کے ذریعے انتشار پھیلایا جا رہا تھا اور تشدد آمیز تحریکوں نے امن و نظم کے قیام و استحکام کو سب سے بڑا مسئلہ بنا دیا تھا۔ اگر ایمرجنسی کا اعلان نہ کیا جاتا تو فاسد مادہ اندر ہی اندر بڑھتا، پکتا اور پھیلتا رہتا اور جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم کی جڑیں کمزور ہوتی رہتیں۔ اوپر اوپر کے لیپ اور سینک سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ طویل تجربے نے واضح کر دیا تھا اور ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کے بعد ہونے والے انکشافات نے اس کا مزید ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

پچھلے ایک سال میں قیمتیں جتنی گری ہیں اتنی پچھلے دس برسوں میں نہیں گری تھیں اور سیلنگ کے قانون سے دیہی سماج میں جو تبدیلی آئی ہے وہ زمینداری کے خاتمے کے ذریعے لائی جانے والی تبدیلی سے کسی طرح کم اہم نہیں ہے۔ ٹیکس کی وصولی اور اسمگلنگ کی روک تھام میں بھی ایسی ہی کامیابی ہوئی ہے اور کارخانوں کی پیداوار میں مشترکہ انتظامی کمیٹیاں بن گئی ہیں۔ قومی یا سرکاری ملکیت والے کارخانوں نے اس معاملے میں پہل کی ہے اور ایسے کارخانوں کے انتظامات میں بہتری اور پیداوار میں اضافے سے نجی زمرے پر قومی زمرے کی فوقیت ثابت ہو گئی ہے۔

فضا میں تبدیلی

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ایک طویل مدت میں رفتہ رفتہ اور پچھلے پانچ برسوں میں خاصی تیزی کے ساتھ جو آلائش جمع ہو گئی تھی وہ ایمرجنسی کے اعلان کے بعد ایک سال کے اندر پوری طرح سے صاف کر دی گئی ہے۔ سماجی ناانصافیاں اب بھی باقی ہیں اور ملک کی ترقی خوشحالی اور سالمیت کو اندر اور باہر کے جو خطرے لاحق ہیں ان کی طرف وزیر اعظم بھی بار بار توجہ دلاتی رہتی ہیں۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ خطرے کو پہچان لیا گیا ہے، اس کی روک تھام کا طریقہ معلوم کر لیا گیا ہے، مایوسی خاصی بڑی حد تک دور ہو گئی ہے، خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے سماج دشمن عناصر ختم نہیں ہوئے تو سہم ضرور گئے ہیں۔ فضا میں تبدیلی آ گئی ہے اور ترقی کی طرف پیش رفت آسان ہو گئی ہے، دستور میں پچھلے ایک سال کے دوران جو ترمیمیں ہوئی ہیں ان کی بدولت ہی دولت مندوں کے لیے دستور کی آڑ لے کر لوٹ کھسوٹ جاری رکھنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اور ان کے کارندے ایمرجنسی سے پہلے عوام میں جھوٹی امیدیں پیدا کر کے انھیں ورغلاتے، ترقی پسند اقدامات کا مذاق اڑاتے اور اس طرح اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کا بندوبست کرتے تھے۔ ایمرجنسی کے اعلان کے بعد عوام میں ترقی کی سچی امنگ پیدا ہو گئی ہے۔

یہ امنگ ایمرجنسی کی شاید سب سے بڑی دین ہے۔ ایمرجنسی سے جہاں ایک طرف حکومت کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ وہاں دوسری طرف وزیر اعظم کے اس اقدام سے حکومت اور

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

جائزہ

نذیر بنارسی

نہ دیکھو پیچھے آگے بڑھنے والوں کا سماں دیکھو
غبارِ کارواں کیا دیکھتے ہو کارواں دیکھو

کسانوں اور مزدوروں کی اب تاب و تواں دیکھو
گزشتہ کل کو چھوڑو آج کا ہندوستاں دیکھو

ہے لطفِ داستاں لینا تو میرا مشورہ لے لو
ذرا عنوان پہلے دیکھ لو تب داستاں دیکھو

بچایا مادرِ ہندوستاں کو کس قرینے سے
وطن والو کمالِ دخترِ ہندوستاں دیکھو

جہاں ہمت شکن مایوسیاں چھائی تھیں انساں پر
وہاں انگڑائیاں لیتا ہوا عزمِ جواں دیکھو

وہ سڑکیں جن پہ کل خنجر بکف خطرے ٹہلتے تھے
انھیں سڑکوں پہ چل کر اب ہجومِ مہوشاں دیکھو

اسی رستے پہ ہم سب چل کے پہنچیں گے سرِ محفل
نظر آتا ہے وہ منزل کا دھندلا سا نشاں دیکھو

زمیں سے آسماں تک آج اپنی بھی رسائی ہے
فضاؤں میں خلاؤں میں جہاں چاہو وہاں دیکھو

ہماری سمت سے اب پھیر لو چشمِ کرم اپنی؎
یہاں ہم دیکھ لیں گے تم جہاں کے ہو وہاں دیکھو

بُری نیت سے میری سرحدوں کو دیکھنے والو
تمھیں میرے جہاں سے کیا غرض اپنا جہاں دیکھو

یہ دونوں کام مل کر بانٹ لیں آپس میں ہم دونوں
زمیں کی ہم نگہبانی کریں تم آسماں دیکھو

نذیرؔ اپنا تعلق اتحادِ باہمی سے ہے
ہمیں کیا دیکھتے ہو تم ہمارا کارواں دیکھو

؎ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی طرف اشارہ ہے۔

عبدالمجیب سہالوی

بی ایمرجنسی

آخر یہ بی ایمرجنسی ہیں کون ؟ جسے دیکھو انہی کے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے

دادی اماں ! آپ نے بھی کمال کر دیا ان کا تو ملک بھر میں طوطی بول رہا ہے اور ان کے نام کے ڈنکے بج رہے ہیں اور آپ پوچھتی ہیں کہ بی ایمرجنسی ہیں کون ؟

ارے بیٹا ! میں بڈھی پھوس ۔ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، کان سے سنائی نہیں دیتا تو پھر مجھ سے تم طوطی کی بولی اور ڈنکے کی آواز کی کیا بات کرتے ہو ۔

دادی اماں ! آپ بھیا کلیم کی باتوں میں نہ پڑیئے یہ یونہی واہی تباہی اڑایا کرتے ہیں ۔ آپ مجھ سے سنیے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ بی ایمرجنسی کون ہیں ؟ آپ نے چاند بی بی اور رانی جھانسی کا تو نام سنا ہی ہوگا ۔ جیسے وہ اپنے دیس کو ظالم دشمنوں کے پنجوں سے نکالنے کے لیے تلوار کھینچ کر میدان میں نکل پڑی تھیں اسی طرح بی ایمرجنسی آستین کے سانپ دیس میں رہنے والے دیس کے دشمنوں سے جنتا کو نجات دلانے کے لیے قانون کی تیز تلوار میان سے نکال کر اس طرح میدان میں آگئیں کہ کالے دھن کے بڑے بڑے پہاڑ بید کی طرح کانپنے لگے اور مارے ڈر کے ان کی سٹی گم ہوگئی ۔ وہ سارا کالا دھن جو چور بازاری، رشوت خوری، ٹیکس ماری اور لوٹ کھسوٹ سے جمع کیا گیا تھا باہر آگیا ۔

یہ سنتے ہی دادی اماں کی ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوگئی اور چہرے پر خوشی کی لہر اس طرح دوڑ گئی کہ ساری جھریاں مٹتی معلوم ہونے لگیں ۔ وہ بولیں بیٹی عقو ! یہ بات ہے تو میرا بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بی ایمرجنسی کی پیشانی چوم کر گلے لگا لوں ۔

اس پر میاں کلیم فوراً بول اٹھے ۔ دادی اماں ! دیکھیے ایسا غضب نہ کیجیے گا بی ایمرجنسی چوما چاٹی کے بھی بہت خلاف ہیں اسی لیے غنڈہ گردی ان کا نام سنتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتی ہے ۔ آپ کو معلوم نہیں بی ایمرجنسی کے جلوہ افروز ہونے سے پہلے لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں کے سامنے من چلے لڑکوں کی ایسی بھیڑ لگی رہتی تھی کہ بچاری لڑکیوں کا آنا جانا دشوار ہو جاتا تھا مگر اب ان کا دور دور پتہ نہیں چلتا اور وہ ایسے غائب ہو گئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔

بیٹی عقو ! تم سچ سچ بتاؤ کہ میاں کلیم اڑا رہے ہیں ۔ یا ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔

دادی اماں ! وہ گدھے غائب تو نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کے سر سے سینگ ضرور غائب ہو گئے ہیں ۔ اب وہ بی ایمرجنسی کے ڈر سے سینگ مارنے کے بجائے کان دبائے بھیگی بلی بنے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سینگ مارنا جانتے ہی نہیں ۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس مرتبہ نقلچیوں کی ایسی سٹی گم رہی کہ کتاب لے جانا تو بڑی بات ہے ۔ امتحان ہال میں پرچی لے جانا بھی ان کے لیے مشکل ہو گیا اور خدا کے فضل اور بی ایمرجنسی کی عنایت سے امتحان وقت سے اور سکون و اطمینان سے ہوئے ۔

نہ ہنگامہ، نہ ہلڑ نہ نعرے بازی۔

دادوا یہ عقو خود بھی ڈرپوک ہے اور اس کے ساتھ کی لڑکیاں بھی۔ یہ اگر بی ایمرجنسی کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئیں اور نقل نہ کی۔ تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ بگڑے دل نوجوان جن کا نعرہ تھا کہ جو ہم سے ٹکرائے گا وہ چور چور ہو جائے گا، ان کے بی ایمرجنسی کی ایک ڈانٹ سے ایسے اوسان خطا ہو گئے کہ نعرے لگانا تو بڑی بات ہے نقل کرنا تک بھول گئے ورنہ ایمرجنسی سے پہلے ان کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے استادوں اور ساتھیوں سے تو خیر آئے دن ٹکراتے ہی رہتے تھے لیکن بعض وقت تو وہ مستی میں آ کر ٹرینوں اور بسوں سے بھی ٹکرانے لگتے تھے۔ جس کی وجہ سے ٹرینوں اور بسوں پر سفر کرنا سفر آخرت سے کم دشوار نہ رہ گیا تھا۔ ڈبوں میں زبردستی بلا ٹکٹ گھس جانا جہاں چاہا بے دھڑک زنجیر کھینچ کر گاڑی روک دینا، سامان لادے گھبرائے ہوئے مسافروں کا مذاق اڑانا، ٹکٹ چیکر کو پریشان کرنا، خونچے والوں کو دق کرنا ان کا روزمرہ کا وطیرہ ہو گیا تھا۔

اللہ جھوٹ نہ بلائے دادی جان! میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ بس تیزی میں جا رہی ہے۔ دس بارہ لڑکے بیچ سڑک پر برابر سے کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور کو بس روکنا پڑی۔ بس کے رکتے ہی لڑکے اچک اچک کر بس ڈرائیور کی کھڑکی سے دندناتے ہوئے گھس آئے۔ ٹکٹ لینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر کسی کنڈکٹر نے ہمت کر کے ٹکٹ کے لیے یا بس سے اترنے کے لیے کہا تو سمجھیے اس کی شامت آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگل کا قانون جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ بیچ شہر میں جاری ہے مسافر مجبور، ڈرائیور اور کنڈکٹر بے بس۔ جو بولے وہ مار کھائے۔

یہ حال سن کر دادی اماں روانسی ہو کر بولیں۔ یہ تو قرب قیامت کے آثار تھے۔

کلیم میاں فوراً بولے دادی اماں۔ اللہ جیتا رکھے بی ایمرجنسی کو اگر یہ بر وقت قانون کی ننگی تلوار لے کر نکل نہ پڑتیں تو قیامت سر پر آ ہی گئی تھی۔

رجعت پسند سیاسی پارٹیوں کی سرپرستی میں منھ زور، ہلڑ باز لڑکے اُدھم مچانے کے لیے تیار ہی تھے۔ دوسری طرف فرقہ پرور جماعتیں، پیسے والوں رجواڑوں اور دیس کے دشمن ملکوں کے اشارے پر غریبی مٹا ؤ اور پچھڑے ہوؤں کو برابر کا درجہ دلاؤ کی جو مہم وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی رہنمائی میں چلائی جا رہی تھی اس میں روڑے اٹکانے اور حکومت کا تختہ ووٹ سے نہیں چوٹ سے الٹنے کے لیے منصوبے تیار کر رہے تھے وہ تو کہیے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ بی ایمرجنسی نے ہمیں اس وقت ان سب کا گلا گھونٹ دیا جب یہ سازش کے فلیتے میں آگ لگانے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

دادی اماں نے کلیم کی لمبی چوڑی تقریر سے اکتا کر جمائی لیتے ہوئے کہا کہ بیٹا میری بوڑھی عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ آخر حکومت کا تختہ الٹنے اور ہلڑ مچانے سے ان کا کیا بھلا ہوتا۔

دادی اماں! وہ تختہ اس لیے الٹنا چاہتے تھے کہ غریبی ہٹاؤ اور سب کو برابر کا درجہ دلاؤ کے نعرے سے ان کے حلوے مانڈے، ان کی شان و شوکت ان کے اثر و رسوخ میں فرق آنے کا ڈر تھا اسی لیے وہ حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتے تھے اور سماج کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاسی آزادی کے بعد ملک میں ہونے والی ترقی سے جو خوش حالی آئی ہے اس کا بڑا حصہ بدستور انہی کے اِنے گنے گھرانوں میں محدود رہے اور محنت کش مزدور اور جفاکش کسان خون پسینہ ایک کر کے پیدا کرنے والی دولت سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ان کے رہن سہن کا معیار بلند نہ ہو، ان کے بچے اعلا تعلیم اور اعلا عہدوں سے بدستور محروم رہیں۔ انھیں کچہریوں، دفتروں اور اسپتالوں میں وہ آسانیاں حاصل نہ ہوں جو امیر لوگوں کو اپنے پیسے اور اثر و رسوخ کے بل پر حاصل ہیں۔ سماج میں انہی کا طوطی بولے انھیں کی ناک اونچی رہے اور وہ جوں کے توں چودھری بنے رہیں اور غریبوں کی کوئی شنوائی نہ ہو۔ اسی لیے وہ ان لوگوں کے خلاف تھے جو تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور غریب و امیر کا فرق مٹانا چاہتے ہیں۔

خزانوں پر بیٹھے ہوئے ان سانپوں کی ایک پوری برادری ہے جو ملک ہی میں نہیں ملک کے باہر تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ اپنے مشترکہ مفاد کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا جال اتنا لمبا چوڑا ہے کہ ان کی سازش میں بڑے بڑے بدعنوان افسر تک شامل ہیں۔ یہ لوگ بھولی بھالی جنتا کو دھوکے میں رکھ کر اپنا حمایتی بنانے کے لیے طرح طرح کے روپ دھارتے ہیں۔ وہ مذہب کے نام پر تبدیلی لانے کے ہر اچھے قدم کی مخالفت کرتے ہیں، فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر اور پیسے کا لالچ دے کر سیدھے سادھے عوام کو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب غلہ بیوپاریوں نے ذخیرہ اندوزی کر کے گیہوں کی قیمتیں اچھی پیداوار کے باوجود آسمان پر پہنچا دیں تو حکومت نے گیہوں کی تجارت درمیانی لوگوں کے ہاتھوں سے نکال کر اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی تاکہ گیہوں مناسب قیمت پر عام خریداروں کو اور معقول قیمت کسانوں کو مل سکے اور درمیان کے غلہ بیوپاری لوٹ کھسوٹ نہ کر سکیں لیکن غلے کے بڑے بیوپاریوں اور ان کے ہمدرد سیاسی لیڈروں نے کسانوں کو بہکا کر اور انھیں لالچ دے کر حکومت کی جانب سے غلے کی خریداری میں روڑے اٹکائے اور ٹھیک سے کام نہ ہونے دیا تاکہ چور بازاری کے ذریعے حاصل ہونے والے کالے دھن سے ان کی کی تجوریوں کے پیٹ بھرتے رہیں۔

یہ سن کر دادی اماں کی بوڑھی رگوں میں بھی خون جوش مارنے لگا اور انھوں نے کہا تو پھر حکومت ان لوگوں کا تختہ کیوں نہیں الٹ دیتی۔

اس پر عقّو بولیں دادی اماں! ہماری حکومت جمہوری ہے وہ جو تبدیلی لائے گی وہ ڈنڈے کے زور سے نہیں قانون کے ذریعہ لائے گی۔

دادی اماں مسکرا کر بولیں، اب میں سمجھی یہ بی ایمرجنسی کوئی بیگم یا رانی نہیں بلکہ کوئی قانون ہے۔ تم لوگوں نے خواہ مخواہ بی ایمرجنسی بی ایمرجنسی کہہ کر مجھے دھوکے میں ڈال دیا۔

میاں کلیم بولے دادی اماں! جب کوئی چیز تلاش کے بعد ملتی ہے تو مزا آتا ہے۔ اگر ہم ایمرجنسی کو برقعہ پہنا کر آپ کے سامنے نہ لاتے تو آپ کاہے کو ہماری بات سنتیں۔ تو جی بیٹا! میں کوئی سٹرن تھوڑی ہی ہوں جو کام کی بات نہ سنتی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ کیا قانون ہے؟

دادی اماں! یہ ایک ایسا قانون ہے جو دیس پر کوئی باہری یا اندرونی بپتا پڑنے پر ہنگامی حالات سے نپٹنے کے لیے لاگو کیا جاتا ہے تاکہ کام کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے جا سکیں اور غلط کام کرنے والوں کو جلد اور معقول سزا دی جا سکے۔

عقّو بولیں دادی اماں! اسی قانون کی برکت ہے کہ ہم لوگوں کے امتحان وقت سے ختم ہو گئے اور نتیجے بھی وقت سے آ جائیں گے۔

دادی اماں! اس عقّو کو تو امتحان اور نتیجے کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اسے یہ نہیں دکھتی کہ ایمرجنسی کے بعد سے ریلیں ٹھیک وقت پر اسٹیشن اور بابو لوگ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ رہے ہیں۔ اب ریلوں کی بلا وجہ زنجیر کھینچی جاتی ہے اور نہ دفتری گھس گھس میں فائیلوں کے سرخ فیتے سب کام ٹھیک سے ہو رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ چھاپے پڑ رہے ہیں اور لاکھوں کا چھپا ہوا کالا دھن روزانہ باہر آ رہا ہے۔ ٹیکس ماری کرنے والے گھبرا کر اپنا چھپا چھپایا روپیہ ظاہر کر رہے ہیں۔ بدعنوان افسروں کی بوٹی بوٹی لرز رہی ہے کہ کہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا نوٹس نہ آ جائے۔ پابند مزدوروں کی بیڑیاں کاٹی جا رہی ہیں۔ غریبوں کو مہاجنوں کے پنجوں سے چھڑانے کے لیے قرضے معاف کیے جا رہے ہیں۔ بینکوں سے غریبوں کو آسانی سے قرضے دیے جا رہے ہیں تاکہ چھوٹے دھندے کر کے اپنے رہن سہن کا معیار اونچا کر سکیں۔

یہ سب سننے کے بعد دادی اماں کافی سنجیدہ ہو کر بولیں مگر بیٹیا! بزرگوں کی یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ آگ اور دشمن کو کبھی کم نہیں سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیے کہ معلوم نہیں کب موقع پا کر کوئی چنگاری شعلہ بن جائے اور دبا دشمن حملہ کر دے۔

ابھی دادی اماں یہ نصیحت کر ہی رہی تھیں کہ ریڈیو سے آواز آئی ہمارا نعرہ "آرام حرام"

★

خالد شفائی

عزم

دل فسردہ کو پھر گلستاں بنانا ہے
نفس نفس کو ہمیں کامراں بنانا ہے

حیاتِ نو کے لیے ارتقا کی چھاؤں میں
نئی زمین، نیا آسماں بنانا ہے

بساطِ دہر کے پھیلے ہوے اندھیروں کو
نظر کی ضو سے تبسّم نشاں بنانا ہے

وہ اشکِ غم جو سلگتا ہے آج آنکھوں میں
اس اشکِ غم سے نئی کہکشاں بنانا ہے

مٹا کے حسرت و یاس والم کی بنیادیں
یہ نظمِ خاص، نیا اک جہاں بنانا ہے

شکست خوردہ ارادوں کو اور امنگوں کو
لہو کے دیپ کی لَو سے جواں بنانا ہے

بہ سعیٔ جہدِ مسلسل، بہ حسنِ عزم و عمل
دیارِ ہند کو جنّت نشاں بنانا ہے

نہ ہونے دیں گے تسلّط، خزاں کا لے خالدؔ
بہارِ نو کو ہمیں جاوداں بنانا ہے

مومن خاں شوقؔ

خواب سحر تمام ہوا

چاروں جانب شیشہ گرانِ عہدِ الم
بستی بستی پگھل رہے ہیں
کروٹ کروٹ جیسے کونپل
شاخِ الم سبز اندر سبز
مہک چلی ہے
رستے گلیاں کھیت، بغیچے
ایک نئی تاریخ بناتے
کتنے سُندر لگتے ہیں
جیسے گجر دم
ننھے ننھے پھولوں ایسے پیارے بچّے
یونی فارم میں مکتب کو نکلے ہوں گھر سے
یہ سُندرتا، یہ ہلچل
پر یہ درشن اندرا گاندھی کے سپنوں کا رنگ محل ہے

ڈاکٹر مرزا رفیع الدین احمد

قومی ترقی اور ۲۰ نکاتی پروگرام

جب بنیادی حقوق کو استحصال کا ایک ذریعہ بنا لیا جاتا ہے تو دوسروں سے زیادتی کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ جب آزادی کو بے لگامی کی شکل دے دی جاتی ہے تو طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ جب آزادی کا استعمال جمہوریت کی تخریب کے لیے کیا جانے لگتا ہے تو آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ جملہ تصورات کی طرح آزادی کا تصور بھی ایک نسبتی تصور ہے۔ مطلق اور غیر پابند آزادی ایک بے معنی چیز ہے کیونکہ غیر پابند اور بے اصول آزادی عام طور سے لاقانونیت، استحصال اور طوائف الملوکی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ایمرجنسی کے نفاذ کے قبل آزادی کا کچھ ایسا ہی غلط استعمال کیا جا رہا تھا کہ ملک میں بے حد بدنظمی اور تقریباً طوائف الملوکی والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ سماج دشمن اور رجعت پسند طاقتوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش کر جمہوریت کو ہی ختم کر دینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور سارے بے اصول اور خود غرض لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کے لیے نظم و نسق کو تباہ کرنے پر تُل گئے تھے۔ عوام کو ان حالات میں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے کو مجبور اور بے بس پاتے تھے۔ کسی ادارے کا بھی سکون کے ساتھ چلنا مشکل تھا، چاہے وہ معاشی ادارہ ہو یا تعلیمی یا سماجی۔ جب آزادی کے اس بیجا استعمال سے نہ صرف جمہوریت بلکہ پورے ملک و قوم کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ایک جرأت مندانہ اقدام کر کے ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو جب ایمرجنسی کا نفاذ ہوا تب جا کر ملک سے بے لگام آزادی اور طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوا اور عوام نے اطمینان کی سانس لی۔ وزیر اعظم نے بہت ٹھیک کہا کہ "جمہوریت جسے لوگوں نے پٹری سے اتار دیا تھا، اسے پھر سے پٹری پر لانا ہے[1]۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "کبھی کبھی ہمیں ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جنھیں عام حالات میں ہم نہیں کرتے جنھیں میں خود کرنا پسند نہیں کرتی اور جنھیں میں ابھی ابھی پسند نہیں کرتی۔ لیکن اس وقت سوال یہ تھا کہ وہ کام کیے جائیں یا اس طوائف الملوکی کو چلنے دیا جائے[2]۔" جمہوریت میں اپنے اعتقاد کی پختگی کو ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "بھارت ایسے عظیم اور گوناگونیت والے ملک کے لیے سوائے جمہوریت کے اور کوئی دوسرا نظام موزوں نہیں ہے ..... چونکہ ہمارے یہاں ایمرجنسی ہے اس لیے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جمہوریت کو ترک کر دیا ہے یا ہم جمہوریت کو بھارت کے لیے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ میں اس کو بالکل واضح کر دینا چاہتی ہوں۔ لیکن ہماری جمہوریت میں کچھ نقائص آ گئے تھے اور ان نقائص کو دور کرنا ہے[3]۔" ایک اخباری نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں اس بات کی ضرورت ہے کہ "افراد کے سیاسی اور دیگر حقوق اور کروڑوں لوگوں کے اقتصادی حقوق میں ایک صحتمندانہ توازن لایا جائے[4]۔"

اس توازن کو قائم کرنے کے لیے اور ملک کو سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے

---

۱ روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۷۵ء۔ ۲ روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ مورخہ ۱ جولائی ۱۹۷۵ء۔ ۳ روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۷۵ء

۴ ہفتہ وار بلٹز مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۵ء۔

یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو ایک بیس نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان کیا۔ یہ بیس نکاتی پروگرام ہمارے ملک کے کروڑوں عوام کے لیے ایک طرح کا منشور آزادی ہے جس نے عوام کو معاشی بدحالی اور پریشانی سے نجات دلا کر انھیں ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔

جیسا کہ ہم آپ سب جانتے ہیں کہ ایمرجنسی کے نفاذ کے قبل ضروری اشیاء کی زبردست کمی ہو گئی تھی اور ملک کی پیداوار اتنی کم ہو گئی تھی کہ عوام کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور یہ سب سماج دشمن طاقتوں کے کرتوت تھے۔ ضروری اشیا کی تقسیم عوام میں صحیح طریقے پر نہیں ہو پاتی تھی کیونکہ ذخیرہ اندوز اور چور بازاری اور کالا دھندا کرنے والے لوگوں نے مال جمع کر کر کے قیمتیں بے حد بڑھا رکھی تھیں۔ ضروریات کی تمام چیزیں مثلاً ڈالڈا، تیل، اناج وغیرہ کی بے حد قلت اور کمیابی پیدا کر دی گئی تھی اور دام بے حد بڑھا دیے گئے تھے۔

بیس نکاتی پروگرام کا پہلا نکتہ یہی تھا کہ ضروری اشیاء کی قیمتیں کم کی جائیں اور ان کی صحیح پیداوار، حصول اور تقسیم کا انتظام کیا جائے۔

ہم نے دیکھا کہ اس پروگرام کا کتنا زبردست اثر ملک پر پڑا۔ ساری ضرورت کی اشیاء آسانی کے ساتھ عوام کو ملنے لگیں اور قیمتوں میں بھاری کمی آ گئی۔ سرکاری تھوک قیمتوں کا اشاریہ جو جولائی ۱۹۷۵ء میں تین سو دس تھا وہ جنوری ۱۹۷۶ء میں دو سو اکیانوے رہ گیا۔ گیہوں کی قیمت میں بھاری کمی ہو گئی۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں ہی گیہوں کی قیمت جولائی ۱۹۷۴ء کی بہ نسبت پچاس فی صد کم ہو گئی۔[۱]

اسی طرح ایمرجنسی کے نفاذ کے چار ہی مہینے بعد یعنی اکتوبر ۱۹۷۵ء میں چاول کی قیمت بارہ فی صد کم ہو گئی۔ جوار کی بیس فی صد، باجرے کی اٹھارہ فی صد، مکئی جوار کی گیارہ سے لے کر ۳۲ فی صد، مونگ پھلی کے تیل کی آٹھ سے اکتیس فی صد، سرسوں کے تیل کی ۲۵ سے ۴۰ فی صد اور بناسپتی گھی کی ۱۲ سے ۲۹ فی صد قیمت کم ہو گئی۔ شکر جو کھلے بازار میں چھ روپے کیلو گرام فروخت ہو رہی تھی وہ کھلے بازار میں چار روپے ستر پیسے کیلو فروخت ہونے لگی۔[۲] اسی طرح دالوں اور چنے کی قیمتوں میں بھی کمی ہوئی۔

پیداوار میں اضافہ

اگر ایک طرف عوام کو چیزیں بہ آسانی اور کم قیمتوں پر دستیاب ہونے لگیں تو دوسری طرف پیداوار میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ جولائی۔ ستمبر ۱۹۷۴ء کے مقابلہ میں جولائی۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں بناسپتی، کھاد المونیم، تانبے، سیسے، اسکوٹر، ڈیزل انجن وغیرہ کی پیداوار میں بیس فی صد کا اضافہ ہوا۔

غذائی پیداوار

غذائی پیداوار ۱۹۷۵ء میں تخمیناً گیارہ کروڑ چالیس لاکھ ٹن ہوئی جو گزشتہ سال یعنی ۱۹۷۴ء سے ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن زیادہ تھی۔[۳]

زرعی زمین کی حد بندی

بیس نکاتی پروگرام کا دوسرا نکتہ زرعی زمین کی حد بندی اور بے زمین لوگوں میں فاضل زمین کی تقسیم تھا۔ بھارت میں بے زمین

بے زمین افراد کو زمین کا الاٹمنٹ۔ (انی چوراد ہٹری)

کاشتکاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو دوسروں کی زمین پر مزدوروں کی طرح بہت ہی کم اجرت پر کام کرتے تھے اور اس طرح ان کا استحصال ہو رہا تھا۔ اس پروگرام کے تحت ہزاروں مزدور کاشتکاروں کو فاضل زمین تقسیم کی گئی جس کے سبب وہ بھی زمین کے مالک

[۱] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ مورخہ یکم اگست ۱۹۷۵ء۔
[۲] 〃 〃 〃 ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء۔ [۳] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۷۵ء

بن گئے۔ اتر پردیش میں ہی اپریل ۱۹۷۶ء تک چھہتر ہزار ایکڑ فاضل زمین بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۱۳ لاکھ خاندانوں کو مکان تعمیر کرنے کے لیے مفت زمین بانٹی گئی[2]

اس طرح پورے ملک میں نومبر ۱۹۷۵ء تک مجموعی طور پر پچاس لاکھ قطعہ زمین ان لوگوں کو الاٹ کی گئی جن کے پاس گھر بنانے کے لیے زمین نہ تھی[3]

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں اتر پردیش سرکار نے بے زمین کاشتکاروں کی کم سے کم اجرت ازسرِنو مقرر کی اور مزدوروں کی کم سے کم حد پانچ روپے سے ساڑھے چھ روپے فی کس روزانہ کے حساب سے مقرر کر دی۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ایک آرڈی نینس کے ذریعہ پابند مزدوری کے رواج کو ختم کر دیا گیا جس سے دیہاتوں میں ہزاروں لاکھوں غریب کسانوں کو صدیوں کی غلامی سے چھٹکارہ حاصل ہوا اور وہ اس قرض سے بری کر دیے گئے۔ جس کے عوض انھیں ایک غلام کی صورت میں کھیتوں پر بلا معاوضہ اس وقت تک کام کرنا پڑتا تھا جب تک کہ وہ اپنا قرض نہ ادا کر دیں جب کہ غریبی کے باعث وہ یہ قرض ادا ہی نہ کر پاتے تھے۔ یہ ایک بڑا ہی منصفانہ اور انقلابی قدم تھا جو حکومت نے اٹھایا۔ شہری زمین کی بھی حد بندی کر دی گئی ہے اور فاضل زمین مکان بنانے کے لیے غریبوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کو دیے جانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

اسمگلروں کی جائداد کی ضبطی

ایمرجنسی کے نفاذ کے قبل اسمگلروں نے ملک میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی۔ حاجی مستان اور سکر نارائن بھاکیہ جیسے لوگوں نے کروڑوں کی مالیت کی ناجائز جائدادیں بنا رکھی تھیں اور ملک کی بیرونی تجارت اور زرِ مبادلہ کو نقصان پہونچا رہے تھے۔ بیس نکاتی

اسمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف سخت کارروائی (علی گڑھ)

پروگرام میں ان کی ناجائز جائیدادوں کو ضبط کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ کروڑوں روپے جو ناجائز طور پر اسمگلروں نے جمع کر رکھے وہ حکومت کے ہاتھ لگے اور انھیں ترقیاتی کاموں میں لگایا گیا۔ حکومت نے ایک نئی اسکیم کے تحت از خود ناجائز آمدنی کا انکشاف کرنے والوں کو سزا دینے کے بجائے معافی دینے کا انتظام کیا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء تک تقریباً پندرہ سو کروڑ روپیے کی ناجائز آمدنی کا انکشاف کیا گیا۔ اس سے حکومت کو ٹیکس کی شکل میں تقریباً ڈھائی سو کروڑ روپے حاصل ہوئے۔

بیرونی زرِ مبادلہ کی تجارت میں جو بے ایمانی اور بدعنوانی برتی جاتی تھی اس پر بھی کڑی روک لگائی گئی۔ جولائی ۱۹۷۵ء تک جائز طریقوں سے تقریباً تین سو تیرہ کروڑ روپیے ملک میں باہر سے بھیجے گئے جبکہ ۱۹۷۴ء کی جولائی میں اسی مدت کے دوران تقریباً دو سو کروڑ روپے بھیجے گئے تھے۔ اس سے ملک کی معیشت اور زرِ مبادلہ کو فائدہ پہنچا۔

انکم ٹیکس ماری کرنے والوں کے خلاف ملک بھر میں ہزاروں چھاپے مارے گئے۔ اگست ۱۹۷۵ء تک انکم ٹیکس کے

---

[2] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء

[3] " " " " " "

چھاپوں میں آٹھ کروڑ روپے حاصل ہوئے جبکہ ۱۹۷۴ء میں صرف ڈھائی کروڑ ہی حاصل ہوئے تھے بیس نکاتی پروگرام میں طلباء کی بہبود کے لیے بھی متعدد بروئے کار لائے گئے۔ مثلاً ان کے لیے ہاسٹلوں میں ضروری اشیاء کم قیمت پر فراہم کی گئیں کتابیں کاپیاں کنٹرول قیمت پر مہیا کی گئیں ان کے روزگار کے لیے تربیتی اسکیم چلائی گئی

انکم ٹیکس سے چھوٹ کی حد بڑھا کر آٹھ ہزار روپے کر دی گئی جس سے کہ درمیانی طبقے کو بڑی راحت ملی۔ اس طرح قومی زندگی کے ہر شعبے میں بیس نکاتی پروگرام سے ترقی ہوئی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ملک میں ضبط و نظم کی ایک فضا قائم ہو گئی اور اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنے فرائض کا بھی احساس ہو گیا۔ اتنے کم عرصے میں بھارت نے جو ترقی کی ہے وہ دنیا میں ایک انوکھی مثال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جمہوریت اب اپنے صحیح راستہ پر آ گئی ہے

حال ہی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو بیس نکاتی پروگرام کے سلسلے میں خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے پانچ مزید نکتوں کا اضافہ فرمایا جو یہ ہیں۔ قومی مستعدی اور صلاحیت، خاندانی منصوبہ بندی، شجر کاری، فلاح اطفال اور شہری نشو و نما۔*

بیس نکاتی پروگرام ایک انقلابی پروگرام ہے جس نے ملک کی زندگی میں واقعی ایک تعمیری انقلاب برپا کر دیا لیکن اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری جتنی حکومت پر ہے اس سے کہیں زیادہ اس ملک کے عوام پر ہے۔ خاص طور سے پڑھے لکھے لوگوں کی زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس پروگرام کے فوائد سے عوام کو روشناس کرائیں اور نہ صرف روشناس کرائیں بلکہ پروگرام کی کامیابی کے لیے عوام کا تعاون حاصل کریں۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں کے طلبا کی توجہ اس طرف دلانا چاہیے اور پروگرام کے نفاذ میں ان سے مدد لینا چاہیے۔ ۲ جون ۱۹۷۶ء سے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ سوشل ورک کے ایم۔ اے کے طلبا اپنے چھ ہفتے کا فیلڈ ورک (FIELD-WORK) سرکاری محکمے کے تعاون سے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ تقریباً چالیس طلبا ہر روز پندرہ اشخاص سے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں رابطہ قائم کریں گے۔ اس طرح لکھنؤ میں ۱۴ جولائی ۱۹۷۶ء تک یہ چالیس طلباء تقریباً ستائیس ہزار لوگوں سے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں رابطہ قائم کر لیں گے اور انھیں اس اسکیم کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہونچا کر اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیں گے۔ علاوہ اس کے نیشنل سروس اسکیم کے ذریعے بھی طلباء کو بیس نکاتی پروگرام میں لگایا جا رہا ہے۔ بیس نکاتی پروگرام ملک کی ترقی کا ضامن ہے۔ ہم سب کو اس کے نفاذ میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔

اندرا گاندھی

روشن مینار اندرا گاندھی ہیں
گلشن کی بہار اندرا گاندھی ہیں
آغاز حکومت سے "ایمرجنسی" تک
بھارت کا وقار اندرا گاندھی ہیں

وجیہہ ادیب

* نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ، مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۷۶ء

ایمرجنسی

امرجینسی ہے امرجینسی ہے
یہ جمہوریت کے لیے لازمی ہے
نظامِ وطن کی حفاظت کی خاطر
ڈسپلن کی تعلیم دی جا رہی ہے
ڈسپلن ہی انسانیت کا ثمر ہے
ڈسپلن بغیر آدمی جانور ہے
جب اہلِ چمن ہی چمن کو جلائیں
مکیں جب مکاں کی عمارت گرائیں
پجاری اہنسا کے ہنسا سکھائیں
وطن کے نواسی وطن کو ستائیں
امرجینسی ایسی صورت کا حل ہے
امرجینسی اس لیے آج کل ہے
جو فوج اور پولیس کو بہکائے وہ دشمن
بدیسیوں سے لے اشارے وہ دشمن
کریں ریل اور ڈاک میں گڑبڑی جو
وہ ہیں ملک دشمن ہمارے وہ دشمن
نہ رہ پائیں گے اب یہ دشمن وطن میں
نیا انقلاب آ رہا ہے چمن میں
وزیر اعظم ہند کی ہوشمندی
بگڑتے ہوئے وقت پر کام آئی
بہت سے بھنور حملہ آور تھے لیکن
بچا کر صفائی سے کشتی نکالی
امرجینسی ایک پتوار سمجھو
سفینے کو طوفان سے پار سمجھو
امرجینسی کا نمایاں اثر ہے
جو بیکار تھا آج وہ کام پر ہے
ہری کھیتیاں، باندھ اور کارخانے
ترقی جدھر دیکھیے جلوہ گر ہے
ابھی دُور گو کوئے منزل ہے لیکن
رواں کارواں سوئے منزل ہے لیکن
وطن کو سنوارو وطن کو بناؤ
گروں کو اٹھاؤ غریبی مٹاؤ
گرانی مٹے گی اُپج کو بڑھاؤ
یہ سنکلپ ساکار کر کے دکھاؤ
کڑی محنت ہو موجؔ ارادہ اٹل ہو
جب ہی اپنی منصوبہ بندی سپھل ہو

راجیندر بہادر موجؔ

شاداںؔ بارہ بنکوی

جمہور کی عظمت — اندرا گاندھی

وقت کچھ ایسا تھا بھارت میں پریشاں لوگ تھے
اک نظامِ بے عمل سے سخت حیراں لوگ تھے ...

ایسے نازک دور میں آیا ایمرجنسی نظام
شادمانی کا دیا ہے اہلِ بھارت کو پیام

چینی گیہوں اور گھی بازار میں ملتا نہ تھا
غمزدہ لوگوں کے دل کا پھول بھی کھلتا نہ تھا

اس کے آتے ہی ہر اک شے خود بخود ملنے لگی
غمزدہ لوگوں کے دل کی بھی کلی کھلنے لگی

اے وزیر اعظم ہے اعلیٰ آپ کا دل اور دماغ
آپ نے فرقہ پرستی کا کیا ہے گل چراغ

آپ نے سرمایہ داروں کو ہلا کر رکھ دیا
لعنت فرقہ پرستی کو مٹا کر رکھ دیا

آپ نے دنیا میں روشن نام باپو کا کیا
جو ادھورا رہ گیا تھا کام وہ پورا کیا

رہبرِ دنیا کہوں یا رہبرِ بھارت کہوں
دل یہ کہتا ہے تمھیں جمہور کی عظمت کہوں

جے۔ ایم۔ شاہ

ایمرجنسی ـــــ ایک نعمت

مہاتما گاندھی ایک ایسے ہندستان کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو، نہ کوئی چھوٹا ہو اور نہ بڑا۔ ایک ایسا ہندستان جس کے بسنے والوں میں نہ اعلیٰ طبقہ ہو اور نہ ادنیٰ۔ ایک ایسا ہندستان جس میں غریب سے غریب شخص بھی یہ محسوس کر سکے کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے جس کی تعمیر میں اس کی آواز کی اہمیت کسی فرد سے بھی کم نہیں ہے۔ ایک ایسا ہندستان جس میں چھوت چھات کی لعنت نہ پائی جائے اور ملک کے ہر باشندے کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔

چنانچہ آزادی کے بعد جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی نے مہاتما جی کے ان سنہرے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کیا۔ لیکن بعض موقع پرست اور سماج دشمن عناصر نے گاندھی جی کے ان سنہرے خوابوں کو ملیا میٹ کرنا چاہا۔ ان رجعت پسند اور قوم دشمن عناصر نے ملک کی آزادی کے لیے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ باپو کے دست راست بن کر ہندستان کو آزاد کرانے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو ہندستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ انھوں نے بھارت کو اقوام عالم کی برادری میں ایک ممتاز جگہ دلائی۔ اس عظیم رہنما، مدبر، سیاست داں، مفکر ادیب اور دانشور نے دنیا کو بقائے باہم، امن و آشتی کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ فسطائیت نواز اور انتشار پسند طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔

عظیم جواہر لال کی عظیم بیٹی شریمتی اندرا گاندھی نے انتہائی مشکل حالات میں، زبردست بحران اور سخت چیلنجوں کے ماحول میں ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ اس زمانہ میں فسطائی طاقتوں اور تخریب پسند عناصر کی ریشہ دوانیاں نقطۂ عروج پر پہونچ گئی تھیں۔ تحریر اور تقریر کی آزادی کا کھلے عام مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ملک میں انتشار اور نراج کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

ان جمہوریت دشمن عناصر کی فسطائیت پسند ریشہ دوانیاں جمہوری حکومت کے خلاف ایک گہری سازش کی شکل میں رونما ہوئیں۔ ابتدا میں حکومت انتشار پسندوں کی سرگرمیوں کو صبر اور ضبط سے دیکھتی رہی لیکن اسے سماج دشمن عناصر نے کمزوری سے تعبیر کیا۔ پانی دن بہ دن سر سے اونچا ہونے لگا۔ حد یہ ہو گئی کہ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو ختم کر دینے کی کوششیں کی گئیں۔ فوج اور پولیس کو بغاوت پر اکسایا جانے لگا۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو گئی کہ ملک کی ایکتا، استحکام اور سالمیت کو ہی خطرہ لاحق ہو گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے ملک کے لیے سخت امتحان کی گھڑی تھی۔

اگر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ملک میں ایمرجنسی۔ (ہنگامی حالات) کے اعلان کا بروقت اور برمحل فیصلہ نہ کرتیں تو ملک کی آزادی اور جمہوریت ہی خطرہ میں پڑ گئی ہوتی۔

یہ اقدام صرف آزادی کے استحکام، جمہوریت، اور سیکولرزم کی بقا اور عوام کی خود اعتمادی اور حوصلوں کو

بلند کرنے کے لیے کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہنگامی حالات کے اعلان نے ملک کو نزاع اور انتشار سے بچا لیا۔ عوام نے ہنگامی حالات کے اعلان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کو دن پر دن راحت مل رہی ہے۔ اس کے سبب ملک میں ضبط و نظم کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

اس ایمرجنسی کے اعلان کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے اشیائے صرف کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے اژدھے کا سر کچل دیا ہے۔ عوام اطمینان اور راحت کی سانس لے رہے ہیں۔ ہنگامی حالات کے اعلان نے جمہوریت اور ملک کو محض انتشار اور لاقانونیت سے ہی نہیں بچایا بلکہ ترقی پسند اقدامات کو مستحکم بنایا اور ملک کی معیشت میں ایک نئی روح پھونک دی۔

ایمرجنسی کے دوران وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا اہم قدم ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان ہے۔ اس پروگرام میں خاص طور پر سے ملک کے غریب اور دبے کچلے عوام کو محرومیوں اور ناکامیوں سے نجات دلانے کے اقدامات شامل ہیں۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کے اعلان کے ساتھ دیش میں ہریجنوں، پس ماندہ اور کمزور طبقوں کی ترقی اور انھیں سماج میں برابری کا درجہ دلانے نیز صدیوں سے ان پر روا رکھے جانے والے ظلم اور چیرہ دستیوں کا خاتمہ کرنے کے اقدامات کی رفتار تیز کر دی گئی ہے۔

پس ماندہ اور کمزور طبقوں کی فلاح و ترقی کی جانب مختلف اسکیموں کے علاوہ کئی قوانین بھی وضع کیے گئے۔ ایک آرڈی نینس جاری کر کے بے زمین اور ایک ایکڑ تک کے کھاتے دار اور ہریجنوں اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ان لوگوں کو جو کئی پشتوں سے مہاجنوں کے قرض دار چلے آ رہے تھے، ان قرضوں سے نجات دلا دی گئی ہے۔ گاندھی جی ہی کی وہ ذات تھی جو تمام عمر ستم زدہ ہریجنوں، پچھڑے ہوئے طبقوں اور اقلیتوں کے مفاد کے لیے لڑتے رہے اور بالآخر انھیں کے لیے اپنی جان کی بھی قربانی دے دی۔ یہ آرڈی نینس گاندھی کے تئیں ایک چھوٹا سا نذرانہ عقیدت تھا۔ بعد میں اس آرڈی نینس کو قانونی شکل دیدی گئی۔ اس کی رو سے تمام بے زمین افراد اور ایک ایکڑ تک جوت رکھنے والے کسان بھی خواہ وہ کسی طبقوں، قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں مہاجنوں سے چھٹکارا پا گئے ہیں۔

کمزور طبقوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ایک اور اہم قدم پابند مزدوروں کے رواج کو ختم کرنے کے لیے بھی اٹھایا گیا ہے۔ کسی اقرار نامہ، معاہدے یا رواج کے مطابق مزدوروں، ان کے خاندان والوں یا ان کی آئندہ نسلوں کو دھمکی یا لالچ کے ذریعہ کام کرنے کے لیے پابند بنانے کا طریقہ بھی قانوناً ختم کر دیا گیا ہے۔ اس رواج کے خاتمہ سے بلاشبہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ ان اقدامات سے پسماندہ طبقوں کا مستقبل نہ صرف روشن اور تابناک ہو گیا ہے بلکہ ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک نمایاں کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

ایمرجنسی کے دوران جوت حد بندی قانون کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس قانون میں بعض ضروری ترمیمیں کر کے نہ صرف جوت حد بندی کم کر دی گئی ہے بلکہ اس پر عمل درآمد کے لیے زیادہ موثر قواعد مرتب کیے گئے ہیں۔ جوت حد بندی قانون کے تحت، فاضل قرار دی جانے والی اراضیات کی بے زمین کھیت مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں میں جلد تقسیم اور اس کی دیکھ بھال کے لیے مناسب بندوبست کیا گیا ہے اس سے نہ صرف تقسیم کے کام کی رفتار بڑھ گئی ہے بلکہ فاضل زمینوں کی منصفانہ تقسیم بھی ہو رہی ہے اور شکایتوں اور بے قاعدگیوں کا موقع ہی پیدا نہیں ہو پاتا ہے۔ موجودہ پروگرام کے مطابق فاضل زمینوں کی تقسیم کا کام قریب مکمل ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ جو دیگر سہولتیں عوام کو دی گئی ہیں وہ ہیں کمزور طبقوں کو مفت قانون سہولتیں، غیر قانونی قبضوں کو

ختم کرنے کے لیے قانونی بندوبست، بے زمین کھیت مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں کو مکان بنانے کے لیے زمین کا الاٹمنٹ قیمتوں پر کنٹرول اور ضروری اشیا کی مناسب تقسیم جنتا دوکانوں کی نئی اسکیم، اسمگلنگ، ذخیرہ بازی، چور بازاری اور ٹیکس ماری کی روک تھام کے لیے اقدامات، مختلف کارخانوں میں اپرنٹسوں کے لیے نئی جگہیں محفوظ کرنا اور کمزور طبقے کے درجہ اوّل سے درجہ پنجم تک کے طالب علموں کو کورس کی مفت کتابوں کی فراہمی وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ان اقدامات میں کامیابی کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکانات کی تعمیر کے لیے بیشتر بے گھر مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں کو زمین دی جا چکی ہے۔ کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرت مقرر کر دی گئی ہے۔ اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ٹیکس ماری کے خلاف سخت کارروائی کے نتیجہ میں گرفتاریوں کے علاوہ کروڑوں روپیہ کی مالیت کا سامان ضبط کیا جا چکا ہے۔

ملک میں ضبط و نظم کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ ہنگامی حالات کے اعلان سے انتظامیہ چاق و چوبند ہو گئی

چوری اور ڈکیتی کے خلاف پولیس کا سخت پہرہ

ہے اور کھیتوں، کارخانوں اور صنعتی اداروں میں پیداوار برابر بڑھ رہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہلڑ بازی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں کام ہی کام ہو رہا ہے۔ اس طرح ایمرجنسی کے سبب ملک کی آزادی، جمہوریت سیکولرزم اور سالمیت کو مستحکم کرنے کا سنہرا موقع ملا ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام ملک کی خوشحالی کا ضامن ہے۔ جس کی بدولت ملک میں ایک سماجی انقلاب تیزی سے آ رہا ہے۔ ہمارا یہ فریضہ ہے کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا پورا تعاون دیں۔ کیونکہ اسی میں ہماری، آپ کی، اور سارے ملک کی بھلائی ہے

یہ ہمارے ملک کی خوش بختی ہے کہ اس کو ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت نصیب ہوئی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے ملک کی ترقی، خوشحالی اور استحکام کے لیے متعدد ایسے انقلابی فیصلے کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک تاریخ ساز شخصیت بن کر سامنے ابھر آئی ہیں۔ انھوں نے عوام سے جو کہا وہ کر کے دکھا دیا ہے۔ ملک میں ایمرجنسی کا اعلان بھی ایک ایسا تاریخی اور جرأت مندانہ فیصلہ ہے۔ جس نے ملک دشمن عناصر کی ناپاک سازشوں کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ ملک کو آئے دن کی تحریکوں، معاشی پریشانیوں اور روز افزوں مہنگائی سے نجات مل گئی ہے۔ اسی لیے عوام نے اس ایمرجنسی کا نہ صرف خندہ دلی سے خیر مقدم کیا ہے بلکہ اس کو ملک کی ترقی کے لیے ایک نعمت قرار دیا ہے۔

ثمر نکاروی

امن و آشتی کی روشنی

(محترمہ وزیر اعظم ہند کے بیس نکاتی پروگرام کے نفاذ کے بعد کے مثبتی اثرات سے متاثر ہوکر)

گل کھلے غنچے ہنسے آئی چمن میں کیا بہار
وجد میں ہر سو خراماں ہے نسیم مشکبار
دیدنی ہیں بیل بوٹوں کی یہ کیا رعنائیاں
لے رہی ہیں گلستاں میں شاخ گل انگڑائیاں
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا نظامِ گلستاں
پھول تو پھر پھول ہیں، ہے پتہ پتہ شادماں
پی رہی ہے زندگی ہر سو سبوئے آسودگی
ہر طرف آتی نظر ہے زندگی ہی زندگی
شہر ہو قصبہ ہو، قریہ ہو کہ صوبہ ہو کوئی
ہر جگہ پھیلی ہے امن و آشتی کی روشنی
بند اور ہڑتال کی ہنگامہ خیزی رک گئی
سیلِ بد نظمی کی دھاروں کی وہ تیزی رک گئی
چور بازاری و اسمگلنگ کا دھندھا رک گیا
ہر ذخیرہ باز کا سر خود بخود اب جھک گیا
آج مزدوروں کے ہر طبقہ میں اطمینان ہے
ملک کا ہر نظم اک نظم عظیم الشان ہے
خوردنی چیزوں کے داموں میں گراوٹ آگئی
تھوک بیوپاری کے پیروں میں تھکاوٹ آگئی
ملک سے اب ہو گئی ہیں دور بدعنوانیاں
وقت پر سب کام اب ہونے لگے ہیں بے گماں
ملک کی تعمیر میں یہ بیس راہیں کیا کھلیں
مسئلے سب حل ہوئے دشواریاں آساں ہوئیں
گر وزیر اعظم نہ لیتیں عزم و ہشیاری سے کام
ملک میں پیدا نہ ہوتا اس طرح بہتر نظام

ذکی پرواز

سفیر امن - اندرا گاندھی

اے اندرا اے ہند کی جانباز و جاں نثار
گاندھی کی جانشین اے نہرو کی یادگار
بخشا ہے تو نے ہند کو رتبہ فلک وقار
تیرے کرم سے گلشنِ بھارت میں ہے بہار
گمراہ کن بساطِ سیاست الٹ گئی
بڑھتی ہوئی وہ ظلم کی آندھی پلٹ گئی
حرفِ غلط کی طرح مٹے فتنہ و فساد
آئے گا کام بغض کسی کے نہ اب عناد
بادِ سموم تھم گئی مہکے گل مراد
مظلوموں کو اماں ملی، مفلس ہوئے ہیں شاد
ٹھوکر سے تیری جور کی بنیاد اکھڑ گئی
اور ہاتھوں سے بنائے مساوات پڑ گئی
ہیئت جو بگڑی ملک کی تو نے درست کی
مضبوط اختیار پہ اپنی گرفت کی
پیش آئی احتیاج جو اقدام سخت کی
بروقت باگ تھام لی رہوارِ وقت کی
ہر مرحلے کو طے کیا پائے ثبات سے
پرچم وطن کا اونچا ہو تیرے ہاتھ سے
اے میر کاروانِ وطن تجھ کو گام گام
دل سے دعائیں دیتے ہیں سب ملک کے عوام
سر فیصلوں پہ تیرے جھکے ہیں بہ احترام
کہتے ہیں تیری طرزِ جہاں بانی کو سلام
عمر دراز دے خدا اس دارِ فانی میں
لگ جائے اپنی عمر تیری زندگانی میں

احمد جمال پاشا

کایا پلٹ

(ڈرامہ)

وقت :- ۴۵ منٹ
مقام :- ایک ہندستانی گاؤں
کردار :- مہاجن
۲- منیم
۳- پرانا زمیندار
۴- دکھیا
۵- بھکیا
۶- ڈگی پیٹنے والا
۷- اگنو
۸- مختلف آوازیں.

مہاجن ——— ہمارے کھیت آج کیوں نہیں جوتے گئے ——— ؟ منیم جی ! پانی برس کر کھل چکا ہے ۔ اس سے اچھا موقع آخر کب آئے گا ——— ؟

منیم جی ——— مہاراج بٹائی والے نہیں مل رہے ہیں ——— !

مہاجن ——— (غصہ کی آواز میں) نہ ملیں مگر مزدور تو لا سکتے تھے ۔

منیم جی ——— مہاراج مزدوروں کے تو بڑے دماغ ہو رہے ہیں ۔

مہاجن ——— ہوں ...... ! ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے آج ہم کو دماغ دکھا رہے ہیں ۔ ہوں .... ! منیم جی ...... !

منیم جی ——— حضور !

مہاجن ——— دکھیا کیوں کھیت جوتنے نہیں آیا ——— ؟

منیم جی ——— حضور اسے اپنے لڑکے کا گونا لے کر کل سندگاؤں جانا ہے ۔ اسی کی تیاری میں لگا ہے ۔

مہاجن ——— دیکھو منیم جی ! آج ہم نے زندگی میں پہلی بار اسے ایک بہت اچھا نیا جوتا پہنے دیکھا تھا تو آج رات کو جس طرح بھی ہو تم اس کا ایک جوتا غائب کر دو ۔

منیم جی ——— جوتا غائب ہو جائے گا سرکار !

مہاجن ——— اور وہ بھکیا جو ہے نا ؟

منیم جی ——— جانتا ہوں سرکار !

مہاجن ——— تم اس کا ایک بیل رات کو چپکے سے کھلوا کر ہماری سسرال کے گاؤں پہنچوا دو ———

منیم جی ——— پہنچوا دوں گا سرکار ——— !

مہاجن ——— اور صبح ہم کو یاد بھی دلا دینا ——— !

دوسرا منظر

(مرغ کی آواز مندر کی گھنٹیاں)

منیم جی ——— (آواز دیتے ہوئے) مہاراج کی جے !

مہاجن ——— (دروازہ کھولنے کی آواز) ایک بجے یا دونوں بجے ۔

منیم جی ——— دونوں قطعے فتح کر لیے ——— مگر آپ کہاں چل دیے ——— ؟

مہاجن ——— دکھیا کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے ۔

منیم جی ——— (ہنستے ہوئے) مہاراج کی جے ہو ! جے ہو !

(قدموں کی چاپ)

دکھیا ـــــ مہاراج آپ ؟
مہاجن ـــــ ہاں ! مگر ہم تمھاری آنکھ میں آنسو کیسے دیکھ
رہے ہیں ـــــ ؟ کیوں رو رہے ہو ؟ بولو !
دکھیا ـــــ (روتے ہوئے) مہاراج میں لٹ گیا ! مجھے اپنے
لڑکے کا گونا لیکر آج نند گاؤں جانا تھا ـ !
مہاجن ـــــ ضرور جاؤ ! میں بھی چلوں ؟
دکھیا ـــــ ایسے ہمارے بھاگ کہاں ؟ پرسوں رات میرا
نیا جوتا کسی نے چرا لیا ـــــ اب میں گونا لے
کر کیسے جاؤں گا ـــــ ارے میں تو کہیں کا
کا نہیں رہا ـــــ (رونے کی آواز)
مہاجن ـــــ بس اتنی سی بات، چلو جوتا میں تمھیں دوں گا۔
دکھیا ـــــ مہاراج مگر . . . . .
مہاجن ـــــ اگر نہ مگر ـــ آدمی آدمی کے کام آتا ہے ـ آج
ہم تمھارے دُکھ درد میں شریک ہوں گے تو کل
تم ہمارے میں ـ ہے نا یہ بات ؟ اسی کا نام
دنیا ہے ـ
(تیز تیز چلنے کی آوازیں)
مہاجن ـــــ منیم جی !
منیم جی ـــــ جی مہاراج !
مہاجن ـــــ دیکھو دیوار پر وہ جو جوتے کی نئی جوڑی لٹکی ہے
دے آؤ ـــ تیرتھ یاترا پر جانے کے لیے ہم نے
رکھی تھی مگر دوسرے کے وقت پر کام آنے سے
بڑی یاترا کون ہو سکتی ہے ـ
دکھیا ـــــ مہاراج آپ بڑے دیالو ہیں ـ بھگوان آپ کو
سدا سکھی رکھے ـ
مہاجن ـــــ پہنو ـــ ! دونوں پہنو !
ہاں ! ٹھیک آ گئے دونوں ـــ !
دکھیا ـــــ مہاراج ! یہ تو بالکل ٹھیٹ ہیں ـــــ پر میں
اس کے دام کہاں سے ادا کروں گا ـ

مہاجن ـــــ (ہنستے ہوئے) دیکھو بھئی اب کی فصل پر تم میرے
کھیت جوت بو، کاٹ دو ـــــ دام بھی
ادا ہو جائیں گے ـــــ بولو
دکھیا ـــــ مہاراج مگر جوتا پیٹ تھوڑی بھر سکتا ہے ـ
مہاجن ـــــ پیٹ تو ہم جوتے ہی سے بھرتے ہیں پھر ایک
وقت بھینا بھی مل جایا کرے گا
دکھیا ـــــ منظور ـ جو مرجی سرکار کی ـ
مہاجن ـــــ جاؤ اب ٹھاٹ سے گونا لے کر ـ
دکھیا ـــــ پائے لاگی !
مہاجن ـــــ خوش رہو ـ
منیم جی ـــــ بھکیا آیا ہے ـ
مہاجن ـــــ بلاؤ ـ
بھکیا ـــــ (چلا چلا کر روتے ہوئے) ہو ہو ہو ! مہاراج
میں تو لٹ گیا ! ارے اب میں کا کروں !
کوئی میرا بیل کھول لے گیا ـــــ ہو ہو ہو !
مہاجن ـــــ تسلی دیتے ہوئے ـــــ تو یہی ہو سکتا ہے
کہ ہم اپنا ایک بیل تمھیں دے دیں ـ
بھکیا ـــــ (حیرت سے) سچ ! کیسے ؟
مہاجن ـــــ ایسے کہ بھکیا ہم تمھارے آنسو نہیں دیکھ سکتے ـ
بھکیا ـــــ مہاراج آپ نے بھی دیا کی حد کر دی ـ
مہاجن ـــــ منیم جی ـ وہ ہمارا جو کونے میں بڑھیا والا بیل
بندھا ہے نا، کھول کے بھکیا کو دے دو ـ
بھکیا ـــــ سرکار بیل تو دے رہے ہیں پر اس کے دام ادا
کہاں سے کروں گا ـــــ پھوٹی کوڑی تو
گانٹھ میں ہے نا ہیں !
مہاجن ـــــ (ہنستے ہوئے) نہیں ہے تو کون سی نئی بات ہے
جہاں تم لوگوں کا ہمیشہ پورا کیا، اب یہی
کروں گا ـــــ پس بیل تمہارا مرے یا جیے
اس کے بدلے تم دس فصلیں ہماری جوت،

بو اور کاٹ دینا ــــــ ! بولو منظور !

بھکیا ــــــ منجور ! پر مالک اتنے دن کھائیں گے کہاں سے ؟

مہاجن ــــــ خیر ایک وقت چبینا دے دیا کریں گے۔

بھکیا ــــــ منجور ــــــ جو مرجی سرکار کی۔

مہاجن ــــــ جاؤ اب ٹھاٹ سے بیل لے جاؤ۔

بھکیا ــــــ پائے لاگی ــــــ !

مہاجن ــــــ خوش رہو۔

منیم ــــــ مہاراج پرانے جمیندار صاحب آئے ہیں۔

مہاجن ــــــ بلاؤ۔ بلاؤ ؟

پرانا زمیندار۔ رام رام۔

مہاجن ــــــ جے رام جی کی۔ کہو کیسے پدھارے ؟

پرانا زمیندار۔ جی۔ یوں ہی چلا آیا۔ کیا ہو رہا تھا ــــــ ؟

مہاجن ــــــ ہو کیا رہا تھا ــــــ ؟ معلوم ہوا لوگ کھیت جوتنے تک کو نہیں مل رہے ہیں، دو کو تو ٹھیٹ کر دیا میں نے ــــــ ایک کو ایک جوڑ جوتے کے بدلے ایک فصل جوتنا، بونا، کاٹنا ہوگا اور دوسرے کو ایک بیل کے بدلے دس فصلیں۔

پرانا زمیندار ــــــ (ہنستے ہوئے) جوتے اور بیل بھی تو انھیں کے ہوں گے۔

مہاجن ــــــ (ہنستے ہوئے) وہی میاں کی جوتی میاں کے سر !

پرانا زمیندار مگر یہ اندھیر ہے ناکہ ایک جوڑ جوتے اور ایک بیل پر صرف ایک اور دس فصلیں جتوا سکو گے۔

مہاجن ــــــ کیسے ؟

پرانا زمیندار۔ وہ ایسے کہ یہی دکھیا کا دادا مجھ سے دس روپے بیاج پر لے گیا تھا۔ ایک تو کاٹ کے ۹ دیے تھے ــــــ پھر اس کے دادا نے بھرے، باپ نے بھرے اور خود ۹ سال اس نے بھرے تھے۔

مہاجن ــــــ ہائے ہائے پھر میں تو لٹ گیا۔

پرانا زمیندار ــــــ اور یہ بھکیا اس کے پردادا نے کھیت رہن کھا تھا۔ اب یہ بھکیا اس کھیت کو چھڑا پایا ہے ــــــ وہ بھی پنچایت نے اسے دلوا دیا۔

مہاجن ــــــ کیوں نہیں آپ نے تو ہمیشہ حکومت کی ہے ــــــ سب داؤں گھات جانتے ہیں۔

پرانا زمیندار ــــــ جب نہ سمجھ میں آیا کرے تو پوچھ لیا کرو۔

مہاجن ــــــ یہ شور کیسا ہو رہا ہے ؟

پرانا زمیندار ــــــ ڈگی پٹ رہی ہے ــــــ کوئی اور نئی مصیبت ہوگی۔ اس سرکار نے تو جینا دوبھر کر دیا ہے۔

مہاجن ــــــ (غصے میں) ہوگا کیا ــــــ ؟ پھر اس کے پیٹ میں مزدوروں کا درد اٹھا ہوگا ــــــ منیم جی ! جاؤ سن کر آؤ یہ کیا بک رہا ہے !

منیم جی ــــــ ابھی آیا ــــــ (بھاگنے کی آواز)

(ڈگی پیٹنے کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے۔)

اعلانچی ــــــ حکم پرجا کی سرکار کا ــــــ ہر مزدور، کسان اور کاریگر بھائی کو سوچت کیا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں کسی مہاجن، بٹے پر روپیہ دینے والے، پرانے زمیندار یا کسی بھی دھنوان سے کوئی پیسہ ادھار نہ لیں۔

(ڈگی کی تیز آواز) حکم پرجا کی سرکار کا۔ کسان، مزدور بھائیو ! ــــــ اگر تم پر یا تمھارے پرکھوں پر کسی مہاجن کا کوئی قرضہ ہے ــــــ تو سرکار تمھاری بھلائی اور ترقی کے لیے اسے معاف کرتی ہے۔ کوئی شخص بھی کسی قرضے یا چیز کے بدلے تم سے زبردستی کام نہیں لے سکتا ــــــ اگر وہ ایسا

کھنے کی کوشش کرے گا تو اسے سخت سزا دی جائے گی ـــــ سرکار نے کسانوں مزدوروں کے لیے بینک کھول دیے ہیں ـــــ جو انھیں بیج، کھاد، بیل اور کھیتی و کاریگری کا سامان خریدنے کے لیے قرضہ دے گا۔

(ڈگی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

حکم پرجا کی سرکار کا ـــــ اب دیہات میں کوئی بھائی بے روزگار نہ رہے گا ـــــ لوہاری، بڑھئی گیری اور دوسرے گھریلو دھندے سکھا کر سرکار سب کو اپنے اپنے پیروں پر کھڑا کر دے گی۔

(ڈگی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

حکم پرجا کی سرکار کا ـــــ جس بھائی پر مہاجن کا جو بھی قرضہ ہو اس کے بدلے اب وہ اس سے کوئی بیگار نہیں لے سکتا ـــــ قرضے سب معاف کیے جاتے ہیں ـــــ اپنے اپنے قرضوں کی اطلاع پنچایت کو دے دیں اور سرکار کے حکم کے خلاف کسان مزدور بھائیوں کو جو دبانے کی کوشش کرے اس کی اطلاع پولیس تھانے اور قریبی حاکم کو فوراً دیں۔

(ڈگی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

حکم پرجا کی سرکار کا جس زمین کو جو کسان جوتے گا وہ اس کی ہوگی، اس کی فصل اس کی ہوگی۔

کسان مزدور بھائیو بولو۔

پردھان منتری اندرا گاندھی کی جے ہو!

زور سے بولو ـــــ فلک شگاف نعرے۔

بیس نکاتی معاشی پروگرام زندہ باد کسان مزدور زندہ باد جے جوان جے کسان۔

(تیسرا منظر)

منیم جی ـــــ "سرکار گجب ہوئے گیو ـــــ"

مہاجن ـــــ بولتا کیوں نہیں ـــــ ؟

پرانا زمیندار ـــــ بتا تو ڈگی والا کیا اعلان کر رہا تھا ؟

مہاجن ـــــ (روتے ہوئے) ارے اب بتانے کو کیا رہ گیا ہے۔

پرانا زمیندار ـــــ ہم بھی تو سنیں۔

منیم جی ـــــ سرکار نے کسان مزدوروں کے سب قرضے معاف کر دیے

مہاجن ـــــ (چھاتی پیٹ کر) ہائے غضب۔

منیم جی ـــــ اب کسان مزدور سے کوئی پابند محنت نہیں لے سکتا۔

پرانا زمیندار ـــــ تو اتنے بڑے بڑے میلوں لمبے کھیت کیا سرکار جوتے گی۔

منیم جی ـــــ اب پرجا جوتے گی ـــــ جس کھیت کو جو آدمی جوتے گا وہ اس کا ہو جائے گا۔

مہاجن ـــــ اور بٹائی پر۔

منیم ـــــ بٹائی کا کام سرکار نے ختم کر دیا۔

پرانا زمیندار ـــــ ہمارے کھیتوں کا کیا ہوگا ؟

منیم ـــــ جوت حد کے باہر سارے کھیت بے زمینوں اور مزدوروں کو مل جائیں گے۔

مہاجن ـــــ ہم لڑیں گے۔

منیم ـــــ سرکار سے کوئی لڑ سکتا ہے ـــــ ؟ اور لڑے گا کیا ـــــ ؟ کسان مزدور کو ہر طرح کا قرضہ تو اب بینک سے مل جایا کرے گا بیج لو، کھاد لو، ہل لو، بیل لو، شادی غمی کا قرضہ لو۔

مہاجن ـــــ (روتے ہوئے) اب ہمارے پاس کون پھٹکے گا۔

پرانا زمیندار۔ ہم پر دنیا ہنسے گی۔
(کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز)
مہاجن ـــــ دیکھو منیم کون ہے ـــــ ؟
منیم ـــــ آؤ انگنو بھیا ـــــ کیا ہوا ؟
انگنو ـــــ بپارے بھیا غضب ہو گیا ! کھیتوں پر جتنے مزدور آئے تھے سبھی سب چلے گئے۔
مہاجن ـــــ (غصے میں) کیسے چلے گئے۔
انگنو ـــــ اس لیے کہ اب وہ صرف اپنے کھیت جوتیں گے۔
مہاجن ـــــ اُن فلکیوں کے پاس کھیت ہی کہاں ہیں جو وہ جوتیں گے ـــــ ؟
انگنو ـــــ سرکار، بے کھیت مزدوروں کو رہنے کے لیے زمین اور کھیتی کے لیے کھیت دے رہی ہے۔
مہاجن ـــــ (مہاجن بہت غصّہ میں) ارے سرکار زمینیں لٹائے دے رہی ہے ـــــ !
انگنو ـــــ زمینیں ہی نہیں کھیتی میں کام آنے والا کل سامان بھی سرکار انھیں دے رہی ہے۔
پرانا زمیندار۔ (چلاّ کر) لالہ بھاگو گاؤں چھوڑ کر کلجگ آ گیا کلجگ !
مہاجن ـــــ دیکھو کون پکار رہا ہے ـــــ ؟ (وقفہ)
منیم ـــــ وہ حضور دکھیا کا لڑکا ـــــ آپ کے جوتے واپس کر گیا ہے۔
مہاجن ـــــ کیا کہا ـــــ ؟ جوتے واپس کر گیا ! کیسے واپس کر گیا۔ کیا لڑکے کا گونا لینے ننگے پاؤں جائے گا۔
منیم ـــــ لڑکا بتا رہا تھا کہ تھوڑے سے زنا ج کے بدلے گھمر داد اسے اُسے جوتے کی نئی جوڑی دے دی ہے۔
مہاجن ـــــ (غصّہ میں) چمار کے بچے کی یہ ہمّت۔
پرانا زمیندار ـــــ سرکار نے ذات پات کا بھید بھاؤ بھی تو اٹھا دیا ہے ـــــ اب ہم چمار کو چمار تک نہیں کہہ سکتے۔
مہاجن ـــــ اور اگر کہہ دیں تو ـــــ
پرانا زمیندار ـــــ تو جس کو کہا اُس سے معافی مانگو، اور اگر وہ نہ معاف کرے تو جیل کی ہوا کھاؤ۔
مہاجن ـــــ پھر کوئی پکار رہا ہے۔ آج کس کا منھ دیکھ کر اٹھا تھا ـــــ ہر خبر بری سنائی دے رہی ہے۔
منیم ـــــ جی وہ بھیکو نے بھی بیل واپس کر دیا۔
مہاجن ـــــ تو بھیکو بھی ہمارے کھیت نہیں جوتے گا۔
منیم ـــــ بھیکو تو بہت بڑا آدمی ہو گیا۔
مہاجن ـــــ بھیکو ۔ ۔ ۔ ۔ اور بڑا آدمی ؟ کیا بک رہے ہو ؟
منیم ـــــ گرام پنچایت نے اسے اپنا نیا پنچ چُن لیا ہے۔ گاؤں میں اس خوشی میں چوپال پر بڑا جلسہ ہے۔
مہاجن ـــــ (چلاّ کر) کیا سرکار کایا پلٹ کر کے دم لے گی۔
پرانا زمیندار کایا پلٹ تو کر دی۔
منیم ـــــ سرکار غضب ہو گیا۔
مہاجن ـــــ کوئی غضب باقی رہ گیا تھا کیا ـــــ ؟
منیم ـــــ نند گاؤں میں بھیکو کے کسی گھر والے نے بھیکو کا بیل دیکھ لیا ـــــ معاملہ رپوٹا ریپاٹ کا ہو گیا ہے۔
مہاجن ـــــ بھیکو کا بیل کہاں ہے ؟
منیم ـــــ سنا ہے پنچایت کے پاس ہے۔ اب اس کی پیشی ہے۔
مہاجن ـــــ تو کیا ہم کو جانا ہو گا۔
(بہت سی آوازیں) مہاجن چور ہے۔
"مہاجن ہیں چور !"
"چور کے گھر کی تلاشی ہو گی !"

(باقی ۴۵ پر)

وصی سیتاپوری

خاموش انقلاب

زمیں کے ذرّے ستاروں سے ہم کلام ہوئے
جو پستیوں میں رہے صاحب مقام ہوئے
وہ رند تشنگی تھی جن پر فضائے میخانہ
وہ میرے کدہ بن کر شریک جام ہوئے
حقیقتوں کی نئی صبح مسکرائی ادھر
روایتوں کے اندھیرے ادھر تمام ہوئے
ہوائے جبر سے اس طرح انتقام لیا
چراغ صبح جو تھے وہ چراغ شام ہوئے
جو فصل گل میں بھی ہنسنے کو جرم کہتے تھے
وہ دَور آیا وہی پھول شادکام ہوئے
تمام دنیا نے دیوانگی کہا جن کو
خود اپنے گھر میں تماشے وہ صبح و شام ہوئے
جنوں مزاج تشدد سے ہم کنار ہوا
یہ انقلاب شکاری ہی زیر دام ہوئے
ہوا عروج کچھ ایسا جنوں پرستی کا
نہ جانے کتنے ہی دیوانگی کے نام ہوئے
طریق عشق کو جن سے ملی ہے رعنائی
وہ کارنامے باندازِ احترام ہوئے
جو اپنے گھر میں بھی لگتے تھے اجنبی جیسے
غریب شہر وہ مقبولِ خاص و عام ہوئے
گھٹی گھٹی سی فضاؤں میں زندگی دوڑی
سکوں کی سانس ملی شادماں عوام ہوئے
ہم اعتماد قیادت یہ اس کی کرتے ہیں
کہ جس کے دَور میں فتنے سبھی تمام ہوئے

فرحت قادری

خوشگوار تبدیلی

دشت میں آبلہ پا ہو جیسے!
زندگی کوئی سزا ہو جیسے
دور تک کوئی شناسا ہی نہ تھا
یہ جہاں دشتِ بلا ہو جیسے
ہر بشر لگتا تھا تنہا تنہا
آپ ہی اپنا خدا ہو جیسے
لب پہ ہر موج تبسم زخمی
آدمی برگِ حنا ہو جیسے
چلتے چلتے کسی صحرا کی طرف
قافلہ غم کا رک سا گیا ہو جیسے
ظلمتِ شب سے اُجالے پھوٹے
معجزہ کوئی ہوا ہو جیسے
شمع احساس کی لَو تیز ہوئی
تیشہ بردار اُٹھا ہو جیسے
نبضِ افکار نے لی انگڑائی
قلب گیتی کی صدا ہو جیسے
دھوپ میں ابر کا ٹکڑا سر پر
دشت میں بادِ صبا ہو جیسے
صبح امید کی ہلکی سی کرن
کسی بچے کی دعا ہو جیسے

اداریہ

۲۰ نکاتی معاشی پروگرام

اتر پردیش کی سرگرمیاں اور کامیابیاں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اعلان کردہ نئے معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے ہر سطح پر بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس پروگرام کے تحت ایک نئی پالیسی وضع کی گئی ہے جس کا مقصد سماجی اور معاشی انصاف کا بندوبست کرنا ہے۔ چنانچہ غریبوں اور دیگر کمزور طبقوں کے حالات کو بہتر بنانے اور عام آدمی کو راحت پہنچانے کے کام کو سب سے اولیت دی گئی ہے۔

اس پروگرام کی رفتار ترقی کو تیز تر کرنے کی غرض سے ایک ریاستی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس طرح ریاست کے تقریباً ہر ضلع میں بھی ضلعی سطح کی کمیٹیاں قائم کی جا چکی ہے۔

ملک کی سب سے بڑی ریاست ہونے کی حیثیت سے اتر پردیش نے اس پروگرام کو مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اس ریاست نے غریبوں اور مراعات سے محروم افراد کی مدد کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں قیمتوں کو ایک سطح پر برقرار رکھنے، قیمتوں پر کنٹرول، ضروری اشیاء فراہم کرنے، زمین حد بندی قوانین کو نافذ کرنے، دیہی قرضوں کو بیباق کرنے، دیہی اور شہری علاقوں کی زمین کو سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، آبپاشی اور بجلی کی سہولتیں مہیا کرنے، ہریجنوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین تقسیم کرنے اور کمزور نیز قبائلی افراد کو راحت پہنچانے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے ہیں۔ طالب علموں کو غلہ، ضروری اشیاء، درسی کتابیں اور کاپیاں کنٹرول شرحوں پر فراہم کی جا رہی ہیں۔ طالب علموں کو کتب بینکوں اور لینڈنگ لائبریریوں کے توسط سے درسی کتابیں مہیا کی جا رہی ہیں

قیمتیں کم کرنے کے لیے اقدامات

غلہ اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتیں کم کرنے اور عوام کو کافی مقدار میں ان کی یقینی فراہمی کا بندوبست کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ اتر پردیش ضروری اشیا آرڈر ۱۹۷۵ء کے تحت ۳۶ ضروری اشیاء کی فروخت کو منتخب کیا گیا ہے اور ہر تھوک اور خوردہ بیوپاری کے لیے اسٹاک کی صورت حال اور ضروری اشیاء کی قیمتیں ظاہر کرنا ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان اشیاء کی فروخت قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان اشیا کی فروخت سے گریز نہیں کر سکتا ہے۔ بیوپاری کو اس قیمت سے زیادہ وصول کرنے کا اختیار نہیں ہوگا جو حکومت یا کارخانہ دار یا فراہم کنندہ نے مقرر کی ہے۔ ان احکامات کے نتیجہ میں گوشت، مچھلی، انڈے، مٹھائیوں، ترکاریوں کی قیمتیں کم ہوئی ہیں اور کپڑوں کی سلائی کی شرحوں میں بھی ۵ سے ۲۵ فیصد تک کی کمی ہوئی ہے۔

قیمتوں کے رجحان پر نظر رکھنے اور دکانوں کی باقاعدہ جانچ کا بندوبست کرنے کے لیے ہر شہر میں غیر سرکاری کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ صدر مقام پر ایک نگراں شعبہ قیمتوں کے رجحان اور ضروری اشیاء کی دستیابی پر نظر رکھتا ہے۔

ریاست کے مختلف حصوں میں سرگرم کار ۱۹۲ منڈیوں سے غلہ کے بارے میں پابندی کے ساتھ باقاعدہ اطلاعات موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکنامکس انٹلی جنس اور اعداد و شمار کے ڈائرکٹر سے ۴۳ ضروری اشیاء کی قیمتوں کے رجحان کے بارے میں اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ اس قسم کے شعبے اضلاع کے صدر مقامات پر بھی قائم کیے گئے ہیں۔

لکھنؤ میں امداد باہمی ڈیری کے دودھ کی فروخت سے متعلق ۳۰ مرکزوں کے ذریعہ روزمرہ ضرورت کی اشیاء مثلاً مکھن، ڈبل روٹی، دودھ اور انڈے فروخت کرنے کے لیے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

ریاست میں ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور اسمگلنگ کی روک تھام کے سلسلہ میں اب تک ۴۰۰ چھاپے مارے گئے اور ۱۴۱۶۱ افراد کو ڈی، آئی، آر، میسا اور دیگر قوانین کے تحت گرفتار کیا گیا۔

غلہ کی خریداری

ربیع کی غلہ کی خریداری مقررہ نشانے سے تجاوز کر گئی ہے۔ چنانچہ ۲۶ مئی ۱۹۷۶ء تک مجموعی طور پر ۱۰۰۲۲۴۸ ٹن گیہوں کی خریداری کی گئی ہے جبکہ ۱۲۰۰۰۰۰ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح ۶ لاکھ ٹن کے مقررہ نشانے کے مقابلے میں ۵۴۰۰۰۰ ٹن چاول کی خریداری کی گئی ہے جس میں لیوی دھان بھی شامل ہے۔

غلہ اور ضروری اشیاء کی تقسیم

ریاست میں ۱۶۱۳۱ سستے غلہ کی دکانوں کے ذریعہ غلہ اور شکر کی تقسیم کی جا رہی ہے۔ ان میں سے ۵۵۵۸ دکانیں شہری علاقوں میں اور ۱۰۵۷۳ دیہی علاقوں میں ہیں۔ حکومت نے جعلی یونٹوں اور کارڈوں سے نپٹنے کے لیے اتر پردیش ضروری اشیاء تقسیم آرڈر ۱۹۷۵ء کے تحت قانونی اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ اس آرڈر کے تحت جعلی یونٹوں یا کارڈوں کا تیار کرنا، انھیں اپنے قبضہ میں رکھنا اور ان کا استعمال کرنا اور سستے غلہ کی دکانوں کو شکمی حیثیت سے کرایہ پر اٹھانا قابل سزا فعل قرار دے دیا گیا ہے۔

نینی تال میں گزشتہ اکتوبر ۱۹۷۵ء سے ضروری اشیاء کی تقسیم کے لیے ایک مثالی اسکیم شروع کی گئی ہے جس کا مقصد عوام کے لیے نہ صرف ضروری اشیاء بلکہ روزمرہ استعمال کی چیزوں کی بہ آسانی دستیابی کا یقینی بندوبست کرنا ہے۔ ضلع نینی تال کے شہری اور دیہی علاقوں میں راشن کی غیر مساوی تقسیم کو ختم کر دیا گیا ہے اور اب ضلع بھر میں راشن کی فی یونٹ ماہانہ مقدار ایک کیلوگرام شکر، ۴ کیلوگرام چاول مقرر کر دی گئی ہے۔

اتر پردیش ریاستی غذا و ضروری اشیاء کارپوریشن نیشنل کارپوریشن کے فراہم کردہ کپڑے کا کاروبار بھی کر رہا ہے جس میں کنٹرول اور بغیر کنٹرول دونوں اقسام کا کپڑا شامل ہے۔

ضروری اشیاء کی فروخت کے لیے جنتا اسٹور

کارپوریشن نے اب تک ۵۰ خوردہ دکانیں قائم کی ہیں اور ۵۴٫۱۳ لاکھ روپیہ کی مالیت کا کپڑا فروخت کیا ہے۔

جانچ پڑتال اور نگرانی

ریاست میں جولائی ۱۹۷۵ء میں سستے غلہ کی دوکانوں کی جانچ پڑتال کے لیے ایک مہم چلائی گئی تھی جس کے نتیجہ میں شکر کی ۳۸۴۳ دکانیں اور سستے غلہ کی ۱۲۱۶ دکانیں منسوخ کی گئیں اور شکر کی ۱۱۲۳۶ اور سستے غلہ کی ۲۳۴۶ دکانیں معطل کی گئیں۔ خطاکار بیوپاریوں کی ۵ لاکھ روپیہ کی ضمانتیں ضبط کرلی گئی ہیں اور ۳۶۵ معاملات میں رپورٹیں درج کرائی گئی ہیں۔ ریاست بھر میں اب تک ۱۲۷۱۴۶۱۱ جعلی یونٹ منسوخ کیے جاچکے ہیں۔

ناپ اور تول کے غیر معیاری پیمانوں کے استعمال کو ختم کرنے کے لیے بھرپور مہمیں مسلسل چلائی جارہی ہیں جن کے نتیجہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور جرمانہ وصول کیا گیا اور ناپ تول کے ہزاروں غلط پیمانے بھی ضبط کرلیے گئے۔ ناپ تول کے معیاری پیمانوں کے استعمال کا یقینی بندوبست کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں منڈیوں، دیہی بازاروں اور میلوں کا احاطہ کرنے کے لیے ایک بھرپور مہم شروع کی گئی ہے۔

جوت حدبندی کا نفاذ اور فاضل زمین کی تیز رفتار تقسیم

کمزور طبقوں یعنی اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے بے زمین زرعی مزدوروں، دیگر بے زمین زرعی مزدوروں اور چھوٹے جوت داروں کے مفاد میں تمام دستیاب زمین کا استعمال ریاستی حکومت کی زرعی پالیسی کے اہم ترین پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے قوانین اور طریقہ کار کو چست بنادیا گیا ہے۔

زمین حاصل کرنے کے دو خاص ذرائع یہ ہیں۔ (۱) گاؤں سبھاؤں کی زمین (۲) حدبندی قوانین کے تحت فاضل قرار دی جانے والی زمین۔

ریاست میں یکم اگست ۱۹۷۵ء سے یکم مئی ۱۹۷۶ء تک مجموعی طور پر ۱۶۸۶۶۰۵ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔ اس میں گاؤں سبھا کی ۱۶۱۱۴۲۱ ایکڑ زمین اور حدبندی کی ۷۵۱۸۴ ایکڑ زمین شامل ہے۔ جس سے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ۱۰۵۳۰۵۷ بے زمین زرعی مزدور، ۱۵۹۴۹۴ دیگر بے زمین مزدور اور دیگر زمروں کے ۲۱۱۲۰۴ مزدور مستفید ہوئے۔

کھاتے داروں کے اختیار کردہ کچھ غلط طریقوں کا سدباب کرنے کے لیے جن کا مقصد جوت حدبندی کے مقصد کو ناکام بنانا تھا اور جوت حدبندی ایکٹ پر عمل درآمد کے دوران عمل میں آنے والی بعض خامیوں کو دور کرنے کے پیش نظر مذکورہ ایکٹ کو اور زیادہ سخت کردیا گیا۔ اس مقصد کے تحت بے نامی جوتوں اور امداد باہمی فارموں کو بھی مذکورہ ایکٹ کے دائرۂ عمل میں لایا گیا۔

تخفیف شدہ حدبندی پر موثر عملدرآمد کے پیش نظر حکومت نے حدبندی قانون کو بروئے کار لانے کے لیے ایک سہ سطحی مشینری قائم کی ہے۔ (۱) ریاستی صدر مقام (۲) بورڈ آف ریوینیو اور (۳) ضلع کی سطح پر ریاستی سطح پر جوت حدبندی اور اصلاحات آراضی سے متعلق دیگر پروگراموں کے عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لیے تین ڈپٹی سکریٹری پر مشتمل ایک اصلاحات آراضی شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ مال کے کمشنر اور سکریٹری کی نگرانی میں اصلاحات آراضی سے متعلق مختلف اسکیموں کی رفتار ترقی کے بارے میں ہر ۱۴ دن کے بعد اعداد و شمار مرتب کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک اصلاحات آراضی نگراں شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے جس کے ڈائرکٹر ایک ڈپٹی سکریٹری مقرر کیے گئے ہیں۔ بورڈ آف ریوینیو جو محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے کام کررہا ہے، مقررہ مدتی پروگرام پر عمل درآمد اور کلکٹروں کو وقتاً فوقتاً ہدایات جاری

کرنے کے لیے ذمہ دار ہے۔

اصلاحات آراضی سے متعلق اقدامات پر تیز رفتار اور موثر عمل درآمد کے لیے کابینی وزیروں بورڈ آف ریوینیو کے ممبروں اور ڈویزنل کمشنروں کو ایک ایک ضلع الاٹ کر دیا گیا ہے تاکہ اس سلسلہ میں جو کام کیا جا چکا ہے اس کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا جا سکے۔ کمشنروں کو بھی یہ ہدایات کر دی گئی ہیں کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب میں آنے والے بڑے کاشت کاروں کے خلاف جوت حدبندی کارروائی پر ذاتی طور پر نظر رکھیں۔

نئے زمین پانے والوں کو زمین کا واقعی قبضہ دلانے کے سلسلے میں ضلع مجسٹریٹوں اور سب ڈویزنل مجسٹریٹوں کو ذاتی طور پر ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ربیع کی کٹائی کے بعد ایک مہم شروع کی جائے گی۔ اس غرض سے کہ زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی تاخیر کی گنجائش نہ رہ جائے اتر پردیش جوت حد بندی قانون میں ضروری ترمیم کر دی گئی ہے۔ ضلع مجسٹریٹوں کو اب یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر ضروری ہو تو وہ زمین کے ناجائز قبضہ کو ہٹانے کے لیے طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ نئے زمین پانے والوں کو زمین کا قبضہ ربیع کی کٹائی کے فوراً بعد ہر حالت میں آئندہ ۳۰ جون تک یقیناً دلا دیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان سبھی لوگوں کو جنھیں زمین الاٹ کی گئی ہے۔ آئندہ خریف کی بوائی سے قبل ہی زمین الاٹ ہو جائے۔ نئے زمین پانے والوں کو امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ زرعی ساز و سامان مہیا کرنے کی غرض سے دو کروڑ روپیہ کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ دریں اثناء حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر زمین پانے والے کو کم سے کم ایک (معیاری) ایکڑ زمین دی جائے گی۔ نئے زمین پانے والوں سے الاٹمنٹ کی تاریخ سے تین برس تک کوئی مال گزاری نہیں لی جائے گی۔

ہریجن بستی (سبھا کرسی روڈ۔ لکھنؤ)

بے زمین اور کمزور طبقوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین

ریاست میں ۱۲۱۲۰۱۴ بے زمین زرعی مزدوروں، دیہی دست کاروں اور ہریجنوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین فراہم کی جانا تھی۔ اس سلسلہ میں ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء تک ۱۲۰۰۹۱۳ خاندانوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ جن میں سے ۱۱۸۷۹۰۰ خاندانوں کو زمین پر قبضہ مل گیا ہے۔ ہر خاندان کو ۱۰۰ سے ۱۵۰ مربع گز تک زمین دی گئی ہے۔ اس ضمن میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے گاؤں سبھا کی زمین الاٹ کی جاتی ہے اور جہاں کہیں ضروری ہو زمین حاصل کر لی جاتی ہے۔ حکومت نے مکانات کی تعمیر کے لیے نئے زمین پانے والوں کے تعلقات آراضی کو ترقی دینے کے لیے ۵۳ لاکھ روپیہ کا بندوبست بھی کیا ہے۔

پابند مزدوری کا خاتمہ

ایسے علاقوں کا پتہ لگانے کے لیے جہاں پابند مزدوری کا طریقہ رائج تھا، ایک ریاست گیر سروے کیا گیا ہے۔ اس طریقہ کو ختم کرنے کے لیے قانونی اور انتظامی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ اسی اثناء میں ریاستی حکومت

نے پابند مزدوری سے نجات دلائے گئے مزدوروں کی
بحالی کے لیے ایک اسکیم مرکز کو بھیجی ہے جس کو باہمی گفت
و شنید کے بعد قطعی شکل دے دی جائے گی۔
ضلع دہرہ دون میں کوٹا تبیلہ کے تقریباً ۱۹۰۰ افراد
کو پابند مزدوری سے نجات دلائی جا چکی ہے۔ ریاست کے
تمام تھانیداروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پابند مزدوری
کے معاملوں کی رپٹ فوراً درج کریں اور خطاکاروں کے خلاف
مقدمات قائم کرنے کے سلسلے میں کارروائی کریں۔

دیہی قرضوں کی ادائیگی سے نجات

اتر پردیش بے زمین زرعی مزدور قرضہ راحت ایکٹ
۱۹۷۵ء کے نفاذ سے ایسے زرعی مزدوروں جن کے پاس
زمین نہیں ہے یا جن کے پاس بھومی دھر، سیر دار،
اسامی یا سرکاری پٹہ دار کی حیثیت سے ایک ایکڑ سے زیادہ
زمین نہیں ہے انھیں قرض کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا گیا ہے
اتر پردیش دیہی کمزور طبقات (قرضوں کی وصولی کا التوا)
قانون ۱۹۷۵ء کے تحت بے زمین زرعی مزدوروں چھوٹے
کسانوں اور دیہی دستکاروں کے قرضوں کی وصولی ایک
سال کے لیے ملتوی کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ امداد باہمی
انجمنوں کے نئے ممبر بنا کر امداد باہمی قرضہ انجمنوں کو مستحکم
کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تقریباً ۲۳٫۱۸۱ لاکھ ممبر بنائے
جا چکے ہیں اور انہیں ۲۲٫۳۰ لاکھ روپیہ کے درمیانہ مدت
کے قرضے منظور کیے جا چکے ہیں۔ اس منصوبہ کے تحت ہریجنوں کو امداد
باہمی قرضہ انجمنوں کا ممبر بنا کر ان کے حالات بہتر بنانے پر خصوصی
توجہ دی جا رہی ہے۔ گورکھپور، دیوریا اور مراد آباد کے
اضلاع میں تین دیہی بینک قائم کیے جا چکے ہیں اور ان
میں سے ہر ضلع میں ان بینکوں کے حلقے میں کسانوں کی آٹھ
خدمتی انجمنوں کی تشکیل کی جا چکی ہے۔
کاروباری بینکوں نے ۱۳۲ اسکیمیں شروع کی ہیں جن
کے تحت کاریگروں اور دیگر افراد کو مالی امداد فراہم کی
جا رہی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر دیہی علاقوں میں بھی
۶ بینک قائم کیے جا رہے ہیں۔

کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں پر نظرثانی

ریاستی حکومت نے زرعی مزدوروں کی کم سے کم
اجرتوں پر ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء سے نظرثانی کی ہے۔ اجرتوں
کی نئی شرحیں پانچ روپیہ سے ساڑھے چھ روپیہ
کے درمیان ہیں۔

مزید آبپاشی

پانچویں منصوبہ کے دوران ریاستی آبپاشی اسکیموں
کے ذریعہ مزید ۶٫۲۷ لاکھ ہیکٹر آب پاشی صلاحیت پیدا
کرنے کی تجویز ہے۔ ۳۰ جون ۱۹۷۶ء تک ایک لاکھ ہیکٹر
رقبہ کے لیے مزید آبپاشی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کوشش
کی جا رہی ہیں۔ گولوں، پانی کی نالیوں اور ٹیوب ویلوں
کی تعمیر کے لیے مجموعی طور پر ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کی
رقم فراہم کی جا چکی ہے۔ گولوں کی تعمیر کا کام اپریل اور مئی
کے دوران بڑے پیمانہ پر شروع کیا گیا۔

پمپنگ سیٹ کے ذریعہ آبپاشی

میرٹھ ڈویژن اور ضلع علی گڑھ میں آب پاشی کی صد فیصد سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ایک اسکیم وضع کی جارہی ہے۔ تمام گولیں اور نالیاں سٹرم واٹر کے ذریعہ صاف کی جارہی ہیں۔ چھوٹے پیمانہ کے آب پاشی پروگرام کے تحت نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ موجودہ ربیع کے دوران زیر آب پاشی رقبہ میں ۱۰ءا۲۳ لاکھ ہیکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔
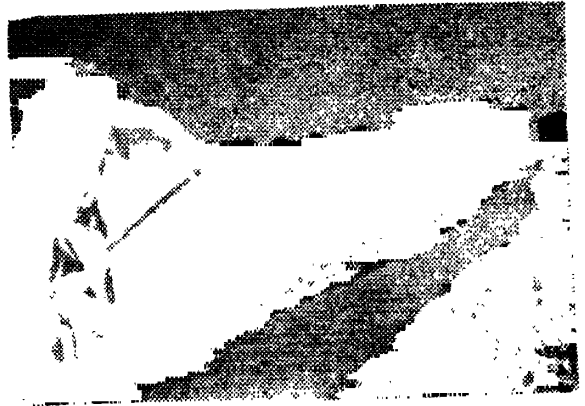
چھوٹی آبپاشی اسکیم کے تحت کھیتوں کی آبپاشی (دیوریا)

بجلی کی ترقی

موجودہ ہائیڈل اور تھرمل بجلی گھروں کی بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے متعدد اصلاحات کی گئی ہیں۔ رام گنگا کی ۶۶ میگاواٹ کی دوسری یونٹ اور پنکی تھرمل بجلی توسیعی پراجکٹ کی ۱۱۰ میگاواٹ کی پہلی یونٹ کو حتی المقدور جلد سے جلد چالو کرنے کی بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں بجلی کی بہتر صورت حال کے نتیجہ میں دیہی علاقوں میں ۲۴ گھنٹے بجلی فراہم کی جارہی ہے اور صنعتوں کی جملہ مانگ کو پورا کیا جارہا ہے۔ پانچ بجے سہ پہر سے ۹ بجے رات تک کے انتہائی مانگ کے اوقات میں بجلی کی سپلائی پر جو پابندیاں تھیں وہ مسلسل کام نہ کرنے والی صنعتوں کو

ہائی ٹینشن لائن (مئو۔غازی پور)

چھوڑکر باقی صنعتوں کے لیے ختم کردی گئی ہیں۔ تقسیم اور ترسیل کے نظام کو بہتر بنایا جارہا ہے اور ۸۰۰۰ ایسے ٹرانسفارمروں کی جگہ پر دوسرے ٹرانسفارمر مہیا کر دیے گئے ہیں جو جل گئے تھے یا چوری ہو گئے تھے

بقایاجات کی وصولی، بجلی کی چوری کی روک تھام اور صارفین کو بہتر سہولیتں مہیا کرنے کی غرض سے بڑے پیمانہ پر مہمیں چلائی گئی ہیں۔ اترپردیش بجلی بورڈ کی قرض لینے کی حد ۲۰۰ کروڑ روپیہ سے بڑھاکر ۴۰۰ کروڑ روپیہ کردی گئی ہے۔ ریاستی حکومت نے سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ، بلند شہر اور علی گڑھ میں ۱۱۵۷۵ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ریاستی بجلی بورڈ کو پانچ کروڑ روپیہ کی رقم دی جاچکی ہے۔

جہاں تک دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کا تعلق ہے ۸۹۳۲ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں، ۴۴۵ سرکاری ٹیوب ویلوں، ۲۷،۳۱۰ مواضعات اور ۸۱۲ ہریجن بستیوں کو بجلی فراہم کی جاچکی ہے۔

ہینڈلوم زمرہ کی ترقی اور بنکروں کو نئی مراعات

ہینڈلوم کی صنعت کی ترقی کے لیے ایک جامع پالیسی اپنائی گئی ہے۔ گورکھپور اور بستی میں اس صنعت کی ترقی کے لیے ایک اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت بنکروں کو خام مال، تکنیکی معلومات اور نئے ڈیزائن کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ اٹاوہ اور فرخ آباد میں ایک پراجکٹ شروع کیا جائے گا جس کے تحت ۱۰۰۰ کرگھے خریدے جائیں گے۔

ہینڈلوم کارپوریشن نے اب تک دس فروخت ڈپو قائم کیے ہیں جن کے ذریعہ ہینڈلوم کپڑے فروخت کیے جارہے ہیں۔

ہینڈلوم ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ — وارانسی

بنکروں کی تعلیمی اور عام ضرورتوں کی دیکھ بھال کے لیے جولائی ۱۹۷۵ء میں بنکر بہبود فلاحی فنڈ قائم کیا گیا ہے بنکروں کے بچوں کو کتابیں مہیا کرنے کے لیے سات کتب بینک کھولے گئے ہیں۔ اسی طرح بنکروں کے بچوں کے وظائف دینے کے واسطے ایک اسکیم تیار کی جارہی ہے۔

معیاری کپڑے کی فراہمی

اترپردیش میں کنٹرول کے کپڑے کی پھٹکر تقسیم کے لیے ۷۲۲۶ پھٹکر بکری مرکز قائم کیے ہیں۔ ان میں سے ۵۴۶۱ مرکز دیہی علاقوں میں اور ۱۷۶۵ شہری علاقوں میں ہیں۔ ان امدادِ باہمی

پھٹکر دکانوں سے جولائی ۱۹۷۵ء سے ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء تک ۴۲ء۱۸ لاکھ کروڑ روپیہ کی مالیت کا ۵۹ء۰ کروڑ میٹر کنٹرول کا کپڑا صارفین کو فروخت کیا گیا۔

کنٹرول کپڑے کی تقسیم کے سلسلہ میں مقدارِ آمدنی اور جوت کے رقبہ سے متعلق تمام پابندیاں ختم کردی گئی ہیں دیہی علاقوں میں نیائے پنچایت میں کم سے کم ایک پھٹکر دکان قائم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ شہروں کے ایسے محلوں میں، جہاں مزدوروں، ہریجنوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقہ کے لوگوں کی زیادہ آبادی ہے۔ پھٹکر دکانیں قائم کرنے کے اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔

غذا اور ضروری اشیاء کارپوریشن نے بھی ۵۰ فروخت مرکز قائم کیے ہیں۔ ان مرکزوں نے ۳۱ لاکھ ۴۵ ہزار روپیہ مالیت کا کنٹرول کا کپڑا فروخت کیا ہے۔

ٹیکس چوری کی روک تھام اور معاشی مجرموں کو سزا

اترپردیش میں ٹیکس چوری کی روک تھام اور معاشی جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا دینے کے سلسلے میں متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری کرنے والوں اور اسمگلروں کے خلاف جون ۱۹۷۵ء سے ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء تک ۴۴۷۷ چھاپے مارے گئے اور ۲۵۲ رپورٹیں درج کرائی گئیں۔ قانون دفاع ہند اور ضروری اشیاء قانون کے تحت ۲۴۱۳ معاشی مجرموں اور ۳۴۲۶ سماج دشمن عناصر کو گرفتار کیا گیا۔

صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت

صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت سے متعلق اسکیم جو حکومت ہند سے موصول ہوئی ہے ایسے تمام سرکاری امداد باہمی اور نجی اداروں میں بروئے کار لائی جارہی ہے جہاں ۵۰۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ اس اسکیم کو مجموعی طور پر ۱۶۰ اداروں (سرکاری زمرہ کی ۵۵، اور نجی زمرہ کی ۱۰۵) میں سے اب تک سرکاری زمرے

کی ۳۴ صنعتوں اور نجی زمرہ کی ۱۰۱ صنعتوں میں بروئے کار لایا جا چکا ہے جہاں ۵۰۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں، ریاستی حکومت نے نجی اور سرکاری زمرہ کے باقی ۱۷ واحدوں میں بھی مقررہ مدت کے اندر اس اسکیم کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

طالب علموں کو کنٹرول نرخ پر ضروری اشیاء کی فراہمی

ریاست کے ۱۲ بڑے شہروں میں ڈگری کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے ہاسٹلوں اور منظور شدہ اقامت گاہوں میں طالب علموں کو غلہ اور دیگر ضروری اشیاء تھوک قیمتوں پر فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ رڑکی اور پنت نگر یونی ورسٹیوں کو محکمہ جنگلات کی جانب سے جلانے کی لکڑی کی مسلسل فراہمی جاری ہے۔ ان دونوں یونی ورسٹیوں کی بیکریوں کو میدہ بھی فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس اسکیم سے مجموعی طور پر ۴۵۸۱۱۱ طلباء مستفید ہو رہے ہیں۔

ریاست کے تمام قصبوں اور شہروں میں دیگر اداروں کے طالب علموں کو ادارہ جاتی کارڈ جاری کر دیے گئے ہیں جن پر چاول× گیہوں، شکر اور مٹی کا تیل مہیا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام طلباء اپنے راشن کارڈوں پر گیہوں، چاول شکر اور مٹی کا تیل حاصل کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ طالب علموں کو ضروری اشیاء فراہم کرنے کی غرض سے لکھنؤ، گورکھپور، وارانسی، میرٹھ اور کمایوں یونی ورسٹیوں میں امداد باہمی گودام قائم کیے گئے ہیں۔ اس قسم کے گودام دیگر یونی ورسٹیوں اور ڈگری کالجوں میں بھی قائم کیے جا رہے ہیں۔ ان انتظامات سے طالب علموں کو آسانی کے ساتھ کنٹرول نرخ پر ضروری اشیاء حاصل کرنے میں کافی مدد ملی ہے اور مطبخ کے اخراجات بھی کم ہو گئے ہیں۔

کنٹرول قیمت پر کتابیں اور اسٹیشنری

ریاست میں قانون دفاع ہند کے تحت ایک حکم کے ذریعہ جولائی ۱۹۷۵ء میں تقریباً ۱۵۰۰ کتابوں کی قیمتیں مقرر کی گئیں جس کے نتیجہ میں بیشتر کتابوں کی قیمتیں ۲۰ سے ۳۰ فی صد تک کم ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۶-۷۷ء کے لیے بھی کتابوں کی قیمتوں کو منضبط کرنے کی کارروائی کی جا رہی ہے۔

حکومت نے منظور شدہ کتابوں کی کلچرل ورائٹی کے کاغذ کے علاوہ دوسرے کاغذ پر طباعت بھی قانوناً ممنوع قرار دے دیا ہے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے تعلیمی سال کے دوران مرکزی حکومت سے موصول ہونے والے ۹۰۰ ٹن کاغذ کے کوٹہ سے کاپیاں تیار کر کے طالب علموں کو مہیا کی گئیں۔ پہلے سے آٹھویں درجے تک کی درسی کتابوں اور نویں سے بارھویں درجوں تک کی ہندی کی نصابی کتابوں کو قومیا یا جا چکا ہے۔ اسی طرح نویں اور دسویں درجے کی انگریزی کی نصابی کتابیں بھی آئندہ تعلیمی سال سے قومیائی جائیں گی۔ اس کے بعد ریاضی اور سائنس کی کتابیں بھی قومیائی جائیں گی۔ ہر کاپی کی پشت پر ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام شائع کیا گیا ہے تاکہ طالب علموں کو اس پروگرام سے متعارف کیا جا سکے۔

سماج کے کمزور طبقوں کے پہلے درجہ سے پانچویں درجہ تک کے طالب علموں کو درسی کتابیں مفت فراہم کی گئیں جس سے دیہی علاقوں کے ۴۳۰۰۰ طالب علم اور شہری علاقوں کے ۱۰۰۰۰ طالب علم مستفید ہوئے ہیں۔ بیسک اسکولوں کے ایک لاکھ سے زیادہ طالب علموں کو ۱ لاکھ روپیہ کی سائنس کی کتابیں فراہم کی گئیں۔ مستقل طور سے ملحق ۲۶۰ ڈگری کالجوں میں سے ۲۳۱ کالجوں میں کتب بینک قائم کیے گئے ہیں۔ اور باقی کالجوں میں بھی جون ۱۹۷۶ء تک کتب بینک قائم کر دینے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ آئندہ تعلیمی سال سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں بھی ایک کروڑ روپیہ کی تخمینی لاگت سے کتب بینک قائم کرنے کی ایک اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

آصف نظامی طاہرپوری

ارتقا کا زینہ

قطعات

دیکھ کر حیران ہیں سب تیرا حسنِ انتظام
بڑھ گیا ہر ایک دل میں اور تیرا احترام
اے جواہر لال کی بیٹی ترا عزم و عمل
تونے برہم کر دیا جاگیردارانہ نظام

بے گھروں کو گھر ملے منسوخ قرضہ ہوگیا
اور زمینیں دی گئیں ہیں بے زمیں افراد کو
ہیں مگن اپنے وطن کے آج سب پچھڑے ہوئے
شادمانی مل رہی ہے آج ہر ناشاد کو

بے زمیں کھیتی کا اور بے گار کا ٹوٹا طلسم
آبپاشی کی سہولت میں اضافہ ہوگیا
ٹیوب ویلوں اور صنعت کے لیے بجلی بڑھی
اور بندوبست سرمائے کا اچھا ہوگیا

گاؤں کی خوشحالیاں بھی ہونگی شہروں کی طرح
شادمانی ہوگی حاصل اب ہر اک رنجور کو
اب سہولت ہر طرح کی پائیں گے مفلس عوام
کوئی دقت بھی نہ پیش آئے گی اب مزدور کو

سربلندی اور حاصل ہوگی اپنے دیس کو
ارتقا کا ایک زینہ ہیں یہی بیسوں نکات
ہوگا ہر سو شادمانی اور خوشحالی کا دور
اب عوام الناس پائیں گے غریبی سے نجات

کھلاپتے سہائے ماہر بلگرامی

زندہ باد

زندہ باد اے اندرا، اے فخرِ بھارت زندہ باد
زندہ باد اے افتخارِ ملک و ملت زندہ باد
زندہ باد اے پیکرِ عزم و شجاعت زندہ باد
زندہ باد اے محرمِ رازِ سیاست زندہ باد

تو بہن بھی، ماں بھی، بیٹی بھی وزیر اعظم بھی ہے
غم کے ماروں کے دلوں کے زخم کا مرہم بھی ہے

رشوت و کنبہ پرستی و گرانی و فساد
دیکھ کر حالاتِ ہنگامی "برائے انسداد"
بیس نکتوں کی چلا دی تو نے تحریکِ مفاد
فصد دے دے کر بہے رد کا خون میں بڑھا فساد

عرصۂ اک سال میں اس پُر اثر اقدام نے
جو ترقی کر دکھائی وہ ہے سب کے سامنے

آج پورے اوج پر ہے ارتقا کا آفتاب
لہلہاتے کھیت ہیں شاداب کیاری میں گلاب
بیٹھ چکے ہیں نہ ہونٹوں پر وہ شورِ انقلاب
لے چکا ہے آخری ہچکی بغاوت کا شباب

دور اب منزل نہیں کہتے ہیں یہ بڑھتے قدم
ہو سلامت یہ قیادت ہم پہ یہ تیرا کرم

ہر نفس تیرا ترقی وطن کا سنگِ میل
ارتقائے قوم کے خاطر کی تو نے ہر سبیل
ذاتِ عالی ہے حصارِ ملک کے گرد اک فصیل
جس نے ٹکر لی گرا وہ سر کے بل ہوکر ذلیل

لکشمی بائی کا تو نے نام اونچا کر دیا
رہ گیا باقی تھا جو وہ کام یہ پورا کر دیا

پیار کے انداز بھی ہیں وار بھی تلوار کے
سب ہیں ششدر دیکھ کر جوہر ترے کردار کے
قوم کو آگے بڑھانے خواہشوں کو مار کے
کل کی خاطر آج سے آثار ہیں ایثار کے

ہے دعا ماہر کی جیتے جی رہے تو یونہی شاد
زندہ باد اے رہنمائے ملک و ملت زندہ باد

رتن سنگھ

امید کی کرن

(افسانہ)

صرف ہمارا گھر ہی نہیں بلکہ سارا محلہ اور ایک طرح سے کہا جائے تو پورا شہر ہی نہیں، تمام شہر، سارے قصبے اور گاؤں یا یوں کہیے کہ پورا ملک ہی چوہوں کی یلغار سے عاجز تھا۔ چوہوں کی وجہ سے حالات کس قدر سنگین ہو گئے تھے، اس کا تھوڑا بہت اندازہ آپ ہمارے گھر میں چوہوں کی مچائی ہوئی تباہی سے لگا سکتے ہیں۔

پہلے تو یوں سمجھ لیجیے کہ چوہوں کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ہمارے باورچی خانے میں ہوتا تھا۔ آدمی کو بھی شاید ڈبوں کے ڈھکن کھولنے میں دقت ہوتی ہوگی، لیکن ہمارے گھر میں بسیرا لینے والے یہ چوہے اتنی چابکدستی اور ہوشیاری سے ڈھکن کھول کر دالیں، چاول، چینی، گڑ، آٹا وغیرہ چٹ کر جاتے تھے کہ کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہوتا یہ تھا کہ آج چوہوں نے ڈبہ گرا کر دو کلو تیل فرش پر گرا دیا ہے تو دوسرے دن پتہ چلا کہ بچے صرف اس لیے پھیکی چائے پی رہے ہیں، کہ چوہوں نے شکر کے ڈبے میں پیشاب کر کے اسے کھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ پھر یہ کہ آٹے کے کنستر میں گھس کر مینگنیاں کر دی ہیں۔ نعمت خانے کی لوہے کی جالی کاٹ کر اس میں سے دودھ کو صفاچٹ کر گئے ہیں جو دہی جمانے کے لیے رکھا گیا تھا۔

جہاں ایک طرف یہ خطرہ رہتا تھا کہ چوہوں کا جھوٹا کھا لینے کی وجہ سے کہیں طاعون یا کسی دوسرے مہلک مرض کا شکار نہ ہو جائیں وہاں ان چوہوں کی وجہ سے ہر وقت کہیں نہ کہیں کھٹر پٹر ہوتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے نہ رات کو چین سے سونے کو ملتا تھا اور نہ دن کو آرام۔

باورچی خانے میں ہونے والے نقصان کی تلافی تو خیر آدمی کسی طرح کر ہی لیتا یا اس نقصان کو برداشت کر لیتا، لیکن جب گھر کے دوسرے حصّوں میں چوہوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں، تو زندگی ہی اجیرن ہو گئی۔

پتہ چلا کہ آج شیکسپیئر کے سر کو چاٹ گئے ہیں تو کل کالی داس کی شکنتلا کو عین اس وقت نیند سے اچاٹ کر دیا جب ڈشینت کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک کر اس کی ایک پل کے لیے آنکھ لگی تھی۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ہمارے بڑے لڑکے نے حساب کے جو سوالات بڑی مشکل سے حل کر کے میز پر اس غرض سے رکھے تھے کہ صبح امتحان کے لیے جانے سے پہلے ان پر ایک نظر ڈال لے گا، وہ کاغذ بھی ندارد ہے۔ کاغذ گم دیکھ کر بھائی بہنوں میں خوب جم کر لڑائی بھی ہوئی۔ بھائی کہتا تھا۔ تم لوگوں نے میرے کاغذ لاپرواہی سے کوڑے میں پھینک دیے ہیں اور بہنیں کہتی تھیں کہ انھوں نے کاغذ دیکھے تک نہیں۔ آخر کافی دنوں بعد پتہ چلا کہ وہ کاغذ چوہوں کی بل کے اندر پائے گئے۔ انھیں ان حساب کے سوالوں کی کیا ضرورت درپیش تھی اور وہ ان کو کیوں اچک لے گئے تھے یہ سوال ابھی تک ہم لوگ

حل نہیں کر پائے۔

یہی حال گھر کے کپڑوں لتّوں کا تھا۔ آج اُوور کوٹ کی جیب کتر گئے۔ تو کل بیوی کے اکلوتے دوپٹے پر چوہوں نے رات بھر ایسے ایسے نقش و نگار بنائے کہ دوپٹے میں دن کو تارے دکھائی دینے لگے۔

غرضیکہ اِن چوہوں کی وجہ سے کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ خواہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا پہننے اوڑھنے کی۔ یہاں تک کہ چمڑے کے سوٹ کیس، بستر بند، لحاف، رضائیاں، کوئی چیز ایسی نہیں تھی جن پر چوہوں نے اپنے دانتوں کی آزمائش نہ کی ہو۔

ہمارا گھر اُن چوہوں کے لیے ایک ایسے مقبوضہ علاقے کی طرح تھا کہ جیسے ان چنگیزوں نے فتح کرنے کے بعد بڑی بے رحمی سے لوٹا ہو۔ گھر کی ایک ایک چیز کو اُلٹ پلٹ کر نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا تھا۔ یوں سمجھیے کہ اِن ظالم فاتحوں نے ہمارے گھر کی ایک طرح سے' اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

یہی نہیں کہ ان کی وجہ سے صرف گھر کی چیزوں کو ہی نقصان پہنچا تھا بلکہ گھر کے مکینوں کے ذہنوں پر بھی یہ چوہے بُری طرح مسلط رہتے تھے۔ ادھر آدھی رات کے وقت چوہوں نے کھٹر پٹر شروع کی اور ادھر سارا گھر اس وہم میں جاگ کر بیٹھ گیا کہ یا خدا کہیں ہمارے گھر میں چور تو نہیں گھس آئے۔ پھر کافی کھسر پھسر اور صلاح مشورے کے بعد ہاتھوں میں ڈنڈا اٹھائے ہم بڑی ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے سہمے سہمے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولتے تو پتہ چلتا کہ چور تو کہیں نہیں ہاں چوہوں کی فوج تھی، جس نے یلغار کر دی تھی۔

ایسا نہیں کہ اِن چوہوں کو گھر سے نکالنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ کئی بار دیواروں میں بنے ہوئے ان کے بِل اینٹوں کے روڑے پھر پھر کر اور اوپر سیمنٹ لگا لگا کر بند کیے لیکن دوسرے روز ہی پتہ چلتا کہ انھوں نے دیوار کے کسی دوسرے گوشے میں نقب لگا لی ہے۔

جب ہم اِن چوہوں کو گرفتار کرنے کے لیے چوہے دان لے آئے تو پتہ چلا کہ چوہے زیادہ بڑے اور موٹے ہیں اور ہمارا چوہے دان چھوٹا ہے اور پھر یہ کہ وہ اتنے ہوشیار ہیں کہ چوہے دان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اگر چوہے مار دوا کی گولیاں ڈالتے تو کبھی کبھی ایک آدھا چوہا مردہ پایا جاتا لیکن وہ کمبخت کسی ایسی جگہ جا کر مرتا کہ وہاں سے اس کی لاش کو نکالنا ممکن نہ ہوتا۔ نتیجے کے طور پر ہفتوں اُس کی بدبو ہماری زندگی کو دوبھر بنائے رہتی۔ پھر یہ کہ مرتا تو ایک چوہا اور دوسرے دن اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے چار چوہے اور پیدا ہو جاتے

آخر جب ان چوہوں کے روز روز کے ظلم سہتے سہتے ایک مدت ہو گئی اور نہ صرف یہ کہ ہمارے گھر کی حالت بگڑی بلکہ ہمارے سارے محلّے، پورے شہر اور سارے ملک میں لوگ جگہ جگہ اِن چوہوں کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے تو آخر قومی پیمانے پر سرکار کو سوچنا پڑا کہ اگر اِن چوہوں کی یلغار کو نہ روکا گیا تو یہ چوہے ملک اور قوم کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔

مزید تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ ہمارے ہاں چوہوں کی کچھ ایسی تنظیمیں بھی ہیں جو منظم طور پر یہ کوشش کر رہی ہیں، کہ حکومت کا تختہ پلٹ دیا جائے تاکہ عوام کو پوری طرح لوٹنے کھسوٹنے کے لیے انھیں پوری آزادی مل جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے چوہوں کی کچھ ایسی غیر ملکی تنظیموں سے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا جو ساری دنیا میں حکومتوں کو گرانے کے لیے بڑی تجربہ کار اور ہوشیار سمجھی جاتی ہیں۔

اور پھر یہ ہوا کہ قومی سطح پر اِن چوہوں کی دھڑ پکڑ شروع ہوئی۔ بڑے بڑے موٹے چوہے جو قوم کی دولت کو مالِ مفت دلِ بے رحم کی طرح چوری چھپے کھا کھا کر موٹے ہو رہے تھے پکڑ کر بڑے بڑے آہنی چوہے دانوں میں بند کر دیے گئے۔

جب ان کے بلوں کی تلاشیاں لی گئیں تو ان کے اندھیرے تہہ خانوں میں کیا کچھ نہ ملا۔ اناج اور کپڑے کے گودام ملے۔ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے ذخیرے ملے۔ اور کروڑوں کی تعداد میں روپیہ ملا۔

سنتے ہیں کسی ملک میں جب لوگ چوہوں سے بے حد عاجز آگئے تھے تو ایک جادوگر آیا تھا وہاں۔ اس کے سر پہ عجیب وضع کی لمبی سی ٹوپی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی لمبا سا بانس کا ساز تھا۔ اس جادوگر نے جب وہ عجیب و غریب ساز بجایا تھا تو اس کی آواز کو سن کر سارے چوہے ناچتے کودتے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ پھر آگے آگے چلا تھا وہ جادوگر اپنا ساز بجاتا ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے سارے ملک کے چوہے اپنی دُمیں ہلاتے ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جادوگر ساز بجاتا ہوا ایک دریا میں اُتر گیا۔ اور اس کے پیچھے سارے چوہے بھی دریا میں اتر گئے۔ جادوگر تو تیر کر دوسرے کنارے جا لگا، لیکن سارے چوہے اس دریا میں ڈوب گئے اور اس طرح اس ملک کو چوہوں سے نجات ملی تھی۔

یہ واقعہ تو خیر بہت پرانا ہے۔ اور کسی دوسرے ملک کا ہے۔ اسی نوعیت کا جو واقعہ ہمارے ہاں ہوا ہے وہ تو اس تاریخی واقعے سے بھی کئی معنی میں سبقت لے گیا ہے۔ وہاں تو صرف ایک ہی آدمی نکلا تھا۔ ان چوہوں کو ختم کرنے کے لیے۔ لیکن یہاں تو پوری قوم ہی جیسے ان دیش دشمن چوہوں سے صف آرا ہونے کے لیے نکل پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہمارے سیدھے سادے عوام نے بانسوں کو تراش کر کوئی ساز بنا لیا ہے۔ اور پھر اس وجہ میں انھوں نے کوئی ایسا سحر پھونکا کہ تمام چوہے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دریاؤں میں ڈوب گئے۔ کچھ ستلج و بیاس میں ڈوب گئے، کچھ گنگا و جمنا میں غرق ہو کر رہ گئے اور جو بچے تھے ان کو نربدا اور گوداوری کی لہریں کھا گئیں۔

اس طرح جا کر ہمیں ان موٹے دیش دشمن چوہوں سے نجات ملی ہے جن کی وجہ سے ہماری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔

★

۲۰ نکاتی معاشی پروگرام : صفحہ ۳۳ کا بقیہ

اپرنٹس شپ اسکیم

ریاستی حکومت اس پر مسلسل کڑی نظر رکھتی ہے کہ اسامیوں کو پُر کرنے میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، پسماندہ طبقوں، معذور افراد، خواتین اور اقلیتی فرقوں اور دیگر کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے اپرنٹسوں کو مناسب نمائندگی دی جا رہی ہے۔ اپرنٹس شپ ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزی کرنے والے آجرین بھی چھ ماہ کی قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں سزاؤں کے مستوجب ہوں گے۔

اس قانون کی سختی سے نفاذ کے سلسلے میں پوری پوری نگرانی رکھی جاتی ہے، اب تک ۱۸۹ آجرین کے خلاف مقدمات دائر کیے گئے، جن میں ۷۸ آجرین کو سزا ہوئی اور باقی مقدمات زیر سماعت تھے۔

مجموعی طور پر ۴۲۷۳ اداروں میں ۱۰۳۰۰ اسامیوں کا تخمینہ چلا جن میں سے ۱۰۱۷ اسامیاں اپرنٹسوں کو دی گئیں۔ ان میں اقوام مندرجہ فہرست کے ۴۳۶، قبائل مندرجہ فہرست کے ۶۲، جسمانی طور پر معذور ۱۰، اقلیتی اور کمزور طبقہ کے ۲۹۵، اور ۱۵ خواتین اپرنٹس شامل ہیں۔

★

شاغل ادیب

اندرا انقلاب

(ایمرجنسی اور شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی نفاذ ہونے کے پس منظر میں کہی گئی نظم)

قدم قدم پہ گھنا نامراد سایا تھا
ہر ایک راستہ تاریکیوں میں ڈوبا تھا

جگہ جگہ تھے چھپے اس میں قاتل تہذیب
بنام خدمت بھارت تھی ہر جگہ تخریب

غریب خون سے امرا کی شمعیں تھیں روشن
تمام دیس کو لوٹے چلا تھا کالا دھن

کوئی جیے کہ مرے، تاجروں کو کیا پرواہ
فقط ذخیرۂ اجناس پر تھی ان کی نگاہ

ملازموں کی وفاداری کا عجب تھا حال
مطالبات تھے بے جا، تو تھی کبھی ہڑتال

بشر کے روپ میں راون تھے گام گام چھپے
ردائے عصمت جمہور لوٹنے تھے چلے

انھیں تھی آس فقط اقتدار پانے کی
انھیں تھی حرص و ہوس سلطنت چلانے کی

ہر اک سو آگ سی دہکا رہے تھے دیوانے
عوام و فوج کو بہکا رہے تھے دیوانے

اس انقلاب کو اک "اندرا انقلاب" کہو
یا اس کو سوشلزم کی نئی کتاب کہو

گھنے گھنے سے اندھیرے اجالوں میں بدلے
فساد شر کے اکھاڑے شوالوں میں بدلے

پیام دوستی ہر ایک لب پہ عام ہوا
تمام لوگوں کا اک بھارتی میں نام ہوا

تمام ملک کے بندہ نواز، بندے بنے
امیر سارے، غریبوں کی صف میں آ ٹھہرے

ہے جنس جنس مہیا سبھی دکانوں میں
ہے پیٹ پیٹ بھرا آج سب مکانوں میں

ملازم اہل وفاداری سے ہوئے مانوس
عمل سے کیے کام تم نے، بھارت میں جل اٹھے فانوس

ہے کالے دھندے کا منھ کالا اور سیر ابھی کرتی
سماج دشمنوں کی زیست بھی حرام ہوئی

وہ جو کہ عصمت جمہور لوٹنے تھے چلے
وطن کے قدموں پہ اب گر کے کرتے ہیں سجدے

خوشا خوشا کہ کرشمہ عجیب دکھلایا
سبق دوانوں کو بروقت تم نے سکھلایا

تمھاری عقل و فراست کا کچھ جواب نہیں
تمھاری اپنی سیاست کا کچھ جواب نہیں

تمام ہند کی خاتون اولین ہو ..... تم
ہمیں ہے ناز کہ مردوں سے بھی ذہین ہو تم

تمھارے دم سے ہے محفوظ ورثۂ قومی
حیات، قوم و وطن کو نئی تمھیں سے ملی

نفاذ گر نہ ایمرجنسی کا کیا ہوتا
نہ جانے قوم کا بھارت کا حشر ہوتا کیا

تمھارا ایک اک اقدام قابل تحسیں
تمھارے بیس نکات اپنی زندگی کے امیں

انھیں نکات میں مضمر ہے اپنا مستقبل
یہی نکات ہیں اپنے نصیب کا حاصل

انھیں نکات سے ابھرے گا نام بھارت کا
انھیں نکات سے چمکے گا کام بھارت کا

عارف عزیز قدوائی

ایمرجنسی کی دین

بدترین سے بدترین مخالف بھی زبان سے نہ کہے لیکن اپنے دل کے نہاں خانے میں یہ ضرور محسوس کرے گا کہ ہنگامی حالات کا اعلان ہونے کے بعد سے ایک سال کے اندر ہندوستان میں ایک ننھا انقلاب (MINI REVOLU-TION) آچکا ہے اور یہ کہ اس کی چھاپ قومی زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر آرہی ہے۔ یہ چھاپ دھندلی تو نہیں البتہ اسے اور زیادہ واضح کرنے کی ضرورت بلاشبہ ہے۔ ایک ایسا مکمل انقلاب لانے کے لیے جو ہر گوشے کا احاطہ کرسکے ضروری ہے کہ ان نقوش کا رنگ شوخ سے شوخ تر ہو۔ خوب سے خوب تر کی جستجو اور جد و جہد بہر حال جاری رہنا چاہیئے۔

وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کو بجا طور پر سماجی۔ معاشی ترقی کا منشور قرار دیا گیا ہے۔ اس کی کلیدی اہمیت ضرور ہے لیکن یہ حرف آخر نہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اندرا جی نے پروگرام کو وسعت دینے کے لیے کچھ اور نکات کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں قومی یکجہتی۔ خاندانی منصوبہ بندی۔ شجر کاری۔ بچوں کی بہبود اور شہری ترقیات کو بھی قابل ترجیح بتایا ہے بہر کیف کسی بھی پالیسی یا پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔

قدیم ترین سیاسی مفکروں نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ مملکت کا کام چلانے کے لیے کسی قدر جبر ضروری ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو راہ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں ہیں کسی قدر جبر کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ جبر شر کے لیے نہیں بلکہ خیر کے لیے ہے۔ یہ وہ نشتر ہے جس کا مقصد عمل جراحی کے ذریعہ فاسد مادے کو خارج کرنا ہے جو لوگ بدنظمی اور بد دیانتی جاری رکھنے پر مصر ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان مخالف اور غیر ذمہ دار عناصر کے آلۂ کار بن رہے ہیں جنھوں نے ملک کو تباہی کے دہانے تک پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت انقلاب لانے کے لیے مزاج سازی کی بڑی اہمیت ہے۔ سارے چمن پر بہار آسکتی ہے بشرطیکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتہ سنوارا جائے۔ ایمرجنسی نے لوگوں کو وقت کی پابندی سکھائی ہے۔ دفتروں کے حالات نے خوشگوار کروٹ لی ہے۔ کارخانوں میں ہڑتالیں نہیں ہوتیں۔ تالہ بندی اور ٹھکی کی نوبت نہیں آتی اس لیے پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ شہروں میں سڑکیں زیادہ صاف ستھری نظر آتی ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر ہٹ گئے ہیں، ٹریفک کے قواعد کی پابندی سختی سے کرائی جاتی ہے، بدمعاشوں اور گنڈوں کو پکڑ کر بند کر دیا گیا ہے، جرائم کی زیادہ موثر روک تھام پر توجہ کی جارہی ہے، معاشی بداعمالی کے مرتکب لوگوں اور ٹیکس ماروں کو عدالت میں گھسیٹ لایا گیا ہے یا جیل پہنچا دیا گیا ہے، غرضیکہ مختلف محاذوں پر خوشگوار تغیر و تبدل کے آثار خاصے نمایاں ہیں۔

ایمرجنسی ظاہر ہے کہ دائمی چیز نہیں ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایمرجنسی ہٹنے کے بعد بھی نظم و ضبط کا موجودہ ماحول برقرار رہے گا اور لوگ نکمے پن، کاہلی اور لاپرواہی کے پرانے رویہ پر واپس نہیں جائیں گے۔ بہترین صورت تو وہی ہوتی ہے کہ لوگ از خود کچھ پابندیاں اپنے اوپر عائد کرلیں اور اپنا کردار ایسا بنالیں جو ملک کی ترقی کے لیے معاون ثابت ہو سکے لیکن جب لوگ خود اپنا محاسبہ کرنے پر تیار نہیں ہوتے تو حکومت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ محاسبہ کرے۔ ایمرجنسی ایسا سیلاب ہے جو گزر جانے کے بعد زرخیز زمین چھوڑ جائے گا۔

مزاج سازی اور کردار سازی کے سلسلۂ عمل میں حکومت کی جانب سے کچھ اور کارروائیاں کی جارہی ہیں۔ ان میں اہم ترین یہ ہے کہ بنیادی

فرائض اور ذمہ داریاں آئین کی زینت بنیں گی۔ شہریوں پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عاید کرنے کی تجویز ہے ان میں ہندستان کے اتحاد اور سالمیت کو برقرار رکھنا، امن وامان قائم رکھنا، ڈسپلن پر عمل پیرا ہونا اور عوامی املاک کی حفاظت کرنا شامل ہوگا۔ یہ ایک منفرد اور مثبت اقدام کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی حیثیت مرض کی صحیح تشخیص اور صحیح علاج کی ہے۔

وزیر اعظم نے اپنی ایک حالیہ تقریر کے دوران رجائیت اور قنوطیت کے مابین راستہ اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ چھوٹی پہاڑیاں سر کرلی گئی ہیں لیکن بڑے پہاڑوں کو سر کرنا باقی ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگرام پر تسلی بخش رفتار سے عمل ہوا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو مکمل کرکے اور آگے بڑھایا جائے۔ جو ملک کسی زمانے میں بہت بڑے کہے جاتے تھے وہ آج ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ برطانیہ کی مثال سامنے ہے۔ نئی نئی طاقتیں ابھر کر میدان پر میدان مار رہی ہیں۔ ہندستان بھی اپنی وسیع افرادی طاقت اور معدنی وسائل سے ترقی کی اس دوڑ میں نہ صرف شریک ہے بلکہ بہتوں سے آگے نکل چکا ہے۔ فوری مسئلہ انسانی وسائل کے بھرپور استعمال کا ہے جسے حل کرنے میں ایمرجنسی سے بڑی مدد مل رہی ہے۔ کاہلی، نااہلی اور نکمے پن کے دن لد گئے۔ پیداوار بڑھانے پر پوری توجہ مرکوز ہے۔ یہ سلسلہ عمل پوری تندہی، لگن اور قوت سے جاری رہنا چاہیے۔

بے زمین کسانوں کو زمین کے الاٹمنٹ کے موقع پر حکومت کے ذریعہ زرعی آلات اور عمدہ بیجوں کی تقسیم

افسردہ دل ساری انجمن کو افسردہ بنا دیتا ہے۔ یہی حال قوم اور ملک کا ہوتا ہے۔ متوازن ترقی کی ضرورت کا خاص خیال ایمرجنسی میں رکھا جا رہا ہے۔ بے زمین افراد کو زمین، زرعی آلات اور بیج فراہم کرنے پر خصوصی توجہ اسی لیے دی جا رہی ہے کہ خوش حالی کے سمندر میں بے اطمینانی محرومی اور مایوسی کا کوئی جزیرہ نہ رہنے پائے۔ انصاف کا یہی تقاضا ہے۔

غلام محمد انور سلونوی

اے رہبر ہندوستاں

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

دیش بھر میں ہے تری تدبیر کا سکہ رواں — ہر کس و ناکس کے دل پر ہو تو ہی تو حکمراں
حاکم و محکوم پر عائد ہوئیں پابندیاں — ختم ہونے کو تریں ہیں اپنی سب مجبوریاں

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

ایکتا کی مسکراتی جاگتی تصویر ہے — اہل بھارت کے لیے یہ باعث توقیر ہے
اے ایمرجنسی یہ تیری جلوہ گر تنویر ہے — جگمگاتی ہر بشر کی دیکھیے تقدیر ہے

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

اب تو غلہ بھی مناسب بھاؤ سے ملنے لگا — مفلسوں کا کچھ تو جینے کا سہارا ہو گیا
تیرگی شام غم کا ہو چلا ہے خاتمہ — ہے افق پر جلوہ گر دیکھو اجالا صبح کا

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

فتنۂ تخریب کاری حد سے جب آگے بڑھا — دیش میں قانون ایمرجنسی کا نافذ کر دیا
لفظ ناممکن تری حکمت سے ممکن بن گیا — زندہ باد اے اندرا پائندہ باد اے اندرا

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

ا۔ م۔ شاہد

دیش کے دشمن

ڈرامہ

کردار:

دولت چند ــــ ایک بیوپاری انکم ٹیکس آفس کے بڑے بابو

دارو غہ جی ــــ

من موہن ــــ ایک لیڈر

موہن چوپڑہ ــ پلاسٹک فیکٹری کا مالک

بھولا ــــ دولت چند کا نوکر

منظر:

[دولت چند کا مکان۔
ایک بڑا کمرہ۔ فرش پر غالیچہ بچھا ہوا ہے۔ دیوار کی کھڑکی کے پاس ایک شیشے کی میز رکھی ہے۔ میز پر فون اور چند کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ میز کے قریب دو چار کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ کمرے کے دائیں جانب ایک دوسرا کمرہ بھی کھلتا ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو دولت چند ایک گدّے دار کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بھولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔]

بھولا۔ کوئی نئے بابو آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟

دولت چند (چونک کر) نئے بابو۔؟ اچھا آنے دو۔

(موہن چوپڑہ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

دولت چند۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آیئے، بیٹھیے، کہیے کون ہیں آپ۔ کہاں سے آرہے ہیں؟

موہن چوپڑہ۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں کانپور سے آرہا ہوں۔ میں ایک پلاسٹک فیکٹری کا مالک ہوں۔ میں آپ کے اس شہر میں بھی ایک فیکٹری قائم کرنا چاہتا ہوں۔ شہر کے بہت سارے لوگوں سے پتہ چلا کہ آپ اس شہر کے بہت بڑے اور ایماندار بیوپاری ہیں۔ فیکٹری کے سلسلے میں میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں اور میں آپ کے مشورے پر ہی فیکٹری قائم کرنے کی بات سوچوں گا۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ بھی فیکٹری میں ایک بڑی رقم لگا کر منافع حاصل کریں۔

دولت چند۔ بھئی مجھ سے جو بھی ہوگا آپ کے لیے کروں گا۔ مگر پہلے یہ تو بتایئے کہ آپ کی فیکٹری میں کیا کیا چیزیں تیار ہوں گی؟

موہن چوپڑہ۔ پلاسٹک کے تکیے، غلاف، چادریں، پائجامے، کرتے، ٹوپیاں اور جوتے۔

دولت چند۔ یہ سبھی پلاسٹک کے ہوں گے؟

موہن چوپڑہ۔ بالکل ــ آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ ہماری فیکٹری میں پلاسٹک کی عورتیں بھی تیار کی جائیں گی۔

دولت چند۔ (چونک کر) عورتیں ـــ

موہن چوپڑہ۔ بالکل ـــ جب پلاسٹک کی عورتیں بازار میں آجائیں گی تو آج کے نوجوان گوشت پوست کی عورتوں کو بھول بیٹھیں گے۔

(بھولا آتا ہے)

بھولا۔ انکم ٹیکس آفس کے بڑے بابو آئے ہیں۔

دولت چند۔ آنے دو۔

(بڑے بابو داخل ہوتے ہیں)

دولت چند۔ آئیے، آئیے سرکار۔ بیٹھیے۔

بڑے بابو۔ آپ نے ٹیکس کی بقیہ رقم جمع نہیں کی ہے؟

دولت چند۔ جمع کر دوں گا سرکار۔ بزنس ذرا دھیما چل رہا ہے تقایا پیسے جائیں گے کہاں ـــ بھلا سرکار کے پیسے دبا کر مجھے کیا ملے گا۔ بیٹھیے۔ کچھ ٹھنڈا پی کر جائیے۔

بڑے بابو۔ نہیں، میں جلدی میں ہوں۔ کل چپراسی کے ہاتھ ایک خط بھجوایا تھا۔ ملا ہوگا۔

دولت چند۔ ملا ہے۔ کب آپ کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے؟

بڑے بابو۔ اسی ماہ کی چوبیس تاریخ کو۔

دولت چند۔ بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ خیر خط کے مطابق میں نے آپ کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ دوسرے کمرے میں منشی جی سے مل لیجیے۔

(بڑے بابو دوسرے کمرے میں جاتے ہیں)

(دولت چند موہن چوپڑہ کی طرف دیکھتا ہے)

دولت چند۔ آپ اطمینان سے بیٹھیے۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔

(بڑے بابو باہر آتے ہیں)

بڑے بابو۔ (مسکرا کر) اچھا اب میں چلتا ہوں۔

دولت چند۔ بہت اچھا۔

(بڑے بابو چلے جاتے ہیں)

بھئی پلاسٹک کی عورتیں جب بازار میں آئیں گی تو ایک تہلکہ مچ جائے گا۔

موہن چوپڑہ۔ بالکل۔

(بھولا آتا ہے)

بھولا۔ داروغہ جی آئے ہیں۔

دولت چند۔ آنے دو۔

(داروغہ جی کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

دولت چند۔ آئیے داروغہ جی۔ بیٹھیے۔ کہیے کیا سیوا کروں آپ کی؟

داروغہ جی۔ سیوا کو گولی ماریے۔ آپ کی جو نئی شراب کی دکان سوناری میں کھلی ہے۔ اس دکان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ دکان پر ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کل ایک بڑے گھر کے لڑکے کے ساتھ آپ کی دکان کے منشی جی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ صرف اس بات پر کہ وہ لڑکا شراب پی کر بہکن گا رہا تھا۔ اس لڑکے نے تھانہ میں رپورٹ درج کرا دی ہے۔ آپ کی دوکان اٹھوا دی جائے گی۔ اوپر سے حکم آیا ہے۔

دولت چند۔ داروغہ جی۔ بھلا آپ کے ہوتے کہیں ایسا ہو سکتا ہے، جب تک آپ اس علاقہ میں ہیں تب تک میری دوکان بند نہیں ہو سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس شہر کے ہر نکڑ پر میری ایک شراب کی دکان ہے۔ لائسنس دلوانے والے آپ ہیں اور میرا اپنا خیال ہے کہ آپ سرکار کے آدمی کم ہیں۔ میرے زیادہ ہیں۔ آپ دوسرے کمرے میں منشی جی سے مل لیجیے۔

داروغہ جی۔ (خوش ہو کر) آپ بھی کمال کے آدمی ہیں سیٹھ جی۔ دل کی بات جان لیتے ہیں۔

(داروغہ جی دوسرے کمرے میں جاتے ہیں اور پھر جیب میں کچھ رکھتے ہوئے باہر نکلتے ہیں۔ اور دولت چند کو سلام کر کے چلے جاتے ہیں۔)

(بھولا آتا ہے)

بھولا۔ من موہن جی آئے ہیں۔

دولت چند۔ آنے دو۔

(من موہن کمرے میں داخل ہوتا ہے)

من موہن۔ آداب۔

دولت چند۔ آئیے من موہن جی۔ بیٹھیے۔ میں آپکے کام سے بہت

خوش ہوں۔ اگر طلبا کے ذہن میں گوداموں پر چھاپے مار کر اناج برآمد کرنے کی بات آجاتی تو میں برباد ہو جاتا۔ وہ سب سے پہلے میرے گوداموں پر چھاپے مارتے۔ کیونکہ اس شہر میں سب سے زیادہ میرے گودام ہیں۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ جو انھیں اپنے بھاشن سے سرکار کے خلاف بھڑکا دیا۔

من موہن۔ مگر سیٹھ جی اب طلبا پر بھاشن کا جادو نہیں چلے گا کیونکہ وہ سب کچھ بھانپ گئے ہیں۔

دولت چند۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ میں آپ کو کس کام کے پیسے دے رہا ہوں۔ سنئے۔ آپ چند لیڈر قسم کے طلبا کی مٹھیاں گرم کر دیں۔ وہ طلبا کو بھڑکائیں گے اور ان کا دھیان ہماری طرف سے ہٹ جائے گا اور ہم اپنا کام کرتے رہیں گے دوسری بات یہ کہ لیڈر قسم کے طلبا کو سمجھا دیجیے کہ وہ پہلی فرصت میں غریب طلبا کو سرکار کے ظلم کے خلاف بھوک ہڑتال پر بٹھا دیں۔ ان کو یہ ضرور سمجھا دیجیے کہ وہ بھوک ہڑتال کرنے والے لڑکوں کو بھوک ہڑتال پر بٹھانے سے پہلے پیٹ بھر کھانا کھلا دیا کریں۔ جو بھی خرچ آئے گا میں دوں گا۔ اور آپ کو کیا سمجھاؤں آپ تو اس شہر کے پرانے لیڈر رہیں۔ ہر بزنس مین کو آپ ہی جیسے لیڈروں پر بھروسہ ہے۔ آپ اب دوسرے کمرے میں جائیے اور منشی جی سے مل لیجئے۔

(من موہن دوسرے کمرے میں جاتا ہے)
دولت چند فائل سے کوئی کاغذ نکال کر بڑے غور سے دیکھتا ہے۔
من موہن کمرے سے باہر آتا ہے اور دولت چند کو سلام کر کے چلا جاتا ہے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

دولت چند۔ (ریسور اٹھا کر) کون..... میں دولت چند بول رہا ہوں..... کہو کیا بات ہے؟ رام پور والے سیٹھ بھگوان داس کا منشی آیا ہے۔ کیا ٹرک لے کر آیا ہے۔.... کیا کہا ..... اوہ... چاول کی کتنی بوریاں چاہتا ہے۔ کیا کہا۔ سات سو بوریاں... کیا... اسٹاک میں نہیں ہیں؟ کتنی بوریاں ہیں... صرف چھ سو پچاس بوریاں ہیں..... سنو.... ایسا کرو... پھر کنکر ڈال کر سات سو بوریاں کر دو — ارے اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تمہیں تو بارہا سمجھا چکا ہوں کہ ایسے معاملے میں کیا کرنا چاہیئے۔ ملاوٹ ہی پر تو ایک بیوپاری زندہ ہے.... سنو۔ چائے، میدہ اور گیہوں میں تم نے میرے کہنے کے مطابق ملاوٹ کی یا نہیں....؟ کیا کہا۔ اب تک نہیں کی — نوکری کرنی ہے یا نہیں —؟ سنو۔ رام پور کے منشی سے سات سو بوریوں کی قیمت وصول کر لو اور اسے سمجھا دو کہ ہوشیاری سے مال لے جائے۔ ان دنوں سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی سونگھتے پھرتے ہیں۔ اچھا اب تم اپنا کام کرو۔

(فون رکھتا ہے)

موہن چوپڑہ۔ سیٹھ جی میں ہوٹل نٹ راج سے فیکٹری سے متعلق تمام کاغذات لے آتا ہوں۔

دولت چند۔ جلدی آیئے گا۔ آج میرے گھر پر کھانا کھایئے گا۔

موہن چوپڑہ۔ بہت بہت شکریہ۔ ابھی آیا۔

(دولت چند فائل سے دو چار کاغذات نکال کر دیکھنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس کی گاڑی دولت چند کے مکان کے سامنے آکر رکتی ہے۔ گاڑی سے ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی اترتے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں، دولت چند پولیس کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔)

پولیس انسپکٹر۔ آپ کے پاس کوئی آدمی کان پور سے آیا ہے؟

دولت چند۔ جی ہاں۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ کاغذات لینے ہوٹل نٹ راج گیا ہے۔

پولیس انسپکٹر۔ آپ اس سے واقف ہیں؟

دولت چند۔ جی نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ کان پور میں پلاسٹک فیکٹری کا مالک ہے۔ وہ اس شہر میں بھی ایک فیکٹری قائم

کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے تعاون چاہتا ہے۔
مگر انسپکٹر صاحب۔ دیکھنے میں وہ کچھ چارسو بیس لگتا ہے۔
(اتنے میں موہن چوپڑہ کمرے میں داخل ہوتا ہے)
دولت چند۔ (خوش ہوکر) یہی ہے وہ انسپکٹر صاحب۔ لیجئے آگیا۔
پولیس انسپکٹر۔ سیٹھ جی۔ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی ہیں۔ ان کی رپورٹ کی بنیاد پر آپ کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ آپ ایک عرصہ سے بزنس کی اوٹ میں جو غلط کام کر رہے ہیں یہ سب کچھ جاننے کے لیے وہ آپ کے پاس آئے تھے۔ آپ جیسے لوگ دیش کو لوٹ رہے ہیں۔ آپ جیسے لوگ دیش کے دشمن ہیں۔ آپ کے کالے دھندے میں بعض بددیانت سرکاری افسران بھی شامل ہیں۔ انھیں بھی گرفتار کیا جائے گا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ کل ایمرجنسی نہیں تھی مگر آج ایمرجنسی ہے۔ اس دور میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بخشا نہیں جائے گا۔

[پولیس انسپکٹر سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے۔
سپاہی آگے بڑھ کر دولت چند کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیتے ہیں۔] (پردہ گرتا ہے)

نیا موڑ

احتزام اسلام

کوئی ہم بے سبب گھبرا رہے تھے
اجالوں کو اندھیرے کھا رہے تھے

مسائل کی لگی تھی آگ ہر سو
دماغ و دل جھلستے جا رہے تھے

گلستاں تھا جہنم کا نمونہ
عجب ہی گل کھلائے جا رہے تھے

سمٹتے جا رہے تھے لوگ ڈر سے
غموں کے ناگ پھن پھیلا رہے تھے

بکھرتی تھی جہاں پر مسکراہٹ
وہیں آنکھوں میں آنسو آرہے تھے

خدا جانے کہاں لگتے سفینے
ہوا کے رُخ پہ بہتے جا رہے تھے

مگر قسمت سے اب خوشیوں کے بادل
برسنے کے لیے منڈلا رہے ہیں

اُداسی مٹ رہی ہے اور دلوں میں
یقیں کے نقش اُبھرتے آ رہے ہیں

تباہی منھ چھپائے پھر رہی ہے
مسائل خوف سے تھرا رہے ہیں

حقیقت بن رہے ہیں سارے سپنے
روش کچھ ایسی ہم اپنا رہے ہیں

بلندی کی طرف مائل ہے سورج
سبھی سائے سمٹتے جا رہے ہیں

سیہ خانوں کے دل پر راج پاکر
اُجالے شان سے اترا رہے ہیں

نیا موڑ احتزامؔ اتنا حسیں ہے
جسے پاکر سبھی اٹھلا رہے ہیں

عشرت قادری

بڑھتے قدم

اندرا ترے شاسن کے یہ دس سال سنہرے
لہراتے ہیں آکاش پہ دھرتی کے پھریرے

سونے سے سجل کھیت ہیں تن جھوم رہا ہے
وہ شکتی ہے کہ آریہ بھٹ گھوم رہا ہے
جھک جھک کے ہمالہ کو گگن چوم رہا ہے

آشاؤں کی اک جوت نئی جاگی ہے من میں
پھوٹی ہیں اندھیروں کا جگر چیر کے کرنیں
جگ جگ پہ مدھر گیت سے گاتی ہوئی نہریں

"بیس سوتری" کرنیں ہمیں دیتی ہیں سندیسہ
بھارت میں غریبی کا چلن رہ نہیں سکتا
جیون کے نئے رنگ نکھارے ہے ترنگا

جڑ فرقہ پرستی کی نہ اب پھیلنے دیں گے
ہم ایک ہیں سب ایک ہی دھارے میں بہیں گے
انسان تھے، انسان ہیں، انسان رہیں گے

اٹھتی ہیں جہیز اور دکھاوے کی یہ رسمیں
دو پھول ہوں اک کنبے میں کھائی ہیں یہ قسمیں
بدلیں گے سماج اپنا کہ دن رات ہیں بس میں

ظہیر کیفیؔ امروہوی

دغاباز

(افسانہ)

سیٹھ علیا بھائی نے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے اکبر کو سمجھایا "تم ابھی ٹیکسی پکڑ کر شیومڑی جاؤ اور بابا کی درگاہ پہ جتنے فقیر ہوں سب کو کھانا کھلاؤ۔" اکبر نے سیٹھ علیا بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا "سیٹھ جی آج انکم ٹیکس کی تاریخ بھی تو ہے وکیل کے پاس کورٹ میں بھی تو جانا ہے"۔ "ادھر میں ڈوقو بھائی کو بھیجتا ہوں۔ تم اپنا کام کرو کھانے کا سمے ہو رہا ہے۔" اکبر نے ہونٹوں میں کچھ ادھورے الفاظ چبائے مگر وہ سیٹھ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سیٹھ کے مزاج کا کیا بھروسہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، ابھی فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے سو روپے خود دیے ہیں مگر میری تنخواہ کی رتی برابر بھی پروا نہیں مہینے کی دس تاریخ ہو چکی ہے مگر میری ضرورت اور پریشانی کا قطعی احساس بھی نہیں کیا۔ اسٹور سے آدھا راشن ملنا بھی بند ہو گیا۔ گھر میں چھ بچے کھانے والے۔ بھوکے پیٹ کتنے دن رہا جا سکتا ہے۔ بچے بغیر لباس کے اسکول کیسے جا سکتے ہیں اور خود اس کی بیوی مہرن کئی دن سے بخار میں تپ رہی ہے لیکن علاج کے لیے ایک نیا پیسہ تک گھر میں موجود نہیں ہے۔ اگر خود اس کے پاس لوکل ٹرین کا پاس نہ ہوتا تو وہ پورے دس میل چل کر اپنی نوکری پر کیسے آسکتا تھا؟ اتنے سارے معاملات اور پریشانیوں کے باوجود اکبر نے سیٹھ سے تنخواہ کا مطالبہ تک نہیں کیا وہ اپنی بے وقوفی کو کوستا ہوا سیٹھ کے دفتر سے نکل گیا۔ وہ چاہتا تو ان سو روپیوں میں سے کچھ روپے بچا سکتا تھا اور شیومڑی جانے کے بجائے مز نگ گاؤں کی جھونپڑ پٹی کا راستہ لیتا۔ جہاں اس کی بیوی مہرن نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔

اکبر سیٹھ علیا کا پرانا اور بڑا وفادار نوکر تھا۔ اسے بس ایک ہی احساس ستاتا رہتا تھا جیسے تیسے کر کے اپنا وہ اعتبار اور اعتماد قائم رکھ سکے جس کو سیٹھ پسند کرتا تھا اس پر چاہے کتنی ہی بڑی آفت اور مصیبت آجائے مگر وہ اپنے فرض سے لاپروائی اور بد دیانتی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ملازمت میں کئی ایسے خطرناک موڑ آئے تھے جن کی وجہ سے وہ ڈگمگا سکتا تھا لیکن وہ ان لمحوں کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے گزار چکا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس کی فطرت کا تقاضہ بھی تھا اس نے جوان ہو کر اپنے باپ سے اگر کوئی نصیحت سنی تھی تو یہی کہ مالک کے وفادار رہنا، ایمانداری پہ قائم رہنا، اپنے فائدے کو بھول کر ذمہ داری کو نبھانا اور خود غرضی اور دھوکہ دہی کے نزدیک نہ جانا۔ اکبر اپنے باپ کی نصیحت کو ایک متاع کی طرح سنبھالے رہا تھا اس وقت بھی جب اس کا باپ مردہ حالت میں بے گور و کفن پڑا ہوا تھا۔ اور اس کی جیب خالی تھی۔ وہ چاہتا تو سیٹھ سے مدد مانگ سکتا تھا لیکن اس کی غیرت اور باپ کی نصیحت نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا، اسے اس خطرناک اور غمناک

ساعت میں بھی اپنے فرض، ذمہ داری اور ایمان کا ہی احساس تھا اور یہ مصیبت بھرا لمحہ بھی جیسے تیسے کر کے گذر گیا تھا اکبر نے اپنے ایک شناسا سے روپیے ادھار لے کر باپ کی تجہیز و تکفین کا فریضہ انجام دیا تھا۔

زندگی کی گاڑی تو چل ہی رہی تھی مگر دو سو روپیے کی تنخواہ میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کا سامنا کرنا کتنا دشوار تھا یہ اس کی بیوی ہی بہتر ہی جانتی تھی۔ اس لیے وہ اکثر اکبر سے کہتی تھی۔ "سیٹھ کو تم بولتے کیوں نہیں کہ ہمارا گذارہ اتنے کم روپیوں میں نہیں ہوتا۔ پگار بڑھوانے کی کوشش کرو نا۔" مگر اکبر عجیب خمیر کا بنا تھا کہ بیوی کی بات پر دھیان بھی نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ ہر روز ہی بیوی کی کڑوی کسیلی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نئی نئی ضرورتوں اور پریشانیوں کو سہنا پڑتا تھا۔ بچوں کی فوج کو زندگی کی بہت سی محرومیوں کا عادی بناتے بناتے وہ خود بھی تنگ آگیا تھا۔ لیکن اس نے سیٹھ سے اپنی ضرورت، پریشانی اور مصیبت کے بارے میں ایک لفظ بھی کبھی نہ کہا تھا۔ ہمیشہ ہی وہ اپنے دکھ بھول کر سیٹھ کی اطاعت کرتا تھا۔ اپنی نوکری اور ذمہ داری نبھاتا تھا۔ سیٹھ کو وہ احساس ہی نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ دکھی ہے پریشان ہے۔ اپنے بچوں کی ضرورتوں، موجودہ مہنگائی، اور بیوی کی بیماری کے لیے اگر وہ سیٹھ سے مالی اعانت کا اظہار کرتا تو یہ ممکن تھا کہ سیٹھ علیا بھائی اسے ہزار پانچ سو روپے آسانی سے دے دیتا، یا اس کی تنخواہ بڑھا دیتا، بغیر روئے تو ماں بھی بچے کو دودھ نہیں پلاتی۔ پھر سیٹھ بھلا کیوں اپنی فیاضی سے اکبر کو نوازتا، یہ تو خود اس کی اپنی ہی خطا اور کوتاہی تھی جس کے نتیجے میں وہ بچوں کو بھوکا رکھے ہوئے تھا اور بیوی کو بغیر دوا دارو کے بیماری میں پھنسا ہوا چھوڑ کر، اپنی ذمہ داری کو نبھانے، سیٹھ کے حکم کے بموجب شیوڑی چلا گیا تھا۔ اکبر کو مزنگ گاؤں اپنی جھونپڑی تک واپس لوٹنے میں روز ہی رات کے نو بج جاتے تھے۔ وہ صبح کو ۹ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کبھی وہ دو وقت کھانا کھاتا بھی تھا۔ اتوار کے دن بھی وہ سیٹھ کے فلیٹ پر کاؤسس جی اسٹریٹ چلا جاتا تھا اور ان کے لیے گھریلو ضروری کام انجام دیتا تھا۔

سیٹھ علیا بھائی کی پانچ بیویاں تھیں۔ سب کی الگ الگ کاریں تھیں، ان کی عمروں اور لباسوں کی طرح مختلف رنگوں، ماڈل اور سائز کی۔ سیٹھ علیا بھائی کی اپنی دس منزلہ بلڈنگ تھی۔ نصف بلڈنگ میں اس کی بیویاں رہتی تھیں اور نصف میں سیٹھ علیا بھائی کا چھوٹا بھائی چینا بھائی رہتا تھا۔ اس کی بھی پانچ بیویاں اور پانچ گاڑیاں تھیں۔ بمبئی میں ان کا کاروبار ایک سرے سے دوسرے کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ بمبئی سے باہر سورت اور گجرات تک، لیکن دونوں بھائیوں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ دونوں سیٹھوں کو اگر کوئی کمی تھی تو بس اولاد کی۔ سیٹھ علیا بھائی کئی برس سے ہر جمعرات کو اکبر کو سو روپے کا نوٹ دیتا اور کہتا۔ "شیوڑی جاؤ اور بابا کی درگاہ سے فقیروں کو کھانا کھلاؤ۔" اکبر بھی ایک مشینی پرزے کی طرح یہ فریضہ انجام دیتا رہتا تھا۔ سیٹھ کہتا "تم ٹیکسی پکڑ کر جاؤ۔" مگر اکبر ہمیشہ ہی لوکل ٹرین میں سفر کرتا تھا۔ سیٹھ کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اکبر ان کے حکم کو کس طرح بجا لاتا ہے۔ سیٹھ کو اکبر پر پورا بھروسہ تھا، اعتماد تھا۔ اور اس اعتماد کو اکبر نے ہمیشہ نبھایا تھا۔ مگر بابا کے مزار کے فقیروں کی دعاؤں نے بھی سیٹھوں کے گھروں کو بچوں کی دولت سے مالا مال نہیں کیا۔ ہاں ان دعاؤں کا اگر کوئی نتیجہ تھا تو سیٹھوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی لاتعداد دولت اور کاروبار۔ سیٹھ بڑا فیاض تھا۔ وہ تبلیغی جماعت والوں کو دل کھول کر چندہ دیتا تھا۔ مذہبی اداروں کو امداد دیتا تھا۔ مسجدیں تعمیر کرانے والوں اور دینی مدرسے کھولنے والوں کو بھی سیٹھ علیا بھائی خاطر خواہ عطیات دیتا تھا۔ اور یہ سارے کام اکبر کے ذریعے ہی انجام پاتے تھے۔ اکبر چاہتا تو اب تک لاکھوں روپیوں کا مالک ہو سکتا تھا اس کا

اپنا الگ کاروبار ہو سکتا تھا۔ سیٹھ علیا بھائی کا ملازم ہونے کے بجائے کسی کمپنی، دفتر یا کارخانے کا وہ بھی سیٹھ بن سکتا تھا۔ اکبر کی بس ایک ہی کمزوری تھی اور وہ تھی اس کی تعریف۔ سیٹھ جیسا بڑا آدمی جب اپنے کسی واقف کار کو بتاتا۔" بیس برس سے اکبر ادھر کام کرتا ہے۔ سوئی کے ناکے کے برابر بھی کبھی بے ایمانی نہیں کرتا۔ چاہتا تو جھونپڑی کو چھوڑ کر میرے پاس ہی فلیٹ میں رہ سکتا تھا مگر رہے گا دس میل دور ہی۔ لوکل ٹرین میں دھکے کھانے کا اس کا چسکہ ہی نہیں چھوٹتا" سیٹھ سے اکبر اپنی تعریف سن کر کسی مجذوب کی طرح دنیا وما فیہا سے گم ہو جاتا تھا!!

پہلی بار سیٹھ علیا بھائی نے خود شیوڑی بابا کی درگاہ پر پہنچ کر اکبر کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی تھی۔ اسے محسوس ہوا شاید سیٹھ کو میری نیت پر آج شک ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ کیوں میرے ساتھ آتا۔ سیٹھ نے اسے جلدی سے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور پھر ڈرائیور کو گاڑی تاریک سڑک پر جلدی لے جانے کو کہا۔ راستے کے مختلف سگنلوں پر ٹھہرتے، رکتے سیٹھ علیا بھائی اکبر کا جائزہ لینے لگا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں، دونوں ہی چپ تھے۔ اکبر کو محسوس ہو رہا تھا کہ سیٹھ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ اور اپنی ناراضگی کے نتیجہ میں وہ اسے کسی پولیس اسٹیشن پر لے جا رہا ہے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر بھی مطمئن تھا کہ سیٹھ کا کوئی الزام، تہمت، غصہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ وہ بے قصور ہے۔ اور ہر قسم کی بے ایمانی اور بددیانتی سے دور ہے۔ مگر ایک شک اور شبہہ اور تجسس اس کے ذہن و دل کو ہیجان و اضطراب میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ سیٹھ کے اس پُر اسرار اور خشم ناک رویے پر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنے ماضی کے ایک ایک پل کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ تاریک سڑک پر پہنچ کر سیٹھ نے اس سے صرف اس قدر پوچھا۔" ڈرائیور کو بتا دو تم کہاں رہتے ہو۔"

اس نے بھی اسی قدر مختصر طور پر ڈرائیور کو اپنا پتہ بتا دیا لیکن اس نے سوچا، تو کیا سیٹھ میری بے عزتی میرے ہی گھر پر میرے بھوکے بچوں اور بیمار بیوی کے سامنے کرنا چاہتا ہے، یا میری جھونپڑی کی تلاشی لینے وہ میرے ساتھ جا رہا ہے۔ چند منٹوں بعد گاڑی مرنگ جھونپڑی پٹی پہنچ گئی۔ سیٹھ اکبر کے کاندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ دیتے ہوئے اس کی جھونپڑی میں چلا گیا۔ اکبر کی بیوی بے ہوشی میں جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھی۔ اور اس کے بچے کبھی بھوک سے تنگ آ کر لڑتے جھگڑتے سو گئے تھے۔ جھونپڑی میں سامان کے نام پر کچھ بھی نہ تھا۔ چھ بچے۔ ایک کے بعد ایک، چھوٹی چھوٹی عمر کے۔ سیٹھ نے حیرت کے ساتھ کہا۔" ارے تم ادھر رہتا ہے جانوروں کے مافک، اور بیمار بائی کو بھی ادھر ہی ڈال رکھا ہے۔ ہاسپٹل کیوں نہیں لے گیا۔" اکبر چپ رہا اور غصے میں اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ اسے سیٹھ کی اس غفلت شعاری پر اور بھی غصہ آیا کہ اس نے تنخواہ کے نام پر اب بھی کوئی پیسہ جیب سے نکالنے کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی۔ سیٹھ علیا بھائی نیازمندی کے لہجہ میں بولا۔" اکبر اب تم ادھر نہیں رہے گا۔ سب بابا لوگ اور تیری بائی ہمارے ہی پاس رہے گی۔ بس جب تک یہ ایمرجنسی کا حکم ہے تب تک تم ادھر اور رہ لو۔ ہمارے اوپر تو بڑی مصیبت آ پڑی ہے۔ انکم ٹیکس والے دھاوا بول کر ایک ایک فلیٹ کی تلاشی لے رہے ہیں۔ ایک ایک کاغذ پڑھ رہے ہیں۔ ایک ایک چیز کی پڑتال کر رہے ہیں۔ تم ہی بتاؤ جینا حرام ہے یا نہیں، دیکھو گاڑی کی ڈکی میں ہمارے ایک نمبر کے کھاتے ہیں۔ تم اس بکس کو اپنی جھونپڑی میں سنبھال کے رکھ لو۔ ایمرجنسی ہٹتے ہی واپس لے لوں گا۔ دیکھو کسی کو بولنا نہیں۔ نہیں تو اپن کی بڑی بے عزتی ہو گی، گورنمنٹ بھی نہیں چھوڑے گی جیل میں ٹھونسے بنا۔ تم بہت اچھا آدمی ہے۔ ایمان دار ہے، نیک ہے۔ ہم بہت خوش ہے تم سے پر تم بولو۔ تم کیا چاہتے ہو جتنا پیسہ مانگنا چاہو مانگ لو ہم دے گا ابھی کھڑے کھڑے۔ بولو۔

بولو۔ چپ کیوں ہو۔'' اکبر بڑی جرات سے شاید پہلی بار سیٹھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے بولا ''سیٹھ ہم کو اور کچھ نہیں چاہیے آج دس تاریخ ہو چکی ہم کو تو بس اپنی پگار چاہیے۔ ہم کوئی بھی غلط کام نہیں کر سکتا۔ سیٹھ ہم غریب آدمی ضرور ہے، چھوٹا آدمی، جھونپڑ پٹی میں جانوروں کی طرح رہنے والا۔ پن ہم اپنی سرکار اور دیش سے دغا نہیں کرے گا، ہم پہلی بار آپ کی بات نہیں مان سکتا۔ اس کے لیے چاہے آپ ہم کو نوکری سے نکال دیں۔ یا پولیس کے حوالے کر دیں۔ پن ہم آپ کے ساتھ مل کر اپنی حکومت سے غداری نہیں کرے گا، ہم غدار بن کر جینا نہیں چاہتا۔ عزت اور ایمان داری سے مرنا چاہتا ہے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں اپنے بھوکے بچوں اور بیمار عورت کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے''!

اکبر کا یہ روکھا اور ٹکا سا جواب سن کر سیٹھ علیا بھائی کے قدموں سے اس جھونپڑی کی جیسے چار گز زمین نکل گئی، جہاں وہ پناہ لینے آیا تھا.....

★

ایمرجنسی کا اعلان اور جمہوریت کا استحکام : (صفحہ ۵ کا بقیہ)

برسر اقتدار جماعت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی۔ اب پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کسی جگہ تھما بھی نہیں جا سکتا۔ پیش رفت ملک کا مقدر بن گئی ہے۔ یہ ایک ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ پہلے جو بدنظمی پیدا ہو گئی تھی اور فسطائیت پسند اور فرقہ پرست عناصر تحریر و تقریر کی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کے لیے جو سنسنی اور حیثجارہ فراہم کر رہے تھے اس کی وجہ سے ضبط و نظم کی پابندی کچھ لوگوں کو شروع میں کھلی لیکن اب اس پابندی کے فائدے بھی سامنے آ رہے ہیں اور رہم میں نکانی نسخے کے استعمال سے جیسے جیسے زخم مندمل ہو رہا ہے ویسے ویسے درد بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔

اس اثنا میں جمہوریت سوشلزم اور سیکولرزم کو ہندستان کے دستور کے بنیادی مقاصد میں شامل کر لینے کی بات تقریباً طے ہو گئی ہے۔ یہ چیزیں دستور میں بالواسطہ طور پر پہلے بھی موجود تھیں لیکن ان کی صراحت نہ ہونے سے غرض مند اور مفاد پرست طبقے غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے۔ صراحت ہو جانے سے ایک طرف ان طبقوں پر قدغن لگ جائے گا اور دوسری طرف حکومت اور عوام دونوں کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔

کایا پلٹ (صفحہ ۲۴ کا بقیہ)

ایک بھیڑ ــــ آوازوں کے ساتھ گھر میں گھس آئی۔
مہاجن اور زمیندار کی آوازیں۔
ایک آواز ــــ دکھیا ــــ یہ رہا تیرا جوتا۔
آوازیں ــــ مہاجن جوتا چور۔
چور کو پکڑو ــــ ارے یہ دوسرا چور کا بھائی گرہ کٹ ہے۔ اس کو بھی پکڑو ــــ لے چلو پنچایت گھر ــــ بہت سی ملی جلی تیز آوازیں۔

★

نیا دور

جلد ۳۲ نمبر ۴

جولائی ۱۹۷۷ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

عُنوانات

پبلشر: بال کرشن چترویدی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

اپنی بات

اتر پردیش جنتا لیجس لیچر پارٹی نے ۲۱ جون کو شری رام نریش یادو کو اپنا لیڈر منتخب کیا اور ۲۳ جون کو گورنر اتر پردیش ڈاکٹر چنا ریڈی نے ان کو راج بھون کے دربار ہال میں وزیر اعلا کے عہدے کا حلف دلایا۔ شری رام نریش یادو آبادی کے اعتبار سے ہندستان کی سب سے بڑی ریاست کے دسویں اور پردیش کی پہلی جنتا پارٹی حکومت کے پہلے وزیر اعلا ہیں۔ اتر پردیش کی پارلیمانی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب پچھڑے طبقے کا کوئی شخص وزیر اعلا کے عہدے پر فائز ہوا ہے۔ شری یادو نے حلف وفاداری کے بعد اپنی تقریر میں کہا کہ یوں تو ریاست اتر پردیش کا شمار ہندستان کی پسماندہ ریاستوں میں کیا جاتا ہے لیکن ریاست کا مشرقی حصہ زیادہ پچھڑا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری وزارت کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ جنتا سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرے جن کی بابت انتخابی منشور میں وضاحت کی گئی ہے۔ اتر پردیش کی یہ نئی حکومت ان کروروں عوام کی تمناؤں اور آرزوؤں کی آئینہ دار ہے جنھوں نے جنتا پارٹی کو اتنی طاقت عطا کی کہ وہ برسر اقتدار آئی ہے۔ شری یادو نے یہ بھی کہا کہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ زبردست ذمہ داریوں کا عہدہ ہے۔ اگر مجھے اپنے سب ساتھیوں کا تعاون حاصل رہا تو میں اس عہدے سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ وزیر اعلا نے کہا کہ ریاست کی ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ ہمارے نوجوانوں کے کاندھوں پر ہے جو کل کے ہندستان کے معمار ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ وہ تعمیری رویہ اپنائیں اور حکومت کو ان اقدامات میں عملی مدد دیں جن کو پورا کرنا ان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ شری یادو نے اس موقع پر یاد دلایا کہ لوک نائک شری جے پرکاش کا مکمل انقلاب کا نعرہ اس وقت تک پورا نہیں ہوگا جب تک کہ سماج کے پچھڑے طبقے اور ہریجنوں کو سماجی انصاف، ملازمتوں میں تحفظ اور روزگار کے تمام مواقع نہیں ملیں گے۔

شری یادو یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو ضلع اعظم گڑھ کی پھولپور تحصیل کے موضع آدھی پور میں پسماندہ طبقہ کے ایک معمولی کسان خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں لیسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد بنارس ہندو یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ہندی میں ایم۔ اے اور قانون کی ڈگری حاصل کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔ یونی ورسٹی میں تعلیم کے دوران وارانسی کے اینگلو۔ بنگالی کالج میں دو سال تک ٹیچر بھی رہے۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی۔ وکالت ان کے لیے ذریعہ معاش کے علاوہ خدمت عوام کا بھی خاص وسیلہ رہی ہے۔ شری یادو سماج کے کمزور اور غریب طبقہ کے لوگوں کو مفت قانونی امداد دینے کے لیے ضلع میں مشہور رہے ہیں۔ یونی ورسٹی میں تعلیم کے دوران ملک کے ممتاز سوشلسٹ لیڈر اور مفکر آچاریہ نریندر دیو سے ان کا رابطہ قائم ہوا اور انھوں نے خود کو سوشلزم کے نصب العین کے حصول کے لیے وقف کر دیا رفتہ رفتہ سوشلزم پر ان کا عقیدہ مستحکم تر ہوتا گیا اور وہ سوشلسٹ نصب العین اور پروگرام کے لیے جدو جہد کرنے والوں کی صف اول میں آ گئے۔ سوشلسٹ پارٹی نے جب بھی کوئی تحریک شروع کی تو انھوں نے وکالت چھوڑ کر اس میں سرگرم حصہ لیا۔ حصول آزادی کے بعد پارٹی کی طرف سے شروع کی گئی اس قسم کی تحریکوں میں انھیں سات بار جیل جانا پڑا۔ ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان کے بعد انھیں آٹھویں بار جیل جانا پڑا اور ۱۹ ماہ بعد لوک سبھا کے گزشتہ انتخابات سے کچھ قبل انھیں جیل سے رہا کیا گیا۔ جنتا پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے انھوں نے اعظم گڑھ پارلیمانی حلقہ انتخاب سے مارچ، ۱۹۷۷ء میں لوک سبھا کا چناؤ جیت کر پارلیمانی زندگی میں قدم رکھا۔

شری یادو کو سیاست کے علاوہ پسماندہ طبقوں میں تعلیم کے فروغ سے خاص دل چسپی رہی ہے اور انھوں نے اس سلسلے میں سرگرمی کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ جونیر ہائی اسکول سے انٹرمیڈیٹ تک کی سطح کے متعدد تعلیمی اداروں سے صدر اور منیجر کی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں اور بعض اداروں کے بانی بھی ہیں۔

اب تک ریاست میں جتنے وزرائے اعلا ہوئے ہیں ان میں ہمارے نئے وزیر اعلا سب سے کم عمر کے ہیں۔

——— ایڈیٹر

اتر پردیش کے عوام کے نام

وزیر اعلا کا پیغام

اتر پردیش کے عوام نے لوک سبھا اور ریاستی ودھان سبھا (اسمبلی) کے انتخابات میں جنتا پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیاب بنا کر پارٹی پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے میں آپ لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنتا پارٹی کے ممبران اسمبلی نے ملک کی سب سے بڑی ریاست کا وزیر اعلا منتخب کر کے عوام کی امیدوں اور آرزوؤں کو پورا کرنے کی بھاری ذمہ داری جس یقین اور اعتماد کے ساتھ میرے کاندھوں پر ڈالی ہے اسے میں پوری لگن، خلوص اور ایمانداری کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اتر پردیش ایک بڑی ریاست ہے اس لیے اس کے مسائل بھی بڑے اور پیچیدہ ہیں۔ علمی اور ثقافتی میدانوں میں ممتاز درجہ رکھنے اور ملک میں سماجی اور سیاسی میدانوں میں پیش پیش رہنے کا فخر حاصل کرنے کے باوجود اس ریاست کا شمار معاشی طور سے ملک کی پسماندہ ریاستوں میں کیا جاتا ہے۔ حصول آزادی کے تیس سال بعد بھی ریاست کی پیشانی سے اس بدنما داغ کو ہم مٹا نہیں سکے ہیں۔

غریبی اور بے روزگاری کے مسائل کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے ہیں تقریباً دس کروڑ کی آبادی والی اس ریاست کے بیشتر عوام کی گزر بسر کے کم سے کم وسائل بھی مہیا نہیں ہیں۔ ہر کھیت کو پانی دینے کی بات تو دور رہی، اکثر جگہوں پر لوگوں کے لیے پینے کے صاف پانی کی بھی سہولت فراہم نہیں ہے۔ بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن کے لیے سر چھپانے کا بھی بندوبست نہیں ہے۔ ان مسائل کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے سماج کے کمزور اور دبے کچلے لوگوں اور معمولی تنخواہ پانے والے شہریوں کی زندگی کو اور بھی دشوار بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے ضروری اشیاء کا بھی مہیا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ان مسائل کے سلسلے میں ہم پورے طور سے بیدار ہیں اور ان سے نپٹنے کے لیے میرے سر پر وزیر اعلا کی صورت میں کانٹے کا تاج رکھا گیا ہے۔ اس قدر بڑے مسائل سے عہدہ برآ ہونا نہ تنہا میرے بس کی بات ہے اور نہ تو جنتا پارٹی کے ممبر ہی اسے حل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے تو ریاست کے ہر مرد اور عورت کے عملی تعاون اور اشتراک کی ضرورت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان مسائل کو پوری طرح سمجھیں اور ان کو حل کرنے کے لیے بھرپور کوشش کریں۔ عوام نے جس جوش و خروش اور اعتماد کے ساتھ جنتا پارٹی کو اقتدار سونپا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ ریاست کی معاشی حالت کو تیزی سے بدلنے میں ان کا پورا تعاون ضرور ملے گا۔ ایمرجنسی کے دوران بے زبان اور مجبور عوام نے بڑی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی عوام ریاست کی جنتا حکومت سے کچھ امیدیں اور آرزوئیں رکھتے ہیں۔ میں ریاست کے عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایمرجنسی کے دوران جن لوگوں کے ساتھ ناانصافیاں اور مظالم ہوئے ہیں، ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور مکمل تفتیش کے بعد مجرم پائے جانے والے اشخاص کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی، خواہ وہ کتنے ہی با اثر اور اعلا عہدوں پر ہوں۔

حکومت کے اخراجات میں کفایت شعاری اور سادگی لانا

نیز بدعنوانیوں کا قلع قمع کر کے عوام کو صاف ستھرا، مستعد اور چاق و چوبند نظم و نسق فراہم کرنا ہی ہمارا اولین مقصد ہوگا۔ نظم و نسق کے ہر شعبے کو خدمت کے جذبہ سے معمور ہو کر اس طرح کام کرنا ہوگا کہ عوام میں یہ اعتماد پیدا ہو سکے کہ نظم و نسق سے وابستہ افسران اور ملازمین ان کے آقا نہیں بلکہ سچے خدمت گزار اور ان کے بنیادی حقوق کے کچلنے والے نہیں بلکہ محافظ ہیں۔

ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے افراد کو سماجی اور معاشی انصاف دلانے کے پروگراموں کی جانب خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ان کی فلاح و بہبود سے متعلق تمام اسکیمیں صحیح معنوں میں بروئے کار لائی جائیں گی اور اس سلسلے میں صرف کاغذی خانہ پری کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ ہریجنوں کو مکان اور کھیتی کے لیے پٹہ پر دی گئی زمین پر ان کو واقعی قبضہ دلایا جائے گا اور اس میں رخنہ ڈالنے والے عناصر کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ چھوت چھات کے انسداد سے متعلق قانون کی ہر دفعہ کا نفاذ سختی کے ساتھ کیا جائے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ ریاست میں اقلیتوں اور خاص طور پر بنکروں کو مکمل تحفظ حاصل ہو سکے اور ان کے لیے معاشی ترقی کے پروگراموں کو تیز رفتاری سے بروئے کار لایا جائے۔ اقلیتوں کی تعلیم اور اردو کی ترقی کے لیے خصوصی اسکیمیں وضع کی جائیں گی تاکہ یہ لوگ ترقی کے کاموں میں حصہ لے سکیں اور ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہوں۔

پردیش کی معیشت خاص طور سے زراعت پر منحصر ہے اس لیے زرعی پیداوار بڑھانے کو اولیت دی جائے گی۔ کسانوں کو آبپاشی، بجلی، بیج، کھاد وغیرہ کی تمام سہولتیں مہیا کی جائیں گی تاکہ وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ زرعی پیداوار بڑھانے کے کام میں لگ جائیں۔ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے گا کہ انھیں اپنی پیداوار کا مناسب معاوضہ ملے۔ زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتی پیداوار بڑھانے کے لیے بھی کوشش کی جائے گی۔ بے روزگاری کو کم کرنے کے لیے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا ایک جال بچھا دیا جائے گا۔ میں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ خریف کی فصل کی بوائی اور بڑھن کی رد پائی کے لیے کسانوں کو بجلی فراہم کرنے کا پورا پورا بندوبست کیا جائے۔

معاشی ترقی کے پروگراموں کو بہتر اور مؤثر طریقے سے بروئے کار لانے کے لیے امن اور قانون کا برقرار رہنا اشد ضروری ہے۔ حکومت اس سلسلے میں کسی قسم کی بدنظمی کو برداشت نہیں کرے گی۔

ریاست کی نئی حکومت عوام کے مکمل تعاون کے ساتھ پردیش کی ہمہ جہت ترقی کے پروگراموں کو نئے ماحول میں اور نئے جوش و خروش کے ساتھ شروع کرنے جا رہی ہے۔ اس موقع پر میں ریاست کے عوام خاص طور سے نوجوانوں طالب علموں، محنت کشوں، صنعت کاروں، ریاستی ملازمین اور سیاسی جماعتوں سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ پارٹی اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر پردیش کی ترقی کے مقدس پروگراموں میں بھرپور تعاون دیں۔ اسی صورت میں ہم مہاتما گاندھی کے انسانی بھلائی کے نصب العین، لوہیا جی کے سماج واد کے خوابوں اور لوک نائک جے پرکاش نرائن کے مکمل انقلاب کے مقصد کو پورا کر سکیں گے۔

★

تصحیح

نیا دور کے مئی ۱۹۷۷ء کے شمارے میں "عنقا" کے عنوان سے محمد اسحاق صدیقی صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں کتابت کی غلطی سے "عُنقا" بالضم شائع ہو گیا ہے۔ صحیح لفظ "عَنقا" بالفتح ہے۔ اسی طرح نیوزی لینڈ کے ناپید پرند کی تصویر کے مقابل "موا" کی بجائے "دوما" درج ہو گیا ہے۔

نشور واحدی

غزل

وفا ہو یا جفا ہو حسرتِ بالیدہ ہے وہ بھی
محبّت جس کو کہتے ہیں گُلِ ناچیدہ ہے وہ بھی

شکستِ دلبری ہے شاید اک محبوب کا پیکر
ادائے بے نیازی ہے مگر غم دیدہ ہے وہ بھی

کسی کو نیند آسکتی ہے اس بزمِ تہتک میں
جسے کہیے زمانہ دردِ ناخوابیدہ ہے وہ بھی

نظر پھیرے ہوئے ملتا ہے رستے کا ہر اک ساتھی
جسے ہم دوست سمجھے تھے نظر دزدیدہ ہے وہ بھی

سبھی منکر تھے آخر نظمِ دوراں لے لیا ہم نے
سیاست جس کو کہتے ہیں غلط بخشیدہ ہے وہ بھی

خود اپنے فیصلے پلٹے ملے ہیں اپنے دامن سے
ارادہ زیست ہے لیکن بخود پیچیدہ ہے وہ بھی

غزل میں مائلِ فریاد ہے شاید کوئی نغمہ
نشور اُس کو کہے ہیں شاعرِ غم دیدہ ہے وہ بھی

ہرش ملسیانی

جاں نثار اختر

خیرآباد کے ایک علمی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور امیر مینائی کے مشہور شاگرد حضرت مضطر خیرآبادی کے فرزند ارجمند تھے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی کو کون نہیں جانتا۔ آپ منطقی دور کے امام مانے جاتے ہیں ان کے صاحبزادے مولانا شمس العلماء عبدالحق متوفی ۱۸۹۹ء اس پایہ کے عالم تھے کہ انھوں نے بھی اپنی خاندانی روایات کو چار چاند لگا دیے۔ مولانا فضل حق غالب کے محب خاص تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی ایک بیٹی سعیدالنساء بیگم تھی۔ ان کی تعلیم بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ چھوٹے بیٹے کا نام افتخار حسین تھا جو مضطر خیرآبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔

مضطر صاحب ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ مدتوں ٹونک، گوالیار، اندور میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ وہ والیِ ریاست نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل کے استاد تھے اور ریاست کی طرف سے انھیں افتخار الشعراء، اعتمادالملک افتخار جنگ، خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے تھے ان کے اشعار زبان زدِ عوام ہیں۔ ایک مشہور شعر تو لوگوں کی زبان پر اب تک چڑھا ہوا ہے۔

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

۱۹۲۷ء میں گوالیار میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے گوالیار میں یہ پہلے سٹی مجسٹریٹ پھر سیشن جج کے عہدے پر متمکن رہے جاں نثار اختر ان کا اکلوتا بیٹا تھا جو ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوا۔ مضطر بڑے زود گو اور پُر گو تھے۔ بعض مقدموں کے فیصلے نظم میں لکھ دیتے تھے۔ اختر نے دسویں درجے تک گوالیار میں تعلیم پائی۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پہنچے اور وہاں سے بی۔اے آنرز کی سند لی ۱۹۴۰ء میں گھر کے حالات نے مجبور کیا اور وہ اردو ناول نویسی پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ درمیان میں ہی چھوڑ کر گوالیار آ گئے۔ ان کی شادی مشہور شاعر مجاز ردولوی کی بہن صفیہ سراج سے ہوئی۔ لطف یہ کہ اس شادی کی محرک خود صفیہ تھی۔ صفیہ سے دو بیٹے جاوید اور سلمان پیدا ہوئے۔ وہ اب فلمی دنیا میں بڑا نام کما چکے ہیں اور فلم میں دولت آ تی ہی ہے۔ آزادی کے بعد جب فسادات کا دور ہوا تو گوالیار کے حالات مخدوش ہو گئے۔ یہ گھومتے گھامتے کسی نہ کسی طرح بھوپال پہنچ گئے۔

اس زمانے میں ترقی پسندی کی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی اور بڑا زور شور ہوا لیکن تھوڑے ہی مہینوں کے بعد حکومت نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندیاں عائد کر دیں۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی اس پارٹی کا ایک رخ تھا اس لیے یہ اصحاب بھی پکڑ دھکڑ کی زد میں آ گئے۔ قصہ کوتاہ اختر کو بمبئی پہنچ کر جانے اماں مل گئی لیکن ایسی کہ مجبوبہ دلنواز بیوی کا ساتھ چھوٹ گیا اور بمبئی چلے جانے کے بعد بھی صفیہ حمیدیہ کالج ہی میں ملازم رہی بلکہ اختر کی جگہ صدر شعبہ بن گئی۔ شوہر کی جدائی اور عسرت کی وجہ سے گھلتی گئی اور تپِ دق کے عارضے میں مبتلا ہو گئی۔ آخر ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو صفیہ کا انتقال ہو گیا۔ صفیہ کے خطوں کے دو مجموعے حرفِ آشنا اور نغمہ زیرِ لب چھپ چکے ہیں۔ ان خطوں میں اختر نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اور اس کی والہانہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے کتنی بڑی مایوسی تھی کہ اختر اس کی موت کے وقت بھی پاس نہیں تھے۔

اختر نے دوسری شادی خدیجہ طلعت سے کر لی۔ یہ ایک بڑے اچھے علمی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اختر کے انتقال پر دوستوں اور سرپرستوں

میں جذبۂ علم دوستی بیدار ہوا۔ چنانچہ دس ہزار روپیہ حکومت ہند اور دس ہزار روپیہ مہاراشٹر کی حکومت نے خدیجہ کی امداد کے لیے عطا کیا مزید پانچ ہزار روپیہ کا عطیہ جوان کی وفات کے دن ان کے نمائندوں نے لکھنؤ میں وصول کیا۔ حکومت یوپی کی طرف سے ملا۔

فہرست تصانیف

سات مجموعہ کلام۔ سلاسل بہار، یار گریباں، نذر بتاں، جا وداں، گھر آنگن، خاک دل، پچھلے پہر اور سیکڑوں فلمی گیت اور مکالمے۔ خاک دل پر ساہتیہ اکاڈمی کا ایوارڈ اُن کی موت کے بعد دیا گیا۔

۱۸۔ اگست ۱۹۷۶ء کو انتقال فرمایا۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اختر نے لکھنؤ سے جاتے ہوئے اور صفیہ کی لاش کو ٹھکانے لگا چکنے کے بعد ایک دردانگیز نظم بھی ہے۔ اس نظم کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ سے ہے۔ اس لیے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

خاک دل

(صفیہ کے انتقال پر لکھنؤ سے جاتے ہوئے)

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کیے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

دفن ہے دیکھ مرا عہد بہاراں تجھ میں
دفن ہے دیکھ مری روح گلستاں تجھ میں
میری گل پوش جواں سال امنگوں کا سہاگ
میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب
میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال
میری شاموں کی ملاحت مری صبحوں کا جمال
میری محفل کا فسانہ مری خلوت کا فسوں
میری دیوانگی شوق مرا ناز جنوں
میرے مرنے کا سلیقہ میرے جینے کا شعور
میرا ناموس وفا میری محبت کا غرور
میری نبضوں کا ترنم مرے نغموں کی پکار
میرے شعروں کی سجاوٹ مرے گیتوں کا نکھار
لکھنؤ اپنا جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا ہر خواب جواں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا سرمایۂ جاں، سونپ چلا ہوں تجھ کو

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
دفن ہیں اس میں محبت کے خزانے کتنے
ایک عنوان میں مضمر ہیں فسانے کتنے
اک بہن اپنی رفاقت کی قسم کھائے ہوئے
ایک ماں مر کے بھی سینے میں لیے ماں کا گداز
اپنے بچوں کے لڑکپن کو کلیجے سے لگائے
اپنے کھلتے ہوئے معصوم شگوفوں کے لیے
بند آنکھوں میں بہاروں کے جواں خواب بسائے

یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
ایک ساتھی بھی تہ خاک یہاں سوتی ہے
عرصۂ دہر کی بے رحم کشاکش کا شکار
جان دے کر بھی زمانے سے نہ مانے جو ہار
اپنے تیور میں وہی عزم جواں سال لیے
یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا

دیکھ اک شمع سر راہ گزر جلتی ہے
جگمگاتا ہے اگر کوئی نشانِ منزل
زندگی اور بھی کچھ تیز قدم چلتی ہے

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
دیکھ اس خواب گرناز پہ کل موجِ صبا
لے کے نوروزِ بہاراں کی خبر آئے گی
سرخ پھولوں کا بھرے ناز سے گوندھے ہوئے ہار
کل اسی خاک پہ گل رنگ سحر آئے گی
کل انھیں خاک کے ذروں میں سما جائے گا رنگ
کل مرے پیار کی تصویر ابھر آئے گی
لے مری روح چمن خاک لحد سے تیری
آج بھی مجھ کو ترے پیار کی بو آتی ہے
زخم سینے کے مہکتے ہیں تری خوشبو سے
وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے
مجھ سے کیا بات بنائے گی زمانے کی جفا
موت خود آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے
میں اور ان آنکھوں سے دیکھوں تجھے پیوندِ زمیں
اس قدر ظلم نہیں ہائے نہیں ہائے نہیں
کوئی لے کاش بجھا دے مری آنکھوں کے دیے
چھین لے مجھ سے کوئی کاش نگاہیں میری
لے مری شمعِ وفا لے مری منزل کے چراغ
آج تاریک ہوئی جاتی ہیں راہیں میری

تجھ کو روؤں بھی تو کیا روؤں کہ ان آنکھوں میں
اشک پتھر کی طرح جم سے گئے ہیں میرے
زندگی عرصہ گہِ جہدِ مسلسل ہی سہی
ایک لمحے کو قدم تھم سے گئے ہیں میرے

پھر بھی اس عرصہ گہِ جہدِ مسلسل سے مجھے
کوئی آواز پہ آواز دیے جاتا ہے
آج سوتا ہی تجھے چھوڑ کے جانا ہوگا
ناز یہ بھی غمِ دوراں کا اٹھانا ہوگا

زندگی دیکھ مجھے حکمِ سفر دیتی ہے
اک دلِ شعلہ بجاں ساتھ لیے جاتا ہوں
ہر قدم تو نے کبھی عزمِ جواں بخشا تھا
میں وہی عزمِ جواں ساتھ لیے جاتا ہوں

چوم کر آج تری خاکِ لحد کے ذرے
ان گنت پھول محبت کے چڑھاتا جاؤں
جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

★

عشرت الاکرام

چاند کا روپ ہے دھرتی کے لیے اک سوغات
اس کی جگمگ ہے کہ میرا کے بھجن کا جادو
سینۂ فکر میں جل اٹھتی ہیں قندیلیں سی
روشنی ملتی ہے ذہنوں کو نگاہوں سے سوا
ماہیا چھیڑ کے انفاس کے اکتارے پر
پیاس کی آگ لٹاتا ہے کوئی تند نوا
لے پہ بنسی کی جگاتا ہے کوئی درد کی جوت،
چاندنی چھوتی ہے اس پیار سے ویرانوں کو
جیسے بیمار کے ماتھے پہ کسی نرس کا ہاتھ
ہمہ شب اڑتا ہے پروانے کی مانند چکور
[فرق اتنا ہے کہ جلتا ہے فقط من اس کا]
چودھویں آتی ہے جیسے کوئی الھڑ مالن
پھول رستے میں چنبیلی کے بچھاتی جائے،
بام نوریں سے شبستانِ زمیں کی جانب
اس طرح ایک سبک سیر کرن آتی ہے
کنکری گرتے ہی جیسے کوئی مہتاب جبیں
اونگھتے زینوں سے اک تیر کی صورت اترے
آبجوؤں سے ابل اٹھتی ہے پگھلی چاندی
چھوٹنے لگتی ہیں مہتابیاں کہساروں پر،
پیپلوں کے تلے بس جاتا ہے جادو کا نگر

ڈولتے پتوں میں رہ رہ کے تھرکتی جھلمل
خاک پر نقرئی سکوں سی بکھر جاتی ہے

چاند [دنیا کے لیے] ہدیۂ فطرت ہے مگر
ہدفِ نقد بناتی ہے اسے بھی دنیا
داغ دل کا ہو کہ دامن کا، برا ہوتا ہے
داغ دل کیا ہو عیاں اس کا عیاں ہونا کیا!
داغ دامن کا چھپاؤ بھی تو کب چھپتا ہے
اور اک روز پہنچ جاتا ہے یہ تا بہ جبیں
ترا چہرہ بھی لٹاتا ہے وہی نور مگر
آنکھ اٹھاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ یہ لگتا ہے
تاج پر کھینچ دے جیسے کوئی کاجل کی لکیر
کاش ایسا اس طرح نہ نسبتی تری مہتاب وشی
داغ ماتھے پہ نہ ہوتا کوئی جھومر ہوتا

شکیل احمد صاصم بریلوی

علامتی شاعری میں قنوطیت

شاعری میں جدید رنگ جسے علامتی یا تجرباتی شاعری کے نام سے
وم کیا جاتا ہے عصرِ حاضر میں روایتی شاعری کی متدمقابل (-Coun
-terpa) بن کر ابھری ہے اور ناقدانِ فن نے شعروشاعری کے
، دونوں رجحانات پر اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ میں جدید
قدیم کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے غزل جدید پیکر میں حسین
قدیم رنگ میں لطیف نظر آتی ہے۔ البتہ غزل خواہ وہ جدیدیت کے لباس
، ہو یا قدامت کی پوشاک زیبِ تن کیے ہوئے ہو، اگر اپنے عصری
ضوں کو پورا نہیں کرتی تو بے مصرف و بے کار شے ہے۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ علامتی شاعری نے
د غزل کو ایک نیا رجحان دیا ہے اور اسے حدیثِ دلبری سے زیادہ
یش زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئی نئی تراکیب اور نئے
مفاہیم جدید غزل میں ملتے ہیں۔ اس اعتبار سے جدید علامتوں نے
، کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے لیکن جب ہم جدید غزل کا گہری
سے مطالعہ کرتے ہیں تو ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ مسائل تو
، کرتی ہے مگر مسائل کا حل نہیں پیش کرتی۔

جدید غزل گو شعرا اپنے عصری کرب، مشینی زندگی اور تلخیِ حالات
اس درجہ بیزار ہیں کہ اُن کی بیزاری نے مایوسی اور قنوطیت کی
، اختیار کر لی ہے۔ وہ خود بھی حال سے بیزار اور مستقبل کی ہولناکیوں
رف زدہ ہیں اور اپنے یاس آمیز کلام کے ذریعے قاری کو بھی ذہنی
پر ایک ایسے ماحول میں لے جاتے ہیں جہاں خوف و ہراس، چیرہ
دں اور تیرہ بختیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ

سائنسی دور نے جہاں عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے ہیں وہاں
انسانی زندگی کو درد و کرب کے دہانے پر بھی لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آج
کے مشینی دور میں ہر آدمی مصروفیات سے اس درجہ برسرِ پیکار ہے کہ
وہ اپنے کو انسانوں کی بھیڑ میں تنہا پاتا ہے۔ ظاہر ہے پھر شاعر بھی اپنے
اِرد گرد کے ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ مگر کیا اس کا
یہ مطلب ہوا کہ آج کا شاعر یکسر قنوطیت پسند ہو جائے اور عزم و استقلال
اور حوصلہ مندی کو یاس و محرومی کی خونخوار دیوی کی بھینٹ چڑھا دے۔

جدید غزل کو جب ہم نقد و نظر کی اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو ہلے بے
صفِ اول کے شعرا بھی قنوطیت پسند دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے معاشرتی
مسائل کی نشاندہی تو کرتے ہیں مگر مسئلہ کا حل نہیں پیش کرتے، وہ
مرض کی تشخیص تو کرتے ہیں مگر مرض کا علاج نہیں بتاتے۔ اس طرح
ان کی یاسیت انتہا کو پہنچ کر قنوطیت (Pessimism) کی شکل
اختیار کر لیتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جدید شعرا عزتِ نفس
حوصلہ مندی اور خودداری کا سرمایہ کھو چکے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسائل تو ہر دور میں انسانی سکون کو جھنجھوڑتے
رہے ہیں، کمزور پر ظلم و تشدد تو ہر دور میں ہوا ہے۔ صحیح الفکر انسانوں
کو رسن و دار سے ہر دور میں گزرنا پڑا ہے مگر اس درجہ قنوطیت پسندی
اُردو شاعری میں کبھی نہ تھی جیسی آج دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر ہم تاریخ
کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہر دور میں پیچیدہ ہوشربا
اور سنگین مسائل رہے ہیں مگر ہمارے شعرا نے اپنے رنگ کی انفرادیت کو
برقرار رکھتے ہوئے اپنے کلام سے ٹھٹھرے ہوئے سینوں کو گرمیِ عزم

اور احساس جواں مردی دیا ہے۔

میر کے دور میں بھی انتشار و تمدد کی فضا تھی بلکہ میر کی آنکھوں نے تو اجڑتی ہوئی دلی کو دیکھا تھا اور غریب الوطنی کی زندگی گزاری تھی۔ لیکن میر نے اپنے آپ کو یکسر قنوطیت پسند نہیں بنایا تھا انھوں نے مایوسی کے بجائے غزل کو سوز و گداز کی متاع گراں دی ہے۔ اگر میر نے ایک طرف اپنے غموں کا سراپا اس طرح پیش کیا ہے ؎

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

تو دوسری طرف شکست خوردہ ہو کر یہ تسلی آمیز پیغام بھی دیا تھا ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ میر نے سوز و گداز کو تو انتہا تک پہنچایا مگر وقار و خودی کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کا پیغام اگر چہ صرف تسلی کی شکل میں ہوتا تھا مگر پیغام تو ہوتا تھا، مرض کے لیے دوا تو فراہم کرتا تھا، خواہ وہ اکسیر ہو یا نہ ہو۔

میر کے بعد اگر ہم غالب کے کلام پر اس نقطۂ نگاہ سے ناقدانہ نظر ڈالیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے درد و غم کی انتہائی کیفیت میں بھی تسلی کا پیام دیا۔ سیل حوادث کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے سینہ سپر رہنے کی تلقین کی۔ زندگی کے مسائل غالب کے دور میں بھی تھے۔ غالب نے تو سلطنت مغلیہ کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن غالب نے اگر ایک طرف یاس آمیز لہجہ میں یہ کہا ہے ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

تو دوسری طرف وہ زندگی بخش پیغام بھی پُروقار انداز میں اس طرح دیتے ہیں ؎

پھرتا ہے سیل حوادث سے کہیں مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

غالب اگر ایک طرف زندگی کی بے چینی پر اس طرح شکوہ بلب ہیں "کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد" تو دوسری طرف وہ اس عزم کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کے بعد اگر ہم اس مکتبۂ فکر کا جائزہ لیں جو تعمیری ادب میں یقین رکھتا ہے تو اقبال کا نام سرفہرست آتا ہے اور اردو نقاد اس سلسلہ میں یک رائے ہیں کہ اقبال کا کلام فلسفۂ حیات، مقصدیت اور افادیت سے آراستہ ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اقبال سے زیادہ معاشرتی اور سیاسی مسائل شاید ہی کسی دور میں رہے ہوں۔ اقبال کی آنکھوں نے ہندستان کے داخلی حالات میں انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم، جدوجہد آزادی سے متعلق سیاسی تحریکیں، مسلمانوں کی زبوں حالی اور خارجی حالات میں پہلی جنگ عظیم، سقوط طرابلس اور مغربی تہذیب کی عریانیت دیکھی تھی۔ ایسے حوصلہ شکن حالات میں بھی اقبال نے عزم و استقلال کا پرچم بلند رکھا۔ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے حیات بخش پیغامات دیے۔ ایسے پیغامات جو کل بھی سچے اور صحیح تھے، آج بھی صحیح ہیں اور کل بھی صحیح رہیں گے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال کا کلام افادیت کے نقطۂ نگاہ سے آفاقی (UNIVERSAL) ہے۔ وہ کون ہے جو حسب ذیل پیغامات سے منحرف ہو سکتا ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
! بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اگر ہم تعمیری ادب سے آگے بڑھ کر جدید تغزل کی طرف آئیں تو سب سے پہلی نگاہ شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی پر پڑتی ہے۔ جگر اور شکیل دونوں نے رنگ تغزل میں خودداری اور حوصلہ مندی کو نمایاں مقام دیا ہے، بلکہ جگر کا کلام تو بعض جگہ ایک چیلنج کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اگر جگر ایک طرف یہ فرماتے ہیں ؎

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

تو دوسری طرف اس عزم و توانائی اور وقار و خودی کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں ؎

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

ہاں جذبِ غمِ عشق کی تاثیر دکھا دے
مجبور نہ بن حسن کو مجبور بنا دے

اسی طرح شکیل بھی اگر ایک طرف عالمِ مایوسی میں یہ کہتے ہیں ؎

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈھیے
میں کسی کا حسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

تو دوسری طرف اپنی ذہنی مایوسی کو امید کی کرن اس طرح دکھاتے ہیں ؎

شکیل دوریِ منزل سے ناامید نہ ہو
اب آئی جاتی ہے منزل اب آئی جاتی ہے

رنگِ تغزل کے بعد اگر ہم ترقی پسند تحریک پر نظر ڈالتے ہیں تو فیض، ساحر لدھیانوی اور مجاز کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سب کی شاعری سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان شعرا کی شاعری محلوں میں پلنے والوں کی نہیں بلکہ کسان اور مزدور کی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام غریب اور مفلس عوام میں زیادہ مقبول ہوا۔ ان سب نے اپنے ولولہ انگیز اور جذباتی کلام سے پسماندہ طبقے میں جوش و خروش، عزم و بیداری اور ہمت و حوصلہ کا جذبہ جگایا۔ انھوں نے ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام پر تعمیری تنقید کی تو دوسری طرف اُن کا حل بھی پیش کیا۔ مثلاً ساحر کے اس شعر کے تاثر کو دیکھیے۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اس شعر کو سننے کے بعد مزدور کش عوام میں شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرنا لازمی ہے۔ مجاز کی نظم "سرمایہ داری" بھی ایسے ہی خیالات کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں انھوں نے سرمایہ داری کو ایک ڈائن، خونخوار دیوی اور ناگن کا نام دے کر انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ترقی پسند شعرا کے کلام میں بھی مقصدیت تھی خواہ وہ ایک طبقہ کی حمایت پر مبنی تھی۔

ان تمام مکتبۂ فکر کے بعد اگر ہم علامتی شاعری (جدید غزل) میں یقین رکھنے والے شعرا کے کلام کو دیکھتے ہیں تو وہ علامت کے حسن سے تو مزین دکھائی دیتا ہے مگر افادیت کے نقطۂ نگاہ سے دیوالیہ نظر آتا ہے۔ اُن کے کلام میں عصری مسائل پر تنقید بھی قنوطیت آمیز لب و لہجہ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ شعر گوئی کے وقت شاعر کے اس عظیم فرض کو بھی بھول جاتے ہیں کہ شاعر کا کام ایک طرف وقت کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلیاں رکھنا ہے تو دوسری طرف اسے ایسی تدابیر کی بھی نشان دہی کرنا ہے جو اس معاشرہ کی خامیوں کو دور کرنے میں معاون ہوں۔ محض مرض، مرض پکارنے سے مرض دور نہیں ہو جاتا بلکہ اس مرض پر قابو پانے کے لیے ضروری تدابیر، علاج و معالجہ اور پرہیز بھی ضروری ہے۔ اسی طرح بیمار سماج کی برائیوں کو چند خوبصورت الفاظ میں بیان کر دینے اور خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دینے سے معاشرے کی اصلاح نہیں ہو جاتی۔

اس اعتبار سے اگر صفِ اول کے جدید شعرا کا کلام دیکھا جائے تو وہ بھی قنوطیت پسند دکھائی دیتے ہیں مثلاً نشتر خانقاہی جن کا شعری مجموعہ جدید شاعری کا بہترین غزل دستہ ہے، وہ بھی قنوطیت کے شکار ہیں۔

دوسرے جدید شعرا مثلاً مخمور سعیدی، خورشید احمد جامی، فضا ابن فیضی، بانی، عمیق حنفی وغیرہ کا کلام بھی یاس آمیز لب و لہجہ لیے ہوئے ہے۔ گویا احساسِ تنہائی، زندگی سے بیزاری اور مایوسی جدید شعرا کی شاعری کی روح بن کر رہ گئی ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے جدید شعرا کے لیے یہ لمحۂ فکر ہے کہ وہ مشکل حالات میں اور عصری کرب کے باوجود اپنے اشعار کو قنوطیت اور یاسیت سے محفوظ رکھیں اور اپنی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں کو ہر طبقۂ خیال کے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

غزلیں

حیات لکھنوی

متاعِ چشمِ تمنا کی آس بنتا ہے
ٹپک پڑے تو ہر آنسو لباس بنتا ہے

وہ تشنگیِ نظر ہو کہ تشنگی دل کی
ہر اعتبار سے وہ میری پیاس بنتا ہے

اب اعتماد و یقیں کا ہو فیصلہ کیسے
تمام عمر کا حاصل قیاس بنتا ہے

گلے تمام ہوئے دورِ ناشناسی کے
کرو یہ شکر کوئی حق شناس بنتا ہے

اُسی میں ڈھونڈھ رہا ہوں مسرتوں کے چراغ
وہ ایک لمحہ جو تصویرِ یاس بنتا ہے

جہاں بھی تذکرۂ حسن و عشق پاتا ہوں
مری کتاب کا وہ اقتباس بنتا ہے

اسے لطافتِ غم سے بھی واسطہ نہ رہا
جو شاد کام بھی ہو کر اداس بنتا ہے

اُسے مرقعِ ہوش و حواس بھی سمجھو
جو دیکھنے میں بہت بدحواس بنتا ہے

حیاتؔ اگر دوستوں کے ہاتھوں سے
تو زہرِ تلخ بھی آخر مٹھاس بنتا ہے

سعید عارف

نذرِ مخدوم

یا تو مری جانب سے تجھے بے خبری ہے
یا سادہ مزاجی تری فطرت ہی رہی ہے

اس سمت بھی شاید ہے کوئی خواب کا منظر
بے وجہ کہیں یاد کی لو تیز ہوئی ہے

سلگا کیے دن رات خیالوں کے شبستاں
ہر سمت سے در بند ہے اور آگ لگی ہے

افسردہ مزاجی کا مری حال نہ پوچھو
موہوم امیدوں کی خلش سرد پڑی ہے

خوابیدہ چراغوں سے ہی سورج کا بھرم ہے
تاریکیِ احساس بھی بالغ نظری ہے

ہوتی ہے فزوں اور مری تشنگیِ شوق
کچھ سوچ تو شبنم سے کہیں پیاس بجھی ہے

مفتون کوٹوی

راجہ بھوانی سنگھ ★ اور اُردو

۱۸۷۳ء تا ۱۹۲۹ء

بہ آں گروہ کہ از ساغر وفا مست اند
زما سلام رسانید ہر کجا ہست اند

مہاراجہ رانا سر بھوانی سنگھ کے۔سی۔ایس۔آئی ۲ ستمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ ۶ فروری ۱۸۹۹ء کو ریاست جھالاواڑ (راجپوتانہ) کی مسندِ حکومت پر بیٹھے۔ میو کالج میں تعلیم پائی۔ منشی شمبھو دیال دانش کی ایک نظم کلیات دانش میں شامل ہے جس کا عنوان ہے "میو کالج کی تعلیم کا اثر" دوران جنگ عظیم ۱۷ جنوری ۱۹۱۵ء کو یہ نظم لکھی گئی ہے اس کے پس منظر میں یہ اشارات مہاراج رانا بھوانی سنگھ کی طرف ہی ہیں۔

ہے بجا لے میو کالج فخر تو جتنا کرے
فرض اپنا کر دیا اچھی طرح تونے ادا
نکتہ چینی جو کیا کرتے تھے یہ تعلیم پر
کر دیا کرتی ہے کم یہ آدمی کی بیرتا[1]
ان پہ ثابت کر رہے ہیں ترے شاگرد رشید
دیکھ لو میدان میں آکر اثر تعلیم کا
بن رہے ہیں وہ مجسم اک لڑائی کی مشین
ہو رہی ہے آج ان پر خود جواں مردی فدا
آج وہ پہلی سی خو ان رئیسوں میں کہاں
ہے خیال ان کو کہاں اب عیش کا آرام کا
ہمت عالی نے ان کی کر دیا کایا پلٹ
اور ہی کچھ اُن مہاپرشوں کا عالم ہو گیا

اس کے بعد میدان جنگ میں لڑنے والوں کا ذکر ہے پھر ان کا جو گھر بیٹھے ہوئے حق وفاداری ادا کر رہے ہیں ؎

حال اب ان کا بھی سنیے جو یہاں موجود ہیں
کر رہے ہیں پست یہ بھی دشمنوں کا حوصلا
دے رہے ہیں یہ مدد ہر کام میں ہر بات میں
کر رہے ہیں حق وفاداری کا گھر بیٹھے ادا
یادگیران وطن کی راحتوں کے واسطے
کر رہے ہیں انتظام فرحت افزا نیا

بقول منشی عزیز الرحمٰن عزیز جھالاواڑی راجہ صاحب نے اردو فارسی سید مصطفےٰ احسین رضوی، بابو چھیدا لال ماتھر اور مولوی خلیل الدین سے پڑھی۔ راجہ بھوانی سنگھ اگرچہ سخن ور نہیں تھے لیکن سخن فہم بہت اچھے تھے۔ کلیات دانش کا ڈیڈیکیشن جب انھوں نے اپنے نام پر منظور کیا تو جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔

"اگرچہ شاعری کی خوبیوں کو میں تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن خود شاعر نہیں۔" ان کی سخن فہمی اور قدر دانی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ جسے نیرنگ مرحوم نے اپنے دیوان "سرمایہ افتخار نیرنگ" ۱۹۲۹ء میں شکریہ اعزاز کے عنوان سے بہ ایں الفاظ درج کیا ہے:۔ "کہ والی ریاست نے اس مجموعہ کی ہر غزل کو مطلع سے مقطع تک ملاحظہ و سماعت فرما کر جا بجا قیمتی مشوروں سے عزت بخشی۔ غالباً یہ پہلا دیوان ہے جسے ایک والی ملک نے خاص وقت مقرر کر کے حرف بہ حرف سماعت فرمایا اور دربار عام منعقد فرما کر اس ہیچ میرز کو سند افتخار الشعرا مطبوعہ لندن عطا کر کے اعزاز و افتخار بخشا اور دیوان بہ غرض طبع نیر پریس

---

[1] بہادری

لکھنؤ میں بھیج دیا۔"

کلیات دانش (۱۹۴۶ء) میں جناب دانش نے اسی رئیس کی قدرشناسی اور شعر فہمی کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

"مجھے ایسی مثالیں تو ہسٹری میں سینکڑوں ملیں اور آئے دن زمانہ میں ملتی رہتی ہیں کہ علمی خطابات والیانِ ملک کی قدردانی نے عالموں کو دیے۔ اور ان کی ذاتی قابلیت نے حاصل کیے۔ مگر ایسی مثال ایک بھی نہ ملی کہ ایک والیِ ملک اپنے ایک ناچیز بندے کو برسوں اپنی فاضلانہ اصلاح سے اس کی شاعری کو زمانہ کے موافق بنا کر ملک الشعراء کا وہ ممتاز خطاب عطا فرماتا ہے جو خاقانیِ ہند ملک الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوق کے بعد آج تک کسی کو نہ ملا تھا۔ اور اس ملنے میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ذوق کو یہ خطاب، ذوق کی خداداد افضلیت، ان کی اعلیٰ درجہ کی زبردست شاعری نے دلوایا اور قدرداں بادشاہ نے دیا۔ لیکن اس خاکسار کو صرف حضور والا ہی کی قدردانی اور قابلیت دونوں نے مل کر عطا فرمایا۔ ع بیں تفاوت رہ از کجا ست تا بہ کجا ست"

"کلیات دانش" کو جب رئیس موصوف نے اپنے نام پر معنون ہونا منظور کیا تو "الطاف خسروانہ" کے تحت جناب دانش نے اس کا ذکر کرتے ہوئے گلستاں کا یہ شعر کچھ ترمیم کے ساتھ درج کیا ہے ؂

ز قدر و عزت سلطاں نگشت چیزے کم
کلاہِ گوشۂ دانش بہ آفتاب رسید

ایک اور موقع پر دانش نے اعتراف کیا ہے ؂

مجھے فخر ہے صرف اس بات کا — کہ آقا نہایت ہی قابل ملا
رئیسوں میں جو خوبیاں چاہییں — وہ موجود ساری ہیں سرکار میں
کسی کو ستانا نہیں جانتے — دلوں کو دکھانا نہیں جانتے
یہ ہیں دشمن و دوست کے خیرخواہ — بتاتے ہیں دونوں کو یہ نیک راہ
رئیسوں میں ان کو ہے یوں برتری — کہ دستارِ علم ان کے سر پر بندھی

جناب نیرنگ کی قدردانی جو رئیس موصوف نے کی اس کے متعلق چند اشعار مختلف شعراء کے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؂

سرکار کے خسروانہ الطاف — ہیں باعثِ افتخارِ نیرنگ
جتنے کھلے جوہرِ لیاقت — اتنا ہی بڑھا وقارِ نیرنگ
بخشا اعزاز ہم نشینی — عزت ہوئی ہم کنارِ نیرنگ
دیوان سنا خطاب بخشا — کیا کیا نہ ہوا وقارِ نیرنگ

—— منشی سکندر خاں اثر

سرکار نے کی جو قدردانی — ذرّہ بنا آفتابِ ثانی
پارس جو بنا ہوا تھا پتھر — دکھلائے سبھوں کو اس کے جوہر
الماس کی روشنی دکھائی — ہونے لگی سب کی رہنمائی
سرکار سا جوہری جو پرکھے — ہیرا آنکھوں میں کیوں نہ چمکے؟
بے شک وہ نگاہ ہے کسوٹی — کرتی ہے الگ کھری سے کھوٹی
پنشن میں عطا ہوئی ترقی — دربار میں بھی نشست بخشی
یہ فخر بھی کم نظر میں آیا — بخشا لقب افتخار الشعراء

—— منشی عبدالعزیز عزیز

والیِ جہالراپاٹن کو خدا خوش رکھے — کر دیا جس نے تمنا کو ہماری پورا
حکم بخشا کہ ہو نیرنگ کا دیوان تیار — نامِ نیرنگ رہے جس سے ہمیشہ زندہ
کس کا دیوان ہے ایسا یہ کوئی بتلائے — ایک اک لفظ ہو جس کا کسی سلطان نے سنا
جس پہ سرکار کی اس طرح پڑی ہو نظریں — ایسی تصنیف کا فرمائیے پھر کیا کہنا

—— حافظ محمد یٰسین فخر

راجہ کی سخن فہمی و قدرشناسی

نیرنگ مرحوم نے اپنے دیوان میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس سے اس رئیس کے درکِ شاعرانہ کا پتہ چلتا ہے۔ نیرنگ مرحوم کی غزل کا شعر یہ تھا ؂

پائی ہلالِ چرخ نے کیا نان بے طلب
رتبہ یہ ہے بلند لبِ بے سوال کا

نیرنگ صاحب لکھتے ہیں کہ سری حضور دام اقبالہٗ نے جب یہ شعر سنا تو فرمایا کہ شعر بہت اچھا ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ نان کی تشبیہ بدر سے دی جائے۔ اس مشورہ کے تحت نیرنگ مرحوم نے شعر یوں بدل دیا ؂

پالے میں ہر پرچرخ ہے اک نان بے طلب
رتبہ بلند ہے دہن بے سوال کا

نیرنگ صاحب نے متعدد اشعار میں راجہ صاحب کی سخن فہمی اور قدر شناسی کا اعتراف کیا ہے ؎

کیا سخن فہم ہے بھوانی سنگھ — نقد معنی کا وہ عیار ہے خاص
قدر دانی ہے مہاراج کی بے شک نیرنگ — ہے فقط روز ہمیں لطف سخن غربت میں
نیرنگ سلطنت بھی اگر ہو تو میں نہ لوں — راجہ بھوانی سنگھ کی سرکار کے عوض

کیفی ٹونکی فرماتے ہیں ؎

راجہ بھوانی سنگھ نے کی قدر کیفی کی
اچھا ہوا غریب کی بگڑی سنبھل گئی

راجہ صاحب کی گفتگو کا لہجہ دل پذیر، تقریر دل نشیں، تحریر صاف، اور رواں اور یہ سب کچھ اُردو میں۔ چھوٹے ملازم تک سے تم کہتے تو نہ کہتے۔ راجپوت راجاؤں میں کم راجہ ایسے ہوئے ہیں جو ایسی شستہ و شائستہ بات چیت کرتے ہوں۔ کلیات دانش کا ڈیڈیکیشن اپنے نام پر منظور کرنا، اس سلسلہ میں عام جلسہ کرنا، اسے خطاب کرنا۔ نیرنگ صاحب کا دیوان حرف بہ حرف سننا۔ قیمتی مشورہ دینا، اسے چھپوانا، بہ حیثیت شاعر دربار میں نشست مقرر کرنا، شعراء کو خطابات سے نوازنا۔ یہ سب باتیں رشانہ تھیں۔ راجہ کی دلچسپی، اُردو دوستی اور شعرا نوازی کی ترجمانی کرتی ہیں۔ قاضی سر عزیز الدین احمد "سی۔ آئی۔ ای۔" "او۔ بی۔ ای" "آئی۔ ایس۔ او" وزیر اعظم ریاست دتیا دیوان نیرنگ میں لکھتے ہیں کہ "مجھ کو بھی ہز ہائی نیس سے بہت پرانی نیاز مندی کا اعزاز حاصل تھا اور جب میں افیون کمیشن کے سلسلہ میں جھالا واڑ گیا تو سری حضور (ہز ہائی نیس بھوانی سنگھ) نے منشی عبدالرحیم نیرنگ اور ان کے کلام کا نہایت قدر و منزلت و محبت سے تذکرہ فرمایا اور خوش خبری سنائی کہ نیرنگ صاحب کا دیوان عنقریب شائع ہونے والا ہے" یہ عبارت راجہ کی قدر دانی اور سخن فہمی کی مظہر ہے۔

ابوالبیان سید رفیق احمد علوی سلیم کاکوروی مہتمم مارج ریاست راج گڑھ بیاورہ ۵ر نومبر ۱۹۲۹ء کو دیوان نیرنگ کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں ؎

"آپ کے (راجہ بھوانی سنگھ کے) کل عہد حکومت پر غائر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد کی نمایاں شان قدر دانی و علمی سرپرستی تھی، جس کی وجہ سے ہر علم و فن کے واقف کار اور فاضل دور دور سے آ کر اس سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہو گئے۔ آپ کے دربار میں زبان انگریزی کے فاضل، ہندی سنسکرت اور بھاشا کے ودوان پنڈت، عربی و فارسی کے عالم اور زبان اردو کے ادیب و شاعر روزانہ صبح سے دس بجے تک دربار میں حاضر رہتے تھے۔ یہ علماء اور صاحبان فن پر مشتمل دربار محض نمائشی نہ ہوتا بلکہ راجہ بھوج، ہارون الرشید اور مامون الرشید کی مجالس علمیہ کی طرح ہر علم و فن پر دلچسپ مباحثے ہوتے تھے۔ اور ہز ہائی نیس خود ہر علم و فن میں خاص دلچسپی سے کام لے کر بامو قع داد دیتے اور طبیعت بڑھاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاست جھالا واڑ کی اُردو شاعری ہز ہائی نیس آنجہانی کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ آپ نے اپنی سرپرستی اور قدر دانی سے اساتذۂ فن کو جمع کر کے اس چھوٹی سی بستی میں سیکڑوں شاعر پیدا کر دیے۔ روزانہ وقت مقررہ پر دیوان نیرنگ کو تمام و کمال سنا۔ اور بذات خاص غزلیات کا انتخاب کر کے بعد ترتیب بغرض اشاعت پریس میں بھجوا دیا"

"سرمایۂ افتخار نیرنگ (دیوان نیرنگ) صفحہ ۹"

شعرا کے رنگ سخن میں تبدیلی

راجہ صاحب ممدوح کا سب سے زیادہ قابل ستائش کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو فطرت اور زندگی کے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ ادب کو برائے زندگی استعمال کرنے اور ادب میں حیات و کائنات کے مسائل اور وقتی ضرورتوں اور ہنگامی داعیوں کو سمونے کی ترغیب شعرا کو دی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے منشی شمبھو دیال دانش پر زیادہ

توجہ صرف کی۔ کلیات دانش کے دیباچہ میں مولوی نیرنگ مرحوم فرماتے ہیں۔
جب اس عالی دماغ اور موقع شناس رئیس نے بخوبی محسوس کرلیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ جو مشورہ دیا جائے وہ تیر بہدف ہوگا تو ایک دن ارشاد فرمایا کہ شمبھو دیال (دانش) میں تمھارے خیال کی بلندی اور شستگی زبان کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ لیکن جس شاعری میں تم اپنی جودت طبع اور ذہانت کو صرف کرتے ہو وہ محض بے کار اور بے فائدہ ہے گل و بلبل کیا چیز ہے؟ زلفوں کو ادھر اُدھر کھینچنے کا کیا نتیجہ؟ ہاں اگر یہی دماغ سوزی ایسی شاعری میں کرو جس میں سچی باتیں ہوں تو ملک کو فائدہ پہنچے، سننے والا مستفید ہو اور تم بھی خوش ہو، غرضیکہ سرکار عالی جاہ نے شاعری کے متعلق ایسا پُراثر لیکچر دیا کہ اسی وقت حضرت دانش کا رنگ طبیعت بدل گیا۔ پھر تو انھوں نے لالہ زار سخن میں ایسے ایسے اچھوتے گل کھلائے کہ جس کی نکہت دلکشا سے اہل سخن کے دل و دماغ معطر ہوگئے۔
(صفحہ ت)

راجہ صاحب نے کلیات دانش کے پیش کیے جانے پر ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے انھیں خیالات کی تائید کی ہے۔

"جھالاواڑ میں بھی اُردو شاعری کے متعلق عرصہ سے خیالات ویسے ہی تنگ چلے آتے تھے عاشق کی شکایت، معشوق کا ظلم، پیر مغاں کے ساتھ طعنہ زنیاں، بس انھیں چند مضامین کو طرح طرح سے باندھنا شاعری خیال کیا جاتا تھا، نیچر کی پر از راز کتاب ان کے سامنے کوئی معنی نہ رکھتی تھی حالی کا نیا رنگ ممنوع خیال کیا جاتا تھا۔ اُردو شاعری کے محدود دائرہ میں ہونے کا خیال آکر مجھے اکثر افسوس ہوا کرتا تھا۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ وہی راستے اختیار کرے جو موجودہ تہذیب اور ضرورت زمانہ کے موافق ہوں اس کو سمجھنا چاہیے کہ سوسائٹی کی حالت بدل گئی ہے۔ زمانہ کسی دوسرے رنگ پر چل رہا ہے۔ جو مذاق سوسائٹی نے کسی زمانہ میں جائز رکھا تھا اب وہ اچھی سوسائٹی میں جائز نہیں ہے" ـــــ (۱۸۴)

لالہ شمبھو دیال کے کلیات دانش میں اسی قسم کی شاعری ہے۔
راجہ صاحب کے ان خیالات نے نہ صرف دانش کو بلکہ یہاں کے دیگر شعراء کو بھی متاثر کیا اور انھوں نے اپنا رنگ سخن بدل کر جدید انداز شعر گوئی اختیار کیا۔ یعنی تعمیری و مقصدی شعر گوئی کو اپنایا۔

شاعری کی کایا پلٹ

یہ سہ ماہی رسالہ اسی قسم کی جدید شاعری کا ترجمان تھا۔ جس کے دستور العمل میں تھا کہ اس کی نظمیں علمی و ادبی، اخلاقی تمدنی، معاشرتی ہوا کریں گی۔ پولیٹکل یا بہاریہ نظمیں درج نہ کی جائیں گی۔ اس رسالہ کا ایک شمارہ فی الوقت میرے پیش نظر ہے۔ اس کا سرسری تعارف یہاں بے جا نہ ہوگا۔ اس کی پہلی نظم ہے کتاب (از دانش) پھر اقبال مرحوم کی وہ نظم ہے جس کے یہ اشعار بڑے مشہور ہیں ؎

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

خدا (از آغا شاعر قزلباش مدیر رسالہ آفتاب جھالاواڑ) نقص عدم تعلیم نسواں (از فیاض صاحب پریسیڈنٹ انجمن سخن جھالاواڑ) اس نظم کے آخری تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

شکر ہے فیاض اس معبود کا — اپنا آقا ہے وہ عالی حوصلا
جس کو تعلیم و تعلّم سے ہے کام — ملکوں ملکوں میں ہے جس کا نیک نام
تیرا ہی صدقہ ہیں یہ دُرِّ ثمیں — اے بھوانی سنگھ بہادر آفریں

نیرنگی زمانہ (از جناب اثر جھالاواڑی)۔ اتحاد (از رونق دہلوی) ہماری حالت (از منشی وجیہ الدین حنیف) علم (از یک رنگ)۔ آپ اچھا تو جگ بھی اچھا ہے (از تسلیم جھالاواڑی)۔ دوست ناداں وبالِ جاں ہوتا ہے (از ابو طالب حسین) علم (از شرر جھالاواڑی)۔ منیر بیگ صاحب رنگین کی غزل اسی قسم کی ہے ؎

یہاں تک ہم کو محتاجی ہوئی یورپ کی ہر فن میں
کہ زیور ہوگیا طوق غلامی اپنی گردن میں

جناب شائق جھالاواڑی تلمیذ نیرنگ کے یہ اشعار ان کی غزل سے پہلے درج ہیں ؎

وہ لکھو جو شاعری ہے کام کی — چھوڑ دو باتیں گل و گلفام کی
وقت ضائع کرچکے آغاز میں — اب تو کچھ سوچو ذرا انجام کی

ان کی غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ فرمائیے ؎

ترقی جس قدر ممکن ہو کیجیے انجمن کشش میں
کہ جس سے خود بخود ہو جائے گی اصلاح نیشن میں
جنھیں کچھ حس نہیں ہے گردشِ دوراں کا اے شائق
انھیں کہہ دو کریں آرام جا کے کُنجِ مدفن میں

پندرہ روزہ بزم مشاعرہ ۱۹۰۵ء

دیوانِ نیرنگ میں مرقوم ہے کہ تقسیم ریاست کے بعد مشاعرے قطعاً موقوف اور بازار شعر و سخن سرد پڑ گیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں ہز ہائی نس مہاراجہ رانا سر بھوانی سنگھ صاحب کے ایما سے ایک پندرہ روزہ مشاعرہ کی بنیا ڈالی بلکہ یوں کہیے کہ شاعری کے قالب بے جان میں جان ڈالی گئی۔ حضرت نیرنگ شرکت کے لیے مجبور کیے گئے۔ جس نے ذوق و شوق سخن دو بالا اور ہر موزوں طبع کو شعر و سخن کا دلدادہ کر دیا۔ (از مولوی نور الحسن نیرؔ مؤلف نور اللغات) صفحہ ۱۳۔

۱۹۰۷ء میں چند مجبوریوں کی بنا پر راجہ بھوانی سنگھ ہی کے دورِ حکومت میں سرکاری زبان اُردو کے بجائے ہندی کر دی گئی لیکن جائزہ زبان اُردو کے بقول اس سے راجہ کی اردو نوازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ رسالہ آفتاب کا اجراء رئیس موصوف کی اُردو کی وہ بڑی خدمت ہے جسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

رسالہ آفتاب جھالاواڑ ۱۹۰۶ء

میرے پیش نظر رسالہ آفتاب جھالاواڑ جلد اول ماہ فروری ۱۹۰۶ء نمبر اول ہے۔ اس کے ایڈیٹر سید محمد حسین رضوی اور سب ایڈیٹر پنڈت پرشوتم لال شرما ہیں۔ "مقاصد آفتاب" میں ایڈیٹر نے تحریر کیا ہے:۔ "خوش قسمتی سے اس مرتبہ ایسا جلیل الشان محرک میسر آ گیا کہ جس نے میرے مذبذب ارادے کو مستحکم کر دیا۔ مجھ کو زبان اُردو کی خدمت کے لیے کمر ہمت باندھنا پڑی۔ اس جلیل الشان محرک سے میری مراد حضور پُر نور خداوند نعمت راج رانا بھوانی سنگھ صاحب والیِ ریاست ابد قرار جھالاواڑ ہیں۔ جن کے علم و فضل اور داد و دانش سے تمام اہلِ جہاں معترف ہیں۔ حضور ممدوح نے اس زبان (اُردو) کے وجود کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ حسب ایما خداوند نعمت سری مہاراج رانا صاحب بہادر والیِ جھالاواڑ یہ ماہواری رسالہ آفتاب نکالنے کا قصد کیا گیا ہے۔ اس کے مقاصد یہ ہیں کہ زبان اُردو کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی جائے اس میں علوم جدیدہ کے خزائن منتقل کیے جائیں۔ اردو داں پبلک کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی حالتوں سے بھی بحث کی جائے تاکہ جو نقائص سوسائٹی میں موجود ہوں ان کی کچھ اصلاح ہو سکے۔" (صفحہ ۲)

جائزہ زبان اُردو ۱۹۴۰ء کے بقول ۱۹۰۹ء تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔ پھر اس کے مدیر کی وفات کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ تاہم اس آن بان کے ساتھ نکلا کرتا تھا کہ اس کے معیار کی تعریف ۱۸ اپریل ۱۹۰۷ء کے خط میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے بھی کی۔ شمس العلماء مولانا حالی بھی اس آفتاب کی درخشانیوں اور تابانیوں کے سلسلہ میں رطب اللسان ہیں۔ "جائزہ" میں یہ خطوط چھپے ہیں۔

آفتاب کا مکرر اجراء

جنوری ۱۹۲۰ء سے آغا شاعر قزلباش مرحوم کی ادارت میں اس رسالہ کا مکرر اجراء ہوا۔ اور یہ غالباً ۱۰ سال تک نکلتا رہا۔ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء کا شمارہ میرے پیش نظر ہے جو جلد ۸ نمبر ۱۱ ہے۔ "جائزہ زبان اُردو" کی مندرجہ عبارت اس موقع پر درج کی جا رہی ہے۔ "سید مصطفےٰ حسین رضوی رسالہ " شاعری کی کایا پلٹ " میں فرماتے ہیں:۔ اردو زبان کی یہ کم مائیگی اور اس پر تمام دفاتر ہائے راجپوتانہ میں اور دیگر صوبہ جات میں اردو حرفوں کے بجائے ناگری اکھروں کا رواج پایا جانا راجپوتانہ میں اردو زبان کی فنا کے لیے کافی تھا، اگر کوئی سر جیون چشمہ اس کی آبیاری پر نہ تل جاتا اور اس کی مدد پر کمر ہمت نہ کس لیتا۔ انھیں خیالات سے متاثر ہو کر اور زبان اُردو کو بہ لحاظ زبان راجپوتانہ و دیگر ممالک کے لیے ضروری خیال فرما کر ہمارے آقائے نامدار حضور مہاراج بھوانی سنگھ صاحب بہادر، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ والیٔ ریاست جھالاواڑ نے جو علوم و فنون کے مخزن ہیں اور جو دنیا کی کئی زندہ زبانوں کے ماہر ہیں جہاں دفتر میں ناگری حرفوں کے رواج کا حکم نافذ فرمایا، وہاں ساتھ ہی ساتھ بقائے

اُردو کے لیے زیر ایڈیٹری سید محمد حسین رضوی بی۔ اے مرحوم ایک رسالہ موسومہ آفتاب ریاست ہٰذا سے نکالے جانے کا حکم بھی نافذ فرمایا۔ یہی آفتاب جو سابق ایڈیٹر کی ناگہانی موت کے باعث صرف تین چار سال ہی اپنی شعاعیں پھیلا کر یک لخت غروب ہو گیا تھا۔ اب شروع جنوری ۱۹۲۰ء سے زیر ایڈیٹری افسر الشعراء جناب آغا شاعر قزلباش دھلوی پھر نہایت آب و تاب سے طلوع ہوا ہے اور زبان کی جو خدمت کر چکا ہے اور کر رہا ہے اہل ملک سے پوشیدہ نہیں۔ اس دلدادۂ علوم نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے انجمن سخن کی بنیاد ڈالی اور اس طرح زبان اُردو کی بقاء کے لیے ہمیشہ ہمیش کو انتظام فرما کر جو احسان شعراء ہند پر کیا ہے اس کا شکریہ اگر ہمارے بال بال زبان ہو جائیں، جب بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔"

انجمن سخن ۱۹۱۸ء

اوپر کی عبارت کی اس سطر کو ملاحظہ فرمائیے :۔ اس دلدادہ علوم نے (راجہ بھوانی سنگھ نے) اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں انجمن سخن کی بنیاد ڈالی"۔ صدر اس انجمن کے صاحب زادہ محمد فیاض علی خاں صاحب فیاض تھے۔ جن کے تین اشعار "نقص عدم تعلیم نسواں" عنوان کے نظم سے میں اوپر رسالہ "شاعری کی کایا پلٹ" کے سلسلہ میں درج کر چکا ہوں۔ اس کے سکریٹری تھے سید مصطفیٰ حسین رضوی۔ "جائزہ" میں مرقوم ہے کہ رسالہ سہ ماہی "شاعری کی کایا پلٹ" میں تین مہینے کا کلام جمع کر دیا جاتا تھا۔ اس رسالہ کا اجراء اس وقت سے ہوا تھا جبکہ سابق مہاراج (راجہ بھوانی سنگھ) شعرا کو نیچرل شاعری پر چلنے کی رہبری فرما چکے تھے انجمن سخن بھی راجہ صاحب موصوف کے ایما ہی سے وجود پذیر ہوئی تھی تو اس رسالہ میں جو سہ ماہی کلام چھپتا تھا وہ یقیناً اسی انجمن سخن میں پڑھا جانے والا کلام ہوگا۔

رسالہ جنگ یورپ ۱۹۱۴ء

یورپ کی جنگ عظیم پر دلچسپ لیکچروں کا یہ سلسلہ راجہ بھوانی سنگھ کے حکم سے شروع ہوا۔ جائزہ زبان اُردو ۱۹۴۰ء مرتبہ انجمن ترقی اُردو ہند میں لکھا ہے کہ ہر افسر موضوعات جنگ میں سے کسی ایک موضوع کو اختیار کر کے اس پر تیار ہو کر لیکچر دیا کرتا تھا۔ یہ تمام لیکچر سرکاری مطبع میں چھپ چکے ہیں ان کی زبان اُردو ہے۔ میں اس عبارت میں یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ نہ صرف سرکاری افسر ہی یہ لیکچر دیا کرتے تھے بلکہ خود راجہ صاحب موصوف نے بھی کئی لیکچر دیئے ہیں۔ اور ان سب کی زبان اُردو ہے۔ بابو اہل بہاری لال بی۔ اے اور لالہ شمبھو دیال دانش اس کے ایڈیٹرز تھے۔ پہلا لیکچر کب دیا گیا، نہیں کہا جا سکتا نہ یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ آخری لیکچر کون سا تھا۔ البتہ "سب میرین" لیکچر نمبر ۲ ہے جو ہز ہائی نیس مہاراج رانا بہادر والیٔ جھالاواڑ (راجہ بھوانی سنگھ) کا ہے۔ ستمبر ۱۹۱۷ء اس میں تاریخ درج ہے۔ اس کی طباعت و کتابت غنیمت ہے۔ کاغذ سفید اور سیاہی روشن ہے۔ جابجا ہاتھ کی بنائی ہوئی شکلوں سے عبارت کی وضاحت کی گئی ہے جس سے مطالب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان لیکچروں کے ساتھ لالہ شمبھو دیال دانش کی نظمیں بالعموم چھپتی تھیں جن کے عنوانات موضوعات جنگ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک اعلان سے جو لیکچر نمبر ۲ کے آخر میں درج ہے کچھ سطریں درج کر رہا ہوں جن سے ان رسالوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا :۔

> "ان رسالوں میں ریاست کے بڑے بڑے لائق صاحب دل کے مضامین درج کیے جاتے ہیں۔ ان مضامین سے ناظرین کو علاوہ وجوہات جنگ لڑنے والی طاقتوں کے حالات، جاسوسوں کے کارنامے، میدان جنگ میں ڈاک رسانی و خورد و نوش کے انتظامات سب میرین ہوائی جہاز ان کے آلات حرب کے مفصل حالات جو اس جنگ میں کام دے رہے ہیں لڑنے والی بعض سلطنتوں کی تواریخیں۔ ہندوستانی سپاہ کے کارنامے، غرض کہ ہر طرح کے عجیب و غریب حالات معلوم ہوا کریں گے۔ طالب علم ان کے ذریعے سے تاریخی معلومات نہایت آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں۔ زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ ہر رسالہ میں جنگ کے متعلق اعلیٰ درجے کی نظم بھی درج ہوتی ہے۔"

بڑی کاسستی قیمت پر یہ رسالے دستیاب ہو سکتے تھے جو اُن کی اصل لاگت تھی فی رسالہ ۲ نمونہ کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ پر بھیجا جا سکتا تھا۔

رفاہ عام کی خاطر ہندی داں کے لیے جو اُردو نہیں جانتے تھے، ان لیکچروں کو ناگری میں بھی جاری کرنے کا حکم والیِ ریاست نے دے دیا تھا۔ ان بیس لیکچروں میں سے حسب ذیل لیکچر راجہ بھوانی سنگھ کے دیے ہوئے تھے۔ (۱) جنگ یورپ کے اسباب اور ہمارے فرائض لیکچر نمبر۱ (۲) جرمن مظالم لیکچر ۳ (۳) سرویہ کی تواریخ لیکچر ۱ (۴) ہیضہ اور اس کے اسباب لیکچر ۱۶ (۵) سب میرین لیکچر ۲۰۔

اُردو لائبریری

اُردو کتابوں کی حد تک راجہ صاحب کی توجہ قابل تعریف ہے مختلف مذہب و مسلک، مختلف موضوعات، طب، تاریخ ادب، شعر وغیرہ کی اُردو فارسی کتابیں لائبریری میں موجود ہیں۔ پرانے رسالے جو ملک کے دور دراز مقامات سے نکلا کرتے تھے، اس میں جمع ہیں۔ جائزہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ کتب خانہ میں عمدہ عمدہ کتابیں دور دور سے منگا کر رکھیں۔ اس لائبریری کے اب تین حصے ہو گئے ہیں، کالج لائبریری، ضلع لائبریری اور پبلک لائبریری، پبلک لائبریری راجہ ہریش چندر لائبریری کہلاتی ہے۔ جس میں انگریزی اور ہندی کی کتابوں کے ساتھ کئی الماریوں میں اردو فارسی کی کتابیں بھی موجود ہیں۔

اُردو پریس

معلوم نہیں یہاں اُردو پریس کب سے جاری ہوا۔ آفتاب کے ابتدائی شمارے ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء باہر کے پریسوں، مطبع مفید عام آگرہ اور مطبع احمد علی گڑھ میں چھپے ہیں۔ لیکن رسالہ جنگ یورپ ۱۹۱۴ء کے شمارے جیل پریس ریاست جھالاواڑ میں چھپے ہیں۔ رسالۂ آفتاب کے اجراء مکرر یعنی ۱۹۲۰ء کے شمارے بھی جیل پریس ریاست جھالاواڑ میں شائع ہوئے ہیں۔ کلیات دانش ۱۹۲۶ء بھی اسی مطبع میں شائع ہوا ہے۔ سب میرین لیکچر ۲۰ بھی اسی مطبع میں چھپا۔ کتابت بہت عمدہ۔ سیاہی روشن، طباعت دیدہ زیب، یہ بھی معلوم نہیں کہ اُردو پریس کب بند

ہو گیا۔ تاہم راجہ صاحب موصوف کے دور حکومت اور غالباً اس کے بعد بھی چلتا رہا۔ اب راجستھان بننے کے بعد اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔

معززین وارا کین ریاست

ایسے ہمہ جہت و ہمہ رنگ، بیدار مغز، روشن دماغ اور عالم و فاضل رئیس کے معززین واراکین حکومت بھی ہوشیار، ہونہار، تجربہ کار دانشمند اور لائق وفائق ہی ہونے چاہئیں۔ پنڈت پرمانند چترویدی دیوان ریاست تھے۔ ٹھاکر امراؤ سنگھ ہوم منسٹر۔ آغا شاعر قزلباش جناب بزم آفندی اکبرآبادی۔ پنڈت گردھر شرما۔ نواب فیاض علی خاں فیاض پریسیڈنٹ انجمن سخن۔ حافظ محمد عالم گیر خاں کیف ٹونکی مولوی عبدالوحید نیرنگ، عزیز الرحمٰن عزیز۔ لالہ شمبھو دیال دانش سول جج۔ ہاں اس عنوان کے تحت ان افسروں کا ذکر نہ کردوں جنھوں نے موضوعات جنگ پر لیکچر دیے۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ (۱) ان لیکچروں سے اُردو کے خزانہ میں کیسی بیش قیمت علمی دولت کا اضافہ ہوا۔ (۲) اُردو کو نکھارنے اور سنوارنے میں مسلم و غیر مسلم سبھی کا ہاتھ رہا ہے (۳) اس سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ رئیس وقت کتنا فراخ طبیعت غیر متعصب اور کشادہ ظرف تھا کہ جس کی حکومت کو سنوارنے میں ہندو و مسلم سبھی دوش بدوش حاضر دربار تھے۔ (۴) قومی یک جہتی کا خوش گوار ماحول تھا (۵) رئیس موصوف نے سرکاری زبان ہندی ہوتے ہوئے بھی اُردو کے فروغ و ارتقا میں کتنی سعی بلیغ کی۔

پانچ لیکچروں کا ذکر راجہ صاحب موصوف کے متعلق اوپر کر دیا گیا ہے۔ بقیہ لیکچروں کی تفصیل اس طرح ہے:۔ (۱) جنگ یورپ کے مفصل حالات از پنڈت دھنی رام شرما سول جج۔ (۲) اہل ہند کے فرائض از سید مصطفےٰ حسین رضوی سابق سپرنٹنڈنٹ جیل (ب) جرمنی کے مختصر حالات از بابو جگ موہن لال الیکٹرک انجینئر (۳) میدان جنگ میں ڈاک از پنڈت دھنی رام شرما (۴) جرمن ورلڈ پالیسی از بابو چھیدا لال ماتھر، ریونیو منسٹر (۴) جرمن تعلیم کا زہریلا اثر از بابو اندر سین ہیڈ ماسٹر دربار ہائی اسکول۔ (۵) جرمن جاسوسی از پنڈت بیجو کا رصاحب سکریٹری جھالاواڑ اسٹیٹ کونسل (۶) قدرت کا اٹل قانون از بابو ابیکا چرن (۷) جنگ اور زنجیری

از بابو جگ موہن لال الیکٹریکل انجینئر انھیں کا مضمون ہے اٹلی کی دور اندیشی
لڑکی کی کوتاہ بینی (۸) برطانیہ کی بحری طاقت از ماسٹر شیام بہاری لال
(۹) مستورات اور جنگ۔ از بابو چھیدالال ریونیو منسٹر (۱۰) جنگ میں شفا
خانہ کا انتظام از بابو مٹھن لال اسٹیٹ انجینئر (۱۱) جنگ اور تجارت از بابو
چھیدالال صاحب ریونیو منسٹر (۱۲) ملکی ہمدردی از پنڈت دھنی رام۔
(۱۳) دَرّہ دانیال از بھایا شادی لال دیوان ریاست (۱۴) لارڈ کچنر
از ماسٹر شیام بہاری لال (۱۵) مصوّری اور جنگ از بابو بدری لال
شرما۔ سپرنٹنڈنٹ جیل۔ ان میں نظمیں چھوڑ دی ہیں وہ بھی جنگ سے
متعلق تھیں اور زیادہ تر لالہ شمبھو دیال دانش کی۔

نمونہ نثر

نا اتفاقی ہوگی اور مضمون نامکمل رہے گا اگر رئیس مورخ کی نثر
اُردو کا کچھ نمونہ پیش نہ کیا جائے :۔ "سب اور میرین دونوں انگریزی
لفظ ہیں۔ سب کے لغوی معنی نیچے اور میرین کے معنی سمندر سے تعلق رکھنے
والے کے ہیں۔ اس لیے سب میرین سے مراد ان تمام امورات اور واقعات
سے بھی ہے جو تحت البحر یعنی سمندر کی سطح آب کے نیچے کے حصّہ سے متعلق
ہوں۔ چنانچہ سمندر کے نیچے غوطہ لگانا۔ وہاں ٹھہرنا۔ جہاز چلانا۔ یا کوئی
کام کرنا۔ یہ سب کام "سب میرین ورکس" کی تعریف میں شامل ہیں۔ آگے
کے چند صفحوں میں میں نے انھیں کاموں کا مختصر ذکر کیا ہے۔ جن لوگوں نے
سمندر کا سفر نہیں کیا ہے وہ اس کی عظمت کا اور وسعت کا اندازہ نہیں
لگا سکتے۔ لیکن اگر وہ کسی جگہ سمندر کے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ان کی
حدّ نگاہ تک جو چند میلوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی پانی ہی پانی نظر آتا ہے
اور پھر خیال کریں کہ یہ سلسلہ پانی کا اسی طرح سیکڑوں ہزاروں میلوں تک
چلا گیا ہے تو ان کو اس وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔"

(سب میرین لیکچر نمبر ۲ صفحہ ۴)

"مصنف نے اپنی عقیدت کے جوش میں ابھی ابھی تقریر میں میرے
باغ سے پھول سمیٹنے اور سمندر سے کچھ بوندیں لینے کے متعلق کہا ہے اس کا
جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہ درست ہو کہ انھوں نے میرے باغ سے پھول
چنے ہوں لیکن اس بات کی تعریف کہ کون سے رنگ کا پھول کس جگہ بجایا
جائے جس سے کہ گلدستہ بننے پر خوش نما معلوم ہو۔ میری نہیں بلکہ مصنف
ہی کی ہے۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ سمندر سے انھوں نے جیسا کہ وہ
کہتے ہیں چند بوندیں لی ہوں۔ جس وقت شروع میں وہ لی گئی تھیں محض چند
بوندیں ہی تھیں، لیکن بعد میں ان کو اپنی صرف علم کے سانچے میں ڈھال
کر اور گوہر ہائے آبدار کی شکل میں تبدیل کر کے سمندر کو واپس کرنا مصنف
ہی کا کام تھا۔"

(کلیات دانش صفحہ ۱۰۱)

انتقال پُرملال

افسوس اس قابل قدر، اُردو نواز، اُردو پرست، سخن فہم نکتہ
شناس راجہ کا انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو بمبئی سے آگے جہاز میں
جب وہ لندن جا رہے تھے، ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے سفر دریا کی ممانعت کر دی
تھی لیکن راجہ صاحب کو خیال تھا کہ لندن پہنچ کر وہ ضرور صحت یاب
ہو جائیں گے۔ عدن میں رئیسانہ اعزاز کے ساتھ فوج کی سلامی میں
لاش اتاری گئی وہیں داغ ہوا۔ بعد میں پھول (راکھ) جھالاواڑ لائے
گئے اور دیگر تقریبات غمی حسب رواج ریاست یہاں ہوئیں۔ ان کے بعد
ان کے ولی عہد مہاراج رانا راجندر سنگھ مخمور مسند نشین ریاست ہوئے۔
اَلوَلَد سِرٌّ لِاَبِیہ کے تحت انھوں نے بھی اپنے والد کی علم دوستی شعرا نوازی
اور اردو پرستی قائم رکھی۔ مولوی نیرنگ مرحوم کا دیوان پریس میں
پہنچ چکا تھا کہ راجہ بھوانی سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اس
دیوان کو نہ صرف چھپوایا بلکہ اپنے نام پر معنون بھی کیا۔ "انجمن راجیندر"
انھیں کے نام سے انھیں کی سرپرستی میں چلتی رہی۔ سرکار و دربار
میں مشاعروں کا سلسلہ راجہ بھوانی سنگھ کے زمانہ میں چلا تھا انھوں
نے بھی اسے برقرار رکھا۔ یہ شعر کہتے۔ شعر سنتے اور مشاعروں میں شعراء
کی حوصلہ افزائی کرتے۔ اتنا شوق تھا کہ اپنی مہارانی کا علاج کرانے
یورپ گئے۔ وہیں سے طرحی مصرعے بھیجتے اور مشاعرہ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے
بہر حال جھالاواڑ کے ادبی ماحول کا ایک جداگانہ باب ہے۔ جس پر
بشرطِ فرصت و حیات پھر کبھی روشنی ڈالی جائے گی اور تاریخ ادب
اُردو کے لیے نئی معلومات فراہم کی جائیں گی۔

★

غزل

تسنیم فاروقی

کب وہ آجائے مہکتا ہوا صندل کی طرح
اس سے ملنا ہے تو جلتے رہو مشعل کی طرح

مشورہ لیں گی جب آنکھیں تری آئینے سے
بن کے احساس بکھر جاؤں گا کاجل کی طرح

ڈوبتا چاند ستاروں کے حسیں میلے میں
لگ رہا ہے تری کھوئی ہوئی پایل کی طرح

دوستو جسم کو جو چاہو اذیت دے لو
روح کانٹوں پہ نہ کھینچو مری ململ کی طرح

عقل خوابوں کے جزیرے میں گرفتار رہی
وقت ہر دور میں چیخا کیا پاگل کی طرح

ہم نے دیکھی ہے چناروں سے پگھلتی ہوئی برف
اس کے شانوں سے ڈھلکتے ہوئے آنچل کی طرح

پیاسی آنکھوں نے تجھے دیکھ کے محسوس کیا
قحط میں جھوم کے آئے ہوئے بادل کی طرح

ایسے کچھ سانپ بھی اس دشت میں پھرتے ہوں گے
جو سمجھتے ہیں ترے جسم کو صندل کی طرح

اس کو تسنیم بھلاتا ہوں تو یاد آتا ہے
وہ مجھے بھول گیا بیتے ہوئے کل کی طرح

غزل

شباب للت

منشا اس بے باک نظر کا باتوں سے کھل پائے کیا
تہہ در تہہ شخصیت اس کی میری سمجھ میں آئے کیا
جنموں پیاسا روح کا پنچھی پیار کے نغمے گائے کیا
دوشیزہ اپنی چھاتی سے دودھ کی نہر بہائے کیا

اپنے لہو کی جوالا مجھ کو جلا رہی ہے جنموں سے
لاوا بن کر پھوٹ بہوں گا اور مجھے گرمائے کیا
میں وہ ضدی بچہ جس کو دھن چندا کے پانے کی
ہاتھ میں کانچ کی گڑیا دے کر ماں تو مجھے بہلائے کیا
آج ہوئیں خاموش اچانک شوخ "بدن کی بانسریاں"[1]
ساز نہیں تو سوز اکیلا پیار کے نغمے گائے کیا
اب تو روٹھ کے جانے والا اگلے جنم تک لوٹے گا
تو میرا غم بانٹنے والے میری دھیر بندھائے کیا
آنکھوں سے اوجھل رہ کر بھی کھیل رہا ہے سارے کھیل
وہ پردے میں رہنے والا رنگ منچ پر آئے کیا
پل دو پل کا ساتھ یہ تیرا اور مجھے سلگا دے ہے
چھینٹوں سے تو جنم جنم کی میری پیاس بجھائے کیا
قاضی منصف حاکم سارے اس کے جانبدار ہوئے
کوئی اس کے ظلم و ستم کی اب فریاد سنائے کیا
وہ زردھن ہے پر دل اس کا پیار کا ایک خزانہ ہے
جیب ہو سکوں سے خالی تو قدر وفا کھٹ جائے کیا
مدت بعد ملا ہے تو اب دور کھڑا کیا تکتا ہے؟
آ کے گلے لگ جا او ظالم اور مجھے ترسائے کیا
میرا من اجلا آئینہ، جیون میرا کھلی کتاب
انجمن میں ہے میرا حاسد مجھ پر دوش لگائے کیا
میں غیبی ہوں، میں مجرم ہوں، میں پاپی ہوں مگر شباب
آن گرا ہوں چرنوں میں تو اب وہ مجھے ٹھکرائے کیا

[1] مرحوم دوست پورن کمار ہوش کا مجموعہ کلام

عبدالعلیم خاں

کشمیری ضیافت

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے — چکبست

ممکن ہے جب چکبست نے دورانِ سفر کشمیر یہ شعر کہا تھا تو اُن کے تخیل میں بہ حیثیت ایک کشمیری، کشمیر سے انسیت اور محبت کا جذبہ غالب رہا ہو! لیکن آج بھی کشمیر جانے والے سیاحوں کو راستے میں متعدد پہاڑی چشمے ایک الھڑ دوشیزہ کے نقرئی قہقہوں کے ساتھ اُسی طرح پانی دیتے ہیں۔ جب سیاحوں کی موٹر بسیں پیر پنجال کے پہاڑوں پر گھوم پھر کر اونچائی پر پہنچتی ہیں تو پہاڑی ندیاں دور سے ایسی لگتی ہیں جیسے سفید نیلگوں چادریں بچھا دی گئی ہوں۔ موسم سرما کے اختتام پر جب موسم بہار آتا ہے وادی کشمیر سنورنا شروع کرتی ہے اور گرمیوں کے اوائل میں نئی دلھن کی طرح سج دھج کر سیاحوں کی یوں منتظر رہتی ہے جیسے دلھن اپنے پردیسی ساجن کی۔

مہمان نوازی

کشمیر کی مہمان نوازی ابھی بھی ویسی ہے جیسی چکبست نے بیان کی۔ کشمیریوں کی مہمان نوازی تو کبھی کبھی ہم جیسوں کے لیے تکلیف دہ حد تک پہنچ سکتی ہے۔ ایک سیاح نے دوپہر کو ایک پُر تکلف دعوت جس میں محض گوشت کا سات آٹھ قسم کا مرغن سالن تھا بڑے شوق اور ذوق سے کھایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بذریعہ ہوائی جہاز دہلی چلے گئے۔ جون کا مہینہ تھا اور دہلی کی گرمی اپنے شباب پر تھی۔ انھیں ہضم کرنے میں بڑی پریشانی ہوئی۔ دو دن اسپتال کی ہوا کھانی پڑی۔ ان کے دیگر ساتھی اور احباب جو سری نگر ہی میں رہے مغل باغات کی سیر کرتے رہے۔ چشمہ شاہی کا پانی پیا اور شام کو دوسری دعوت میں شریک ہوے۔

کشمیر کے کلچر اور تمدن پر جہاں کشمیر کی آب و ہوا کی گہری چھاپ ہے وہاں وسط ایشیا سے اور کشمیر میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

انواع و اقسام کے پکوان

وادی کشمیر میں انواع و اقسام کے پکوان اور مہمانوں کو کھلانے کا اپنا انداز اور آرٹ ہے۔ اس کا مظاہرہ شادی بیاہ اور اس قسم کی دیگر تقاریب کے موقع پر ہوتا ہے۔ تقاریب ہی کے موقع پر نہیں بلکہ جب بھی دس بیس آدمیوں کی دعوت کا سوال آتا ہے، وازہ بُلایا جاتا ہے۔ یہ وازہ پیشہ ور تربیت یافتہ باورچی ہوتا ہے جس کے یہاں کھانا پکانے کا ہُنر باپ سے بیٹا سیکھتا ہے۔ وازہ کی اُجرت بھی کافی ہوتی ہے۔ آج کل ایک اچھے وازہ کی یومیہ اُجرت عام طور پر ۴۰ سے ۵۰ روپیہ ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کے موسم میں ظاہر ہے اُن کی مانگ بڑھ جانے کے باعث اُن کی اُجرت بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہر وازہ اپنے ساتھ اپنے معاون باورچی بھی ساتھ لاتا ہے جس کی اُجرت الگ ہوتی ہے۔ شادی خواہ لڑکے کی ہو یا لڑکی کی ہر صاحب خانہ کو اپنے اعزا و احباب کو تقریباً دو تین مرتبہ دعوت کھلانا پڑتی ہے اور یہ دعوت پر تکلف سات آٹھ قسم کے سالن کے ساتھ ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں عام طور پر مہمان کے لیے گوشت کا اوسط فی کس ایک سے دو کلو کا رکھا جاتا تھا۔ اب گرانی کی وجہ سے اس میں کچھ تخفیف کر دی جاتی ہے۔ فربہ بھیڑ یا بکری کا گوشت

چربی سے پٹھا اور بکرے سے اچھا ہوتا ہے ذبح کی جاتی ہیں اُن کی آنتوں سے لے کر گوشت، کلیجی وغیرہ ہر چیز مختلف سالنوں کی تیاری میں استعمال کی جاتی ہے۔

آداب دعوت

ایک روایتی کشمیری دعوت سیاحوں کے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہوتی ہے۔ مغل طرز کے پکوان، ہاتھ دھونے، بیٹھنے، کھانے اور دعا (Thanks Giving) سب کے لیے ایک خاص طور طریقہ اور آداب ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سارے مہمان، ایرانی، کشمیری قالینوں اور گاؤ تکیوں سے آراستہ فرش پر بیٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک سلفچی، آفتابہ مع صابن تولیہ لائی جاتی ہے۔ معزز ترین مہمان کا ہاتھ سب سے پہلے دھلایا جاتا ہے۔ دستر خوان بچھتے ہی لوگ چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب تانبے کی بڑی بڑی سینیاں جنھیں کشمیری زبان میں ترامی کہتے ہیں لائی جاتی ہیں، ایک ایک ترامی ہر ٹکڑی کے بیچ میں رکھ دی جاتی ہے۔ جب سرپوش (ڈھکن) اٹھایا جاتا ہے تو منظر بے حد اشتہا انگیز ہوتا ہے۔ سادہ چاول (پلاؤ یا بریانی نہیں) کا ایک ڈھیر ہوتا ہے جس کے چاروں کونوں پر میتھی (ساگ والی میتھی نہیں) یعنی باریک کٹی ہوئی آنتوں کا سالن، کم از کم چھ انچ لمبا ایک ایک سیخ کباب، ایک ایک مرغ کی بوٹی اور ایک ایک طبق ماس (جسے کشمیری میں کبرگاہ کہا جاتا ہے) اس سینی میں رکھا ہوتا ہے۔ صاحب خانہ یا اُس کے گھر کے کسی بزرگ کے یہ کہنے پر کہ بسم اللہ کیجیے، کھانا شروع کیا جاتا ہے۔ اُس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ پر وازہ آتا ہے، جو عموماً ایک سفید لمبے کرتے میں ملبوس رہتا ہے۔ صاحب خانہ شادی کے موقع پر ٹھیکے پہ بنایا کرتا دیتا ہے۔ وازہ اپنے کولھے پر ایک کپڑے کی مدد سے سالن کی ترچی مع چمچے کے لاتا ہے اور چاروں کونوں پر ہر ترامی میں سالن ڈال دیتا ہے۔ آپ کتنا بھی کہیں کہ مجھے نہیں چاہیے یا کم چاہیے وہ سب کچھ سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے۔ اب مختلف سالنوں کا دور شروع ہے وازہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جہاں ایک دور ختم ہوا دوسرا سالن لاتا ہے قورمہ (روغن جوش)، رشتہ (ایک قسم کا کوفتہ) دھنیا گوشت، مرچ

گوشت، آب گوش، یخنی اور سب سے آخر میں دہی میں ڈالا ہوا گش
یہ سب ہی مشہور اور عمومی سالن ہیں، عام طور پر گشتابہ آخری دو
ہے۔ اب کچھ لوگ گشتابہ کے بعد کوئی میٹھی چیز مثلاً سوجی کا حلو
بھی پیش کرنے لگے ہیں۔ یہ نیا رواج ہے اور اُن لوگوں کے
دیکھا جاتا ہے جو کشمیر سے باہر رہ کر بیرونی اثرات سے دو چار ہو
متموّل گھرانوں میں عام طور پر تقاریب میں سات آٹھ قـ
سالن دستر خوان پر رکھنا معمولی بات ہے اس میں کمی بیشی میز
کی حیثیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں راقم الحروف
لطیفہ سُننے کو ملا۔ جب دلھن پہلی بار سسرال جاتی ہے تو عزیزوں
جاتی ہے۔ اُس کی بڑی خاطر مدارات ہوتی ہے۔ کسی عزیز کے یہا
جب وہ دلھن واپس آتی ہے تو اس کی خوش دامن پوچھتی ہے
تمھارے سامنے فلاں نے کتنے سالن رکھے تھے، میں نے تو اُس
کو ، قسم کے سالن کھلائے تھے"۔ یہ بھی سُنا گیا ہے کہ ایک اچھا
گوشت کے تقریباً پچاس قسم کے سالن تیار کر سکتا ہے۔

چند سالن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ہندوستان کے دیگر علا
میں نہیں تیار کیے جاتے ہیں۔ کچھ اگر پکتے بھی ہیں تو مختلف اندا
کشمیری سیخ کباب کی بہ نسبت کچھ بڑا اور قدرے سخت ہوتا ہے۔ ر
دیگر جگہوں کے کوفتوں سے مشابہ ضرور ہے لیکن تھوڑا مختلف ہوتا۔
طبق ماس، گشتابہ آبگوش اور یخنی راقم الحروف نے کسی اور جگہ
دیکھا۔ طبق ماس بھیڑ کے سینے کی چربیلی بوٹیوں سے بنتا ہے۔ اسے
میں اُبال کر ملائم کر لیتے ہیں اور پھر نمک اور مصالحے وغیرہ ملا کر گھ
تل لیتے ہیں۔ آب گوش دودھ میں پکایا جاتا ہے اور اس کا شور
سفید ہی رہتا ہے۔ یخنی بھی ہمارے اتر پردیش یا بہار جیسی مریض
لیے نہیں بلکہ یہ دہی میں پکایا ہوا گوشت ہے۔ اس کا شوربہ سنہر
رنگ کا ہوتا ہے۔ گشتابہ کشمیر کا بہت ہی مشہور پکوان ہے اور بڑی ہو
سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہے تو یہ کوفتہ سے مشابہ لیکن کوفتہ نہیں۔ بـ
ہڈی کے گوشت کو گرم پانی اور چربی ملا کر لکڑی کی مٹھیا سے خو
کوٹتے ہیں تاکہ ریشہ باقی نہ رہے۔ اس کے بعد مختلف مصالحے ڈا
کر بڑے یا چھوٹے گول گول گشتابے گھی میں تلے جاتے ہیں۔ عمو

وزیراعظم شری مرارجی ڈیسائی یکم مئی ۱۹۷۷ء کو لکھنؤ تشریف لائے۔ اموسی ہوائی اڈے پر گورنر اترپردیش شری ایم۔ چنا ریڈی ان کا استقبال کر رہے ہیں

شری رام نریش یادو کو ۲۳ جون ۱۹۷۷ء کو راج بھون لکھنؤ میں وزیراعلیٰ کے عہدے کا حلف دلایا جا رہا ہے

وزیر اعلا شری رام نریش یادو ۲۳؍ جون ۱۹۷۷ء کو اخباری نمائندوں کو خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعلا شری رام نریش یادو اعظم گڑھ میں ۲؍ جون کو بار کونسل کی جانب سے دیے گئے استقبالیہ میں حاضرین کو خطاب کر رہے ہیں۔
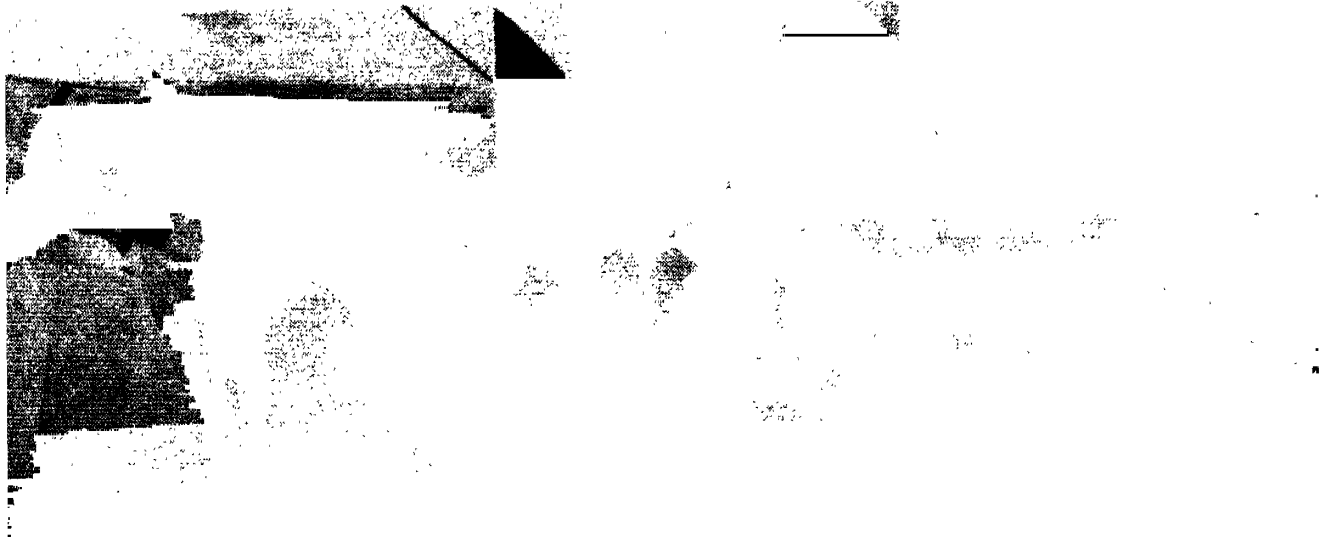
گرم گشتابہ وہی میں ڈبو دیتے ہیں اور پھر کھاتے ہیں۔

کھانا ختم ہونے پر پھر معزز ترین مہمان ہی سے ہاتھ دھلانا شروع کرتے ہیں۔ جو ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ واقعی ایسے لذیذ پر تکلف کھانے کے بعد کون ناشکری کر سکتا ہے۔

تکلّفات

محض تقاریب ہی کے موقع پر کشمیری مہمان نوازی اپنے عروج پر نہیں ہوتی، بلکہ کشمیری معمولی ضیافتوں میں بھی مہمان کے ہی سامنے کم از کم دو تین قسم کا سالن رکھے بغیر اپنی میزبانی کی تسلی نہیں محسوس کرتا۔ چونکہ کچھ پکوان مثلاً رشتہ، گشتابہ، طبق ماس ایسے ہیں جن کے لیے پہلے سے اطلاع اور وقت درکار ہے۔ کشمیری عموماً مدعو کر کے دعوت کھلاتا ہے۔ کہنے کے لیے وہ آپ سے کہیں گے "جناب کل آپ میرے ساتھ ساگ بھتہ کھائیے گا"۔ لیکن جب آپ دسترخوان پر بیٹھیں گے تو ساگ کے بجائے پر تکلف کھانا ہوگا۔ اگر ساگ ہوا بھی تو گوشت کی معیت میں۔ یہ بات دوسری ہے کہ روٹی نہ نظر آئے اور پلاؤ کے بجائے صرف سادے چاول ہی ہوں۔ کشمیری عوام اور خواص سب دونوں وقت چاول کھاتے ہیں۔ مجھے ایک کشمیری لڑکی کی بات پر ہنسی آئی۔ یہ پوچھنے پر کہ تم روٹی کیوں نہیں کھاتی ہو اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "روٹی پیٹ میں گڑتی ہے"

ساگ سبزیاں

غربا اور دیہات کے رہنے والے مزارعین جو ہمہ وقت گوشت نہیں کھا سکتے عموماً ساگ سبزیاں اور چاول کھاتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ کشمیری سبزیاں نہیں پسند کرتے یا کھاتے نہیں۔ دراصل وہ اکثر سالن میں کوئی نہ کوئی سبزی حتیٰ کہ ہری مرچ ہی سہی ڈال کر پکانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہاک اور گانٹھ گوبھی (جسے کرم کہتے ہیں) اُن کا مرغوب ساگ ہے۔ ہاک جو پہلے گرم علاقوں میں نہیں لگایا جاتا تھا دراصل پالک کی قسم کا ایک ساگ ہے جس کے پتے کافی موٹے (تمباکو جیسے لیکن چھوٹے) ہوتے ہیں۔ اس کا ساگ بنانے کا طریقہ بھی مختلف ہے۔ ہاک کے پتّوں کی نسیں نکال کر مسلّم پتے سرسوں کے تیل میں سُرخ مرچ، لہسن اور نمک وغیرہ ڈال کر بگھار دیے جاتے ہیں اور شوربہ ہلکا رکھتے ہیں۔ اسی طرح گانٹھ گوبھی مع ملائم پتوں کے کاٹ کر ساگ بناتے ہیں۔ ہاک ایک کشمیری کے لیے خواہ ہندو ہو یا مسلمان وہی حیثیت رکھتا ہے جو پنجابی کے لیے سرسوں کا ساگ۔ اب تو ہاک کا بیج لا کر لوگوں نے اُتر پردیش اور دہلی میں بھی اگایا ہے۔ جناب شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ کشمیر جب دہلی میں مقیم تھے تو انھوں نے پہلی بار کشمیر سے باہر ہاک اُگانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ کشمیریوں کو دالیں البتہ بہت کم پسند ہیں ماسوا راج ماش کے جو جموں کے علاقہ بھدرواہ اور پونچھ راجوری وغیرہ میں کافی مقدار میں پیدا کی جاتی ہے۔ موسم سرما میں استعمال کے لیے بیگن گوبھی، لوکی، شملہ مرچ حتیٰ کہ ٹماٹر تک گرمیوں ہی میں سکھا کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

مشروبات

کشمیر کے خورد و نوش کا بیان تشنہ رہ جائے گا اگر وہاں کی مرغوب اور ہر دلعزیز نمکین چائے اور سماوار (نمکین چائے بنانے اور لانے کا برتن) کا ذکر نہ کیا جائے۔ حالانکہ آج کل امرا اور بعض متوسط طبقوں میں شکر والی چائے (جسے کشمیری لپٹن ہی کے نام سے پکارتے ہیں) کافی رواج پا چکی ہے لیکن غربا اور متوسط طبقہ میں اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں نمکین چائے کا رواج زیادہ ہے۔ نمکین چائے بنانے کے لیے ایک خاص قسم کی چائے آسام سے آتی ہے اُسے پانی میں ڈال کر نمک اور سوڈے کے ساتھ تقریباً آدھے پون گھنٹے تک پکایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک تانبے کا برتن (عموماً منقش) ہوتا ہے اس میں چائے نکالنے کی ٹونٹی، نیچے ایک خانہ کوئلے کی آگ کے لیے اوپر ایک ڈھکن ہوتا ہے۔ اسی برتن کو سماوار کہتے ہیں۔ اُبلتی ہوئی گرم گرم چائے سماوار میں مہمان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے چائے فنجان یا پیالوں میں ڈال کر باقرخانی۔ بسکٹ۔ چوروو، یا پراٹھوں کے ساتھ پی جاتی ہے۔ نمکین چائے سے تکان اور سستی

فوراً دور ہو جاتی ہے۔ یہ بدن کو گرم بھی رکھتی ہے۔ کھانے کے بعد استعمال کرنے سے ہاضمہ میں معاون ہوتی ہے۔ نشاط۔ شالامار، چشمہ شاہی جیسے مغل باغات یا بادام واری وغیرہ کے میلوں میں کشمیری عام طور پر سماوار اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور دوستوں، عزیزوں کے ساتھ مل کر چائے باقرخانی یا ندرو (کم گٹہ) کی پکوڑیوں کے ساتھ چائے پی کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ہاؤس بوٹ ہو، یا شکارا۔ ہر جگہ یہ سماوار اور تمباکو پینے والا حقہ ضرور موجود رہتا ہے۔

مشروبات میں ایک چیز اور ہے جس کا رواج عموماً امرا اور بعض متوسط طبقوں میں زیادہ ہے۔ یہ ہے۔ قہوہ، یہ نہ عربی قہوہ ہے نہ ہماری آپ کی کافی۔ یہ مشروب چھوٹی الائچی۔ دارچینی۔ بادام اور شکر ڈال کر بنائی جاتی ہے اور جاڑوں میں بہت استعمال کی جاتی ہے۔

ہندو اور مسلمانوں میں جیسی یک جہتی اور یگانگت کشمیر میں پائی جاتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، ان کی زبان، رسم و رواج، خورد نوش اور پوشاک میں بہت ہی کم فرق پایا جاتا ہے۔ ضیافت کے سلسلے میں ایک فرق ضرور ہے۔ کشمیری ہندو جو بیشتر شیو مت کے پیرو ہیں عام طور پر کشمیری مسلمانوں کی طرح سو فیصد گوشت خور ہیں شیوارتری کا برت توڑنے کے لیے انھیں مچھلی گوشت چاہیے۔ لیکن شادی بیاہ کے موقع پر وہ صرف سبزیاں۔ مٹھائیاں ہی کھلاتے ہیں۔ جب راقم الحروف نے اس کی وجہ جاننا چاہی تو ایک کشمیری مسلمان دوست نے اپنے ہندو دوست پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ کنجوس ہیں گوشت کھلانے میں رقم خرچ ہوتی ہے"۔ پنڈت جی نے تردید کی "بالکل غلط شادی بیاہ میں شنکر پاروتی کی پوجا ہوتی ہے اور مذہبی رسومات بھی ہوتی ہیں اس لیے گوشت نہیں پکایا جاتا" وجہ کچھ بھی ہو لیکن کشمیری پنڈت یا کشمیری مسلمان دو میں سے کوئی بھی آپ کو کھانے پر مدعو کرے تو جو کیے نہیں ضرور جائیے۔ اپنے مہمان کی تواضع کے سلسلے میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں ہی آپ کو انواع اقسام کے لذیذ کھانے باصرار کھلائیں گے۔

■■

اختر بستوی

غزل

اک نیا پن یوں پرانے عکس میں پیدا کریں
آئنہ رکھیں وہی لیکن اسے ترچھا کریں

جذبہ و احساس کی اکتاہٹوں کو بھول کر
فکر کی کٹھ پتلیوں کے کھیل سے بہلا کریں

کچھ نہ کچھ سمجھائیں گے بنتے بگڑتے دائرے
چند کنکر پھینک کر نظارۂ دریا کریں

زندگی شبنم میں بھیگے خار جیسی ہے تو کیا؟
اس کی ٹھنڈی سی چبھن سے کیوں نہ سمجھوتا کریں؟

موج ساحل کی طرح اپنا مقدر ہے یہی
جا کے منزل پر وہاں سے ہم سدا لوٹا کریں

کب حفاظت کے تصور سے ہوے ہیں منحرف؟
لاکھ ہم قسمت کے ہاتھوں ٹوٹ کر بکھرا کریں

ذہن میں اختر خیال قرب جسمانی نہیں
دل کے بستر پر کسی کی چوڑیاں کھنکا کریں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

غزل

ہر دور میں ترقیِ فن دیکھتے رہے
روشن چراغِ بزمِ سخن دیکھتے رہے

تہذیبِ مشرقی سے اُبھرتی ہوئی پھر آج
خورشیدِ نو کی تازہ کرن دیکھتے رہے

سینے میں پھول بن گئے سب زخمِ آرزو
زنداں میں ہم بہارِ چمن دیکھتے رہے

اللہ رے یہ جذبِ تصوّر کی وسعتیں
جیسے انہی کو جلوہ فگن دیکھتے رہے

ہم تو پہنچ کے منزلِ مقصود پر رُکے
کچھ لوگ تھے جو اپنی تھکن دیکھتے رہے

جوہر غزل یہ تو نے مرصع کہی ہے کیا
احباب تیرا رنگِ سخن دیکھتے رہے

چندر بہادر سکسینہ شاد بریلوی

غزل

جہاں پر نہ پہنچیں گے وہم و گماں تک
رسائی مری ہو چکی ہے وہاں تک

ترستے ہیں سجدے جہاں بندگی کو
کئی بار پہنچا ہوں اُس آستاں تک

تمھارے اشارے میری داستاں ہیں
سُناؤں تمھیں داستاں میں کہاں تک

نہ گھبرا دلِ ناتواں تو ستم سے
ستم بھی وہ دیکھیں کریں گے کہاں تک

وہاں تک غمِ زندگی کو اُٹھاؤ
حقیقت نظر آئے تم کو جہاں تک

تری بات جب بھی حقیقت بنے گی
قدم چوم لے گی ترے کہکشاں تک

فریبِ نظر شاد کہتے ہیں جس کو
حقیقت بتاؤ ہے اِس میں کہاں تک

شفیق احمد صدیقی

افسانہ

زندگی کی ستر بہاریں دیکھنے کے بعد رئیسہ بیگم اپنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ چکی ہے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس پر جھریوں کا ایک جال سا پھیل گیا ہے۔ سارے بال سفید ہو گئے ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے بوڑھی رئیسہ میں اب بھی چلنے پھرنے کی بہت ہمت ہے۔

اپنے شوہر اور دو بچوں شاہد اور زاہد کے ساتھ رئیسہ کی زندگی نہایت پرسکون گزر رہی تھی لیکن کاتبِ تقدیر نے اس کے حصہ میں یہ سب خوشیاں بہت تھوڑے وقت کے لیے لکھی تھیں۔ شادی کے چار ہی سال بعد اس کا شوہر مادرِ وطن کی خاطر میدانِ جنگ میں دشمن کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ رئیسہ کی زندگی کے پُر بہار چمن پر اچانک خزاں چھا گئی۔ اس کے سب ارمان خاک میں مل گئے۔

اپنے بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ شوہر کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی صحیح نگرانی کر کے رئیسہ نے اپنی ذہانت و قابلیت کی ایک مثال قائم کر دی تھی۔ اس نے دل کھول کر بچوں کی تعلیم پر روپیہ خرچ کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی میں داخل کرایا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب اس کے لڑکے جوان ہو گئے۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے اور رئیسہ نے ان کی شادیاں دھوم دھام سے کر دیں۔

بڑا لڑکا شاہد علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا وہ نہایت ہی سنجیدہ طبیعت اور پُر وقار شخصیت کا مالک تھا وہ کوئی بھی ایسا کام نہ کرتا تھا جو اس کی ماں کو گراں گزرے۔ اس کی بیوی شکیلہ بھی بے حد نیک تھی سب کے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آنا اس کی عادت تھی وہ ایک سلیقہ مند عورت، شوہر پرست بیوی اور فرماں بردار بہو تھی۔

رئیسہ کا چھوٹا لڑکا زاہد اپنے بڑے بھائی کے بالکل برعکس تھا وہ ایک سرکاری ملازم تھا۔ خواہ مخواہ شیخی بگھارنے اور اترانے کی اُسے بچپن سے عادت تھی۔ نئے نئے فیشن اختیار کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا فحش فلمیں دیکھنے کی لت اسے طالب علمی ہی کے زمانے سے پڑ چکی تھی۔ ہر غیر ادبی محفل کا وہ سرغنہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے آپ کو وہ اتنا خود مختار سمجھنے لگا تھا کہ اس نے کھلے بندوں اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی پسند کی شادی ہرگز نہ کرے گا اور پھر وہی ہوا جس کا رئیسہ کو ڈر تھا۔ ایک دن زاہد نے ایک لڑکی کو گھر لا کر ماں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا —

"اماں! میں اس لڑکی سے شادی کروں گا۔ اس کا نام زرینہ ہے میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہے۔ میں اسے دل و جان سے پیار کرتا ہوں۔ اس کے بغیر میں ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا!"

رئیسہ نے بات کا بتنگڑ نہ بنانا چاہا وہ بڑھاپے میں اپنے اور بیٹوں کے درمیان کسی طرح کی خلیج حائل کرنا نہیں چاہتی تھی، اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹے کی خوشی کے لیے اس لڑکی سے زاہد کا پیغام دے دیا اور اس طرح زاہد کی زرینہ سے شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد زاہد کا تبادلہ میرٹھ ہو گیا تو وہ اپنی بیوی زرینہ کو بارہ بنکی سے میرٹھ لے آیا۔

بوڑھی رئیسہ اب ضلع بارہ بنکی کے قصبہ نواب گنج میں اپنے شوہر کے خاندانی مکان میں رہتی تھی۔ زمین جائیداد کا سب نظام رئیسہ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ فصل کی رقم کو وہ اپنے ہی نام سے بینک میں جمع کراتی تھی۔ بڑا لڑکا شاہد اکثر و بیشتر اپنی والدہ کے پاس بارہ بنکی آتا رہتا تھا۔ گرمیوں کی ساری چھٹیاں وہ ماں کے ساتھ قصبہ ہی میں گزارتا تھا۔ اس کی بیوی شکیلہ تو دل و جان سے رئیسہ کی خدمت کرتی تھی۔ اس کی بے لوث خدمت کو دیکھ کر رئیسہ کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے

اس کی زندگی میں اس کی بہو نے بیٹی کی کمی پوری کر دی ہو۔

زاہد کو میرٹھ گئے ہوئے پورا ایک سال ہو گیا تھا۔ پہلے تو اس نے ماں سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ جب کافی دنوں سے رئیسہ کو زاہد کی خیریت نہ ملی تو وہ کچھ پریشان سی رہنے لگی۔ ایک الجھن تھی جو اُسے ہر وقت گھیرے رہتی تھی۔ بیٹے کی خیریت جاننے کے لیے وہ ہر وقت برقرار رہتی تھی۔ جب بیقراری کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو رئیسہ نے بیٹے سے ملنے کے لیے میرٹھ کا رُخ کیا۔ وہ زاہد کے گھر جب پہنچی تو زاہد نے ماں کو سلام کرتے ہوئے کہا "اماں! کم سے کم آنے سے پہلے خبر تو کر دی ہوتی اگر مجھے ہی وقت نہیں تھا تو نوکر ہی کو اسٹیشن بھیج دیتا۔"

رئیسہ نے تانگے سے اتر کر بیٹے کو گلے لگایا "کہو بیٹے کیسے ہو؟"

"اماں! ٹھیک ہوں۔"

خدا تمھیں ہمیشہ خوش رکھے، عمر دراز کرے، دن دونی رات چوگنی ترقی کرو۔"

پھر گھر میں داخل ہوتے ہوئے رئیسہ نے کہا "ارے بہو نہیں دکھائی دے رہی ہے۔"

"اماں! تمھاری بہو سوشل ورکر ہے، گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اپنا باقی وقت سوشل ورک میں گزارتی ہے، ملک اور قوم کی خدمت کرتی ہے" زاہد نے اپنی بیوی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

رئیسہ بیٹے کے گھر کا بخوبی جائزہ لے ہی رہی تھی کہ زرینہ اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی اور اپنی ساس کو گھر میں موجود پا کر کچھ حیران سی ہو گئی، اپنی سہیلیوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر وہ رئیسہ کے پاس آئی اور رسمی طور پر مزاج پرسی کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ گفتگو میں محو ہو گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟" زرینہ نے اپنی سہیلیوں سے پوچھا۔

"بھئی اس بور پکچر نے تو ہمارے سر میں درد کر دیا ہے ہم تو ایک کپ چائے پئیں گے اور ساتھ میں ایک اسپرو بھی مل جائے تو بس کیا ہی کہنے۔" ایک سہیلی نے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

"چائے میں شکر ذرا کم ہی ڈلوانا...." دوسری سہیلی نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

زرینہ نے نوکرانی کو چائے بنانے کا حکم دیا

زاہد دفتر کی فائلیں کھول کر بیٹھ گیا۔ زرینہ سہیلیوں کے ساتھ باتوں میں لگ گئی اس لیے رئیسہ کچھ کھسیانی سی ہو گئی۔ اپنے آپ کو کام میں مصروف کرنے کے لیے وہ باورچی خانے میں چلی گئی اور نوکرانی کو کسی دوسرے کام میں لگا کر بیٹے، بہو اور اس کی سہیلیوں کے لیے چائے بنانے لگی۔ بیٹے کے گھر کا کام کرنے میں اُسے بہت خوشی ہو رہی تھی، چائے بنا کر اس نے ایک کپ زاہد کو دیا۔ پھر ایک ٹرے میں چائے کی کیتلی اور کچھ کپ رکھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور بہت اہتمام سے چائے بنا کر زرینہ اور اس کی سہیلیوں کو پیش کی۔ زرینہ کی سہیلیاں اس نئی صورت کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ زاہد نے کسی کام سے زرینہ کو اپنے پاس بلایا تو وہ وہاں سے اٹھ کر آنگن میں زاہد کے پاس چلی گئی۔ ایک سہیلی نے رئیسہ سے پوچھا "چائے تو اچھی بنائی ہے تم نے اس سے پہلے کہاں کام کرتی تھیں۔"

یہ سُن کر رئیسہ حیران رہ گئی۔

دوسری سہیلی نے کہا "معلوم ہوتا ہے پہلے کسی اچھے گھرانے کی نوکرانی رہی ہوں گی۔"

"ہاں بھئی جبھی تو اتنے اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں۔" تیسری سہیلی نے دوسری سہیلی کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

رئیسہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی، اگر وہ اس کی بہو کی سہیلیاں نہ ہوتیں تو وہ منہ توڑ جواب دیتی لیکن بیٹے اور بہو کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے اُس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

پھر چوتھی سہیلی نے کہا "اے آج کل نوکرانیوں کی کمی جو ہے اس لیے یہ نوکرانیاں بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتیں۔"

اب رئیسہ کے ضبط کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ وہ غصہ میں بولی "شکل و صورت سے تو تم بہت مہذب اور سمجھ دار لگتی ہو لیکن ہو پرلے درجہ کی جاہل جو یہ بھی نہیں جانتیں کہ ایک اجنبی سے کیسے بات کرتے ہیں۔؟"

"اچھا تو دو پیسہ کی نوکرانی ہمیں سبق سکھائے گی؟"

"خبردار اگر منھ سے ایک لفظ بھی نکالا تو زبان کھینچ لوں گی" رئیسہ ایک زخمی شیرنی کی طرح ان پر گرجی۔

"اماں! شرم نہیں آئی ایسی بیہودہ بات کہتے ہوئے۔ یہ میری سہیلیاں

ہیں۔ بھلا گھر آئے لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟" زرینہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے ناراضگی کے ساتھ اپنی ساس سے بولی۔

"سلوک تو میں تم سب کا دیکھ چکی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تہذیب نام کی کوئی چیز تمھارے پاس نہیں۔"

زرینہ نے شوہر کو آواز دے کر کہا "اجی سنتے ہو۔ اماں میری سہیلیوں سے ناحق جھگڑا کر رہی ہیں۔"

"اچھا زرینہ! ہم تو چلتے ہیں۔ اپنا تو موڈ خراب ہو گیا ہے۔"

"تمھارے گھر ہماری ایسی بے عزتی ہو گی اس کی ہمیں امید نہ تھی۔"

"آخر سوسائٹی میں ہماری بھی کچھ عزت ہے۔"

اس طرح بڑبڑاتی ہوئی سب سہیلیاں گھر سے باہر چلی گئیں۔

"ارے کیا ہوا؟ اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے؟" زاہد نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

زرینہ شوہر کے نزدیک آ کر ساس کی شکایت کرتے ہوئے بولی "دیکھ لو جی! تمھاری ماں نے میری سہیلیوں سے جھگڑا کر کے انھیں گھر سے باہر نکال دیا ہے وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہیں۔ میرے بارے میں اب وہ کیا سوچ رہی ہوں گی؟"

یہ سن کر زاہد غصّہ میں آگ بگولا ہو گیا لیکن غصّہ کو برداشت کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولا "اماں! تم نے ہماری عزت کا کچھ تو خیال کیا ہوتا۔ کیا شہر کی پڑھی لکھی لڑکیوں سے اسی طرح پیش آتے ہیں۔ تم بڑھاپے میں اس قدر تلخ مزاج ہو جاؤ گی اس کی مجھے بالکل امید نہ تھی۔"

"ہاں بیٹے غلطی میری ہی تھی۔ مجھے اُن سے اس طرح پیش نہ آنا چاہیے تھا۔" پھر بہو کی طرف مخاطب ہو کر رئیسہ نے کہا۔ "بہو میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تمھاری سہیلیاں ناراض ہو کر چلی گئیں یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ ایسا موقع کبھی نہ آنے دوں گی۔"

اپنے غصّہ کو ضبط کرتے ہوئے رئیسہ نے یہ کہہ کر زاہد اور زرینہ کے غصّہ کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ وہ اپنی صفائی پیش کر کے بات کا بتنگڑ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ گھر کے ماحول سے وہ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا چکی تھی کہ اس گھر میں اُس کی کوئی عزت و وقعت نہیں۔

رئیسہ کو زاہد کے گھر میں آئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ نوکرانی کھانا بناتی اور زرینہ گداز بستر پر آرام سے لیٹی جاسوسی ناول پڑھتی یا سوتی رہتی۔ شام کو زرینہ اپنی سہیلیوں سے اور زاہد اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے نکل جاتے۔ ان دونوں کے لوٹنے تک رئیسہ سو جاتی۔ اُسے اپنی بہو سے کوئی شکایت نہ تھی شکوہ تھا تو بیٹے سے جو اس کی قربانیوں کو بھول کر اپنی بیوی کے اشارے پر ناچ رہا تھا۔ اُسے اپنی ماں کا بالکل خیال نہ تھا۔ اُسے ماں کا اپنے گھر رہنا بھی بہت ناگوار گزر رہا تھا لیکن وہ صاف لفظوں میں ماں سے گھر واپس جانے کے لیے کہہ بھی نہ سکتا تھا وہ ماں سے اپنے تعلقات کو زیادہ خراب نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ سب زمین جائیداد ماں ہی کے نام تھی۔

اگلے دن زاہد نے کمال عیاری سے اداکاری کرتے ہوئے ماں سے کہا "اماں رات میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔"

"خواب! کیسا خواب؟" رئیسہ نے زاہد سے پوچھا۔

"نہیں اماں تمھیں نہیں بتاتا ورنہ تم فضول ہی پریشان ہو جاؤ گی۔"

"نہیں بیٹا تو بلا جھجک اپنا خواب بتا دے۔ میں بالکل پریشان نہ ہوں گی۔"

"مجھے رات خواب میں ابا میاں دکھائی دیے۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟" رئیسہ نے بے قرار ہو کر زاہد سے پوچھا۔

"وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ زاہد آج کل تمھاری ماں کے ستارے اچھے نہیں چل رہے ہیں، اس سے کہہ دو کہ وہ کل ہی گھر چلی جائے اگر گھر واپس نہ گئی تو زاہد تمھارے ستارے بھی تمھارے خلاف گردش کرنے لگیں گے اور تم پر کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہو جائے گی۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد تو میں ایک پل نہ سو سکا۔ ساری رات یہی سوچتا رہا اگر تم آج ہی گھر واپس نہ گئیں تو ابا میاں کی روح کو بہت تکلیف پہنچے گی۔ جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا آپ کو بتا دیا اب جانا نہ جانا آپ کے اختیار میں ہے" یہ کہہ کر زاہد چپ ہو گیا۔

"نہیں نہیں بیٹے! میں اپنی وجہ سے تمھیں کسی پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ اچھا ہوا تم نے مجھے پہلے ہی اپنا خواب بتا دیا ورنہ تم پر ناحق ہی کوئی مصیبت آ جاتی۔ میں آج ہی بارہ بنکی چلی جاؤں گی۔"

رئیسہ دودھ پیتی بچی تو تھی نہیں جو زاہد کی چال نہ سمجھ سکتی، اُس نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے وہ زاہد کو اب پوری طرح پرکھ چکی تھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی زاہد کو ایسا سبق سکھائے گی جسے وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

جب وہ زاہد کے گھر سے رخصت ہوئی تو زاہد نے اسٹیشن تک آنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ اسٹیشن پر آکر رئیسہ نے سوچا علی گڑھ میں شاہد سے بھی ملتی چلوں۔ کہیں ایسا تو نہیں اس کے مزاج میں بھی تبدیلی آگئی ہو اس لیے رئیسہ نے ہاتھوں ہاتھ شاہد کا بھی امتحان لینے کی غرض سے بارہ بنکی کے بجائے علی گڑھ کا رُخ کیا۔ جب رئیسہ علی گڑھ میں شاہد کے گھر پہنچی تو شاہد اور شکیلہ نے بہت ہی گرم جوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ شاہد نے ماں کو سلام کیا اور فوراً تانگے سے سامان اتارا شکیلہ نے اسی وقت مسہری پر نئی پھولدار چادر بچھا کر اپنی ساس کو اس پر بٹھایا۔

"اماں! تمھارے آنے سے پل ہی بھر میں کتنی رونق ہو گئی ہے۔" شاہد نے خوش اسلوبی سے ماں سے کہا۔

"کہیے اماں کیسی ہیں آپ؟ بہت دنوں بعد آنا ہوا آپ کا ہم تو آپ کو یاد ہی کر رہے تھے۔" شکیلہ بولی

"ہاں بیٹی خیریت سے ہوں۔"

"لیکن مجھے تو آپ کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہیں۔"

"نہیں بیٹی میں تو بالکل ٹھیک ہوں، یوں ہی سفر کی وجہ سے سستی اور تکان سی محسوس ہو رہی ہے۔"

"تو پھر آرام سے لیٹ جائیے۔ میں ابھی آپکے لیے لسی بنا کر لاتی ہوں۔" شکیلہ نے ٹیبل فین چلا کر اُس کا رُخ رئیسہ کے بستر کی طرف کیا اور لسی بنانے لگی۔ ساس کے آجانے سے شکیلہ کو ایسی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے اس کی اپنی ماں اس کے گھر آگئی ہوں۔ شام کو شکیلہ نے ساس اماں کے آنے کی خوشی میں بریانی، زردہ اور قورمہ بنایا اور شام کو تینوں نے ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اماں کے لیے گداز بستر لگاتے ہوئے شکیلہ نے کہا۔ "اماں رات کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا تکلف اٹھا لیجیے گا۔"

صبح کو جب شاہد اور شکیلہ سو کر اٹھے تو اماں کا چہرہ کسی غم میں ڈوبا ہوا تھا ماں کو اداس دیکھ کر شاہد نے پوچھا "کیا بات ہے اماں! بہت اُداس نظر آ رہی ہو؟"

"بیٹا رات میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔"

"خواب! کیسا خواب؟"

"بیٹا رات میں نے خواب میں تمھارے ابا کو دیکھا۔"

"ابا کو دیکھا.... کیا کہہ رہے تھے وہ؟"

"وہ کہہ رہے تھے۔ رئیسہ تم جلد سے جلد شاہد کے گھر سے اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ اگر تم شاہد کے گھر ایک دن بھی رکیں تو اس پر بہت بڑی مصیبت آ سکتی ہے اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں ایک پل نہ سو سکی۔ میں نہیں چاہتی بیٹا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی مصیبت آئے اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دوپہر ہی کی گاڑی سے بارہ بنکی چلی جاؤں گی۔"

شاہد نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "اماں! دنیا چاند پر کمند ڈال رہی ہے لیکن تم پیچھے ہی رہیں، بھلا کہیں خواب کی باتیں بھی سچی ہوا کرتی ہیں تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔ مجھے کچھ نہ ہوگا اور پھر تمھارے لیے اگر مجھے کسی پریشانی کا سامنا کرنا بھی پڑ گیا تو کیا ہے میں تمھارے لیے ہر پریشانی اور مصیبت کا سامنا کر لوں گا۔ تمھاری خاطر میں پہاڑ سے بھی ٹکرا جاؤں گا ماں۔"

"ہاں اماں! ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں یہ، خواب تو صرف خواب ہی ہوتا ہے۔ کتنے دنوں بعد تو آپ ہمارے یہاں آئی ہیں۔ کیا آپ مجھے اپنی خدمت کرنے کا موقع بھی نہ دیں گی؟" شکیلہ نے لجاجت آمیز لہجے میں ساس سے کہا۔

خوشی کے دو آنسو رئیسہ کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے، آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے رئیسہ نے کہا: "اچھا میرے بچوں اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو کچھ دنوں تک میں ضرور تمھارے ساتھ رہوں گی۔"

شاہد کے گھر میں ایک ماہ قیام کرنے کے بعد رئیسہ اپنے گھر چلی گئی وہاں جا کر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے زاہد کو ایک خط لکھا۔

"زاہد بیٹے خوش رہو! تمھارے گھر سے رخصت ہو کر میں خیریت سے

(بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

از:- اکناوس رولے کوہن
مترجم:- سید محمد آفاق نقوی سیتاپوری

افسانہ

مسرت کا راز

میں دو ایسے شخصوں کے بارے میں لکھ رہا ہوں جو عام قسم کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن بعض باتوں میں ان کا طرزِ زندگی عام لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ اپنے اس غیر معمولی طرزِ زندگی کی وجہ سے بڑی خوشی و خرمی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ایسی خوش و خرمی کی زندگی جس کی ہر شخص تمنا کرتا ہے۔

میں، ڈن اور مارتا تینوں امریکہ کے ایک شہر میں پیدا ہوئے۔ ایک ہی اسکول میں ہم تینوں ہم جماعت تھے۔ ڈن اور مارتا بچپن ہی سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یہ دونوں جماعت میں اوسط درجہ کے طالب علم تھے۔ مارتا کوئی خوبصورت لڑکی نہ تھی مگر اس کے نشست و برخاست کے انداز میں ایک دلکشی تھی۔ ڈن بھی کوئی خوبصورت لڑکا نہ تھا مگر جسم مضبوط، قد بلند و بالا اور مزاج میں ہمدردی کا مادہ تھا۔ مشینی کاموں سے اسے فطری لگاؤ تھا لڑکپن ہی سے فرصت کے اوقات میں وہ موٹر کی مرمت کے ایک کارخانہ میں کام کرتا یہ دونوں غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد قانون پڑھنے کے لیے ایک دوسرے شہر چلا گیا، چند سال بعد تربیت حاصل کر کے اپنے شہر آگیا اور وکالت شروع کر دی۔

ایک دن مارتا اور ڈن مجھ سے ملنے آئے، معلوم ہوا کہ دونوں نے شادی کر لی ہے اور میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈن نے اسی کارخانہ میں ملازمت کر لی ہے جہاں وہ لڑکپن میں فرصت کے اوقات میں کام کیا کرتا تھا۔ مارتا اسی کارخانہ میں کلرک تھی۔

ایک دن میں ان سے ملنے گیا۔ شہر کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں کرایہ پر رہتے تھے، مکان سادگی کے ساتھ آراستہ تھا، ہر چیز قرینے کے ساتھ مناسب جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ مارتا نے گھر کی ضروری چیزیں کباڑ خانے سے خریدی تھیں چھوٹے سے پائیں باغ میں طرح طرح کے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ مکان کی پشت پر تھوڑی سی جگہ میں ترکاریاں بو رکھی تھیں۔ کوئی بھی مکان میں قدم رکھتا تو اس صاف ستھری فضا میں خوشی و خرمی محسوس کرتا۔ کارخانہ میں بھی دونوں بڑی محنت اور فرض شناسی کے ساتھ کام کرتے۔ گھر پر بھی دونوں کسی نہ کسی کام میں ہمہ وقت مصروف رہتے لیکن اتنی محنت کے باوجود دونوں ہر وقت ہشاش بشاش نظر آتے اور ان کے لبوں پر تبسم نظر آتا جو بھی ان کے مکان کے قریب سے گزرتا وہ گھر سے چہل پہل کے آثار محسوس کرتا اور قہقہوں کی آوازیں سنتا۔ دونوں ایسی محبت کی زندگی گزار رہے تھے کہ دیکھنے والا کہہ سکتا تھا کہ ان کے پاس غم پھٹکتا تک نہیں۔ میں خیال کرتا تھا کہ اُن کی خوش دلی کا راز یہ ہے کہ آپس میں بے حد خلوص و محبت ہے اور جو کچھ بھی ان کے پاس ہے اس سے راضی و مطمئن ہیں، اولاد سے محروم تھے اگر کسی شے کی کمی کہی جا سکتی ہے تو بس یہی تھی۔ میں نے یہ تو کبھی نہ محسوس کیا کہ انہیں اپنے لاولد ہونے کا غم ہے، یہ ضرور محسوس کیا کہ انھیں بچوں سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ ان کے گھر میں کسی ہمسایہ کا کوئی نہ کوئی بچہ موجود ملتا۔ کوئی ہمسایہ خرید و فروخت کے لیے بازار جاتا تو اس کے بچے والدین کی عدم موجودگی میں ان کے پاس رہتے۔ کبھی کسی بچہ کو پڑھاتے نظر آتے یا کسی بچہ کے لیے گڑیا بناتے اور گڑیا کے لباس تیار کرتے۔

اس طرح ایک مدت گزر گئی اور دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ڈن ہم لوگوں سے پہلے جنگ پر چلا گیا اور ہم لوگوں کے بعد واپس آیا۔ جب واپس ہوا تو اس کے چہرے سینے اور گردن پر زخموں کے نشانات تھے۔ ڈن کی عدم موجودگی میں مارتا حسبِ معمول خانگی امور کی انجام دہی کرتی رہی مگر مکان کا کرایہ چڑھ جانے کی وجہ سے مقروض ہو گئی تھی۔

ڈن جس دن سے واپس ہوا اسی دن سے اپنے کارخانہ میں مصروف ہو گیا اور از سرِ نو گھر میں شادمانی و مسرت کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ایسا معلوم

اتنا کہ اتنے دنوں کی دوری نے ایک دوسرے کو قریب تر کر دیا تھا، وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش دلی کے ساتھ گھریلو کاموں میں منہمک ہو گئے جلد ہی ان کا قرض بھی ادا ہو گیا۔

ایک دن میں ان کے گھر گیا، ان کو بے حد خوش و خرم دیکھ کر میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کوئی ایسی افتاد نہ پیش آ جائے کہ ان کی مسرتوں میں رخنہ پڑ جائے۔ ہوا بھی ایسا ہی لیکن اس کی صورت میرے تصورات سے کچھ مختلف تھی۔ ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہی تھا کہ میرے ایک وکیل دوست کا خط ملا جس نے میرے ساتھ قانون کی تعلیم پائی تھی وہ ایک دوسرے شہر میں وکالت کرتا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

"میں ایک موکل کا مشیر قانونی تھا جس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ایک لاکھ روپے کی رقم چھوڑی ہے۔ مرحوم وَن کے باپ کا چچا تھا، وَن ہی اس رقم کا تنہا وارث ہے۔ میرے موکل نے تاکید کی تھی کہ میں اس کے وارث کو مطلع کر دوں تاکہ وہ اس رقم کو حاصل کر لے۔"

میں نے ٹیلیفون سے وَن کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ میرے دفتر میں آ کر مجھ سے مل لے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے پاس دفتر میں آ گیا، میں نے اسے حالات سے باخبر کیا۔ میری بات سن کر مجھ سے کہا۔

"کیا آپ بالکل مطمئن ہیں کہ وکیل صاحب نے آپ کو جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں پورے طور پر مطمئن ہوں۔"

اس نے کہا: "اس واقعہ کے بارے میں کون کون واقف ہے؟"

میں نے جواب دیا: "اس واقعہ کے بارے میں وکیل صاحب جانتے ہیں، میں جانتا ہوں اور آپ۔"

اس نے کہا: "میری خواہش ہے کہ میری طرف سے اس رقم کو آپ اپنے حساب میں کسی بینک میں جمع کر دیں۔ یہ رقم بطور امانت آپ کے پاس رہے اور کوئی شخص یہ نہ جانے کہ مجھے یہ رقم ملی ہے۔"

میں نے کہا: "مارتا کے علم میں تو یہ بات رہنا ہی چاہیے۔"

اس نے کہا: "نہیں مارتا کو بھی اس کا کچھ علم نہ ہونے پائے۔"

میں حیرت سے اس کو دیکھنے لگا، کچھ توقف کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"دیکھیے آپ اور مارتا دونوں مل کر گھر چلا رہے ہیں۔ آپ نے بڑی زحمتیں اٹھائی ہیں۔ یہ رقم آپ دونوں کی ہے، کیوں نہ اس رقم سے آسائش کی زندگی گزاریں۔

اس نے تعجب سے پوچھا: "آسائش کی زندگی؟"

اس کے اس سوال سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں نے اس سے کوئی مذاق کیا ہے۔

میں نے کہا: "ہاں! آسائش کی زندگی، کیوں نہ اس رقم سے مکان خرید لیں، موٹر خرید لیں۔ مارتا کے لیے قیمتی قیمتی لباس فراہم کریں کچھ دن آرام کرنے کے خیال سے کہیں سیاحت پر نکل جائیں۔ کچھ دنوں کے لیے آپ اور مارتا یورپ کی سیر کر آئیں۔"

اس نے کہا: "ان سب باتوں سے فائدہ کیا ہو گا؟"

میں نے کہا: "یہ بھی کوئی سمجھانے کی بات ہے۔ انھیں چیزوں کا نام زندگی ہے۔ اسی کا نام مسرت و شادمانی ہے۔"

وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر بولا: "میں تو بڑی خوشی و خرمی کی زندگی بسر کر رہا ہوں مگر آپ خیال کرتے ہیں کہ اس رقم سے میں اپنی شادمانی میں مزید اضافہ کر سکتا ہوں!"

اب مجھے اس کی باتوں سے جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی، میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ دونوں بے حد خوش نصیب آدمی ہیں پھر بھی اس شادمانی اور اطمینان میں اضافہ تو ہو ہی سکتا ہے......"

اس نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میری راحت اور میرے آرام میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس رقم کے بغیر بڑا سکون محسوس کر رہا ہوں اس لیے میں یہ رقم اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا، یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں اسے ضائع کر دینا چاہتا ہوں ہو سکتا ہے کہ مجھے کسی وقت اس کی ضرورت پیش آئے، ممکن ہے کہ میں یا مارتا بیمار ہو جائیں اور علاج کرانے کی ضرورت پیش آ جائے یا میرے ہاتھ پیر بیکار ہو جائیں اور کام کرنے سے معذور ہو جاؤں، اسی لیے آپ سے درخواست ہے کہ اس رقم کو میرے لیے آپ محفوظ رکھیں۔ اس

وقت جس اطمینان کی زندگی گزار رہا ہوں اس کے لیے نہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے اور نہ مارتا کو۔

اب میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کے آگے چل کر اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی ہوگی اس کی رقم کو اس کی منشا کے مطابق محفوظ کر دیا۔ وقت گزرتا گیا مگر اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور نہ کبھی اس رقم کے متعلق اس نے کوئی گفتگو کی۔

ایک سال کے بعد امریکہ کے معاشی حالات میں بڑی ابتری آئی، لوگوں کی مالی حالت میں تنگی پیدا ہوگئی۔ ان حالات کا اثر ڈن اور مارتا کی زندگی پر بھی پڑا مگر ان کی خوش و خرمی کا وہی عالم تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اقتصادی بحران قابو میں آ گیا، لوگوں کی زندگی میں بہتری پیدا ہوگئی۔ اس عام خوشحالی کا اثر ان دونوں کی زندگی پر بھی پڑا۔ میں نے دیکھا کہ مکان کی خوب چونا کاری کرائی گئی، گھر میں کھانا پکانے کے لیے کُکر بھی آ گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اب وہ گھر میں ایک نئی تبدیلی لا رہا ہے، شاید اب پیسوں کی ضرورت محسوس کرے مگر اب بھی پیسوں کا مطالبہ نہ کیا۔

ایک سال کے بعد مالک مکان نے مکان اس کے ہاتھ فروخت کر دیا اور شرط یہ طے پائی کہ مکان کی قیمت ماہ بماہ قسطوں کی شکل میں ادا کرے۔ میں نے ایک دن اس کو بلا بھیجا اور مشورہ دیا کہ مکان کی قیمت بالاقساط جمع کرنے کے بجائے اک دم ہی کیوں نہ ادا کر دی جائے اس نے جواب دیا۔

"اب تو مارتا کی تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے، مکان کی قسط بسہولت ادا ہو رہی ہے آپ کے پاس جو پیسہ محفوظ ہے اس کی ضرورت ہی نہیں۔"

میں نے اس کی باتوں سے بڑی بددلی محسوس کی۔ اس نے میری بددلی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے یہ مثل سنی ہوگی کہ مسرت و شادمانی پیسے سے نہیں خریدی جا سکتی لیکن میں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ پیسے سے آدمی کا اطمینان و شادمانی رخصت ہو جاتی ہے۔"

میں خاموش ہو گیا اور اس موضوع پر کوئی گفتگو نہ کی۔ دو سال گزر گئے ڈن اور مارتا نے مکان کی سب قسطیں ادا کر دیں، گھر میں کچھ نئی چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ ایک دن میں ان کے گھر گیا میں نے دیکھا کہ مارتا نے مکان کے باورچی خانہ میں الماریاں بنوائی ہیں۔ جسم پر لباس بھی پہلے سے بہتر قسم کا نظر آیا، ان کی مسرت و شادمانی میں اضافہ نظر آتا تھا مگر اب ایک حادثہ سے انھیں دوچار ہونا پڑا ایک دن ٹیلیفون سے مجھے طلب کیا گیا میں پہنچا تو وہ دیکھا جس کا خیال تک نہ تھا۔ ڈن اپنے دفتر کے برآمدہ میں بیہوشی کے عالم میں ایک بنچ پر لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا، ذرا دیر کے بعد ایمبولینس کار آئی۔ لوگ اسے اسپتال لے گئے اور اسی دن اس کا انتقال ہو گیا۔

اس حادثہ نے مارتا کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بیمار ہو گئی، ایک مہینہ تک وہ اسپتال میں زیر علاج رہی، شفایاب ہونے کے بعد اپنے گھر واپس ہوئی۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان بدلے ہوئے حالات میں میں اس کے گھر جاؤں۔ سوچتا تھا کہ ڈن کے انتقال کے بعد اس کے گھر کا کیا نقشہ ہوگا۔ مارتا کا کیا حال ہوگا۔ مگر ایک دن میں اس کے گھر گیا تاکہ مارتا کو اس رقم کے بارے میں بتاؤں۔

موسم بہار میں مجھ پر بڑا کیف آور اثر ہوتا تھا۔ مجھے ہر چیز میں حیات نو محسوس ہوتی تھی، نہ جانے کتنے بھولے بھٹکے اشعار بے ساختہ زبان پر آ جاتے تھے۔ میں اس کے گھر جا رہا تھا لیکن اس بہار کے موسم میں کائنات مجھ کو لبریز یاس نظر آ رہی تھی، ہر طرف اداسی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں اس کے دروازہ پر موٹر سے اترا مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری آواز گلوگیر ہے، جی چاہتا تھا کہ گھر میں جا کر کسی گوشہ میں بیٹھ کر زار و قطار رو کر اپنے دل کو ہلکا کروں، میں سوچ رہا تھا کہ مارتا کو گھر میں تنہا کیسے دیکھوں گا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مارتا نے دروازہ کھول کر میری پذیرائی کی، ہم دونوں مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن تبسم نہ میرے لبوں پر تھا اور نہ اس کے لبوں پر۔ ہم دونوں ایک کمرہ میں بیٹھ گئے۔ مارتا نے گفتگو شروع کی بولی۔

"اب اس مکان کا ماحول میرے لیے غم آور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ گھر ہمیشہ خوش و خرمی کا گھر رہا ہے، میرا جی نہیں چاہتا کہ اسے ماتم کو

بناؤں ۔ میں چاہتی ہوں کہ ہنستی رہوں، خوش خوش رہوں مگر
میری کوششیں رائگاں ہو جاتی ہیں ۔ اسپتال سے آکر میں نے
چاہا کہ گھر کی وہی حالت برقرار رکھوں جیسی کہ پہلے تھی ۔ میں اس کی
فضا ویسی ہی قائم رکھوں جیسی کہ ڈن چاہتا تھا مگر میری سب
کوششیں بے سود ہو کر رہ گئیں ۔"

مارتا جو کچھ کہہ رہی تھی اور کہنا چاہتی تھی وہ سب میرا دل محسوس
کر رہا تھا ۔ قبل اس کے کہ اس کا سلسلۂ کلام ختم ہو میں نے اس کو اس
امانت کے بارے میں بتایا جو میرے پاس محفوظ تھی ۔

مارتا نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا ۔

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ رقم میں لے لوں ؟"

میں نے کہا ۔ "آپ نہ لیں گی تو اور کون لے گا ؟ آپ جب کہیں
میں یہ روپیہ حاضر کر دوں ۔"

اس نے کہا ۔ "اب تک تو مجھے اس رقم کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ ڈن
اور میرے پاس کسی چیز کی کمی ہی نہ تھی ۔ اگر کمی تھی تو صرف اولاد کی
اور ڈن کی موجودگی میں مجھے اس کمی کا بھی چنداں احساس نہ تھا ۔
ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی کی کمی کو پورا کر رہے تھے ۔ مجھے
ان کی موجودگی میں تنہائی کا سوال ہی نہ تھا ۔ میں ایسے لوگوں کو
جانتی ہوں کہ جو ایک بڑے کنبے میں بیوی بچوں کے درمیان رہتے
ہوئے بھی زندگی بھر تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ ان کے
مزاجوں میں ہم آہنگی نہیں ہوتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت
ایک وسیع سمندر میں ایک ویران جزیرہ کی ایسی ہے لیکن میں نے
کبھی بھی تنہائی محسوس نہیں کی ۔ ڈن موجود نہ بھی ہوتا پھر بھی میں
اس کے وجود کو محسوس کرتی گویا وہ کسی وقت مجھ سے جدا نہ تھا ۔ اسکے
وجود کو تو میں اب بھی محسوس کرتی ہوں لیکن گھر میں زندگی محسوس
نہیں کرتی ۔ اب اس گھر میں مسرت و شادمانی کا فقدان ہے ۔ اس
رقم سے میں اس طرح صاحب اولاد ہو سکتی تھی کہ کسی کے بچہ کو میں
اپنی فرزندگی میں لے لیتی ، ملازمت ترک کر دیتی ۔ ڈن کی خواہش تھی
کہ کسی لڑکی کی ہم پرورش کرتے اور کوشش کرتے کہ اسے پر مسرت
زندگی بسر کرنے کا فن سکھاتے ، بالکل اسی ڈھرّے پر لگاتے ، جس
ڈھرّے پر ہم دونوں تھے ۔"

یہ کہتے کہتے اس نے رومال سے اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے
ہوئے کہا ۔

"پیارے ڈن ! تم نے مجھے مسرت سے روشناس کیا اور ایسی
مسرت کہ تم موجود نہیں ہو پھر بھی تمھاری یاد کے سہارے میں خوش و
خرم رہ سکتی ہوں، تمھاری مسرت بخش یاد میری زندگی بن چکی ہے
جب مسرت کا اتنا بڑا سرمایہ میرے پاس ہے تو اب مجھے کس چیز کی ضرورت
ہے ۔"

یہ کہتے کہتے وہ کسی خیال میں گم سی ہو گئی، میں بھی نہ جانے کس
خیال میں کھو گیا ۔ میں نے سکوت کے توڑنے میں پہل کی، بولا ۔

"مارتا تمھیں اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد ہے ؟ اپنے ہم جماعت یاد
آتے ہیں ؟ تم اور ڈن ان سب میں بہتر تھے ۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم
دونوں ہم میں سب سے زیادہ عقل مند تھے تو بے جا نہ ہوگا جانتی ہو کیوں ؟
تم دونوں نے زندگی کے اس رخ کو اپنایا جس سے ہم سب محروم رہے ۔"

★

پھول اور کانٹا ۔ (صفحہ ۳۱ کا بقیہ)

شاہد کے گھر آ گئی تھی ۔ ایک ماہ شاہد کے یہاں رہنے کے بعد اب بارہ بنکی
آ گئی ہوں ۔ بیٹے ! کل رات مجھے ایک عجیب و غریب خواب دکھائی دیا میں نے
دیکھا کہ تمھارے ابا میاں خواب میں مجھ سے کہہ رہے تھے اگر تم زاہد کی بھلائی
چاہتی ہو تو اپنی جائیداد میں سے ذرا سا بھی حصہ زاہد کو نہ دینا اگر تم نے
اس کو اپنی جائیداد میں سے کچھ بھی دیا تو اس پر بہت بڑی مصیبت
آ جائے گی ۔ تم میری روح کو اگر سکون پہنچانا چاہتی ہو تو سب جائیداد
شاہد کے نام کر دو ۔ پھر میری آنکھ کھل گئی ۔ جب سے میں نے یہ خواب دیکھا
ہے میں بہت پریشان ہوں میری تو یہی خواہش تھی کہ تم دونوں بھائیوں
کے نام آدھی آدھی جائیداد کر دوں لیکن میں تمھارے ابا کی خواہش کو
کیسے ٹال سکتی ہوں ۔ اس لیے میں اپنی وصیت میں سب جائیداد
شاہد کے نام ہی کر رہی ہوں ۔ آئندہ جو تم خواب دیکھو مجھے ضرور خبر کرنا ۔

تمھاری ماں ـــــ رئیسہ !"

★

ضیا حسنی

مزاحیہ

ہم جن صاحب کا تذکرہ کرنے جا رہے ہیں ان سے ہماری واقفیت پرانی ہے وہ ہمیں اپنے پچیس معاشقوں کی داستان قسط وار سنا چکے ہیں جن میں سے چند ایک کامیاب اور بقیہ سبھی ناکام ہو چکے ہیں۔

عشق بازی ان کا محبوب مشغلہ ہے چنانچہ وہ اپنے انتہائی ضروری کاموں کو بھی پس پشت ڈال کر بلاناغہ صبح و شام گرلز کالج کا طواف ضرور کرتے ہیں اور اس بادیہ پیمائی کے سلسلہ میں انھیں کس حد تک کامیابی بھی ہوتی ہے اس کی پوری واقفیت تو ہمیں نہیں ہو سکی البتہ انھوں نے ایک درجن سے زیادہ لڑکیوں کے سلسلۂ نسب سے ہمیں ضرور واقف کرا دیا۔ اس سلسلہ میں ہم ان کے شکر گزار ہیں یا بیزار اس پر کوئی رائے دیے بغیر یہ ضرور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ جب کبھی تازہ تازہ اپنی مہم سے واپس آتے ہیں تو اس طرح ہم کلام ہوتے ہیں۔

"فلاں لڑکی ملی تھی، دیر تک ہنستی رہی، شوخیاں کرتی رہی، میاں! یہ وہی لڑکی ہے جس کے والد کا نام فلاں ہے اور منشی گنج میں رہتی ہے۔"

ہم پڑھ رہے ہوں یا لکھ رہے ہوں جب وہ آپ بیتی سنانے لگتے ہیں پھر بھی اکثر وہ خفگی کے انداز میں فرماتے ہیں۔

"کتنی بار اس کا تذکرہ کر چکا ہوں لیکن تم اس طرح میرا منھ دیکھے جاتے ہو جیسے تم اس سے واقف ہی نہ ہو۔"

اس کے علاوہ وہ ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹیشن پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بک اسٹالوں پر یوں ہی رسائل و اخبار اٹھا لیتے ہیں اور خوبرویوں کو کن انکھیوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ سرفراز میموریل لائبریری میں بھی وقتاً فوقتاً قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ جب سے شبانہ نے اس لائبریری کی ذمہ داری سنبھالی ہے یہ لائبریری ان کی دلچسپی کا مرکز بن گئی ہے۔ اخراجات کے معاملہ میں وہ کافی محتاط رہتے ہیں، کوئی رسالہ یا کتاب کی خریداری کا بوجھ اپنی جیب پر ڈالنا پسند نہیں کرتے اور نہ ابھی تک کسی لائبریری کے ممبر بننے کی انھیں توفیق ہوئی تھی لیکن اب انھوں نے سرفراز لائبریری کی ممبرشپ خوشی خوشی قبول کر لی ہے ان کی اس خوشگوار تبدیلی پر چہ می گوئیاں ہوتی ہیں لیکن وہ ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتے۔

شبانہ کو ان کی یہ بات کافی کھلتی ہے کہ وہ کافی ضخیم کتاب دوسرے دن ہی واپس کر دیتے ہیں اور اس طرح کہ ان کے مطالعہ کا کوئی نشان کتاب میں دکھائی نہیں دیتا وہ دوسری کتاب ایشو کرانے کے لیے اسے کافی دیر تک گھیرے رہتے ہیں اس اثنا میں وہ موضوع سے ہٹ کر کچھ باتیں بھی کر جاتے ہیں جس کا جواب وہ ترش روئی سے دیتی ہے لیکن وہ اس تلخی کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے ہیں اور اس کا عکس ان کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اس پر بھی نگاہ رکھتے ہیں کہ چپراسی غائب ہو اور وہ اونچی الماری کے پہلے خانے سے کوئی کتاب نکالنے کے لیے شبانہ سے کہیں، شبانہ جیسے ہی الماری کی طرف بڑھتی ہے تو وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہیں اور پھر اسے ٹھیک سے آنکھوں پر جما کر اس کے جسم کی رنگینیوں کو چرانے لگتے ہیں۔

دورانِ سفر ہمیں اکثر ان کی رفاقت میسر آئی ہے کبھی خیریت رہی اور کبھی بات ایسی الجھی کہ اسے سلجھانے میں پسینے آ گئے لیکن کیا مجال جو ان کی پیشانی پر شکن آئی ہو، کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ بیٹھے

رہ جائیں یہ ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی ایک دلچسپ حرکت سنتے چلیے، اگر وہ کسی حسینہ کو اپنے نومولود بچے کو گود میں لیے ہوئے دیکھ لیں گے تو اس بچے پر ہزار جتن سے فدا ہونے کی سعی کریں گے، سیٹی بجائیں گے چٹکیوں سے اسے مخاطب کریں گے، کوئی بولے نہ بولے بچے کی معصومیت اور دلکشی کی بات چلائیں گے، اگر حسن اتفاق سے ماں ملتفت ہو گئی تو اس کے بچے کو منزلِ مقصود تک گود میں لیے رہیں گے، بچے کو کھلاتے رہیں گے، بہلاتے رہیں گے اور چوری چوری اس کی ماں کو بھی دیکھے جائیں گے کہ اس کے چہرے پر اُن کی جاں نثاری کیا رنگ لا رہی ہے۔ ایک بار ان کی اس حرکت پر ایک خاتون نے اُنھیں کس کر ڈانٹ پلائی۔ انھوں نے اس کے بچے کو گود میں لے کر فرطِ محبت سے اس کا منھ چوم لیا۔ اس پر عورت نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ہم نے اسے ہموار کرنا چاہا تو وہ بولی۔

"ان کے ہونٹ پر سپید داغ ہے، کیا آپ کو دکھائی نہیں دیتا؟"

ہم نے نرمی کے لہجے میں اسے سمجھایا۔

"اُن سے غلطی ہو گئی لیکن ان کے کئی معصوم بچے فوت ہو چکے ہیں اس لیے جب وہ کسی بچے کو دیکھتے ہیں تو اسے گود میں ضرور اٹھا لیتے ہیں۔ انھیں معاف کر دیجیے۔"

ایسی بات سنتے ہی عورت خاموش ہو گئی۔

جاڑے میں ہم اپنے چبوترے پر بیٹھ کر کوئی کتاب یا رسالہ دیکھا کرتے تھے۔ دھوپ نکلی ہوتی تو گھنٹوں بیٹھے رہتے وہ ہمیں وہاں دیکھتے تو بے تکلفی سے آکر جم جاتے۔ بظاہر ہم سے باتیں کرتے لیکن چوری چوری حلوائی کی جواں سال چھوکری کو دیکھے جاتے اور کبھی چھلانگ لگا کر اس کی دوکان پر پہنچ جاتے اس سے دو گھڑی باتیں کر کے دل ٹھنڈا کرتے، دونے میں گرم گرم جلیبیاں لیے ہوئے پھر ہمارے قریب آکر براجمان ہو جاتے ہم بظاہر ان سے توجہ ہٹا کر مطالعہ میں ڈوبے رہتے تو وہ ہمیں چھیڑتے ہوئے کہتے۔

"میاں! گرم گرم جلیبیاں کھاؤ، حلوائی کی چھوکری ان سے بھی زیادہ رسیلی ہے۔"

غرض مجھے انھوں نے زیادہ دنوں چبوترے پر بیٹھنے نہیں دیا اور اس کے بعد ہم روپوش ہو کر گھر میں بیٹھنے لگے۔ ہم ایسا کیوں کرنے لگے اسے بھی سنتے چلیے۔

ایک دن حلوائی ہم سے آکر ملا اور اُس نے ایسی بات کہہ دی کہ ہماری خاندانی شرافت کو جھرجھری آگئی۔ اُس بات کو بھی سن لیجیے۔

"کوئلے کی دلالی بری ہوتی ہے بابو! وہ آپ کے یہاں چھوٹے قد کے، آدھی چندیا صاف، عینک لگائے ایک بابو جو اکثر آجاتے ہیں کچھ نجر (نظر) کے کھراب (خراب) لگتے ہیں۔ آپ بھلے آدمی ہیں انھیں منہ نہ لگایے۔"

ادھر بیگم اُن کے نام پر ہزاروں صلوٰتیں سنانے لگی ہیں۔ اُن کا نام آیا اور ان کا مزاج برہم ہو گیا۔ ہمیں ان کی دوستی سے دلچسپی ضرور ہے لیکن بیگم سے بگاڑ ہو جائے یہ بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ بیگم کی ناراضگی کا سبب یہ ہے کہ ایک بار ہماری عدم موجودگی میں تشریف لے آئے اور جب یہ سنا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں تو بیگم سے بولے۔

"بھائی جان! ذرا ایک گلاس ہمیں پانی پلا کر کلیجہ تو تر کیجیے۔" بیگم نے پانی جیسے ہی دیا تو انھوں نے فرمایا۔ "لگتا ہے بھابی! مہندی آج ہی لگائی ہے۔ گوری گوری ہتھیلیوں سے بھینی بھینی مہک آرہی ہے۔"

بیگم زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئیں اور انھیں مہمان سمجھ کر کچھ نہیں بولیں ورنہ وہ جتنی نرم ہیں اتنی گرم بھی ہیں۔

خوش قسمتی سے ہمارا تبادلہ خیر نگر ہو گیا۔ ہم نے ایسی بات اس لیے کہی کہ جہاں ہمیں بیگم کی جدائی کا سامنا کرنا پڑا اور اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہنا پڑا وہاں اپنے دوست سے مفارقت بھی ہو گئی ادھر ان کی خصوصی توجہ ہماری طرف ہو گئی تھی، صبح شام ہمارے یہاں نازل ہو جاتے کوئی نہ کوئی تازہ خبر سناتے تھے اور ہم جیسے ہی گھر پہنچتے بیگم کے عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔ چلیے اُن سے ہمیشہ کے لیے چھٹی مل گئی۔

★

مزاحیہ

حمزہ نیر مراد آبادی

ایک تیر سے ...!

دانشوروں، عالموں، فاضلوں، فلسفیوں، جاہلوں اور عاقلوں کے اقوالِ زریں کسی نہ کسی حد تک ان کی زندگی کے تجربات کے نچوڑ ہوتے ہیں، ان کے تجربات سے فائدہ نہ اٹھانا آج کے انسان کے لیے بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔ تجربات کے نچوڑے گئے قطروں کے مجموعہ کو آبِ حیات کا بیکراں سمندر خیال کرتے ہوئے ہر کس و ناکس کو اس سے اپنے گلشنِ حیات کو سیراب کرتے ہی رہنا چاہیے ـــــ اس لیے ہم نے اپنے آپ کو خوش نصیب خیال کرتے ہوئے بارنولڈ کے قول (عورت مصیبت اور غم کو کم کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے) پر ایمان لاکر ہم عورت کو اپنے غم و آلام کے جھمیلوں کو کم کرنے کے لیے وقت و مصلحت کی اہم ضرورت سمجھنے لگے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر ہم نے کئی خوبصورت لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھانسنا چاہا۔ بدقسمتی (لڑکی کی) سے ایک لڑکی جال میں پھنس گئی۔ لیکن جلد ہی اس نے ہمیں داغِ مفارقت کی دولت سے مالامال کرکے نئے غم کی دولت بخش دی اس طرح مختلف النوع غموں کے بڑھتے ہوئے سلسلے نے ہمیں مجنوں کی (True Copy) بناتے بناتے چھوڑا تھا۔ اگر عین موقع پر ہمارا ایک عزیز دوست ہماری بحث میں مداخلت نہ کرتا تو ہم یقیناً مجنوں کی اصلی تصویر بن جاتے اور صحرا صحرا، جنگل جنگل گاتے پھرتے "لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں..." ـــــ دوست نے ہمیں نکتے کی بات بھی بتائی تھی "اگر غموں کو خوشیوں سے بدلنا چاہتے ہو تو کسی معقول لڑکی کو بیوی کے روپ میں شوہکار کر لو!" بات بے حد معقول تھی فوراً ہی ذہن میں اتر گئی۔

شادی کے بعد سات آٹھ مہینے تک ہماری بیوی بقول "ناصر ہور کے رات کا تارہ، صبح کا نور اور شبنم کا قطرہ ثابت ہوتی رہی۔ ہمارے ذہن میں بقراط کی نصیحت بھی پتھر کی لکیر کی طرح نقش تھی کہ عورتوں کے کہنے پر عمل نہ کیا تو تمام آفاتِ زمانہ سے محفوظ رہو گے ـــــ اس لیے ہم نے ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی بڑی ہوشیاری کے ساتھ بیوی کو ایسے ہر سنہرے موقع سے محروم رکھا جبکہ وہ ہم پر حکم چلانے کے بارے میں سوچ بھی سکتی تھی۔ نتیجتاً ہم بہت سے آفاتِ زمانہ سے محفوظ رہے ـــــ اسے ہم نے کبھی کوئی راز بھی نہیں بتایا تھا کیونکہ عورت پیٹ کی ہلکی ہوا کرتی ہے جب کبھی ہم اپنے شوق کی کوئی چیز لاتے تو ایسی ہر چیز کو خفیہ رکھتے جو بیوی کی نظر میں فضول ہوتی!

ایک مرتبہ دہلی جانا ہوا ـــــ شاید کسی نمائش میں! وہاں سے ہم اپنی پسند اور شوق کی کئی چیزیں خرید لائے۔ ان میں سے کچھ چیزیں کھلم کھلا بیوی کے شوق کی بھی تھیں۔ عورت کے دل میں اپنی قدر کی جڑیں گہری کرنے کا یہ بھی ایک کامیاب طریقہ ہے۔ اپنے شوق کی بہت سی چیزیں ہم نے اپنی بیوی سے پوشیدہ رکھی تھیں۔

اچانک ہماری بیوی کے پیار بھرے خلوص اور محبت بھرے سلوک میں لرزہ خیز انقلاب آنے لگا۔ ہم نے اس تاریخی انقلاب کے بارے میں مختلف پینتروں سے معلوم کرنا چاہا۔ لاکھ کوشش کی ہم نے لیکن اس نے منہ پھُلائے رہنے کے علاوہ کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم مزید خوشامد کرتے تو وہ ناک سکوڑ کر، دانت نکوس کر، آنکھیں مٹکا کر ہماری طرف کوئی طنز کا تیر پھینک دیتی اور کمرے میں جاکر روٹھ جانے کی سی ایکٹنگ کرنے لگتی اس کی اس غیر زوجیانہ حرکت سے ہم شدید کشمکش کے عالم میں گرفتار ہوگئے تھے۔ دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اپنے ذہنی توازن کو برقرار رکھنے کی خاطر ہم نے مجبوراً ہار مان لی اور بقراط کی نصیحت کو سطحِ ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا۔ پھر ارسطو کے قول (مرد آقا ہے، عورت اس کی کنیز) کو عملی طور پر الٹا کر دکھایا تاکہ گھر کے ہی چراغ بلکہ موم بتی سے گھر کو آگ نہ لگ جائے ـــــ لیکن ہماری نرمی، ملائمت، لچک اور

شرافت کا بیوی نے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ٹھان رکھی تھی۔ پہلے وہ سادہ کریلا تھی، بعد میں ہماری شرافت کا عظیم کمزوری سمجھ کر نیم چڑھا کریلا ہو گئی اپنی بیوی کی بدلتی ہوئی حالت پر قابو پانے کے لیے ہم نے کرپٹ حاکم کی طرح چھوٹی موٹی، ہلکی پھلکی دھمکیاں بھی دیں، لیکن ان دھمکیوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا، اور اس کی ایک ہی ننھی منی دھمکی سے ہمارے چھکے چھوٹ گئے، نختے بہک گئے ـــــ! ہماری منت سماجت کے باوجود وہ شادی کے نویں مہینے اپنے مائیکے چلی گئی جبکہ نواں مہینہ یوں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا ہوتا ہے ـــ تنہا رہ جانے کے بعد حضرت علیؓ کا قول (عورت اگرچہ شر اور خرابی ہے، مگر اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ عورت کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہو سکتا) بار بار ہمارے دل و دماغ کو کچوکے لگا رہا تھا۔

بہ طور حفظ ما تقدم ہم نے اپنی سسرال میں خطوط کا براہ راست رابطہ صرف بیوی ہی سے قائم کیا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری بیوی کی خفگی کا علم ہمارے ساس سسر کو ہو اور وجہ خفگی پردے ہی میں رہ جائے، عزیز دوستوں اور رفیق رشتہ داروں کو تماشہ دیکھنے کا سنہرا موقع ملے۔

وقت نے ہلکے سے انگڑائی لی اور ہماری زندگی طوفان کے نذر ہوتے ہوتے رہ گئی، کیونکہ ہماری بیوی نے ہمارے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا

"آپ اس کلموہی سے دل لگائے رکھیے جو ۲۰ رمئی کی گرم دوپہر میں آپ کے پہلو میں سسکیاں بھر رہی تھی، آپ کو اپنے پیار کا یقین دلا رہی تھی۔ اس وقت آپ نے اس حرّافہ، ڈائن، جوانمری سے یہ تک نہیں کہا کہ آپ کے پلّے ایک بدنصیب بیوی بندھی ہوئی ہے.... آپ کے دل میں اگر میرے لیے ذرا سا بھی پیار ہوتا تو آپ کی برق رفتار زبان سے کچھ تو پھوٹتا ہی ـــــ! بعد میں آپ نے کیا کچھ کیا ہوگا، اس کے سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی۔ اب آپ ایک بچے کے باپ بننے والے ہیں، لیکن حرکتیں وہی ہیں طالب علمی کے زمانے کی ـــ! آپ کے دل اور گھر میں اب وہی خانہ خراب رہ سکتی ہے۔ اس لیے مجھ بدنصیب کے لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں آپ کے گھر واپس آؤں یا نہیں؟"

خط پڑھ کر ہمارے ذہن کے دوار چوپٹ کھل پڑے تھے۔

۲۰ رمئی کی دوپہر کی ساری تصویریں ہمارے گھورتے ہوئے دماغ میں ابل پڑی تھیں ـــــ ہوا یہ تھا کہ ہم دہلی نمائش سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر خرید لائے تھے۔ بیوی سے اسے چھپانا اشد ضروری تھا ورنہ فضول خرچی کا چوڑا سا لیبل ہماری ازدواجی زندگی کی پیشانی پر چپکا دیا جاتا ـــــ۔ ۲۰ رمئی کی دوپہر کو سونے کے بہانے سے ہم اپنے بے رونق ڈرائنگ روم میں تنہا جا لیٹے تھے۔ موقع اچھا تھا۔ اس لیے ہلکی آواز میں ڈرامے کا ٹیپ سننے لگے تھے۔ ڈرامے میں محبت کے جذبات کو بڑے مؤثر انداز میں سمویا گیا تھا ـــــ! اپنی اس عظیم غلطی کو محسوس کر کے ہم فوراً ہی بہ نفس نفیس سسرال پہنچے، کیونکہ ہمارے بے داغ دامن میں خواہ مخواہ بدنما دھبّہ لگنے کی نوبت تھی ـــــ سسرال پہنچ کر بیگم کو ڈرامے کا ٹیپ سنایا، تب کہیں جا کر نئے مہمان کی آمد کے ساتھ ساتھ روٹھی ہوئی خوشیاں واپس آ سکیں۔ لیکن بیوی کو اپنے حکم کے تابع رکھنے کی بات اپنا وزن کھو چکی تھی۔

کچھ دنوں بعد ہماری بیوی کی ایک بچپن کی سہیلی (جس سے ہماری شادی کی بات بھی خوب خوب چلی تھی) نے نہ جانے کس موڈ میں آ کر اس راز کا انکشاف بھی ہمارے سامنے کر دیا کہ ہماری بیوی بڑی ذہین اور ہوشیار ہے، معاملہ فہم اور موقع شناس ہے۔ اس نے ہمارے تحکمانہ رویّے اور غیر منصفانہ سلوک کو خاک میں ملانے کے لیے یہ سوانگ بھرا تھا۔ وہ یہ سب کچھ جانتی تھی کہ ٹیپ میں سے نکلتی ہوئی آواز ڈرامے کی ہیروئن کی ہی تھی...... !! یہ سن کر ہم نے سوچا کہ ایک تیر سے دو شکار! نویں مہینے تو بیوی کو ویسے بھی اپنے گھر جانا ہی تھا ـــــ !!

اب ہمیں شوپنہار کی بات سچ لگتی ہے کہ "عورت مرد سے زیادہ چالاک ہے۔" اب قارئین کرام ذرا غور سے سوچیں تو یہ باور کرنا پڑے گا کہ عورت ایک دھنک ہے، ایک گرگٹ ہے جس کے کتنے ہی رنگ ہوتے ہیں.....؟! پڑھیے تو سہی علامہ اقبالؒ کا یہ شعر کانوں کو کتنا بھلا لگے گا ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

★★

ایچ۔ سعادت اللہ بیتاب امروہوی

برسات

کالی گھٹا گھری ہے مینھ کی جھڑی لگی ہے
مدہوش کر رہی ہے کیسی ہوا چلی ہے
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

بجلی چمک رہی ہے، بادل مچل رہے ہیں
دل خوف سے ہر اک کے، کیسے دہل رہے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

تالاب، ندی، نالے جل سے بھرے ہوئے ہیں
مرغابیوں کے ان میں بیڑے پڑے ہوئے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

پیڑوں کی ڈالیوں میں جھولے پڑے ہوئے ہیں
ہر لب پہ ہے ترانہ، اور دل کھلے ہوئے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

سارس کنارِ دریا خوش ہو کے بھاگتے ہیں
خوش ہو کے جنگلوں میں کیا مور ناچتے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

بیلا، چمیلی، چمپا، جوہی کھلی ہوئی ہے
ہر دل ہے شاد و فرحاں مستی بھری ہوئی ہے
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

پھولوں کے پاس پنچھی کیا چہچہا رہے ہیں
کتنے وہ خوشنما ہیں دل کو لبھا رہے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

ہر شاخِ گل چمن میں، پھولوں کو چومتی ہے
تتلی تھرک رہی ہے کوئل بھی کوکتی ہے
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

پیپل کے پیڑ کیسے تالی بجا رہے ہیں
تو سب کے ساتھ وہ بھی اب گیت گا رہے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

بندِ قبا زمیں کے دیکھو کھلے ہوئے ہیں
گورا ہے جسم اس کا کپڑے دھلے ہوئے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

تارے بھی آسماں پر کیسے چمک رہے ہیں
دامن میں جوہری کے موتی دمک رہے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

رکتا نہیں ہے پانی، مینھ کی جھڑی لگی ہے
نغمہ کوئی حسینہ دیکھو وہ چھیڑتی ہے
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

کوئی مکاں گرا ہے، چھپر ٹپک رہا ہے
کوئی پھسل رہا ہے تو کوئی گر پڑا ہے
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

بیٹھا، چھت اپنی دیکھو کوئی تھپک رہا ہے
اور کوئی لینے مٹی، دیکھو لپک رہا ہے
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

خوش ہو کے بوڑھے بچے سب گیت گا رہے ہیں
دہقاں بھی بھاگے بھاگے کھیتوں پہ جا رہے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

سڑکوں پہ دیکھو بچے ناویں چلا رہے ہیں
پانی میں بھیگتے ہیں تالی بجا رہے ہیں
برسات آگئی ہے برسات آگئی ہے

ثمر بسوانی

نواب مرزا شوق لکھنوی

اپنی مثنویوں کے آئینے میں

نواب مرزا شوق لکھنوی اردو زبان و ادب کی ان ممتاز تاریخی شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ذوق ادب و شعور کے ہاتھوں اُردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ علم و فن کے میدان میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے اور اُن مصوّرانِ ادب میں گنے جاتے ہیں جنھوں نے ادبی سرمایہ میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مزاج اور زندگی کی صحیح طور پر عکاسی کی ہے۔

ان کا نام حکیم تصدق حسین خاں، عرفیت نواب مرزا، اور تخلص شوق تھا۔ باپ مرزا آغا علی کم آمیز اور خاموش پسند واقع ہوئے تھے لیکن چچا حکیم الملک مرزا علی خاں اپنے دور کے مشہور طبیب ہونے کے علاوہ نوابین اودھ کے دربار میں صاحبِ رسوخ و اثر سمجھے جاتے تھے انھیں کے صاحبزادے حکیم مسیح الدولہ بہادر تھے جو دیگر معزز عہدوں کے علاوہ سفارت کے منصبِ جلیلہ پر بھی فائز رہے اور بعض مصلحتوں کی بنا پر یہ ناکام کوشش فرماتے رہے کہ مرزا شوق نوابین اودھ کے دربار سے قریب نہ ہونے پائیں لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ نواب واجد علی شاہ اختر کے دور میں مرزا شوق کی دربار میں رسائی ہو گئی اور دیگر اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ بھی مقرر ہوئی۔

مرزا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب آتش کے فضل و ہنر کا طوطی بولتا تھا فطری ذوق، غیر معمولی لیاقت و ذہانت، شعر و نغمہ سے بھرپور ماحول ان محرکات نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور شوق جلد ہی شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آگئے۔ فکر و فن کے میدان میں آتش سے اصلاح لی، خواص سے دادِ سخن حاصل کی اور ایک رئیس کی طرح شان و شوکت سے زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔

شوق ایک زود گو شاعر تھے مختلف علوم و فنون میں مہارت کے ساتھ ساتھ فنِ شعر میں دستگاہِ کامل حاصل تھی، انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں کامیاب طور پر طبع آزمائی کی ہے ان کا کلام "مثنوی زہرِ عشق، مثنوی بہارِ عشق، مثنوی فریبِ عشق، مثنوی خنجرِ عشق مثنوی لذتِ عشق، دیوانِ غزلیات اور مجموعۂ واسوخت پر مشتمل ہے شاعری گویا ان کی تفریحِ طبع کا ایک حسین مشغلہ تھا لیکن اس میں فن کی چاندنی کے ساتھ ساتھ بلاشبہہ زورِ بیان و لطفِ زبان، رنگینی و رعنائی، موسیقی و سحر کاری اور دلکشی و اثر آفرینی کی قوسِ قزح بکھری ہوئی ہے۔ جہاں تک مثنویوں کا تعلق ہے شوق کے کلام کی خوبیوں میں تصویر کشی اور جذبات نگاری جیسے محاسن کا اور اضافہ ہو جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ شوق نے ان مثنویوں میں اپنے عہد کے لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت اور روایت و معاشرت کی جس طرح عکاسی کی ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ بعض معترضین کا خیال ہے کہ "واجد علی شاہی لکھنؤ پر مشتمل ان مثنویوں کی رنگین داستانوں میں اکثر شوق نے خود کو ہیرو متصوّر کیا ہے۔ اس لیے یہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی کہانیاں ہیں"۔ یہ خیال درست نہیں ہے بلکہ مفروضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں فنکار کے سامنے اس کے زمانے کی کچھ واقعاتی، تہذیبی، سماجی، سیاسی اور ذاتی مصلحتیں ہوا کرتی ہیں

اس کے باعث وہ اپنے مقصد کا اظہار کبھی حجاب اندر حجاب، کبھی اشارۃً کنایۃً کرتا ہے اور کبھی جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرتا ہے۔ شوق کے سامنے بھی یہی تمام مصلحتیں ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح مولانا الطاف حسین حالی کا یہ تبصرہ کہ "شوق کی مثنویاں اخلاقی حیثیت سے ایسی گری ہوئی چیزیں ہیں کہ عرصہ تک قانوناً ان کی اشاعت بند رہی" تنقیدی جائزے کی شکل میں ناصح مشفق کے فرمان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اخلاقی اقدار کم و بیش بدلتے رہے ہیں اور آج تک ان کا صحیح طور پر تعین نہیں ہو پایا ہے۔ علاوہ ازیں مثنویوں کی اشاعت کا قانوناً ممنوع ہونا مذاقِ سلیم پر بار ہونے کا جواز نہیں بن سکتا۔ دنیا کے بیشتر ممالک کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر دور میں حکمرانوں کی مختلف سیاسی مصلحتیں رہی ہیں جن کے باعث فنکار اور ان کے رشحاتِ قلم پر قانونی پابندیاں عائد کی جاتی رہی ہیں ایسی صورت میں شوق کی مثنویوں کی بابت یہ کیوں کر فرض کر لیا گیا کہ وہ مخربِ اخلاق ہونے کی وجہ سے قانونی طور پر اشاعت کے لیے ممنوع قرار دی گئی تھیں۔ بہرکیف یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات بنیادی طور پر درست نہیں ہیں لیکن کسی وجہ سے اگر تھوڑی دیر کے لیے صحیح مان بھی لیے جائیں تب بھی مرزا شوق کی ادبی عظمت اور ان مثنویوں کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر مثنوی 'لذتِ عشق' اپنی طوالت و ضخامت کے اعتبار سے شوق کی مثنویوں میں بہت نمایاں ہے۔ اس رنگین داستان کی تلخیص اس قدر ہے کہ "پرستان کی ایک پری شاہزادے کو مسحور کر کے لے جاتی ہے۔ پھر اس کے دام سے جنوں کے ذریعہ رہائی ملتی ہے وزیر کی ایک دخترِ رازداں ہے جو اپنے حسنِ جنوں خیز کے ساتھ ساتھ بلا کی شوخ اور قیامت کی ہوشیار ہے۔ اس میں دو قصے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، دونوں قصوں کے کردار شاہی خاندان سے متعلق ہیں اور ماں باپ کے چہیتے ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں تقریباً ایک ہی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں۔ بالآخر مصیبتوں کی قید سے آزاد ہو کر دونوں کا انجام شادی پر ہوتا ہے" اور اس طرح یہ افسانہ بخیر و خوبی انتہا کو پہنچتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مرزا شوق اپنے وقت کے صاحبِ کمال شاعر تھے لیکن اس مثنوی کے مطالعہ کے بعد یہ مترشح ضرور ہوتا ہے کہ ان کا چراغ سے چراغ جلانے کے فن پر ایمان و یقین تھا اور میر حسن کو اس پُرپیچ راہ کا خضرِ کارواں تسلیم کرتے ہوئے ان کے اسٹائل اور ٹیکنک سے استفادہ ضرور کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شوق کی مثنوی کے بیشتر اشعار الفاظ، تراکیب اور قصہ کی بندش پر میر حسن کی مثنوی کے اکثر اشعار کا گمان ہوتا ہے۔ اُن کا فن اُن ارتقائی حدوں کو چھو لیتا ہے جہاں بعض اوقات ان میں اور میر حسن میں تمیز کرنا محال نہ سہی تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں ایک دوسرے کا ہم رنگ و ہم آہنگ ہونا قدرتی امر ہے تعجب خیز نہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

گرے نہر پر قاز اور قرقرے — لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے (میر حسن)
ہیں قازیں کہیں اور کہیں قرقرے — ہیں رنگین مرغابیوں کے پرے (مرزا شوق لکھنوی)
تھی ہمراہ اُس کے جو دختِ وزیر — نہایت حسین اور قیامت شریر (میر حسن)
لگی کہنے سُن کے یہ دُختِ وزیر — کہ تھی طبع اس کی نہایت شریر (مرزا شوق لکھنوی)

شوق اُن صاحبِ کمال شاعروں میں تھے جنھیں قدرت نے موزونیٔ طبع کے ساتھ ساتھ ذہانت و ذکاوت کی دولت سے بھی مالامال کیا تھا انھیں فکر و فن پر مکمل عبور تھا اور زبان و بیان پر تمام و کمال قدرت حاصل تھی وہ بہ یک جنبشِ قلم جس مقام پر جو ماحول اور کیفیت پیدا کرنا چاہتے آسانی سے پیدا کر دیتے تھے، اس سلسلے میں پاکیزگی، سلاست اور روانی اُن کے کلام کا خاص جوہر ہیں اور روزمرّہ اور محاورہ، اصلیت اور آمد ان کا شاہکار۔ حقیقت یہ ہے کہ شوق ایک صاحبِ شعور و آگہی تھے۔ اُنھوں نے دنیا اور اہلِ دنیا کا مشاہدہ و تجربہ بہت قریب سے کیا تھا، وہ دونوں سے باخبر ہی نہیں تھے محرمِ اسرار بھی تھے۔ انسانی نفسیات کے شوق صحیح نباض تھے۔ جذبات نگاری کے میدان میں استادانہ حیثیت کے مالک ہیں اور ان کی تمام مثنویاں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہیں لیکن عورتوں کی ذہنیت، جذبات و احساسات، گفتگو نیز ان کے مخصوص فقرے اور لب و لہجہ کے لحاظ سے مثنوی "لذتِ عشق" اور "بہارِ عشق" اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں "لذتِ عشق" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

کر لیجاؤ بَتو نظارہ کرو — اسی لطف میں دن گزارا کرو

دہ دل کس طرح سے تمھارا ہو شاد   کہ گھر بیٹھے بھیجی خدا نے مراد
جلاؤ بس اب جا کے گھی کے چراغ   اسی واسطے تو بنایا تھا باغ
میں سمجھی تھی پہلے حضور   کوئی بلبل آ کر پھنسے گا ضرور
دیا ہنس کے ملکہ نے اسکا جواب   تو کہا ہے کو ہوتی ہے دل میں کباب
ارے کیوں تو جلتی ہے شامت گئی   اکیلا نہیں دو ہیں غارت گئی
کہا چھپ کے سنتی ہے او سرو ناز   نکالوں کی تیری زبان دراز
میں کرتی نہیں اس لیے بات بھی   یہ گستاخیاں کیوں مرے ساتھ بھی
وہ بولی کڑی شاخ جھکتی نہیں   اجی منہ پہ آئی تو رکتی نہیں

مختلف کیفیات اور واردات کی منظر نگاری اور تصویر کشی شوق کا اصل فن ہے، تہذیب و تمدن کی بات ہو یا علم و ادب کا موضوع، باغ و بہار کا ذکر ہو یا تسنیم و کوثر کا تذکرہ، اعلیٰ شریف خاندان کی بہو بیٹیوں کی داستان ہو یا ماؤں، لونڈیوں اور دائیوں کے قصے، زندگی کی سرگزشت ہو یا موت کی روداد، زلف یار کے افسانے ہوں یا عہد محبت کی رام کہانی غرض موقع و محل کی مناسبت سے ہر حالت و کیفیت کا شوق نے اس خوبی سے اظہار کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ؎

سنا شاہزادے کو جو گم ہوا   عجائب محل میں تلاطم ہوا
کیا ماں نے اس غم میں اپنا یہ حال   دیے کھول گھبرا کے سب سر کے بال
کوئی روئی اتنا کہ غش کر گئی   کوئی پیٹتے پیٹتے سر گئی
گرا غم کا سن کر کسی پر پہاڑ   کسی گل نے گلشن میں کھائی پچھاڑ
کوئی بولی ہے ہے یہ کیا ہو گیا   کہ شادی میں ماتم بپا ہو گیا
کوئی ہو گئی روتے روتے ہلاک   کسی نے گریباں کیا چاک چاک
کھڑی کوئی یوں مانگتی تھی دعا   بحق محمد سن اے کبریا
فزوں شاہزادے کا اقبال ہو   کہ بیکا نہ اس کا کوئی بال ہو
کوئی بولی اس کی خبر میں جو پاؤں   اسی وقت بی بی کی پڑیا منگاؤں
کہا اک نے آسے جو وہ مہ لقا   کروں اپنے اللہ کا رت جگا
دکھائے جو شکل اپنی آ کر ابھی   بھروں طاق مسجد کا جا کر ابھی

تھی سوسن کی رنگت اس اسلوب کی   تجلی جس سے مستی ہو محبوب کی

شجر اس کے تھے سب کے سب باثمر   قرینوں سے سب کچھ ادھر کچھ ادھر
روش صاف صاف آئینے کی مثال   شجر وہ کہ گلچیں ہوں جس سے نہال

کہاں مرد اور وہ کہاں نازنیں   چلی اس سے ملکہ کی کچھ بھی نہیں

کوئی بولی اس طرح مل مل کے ہاتھ   کہ اب ہم سے چھٹتا ہے ملکہ کا ساتھ
عبث جان اپنی کریں کیوں ہلاک   یہاں رہ کے کٹوائے کون اپنی ناک
کسی دن جو پوچھیں گے یہ بادشاہ   کہ کیوں کر ہوئی شاہزادے سے راہ
جواب اس کا پھر کیا دیا جائے گا   بہانہ کہو کیا کیا جائے گا
یہ گل ایک دن رنگ دکھلائے گا   یہ اوپر ہی اوپر نہیں جائے گا
یہ ہولیں شب و روز کی کھائے کون   یہاں رہ کے سر اپنا منڈوائے کون

مثنوی لذت عشق نواب مرزا شوق لکھنوی کی علمی و ادبی اور فکری و فنی صلاحیتوں کی پوری طرح آئینہ دار ہے اور محاسن شاعری کی وہ کہکشاں ہے جس کی روشنی میں واجد علی شاہی لکھنؤ کے عہد کا نظارہ گھر کی چہار دیواری میں رہ کر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مثنوی بھی شوق کی دیگر مثنویوں کی طرح اعلیٰ حیثیت کی حامل ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے خالص لکھنوی ہے مگر رعایت لفظی اور صنعت گری کے بجائے اصل شاعری کا ایک دلکش مجموعہ ہے لیکن اس مثنوی کے بارے میں بھی ارباب علم و دانش کے درمیان بہت اختلافات ہیں۔ مولانا حالی، لالہ سری رام (مصنف خم خانۂ جاوید) اور مجنوں گورکھپوری اگر ایک طرف اسے مرزا شوق کی تصنیف کردہ مثنوی تسلیم کرتے ہیں تو دوسری جانب احسن لکھنوی، اور مولانا عبدالماجد دریابادی اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "لذت عشق" نواب مرزا شوق کی تصنیف ہے اور ان کے فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان، رنگ و روغن اور آہنگ و لب و لہجے کے اعتبار سے ادب کا ایک حسین مرقع ہے۔

□□

شمس تبریز خاں

غزل

پیغام تک نہ آئے تغافل شعار کے
ایکے بھی دن گزر گئے یونہی بہار کے

آتی رہیں چمن میں بہار و خزاں مگر
دن پھر سکے نہ اک دلِ امیدوار کے

گویا کہ ہم انھیں کے مخاطب بنے رہے
کتنے تھے دلفریب مزے انتظار کے

وارفتگیِ شوق میں مجھ کو نہیں خیال
یہ تیرے غم ہیں یا ہیں ستم روزگار کے

اک زحمتِ نگاہ سے ممنون کر گئے
سب ختم ہیں گلے دلِ منت گزار کے

گو پائمال ہے غمِ ہستی کے ہاتھ سے
ہیں ولولے وہی دلِ الفت شعار کے

شاخِ چمن پہ ہے گلِ رعنا کھلا ہوا
یا عارض و دہن کسی زیبا نگار کے

اے ہمرہانِ شوق بڑھاتے رہو قدم
منزل نہیں، قریب ہیں یہ رہ گزار کے

غزل

آفاق احمد فاخری

تصور میں تیرے سحر ہو گئی ہے
شبِ غم بہت مختصر ہو گئی ہے
تیری یاد کے چند روشن دیے سے
رہِ پر خطر بے خطر ہو گئی ہے
نہ لے جاؤ مجھ کو بیاباں سے لوگو!
یہ ویرانی اب میرا گھر ہو گئی ہے
تیرے پاس آتے ہوئے ڈر رہا ہوں
زمانے کو جب سے خبر ہو گئی ہے
کہے بے وفا کیسے آفاق تجھ کو
تری ہر ادا معتبر ہو گئی ہے

غزل

ایجزا اے ہملونی

حسن مغرور ہے بپھرے ہوئے راون کی طرح
عشق معصوم ہے جھکے ہوئے جو بن کی طرح
تو نے جو دستِ حنائی سے لکھے تھے مجھے خط
آج بھی ان سے مہک آتی ہے چندن کی طرح
ان سے پوچھے تو کوئی تلخیِ آلامِ جہاں
زندگی جن سے ملی ہے کسی سوتن کی طرح
میری پلکوں پہ ہے اک غم کا گلستاں پیدا
تو نے دیکھا نہیں آ کر کبھی مالن کی طرح
ہو کرم ان پہ بھی اے آئینہ سازِ ہستی
وہ جو بے کار ہیں ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح
زندگانی کو تجربات کے موتی دے دوں
گڑگڑاتی ہے میرے در پہ بھکارن کی طرح

غزلیں

ضمیر الحق ضمیر

پھر تری یاد مجھے آج صدا دیتی ہے
میرا سویا ہوا احساس جگا دیتی ہے
گھوم جاتا ہے نگاہوں میں سراپا تیرا
شامِ ہجراں جو تری یاد دلا دیتی ہے
جب کوئی ٹیس ابھرتی ہے ترے نام کے ساتھ
میری پلکوں پہ چراغوں کو جلا دیتی ہے
پھر وہی میں ہوں، وہی سیلِ رواں غم ہے
اف! یہ تقدیر مجھے کیسی سزا دیتی ہے
تیری یادیں، ترا احساس، تمنا تیری
مجھ کو یہ دین تو کانٹوں پہ سلا دیتی ہے
کس کو معلوم ہے یہ بادِ بہاری اکثر
تیری مہکی ہوئی زلفوں کا پتا دیتی ہے
ہوتی جاتی ہے فنا جینے کی حسرت جیسے
کیسے چکر یہ مجھے آج قضا دیتی ہے
زندگی نام ہے "ناکام تمنا" کا ضمیر
کیسے مانوں کہ یہ پیغامِ وفا دیتی ہے

شفیق شاہ پوری

نشاطِ مے کا مقدر مری تلاش میں ہے
وہ رندِ خاص ہوں ساغر مری تلاش میں ہے
ہزار موڑوں سے گزرا ہوں اور گزروں گا
خوشا نصیب کہ رہبر مری تلاش میں ہے
یہ کچھ ملا مجھے موجوں کی آشنائی میں
کہیں ڈبو دے سمندر مری تلاش میں ہے
فریب دینے کو دن میں دیے جلائے ہیں
ابھی سے شام کا منظر مری تلاش میں ہے
لبوں پہ آ کے ترے نام نے صلہ یہ دیا
جنوں کے سارے ہی پتھر مری تلاش میں ہے
بڑھا ہوں جانبِ منزل مگر ارادوں سے
شکست کھا کے بھی ٹھوکر مری تلاش میں ہے
شفیق آبلہ پائی سے چھیڑ خوب نہیں
یہ اور بات ہے نشتر مری تلاش میں ہے

ندیم صدیقی

جو شخص دوستوں میں مرے شیدائیوں میں تھا
وہ پیش پیش کل مری رسوائیوں میں تھا
کس کی مجال تھی کہ ہٹاتا نگاہ کو
کل حسنِ کائنات ہی انگڑائیوں میں تھا
میں آفتاب ہو نہ سکا ٹھیک ہے مگر
یہ تو نہیں ہوا کہ میں پرچھائیوں میں تھا
برباد کر گیا مری فردوسِ اتحاد
وہ اختلاف جو کہ مرے بھائیوں میں تھا
سونا اگر تپے نہ تو کندن دمک سکے
اس عشق کا علاج بھی رسوائیوں میں تھا
جس کا سراغ کوئی مسیحا نہ پا سکا
یہ کیسا درد روح کی گہرائیوں میں تھا
جس روز میری لاش اٹھی اتفاق سے
اس روز میں بھی اپنے تماشائیوں میں تھا

باذل عباسی

تم اس احساس کو سمجھو

ابھی تو دور ہے منزل
انا الحب وانا الحق وانا البحر وانا الموجود و الذات قدیمی کی
ابھی خوابوں کا منظر دیکھ تو پہلے
حقیقت سے ذرا تعبیر کی موجوں میں
غواصی کے جوہر کا نشاں ڈھونڈو

اٹھاؤ فلسفوں کی اور مذاہب کی کتابوں کو
دلوں کے قرب کی منزل کا کوئی مسئلہ دیکھو
صحائف کی سبھی آیات کا مطلب ذرا پڑھ لو
بلاؤ تم فقیہوں کو نجیبوں کو
"وفا" کے لفظ کا مفہوم پوچھو
صدا دو روح کے مردہ خرابوں کو
جگاؤ ذہن کے خفتہ اصولوں کو
ذرا اپنی جبینوں کا تزکیہ کر لو
کبھی روز جزا کے راز کی تفہیم کی خاطر
حیات دہر کی رعنائیوں کا تجزیہ کر لو
تم اپنے گھر میں خود اجداد کی تاریخ پڑھ لو
"انا" کے خول سے باہر نکل کر
تم اپنے ذہن اپنی عقل سے خود فتح پا لو

اساس زندگی کا کوئی پاکیزہ تصور
کبھی ویراں خرابوں میں نہ ڈھونڈو
وہاں جاؤ
جہاں احساس کے پرتو سے ذہنوں نے جلا پائی
جہاں فانوس قربت میں منور ہیں
نشاط جذب کی شمعیں
— تم اس احساس کو سمجھو — !!

فرحت قادری

جنونِ آگہی

مری نگاہ میں ہیں اب خلا کے سارے دائرے
سمٹ گئے ہیں کس قدر قیامتوں کے فاصلے
حدودِ ممکنات سے جو آگے بڑھ گیا ہوں میں
تو جلتے ہیں خلاؤں میں شعور و فکر کے دیے
مہ و نجوم دنگ ہیں مری ہر ایک جست پر
سمجھ سکا نہ کوئی بھی مری نظر کے زاویے
قبائے کہکشاں پہ بھی مرے نقوش ثبت ہیں
تمام پردے راز کے تو میں نے خود اٹھا دیے
رگوں میں خار و خس کی بھی تڑپ رہی ہیں بجلیاں
بڑھا دیے ہیں میں نے ہی شرارِ دل کے حوصلے
خلاؤں کی یہ وادیاں اجاڑ تھیں جہاں جہاں
وہیں جلا رہا ہوں میں جسارتوں کے قمقمے
مری نظر بلند ہے، رگوں میں گرم ہے لہو
وہیں ملی ہے راہ بھی جہاں مرے قدم اٹھے
جنونِ آگہی یونہی رواں دواں ہے دہر میں
اسی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں زندگی کے قافلے

سید آل رسول نظمی

تاریخ گوئی اور اقبال

تاریخ گوئی ایک ایسا فن ہے جس کے لیے اعلیٰ پایے کی ذہنی قابلیت اور مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ گوئی کی بنیاد ہے علم الحروف اور علم ہندسہ۔ حروف و علم ہندسہ کی مناسبت کا موجد حکیم یزد فیلوس کو بتایا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰ سے ۳۲۲ برس قبل پیدا ہوا تھا حکیم یزد فیلوس کے زمانے سے بہت دنوں بعد ایک حکیم مرامر بن مردہ ہوا ہے۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے۔ اس نے بیٹوں کے نام کی مناسبت سے ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ، ابجد قمری ترتیب دی۔ اعداد حروف میں حکما کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر اور حکیم فیثاغورث کے استاد حضرت آصف بن برخیا نے الگ اعداد مقرر کیے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت علی ابن ابی طالب کے مقرر کردہ اعداد مختلف ہیں۔ حکیم بطلیموس نے اعداد تکسیری کا اختراع کیا اور یہی اعداد رائج الوقت ہیں۔ کتاب ابجدی میں حرف اول سے نو تک اکائی شمار کی جاتی ہے جسے احاد کہتے ہیں۔ دس سے نوے تک کے اعداد کے حروف کو عشرات اور سو سے نو سو تک کے اعداد رکھنے والوں کو مآت اور ایک ہزار عدد رکھنے والے کو آلوف کہتے ہیں۔ ابجد قمری مع اعداد درج ذیل ہے۔

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰

ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص
۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰

ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

مادۂ تاریخ کے استخراج میں یہی ابجد باتفاق مستعمل ہے۔

اہم واقعات مثلاً کسی کی پیدائش، شادی، کسی ممتاز شخصیت کی رحلت، تعمیر عمارت اور سلاطین کی رسم جلوس کی تاریخ کہنے کا رجحان اُردو اور فارسی دونوں ادبیات میں پایا جاتا ہے۔ تاریخ نکالتے وقت ایسے الفاظ چنتے ہیں جن کے حروف کے اعداد جمع کرنے پر متعلقہ واقعہ کا سال نکل آئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک لفظ یا کلمہ ہی سے تاریخ نکل آتی ہے۔

اقبال جہاں شعر و فلسفہ کے فن میں یکتائے روزگار تھے وہاں تاریخ گوئی کے شعبے میں بھی اُن کے قلم کی جولانیاں دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اقبال نے جو تاریخی مادے نظم کیے وہ کلیات میں شامل نہیں ہیں۔

اقبال نے مشہور و معروف سماجی مصلح اور ماہر تعلیم سر سید احمد خاں کی تاریخ وفات قرآن عظیم کی اس آیت سے نکالی ہے۔ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ۔ یہ آیت علی گڑھ میں سر سید کے مقبرے پر کندہ ہے۔ ہزاروں افراد نے اس کو پڑھا ہوگا مگر شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ یہ تاریخی مادہ اقبال کی فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کا تذکرہ خود اقبال نے محمد حسین عرشی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

شیخ عبدالحق کی رحلت پر اقبال نے یکم جنوری ۱۹۱۴ء کو ایک بہت ہی اثرانگیز قطعۂ تاریخ لکھا۔

چوں مے جامِ شہادت شیخ عبدالحق چشید
باد بر خاکِ مزارش رحمتِ پروردگار
با عزیزاں داغِ فرقت داد در عینِ شباب
آستینہا از درِ اشکِ غمش سرمایہ دار
بندۂ حق بود و ہم خدمت گزارِ قومِ خویش
سالِ تاریخِ وفات او زعفراں آشکار
۱۳۳۱ھ

پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج تھے میاں شاہ دین جو اقبال کے
گہرے دوستوں میں سے تھے۔ شاہ دین کی وفات پر اقبال کو بے حد
رنج ہوا۔ ہم پیشہ و ہم مشرب دوست کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رمید
می جست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت
علامہ فصیح ز ہر چار سو شنید

۴ × ۳۳۴

اس قطعہ میں "علامہ فصیح" کے اعداد کو اگر چار سے ضرب دیا جائے
تو مادۂ تاریخ نکل آئے گا۔ علامہ فصیح کے اعداد ۳۳۴ ہوتے ہیں، چار
سے ضرب دینے پر حاصل ضرب ۱۳۳۶ آتا ہے جو میاں شاہ دین کی وفات
کا سن ہجری ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا (اتاترک) نے جس سال بندرگاہ سمرنا (موجودہ
ازمر) سے یونانیوں کو کھدیڑا۔ اس کا قطعہ تاریخ اقبال نے یوں سپرد
قلم کیا۔

شارخ ابراہیم را نام مصطفےٰ — مہدیِ آخر زماں ہم مصطفےٰ
گوش کن اے بے خبر تاریخ فتح — گفت اقبال اسم اعظم مصطفےٰ

اس قطعہ میں اسم اعظم مصطفےٰ کے اعداد جوڑنے پر سال فتح ۱۳۴۱ھ
بمطابق ۱۹۲۲ء نکلتا ہے۔

اقبال کی لدھیانہ والی بیگم حمل کی خرابی سے ۱۹۲۳ء میں گزر گئیں
بیگم کی وفات پر انھوں نے جو قطعہ تاریخ نظم کیا وہ لدھیانہ کے بڑے
قبرستان میں مرحومہ کی لوح مزار پر کندہ ہے۔

المبطون شہید (حدیث)

اے دریغا زمرگِ ہم سفرے — دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم — سخنِ پاکِ مصطفےٰ آورد
بہر سالِ رحیل او فرمود — بشہادت رسید و منزل کرد

۱۳۴۳ھ

اقبال کی دوسری بیگم یعنی جاوید و منیرہ کی والدہ ۲۲ مئی ۱۹۳۵ء
کو راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ لاہور کے امپریس روڈ پر واقع قبرستان
بیبیاں پاک دامناں میں ایک اونچے ٹیلے پر والدۂ جاوید کی پختہ قبر ہے
جس پر اقبال کا نظم کردہ یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

یا حیّ و یا قیوم

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمۂ مازاغ"

۱۳۵۴ھ

اقبال کے قلم سے نکلا ہوا آخری مادۂ تاریخ اپنے اندر ہزاروں
درد سیکڑوں آنسو لیے ہوئے ہے۔ ان کی تاریخ وفات ان کی ہی ایک
مشہور نظم "مسافر" کے اس مصرع سے نکلتی ہے۔

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند

۱۳۵۷ھ

اقبال ایک عظیم انسان ہی نہیں علم و ادب، فکر و فلسفہ کا ایک
دور تھے۔ وقت کی نئی کروٹوں کے ساتھ اس "دور" کے مختلف گوشوں
اور نئے نئے پہلوؤں پر سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ کون جانے کل اس عظیم
شخصیت کا کون سا نیا اور نرالا وصف منظرِ عام پر آئے اور دنیائے
ادب کو چونکا دے۔

★

علامتی شاعری میں — (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

عزائم کو توانائی بخشنے پر صرف کریں۔ ان کے اشعار پہلے پیغام ہونا چاہئیں
اور بعد میں اور کچھ۔ ان کو ہر مسئلے کے منفی رُخ کے ساتھ ساتھ مثبت رُخ
کو بھی دیکھنا چاہیے اور اس طرح ناامیدی کی دبیز تاریکی میں امید کے
چراغ روشن کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا رویہ شعر و شاعری میں اپناتے
ہیں تو اس سے وہ خود بھی سماج میں پروقار مقام حاصل کریں گے
اور عوام و خواص کو متاعِ خودی عطا کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

★

نیا دور

آزادی نمبر

جلد ۳۲ نمبر ۵

اگست سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

سرورق: جاوید حسن

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرسالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ہماری آزادی کو ۲۹ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس سال ہم تیسواں یوم آزادی منا رہے ہیں۔ یہ آزادی بڑی قربانیوں، جانفشانیوں اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ کسی نو آزاد ملک کے لیے اگرچہ ۲۹ سال کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا لیکن اس قلیل مدت میں بھی ہمارے ملک نے اپنی آزادی کو مستحکم بنانے کے لیے جو ٹھوس قدم اٹھائے ہیں ان کے نتائج سامنے آتے جا رہے ہیں۔ گزشتہ سال ہمارے لیے بڑی کامیابیوں اور ترقیوں کا سال تھا۔ ایمرجنسی کے سبب ملک میں ضبط و نظم کی ایک عام فضا قائم ہو گئی ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں خاص طور سے تعلیمی، صنعتی اور معاشی میدانوں میں ملک نے ہمہ جہت اور تیز رفتار ترقی کی ہے۔ ملک کی اس ہمہ گیر ترقی کا خاص سبب ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا دیا ہوا ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام ہے جو اب ۲۴ نکاتی پروگرام ہو گیا ہے۔ اور جس نے صرف ایک سال کی مدت میں ملک کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔ گزشتہ سال کا ایک بڑا کارنامہ افراط زر پر قابو پانا ہے۔ ہم خود کفالت کی جانب برابر بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اب ہم کو اپنی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسرے ممالک کا سہارا لینا نہیں پڑتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے آزاد ہندستان کے لیے جو خواب دیکھا تھا اور اس کو سوشلزم اور سیکولرزم کی جس منزل تک لے جانا چاہتے تھے، شریمتی اندرا گاندھی کا اعلان کردہ معاشی پروگرام اس منزل تک پہنچانے کا ایک بہت ہی بڑا اور انقلابی قدم ہے جس نے ملک بھر میں بیداری کی نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ ہماری ریاست اتر پردیش میں بھی اس معاشی پروگرام کے نتیجے میں ایک ہمہ گیر ترقی کے نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور پردیش مکمل سماجی معاشی انقلاب کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ اس قلیل عرصے میں پردیش میں سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے متعدد ٹھوس قدم اٹھائے گئے، جن کے نتیجے میں ۴ لاکھ بے زمین مزدور خاندانوں کو مہاجنوں کے صدیوں پرانے قرضوں سے نجات مل گئی ہے۔ پابند مزدوری کا بھی دور ختم ہو چکا ہے، ۳۶ر۱۸ لاکھ ایکڑ آراضی ۵۵؛۱۹ لاکھ بے زمین مزدوروں میں تقسیم کی جا چکی ہے، ۱۲ لاکھ سے زیادہ کنبوں کو رہائشی پلاٹ الاٹ کیے جا چکے ہیں، ریاست میں آبپاشی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جا چکا ہے جس کے سبب غذائی پیداوار میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور بجلی کی موجودہ صلاحیت ۲۲۰۳ میگاواٹ تک پہنچ چکی ہے۔ دیہی بجلی کاری کی جنتا اسکیم کے تحت ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں کو ایک لاکھ نئے کنکشن اور سال کے آخر تک تمام صنعتی اداروں کو بجلی کی سہولت مہیا ہو جائے گی۔ صنعتی میدان میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ ۵۹ صنعتی بستیوں میں ضروری سہولتیں فراہم کی جا چکی ہیں۔ ان بستیوں میں ۱۱۰ کروڑ روپے کے سرمایہ سے جلد ہی نئے صنعتی واحدے قائم کر دیے جائیں گے۔ دس ہزار چھوٹے واحدوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض صنعتی بستی اوکھلا ضلع بلند شہر میں قائم کی جا رہی ہے۔ ہینڈلوم کی ترقی کے لیے ۱۰ نئی کتائی ملیں اور متعدد ہتکرگھا صنعتی بستیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی ہمہ جہت ترقی ہوئی ہے۔ پہلے درجہ سے پانچویں درجے تک کے ۲۴۰۰۰ طالب علموں کو نصابی کتابیں مفت مہیا کی گئیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی کتابوں کی قیمتوں میں ۲۰ سے ۳۰ فی صد تک کی کمی ہوئی۔ تمام ڈگری کالجوں میں کتب بینک قائم کر دیے گئے ہیں۔ کتب بینک کی اسکیم انٹرمیڈیٹ کالجوں اور ہائی اسکولوں میں بھی شروع کی جا رہی ہے۔ ہوسٹلوں میں تھوک قیمت پر ضروری اشیا کی فراہمی کی جا رہی ہے۔ صارفین کے مفاد کے لیے سستے غلہ کی دکانوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۴۲ ہزار تک پہنچ گئی۔ ضروری اشیا کی قیمتوں میں بھی ۱۰ سے ۴۰ فی صد تک کی کمی ہو گئی ہے۔ ملک میں آبادی کے تیز رفتار اضافے نے اس وقت ایک سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے اور اسے جنگی پیمانے پر حل کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ اتر پردیش بھی اسی سنگین مسئلے کو حل کرنے اور خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو کامیاب بنانے اور اس طرح اضافہ آبادی کو روکنے کی کوششوں میں پیش پیش ہے۔ پردیش میں خاندانی منصوبہ بندی کی رفتار ترقی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگست کے دوسرے ہفتے تک ایک لاکھ سے زائد نس بندی کے آپریشن ہو چکے تھے۔ ریاست میں سال کے آخر تک ۱۵ لاکھ آپریشن کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ۶۴ گشتی یونٹیں قائم کی جا چکی ہیں اور ریاست میں اوسطاً ہر مہینے چالیس ہزار نس بندی آپریشن کیے جا رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہو جائے گا کہ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ریاست اتر پردیش کس مستعدی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ چھوٹے خاندان کے فوائد کو عوام رفتہ رفتہ محسوس کر کے خاندانی منصوبہ بندی کو اپناتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض شکوک و شبہات بھی دور ہو رہے ہیں اور وہ لوگ بھی جو مذہب اور دھرم کو بنیاد بنا کر نس بندی کرانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے، آگے بڑھ رہے ہیں اور نس بندی کے لیے خود کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ خاندانی منصوبہ بندی مہم کی کامیابی کے لیے ایک فال نیک ہے۔

آہ مولانا فارقلیط

مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم سابق ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ میدان صحافت کے ایک ایسے عظیم المرتبت شہ سوار تھے جس کی مثال مشکل سے ڈھونڈے ملے گی۔ مولانا فارقلیط کا شمار صف اول کے ان صحافیوں میں تھا جنھوں نے اردو صحافت کو اپنے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا اور اس کو بام ترقی تک پہنچا دیا۔ آپ ایک بے باک اور نڈر صحافی تھے۔ صحافت آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اسی لیے ان کو کسی ستائش اور صلے کی پروا بھی نہ تھی۔ صحت مند اور تعمیری تنقید کو وہ کامیاب صحافت کا لازمی جز سمجھتے تھے اور آخر دم تک وہ اپنے اصولوں پر مستعدی سے ڈٹے رہے۔ آپ کے انتقال سے اردو صحافت میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ البتہ صحافت کے میدان میں ان کے نقش قدم ہمیشہ تابناک رہیں گے اور مستقبل کے صحافیوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

—— ایڈیٹر

نازش پرتابگڈھی

پیام

مرا قلم جو ہے دردِ حیات کی تصویر
مرا قلم کہ ہے صد چاک آستیں کی طرح
مرا قلم جو بٹا ہے مری زمیں کی طرح
اسے مورخ فردا کو کس طرح سونپوں
میں اس قلم کے مقدر پہ خود پشیماں ہوں
مرے وطن کی نئی نسل اس سے دور رہے

میں چاہتا ہوں مرے بعد جو قلم اُٹھے
چمن کی بات کرے، گل کی داستاں لکھے
بیانِ شوق کرے، وصفِ دلبراں لکھے
حدیثِ حسن بہ حرفِ دلِ جواں لکھے

مرا یقین، مرا عزم، میری بے باکی
مرا ضمیر، امانت ہے صبحِ فردا کی
مرے خلوص سخن کو بچا کے رکھنا مگر
مری حیات کو ہرگز نہ رہ گزر دینا
مرے قلم کو مرے ساتھ دفن کر دینا
کہ یہ عذاب نئی نسل تک پہنچ نہ سکے

یہ نو بہارِ وطن، تازہ واردانِ چمن
سیاہیوں کا جگر ان کو چاک کرنا ہے
دلوں میں عزم و ارادہ کی روشنی لے کر
سنوارنا ہے انھیں عارضِ عروسِ وطن
مزاج لالہ و گل کی شگفتگی لے کر
مرے وطن کی نئی نسل کو نئے ڈھب سے
یقین و جہد کی اک داستان لکھنی ہے
کتابِ عظمتِ ہندوستان لکھنی ہے

عبدالمجیب سہالوی

آزادی صرف پھولوں کی سیج نہیں

آزادی ایک بڑی نعمت ہے لیکن یہ صرف پھولوں کی سیج ہی نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج بھی ہے۔ یہ اپنے دامن میں جہاں بہت سی آسانیاں اور سہولتیں لاتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اپنی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والوں کے کاندھوں پر کچھ بھاری ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے۔ وہ لوگ جو ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے اپنے کو تیار نہیں کرتے وہ اپنے بزرگوں کی قربانیوں اور اَن تھک کوششوں سے حاصل کی جانے والی آزادی کی نہ تو زیادہ دنوں تک حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سیاسی آزادی آخری منزل نہیں بلکہ وہ منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راہ کھولتی ہے۔ در اصل ترقی اور خوش حالی کا سفر سیاسی آزادی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

بیرونی اقتدار کے خاتمے اور غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹنے کے بعد اگر دیس کی جنتا اور عام لوگوں کی روکھی پھیکی زندگی میں خوش حالی کی ہریالی نہ آئی اور وہ اسی طرح ننگے بھوکے، بے گھر، اَن پڑھ اور بیمار رہے تو یہ آزادی بالکل سطحی اور بے معنی ہوگی کیونکہ ملک کی ترقی اور حقیقی خوش حالی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ چند اِنے گنے لوگوں کے یہاں دولت کی ریل پیل ہو جائے، ان کی فلک بوس عمارتیں کھڑی ہو جائیں اور ان کے لیے یہ دنیا جنت بن جائے۔ اور دوسری طرف عام لوگوں کی زندگی میں کوئی فرق نہ آئے اور وہ اسی طرح دشواری کی زندگی بسر کرتے رہیں۔ انھیں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہ مل سکے، انھیں سر چھپانے کے لیے چھت میسر نہ ہو، ان کے تن ڈھکنے کے لیے پورے کپڑے نہ ہوں، دوا، علاج کا کوئی معقول انتظام نہ ہو، ان کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بند و بست نہ ہو، انھیں ترقی کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ انھیں غربت کی وجہ سے عدالتوں میں انصاف حاصل نہ ہو سکے اور انھیں سماج میں برابری کا درجہ نہ مل سکے۔ یہ ملک کی ترقی نہیں بلکہ ملک کے دامن پر دھبہ ہے۔ یہ صحت نہیں بیماری ہے۔ ملک ایک جسم ہے جس کے تمام اعضا کا صحت مند ہونا ضروری ہے اگر اس کے کچھ اعضا موٹے ہوں گے اور باقی سوکھے رہے تو یہ صحت کی علامت نہیں بلکہ خطرناک بیماری ہے جس کے علاج کی طرف توجہ نہ کرنا ملک کے امن امان اور اس کے استحکام کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ذہن میں آزاد ہندستان کا جو نقشہ تھا وہ یہی تھا۔ رام راج کا مطلب یہ تھا کہ چھوٹے اور بڑے، غریب، امیر، شہری اور دیہاتی سب کو یکساں سہولتیں اور ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں نیچ اونچ کا فرق جاتا رہے۔ اسی طرح نہرو جی نے بھی ملک کو سوشلسٹ جمہوریہ بنانے کا مقصد اپنے سامنے رکھا تھا اور وہ مخالفتوں کے باوجود ملک کو اس منزل کی طرف لے جانے کی برابر کوششیں کرتے رہے۔

ملک کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ نہرو جی کی ترقی پسند قیادت سے محروم ہونے کے بعد اس کی باگ ڈور مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں آئی جن کے اندر ایک طرف گاندھی جی کی حقیقت پسندی اور دوسری طرف نہرو جی کی بلند حوصلگی پائی جاتی ہے۔ انھیں بھی نہرو جی کی طرح اپنی ترقی پسندانہ پالیسی پر عمل درآمد کے سلسلہ میں سخت مخالفت کا سامنا

کرنا پڑا۔ بینکوں کو قومیانے کا جب مسئلہ اٹھایا گیا تو سرمایہ داروں اور ان کے ہمدردوں کی جانب سے اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ اسی طرح سابق راجوں مہاراجوں کے صرف خاص اور انھیں حاصل مخصوص مراعات کے خاتمے کے لیے جب قدم اٹھایا گیا تو اس وقت بھی جاگیرداروں سرمایہ داروں اور ان کے حاشیہ برداروں نے متحدہ محاذ بنا کر سخت مخالفت کی لیکن وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ ان تمام مخالفتوں کا سامنا کیا اور اپنی منزل کی طرف قدم جمائے ہوئے بڑھتی رہیں۔

آزادی حاصل ہوئے چوتھائی صدی سے زائد عرصہ گذر چکا ہے یہ مدت لمبی بھی ہے اور مختصر بھی۔ مختصر اس لیے کہ ملکوں کی تقدیر بدلنے کے واسطے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے یہ ایک بڑا اور وسیع ملک ہے جس میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذہب رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں اس کے پاس قدرتی ذرائع کی کوئی کمی نہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ ایک پچھڑا ملک تھا جو جہالت اور غربت کا شکار تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ رفتہ رفتہ ملک ترقی کی طرف بڑھتا رہا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد بیس بائیس برسوں میں ترقی کی رفتار سست اور غیر اطمینان بخش رہی۔ اس کے وجوہ بھی تھے۔ ملک جو ایک جاندار جسم کی حیثیت رکھتا ہے اس کے بدقسمتی سے تقسیم کی بنا پر دو ٹکڑے ہو گئے جس کے گہرے زخم کے بھرنے میں کافی وقت لگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستوں، رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کو تقسیم کی بنا پر فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر اپنا الو سیدھا کرنے اور ترقی پسند پالیسی اختیار کرنے والوں کی راہ میں روڑا اٹکانے کا اچھا موقعہ مل گیا اور انھوں نے ملک کے عام مفاد کی پروا کیے بغیر اپنے طبقے کے مفاد کی خاطر فرقہ وارانہ نعرے لگا کر بھولے بھالے عوام کو بہکانے اور ان کو غلط راہ پر لگانے کی بھرپور کوشش کی تا ان کی توجہ اصل مسائل یعنی غریبی، معاشی نابرابری اور سماجی ناانصافی ختم کرنے کی طرف نہ جانے پائے۔ کیوں کہ اس سے ان کے مفاد پر چوٹ پڑتی تھی۔

سرمایہ داروں نے حالات کو جوں کا توں رکھنے اور معاشی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انھوں نے اپنا جال ملک کے ہر شعبے میں اس طرح پھیلا دیا کہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ان آدمی نہ ہوں حد یہ ہے کہ خود کانگریس پارٹی میں ان کے آدمیوں نے اچھا خاصا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند اقدامات کی راہ میں وہ ہر قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ عوام کی بھلائی اور بہبود کے لیے تیزی سے اقدامات کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس پارٹی جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور تھی اسے سرمایہ داروں کے حامی عناصر سے پاک کیا جائے۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا لیکن اس کا کرنا عوام کی بھلائی کے لیے ضروری تھا۔ چناں چہ مسز اندرا گاندھی نے کسی خطرے کی پروا کیے بغیر بڑی حوصلہ مندی سے یہ کام انجام دے دیا۔ اس نیک قدم سے یہ فائدہ ہوا کہ کانگریس کے اندر ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کے درمیان عرصہ سے جو رسہ کشی ہو رہی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا اور عوام کی فلاح بہبود کے لیے تیزی سے قدم بڑھانے کے لیے راستہ صاف ہو گیا لیکن سرمایہ داروں، جاگیرداروں، رجعت پسندوں اور فرقہ پرستوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اگر متحدہ محاذ بنا کر مسز اندرا گاندھی کے ترقی پسند اقدامات کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ سیلاب سرمایہ داری، جاگیرداری، رجعت پسندی سب کو ایک ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر پھینک دے گا چناں چہ انھوں نے آخری مورچہ لینے کی ٹھان لی۔ انھوں نے مختلف ریاستوں میں اپنے پیسے اور بعض بیرونی طاقتوں کی شہ پر خلفشار، بدامنی اور علاقائیت پھیلانے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ کہیں فرقہ وارانہ جذبات

بھڑکائے۔ کہیں زبان کا مسئلہ اٹھا کر گڑبڑ مچانے کی کوشش کی، کہیں صوبائی تعصب پھیلایا اور کہیں طلباء کو بھڑکا کر انھیں اپنا آلۂ کار بنایا۔ یہی نہیں وہ فوج میں بغاوت کے جذبات پھیلانے کا خطرناک کھیل کھیلنے سے بھی باز نہیں آئے۔ آخر میں انھوں نے ملک کے لیڈروں کو قتل کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ ملک کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے حالات کا بروقت جائزہ لے کر ان کی اس ناپاک سازش کو ناکام بنانے کے لیے بلا جھجک ایمرجنسی کا اعلان کر کے بھرپور کارروائی شروع کر دی۔

عوام اس صورتِ حال سے عاجز آ گئے تھے جو مفاد پرستوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر ملک کے اندر پیدا کر دی تھی اور جس سے ہر پُر امن شہری کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ چور بازاری، ٹیکس ماری، رشوت خوری، بدعنوانی، بے قاعدگی اور بیہودگی کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ تاجروں نے موقعہ پا کر چیزوں کی قیمتیں اتنی بڑھا دی تھیں کہ ان کی خریداری عام لوگوں کے بس کی بات نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے ایمرجنسی کے اعلان کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ایک سال کے اندر غریب پس ماندہ اور دبے ہوئے طبقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے جو کام انجام دیے گئے ان کے ایک سرسری جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں جو کام ہوا وہ اب تک برسوں میں بھی نہ ہو سکا تھا۔ چیزوں کی قیمتیں جو آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ان میں گھٹنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ افراطِ زر پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا۔ امن و امان اور نظم و ضبط کی صورتِ حال کافی بہتر ہو گئی۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے اس بیس نکاتی معاشی پروگرام کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جس کا اعلان انھوں نے ملک کے پس ماندہ، کمزور اور دبے ہوئے طبقے کی حالت سدھارنے اور ان کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے کیا۔

دیہات میں غریب دستکار، چھوٹے کاشتکار اور بے زمین مزدور عام طور پر مہاجنوں کے قرضے سے اس طرح دبے ہوئے تھے جن سے چھٹکارا ملنا ان کے لیے مشکل تھا۔ ایمرجنسی کے دوران ایک آرڈیننس جاری کر کے ان کے قرضے معاف کر دیے گئے اور انھیں بینکوں سے قرضہ فراہم کرنے کی آسانیاں پیدا کی گئیں۔ دیہاتوں میں ایک دوسری لعنت پابند مزدوری کی تھی جن کی غربت اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر بڑے کاشتکار انھیں پیسے دے کر اپنے کام کے لیے پابند کر لیتے تھے وہ زندگی بھر اور بعض صورتوں میں ان کی اولاد بھی اس جال سے نہ نکل پاتی تھی۔ اسی طرح جوت کی حد بندی کے ذریعہ جو فاضل آراضی حاصل ہوئی تھی اس کی تقسیم کا چوکس انتظام کیا گیا تاکہ غیر مستحق با اثر لوگ اسے ہتھیا نہ لیں۔ دیہات کی آبادی کو سہولت پہنچانے کے لیے تحصیل میں تحصیلدار کے علاوہ حاکم تحصیل کا رہنا اور مقدمات کا فیصلہ کرنا ضروری قرار دے دیا گیا۔ تحصیلوں میں منصفی عدالتیں لے جانے کا بھی بندوبست کیا جا رہا ہے تاکہ وہاں کے لوگوں کو انصاف حاصل کرنے کے لیے دور نہ جانا پڑے اور آسانی سے انھیں انصاف مل سکے۔ کمزور طبقے کے لیے مکانات کی فراہمی کا بھی انتظام کیا گیا اور مکان بنانے کے لیے زمین الاٹ کی گئی۔ ضروری اشیاء کی فراہمی کے لیے کنٹرول کی ایسی دوکانیں قائم کی گئیں جہاں غریب لوگوں کو مناسب قیمت پر کپڑا اور دوسری چیزیں مل سکیں۔ کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرت مقرر کر دی گئی تاکہ بڑے کاشتکار ان کا حق نہ مار سکیں۔

اسمگلنگ کی روک تھام میں شاندار کامیابی حاصل کی گئی۔ چھپے ہوئے کالے دھن کو باہر لانے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے جن سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اور بڑی تعداد میں کالا دھن برآمد ہوا۔ مجموعی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو آزادی کا یہ سال بہت مبارک سال تھا اور اس مرتبہ ۱۵ اگست کو آزادی کی جو سالگرہ منائی جا رہی ہے وہ رسمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر خوشی و مسرت کی حامل ہے۔

★

اندھیرے کے بعد

فضل النقوی

رونق بزم سسکتی ہوئی ویرانوں میں
شمع خاموش تھی سہمے ہوئے پروانوں میں
اشک کے قطرے اُبھرتے ہوئے انسانوں میں
آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے پیمانوں میں

نالہ بندی تو کہیں بند کی بیداد یں تھیں
کہیں ہڑتالوں سے لپٹی ہوئی فریادیں تھیں

ظلم کا دور تھا مزدوروں کو بے حال کیے
جھونپڑی میں کہیں بجھتے ہوئے غربت کے دیے
کوئی مجبور زبانوں کی طرح دل کو سیے
کوئی ٹوٹا ہوا دل غم کے اندھیرے میں لیے

شورہ پشتوں سے سہمتا ہوا بازاروں میں
کوئی بے چین حقیقت کے طلب گاروں میں

پھول گلشن کا اگر دیکھ کے شرماتے تھے
صبح کو کھلتے تھے اور شام کو مرجھاتے تھے
لوگ بازاروں میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے
راہبر جا بجا رہزن کے نظر آتے تھے

دامنِ خوف چھپائے ہوئے انسانوں کو
چین ہندو کو نہ ممکن نہ مسلمانوں کو

کوئی پُر درد بناتا ہوا افسانوں کو
کوئی آنکھوں میں چھپائے ہوئے ارمانوں کو
شور ہنگاموں کا گھیرے ہوئے میخانوں کو
راہ ملتی نہ تھی بھٹکے ہوئے پروانوں کو

قافلے کے لیے جادہ نہ کوئی منزل تھی
جلسے برباد اندھیرے میں سجی محفل تھی

دھوکے دیتے ہوئے پھولوں کی طرح گلشن کو
دفن کرنے کے لیے سینچتے ہوئے مدفن کو
رخ پہ ڈالے ہوئے رہزن کی طرح چلمن کو
لالچی دیو تھے پھیلائے ہوئے دامن کو

قوم پر ظلم کو ڈھانے کے لیے نکلے تھے
تیر پر تیر چلانے کے لیے نکلے تھے

ایسے برباد اندھیروں کو مٹانے کے لیے
موت کی نیند سے غربت کو جگانے کے لیے
اپنی مرضی سے مقدر کو بنانے کے لیے
گاندھی اور نہرو کی یادوں کو دلانے کے لیے

روشنی دینے کو اک نور کا دھارا چمکا
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ستارا چمکا

پھول اور کلیوں کو گلشن میں سجانے کے لیے
ملک کو آئی بلاؤں سے بچانے کے لیے
ظلم کے قلعہ کی بنیاد کو ڈھانے کے لیے
زندگانی کو نیا رُوپ دلانے کے لیے

سائے مٹنے لگے قبضے میں اندھیرا آیا
کھل گئیں آنکھیں جو پُر نور سویرا آیا

یہ ایمرجنسی کا پیغام سنایا کس نے
ملک اور قوم کے بازو کو ہلایا کس نے
راستہ غم کے اندھیروں میں بنایا کس نے
آئے طوفان سے بروقت بچایا کس نے

پھر خدا جانے کہ کیا قوم کی حالت ہوتی
اندرا گاندھی نہ اٹھتیں تو قیامت ہوتی

چاندنی تیز ہوئی بزم کی رونق جو بڑھی
زورِ سیلاب گھٹا شمع اندھیرے میں جلی
دامنِ گل سے محبت کی ہوا مل کے چلی
راستے والے چلے آس ملی راہ ملی

کھل گیا بابِ قفس قوتِ پرواز آئی
جاگ اٹھا سارا چمن امن کی آواز آئی

مطمئن کرنے کو پُر کیف فضائیں آئیں
حسن پھولوں کا بڑھانے کو وفائیں آئیں
کھیت سرسبز ہوئے ایسی ہوائیں آئیں
کارخانوں سے مشینوں کی صدائیں آئیں

غم کا سیلاب گھٹا روحِ تمنا جاگی
کھل گئی آنکھ تو سوتی ہوئی دنیا جاگی

وقت پر آ کے ایمرجنسی نے بیدار کیا
عرش سے اونچا محبت بھرا کردار کیا
سدھرے حالات، بلند اور بھی معیار کیا
خدمتِ قوم پہ ہر شخص کو تیار کیا

نور اور حسن وفاؤں کی طرح چھانے لگا
امن اور چین کا ماحول نظر آنے لگا

ڈاکٹر اطہر پرویز

اردو افسانہ

کسی نے کہا تھا کہ فکشن کا کام دراصل جھوٹ کہنے کے فن کی مشق ہے۔ لیکن اس مشق نے قصہ گویوں کے قلم سے کتنے زندہ جاوید فن پارے تخلیق کروائے کہ ان میں ہمیں انسانی نفسیات کے پیچ و خم کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، کتنی فلسفیانہ گرہیں کھلتی نظر آئیں۔ ادب حقیقتاً ایک استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ادب کی ہر صنف کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ افسانہ بھی اسی طرح گویا ایک استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ہے زندگی کا، گروہوں کا اور افراد کے ذہنی اور جذباتی ردِ عمل کا، اسی لیے ان کی نفسیاتی اور سماجی زندگی سے دلچسپی اور ان پر غور و فکر — افسانے کا ایک اہم حصہ ہے۔

افسانہ ایک ایسی پُر فریب فضا تیار کرتا ہے جو ایک طرح سے حقیقی ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ بظاہر اپنے افسانے کا تار و پود حقیقت سے زیادہ فریب اور سچ سے زیادہ جھوٹ سے تیار ہوتا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ یہ واقعیت اور حقیقت کا اظہار ہے۔ یہاں جھوٹ کے مقابلے سچ کا بول بالا ہے۔ کہانی کہنے والا کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا ایسے تجربے سے گزرتا ہے جس میں اسے ایسے افراد اور ان سے متعلق واقعات کو یقین کرنا پڑتا ہے جن کا نہ تو کوئی وجود تھا اور نہ واقعات اس ترتیب اور اس شکل میں کہیں پیش آئے تھے۔ لیکن پڑھنے والے کا ردِ عمل کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے وہ افراد فی الواقعی اسی قسم کے تھے اور وہ واقعات ان کی زندگی میں پیش آچکے ہیں۔ دراصل افسانہ نگار یہاں ایسا پس منظر پیش کرتا ہے جو اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن کو اسے قبول کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔

مختصر افسانہ ادب کا سب سے چھوٹا بچہ ہے اور ہر زبان میں اس کو یہی حیثیت حاصل ہے لیکن صحت مند اور ہونہار ہونے کی وجہ سے بہتوں کو غلط فہمی بھی ہوئی کہ اس کا تعلق ناول سے ہے۔ کچھ لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ اگر کسی ناول کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے یا صرف اس کا پلاٹ لے لیا جائے تو وہ مختصر افسانہ بن جائے گا۔ یعنی دوسری طرف یہ بھی کہ افسانہ کو تفصیلات کے ذریعہ پھیلا دیا جائے تو وہ ناول ہو جائے گا۔ لیکن یہ بیان اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا کہ افسانہ مختصر ہوتا ہے اس لیے اس کا لکھنا ناول کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔

'ناول' میں ناول لکھنے والا کوئی گوشہ قاری کے لیے نہیں چھوڑتا، لیکن افسانے میں جا بجا کھانچے نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار ان کو چھوڑتا جاتا ہے اور اس طرح اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت بھی کرتا جاتا ہے۔ یہاں عام طور پر کہی باتوں سے زیادہ اَن کہی کی اہمیت ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ کا استعمال کرے۔ وہ لفظوں سے زیادہ احساسات سے اپنے افسانے کو نمایاں کرے۔ عام طور پر لوگ لفظوں کا ذریعہ نہیں سوچتے۔ انسان کے ذہن میں خیالات اور تصورات لفظوں سے پہلے آتے ہیں اور پھر وہ ان کو لفظوں کا لباس پہناتا ہے۔ افسانہ ایک خیالی پیکر کی عملی تشکیل ہے۔ اسی لیے یہاں احساسات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ بات سننے میں تو عجیب سی لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ نہیں کہا جاتا، انسانی تجسس اسے تلاش کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی "آپا" ایک لفظ نہیں بولتی، لیکن اس کی خاموشی ہی اس کی گفتگو ہے۔ وہ سرتاپا جذبات سے سرشار ہے لیکن اس کے اظہار کو گناہ سمجھتی ہے وہ خاموشی سے چنگاری کو بھی بجھا دیتی ہے کہ یہ ہلکی سی چنگاری جو راکھ میں چھپی ہوئی ہے، دکھائی دیتی ہے۔ "آپا" کو ہم بہت قریب سے جاننے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے ہیں۔ سچ ہے کہ افسانہ نگاری محض لفظوں کا پُل باندھ کر نہیں کی جاتی۔ اسی لیے افسانے کا فن مشکل فن ہے۔

مختصر افسانہ لفظوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر افسانہ اپنے گنتی کے الفاظ رکھتا ہے۔ افسانے کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ افسانہ نگار دریافت کرے کہ اس افسانے پر کتنے لفظوں کا بوجھ رکھا

جا سکتا ہے۔ اتیچ۔ای بیٹس نے اپنی کتاب "دی ماڈرن شارٹ اسٹوری" میں دو بار یہ بات کہی ہے کہ کہانی لکھنا گویا دیا سلائی کے تنکو سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب کہ ایک مزید تنکا اڑا اڑادھم کر کے سب کو گرا سکتا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو اس بات کا شدّت سے احساس ہونا چاہیئے کہ کس وقت اس کی بات پوری ہو گئی اور اب کہاں اسے اپنا قلم روک دینا چاہیئے۔

افسانے میں ایک قسم کی وحدت ہوتی ہے اس لیے یہاں جملوں سے لے کر الفاظ تک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی بات غیر ضروری نہ کہی جائے جو زبان لکھی جائے وہ افسانے کی مناسبت سے ہو اور اس فضا کو پورے طور پر ظاہر کرے۔ اظہار کا سب سے بہتر ذریعہ زبان ہے، اور زبان صرف الفاظ کا نام نہیں ہے۔ زبان میں لب و لہجہ اور طرز ادا سب ہی کچھ شامل ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو الفاظ کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

مختصر افسانہ جادو کی بوتل نہیں ہے جس میں دیو زادوں کو دھوئیں کی شکل میں مقید کیا جا سکے۔ اس میں کردار یا مختلف کرداروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پھر بھلا جھلکیوں میں کردار کا ہر روپ کیسے دیکھ سکتے ہیں ہمیں زندگی میں کتنے انسان نظر آتے ہیں۔ اگر ہم انھیں مختلف صورت حال میں دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ان کو مختلف زاویوں سے دیکھنا ہوگا۔ کسی ایک انسان کا ایک ہی روپ نہیں ہوتا، وہ بیک وقت بیٹا، شوہر اور باپ بھی ہوتا ہے اور وہی کارخانے اور دفتر میں کام کرتا ہے وہ افسر بھی ہو سکتا ہے اور ماتحت بھی۔ وہ مقروض بھی ہو سکتا ہے اور کسی کو قرض بھی دے سکتا ہے وہ ایک کا دوست اور دوسرے کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے منفرد ہوتا ہے لیکن اس کے روپ علاحدہ علاحدہ ہیں۔ مختصر افسانہ اس کردار کا ایک آدھ ہی روپ پیش کر سکتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ مختصر افسانہ میں ایک آدھ کردار ہی پیش کیا جائے۔ یہاں کئی کردار بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعات پیش کیے جائیں وہ بہت مختصر وقفے کے اندر ہوں۔ یہ واقعات برسوں پر محمول ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کرداروں سے متعلق یا ان واقعات سے متعلق کردار چاہے تعداد میں کتنے ہی ہوں اور کتنے ہی برسوں پر پھیلے ہوئے ہوں، وہ ایک ہی مرکزی خیال پر روشنی ڈالیں۔

مختصر افسانہ کوئی دستاویز نہیں ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ یہاں تخیل کے ذریعے تصویریں بنائی جاتی ہیں لیکن اس کے لیے افسانہ نگار میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے تاکہ ہم کرداروں کو ایکس رے کی طرح آر پار دیکھ سکیں۔ یہ بات کرداروں کے ذریعہ اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے جیسا کہ قرۃ العین حیدر کے "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں یا اشفاق احمد کے "گڈریا" میں۔

یہ حقیقت ہے کہ ادب پہلے تخلیق ہوا، اس کے بعد تنقید وجود میں آئی۔ کیونکہ تخلیقی ادب کے بغیر تنقید کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ ادب ہی سے تو معیار کا تعین ہوتا ہے۔ اسی بات کو ہم افسانے کی تنقید میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ محض تنقید کے ذریعے افسانے کے فن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ کوئی بھی تنقیدی اصول، افسانے کے فن کو اپنی گرفت میں مکمل طور پر نہیں لے سکتا۔ اگر ہم مختلف قسم کے افسانے پڑھیں تو ہم بہتر طور پر افسانے کے فن کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہر افسانے کی اپنی تکنیک اور اس کا اپنا فن ہوتا ہے اور اس کی دریافت افسانہ نگار کی صلاحیت پر منحصر ہے، اگر افسانہ نگار کے قدم یہاں پر ڈگمگا جائیں تو گویا افسانہ اپنی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس لیے کہ افسانے کو وجود میں لانے کے لیے افسانہ نگار کو اپنا خونِ جگر پلانا پڑتا ہے اور واقعات جو اس ترتیب اور اس نوعیت سے کسی کی زندگی میں پیش نہیں آئے انھیں اپنے اوپر گزارنا پڑتا ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ تخلیق کے ایک مسرّت زا کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔

افسانہ نگار کو اپنے ہر افسانے کے اسلوب کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اسے اسلوب پر بھی اتنی ہی توجہ دینا چاہیے جتنی کہ خام مواد پر۔ اس اسلوب کے اندر لچک ہونا چاہیے کہ ضرورت کے مطابق اس کو موڑا جا سکے۔ افسانے کا خام مواد پلاسٹر آف پیرس کی طرح ہونا چاہیے۔ اب اس سے کیسا مجسّمہ تیار ہوتا ہے یہ افسانہ نگار پر منحصر ہے۔

افسانہ میں جو واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں انسان تو ہوتے ہی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر افسانے میں اس کی صحیح معنوں میں کردار نگاری کی جائے۔ اس سے افسانے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مثال کے طور پر غلام عباس کی کہانی "آنندی" میں۔ اس افسانے میں کوئی خاص کردار نہیں، محض افراد کا ہجوم ہے جو عقائد بھی رکھتے ہیں، اور معاشرے کا جبر بھی۔ ان کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے لیکن ان کو ایک افسانہ نگار کی نظر سے ہی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ لوگ جو یہاں اقدار کے پاسبان نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اس حمام میں ننگے دکھائی دیتے ہیں۔ "آنندی" اسی لیے ایک مثالی کہانی ہے لیکن ہر اچھی کہانی مثالی ہوتی ہے کیونکہ اس میں وہ بات ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔

بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ افسانے کا فن اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ تبلیغ کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ہم "مہالکشمی کا پل" کے علاوہ بھی کرشن چندر کے افسانے پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی تبلیغ کرشن چندر کے فن کی جان ہے۔ روایت کی خوبی یہ ہے کہ راوی نظر نہ آئے۔ لیکن کرشن چندر کے یہاں راوی محض جھانکتا ہی نہیں بلکہ خود بھی اچھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ بالکونی میں جب بوڑھا عبداللہ مر جاتا ہے اور منیجر صاحب پکارتے ہوئے گالی دیتے ہیں تو راوی کہتا ہے:

"بول۔ بول۔ اے سور کے بچے! سپید سپید تیلیوں والے غلیظ بڈھے گنجی چاند والے، کھردرے ہاتھ پاؤں والے نیم برہنہ، فاقہ مست انسان، بول کیا مر کر بھی تجھے گالی کا جواب دینا نہ آئے گا؟"

کرشن چندر کے بہترین افسانے وہی ہیں جہاں انھوں نے تبلیغ کو فنی ہیئت دی ہے۔ اور اسے اپنا اسلوب بنا لیا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے زمانے کی روح کو اپنے افسانوں میں اسیر کر لیا ہے۔ ان کے افسانوں سے ان کے عہد کے ہندوستانی سماج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کی یہ خصوصیت نہ صرف ماحول، پس منظر اور زندگی کی کش مکش سے واضح ہوتی ہے بلکہ وہ کرداروں سے بھی خوب کام لینا جانتے ہیں۔ کردار کے افسانے اپنے مصنف سے بڑا زبردست مطالبہ رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کردار ہی بذاتِ خود افسانے ہوتے ہیں۔ اس کا فن اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو کس حد تک زندگی اور زندہ انسانوں سے قریب کرتے ہیں۔ کرداروں کو جانچنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ کس حد تک زندگی سے میل کھاتے ہیں۔ کردار چاہے کتنے انوکھے کیوں نہ ہوں، لیکن پڑھنے والا ہر لمحہ یہ محسوس کرے کہ وہ اس معاشرے کے اندر سانس لے رہا ہے۔ افسانے انسانی تجربات کو ڈرامائی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ افسانہ انسان اور اس کے سماج کے ارد گرد چکر لگاتا ہے اس لیے وہ سماج کے مسائل سے کترا کر نہیں نکل سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ افسانہ نگار اپنے مخصوص زاویے سے اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ واقعیت کا اظہار ہے، جسے ہم "شاعرانہ حقیقت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شاعرانہ حقیقت افسانے کے ذریعہ بڑی کامیابی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر ہر چیز فرضی ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام اور مقام کے علاوہ کوئی چیز بھی فرضی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ تمام واقعات زندگی کے اپنے دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ واقعات چاہے اس شکل میں نہ پیش آئے ہوں لیکن اس کا تجربہ انسانی معاشرے کا اپنا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ افسانہ نگار کے یہاں جتنی سچائی اور شدّت کے ساتھ پیش آئے گا، افسانے کی تکنیک اس کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔

ابتدائی افسانہ نگاروں کے سامنے یہ مشکل ضرور پیش آئی ہوگی کہ افسانہ اتنا مختصر ہوتا ہے کہ چند صفحات کے اندر کردار کے ساتھ کس طرح انصاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسانہ نگاروں نے بہت جلد اپنی چابکدستی سے یہ ثابت کر دیا کہ قوتِ تخیل چاہے تو جزء میں کل کو بڑی کامیابی سے پیش کر سکتی ہے۔ البتہ افسانہ نگاروں کو اپنے کرداروں سے ضرور مانوس ہونا چاہیے۔

چیخوف کی "ڈارلنگ" اپنی پوری شخصیت کے ساتھ افسانے میں نظر آتی ہے۔ اس کی محرومی، اس کا زندگی سے سمجھوتہ، ہر شکست کو فتح سے بدلنے کا جذبہ، اور ان گنت احساسات اس بڑے کردار کا سرمایہ ہیں۔ منٹو کے افسانے "نیا قانون" کا استاد منگو، ممتاز مفتی کی "آپا"، کرشن چندر کا موبی، اور کالو بھنگی، اشفاق احمد کا گڈریا ـــــ بیدی کے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی اندو، ہاؤسنگ سوسائٹی کا جمشید، سلمیٰ، اور ثریا۔ اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

بعض لوگ مختصر افسانے کے کرداروں سے بڑی توقعات وابستہ

کر لیتے ہیں۔ دراصل مختصر افسانے میں ہمارے سامنے کردار کا پورا ارتقا نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ارتقا ہوتا بھی ہے تو اشاروں اور کنایوں میں ہی کیا جاتا ہے جہاں اس کی ضروری کمی رہ جاتی ہے وہاں قاری کا ذہن اسے پورا کر لیتا ہے یہاں کردار قدرے نہیں اندازِ قدرے پہچانے جاتے ہیں، زندگی کی طرح افسانے میں بعض اوقات ایسے کردار ملتے ہیں جو ایک ہی جھلک میں اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا افسانہ "چوتھی کا جوڑا" ایک معاشرے کا درد و کرب ہے۔ یہاں عصمت کرشن چندر کی طرح تبلیغ نہیں کرتیں۔ لیکن وہ چپ چاپ ایک 'کیمرا' لیے ہوئے کبریٰ کی ماں کے گھر میں پہنچ جاتی ہیں اور ان تمام اَن کہی باتوں کی تصویر کھینچ لیتی ہیں جنھیں کبریٰ کی ماں سوچتی نہیں، کہتی نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ وہاں کوئی اور بھی ہے تو وہ اپنا سر پیٹ لے۔ معاشرے کا جبر بھی عجیب ہوتا ہے کہ انسان کبھی کبھی اسے اپنے آپ سے بھی نہیں دہرا سکتا۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اس کے لیے کلمۂ کفر کے مترادف ہے کیونکہ یہاں سوچنے پر بھی تو پہرے ہوتے ہیں۔ عصمت صرف کہانی لکھ دیتی ہیں فیصلہ صادر نہیں کرتیں۔ اگر وہ رائے زنی کرتیں یا راوی کا انداز اختیار کرتیں، تو ہم یقیناً انھیں اذیت پسند بھی کہتے۔

افسانے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے کہ زندگی کے اندر اتنے موضوعات بکھرے پڑے ہیں کہ ان کو سمیٹا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ جب ہم افسانے کے فن پر غور کریں تو ہمیں موضوع کی اہمیت کی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔ چیخوف نے صحیح کہا تھا کہ وہ کسی چیز پر بھی افسانہ لکھ سکتا ہے۔ تکنیک تو موضوع کے اندر ذہنی ربط پیدا کرنے کا نام ہے۔ افسانہ نگاروں کو یہاں افراط و تفریط سے کام لینا چاہیے اور اس پر خوب محنت سے مشق کرنا چاہیے۔ اس لیے ایک موضوع بلکہ ایک ہی واقعہ کو مختلف افسانہ نگار الگ الگ طریقے سے بیان کر سکتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز سے پیش کر سکتے ہیں۔ موضوع اپنی ہیئت تو تلاش کرتا ہے لیکن ہیئت کوئی ایک نہیں ہو سکتی۔ اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اسی کو لوگ افسانے کا پلاٹ کہتے ہیں اس سے افسانے کو ایک طرح کی فنی تنظیم ملتی ہے۔ واقعہ کو ترتیب حاصل ہوتی ہے اور یہ ترتیب ہی قصے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو واقعات سے قصے کا عنصر ختم ہو جائے۔ اس کی بدولت مرکزی خیال بھٹکتا نہیں۔ مرکزی خیال کو بہرحال افسانے میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی افسانہ لکھنے کا محرک ہوتا ہے بقول وزیر آغا "ہر افسانے کا ایک نقطہ ہوتا ہے اور افسانے کے تمام واقعات اس ایک نقطے کو ابھارنے کے لیے وقف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک اچھے افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر واقعہ تاثر، بلکہ ہر جملہ، ایک ہی مرکزی نقطے کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔"

اردو افسانہ ہندوستان کے بدترین اقتصادی دور کی پیداوار ہے۔ معاشرے میں تیزی سے تبدیلی بھی نہیں ہو رہی تھی اس لیے اردو افسانے نے اپنی نظریں خوب اچھی طرح ان مسائل کی طرف گاڑیں اور انھیں اپنا موضوع بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا افسانہ زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ تعبیر بھی ہو گیا۔ آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی، اشتراکیت کے نعرے فضا میں گونجنے لگے، اردو افسانہ ہندوستان کی اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ بچوں میں ماحول کو قبول کرنے کی صلاحیت بڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ یہ اردو افسانے کا بچپن تھا اس لیے اس نے لازماً اپنے عہد کی تمام تر صفات کو بڑی تیزی سے قبول کر لیا۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہنگامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ چاہے بنگال کا قحط ہو، یا کوئی اور ہنگامی مسئلہ ہو۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے سیاسی شعور کی بنا پر افسانے میں مقصدیت کو نمایاں کیا۔ ان کی بدولت پڑھنے والوں کا حلقہ بڑی تیزی سے بڑھا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں ایک غیر معمولی کشش تھی، وہ اپنے پڑھنے والوں کو شدت سے متاثر کرتے تھے انھیں اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے کم از کم اس مخصوص کہانی میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اردو افسانوں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاپ آج بھی گہری ہے اور اردو کے نئے افسانہ نگار چاہے بالواسطہ ہی سہی، لیکن ان سے متاثر ضرور ہیں۔ انھوں نے اس طرح اپنی نسل کو تو متاثر کیا ہی تھا، لیکن نئے لکھنے والوں کی نسل بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس میں عہد کا بھی ہاتھ تھا اور زندگی کے حقائق

(باقی صفحہ پر)

مختار ٹونکی

نغمۂ آزادی

آزادیوں کی دیوی ہم پر کرم کیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

آکاش چھو رہا ہے قومی نشاں ہمارا
یہ ہے زمیں ہماری اب آسماں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

آزادیوں کا تونے جادو جگا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

جمہوریت کی خوشبو پھیلی چمن چمن ہے
کیا ذاتیں اور قومیں اب سیکولر علن ہے
ہندو ہو یا مسلماں سب کا یہی وطن ہے

سب کو برابری کا درجہ عطا کیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

ہر چھوٹے اور بڑے کو آزادیاں ہیں حاصل
آزادیوں میں اور ہیں بنیادی حق بھی شامل
دستور ہند سے تو سب کو ملی ہے منزل

جمہوریت کو جس نے کامل بنا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

منصوبے پانچ سالہ ہم تو چلا رہے ہیں
نہروں سے کھیتیوں کو پانی پلا رہے ہیں
دیکھو مشینی ہل سے سونا اُگا رہے ہیں۔

سویا ہوا تھا دہقاں اُس کو جگا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

تعمیر ہو رہی ہے، تقدیر بن رہی ہے
اب آنے والے کل کی تصویر بن رہی ہے
باپو کے خواب کی یہ تعبیر بن رہی ہے

تونے ترقیوں کا رستہ دکھا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے قدم بڑھائیں
فرقہ پرستیوں کا نام و نشان مٹائیں
آؤ کہ گنگنائیں اور ساتھ مل کے گائیں

مختار نے جو نغمہ ہم کو سنا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

جعفر عسکری

جشنِ طرب

آخر کار بہار آئی کہ آنا تھا اسے ـــــ
رات بیدار، فضا سبز، مہکتی ہے ہوا
خم بہ خم، گیسوئے احساس کے کھلنے کی گھڑی آ پہنچی
جاں فزا جامِ طربناک چھلکنے کی گھڑی آ پہونچی
اور بوسیدہ تمناؤں کے گلزار میں، شاداب تمناؤں کے گلزار کھلے
شجرِ خواب پہ جس طرح سے تعبیرِ ثمر دار کھلے
آرزوؤں کے، چمن کے لب و رخسار کھلے
آج دل ہائے فسردہ میں مسرت کے چراغوں کی لویں تیز کرو
ساعتِ جشنِ طرب خیز ہے، اک رقصِ طرب خیز کرو
گفتگو آج سرِ محفلِ یاراں، شکر آمیز کرو
یہ شبِ وصل ہے،
احساسِ شبِ ہجر سے پرہیز کرو
آج جذبوں کی کدورت کو، بصیرت میں ملا دو یارو
آج چہروں سے تغیر کی نقابوں کو اٹھا دو یارو!
آج ہر فکرِ گراں بار کو، سولی پہ چڑھا دو یارو!
آج قصہ نہ کہانی کوئی سرگوشی میں ـــ
آج ہر راز زبانوں کے نہاں خانوں سے باہر لاؤ
آج گلدستۂ جذبات سے،
ہونٹوں پہ کوئی حرفِ معطر لاؤ
جشنِ یاراں ہے، رقیبوں کو صدا دو یارو
آج جو دستِ تہی رنگ نظر آئے، اُسے رنگِ حنا دو یارو!
آج ہر گام پہ اک شمع جلا دو یارو۔
آج ہر فکرِ گراں بار کو سولی پہ چڑھا دو یارو!

عبدالقوی دسنوی

افاداتِ مہدی

آج سے تقریباً باون سال پہلے ۱۹۲۲ء میں مہدی افادی کی نگارشات کا مجموعہ افاداتِ مہدی کے نام سے شائع ہوا ہے جس کے لیے بیگم مہدی بجا طور پر اردو والوں سے شکریہ کی مستحق ہیں۔ انھوں نے افاداتِ مہدی کی صورت میں مہدی حسن کی منتشر تحریروں کی شیرازہ بندی کر کے انھیں تلف ہونے سے نہ صرف بچا لیا ہے بلکہ اردو ادب کے خزانے میں خوبصورت اور قیمتی اضافہ کیا ہے جس نے اہلِ اردو کو اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ یہ کتاب اس وقت سے آج تک مختلف حلقوں میں پسند کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہے اور اسی مقبولیت کی وجہ سے ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ اے تک کے نصاب میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور داخل رہی ہے۔ میرے خیال میں اردو کا شاید ہی کوئی ایسا نثری مجموعہ ہوگا جو اپنے تنقیدی سرمایہ سمیت اس قدر مقبول ہوا ہو، جس قدر طویل مدت کے لیے افاداتِ مہدی کو مقبولیت حاصل رہی ہے یہی اس کی عظمت کی ضمانت ہے اور اسی سے اس کی قدر و قیمت کی پہچان ہو سکتی ہے۔

افاداتِ مہدی مہدی حسن کی انتیس تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام تحریریں عام طور سے سرسری ہیں اور کسی نہ کسی ضرورت سے قلم بند کی گئی ہیں، جن میں گہرائی کم ہے دلربائی زیادہ، باتیں کم ہیں باتیں بنائی زیادہ گئی ہیں۔ ان مضامین میں مہدی اپنے موضوع اور منزل سے اکثر بھٹکتے نظر آتے ہیں، سوائے "معاصرانہ چشمک" کے جس کی اصل حقیقت کچھ اور

سہی لیکن یہ مضمون محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس لیے مہدی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں، عام طور سے اس کے مطالعے کے بعد قاری کسی حد تک ان کا ہم خیال نظر آتا ہے ورنہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی بھی مضمون میں بہت محنت، سنجیدگی، کاوش اور عرق ریزی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ جو کچھ ان کو معلومات حاصل تھیں ان کو اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے زیادہ کس طرح کہا گیا ہے اس سے ہم متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ان کا اسلوبِ نگارش ہے جس میں دلبری بھی ہے، دلکشی بھی، شوخی بھی ہے، شگفتگی بھی، رعنائی بھی ہے رنگینی بھی، سادگی بھی ہے بے تکلفی بھی، ساحری بھی ہے پاکیزگی بھی، بے باکی بھی ہے، بے ساختگی بھی۔ ان کے یہاں پرکشش اسلوب، دلنشیں زبان، پرفریب لہجہ بے مثل قدرتِ بیان کے ساتھ جدتِ خیال، قطعیتِ رائے کا زور ہے۔ ان کی تحریروں میں ندرت، تازگی، نفاست اور شان و شوکت کا اظہار ملتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ان کی انانیت اور انفرادیت ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ اپنی بات کو بہت زیادہ پُرفریب اور باوزن بنانے کے لیے چست فقرے، حسین استعارے، نادر ترکیبیں، نئی نئی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی کبھی انگریزی زبان و اسلوب کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی فارسی غزل کا تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا اپنا اسلوب نہایت باوقار، باوزن، پرشکوہ رواں دواں، چونکا دینے والا، منفرد اور پرکشش نظر آتا ہے۔ چنانچہ قاری پہلی ہی نظر میں ایسا مسحور ہو جاتا ہے کہ پھر نہ سحر ٹوٹتا ہے اور نہ وہ اس سے چھوٹتا ہے۔

اور سچ یہ ہے کہ مہدی کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو ان کے طرزِ نگارش میں نکھار، وقار، اعتماد، خلوص، سچائی اور جذبے کی فراوانی ہے۔ جن کی وجہ سے ان کی تحریروں میں وزن اور بانکپن پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ ان کا اسلوب ہی ہے جس نے ان کو اردو کے صفِ اول کے انشا پردازوں میں لاکھڑا کیا ہے جس کے بل پر وہ آج تک زندہ ہیں اور پائندہ رہیں گے۔

مہدی کی تحریروں اور اندازِ فکر میں ان کے پیشروؤں کا اثر ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی انگریزی طرزِ فکر کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ انھوں

نے بھی اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن برجستہ استعمال کیے ہیں جن سے ان کی تحریر میں کسی قسم کا نقص پیدا نہیں ہوا ہے۔

انگریزی الفاظ کے استعمال کا سلسلہ مہدی افادی کی تحریروں میں پہلے مضمون "حکمائے یونان پر ایک نظر" (۱۸۹۰ء) سے شروع ہو کر "شبلی سوسائٹی" (۱۹۱۸ء) تک جاری رہا ہے۔ انھوں نے انگریزی الفاظ اور اصطلاحوں کے ترجمے بھی کیے اور ترجمے کے لیے دوسروں کو زور بھی دیا ہے اور متوجہ بھی کیا ہے۔

مہدی حسن کا قابل ستائش کارنامہ جو ان کے ہاتھوں اردو زبان کے لیے انجام پایا ہے اصطلاح سازی اور نئے نئے تراکیب اور الفاظ گھڑنے اور وضع کرنے کا ہے۔ انھوں نے اس کام کو نہایت جانگدستی ہوشیاری اور عالمانہ انداز سے انجام دیا ہے۔ ان کی ان ترکیبوں اور اصطلاحوں نے ان کی تحریروں میں چمک پیدا کی ہے، جان ڈال دی ہے اور مفہوم میں گہرائی اور گیرائی عطا کی ہے۔

اردو زبان و ادب سے والہانہ تعلق ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ اردو کے مصنفین سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے، ان کے شیدائی اور فدائی تھے اور ان کے لیے نیک خواہشات رکھتے تھے اور کبھی کبھی ان کی تعریف و توصیف اس انداز اور لہجے کے ساتھ کرتے تھے کہ مبالغے کی سرحدوں تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ اردو کے مصنفین جو مہدی کو پیارے تھے یا جن سے وہ دل چسپی لے رہے تھے وہی تھے جن کے ہاتھوں میں اس زمانے میں رہوار اردو ادب کی باگ تھی، میری مراد سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، سید علی بلگرامی، محسن الملک، عبدالحلیم شرر، اکبر الہ آبادی اور ناصر علی وغیرہ سے ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے ادبا بھی تھے جو تازہ واردان بساط ادب تھے اور جو ان کے ہم عصر کہے جا سکتے تھے۔ ان میں خاص طور سے سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی، عبدالباری ندوی، مولوی عبدالحق، ریاض خیر آبادی، عبداللہ عمادی، دلگیر اور ابوالکلام آزاد کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

مصنفین کی اس فہرست میں ایوان مہدی میں جس کو سب سے زیادہ باریابی کا موقع ملا وہ علامہ شبلی نعمانی تھے۔ شبلی کے وہ شیدائی تھے فدائی تھے، ان کی عظمتوں کے معترف تھے۔ قدرداں تھے۔ چنانچہ افادات مہدی میں تقریباً ایک چوتھائی مضامین صرف شبلیات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ شبلی کے بارے میں ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں "وہ اعلا درجے کے مورخ، اعلا درجے کے شاعر تھے"۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ خالص ادیب تھے۔ ان کے یہاں وسیع النظری اور تحقیقات میں گہرائی اور صداقت پائی جاتی ہے۔ ان کا درجہ یورپ کے صف اول کے مورخین کے ہم پلہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہدی کے اتنا لکھنے کے باوجود شبلی کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے انوکھے انداز سے بات کہنے کی کوشش ضرور کی ہے، ان کے اظہار خیال میں ندرت بھی پائی جاتی ہے، ان کے فیصلوں میں صداقت کی جھلک بھی نظر آتی ہے، ان کے ایک ایک لفظ سے خلوص اور عقیدت مندی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ان کے ان صالح جذبات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں ایسے باذوق اور باصلاحیت افراد کے لیے موج زن تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چند اُچٹتے منتشر خیالات سے شبلی کی اصل تصویر اُبھر کر سامنے نہیں آ سکی ہے۔ یہی کمی دوسرے مصنفین کے متعلق ان کے اظہار خیال میں محسوس کی جاتی ہے۔

مہدی نے آنکھیں اس فضا میں کھولی تھیں جب سرسید تحریک شباب پر تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب خطہ پنجاب نے اقبال کو جنم دیا تھا جو آگے چل کر شاعر مشرق کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ مہدی نے اسی فضا میں سانس لی، اس کی گرمی، نرمی، تیزی، تلخی سے متاثر ہوئے اسی میں ان کا مزاج بنا، شعور پیدا ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت نے انھیں پرکھنے، سمجھنے اور فیصلہ سنانے کی قوت عطا کی تھی۔ انھوں نے کبھی مخالفت میں فیصلے سنائے تو کبھی موافقت میں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کے ہر فیصلے پر صاد کیا جائے۔ لیکن یہ حق بات ہے کہ ان کے فیصلے آسانی سے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

مہدی کی تحریروں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں شاعروں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ اس لیے شعرا سے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی نثر پر شاعری کا رنگ گہرا ہے لیکن وہ خود نہ تو شاعر تھے اور نہ ہی شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے حالانکہ وہ دور جس کے وہ نمائندہ ہیں شاعروں کے نغموں سے، ترانوں سے اور شعلہ زبانیوں سے گونج رہا تھا۔ ہر مزاج اور

ہر خیال کے شعراء، زبان و ادب اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اقبال تو سب میں نمایاں تھے جن کی شاعری نے عالم اور عالِم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ متوجہ نہیں کر سکے تو مہدی افادی کو۔

لیکن جہاں تک نثر نگاروں کا تعلق ہے افادات مہدی اس دور کے نثر نگاروں کے خیالات و افکار سے متعلق مہدی افادی کے تاثرات کے تانے بانے سے بھری پڑی ہے۔ اردو ادب میں مہدی افادی پہلے شخص ہیں جن کی تحریروں میں جگہ جگہ مختلف ادیبوں کا اس طرح ایک ساتھ ان کی اپنی اپنی خصوصیات اور خوبیوں کے ساتھ ذکر ملتا ہے اور کمال یہ ہے کہ ان کی خصوصیات نہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں نہ ان کی عظمتوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں نقصان پہنچتا ہے۔ یہ مختلف مصنفین اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور اپنا اپنا رنگ و روپ ہمارے دل و دماغ پر بٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس خوبی کے لیے مہدی لائق ستائش ہیں۔ مہدی کو یہ سلیقہ وسیع مطالعے کے بعد حاصل ہوا تھا۔ وہ اچھے رسائل اور اچھی کتابوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مطالعے کے سلسلے میں ان کا بڑا صاف ستھرا اور نکھرا انداق تھا۔ وہ کتابوں کو نازنینان حرم کہتے تھے اور کتابوں کی دنیا کو غیر فانیوں کی دنیا سمجھتے تھے۔

افادات مہدی کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب سے، اس میں مختلف رجحانات سے واقف تھے، باخبر تھے اور گہری نظر رکھتے تھے۔ کتابوں سے متعلق ان کی رائیں، رسائل سے متعلق ان کے خیالات، مختلف ادبی کاموں سے متعلق ان کے افکار نئے نئے کاموں کی طرف متوجہ کرنے کا ان کا انداز اور طرح طرح کے کاموں کے لیے ان کے دل میں آرزوئیں اور تمنائیں، کام کرنے والوں کو کبھی روکنا، کبھی ٹوکنا، کبھی سراہنا، کبھی رہنمائی کرنا، یہ سب باتیں ان کی عظمت، ادبی ذوق و شوق، وسیع مطالعے، زبان سے لگاؤ اور محبت کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ اردو زبان سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے بعض خیالات سے آپ متفق نہ ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ان کے جذبات کی قدر نہ کریں، ان کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس نہ کریں۔

مہدی کے یہاں اردو کے ساتھ دوسری زبانوں سے بھی دلچسپی تھی، ادب نوازی کا جذبہ تھا، اچھی کتابوں کے مطالعے کا ذوق و شوق، کتابوں کے ساتھ نازنینان حرم کا سا سلوک، اردو کے لیے فکر مندی، اس کے خزانے میں اضافے کے لیے رات دن غور و خوض، تگ و دو، مشورے، خطوط نگاری کا شوق، بات میں بات پیدا کرنے کا ملکہ، نئی بات کہنے کی صلاحیت، دلچسپ اور نیا انداز اختیار کرنے کا سلیقہ ہے۔ اسی کے ساتھ متحرک کرنے کی خواہش، متاثر کرنے کا فن، متوجہ کرنے کی ادا بھی۔ یہی سب کچھ ان کی دولت تھی جس نے ان کے تنقیدی شعور کو جگایا، نمایاں کیا، نکھارا، باوزن بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، اپنا ہم خیال بنا سکے اور ایک خاص انداز سے سوچنے کے لیے مجبور کر سکے۔

میرا خیال ہے کہ انھوں نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، انھوں نے تنقید کا اسلوب اختیار نہیں کیا، انھوں نے تنقید کو اپنا مزاج نہیں بنایا، انھوں نے تنقید کو اپنا فن بھی نہیں ٹھہرایا۔ وہ تنقید کے آدمی بھی نہیں تھے، تنقید کے لیے جس ریاضت، جس صبر و تحمل اور جس طبیعت کی ضرورت پڑتی ہے وہ بدقسمتی سے ان کے حصے میں نہیں آئی تھی اور نہ ان کو اتنی فرصت تھی نہ موقع حاصل تھا، نہ ماحول تھا، نہ ان کا کوئی مسلک تھا اس لیے وہ اردو کے تنقیدی خزانے میں کوئی اضافہ بھی نہیں کر سکے لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو تنقید کی تاریخ میں ان کا نام ضرور آئے گا۔ ان کا ذکر ضرور کیا جائے گا، اس لیے کہ انھوں نے تنقیدی شعور کے پیدا کرنے میں حصہ ضرور لیا ہے اور حق بات کہنے کی جرأت اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں خیالات میں تضاد بھی ہے، تکرار بھی ہے، لیکن ان کے جذبے کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ادب کا صالح ذہن لے کر آئے تھے۔ وہ کسی نظریے کے پابند نہیں تھے، وہ کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، وہ کسی خاص مقصد سے کچھ نہیں لکھتے تھے؛ وہ ادب کی قلم رو میں ہر نو وارد کو خوش آمدید کہتے تھے، اپنی مسرتوں کا اظہ

کرتے تھے، اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

اس کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کی خوبیوں سے روشناس کرنے میں حصہ لیتے تھے اور دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ ان کا یہی عمل قابل ستائش بن گیا۔ ان کا یہی جذبہ قابل قدر ہو گیا اور ان کی یہی سچائی قابل اعتنا ثابت ہوئی۔

مختلف ناقدین نے مہدی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جمالیاتی، تاثراتی، وجدانی، جذباتی اور تقابلی تنقید کی خصوصیات رکھتے تھے۔ وہ تنقید کی صحیح اسپرٹ سے واقف تھے، وہ انتہا پسند تھے، جدت طراز تھے، انھوں نے تنقید کو تخلیق کے دائرے میں داخل کیا اور اس میں ادب لطیف کی خوبیاں پیدا کیں اور یہی سب خصوصیات ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں کسی نہ کسی حد تک درست ہیں اور ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں پائی بھی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ ان کے یہاں اچھا تنقیدی شعور تھا، جرأت مندی تھی، بصیرت تھی، بے باکی تھی، بات کا کہنے کا سلیقہ تھا، پرکھنے کا طریقہ تھا لیکن وہ اپنی ان صلاحیتوں سے زیادہ کام نہ لے سکے۔ ادب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکے۔ کچھ تو حالات نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ پھر زمانہ بھی کھری تنقید کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ان کا میدان بھی دوسرا تھا، سرکاری ملازمت کی الجھنیں تھیں، وقت کی کمی تھی، لیکن ان حالات میں جب بھی وقت نکال کر لکھنے کی کوشش کی تو ان کی تحریر کی انفرادیت بھی آڑے آئی۔ وہ تنقید کے ساتھ انشائے لطیف کے حدود میں جب بھی داخل ہوئے تنقید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، پھر لفظوں کی بازی گری میں کھو گئے یا اسے تخلیق کا درجہ دینے میں کامیاب ہوئے بھی تو اپنی منفرد انشا پردازی کا سہارا لیا اور اسی کے سہارے آگے بڑھے اور سچی بات تو یہی ہے کہ ان کا طرز اسلوب یا ان کی انشا پردازی ہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ اسی وجہ سے وہ زندہ رہیں گے، نمایاں رہیں گے، یاد کیے جائیں گے۔

ان کو بات کہنے کا ایک خاص ملکہ تھا، وہ دل چسپ انداز اختیار کرتے تھے، اسلوب کی ندرت کا خاص خیال رکھتے تھے، الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال کے فن سے واقف تھے، اردو والوں کے احساس اور مزاج سے بھی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں کہاں اور کس طرح متاثر کیا جا سکتا ہے۔

عام طور سے مہدی کی تحریریں شگفتہ ہیں۔ زبان پر لطف اور پرشکوہ ہے۔ کبھی کبھی ظرافت کی آمیزش سے تبسم زیر لب کا لطف آ جاتا ہے۔ لیکن کہیں لہجے کی درشتی، کرختگی اور طنز کی ملاوٹ سے تلخی کا احساس ہوتا ہے۔

مہدی کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں تہاں صنف نازک کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ وہ اس کے متعلق مزہ لے لے کر باتیں کرتے ہیں اور اس کے حسن و جمال کی حسین تصویریں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریروں میں خوبصورت تصویریں ہنستی، بولتی اور انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں۔ اسی لیے افادات مہدی کے صفحات گل بداماں نظر آتے ہیں جن سے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے، اور ارضی حسن و جمال سے لذت یاب بھی ہوا جا سکتا ہے۔ بعض جگہ مثالیں بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بات اس تک جا پہنچتی ہے۔

عام طور سے مہدی کی تحریریں دل چسپ ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ تحریریں وقتی ضرورت کے تحت قلم بند ہوئی ہیں۔ اس لیے بعض خامیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ جوش تحریر میں اپنے موضوع سے کبھی کبھی ہٹ بھی جاتے ہیں اس کی وجہ شاید وقت کی کمی اور سب کچھ ایک ساتھ کہہ دینے کی آرزو ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ مہدی جو یونانی حسن کا مذاق رکھتے تھے جنس لطیف کے نہ صرف شیدائی تھے بلکہ ان سے متعلق اظہار میں ان کا قلم حسن کا لالہ زار اور باغ و بہار بن جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر میں شاعری کا لطف آتا ہے۔ ان کی زبان پر شاعر کا نام نہیں آتا البتہ چند شعر نوک قلم پہ آ گئے ہیں لیکن یہ اشعار ویسے نہیں جن کی ہم مہدی سے توقع رکھتے ہیں۔

بہرحال مہدی افادی کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ سرسید تحریک کے BY-PRODUCT تھے تو یہ بات بڑی حد تک درست ہوگی اگر یہ "تحریک" متحرک نہ ہوتی اور حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد قریب یا دور سے اس میں شامل یا اس سے متاثر نہ ہوتے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

نہال رضوی

غزلیں

ساتھ رہتے ہیں منافق کے قرینوں کی طرح
آج کے دوست ہیں شیشے کے نگینوں کی طرح

عمر تو سوچتا ہوں دار و رسن کو دی جائے
کہہ کے سچ بات محبت کے امینوں کی طرح

یہ ہوا ہے اثرِ ترکِ تعلق یارو
اب تو ہر روز گزرتا ہے مہینوں کی طرح

غمِ انساں کی تجلی نہ ہو جس کے دل میں
زندگی اس کی ہے بے فیض زمینوں کی طرح

وقت پڑتا ہے تو مخصوص عزیزوں کی نظر
ہم نے بدلی ہوئی دیکھی ہے حسینوں کی طرح

جب سے ٹھکرایا ہے تم نے میں بسر کرتا ہوں
شہرِ نغمات میں ٹوٹی ہوئی بینوں کی طرح

کاش میخواروں کی صحبت انہیں حاصل ہو جائے
فرق انسانوں میں کرتے ہیں جو زینوں کی طرح

محترم لوگ بسر کرتے ہیں اب کیا کہیئے
رات میخواروں کی دن کعبہ نشینوں کی طرح

اچھے فن کار سے کچھ اہلِ قلم مصلحتاً
پھیر لیتے ہیں نظر زہرہ جبینوں کی طرح

دوستو دیکھو بڑا بول نہ بولو ورنہ
غرق ہو جاؤ گے خود کام سفینوں کی طرح

حرم و دیر کے قائل نہیں میرے سجدے
کیوں جھکاؤں میں جبیں عام جبینوں کی طرح

ہم بھی ہیں دینِ محبت کے پرستار نہالؔ
غالبؔ و حافظؔ و خیامؔ کے دینوں کی طرح

سعید عارفی

اس یُگ میں بھی میری ہستی اک جنت کی بانی ہے
پھولوں کی دلدادہ ہے یہ رنگوں کی دیوانی ہے

چہرے کو محبوب کے یارو چاند سے تم تشبیہ نہ دو
مجھ پر اب یہ راز کھلا ہے چاند میں بھی ویرانی ہے

بستی بستی ڈھونڈھ رہا ہے اس جوگن کو دیوانہ
وہ جوگن وہ روپ متی، جو اس کے گھر کی رانی ہے

سنگِ ملامت پھینک کے جس پر آسودہ ہوئے لوگو
وہ تو مسیحا ہے اس یُگ کا وہ تو انتر گیانی ہے

تنہائی کا نام دیا ہے جس کو دنیا والوں نے
اس انجانے دیس میں اک صورت جانی پہچانی ہے

میری نظمیں، غزلوں کے شعلوں میں جلنے والے لوگ
گھر گھر کہتے پھرتے ہیں یہ شنکر بڑی دہقانی ہے

خاموشی کی چادر اوڑھے شہروں میں آوارہ ہوں
کس کو سناؤں رام کہانی کون یہاں پر گیانی ہے

لب پر آہیں، دامن گیلا، ہجر کی سختی، قرب کی پیاس
جیون میرا اک صحرا ہے، میں ہوں اور ویرانی ہے

شہروں شہروں میرے قصے بستی بستی چرچا ہے
مجھ کو جانے کیا سمجھی ہے دنیا بھی دیوانی ہے

شعر تمہارے نشتر جیسے، غزلیں تیکھی تیکھی ہیں
چھیڑو سعیدؔ اب کوئی نغمہ محفل میں ویرانی ہے

خالد شہاب

کنبہ بندی کیوں؟

اپنا کنبہ کسے عزیز نہیں۔ آپ کو بھی یقیناً عزیز ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے جو آپ کے نورِ نظر، لختِ جگر، گھر کی رونق اور آپ کے چمن کے پھول ہیں وہ بن کھلے مرجھا نہ جائیں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ یہ تو ما ر دھاڑ اور انوکھی والی بات کہی جا رہی ہے۔ آخر کنبہ بندی سے گھر کی رونق کا کیا تعلق؟ سوچا جائے تو بہت گہرا تعلق ہے اور نہ سوچا جائے تو کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا آپ کا اور ملک کی آبادی کی اکثریت کا تعلق ایسے طبقے سے ہے جس کے لیے سفید پوشی نبھانا اور دال روٹی چلانا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اپنی تنگ جیب اور محدود وسائل گھر کے باوجود آپ بلا سوچے سمجھے ہر ڈیڑھ یا دو سال بعد بچوں کی شکل میں ناخواندہ مہمانوں کو بلاتے رہیں گے تو آپ جلد ہی اپنی چھوٹی سی آمدنی کی پتلی گردن پر بہت سے چھوٹے بڑے بچوں کا وہ بوجھ لاد دیں گے جو کمزور شاخ کی طرح ٹوٹ کر گر پڑے گی جس سے آپ کا جو حال ہوگا وہ تو ہوگا ہی آپ کے ننھے منے چہیتے بچے بھی چوٹ کھا جائیں گے اور وہ ایسی چوٹ ہوگی جو زندگی بھر بوجھ نہ پائے گی اور ناسور بن کر رستی رہے گی آپ کے پورے کنبے کی زندگی تلخ کر دے گی آپ کے گھر کی خوشی آپ کی حالت زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہوئی رخصت ہو جائے گی اور آپ کے اندر اتنی بھی سکت نہ ہوگی کہ آپ اس کا دامن پکڑ کر روک سکیں۔

'چھوٹا پریوار سکھی پریوار' محض نعرہ نہیں حقیقت ہے۔ چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی مثل آج کی نہیں بہت پرانی ہے اور صدیوں کے تجربے کی کسوٹی پر کسنے کے بعد کہی گئی ہے' یہ بالکل موٹی سی بات ہے جس کے سمجھنے کے لیے دماغ پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ اگر آپ اپنی آمدنی کی چادر کا خیال کیے بغیر بلا دھڑک آنکھ بند کیے کنبے کے پاؤں پھیلاتے رہیں گے تو ظاہر ہے کہ آپ نہ سر چھپا سکیں گے نہ پاؤں۔ یعنی آپ نہ اپنی اور اپنی بیوی کی صحت درست رکھ سکیں گے اور نہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت اور تعلیم کا انتظام کر سکیں گے۔ آپ کی گھر والی ڈھل ڈھل سوکھے، مرجھائے اور ریں ریں کرتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر کڑھتی اور گھلتی رہے گی اور آپ دال نون، لکڑی کی فراہمی کے چکر میں اپنی صحت چوپٹ اور زندگی تلخ کرتے رہیں گے۔

کنبہ بندی کا سوال صرف آپ کے گھر کا سوال نہیں پوری دنیا کا سوال ہے۔ پوری انسانی آبادی کی بقا کا سوال ہے۔ جس تیز رفتاری سے دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے اگر بروقت اس کی روک تھام نہ کی گئی تو آخر میں یہی کہنا پڑے گا کہ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

روزانہ بڑی تعداد میں بے تحاشا پیدا ہونے والے بچے دنیا کی خوشحالی چہل پہل اور چمک دمک کو روند کر سونا کر دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ زمین محدود ہے اس کے ذریعے پیداوار بھی محدود ہے لیکن پیدا ہونے والے بچوں کی کوئی حد نہیں یہ ایک جانی بوجھی بات ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار میں چاہے جتنی کوشش کی جائے بڑھتی ہوئی آبادی کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتی اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے گی تو وہ اتنی بڑھ جائے گی کہ ہر شخص کو پیٹ بھر کھانا پہنچانا مشکل ہو جائے گا اور دنیا کو خوشحال اور جنت کا نمونہ بنانے کا خیال خواب پریشاں بن کر رہ جائے گا۔

آپ سوچتے ہوں گے اور غالباً بجا طور پر سوچتے ہوں گے کہ یہ

دنیا تو بہت پرانی ہے آخر اب تک یہ کیسے بغیر کنبہ بندی کے باقی رہی۔ اگر بالکل شروع دنیا کی بات کیجئے تو اس وقت دنیا کا دامن قدرتی ذرائع سے بھرا اور انسانوں سے خالی تھا اس وقت کنبہ بندی کا نہیں کنبہ بڑھانے کا سوال تھا۔ اس کے بعد جب دنیا کا دامن انسانوں سے بھر گیا اور پیداوار کے ذرائع تنگ ہونے لگے تو آبادی کو کم یا اس کو بڑھنے سے روکنے کا سوال اٹھا۔ جہاں تک آبادی کو کم کرنے کا سوال ہے وہ یا تو جنگ، وبائی بیماری یا قدرتی آفات یعنی سیلاب اور زلزلہ وغیرہ کا شکار ہو کر کم ہوتی تھی۔

اب آپ بتائیے کہ آپ بے سوچے سمجھے انسانی آبادی کا ایک خوفناک جنگل کھڑا کرنے کے بعد اسے جنگ کے شعلوں یا بیماری کی آگ سے جلا کر رہائش کے لیے گنجائش پیدا کرنا پسند کریں گے یا سوجھ بوجھ سے کام لے کر ایک سمجھدار آدمی کی طرح خطرے کی گرفت میں آنے سے پہلے خطرے کی روک تھام کرنا پسند کریں گے۔ کنبہ بندی کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ بے سوچے سمجھے بچوں کو پیدا کر کے انھیں غریبی، تنگی اور بیماری کی آگ میں نہ جھونکیں بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کریں کہ صرف اتنے ہی بچے پیدا ہوں جتنی آپ کی چھوٹی سی آمدنی کی چادر میں گنجائش ہو یعنی بچوں کی پیدائش ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایسی ضرور تدبیریں اور طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جن کی مدد سے آپ بچوں کی پیدائش ایک منصوبے کے مطابق کر سکتے ہیں۔

بچوں کی بے تحاشا پیدائش روکنے کا خیال کوئی بالکل نیا خیال نہیں اس سے پہلے بھی یہ کوشش غیر منظم اور انفرادی طور پر ہوتی رہی ہے۔ مسلمانوں کی فقہ کی کتابوں میں اس سلسلہ میں عزل کا ذکر آتا ہے، جس کا مطلب ہم بستری کے دوران بدون انزال کے علاحدہ ہو جانا ہے تاکہ حمل نہ قرار پا سکے۔ چونکہ اس وقت کنبہ بندی کے اچھے اور موثر طریقے ایجاد نہیں ہوئے تھے اس لیے مجبوراً انھیں اس قسم کے طریقے استعمال کرنے پڑتے تھے لیکن اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے بچوں کی بے تحاشا پیداوار کو روکنا مذہبی لحاظ سے نہ تو گناہ ہے اور نہ قباحت ہے۔

بعض لوگ اپنی سادہ لوحی سے کنبہ بندی کو ایک طرح سے قتل سمجھتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کنبہ بندی نہ کرنا اور خراب حالات میں بچوں کو پیدا کر کے انھیں مفلسی اور بیماری کی آگ میں جھونکنا قتل ہے۔ کنبہ بندی تو خاندان کو ایک معقول حد میں رکھ کر کے اپنے بچوں کی زندگی کو خوشگوار بنانا ہے نہ کہ قتل کرنا۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی کوتاہی اور غلطی کی ذمہ داری بڑے بھولے پن سے قدرت کے سر ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں واہ صاحب بچوں کی پیدائش میں اپنا کیا دخل یہ تو قدرت کی دین ہے جس کو چاہتی ہے اس کی کوکھ سونی رکھتی ہے اور منتوں مرادوں کے باوجود کوئی سُن گُن نہیں ہوتی۔ مگر یہ قدرت پر بھروسہ نہیں اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ قدرت نے آپ کو پیدا کیا آپ کو عقل دی تاکہ آپ اپنی بھلائی برائی کے متعلق سوچ سکیں اور اسی کے مطابق اپنی راہ اختیار کریں۔ اگر قدرت کی دی ہوئی عقل اور سمجھ سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ آپ خواہ مخواہ قدرت کو کیوں بدنام کرتے ہیں۔ قدرت اسی کی مدد کرتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتا ہے۔ اگر آپ عقل سے کام لے کر اپنی بھلائی کے لیے کوشش نہیں کرتے تو وہ آپ کو انگلی پکڑ کر بے عقل بچوں کی طرح صحیح راہ نہیں دکھائے گی۔ اس نے عقل کی مشعل آپ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اس پر بھی اگر آپ آنکھیں بند کر کے خندق میں گر پڑتے ہیں تو آپ کو اپنے اندھے پن پر شرمندہ ہونا چاہیئے۔ دیدہ دلیری کر کے قدرت پر الزام نہ لگانا چاہیے۔ ایک دیہاتی مثل ہے کہ "چلنی میں دودھ دوہو اور کرم کو لاگ دو" یعنی غلطی خود کرو اور الزام قسمت پر رکھو یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بے سوچے سمجھے بچے پیدا کیا کرتے ہیں اور معصومیت کر اپنی غلطی قدرت کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

آبادی کے بڑھاؤ کو روکنے کے لیے جہاں اور بہت سے سوالات کیے جا رہے ہیں جیسے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کی عمر بڑھانا وہیں یہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر بچہ پیٹ میں آ ہی جائے اور حمل کا باقی رہنا ماں کی زندگی کے لیے خطرے کا سبب بن جائے یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو یا پیدا ہونے والے بچے کی جسمانی یا ذہنی نشوونما میں کوئی بہت بڑا نقص رہ جانے کا خطرہ ہو یا باپ کے حالات

ایسے ہوں کہ وہ مزید بچوں کی خوشگوار زندگی کا بندوبست کرنے سے قاصر ہوں تو میاں بیوی کی رضامندی سے حمل گرا دینا جرم باقی نہیں رہا۔ کچھ ستم ظریف اس پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے بھی آوارگی میں اضافہ کا باعث قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں، لیجیے صاحب اسقاط کو جائز قرار دے کر کنواروں اور کنواریوں کے دل سے بدنامی کا خوف بھی دور کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ بھولی بھالی، نادان کنواری لڑکیاں جو برے لوگوں کے پھندے میں پھنس کر نہ صرف اپنی آبرو گنوا بیٹھتی ہیں بلکہ بسا اوقات حاملہ بھی ہو جاتی ہیں وہ بدنامی کے ڈر سے بدستور خودکشی کرتی رہیں یا پھر عطائی دائیوں کے ہاتھوں چوری چھپے حمل گروا کر اپنی جان خطرے میں ڈالتی رہیں اور باقاعدہ سے کسی زنانے اسپتال یا لیڈی ڈاکٹر کے یہاں جا کر انھیں اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی سہولت نہ فراہم کی جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ استقرار حمل کے پہلے بارہ ہفتوں میں حمل آسانی سے گرایا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے کیونکہ اس مدت میں نطفے میں جان نہیں پڑتی اور جب تک جان نہ پڑے وہ بچّے کے قتل یا جان کے ضائع کیے جانے کی تعریف میں نہیں آتا۔

نس بندی کے خلاف یا تو جان بوجھ کر یا نادانی سے عجیب و غریب افواہیں اڑائی جاتی ہیں کوئی کہتا ہے کہ اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں کوئی دور اندیش یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "دو یا تین بچے گھر میں ہوتے ہیں اچھے" محض کہنے کی بات ہے بھلا بتائیے موت پر کس کا قابو۔ خدانخواستہ سب چل بسے تو نس بندی کرانے والے کا تو ہمیشہ کے لیے گھر ہی سونا ہو جائے گا۔ مگر کیا نس بندی پر عمل کیے بغیر یہ صورت ممکن نہیں؟ کون اس کی گارنٹی لے سکتا ہے کہ نس بندی نہ کرائی گئی تو تمام اولادیں زندہ رہیں گی یا یہ کہ اولادیں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت باقی رہے۔ اگر تمام اولادوں کے چل بسنے کا خطرہ ہے تو وہ اس وقت بھی پیدا ہو سکتا ہے جب میاں بیوی اولاد پیدا کرنے کے لائق ہی نہ رہ جائیں۔ پھر اس وقت کیا ہوگا؟ گھر سونا ہونے کا خطرہ کہ نس بندی سے اور نس بندی سے نہیں بچوں کی بے تحاشا لام بندی سے ہے۔ بچوں کی بھوکی فوج گھر کی خوشی اور خوشحالی کے ساتھ اپنے کو بھی ہضم کر جاتی ہے۔

★

"ہمارے ملک میں فیملی پلاننگ کا پروگرام عوامی فلاح و بہبود کے وسیع تر پروگرام کا لازمی جزو ہے۔ کنبے کو چھوٹا رکھنے کی ضرورت پر اس لیے نہیں زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں بچّے پسند نہیں، بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہر بچّے کو ملک میں ترقی کرنے کے بہترین مواقع ملیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچّوں کو ایک بہتر دنیا ورثے میں دیں۔ ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے اور ہماری منصوبہ بند ترقی کا بھی یہی مقصد ہے۔"

——— اندرا گاندھی

ضیا حسنی

(افسانہ)

چاندی کے تار

چالیس سال کی عمر سے نت نئی بیماریاں میرے یہاں مہمان ہو رہی ہیں اور ان میں سے چند ایک کا میرے ناتوان جسم سے دلی لگاؤ بھی ہو گیا ہے۔ میں ان کے لیے اپنے خانۂ جسم کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہوں مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں کہ جب ان سے علیک سلیک شروع ہوئی تھی۔ ان دنوں میں صبح سویرے جیسے ہی آئینہ دیکھتا تو کوئی سپید بال ضرور سر ابھارتا ہوا دکھائی دیتا اور دھیرے سے موت کا سندیسہ سنا دیتا۔ میں ایسا خیال آتے ہی سہم جاتا۔ حالانکہ موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ پھر بھی انسان نہ جانے کیوں اسے بھول جاتا ہے اور مرتے مرتے جینے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔

غرض جب کبھی میں کوئی سپید بال دیکھتا تو اسے قینچی سے کاٹ کر اپنے بال سنوار لیتا پھر اپنے کاموں میں لگ جاتا۔ لیکن میں جیسے جیسے ان سپید بالوں کی فصل کو اجاڑتا رہا ویسے ویسے یہ لہلہاتی اور سرسبز و شاداب ہوتی گئی۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے اسے کر نہیں پاتا اور اسے قدرت کے فیصلے کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں میرے آدھے بال سپید ہو گئے۔ اب میں انھیں خضاب سے سیاہ کر لیتا اور صبح کو جب میں ان پر توے کی سیاہی دیکھتا تو میرے اندر جوانی کی امنگیں اور حوصلے بیدار ہونے لگتے۔ کئی سال یہی معمول رہا۔ لیکن جلد ہی میں اکتا گیا۔ یہ میری فطرت کا قصور ہے کہ وہ مجھے کوئی کام پابندی سے کرنے نہیں دیتی۔ ایک دن میں سوچنے لگا کہ جب قدرت نے انھیں سپید کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں انھیں کب تک مصنوعی رنگ دیتا رہوں گا۔ ایسی بات ذہن میں آتے ہی میں نے پھر کبھی بالوں کو سیاہ نہیں کیا اور اب میرے بال روئی کے گالے کی طرح ہو گئے ہیں۔

بظاہر ان بالوں سے کوئی نقصان نہیں ہے، ہر جگہ ان کی قدر کی جاتی ہے۔ ہاں! کبھی نوجوان کوئی فقرہ چست کر دیتا ہے تو سر جھکا کر سن لیتا ہوں۔ ایسی بات نہیں کہ مجھے جواب دینا آتا نہیں، لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا جواب نہ دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔

میں نے نوکری کے بیس سال کئی ضلعوں میں گزارے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، عجیب عجیب چہروں کا مطالعہ کیا، بھانت بھانت کی بولیاں سنیں۔ اب مجھے طویل سرکاری خدمات کے صلے میں صدر دفتر میں تبدیل کیا گیا تو ایسا خیال ذہن میں بار بار آتا کہ شاید میں نئے دفتر نئے ماحول اور نئے ساتھیوں میں کامیاب نہ ہو سکوں لیکن یہاں بھی ایک مہربان افسر مل گئے۔ ویسے میں دل لگا کر کام کرتا ہوں لیکن ان کی مہربانیوں سے متاثر ہو کر یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ سپید بالوں کی قدر افزائی تو نہیں ہے۔

میں عالم نگر میں تنہا رہتا ہوں اور میرا کنبہ پچاس میل دور ایک قصبہ محمود پور میں رہتا ہے۔ لہٰذا پندرھویں دن وہاں جاتا

ہوں، کبھی ایک دن اور کبھی دو دن وہاں قیام کر کے واپس آجاتا ہوں۔ ایک دن میں رکشا سے اتر کر ایک ہاتھ میں اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں ہولڈال لیے بکنگ آفس کی طرف جا رہا تھا، ہولڈال مجھ سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ ایک خوب رو نوجوان لڑکی نے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ہولڈال لے لیا تو میں گھبرا سا گیا، وہ بولی۔

"انکل! میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"شکریہ، بیٹی!"

"سن رسیدہ لوگوں کی خدمت کرنا ان کی ہابی ہے۔"

ایک جوان بولا جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا شوہر ہے۔ لڑکی نے بڑھ کر ٹکٹ بھی لے لیا اور مجھے بس تک پہنچانے آئی۔ جب وہ دونوں جانے لگے تو میں نے دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کیا۔ یہ لڑکی میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ اور رہ رہ کر سطح ذہن پر ابھر آتی ہے۔

جہاں یہ لڑکی مجھے یاد آتی ہے وہاں ایک لڑکی اور ذہن میں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک دن میں ٹکٹ لے کر کیبارٹمنٹ میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک چھریرے بدن، گوری رنگت اور تیکھے نقوش والی لڑکی بشرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے میرے برابر آکر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے زانو پر بریف کیس رکھے ہوئے باتیں کرتی رہی۔ اسی دوران میں چائے والا سامنے آگیا تو وہ بریف کیس میرے حوالے کر کے پلیٹ فارم پر چلی گئی۔ وہیں سے اس نے کہا۔

"چائے پی لیجئے۔"

"شکریہ، میں نہ پیوں گا۔"

وہ چائے پیتے پیتے نہ جانے کہاں چلی گئی؟ تھوڑی دیر بعد ایک کانسٹبل آیا، اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر وہ بریف کیس لے کر جانے لگا۔ تو میں نے اسے روکا۔ وہ بولا۔

"کیا یہ آپ کا ہے۔؟"

"ایک لڑکی مجھے دے گئی ہے اسے آجانے دو۔"

"وہ تو اب یہاں نہ آئے گی، اگر آپ اس لڑکی سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ بھی میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ میں اس سے ملوا دوں گا۔ صرف آپ کے سپید بالوں کا خیال ہے۔ اس لیے آپ کو زحمت نہیں دے رہا ہوں۔"

"وہ لڑکی تو صورت سے بھلی لگتی تھی۔"

"بھولے بھالے چہروں کے پھیر میں نہ آجایا کیجیے! وہ افیون اسمگل کرتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے کانسٹبل بریف کیس لے کر چلا گیا لیکن اس واقعہ کا اثر میرے ذہن پر کافی ہوا اور میں آج تک اس لڑکی کو بھول نہیں سکا ہوں۔

بات سے بات نکلتی ہے اس زندگی میں ایک تجربہ ایسا بھی ہوا کہ جب میں سفر کے دوران اپنی زندگی گنوا بیٹھتا لیکن ایک فرض شناس کانسٹبل نے موقع پر میری ایسی اعانت کی کہ موت کا خطرہ صاف ٹل گیا۔ میں بس سے محمود پور پہنچ گیا تھا اور اپنا سامان لے کر رکشا اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا کہ ایسا چکر آیا کہ میں وہیں گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے پتہ نہیں چلا کہ مجھ پر کیا بیتی؟ میری آنکھیں تو اس وقت کھلیں کہ جب پانی کے تیز چھینٹے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ میں نے اپنے چہرے سے پانی کو پونچھتے ہوئے جو نگاہ اٹھائی تو ایک کانسٹبل کو اپنے پاس کھڑا ہوا پایا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے بابا؟"

"نظیر باغ"

پھر میں بیہوش ہو گیا اور گھنٹوں ہوش نہیں آیا۔ اور اس کے بعد جو میں نے آنکھیں کھولیں تو وہی کانسٹبل کھڑا ہوا تھا اور پولیس کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ وہ بولا۔

"چنتا نہ کرو، میں ابھی تمھیں موٹر سے گھر پہنچا دوں گا۔"

"پیشاب کروں گا۔"

اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھانا چاہا لیکن گر پڑا۔ وہ مجھے گود میں اٹھا کر پیشاب کرانے لے گیا۔ وہاں سے آکر اس نے مجھے پولیس کی گاڑی پر بٹھاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"باباکو ان کے رشتہ داروں کے حوالے کر کے ان سے تحریر لے لینا۔

اب میں نے کوٹ کی جیب کا جو جائزہ لیا تو اس میں کچھتر روپے رکھے ہوئے تھے لیکن وہ بھیگ گئے تھے۔ پانچ منٹ بعد میں اپنے گھر پہونچ گیا، کئی ہفتے علاج ہوا اور میں اس کے بعد پھر کبھی بے ہوش نہیں ہوا اور نہ وہ فرض شناس نوجوان ملا۔ میں اسے برابر ڈھونڈ رہا ہوں، جو کانسٹبل دکھائی دیتا ہے اس کے چہرے پر متجسس نگاہ ضرور ڈالتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی اور وہ سر راہ کہیں مل گیا تو میں اس کی فرض شناسی کو ضرور سراہوں گا۔ نہ جانے کب وہ گھڑی آئے گی۔

بھری جوانی میں کئی گناہ سرزد ہوئے ہیں اور کچھ کی حسرت آج بھی لیے بیٹھا ہوں۔ جوانی رخصت ہو گئی اب نہ وہ لوٹ کر آئے گی اور نہ میں رندی و مستی کے منصوبے بنا سکوں گا۔ اسی زمانے میں ایک گوری چٹی، مست انکھڑیوں اور تیکھے چتونوں والی لڑکی ملا کرتی تھی۔ کبھی پارک کے قریب اور کبھی ذرا سا آگے بڑھ کر تجارتی مرکز میں، وہ کافی شوخ اور شریر تھی۔ اس کی باتیں کافی دلچسپ ہوتیں اور لہجے میں عجیب سی کشش جب وہ مل جاتی تو پھر اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، اور میں اس کے ساتھ کبھی پکچر جاتا اور کبھی رستوران میں بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ مجھے رجھا کر اپنے گھر لے گئی اور اپنی مست شرابی انکھڑیوں میں ایسا الجھایا کہ میں اسے گلاس بدلتے نہ دیکھ سکا۔ اور جب سے انگور کی بیٹی سے اکثر دل لگاتا رہا ہوں۔ ہر دن نہ سہی تو جب گھٹائیں گھر گھر کر آتیں اور ٹھنڈی ہوائیں چلتیں تو وہ لڑکی بے اختیار یاد آجاتی۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو اور کس حال میں ہو؟ جام کو ہونٹوں سے لگا کر اس کی یاد ضرور تازہ کر لیتا کہ یہ اسی کی دین ہے۔

یہ عادت برسوں سے چلا کر رہی تھی سپید بال اکثر ہاتھ روک لیتے۔ لیکن میں زبردستی پی لیتا تھا لیکن کئی مہینوں سے ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اب پینے کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہوتی اسے کبھی سنتے چلیے۔

میں پرمٹ لے کر آزادی سے پیا کرتا ہوں اسی کو حاصل کرنے کے لیے سول سرجن کے دفتر گیا تھا۔ ان کے کمرے میں ایک اور شخص بیٹھا ہوا ان سے میڈیکل سرٹیفکیٹ مانگ رہا تھا ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"آپ بیمار نہیں ہیں اس لیے میں سرٹیفکیٹ نہ دوں گا۔"

"زیارت کے لیے اجمیر جاؤں گا، آپ کو ثواب ملے گا۔

"میں سرٹیفکیٹ نہ دے سکوں گا۔ آپ سچ کیوں نہیں بولتے؟"

"اجمیر جانے کے لیے چھٹی لیجیے۔"

وہ شخص مایوس ہو کر چلا گیا۔ میں کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے متوجہ کیا۔

"کہیے آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"میں شراب پینے کے لیے اجازت نامہ لینے آیا تھا لیکن پہلی ملاقات میں آپ نے مجھے ایسا تاثر دیا کہ اب میرا جی نہیں چاہتا کہ شراب کو ہونٹوں سے لگاؤں۔"

"میں بھی آپ کو یہی مشورہ دیتا۔ لیکن آپ کے سپید بالوں کے خیال سے ایسی بات کہہ نہ پاتا۔

میں شرمسار کمرے سے باہر آگیا اور اب مہینوں سے میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں پی ہے۔ شروع شروع کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جسم سے روح کھنچ رہی ہو اور میرا کسی کام میں جی نہ لگتا کہ جھنجھلاہٹ بھی ہو گئی تھی، بات بات پر الجھ جاتا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ توبہ کو توڑ دوں کہ جان پر بن آئی ہے لیکن ضمیر نے ایسی ملامت کی کہ میں جان پر کھیل گیا اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شراب کو ہاتھ نہ لگانے کا تہیہ کر لیا۔ دن بہ دن اس ارادے میں توانائی آتی جاتی ہے۔ اور اب میں صبح کو جب آئینہ دیکھتا ہوں تو چاندی کے تاروں میں عجیب سا نکھار دکھائی دیتا ہے۔

★

ایم۔ اے۔ کاوش

ہمارا ہندوستان

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن ہمیں جان و دل سے ہے پیارا وطن

یہ سرسبز پھولوں بھری وادیاں
یہ مستی بھری جھومتی ڈالیاں
خموشی میں جھرنوں کی شہنائیاں
پپیہے کی رٹ، پی کہاں، پی کہاں؟

ہیں جنت سے بڑھ کر یہاں کے چمن یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہ گنگا اور جمنا کے میداں کی ریت
زمیں پر ہو جیسے ستاروں کا کھیت
گگن کا وہ پانی میں دلکش فریب
اتر آیا مہتاب تاروں سمیت

مچلتی سی دھاروں کا وہ بانکپن یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

ہمالیہ کی عظمت ہے سب پر عیاں
بلندی میں ہے ہمسرِ آسماں
یہ ہے ہند کا قدرتی پاسباں
اسی دیش میں تاج جنت نشاں

محبت کا گھر، مظہرِ علم و فن یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

یہ باپو کا موتی جواہر کا دیش
ہمگنت اور اشفاق ٹیگور کا دیش
یہ نیتا سبھاش اور جوہر کا دیش
یہی ہے ظفر شاہ بہادر کا دیش

وطن پر فدا ہو گئے سب یہ تن یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

لقاء اللہ خاں لقا گرتیوپوری

ترنگے کا نشاں

دیکھتی ہے جسے حسرت سے زمانے کی نظر
جس پہ ہے سایہ فگن پرتوِ انوارِ سحر
ٹکٹکی باندھ کے دیکھے ہیں جسے شمس و قمر
لہلہائے گا جو تا حشر یونہی شام و سحر
اہلِ بھارت کی عقیدت ہے ترنگے کا نشاں
مژدۂ جذبِ محبت ہے ترنگے کا نشاں

فخر ہے جس پہ مجھے، ہاں وہی تصویر ہے یہ
جشنِ آزادی و اشفاق کی تنویر ہے یہ
اور گاندھی کے ہر اک خواب کی تعبیر ہے یہ
کیوں نہ کہہ دوں کہ مساوات کی تصویر ہے یہ
بادۂ عشق کی لذت ہے ترنگے کا نشاں
مژدۂ جذبِ محبت ہے ترنگے کا نشاں

میرے محبوب مجھے نانک و چشتی کی قسم
عزمِ جوہر کی قسم مقصدِ گاندھی کی قسم
قطرۂ خونِ بھگت ہمتِ مدنی کی قسم
خونِ ٹیپو کی قسم جھانسی کی رانی کی قسم
مادرِ ہند کی عظمت ہے ترنگے کا نشاں
مژدۂ جذبِ محبت ہے ترنگے کا نشاں

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

تذکرۂ شعرائے ہندی

مولفہ میر حسن

قدیم ترین مخطوطہ

میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ ہجری مطابق ۱۷۸۶ء) اُردو کے عظیم ترین مثنوی نگار اور مشہور و معروف صاحبِ دیوان شاعر ہیں مثنوی 'سحرالبیان' اور دیوان کے چند قلمی نسخے انڈیا آفس لندن اور ہندستان کے بعض کتاب خانوں میں دستیاب ہیں۔ کلیات[1] کا ایک نادر نسخہ جناب راجہ صاحب مرحوم محمود آباد کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے

اردو تذکرہ نویسی میں بھی ان کا پایہ بڑا اہم ہے اور ان کا شمار قدیم اور مستند تذکرہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ تذکرۂ میر حسن کے قلمی نسخے عنقا کے برابر ہیں۔ جہاں تک معلوم ہوسکا اس تذکرے کا کوئی قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن یا یورپ کے کسی اور کتاب خانے میں نہیں ملتا ہے۔ اس کے نادر اور کمیاب ہونے کا ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر اور گارساں دتاسی کو بھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوسکا تھا۔ ان دونوں مستشرقین نے اپنی کتابوں[2] میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

میر حسن نے تذکرۂ شعرائے ہندی عہدِ نواب شجاع الدولہ بہادر (متوفی ۱۱۸۸ ہجری مطابق ۱۷۷۵ء) میں فیض آباد میں تصنیف کیا تھا۔ انھوں نے اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔ نواب حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اسے تذکرہ شعرائے اُردو کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں مصنف کا کوئی خاتمہ یا تتمہ درج نہیں تھا۔ شروانی صاحب نے تذکرے کا دوسرا ایڈیشن رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے سے مطابقت کرکے تصحیح و تنقید کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں انجمن ترقی اُردو سے شائع کرایا۔ آخر میں جو خاتمہ درج ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ ۱۱۹۱ ہجری مطابق ۱۷۷۷ء میں تالیف کیا گیا تھا۔ میر حسن کہتے ہیں:

"الحمدللہ والمنۃ کہ ایں تذکرہ من تالیف فقیر حقیر پروردہ آغوش رنج و محن میر حسن در تاریخ یک ہزار یک صد و نود و یک ہجری باتمام رسید[3]"

ای نبی کوئی ... رباعی ... ای دوالی
عشق میں ایسا ہی ہوتا ہی اغلب ہست کہ این شعر
از سلک متوسطین باشد الحمدالله والمنہ کہ این تذکرہ
من تالیف فقیر حقیر پروردہ آغوش رنج و محن میر حسن
در تاریخ یکہزار و یکصد و ہشتاد و ہشت ہجری این
باتمام رسید نوشتہ شدہ نماند کہ احاطہ نمودن کلام جمیع
شعرا از قبیل دریا بکوزہ بردن ہست چراکہ ہیچ جای
نیست کہ در و صاحب سخنی نخواہد بود پس این لی استعداد
ہر بار کہ از ملک بملک یا از شہر بشہر احوال ہر کس نقش نماید
و اشعار ہر صاحب سخنی درج کند مگر احوال بعضی اشخاص
کہ شنیدہ شد یا در تذکرہ متقدمان دیدہ شد با وجود ملاقات

---

[1] تفصیل کے لیے راقم الحروف کا مقالہ "کلیات میر حسن کا قدیم مخطوطہ"، مطبوعہ اردو ادب علی گڑھ شمارہ ۱ سنہ ۱۹۷۳ء ملاحظہ ہو۔ [2] اودھ کیٹلاگ ڈاکٹر اسپرنگر مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۵۴ء اور خطبات گارساں دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ [3] تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن ص ۲۰۸

جناب قاضی عبدالودود صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے نے کتابی صورت دراصل ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں اختیار کرلی تھی[1]۔

تذکرۂ میر حسن کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں بھی محفوظ ہے۔ یہ غالباً نامکمل اور بغیر خاتمے کے ہے۔ اس کے بارے میں جناب عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں موجود ہے۔ اس میں جا بجا سادہ صفحات یا دس دس پانچ پانچ سطروں کی بیاضیں پائی جاتی ہیں نیز آخری حال دوسرے خط کا لکھا ہوا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ خود مصنف کا نسخہ ہے کہیں کہیں نسخے میں اختلاف بھی ہے[2]۔"

تذکرے کے سال تصنیف کے بارے میں شروانی صاحب کی رائے ہے کہ:

"تذکرۂ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی رموز العارفین ہے، گلزار ارم نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۸ ہجری ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ ہجری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا ہے[3]۔"

شروانی صاحب کی تحقیق کے مطابق میر حسن نے ۱۱۸۸ھ میں تذکرہ لکھنا شروع کیا اور اسے ۱۱۹۲ھ میں تمام کیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تذکرہ نے ۱۱۹۲ھ میں کتابی صورت اختیار کرلی تھی۔

عرشی صاحب شروانی صاحب کی رائے سے متفق ہیں کہ میر حسن نے اسے سنہ ۱۱۹۱ ہجری میں ختم کر دیا تھا اور بعد کے اضافوں میں صرف شاہ یقین کی وفات ہے جو ۱۱۹۲ ہجری میں واقع ہوئی تھی۔

تذکرہ شعرائے ہندی (نسخہ سلطان المدارس لکھنؤ) (تالیف میر حسن)

خوش قسمتی سے راقم الحروف کو تذکرۂ میر حسن کے دو نادر الوجود قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں کا ایک لکھنؤ کے مشہور و معروف عربی کالج سلطان المدارس اور دوسرا ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جہاں تک اول الذکر نسخے کا تعلق ہے اسے تمام نسخوں پر تقدم زمانی حاصل ہے۔ یہ اردو کے محسن عظیم اور لکھنؤ کے رئیس اعظم اسد الدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خاں بہادر فیل جنگ عرف آغا صاحب تخلص ترقی[4] کے کتاب خانے کی یادگار ہے

[1] عیار ستان ص۱۔ [2] دستور الفصاحت ص۱ حواشی۔ [3] تذکرۂ شعرائے اردو ص۱۔ [4] میرزا محمد تقی خاں ترقی نیشاپوری سید تھے۔ ان کے والد گرامی کا نام سید محمد امین تھا۔ ان کی شادی نواب برہان الملک (متوفی ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء) کی نواسی نجم النساء بیگم عرف کھیتو بیگم سے ہوئی تھی۔ اس طرح ترقی نواب موصوف کے نواسے تھے (قیصر التواریخ ص ۲۹ جلد اول مصنفہ سید کمال الدین حیدر)۔ ترقی کی ولادت فیض آباد میں ہوئی تھی اسی لیے تذکروں میں ان کا وطن فیض آباد درج کیا گیا ہے (بزم سخن ص ۲۸ سید علی حسن خاں، سراپا سخن ص ۵۶ سید محسن علی محسن)۔ نواب آصف الدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء) نے فیض آباد میں اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی تھی (قیصر التواریخ ص۲ جلد اول)۔ آصف الدولہ بہادر کی والدہ بہو بیگم صاحبہ نے اپنے رشتے کی ایک لڑکی لطف النساء بیگم کو منہ بولی بیٹی بنایا تھا جن کو بعد میں انھیں ترقی سے منسوب کیا۔ اس طرح وہ نواب وزیر الملک شجاع الدولہ کے داماد کہلاتے تھے۔ (قیصر التواریخ ص ۱۹۱) بہو بیگم نے ان کے لیے وصیت نامے میں وثیقہ بھی مقرر کیا تھا (قیصر التواریخ ص ۱۹۱)

ترقی بڑے باغ و بہار اور جاہ و جلال کے مالک تھے۔ ان کے دامن دولت سے فیض آباد اور لکھنؤ میں بہت سے شعراء وابستہ تھے (ریاض الفصحا ص ۴۵ مصحفی)۔ میر سوز (متوفی ۱۲۱۳ھ م ۱۷۹۸ء) کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ (سراپا سخن ص ۵۶)۔ انڈیا آفس اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ان کے دیوان کے دو نسخے موجود ہیں۔ ترقی کا انتقال ۱۲۴۶ ہجری مطابق ۱۸۳۰ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ مصحفی کے شاگرد مرزا علی نظر نے تاریخ کہی:

محمد تقی خاں بہادر کہ بود	بجود و شجاعت عدیم المثال
بحکم خدا زیں سرائے سپنج	سوئے باغ فردوس کرد انتقال
پئے سال تاریخ آں ذی شکوہ	چو کردم نظر از دل خود سوال

موصوف کے انتقال کے بعد یہ نسخہ ان کے بیٹے دلیر الدولہ[1] محمد علی خاں بہادر عرف آغا حیدر، فیروز جنگ کی ملکیت میں رہا۔ ان کے انتقال کے بعد نہ جانے اس بیش بہا کتاب خانے کا کیا حشر ہوا، چند نادر کتابیں جن میں تذکرۂ میر حسن بھی شامل ہے، سلطان المدارس کے کتاب خانے کی زینت بن گئی ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمد تقی خاں ترقی نواب شجاع الدولہ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر (متوفی ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۷ء) کے قرابت داروں میں تھے۔ میر حسن فیض آباد میں سالار جنگ کی رفاقت میں رہتے تھے[2] اور انھیں ترقی کے خاندان سے والہانہ محبت تھی۔ بقول میر شیر علی افسوس (متوفی ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء) ان کے دو فرزند میر مستحسن خلیق (متوفی ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء) اور میر محسن محسن بہو بیگم صاحبہ (متوفی ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۶ء) کے داماد میرزا محمد تقی خاں ترقی کی رفاقت میں رہتے تھے[3]۔ آزاد کی تحقیق کے مطابق میر خلیق پندرہ روپے ماہانہ پر ترقی کے ملازم تھے[4]۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر حسن اور ترقی کے خاندانی تعلقات کس قدر استوار تھے۔ اس لیے تذکرۂ میر حسن کا ترقی کے خاندان میں پہنچنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

نسخۂ سلطان المدارس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تذکرۂ میر حسن کا قدیم ترین مخطوطہ ہے اور غالباً مصنف کے ہاتھ ہی کا مکتوبہ ہے۔ اگر یہ کسی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوتا تو پھر اس میں کہیں نہ کہیں کاتب کا نام یا تاریخ کتابت بھی درج ہوتی۔ پورا نسخہ ابتدا سے آخر تک ایک ہی کاتب کے ہاتھ کا ہے۔

اس مخطوطے سے یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دراصل تذکرے کا پہلا نسخہ ۱۱۸۸ ہجری میں کتابی صورت میں مرتب ہوا تھا۔ میر حسن کہتے ہیں کہ:

"الحمد للہ والمنۃ کہ ایں تذکرہ من تالیف فقیر حقیر پروردۂ آغوشِ رنج و محن یک ہزار یک صد و ہشتاد ہجری باتمام رسید"۔ (ورق ۱۷۹ الف)

نسخۂ سلطان المدارس کی تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر مخطوطہ ۹۵، سائز ۵½ × ۹، اوراق ۱۷۹، سطر ۱۱، خط نستعلیق۔

ابتدا میں سادہ کاغذ کا ورق ہے۔ اس کے بائیں طرف اوپر کے کونے پر سیاہ روشنائی سے "تذکرۂ شعرائے ہندی تالیف میر حسن" کے الفاظ نہایت خوش خط درج ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ۱½×۲ سنٹی میٹر سائز کی تقریباً چوکور مہر بھی ثبت ہے جس میں پورا نام صاف طور پر نہیں پڑھا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے نچلے حصے میں "امیر دوراں ......" اور کچھ مبہم حروف اور اوپر "سالار جنگ" کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں "سالار جنگ" کے بائیں کونے میں ۱۱۷۵ھ (مطابق ۱۷۶۱ء) کا سال نمایاں طور درج ہے۔ مہر کی ساخت یوں ہے:

جنگ سالار ۱۱۷۵
امیر دوراں

تذکرۂ شعرائے ہندی تالیف
میر حسن

(بقیہ حاشیہ) ... ہماں دم خرد از سر علم گفت — برفت از زماں قدر دانِ کمال

(۱۲۴۶ھ دیوان نظر قلمی و غیر مطبوعہ)

[1] دلیر الدولہ تخلص حیدر، برق (متوفی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء) کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مرزا غالب کے ساتھ گہرے مراسم تھے (کلیات نثر غالب ص ۱۰۵ مطبوعہ ۱۸۶۸ء نولکشور) ان کا انتقال ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ اسیر لکھنوی نے تاریخ کہی ؎

دلیرے کہ از دلش بود شہرت — شجاعے کہ مشہور ہمنام حیدر
بتاریخ فوتش ندا کرد ہاتف — کہ جا یافت حیدر بقرب پیمبر

(دیوان اسیر ص ۸۰۴ مطبوعہ ۱۸۷۰ء)

[2] عمدۂ منتخبہ ص ۱۶۸، اعظم الدولہ [3] دیباچہ مثنوی سحر البیان مطبوعہ ۱۸۰۳ء کلکتہ [4] آب حیات ص ۲۷۹ مطبوعہ ۱۹۲۲ء الہ آباد

آغاز تذکرہ میں مصنف کا دیباچہ ہے جو ورق ۲ب میں چوتھی سطر کے وسط میں ختم ہوتا ہے۔ پھر ساتھ ہی اسی سطر میں حرف الف کے تحت آرزو کا ترجمہ ذیل کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"اذ اکر خان مغفرت نشان استاد استادان ہندوستان
سر گروہ سخن سنجان چراغ دودمان گفتگو شیخ سراج الدین
علی خان آرزو . . . . . . "

تذکرہ حرف ی، پر خاتمہ سے قبل حکیم یونس کے ترجمہ کے بعد ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

بعضے از اشعار کہ قابل نوشتن تذکرہ بودند
نام شاعر معلوم نیست دریں جا نیز ثبت می نماید[51]
توحید عشق کے موں اثبات کو نہ پوچھو باقی رہا فنا سے جن نے جبی ہے ملا
از لفظ "موں" معلوم شود کہ ایں شعر از قدیم باشد
عبث تو بیکسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دلا نے عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے[52]
اغلب است کہ ایں شعر از مسلک متوسطین باشد"

یہ عبارت ورق ۱۷۹-الف کی تیسری سطر کے وسط میں ختم ہوتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی اسی سطر میں "خاتمہ" درج ہے جو ورق ۱۷۹ ب کے نصف سے زیادہ صفحہ پر مشتمل ہے۔

نسخۂ سلطان المدارس میں ۱۹۵ شعرا کا حال حروف تہجی میں درج ہے۔ ان میں سے تین شاعر (۱) فضلی (۱۴۴ب) (۲) مرزا حسین بخش فراق (ورق ۱۱۶ الف) اور (۳) کھتری (ورق ۲۶۰ الف) مطبوعہ اور نسخۂ ندوۃ العلما میں غائب ہیں۔ یہ اب پہلی مرتبہ دریافت ہوئے ہیں۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مصنف نے ۱۱۸۸ ہجری تک کے شعرا میں اردو کے مشہور و معروف شاعر مصحفی کو تذکرۂ ہذا میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس زمانے میں مصحفی کی عمر ۲۴ سال سے کم تھی۔ عرشی صاحب تذکرے (مطبوعہ) کے سال آغاز کے تعین کے سلسلے میں کہتے ہیں:

"مصحفی نے لکھنؤ کا یہ سفر ۱۱۸۵ ہجری (مطابق ۱۷۷۱ء) میں سکرتال کی جنگ کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا حال بھی ۱۱۸۴ ہجری (مطابق ۱۷۷۰ء) کے لگ بھگ لکھا گیا ہے[53]"

راقم کی رائے میں میر حسن نے مصحفی کا ترجمہ ۱۱۸۸ ہجری کے بعد لکھا ہے۔ اگر اس سے قبل لکھتے تو ضرور نسخۂ سلطان المدارس میں درج ہوتا۔ عرشی صاحب کا یہ فرمانا درست ہے کہ میر حسن نے تذکرہ کا کام ۱۱۸۴ ہجری کے لگ بھگ شروع کیا تھا۔

زیر بحث نسخہ میں نئی اور مفید اطلاعیں بکثرت ملتی ہیں جو ذیل میں چند شعراء کے سلسلے میں مختصراً درج کی جاتی ہیں:

(۱) آرزو - چوں مشاعرہ در خانۂ او مقرر بود خودہم دوسہ ریختہ فرمود (ورق ۱۲ الف)

(۲) جوشش - شنیدہ ام کہ اوہم در تالیف تذکرہ مشغول است (۱۳۵ الف)

(۳) حاتم - بندہ اورا در شاہ جہان آباد دیدہ متقدمین وضع بود (۲۹ الف)

(۴) خاکسار - حالا پسرش با فقیر آشنا است مردے متواضع و مودب است

البتہ پدرش بہتر خواہد بود خدایش بیامرزد شنیدہ شد کہ تذکرہ درہماں عصر علی الرغم تذکرۂ میر تقی نوشتہ و احوال خود را محستہ معشوق کسے کنبودہ بودہ کہ او را می خواست رقم نمودہ۔ فکرش خالی از دردمندی نیست خدایش بیامرزد — (۴۵ الف و ب)

---

[51] یہ نثری عبارت لال روشنائی میں درج ہے۔ [52] مطبوعہ نسخہ ص ۱۹۹ میں یہ شعر یکرنگ کے نام سے درج ہے۔
[53] دستور الفصاحت ص ۶۸ حواشی (مصحفی اس مرتبہ لکھنؤ (صحیح فیض آباد) میں ایک ہی سال رہے تھے۔ وہ دوبارہ دہلی سے لکھنؤ ۱۱۹۸ھ میں گئے تھے (ریاض الفصحا)

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اپنی رہائش گاہ پر ۳۱ مئی ۱۹۷۶ء کو مانٹیریل اولمپک کے لیے منتخب ہندستانی ہاکی ٹیم کے ممبروں کے ساتھ

وزیراعلا شری نرائن دت تیواری سیتاپور سے ۴۰ کیلومیٹر دور موضع کلتاج پور
میں ۲۶ جون ۱۹۷۶ء کو بے زمینوں کو زرعی آلات اور بیل قرض کی شکل میں
تقسیم کرتے ہوئے
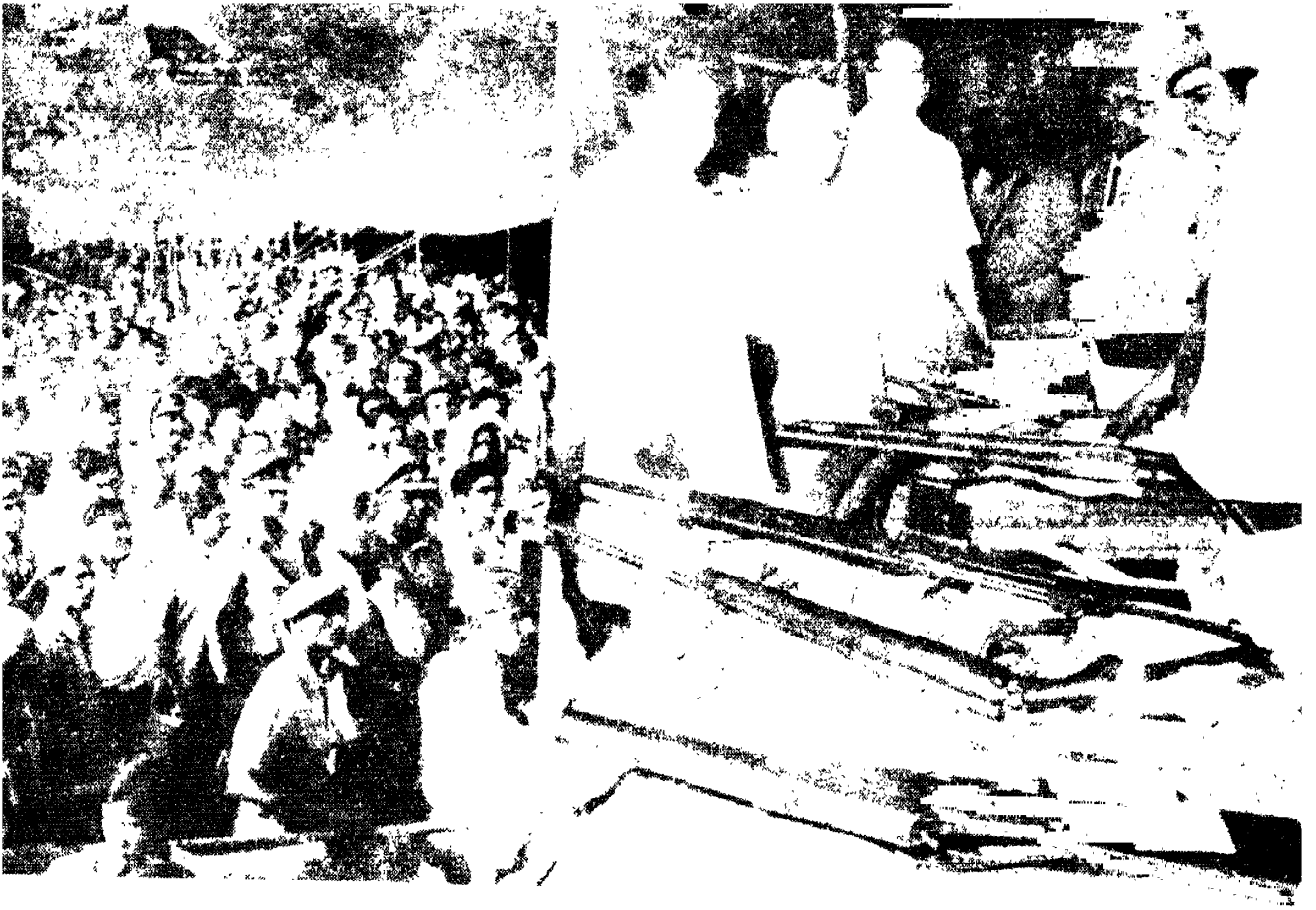
(اوپر دائیں) بٹیشور ضلع آگرہ میں "باغی بھائیوں" (سابق ڈاکوؤں) نے ۳ جون ۱۹۷۲ء کو وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کے سامنے ہتھیار ڈالے — داہنی جانب تصویر میں ان میں سے کچھ ہتھیار دیکھے جا سکتے ہیں۔۔۔۔۔

(اوپر بائیں) وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۱۹ جون ۱۹۷۶ء کو کلیان پور (کانپور) ترقیاتی بلاک کے چکرپور گاؤں میں بے زمینوں کو الاٹ کیے گئے کھیت پر ہل چلا رہے ہیں۔

(وسط میں) وزیر اعلا ۲۲ جون ۱۹۷۶ء کو فیض آباد کو آپریٹیو فیڈریشن کے واحدے "ساکیت دگدھ شالا" کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے، بائیں: دگدھ شالا کی عمارت کا ماڈل
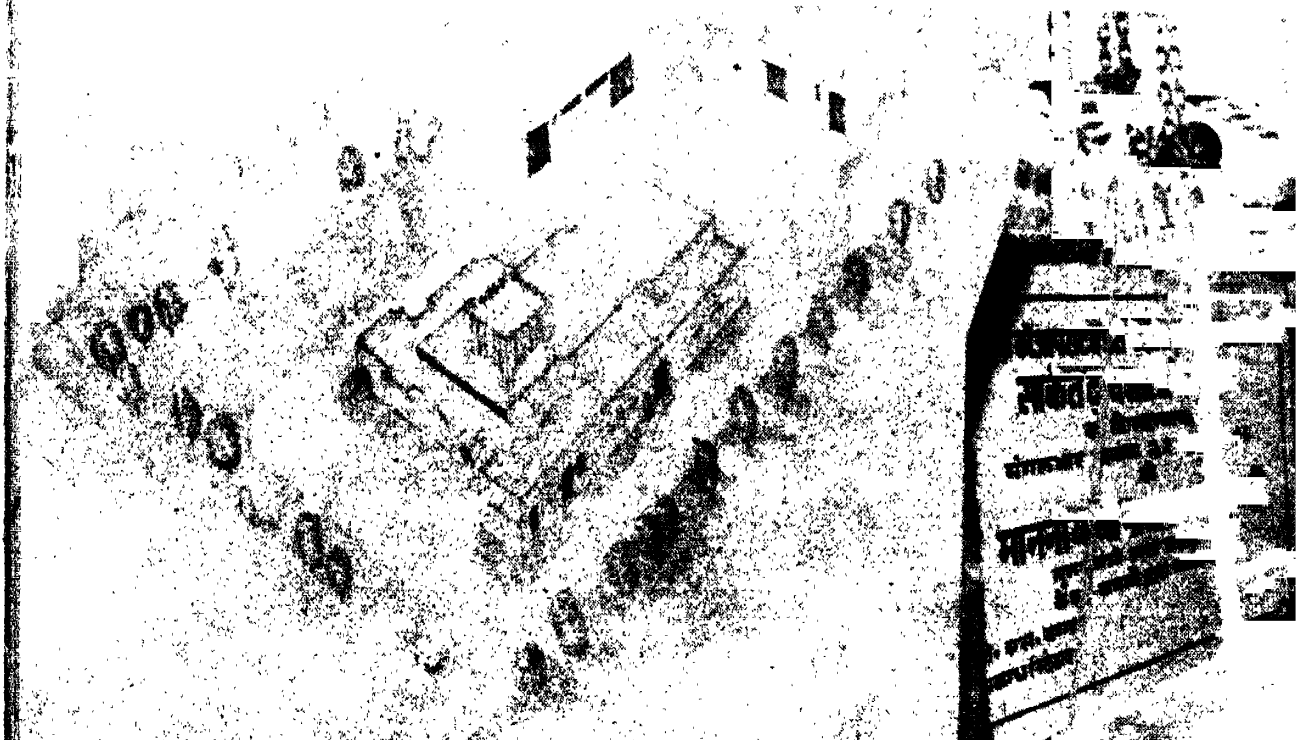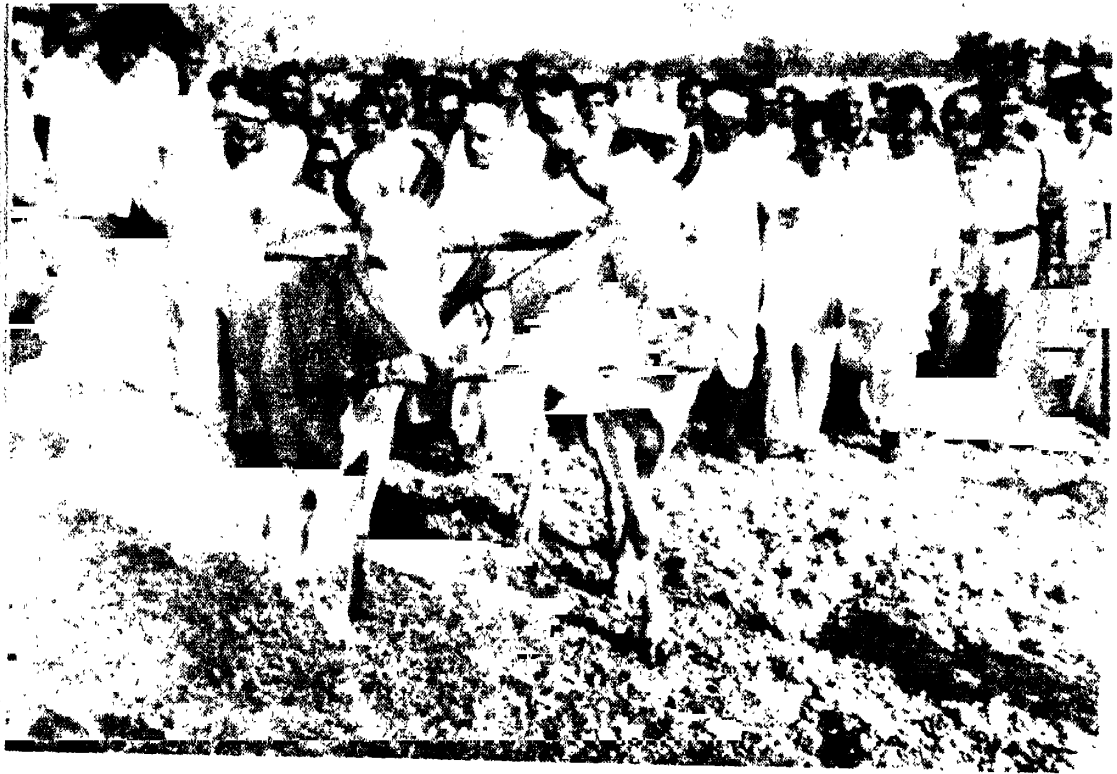
وزیر ریاست شری رمیندر ورما ۲۴ جون ۱۹۷۶ء کو ضلع لکھنؤ کے ملیح آباد بلاک میں اجتماعی ٹی وی مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے

ضلع اناؤ میں اجتماعی جوتائی کا ایک منظر

(۵) دَرد - بندہ در صغر سن بخدمت او رسیدہ دارستہ مزاج و آشنائے درست و متواضع، غرضکہ مجموعہ خوبی ہاست رباعیات فارسی ہم بسیار مشہور است کہ ثانی نہ دارد۔ و کتاب فارسی مسمی بنام دارد، در مقدمۂ توحید و تصوف تصنیف نمودہ کہ شرحش برادر او کہ اثر تخلص می نماید مسمی بہ توارد نوشتہ قابل دیدن و فہمیدن است (۵۸ الف و ب)

(۶) سعدی - از دکن است مردم ایں را گمان شیخ سعدی بردہ اند خطاست (۷۷ الف)

(۷) کافر - ایں ہر دو شعر او از فارسی است۔ وقتے کہ جنون تخلص می کرد گفتہ ؎

از کعبہ و بتخانہ جنون فرق ندارد سنگیں لِ ما، کافرِ ما، برہمنِ ما

(۱۲۶ الف)

در وقتیکہ تسکین تخلص نمود گفتہ ؎

دل دیوانہ از فرط محبت شادی دارد
گر تسکین غم از بہر مبارک بادی آید

(۸) میر - طرزش مانا بطرز شفائی۔ چنانچہ در مقدمۂ استادی خود فرمودہ ؎

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا ہے اس کا معتقد کون نہیں میر کی استادی کا
دلیل بر طرز شفائی او روشن ؎

تھی غزل میر یہ شفائی کی ہم نے بھی طبع آزمائی کی

از چندے در شاہ جہان آباد است۔ استقامت ورزیدہ جوان محمد شاہی است۔ الحال ہم پیش ناگرمل در شاہ جہان آباد سکونت دارد لیکن شنیدہ ام کہ اکنوں لباس فقیری پوشیدہ از جہاں عزلت گزیدہ۔ (ورق ۱۴۴ الف)

(۹) معین - بیشتر شعر خود را بخدمت میر سوز می برد الحال خود را از تلامذہ اے مرزا رفیع می شمارد .... غرض مرد خوش است مثل او ہم طبع پیدا نیست۔ در مقدمۂ آب بر قصیدہ خوب گفتہ و ہجو کشمیری نیز خوب کردہ۔ بوسیلۂ شاعری بسر می برد۔ (۱۵۲ الف)

(۱۰) ولی - مردے بود از متقدمین عالمگیری، اصلش از خاک اورنگ آباد۔ اگرچہ در زبانِ اردوئے معلی تفاوت زمین و آسمان دارد، لیکن اکثر در آنہا کہ موافق محاورہ یافتہ شد، بنا بر تیمناً و تبرکاً بقلم آورد۔ (ورق ۱۵۹ اب)

غرضیکہ اس نسخہ میں اکثر و بیشتر شعراء کے بارے میں بیش بہا اور نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ میر حسن نے تذکرہ میں جن ماخذوں کا ذکر کیا ہے ان میں تذکرۂ آرزو، تذکرۂ میر، اور تذکرۂ قائم قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر استفادہ تذکرۂ میر سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک معمولی مثال فغاں کی پیش کی جاتی ہے۔ میر حسن ان کے ترجمے میں زیادہ تر ان ہی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو تذکرۂ میر میں درج ہیں۔ اس قسم کے واقعات مطبوعہ نسخے میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

فغاں - .... داخل ذیل نیچۂ امرایان بودہ بسیار جوان قابل شعر ریختہ را بخوبی می گفت بطور خود گاہے فکر غزل فارسی ہم می کرد۔ اصلش از شاہ جہان آباد بودہ طبع لطیفش مائل بہ لطیفہ بسیار بودہ، چنانچہ ناگرمل را دیوان تن در دخیل سرکار پادشاہت "گھی کی منڈی کا سانڈ" گفتہ و حکیم معصوم را در دربار معلی "گاؤ گجراتی" نام نہادہ۔ ہر کہ ایں ہر دو را دیدہ باشد، بداند کہ چہ مناسب گفتہ" (ورق ۱۰۶ الف)

اب میر کی زبانی فغاں کا حال ملاحظہ ہو:

فغاں - .... داخل ذیل نیچۂ امرایان است۔ بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا، شعر ریختہ را بخوبی می گوید۔ گاہے فکر غزل فارسی ہم می کند، شاگرد قزلباش خان امید مرحوم است در ایام طبع او مائل لطیفہ بسیار است۔ چنانچہ ناگرمل را "دیوان تن و دخیل بادشاہیت "گھی کی منڈی کا سانڈ" گفتہ، ہر کہ دیدہ دیدہ باشد و فہمیدہ باشد۔ و حکیم معصوم را در دربار معلی "گاؤ گجراتی" نام کردہ (مطبوعہ ۱۲۷)

نکات الشعرا[1]

نسخۂ سلطان المدارس اور نسخہ ہائے مطبوعہ مدودہ کے ...... اختلاف پایا جاتا ہے۔ اول الذکر نسخے میں جہاں تک

معلوم ہوسکا مصنف نے صحت متن کا خیال رکھا ہے۔ اس میں شعراء کے حالات زندگی زیادہ اور اشعار کی کافی تعداد موجود ہے۔ آبرو (۳ ب) بیاں (۲۱ الف) جرات (۳۷ الف) درد مند (۵۵ ب) میر درد (۵۸ الف، ب) سودا (۸۲ الف) فغاں (۱۰۶ الف) میر تقی میر (۱۴۳ آ) وغیرہ کے اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار موخرالذکر نسخوں یا کسی اور تذکرہ میں درج نہیں ہیں۔ یہ سبھی اشعار ترتیب دواوین کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ ذیل میں صرف نمونے کے طور پر میر حسن مولف تذکرۂ ہذا کے متعلق اختلاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کے ترجمے میں جو اشعار درج کیے جاتے ہیں وہ مطبوعہ (م) اور ندوہ (ن) کے نسخوں میں غائب ہیں۔ سب سے پہلے دیباچے میں ہی نام کا اختلاف ہے۔ مطبوعہ اور ندوہ کے نسخوں میں میر غلام حسن درج ہے:

"این پروردۂ آغوش رنج ومحن، اسیر دارالحزن میر غلام حسن ...... (صفحہ ۲)

نسخۂ سلطان المدارس میں مصنف کا نام میر محمد حسن درج ہے، (ورق ا ب) اس تذکرے میں جابجا حیرت انگیز انکشافات کیے گئے ہیں۔ میر حسن کے حالات زندگی کے بارے میں بھی نئی معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولف تذکرہ نے اپنا نام میر محمد حسن اور اپنے پردادا کا اسم گرامی میر ہدایت اللہ بیان کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میر ہدایت اللہ کا نام پہلی مرتبہ صفحۂ تاریخ پر ابھر آیا ہے۔ نسخۂ مطبوعہ اور ندوہ میں ان کے پردادا کا نام میر امامی درج ہے عبارت یہ ہے:

"پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن میر غلام حسین ولد میر عزیز اللہ ابن میر امامی ہروی است۔"

زیر نظر تذکرہ سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ میر حسن ابتدا میں فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی ایک فارسی رباعی بھی تذکرۂ ہذا میں درج ہے۔ جب میر ضاحک نے یہ رباعی شیخ علی حزیں کو سنائی تو وہ محظوظ ہوے۔ انھوں نے میر حسن کے حق میں دعا فرمائی۔ تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے ۵۸ھ ۱۱ہجری تک تقریباً دس ہزار شعر کہے تھے۔ اس تذکرہ میں ان کے ۵۴ شعر بھی زیادہ ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض اشعار پہلی مرتبہ سامنے آرہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے یہ تذکرہ اپنے مربی نواب سالار جنگ کے لیے بڑے اہتمام سے لکھا تھا۔ اس نسخے میں ان کا ترجمہ ان الفاظ میں درج ہے۔ خط کشیدہ الفاظ اور قوسین کی عبارت میں اختلاف ہے یہ الفاظ اور عبارتیں نسخۂ سلطان المدارس میں زائد ہیں

ورق ۴۶ ب تا ۴۷ الف

"میر محمد حسن۔ پارۂ احوال این فقیر مولف کتاب بر سخنوران شاعر و دانش وران ماہر پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن میر غلام حسین بن میر عزیز اللہ ابن میر ہدایت اللہ بن میر امامی ہروی از ہرات است (میر امامی ہروی نور اللہ مرقدہ در شاہ جہاں آباد آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند۔ فاضل متبحر و فقیہ بے مثال و ہفت قلم بودند و شعر ہم گاہ گاہ می فرمودند) پس این عاجز سخن را سررشتۂ شاعری اجدادیست نہ امروزی، حاصل کہ صغیر سن میلان طبیعت این فقیر بطرف سخن بیشتر بود۔ بارے حق تعالیٰ درین فن کم و بیش موافق ظرف استعداد و قبولیت بخشید۔

(اول این رباعی فارسی گفتہ بودم۔ چنانچہ از زبان قبلہ گاہی، شیخ صاحب، شیخ علی حزیں نور اللہ مرقدہ شنیدہ محظوظ شدند و دعا در حق این عاصی نمودند، شاید کہ این نتیجہ دعاے آن بزرگوار باشد کہ توفیق سخن یافتم یا از فیض صحبت میر ضیا سلمہ اللہ کہ اصلاح حرفی و معنوی از ایشاں گرفتم)

لیکن کما حقہ طرز سخن ایشان از من سرانجام نہ یافتہ۔ ہر قدر دیگر بزرگان است مثل حضرت خواجہ میر درد و مرزا رفیع و میر تقی پیروی نمودم۔ و آں رباعی این است۔

جمع نمودہ، چون مرزا دولت با شعر سخن ولی و میل رباعی نیز خود موزون کرد۔ بندہ ہمدستہ ملاقات با وی نمودہ حق تعالیٰ سلامت دارد از دست رباعی دنیا، بدلی کو جو کہ فانی سمجھی ہے اور قصہ عمر کو کہانی سمجھی ہے دریائی حقیقت کو ذرہ ہی جاری ہے جو مثل حباب زندگانی سمجھی ہے میر محمد حسن بارے از احوال این فقیر مولف کتاب بر سخن وران شاعر و دانشوران ماہر پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن میر غلام حسین بن میر عز یز اللہ ابن میر ہدایت اللہ بن میر امامی ہروی از سادات سنت میر امامی ہروی نور اللہ مرقدہ در شاہجہان آباد آمدہ بمنصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز کردیدند۔ فاضل متبحر و فقیہ نامثال و ہفت قلم بودند و شعر ہم گاہ گاہ میفرمودند بس این عاجز سخن را سررشتہ شاعری

جانا ز تو امید نگاہے داریم ۔ امید نگاہے ز تو گاہے داریم
ما کشتۂ چشم سرمہ سائیم حسنؔ نے نالہ و نہ فغاں نہ آہے داریم

بعدازیں رباعی فارسی مائل ریختہ گرہ دیدم کہ زبان خود بود۔

گردش روزگار ناہنجار کہ ہرگز بہ کسے وفا نہ کردہ بطرف لکھنؤ فیض آباد رسیدم۔ بارے (دریں زمانہ کہ کسے از قابلیت کسے و سخن فہمی سروکارے نہ دارد) کم و بیش از قدردانی نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ بلب نان رسیدہ در خدمت مرزا نوازش علی خاں سردار جنگ بہادر کہ خلف ارجمند اوست صحبت گزیدم۔ چنانچہ تا حال بہر حال گزراں می نمائم (اکثر بفرمائش نواب معلی القاب مرثیہ نیز بگفتن می آید کہ طبع عالیش در ہمہ فن

ابداد بنت نامر درزی حاصل کہ از صغر سن میلان طبیعت این فقیر بطرف سخن بیشتر بود باری حق تعالیٰ درین فن کم و بیش موافق ظرف استعداد قبولیت بخشید اول این رباعی فارسی گفتہ بودم چنانچہ از زبان قبلہ گاہی شیخ صاحب شیخ عاجز بن نور اللہ مرقدہ شنیدہ محظوظ شدند و دعا در حق اینجانبی نمودند شاید کہ این نتیجہ دعا آن بزرگوار باشد کہ توفیق سخن یافتم باز از فیض صحبت مرزا رسلمہ اللہ کہ اصلاح عروضی و معنوی از ایشان گرفتم لیکن کا حقہ طرز سخن ایشان از من سرانجام نیافتہ بر قدم دیگر بزرگان ہست مثل حضرت خواجہ میر درد و مرزا رفیع و میر تقی پیروی نمودم و آن رباعی اینست رباعی جانا ز تو امید نگاہی داریم امید نگاہی ز تو گاہی داریم ما کشتۂ چشم

چنیں بلند افتادہ کہ از حصر و بیاں بیرون ست، علی الخصوص در موسیقی کہ سوز ہائے مرثیہ تصنیف می فرمایند و ایں حسنہ برائے آخرت است۔ حقا کہ دریں فن بعد از امیر خسروؔ دہلوی تا حال چنیں صاحب کمال بر نہ خاستہ بلکہ از دہم سبقت فرمودہ و ایں فن را بجائے صرف نمودہ کہ نتیجہ آخرت گردید و سردار جنگ بہادر نیز بطور پدر بزرگوار دریں کار ذہن رسا دارند۔ حق تعالیٰ امعہ فرزندان عمر و دولت ایشاں را تا جہان ست قائم دارد ۔ بالنبی والہ الامجاد۔

(فقیر دریں مدت قریب دہ ہزار بیت مع رموز العارفین و ترکیب بند کہ پسند سخن سنجان گردیدہ و مشہور گفتہ باشد۔ اول

چند اشعار برائے یادگار از دیوان خود در ذیل ایں بزرگان ،
مسطور می نماید شاید کہ مقبول دلہا گردد) بیت. سہ

گرچہ از نیکاں نہ ام خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

(درج ذیل اشعار مطبوعہ اور ندوہ کے نسخوں میں غائب ہیں)

مرنے کے بعد گل کی ہوا و ہوس کے بیچ
بلبل کے پر بھی اڑتے ہیں کنج قفس کے بیچ

ہاں دل تو چاہتا ہے کہ تجھ کو کوئی کچھ کہے
موجود ہوں یہ بات تو کہنے کو دس کے بیچ

اب کہاں لطف یار اور اخلاص
تھا کبھی ہم سے پیار اور اخلاص

شمع ساں شب کے میہماں ہیں ہم
صبح ہوتے تو پھر کہاں ہیں ہم

باغباں تک تو بیٹھنے دے کہیں
آہ گم کردہ آشیاں ہیں ہم

پھر گل کے تو وعدہ پہ لگا کھانے قسم آج
کیا بھول گئیں اپنی تجھے کل کی وہ قسمیں

ہم نہ ہنستے ہیں اور نہ روتے ہیں — عمر حیرت میں اپنی کھوتے ہیں
کو کس حیرت ہے جنبش ہر دم — آہ تس پر بھی یار سوتے ہیں

رازِ دل کہتے تو ہر اک سے کہا میں نے پر اب
مجھ کو یہ ڈر ہے کہ وے ہر کہیں رسوا نہ کریں

کچھ ہو نہ ہو دلے ہو ترا خیال ہر دم
اس بن نہیں گزرتی ، اس بن نہیں گزرتی

خوبی چمن میں دیکھ نسیم بہار کی — کس کس طرح سے آئی ہوا دل میں یار کی
دل ساتھ رنگ کے جو گیا سو پھر نہ پھر — سینے سے گرچہ نالے نے کتنی پکار کی

پھر پھر کے ہم نشین نہ دلا یاد اس کی بس
ہم سن چکے خبر دل زار و نزار کی

چھیڑی دل حزیں نے جو شب بات وصل کی
باتوں میں رات یوں کٹی جوں رات وصل کی

عشق کے جب سے پیچ و تاب میں ہیں
تب سے تو نپٹ عذاب میں ہیں

نسخۂ دل کو سرسری مت دیکھ
سینکڑوں علم اس کتاب میں ہیں

دلدار و دل اس طرح ہم آئے نظر میں
جس طرح گہر آب میں اور آب گہر میں

ہر چند کہ ہے شام و سحر وہی پر اس بن
وہ لطف نہ اب شام میں ہے اور نہ سحر میں

صبا اب سوگ ہے کس کا چمن میں عندلیبوں کو
پڑے ہیں برگ گل سے جو یہ منہ پر لے کے رومالوں

نگہ سے چشم سے ناز و ادا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

یہ کس کا روٹھنا ملنا حسن کہہ یاد آتا ہے
کہ تو آپ ہی خفا ہوتا ہے آپ ہی مسکراتا ہے

دور سے باغ جہاں دکھلا کے دیوانہ کیا
متصل جانے نہ پایا میں کہ ویرانہ کیا

طرفہ تر یہ ہے کہ اپنا بھی نہ جانا اور یونہی
اپنا اپنا کہہ کے مجھ کو سب سے بیگانہ کیا

دیکھنے بیٹھا جو وہ سر اپنے گھر کی چاندنی
جب تلک بیٹھا رہا تب تک سر کی چاندنی

ایک شب تو پھر آ آنکھیں تو بس ہو گئیں سفید
کب تلک دیکھا کریں اجڑنے نگر کی چاندنی

اگر اس کے آنے کے کچھ طور ٹھہرے — تو یہ جاں بلب ایک دم اور ٹھہرے
اک ذرا تم تو بیٹھ کر اٹھ گئے — رات ہم نے تڑپ تڑپ کاٹی

جوں شمع استخواں مرے آہوں سے جل گئے — اعضا تمام اشک ہو آنکھوں سے ڈھل گئے
غیرت تو نے چلی تھی گلی سے تری ہمیں — پر دل کے کہنے سننے سے کچھ بھی سنبھل گئے

اب تو کیا پوچھے ہے تب درد و الم رہتے تھے
جب ترے گم شدگاں آپ میں ہم رہتے تھے

یملہ سیکڑوں کوسوں کا پڑا اُسسے اب آہ

ہوگیا وہ بھی زیبانہ جو باہم رہتے تھے

نیا ہے نہ مجھ پاس مری جان نہ دین ہے

ایک تو ہے سو کچھ ترا بھروسا بھی نہیں ہے

صبر کہ تو ڈھونڈے ہے سو ہم میں نہیں ہے

یہ اور ہی عالم ہے کہ عالم میں نہیں ہے

ں زخم پہ ہاتھ اس کا لگا بس وہ بھر آیا

یہ دستِ شفا تو کسی مرہم میں نہیں ہے

میان تیغ ،نظ جب تہہ ابرو ہی نہ ہو

حسن اور عشق کا قصہ کبھی یکسو ہی نہ ہو

سے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں

جی دھڑک جاتا ہے مرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

لبر سے ہم اپنے جب ملیں گے اس گمشدہ دل سے تب ملیں گے

اہر ہیں تو ڈھب نہیں ہے کوئی ہم یار سے کس سبب ملیں گے

دستاں مجھ کو تم اس شوخ تلک جا۔ نہ دو

عشق کرنے کا مزا پھر تو ذرا پانے دو

یا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

ہلی دل کی اسکے جس کا گھر ہے کسی کے گھر کی ہم کو کیا خبر ہے

یں کچھ وہ نہیں ہیں آہ ورنہ وہی ہے شام اور وہی سحر میں

دل کو اپنی لیلیٰ کا محمل عزیز ہے تو دل میں ہو یہاں ہیں دل عزیز ہے

دریا میں ڈوب جاوے کہ یا چاہ میں پڑے

اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے

یا کہیں شتاب کہ مانند نقش پا تکتے ہیں راہ تیری سر راہ میں پڑے

ۂ سلطان المدارس میں سبھی شعرا کے نام اور تخلص لال روشنائی سے

رج ہیں۔ بعض شعرا کے حالات بھی اسی روشنائی میں مندرج ہیں۔

ن میں سے چند یہ ہیں :۔

غریب، کہتری، مجنت، مستمند، مسافر، محب، میر محمد نعیم اللہ

ان مرزائی، محزون الہ آبادی، منت، مخلص، مشتاق، منزار، نظا، نامی،

ارش الہ آبادی، وحشت، شاہ واقف، میر ہدایت اللہ ہدایت۔

انتخاب کلام میں بھی ہر شعر کے دو مصرعوں کے درمیان لال روشنائی

سے نشان امتیاز (سہ) رکھا گیا ہے تاکہ دونوں مصرعے آپس میں خلط

ملط نہ ہوں۔ جہاں اشعار کے درمیان کوئی قطعہ یا رباعی لکھنے کی ضرورت

پڑی تو کاتب نے اسے بھی لال روشنائی سے نمایاں طور پر لکھا۔ پوری کتاب

لال جدول سے آراستہ ہے اور مکمل طور پر بڑی صفائی اور نفاست سے

لکھی گئی ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی ممدوح یا سرپرست کے لیے

بڑے اہتمام سے لکھی گئی۔

کتاب کی ابتدا میں ورق ۱۲ ب کے آخر میں میر آثم کے ترجمے

کے ان الفاظ " این غزل را بسر ش میر ماتی مخمس نمودہ وخوب نمودہ" کے

بعد ۴ اوراق خالی ہیں۔ پھر ایک ورق خالی ہے۔ یہ خالی صفحے تذکرہ

پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں کیونکہ صفحوں کے متن کی عبارت مکمل ہے۔

تذکرے میں املا کی بعض معمولی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے

طور پر چند غلطیاں درج کی جاتی ہیں :۔

مسنوی (مثنوی)، طلامزہ (تلامذہ)، حاظم (حاتم)، متوصلان

(متوسلان)، اکسر (اکثر)، تور (طور)، انتخواب (انتخاب)

تذکرۃ الشعرا، تالیف میر حسن (نسخہ ندوۃ العلما)

تذکرۂ میر حسن کا جو قلمی نسخہ ندوۃ العلما، لکھنؤ کے کتاب خانے

میں موجود ہے وہ بھی اہم اور کارآمد ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

نمبر مخطوطہ ۴، سائز ۸ × ۵، اوراق ۱۶۱ ب، خط نستعلیق،

سطر ۱۳۔ یہ نسخہ علامہ شبلی کی کتاب خانے کی یادگار ہے جو انھوں

نے بعد میں ندوۃ العلما کے لیے وقف کر لیا تھا۔ دیباچہ مصنف سے قبل

صفحۂ اول کی پیشانی پر شبلی کے ہاتھ کی یہ تحریر بھی درج ہے۔

"تذکرۃ الشعرا، از میر حسن مصنف مثنوی بدر منیر وجد میر انیس ۱۲

شبلی ۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء"

ابتدا میں دیباچۂ مصنف ہے۔ پھر حروف تہجی میں حالات شعرا درج

ہیں۔ تمام شعرا کے نام اور تخلص لال روشنائی میں لکھے گئے۔ تذکرہ

کا آغاز بادشاہ شاہ عالم تخلص آفتاب سے ہوتا ہے اور آخر میں ردیف

دال میں محمد علی وہم کے حال میں ورق ۱۴۲ ب پر ان اشعار پر ختم ہوتا ہے۔

صبر و ہوش و قرار و تاب و تواں چل بسے رفتہ رفتہ سب کوئی

مرتے ہیں تب جو پاتے ہیں آرام نہیں مرتا ہے بے سبب کوئی

اس کے بعد نصف سے زیادہ صفحہ خالی ہے اور پھر دو ورق خالی ہیں یہ غالباً حروف ی اور ی کے شعرا کے لیے رکھے ہوں گے۔ ورق ۱۴۴ ب سے مثنوی گلزار ارم شروع ہوتی ہے۔ مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے

زبس وصف گل و گلشن بہم ہے سو اس کا نام گلزار ارم ہے

ترقیمہ میں کاتب کا نام یا تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ صرف اتنی سی عبارت ہے:

"تمت تمام شد این مثنوی مسمّی بہ گلزار ارم تصنیف میر غلام حسن
ابن غلام حسین بن عزیز اللہ المتخلص بہ حسن"

تذکرہ اور مثنوی ایک ہی جلد میں مجلد ہے اور پوری کتاب ایک ہی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ کتابت بڑی شاندار جدول سے مزین ہے۔

نسخۂ ندوہ بڑا خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اس میں اور مطبوعہ نسخے میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ متن میں کہیں کہیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ راقم نے جب نسخۂ سلطان المدارس کا مقابلہ مطبوعہ اور ندوہ کے نسخوں سے کیا تو متنوں میں بڑا فرق نظر آیا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ تذکرۂ میر حسن از سر نو ترتیب دیا جائے تاکہ صحیح متن سامنے آجائے۔ اس ترتیب نو میں سلطان المدارس کا قدیم ترین نسخہ ہی بنیاد بنایا گیا ہے جو شعرا اس میں درج نہیں ہیں وہ مطبوعہ نسخہ سے شامل کیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں تینوں نسخوں میں اختلاف یا اشعار کی تعداد میں کمی و بیشی نظر آئی اس کی نشاندہی فٹ نوٹ میں کی گئی ہے۔ متن میں قوسین یا خط کشیدہ الفاظ کا اندراج جن جن مقامات پر ہے ان کی بھی فٹ نوٹ میں امکانی طور پر وضاحت کی گئی ہے۔

★

سراج مرزاپوری

اگست ہے

تنویرِ آفتاب کا پیکر اگست ہے
حسنِ مہ و نجوم کا منظر اگست ہے
چرخِ سیہ پہ نور کا گھیرا اگست ہے
یعنی شبِ الم کا سویرا اگست ہے

جلوہ نمائے حسنِ عقیدت اگست ہے
آئینۂ خلوص و محبت اگست ہے
احساسِ زندگی کا تبسم اگست ہے
جذباتِ زندگی کا ترنم اگست ہے

دیر و حرم کا حسن نمایاں اگست ہے
اہلِ وطن کا حاصلِ ایماں اگست ہے
عزم و عمل کے ذہن کا پردہ اگست ہے
تصویرِ انقلاب کا جلوہ اگست ہے

ٹیگور کا نشانۂ منزل اگست ہے
باپو کی سعیٔ زیست کا حاصل اگست ہے
افسانۂ سبھاش کا عنواں اگست ہے
نہرو کی حسرتوں کا گلستاں اگست ہے

پیغامِ دوستی کا اشارہ اگست ہے
امن و اماں کا ذوقِ نظارہ اگست ہے
دنیائے رنگ و بو کا فسانہ اگست ہے
یعنی مسرتوں کا زمانہ اگست ہے

خوش رنگیٔ مزاج کا گلشن اگست ہے
خوش بختیٔ سراج کا دامن اگست ہے

پروفیسر ایم۔ ایل سکینہ وفا امروہوی

پندرہ اگست کی بہار

خوشا نصیب! آج تو بہار ہی بہار ہے
زہے! کہ روکشِ جناں ہوائے مرغزار ہے

چمن چمن برس رہی ہے بادلوں سے آج مے
یہ نشہ ہے کہ جھومتا ہر ایک مے گسار ہے

بہشت در بہشت اب وطن کی سرزمین ہے
ہزار بار، لاکھ بار شکرِ کردگار ہے

قدم قدم ہیں زینتیں، نظر نظر ہیں رونقیں
ہر ایک سمت پندرہ اگست کی بہار ہے

اٹھائیں کلفتیں بہت، سہیں صعوبتیں بہت
وطن کی سرگزشت سے زمانہ دل فگار ہے

ستم اٹھا کے بے بہا وطن نے پائی زندگی
یہ رہبرانِ قوم کے دکھوں کی یادگار ہے

فرنگیوں کے جال میں پھنسے رہے ہیں مدتوں
سرور کیوں نہ ہو ہمیں، زمانہ سازگار ہے

ہر ایک سو ہے اب خوشی، ہر اک قدم پہ تازگی
ہر ایک فرد قوم کا، جہاں میں کامگار ہے

خدا کا شکر ہے وفاؔ، نہیں غلام دیس اب
ہر ایک فرد ہند کا، وطن کا جاں نثار ہے

اظہار شادانی

آزادی کی دیوی

مادرِ ہند کی منھ بولتی تصویر ہے تو
جاگتا خواب ہے، بیداری کی تعبیر ہے تو

پھول سی نرم ہے، نازک ہے محبت کے لیے
اور نفرت کے لیے برہنہ شمشیر ہے تو

دوستوں کے لیے مرہم ہے تری میٹھی نظر
دشمنوں کے لیے اک زہر بجھا تیر ہے تو

حامیِ امن و اماں کے لیے پیغامِ حیات
شرپسندوں کے لیے آہنی زنجیر ہے تو

زندگی بخش اک نغمہ ہے غریبوں کے لیے
اہلِ زر کے لیے اک نالۂ دلگیر ہے تو

مژدۂ صبحِ مسرت ہے شبِ غم کے لیے
ظلمتِ دہر پہ چھائی ہوئی تنویر ہے تو

غیر کے واسطے سرحد پہ ہے نجمن رکھا
شانۂ دوست پہ اک زلف گرہ گیر ہے تو

قسمتِ ہند کی تحریر ہے ہر لفظ ترا
نطق بھی جس پہ تصدق ہے وہ تحریر ہے تو

عقل دہشت پہ تری "نورجہاں" ناز کرے
عدل و انصاف میں اک نسخۂ "جہانگیر" ہے تو

گتھیاں سب جو الجھی ہیں، سلجھیں گی ترے ہی دم سے
جس پہ تقدیر کا سایہ ہے وہ تدبیر ہے تو

سازشیں لاکھ ہوں تخریبِ وطن کی لیکن
دل کو تجھ پہ ہے یقیں جذبۂ تعمیر ہے تو

تیری ہستی سے ہیں وابستہ امیدیں کتنی
دل کی دھڑکن ہے، غمِ قوم کی تاثیر ہے تو

جانِ گاندھی کی ہے، در اصل تو، نہرو کا ہے دل
ناز ہے جس پہ مصور کو وہ تصویر ہے تو

جہل، مکاری، غریبی کو مٹانا ہے تجھے
ناظمِ نظمِ وطن، ہند کی تقدیر ہے تو

چشمِ شیطاں میں کھٹکتی ہے تو کانٹے کی طرح
نازشِ حسنِ چمن، جنتِ کشمیر ہے تو

خود ہی مٹ جائیں گے اظہار مٹانے والے
مٹ نہیں سکتی، مقدر کی وہ تحریر ہے تو

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

جنگ آزادی کا ایک گمنام مجاہد
شہزادہ مبارز الدولہ

ہماری تاریخ اور تذکروں نے صدیوں کے تہہ در تہہ نقابوں کے اندر ڈھکے اور چھپے ہوئے کتنے ہی پیکروں کو ابھارا اور ان کے کارناموں کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ماضی کے بعض گوشے ابھی روشن نہیں ہو سکے ہیں۔

دکن کی سیاسی تاریخ کی ایک گم نام ہستی آصف جاہی شہزادہ گوہر علی خاں مبارز الدولہ کی بھی ہے جو سکندر جاہ، آصف جاہ ثالث کے فرزند تھے۔ محل میں ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی۔ لیکن فطرتاً ایک حساس دل اور بیدار دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لیے اپنے دیش پر انگریزوں کا تسلط انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سارا ہندستان اپنی تاریخ کے ایک نہایت ہی بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ ہندستان کو استحصال پسند مغربی قوموں سے ربط میں آئے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں، ان کی بہتر تنظیمی صلاحیتوں اور ان کی حکمت عملی سے پہلے ہی پہل ہندستانیوں کے ذہن مرعوب ہو چکے تھے۔ مغل سلطنت کو ابھی باقی تھی، لیکن اپنی عظمت رفتہ کا کھنڈر بن کر رہ گئی تھی۔ کچھ مدبروں کو اس کی بقا کی جو فکر تھی کہ وہ اب جواب دینے لگی تھی کیونکہ مغل سلطنت کے تحفظ کا خیال ایک دھوکا معلوم ہونے لگا تھا۔ خود دہلی کی حکومت میں امرا کی سازشوں اور شورشوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً اندرونی خلفشار ابھرتا اور نظم و نسق کے کھوکھلے پن کا پردہ فاش کرتا رہتا تھا۔

دکن میں مبارز الدولہ سے کچھ عرصے پہلے ان کے جد اعلیٰ میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اوّل کے انتقال کے بعد سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی حریص نظریں آصف جاہی سلطنت پر بھی پڑ رہی تھیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی قومی منافرت نے دکن میں ریشہ دوانیوں کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک کے بعد ان کے فرزند ناصر جنگ، نواسے مظفر جنگ اور دوسرے بیٹے صلابت جنگ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے مسند نشین ہوئے اور پھر قتل کر دیے گئے۔ دکن میں پرسکون اقتدار کا دور ختم ہو چکا تھا اور اٹھارہویں صدی عیسوی کا نصف آخر اپنی تمام آسودگیوں اور قرون وسطیٰ کے فرسودہ جاگیردارانہ تصورات اور سماجی توہمات کو اپنے سینہ سے چمٹائے دم توڑ رہا تھا۔ نئے نظام کے جلو میں نئی جاگیرداریت اور نئی سرمایہ داریت آ رہی تھی سیاسی اور سماجی زندگی کی پرانی عمارت جن ستونوں پر قائم تھی انکی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں۔ پرانے دستور اور آئین تقویم پارینہ بن رہے تھے اور نئے آئین کا ہیولیٰ نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا تھا۔

نئے اور پرانے دو قرنوں کے اس جھٹ پٹے میں فطرتاً کچھ نئے تصورات ابھر رہے تھے اور کچھ نئے عقائد کی صورت گری ہو رہی تھی۔ ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ دم توڑتے ہوئے اقتدار کے ساتھ وفاداری کا دم بھرنا دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ اس کے بجائے مصلحت اس میں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے اس شعور کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر صوبے اور ہر ریاست میں انگریزوں کے کچھ

دوست اور طرفدار پیدا ہو گئے تھے حیدرآباد میں اس کی سب سے نمایاں مثال مہاراجہ چندو لعل کی ہے جو سلطنت آصفیہ کے پیشکار اور پھر دیوان مقرر ہوئے تھے۔

چندو لعل جب ۱۲۲۹ھ میں پیشکاری کے عہدہ پر مامور تھے، دکن میں پنڈاریوں کی شورش نے حیدرآباد کی سرزمین پر بھی چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ کردی۔ دکن کے مشہور مورخ غلام حسین خاں جو ہر گلزار آصفیہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اس کے بانی مرہٹہ حکمران باجی راؤ تھے۔ باجی راؤ در اصل غیر ملکی اقتدار کے خلاف تھے اور اسی لیے وہ سلطنت آصفیہ کی انگریزوں کے ساتھ دوستی کو ناپسند کرتے تھے۔ چندو لعل نے ایک خط لکھ کر باجی راؤ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کے ساتھ اخلاص اور اتحاد وقت کا تقاضہ ہے۔"

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کے نظم و نسق میں انگریزوں کی مداخلت اور اقتدار طلبی کی مساعی کے خلاف سارے ہندوستان میں ناگواری کا ایک شدید احساس پیدا ہو گیا تھا جو موقع اور حالات کے لحاظ سے خاص خاص صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں کسی قدر منظم کوشش ۱۲۵۵ھ کی شورش ہے جو تاریخ میں وہابیوں کی تحریک کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا تھا۔ چنانچہ گارساں دتاسی اپنے مقالات میں لکھتا ہے:

"بعض اشخاص نے جو اپنے آپ کو وہابی کہتے تھے، حکومت ہند کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ مکہ کے علماء سے حاصل کیا۔"

سید احمد شہید کی یہ تحریک جو در اصل آزادی ہی کی تحریک تھی تھوڑے ہی عرصے کے اندر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ہندوستان کی کئی ریاستوں کے حکمران اور شہزادے، نواب اور سردار سب اس تحریک کے پیچھے تھے۔ رامپور اور کرنول کے نواب، ٹونک، سندھ اور افغانستان کے سردار اور خاص طور پر حیدرآباد کے شہزادہ مبارز الدولہ اس تحریک کے زبردست علمبردار تھے۔ انگریزوں کے خلاف کارروائیوں میں انھیں سارے ہندوستان میں شہرت حاصل تھی۔ اس لیے ہندوستان کی مختلف ریاستوں نے انھیں اپنا سردار منتخب کرا لیا تھا اور وہ اس تحریک کا مرکز بن گئے تھے۔

رزیڈنٹ فریزر نے اپنی یاد داشت (MEMOIRS) میں لکھا ہے کہ مبارز الدولہ نے اپنا لقب "عمر بن عبدالعزیز، رئیس المسلمین جانشین سید احمد" اختیار کیا تھا اور ایک مہر بھی بنوائی تھی جس پر یہ پورے القاب کندہ تھے۔

انگریزی اقتدار سے نفرت کرنے والے ان کو اپنا پیشوا اور قائد سمجھتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ انگریزی اقتدار کے شکنجوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے ادنیٰ ملازمین کی پشت پناہی اور ان کی تائید سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ قومی وقار کی بازیافت کی کوشش میں وہ کبھی کبھی سرفروشانہ اقدام بھی کر بیٹھتے تھے اور کبھی ایسی جرأت رندانہ سے بھی کام لیتے تھے، جس کی اس زمانے کے عمائدین میں سے کسی کو ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

چنانچہ ۱۲۳۰ھ کا واقعہ ہے کہ مبارز الدولہ کے ایک ملازم شیریں نامی نے حیدرآباد رزیڈنسی کے ایک درزی سے جھگڑا کر لیا اور اس کو پکڑ کر مبارز الدولہ کی حویلی میں قید کر دیا اور خود بھی رزیڈنسی کے عہدہ داروں کے خوف سے مبارز الدولہ کی حویلی میں جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع اس زمانے کے رزیڈنٹ ہنری رسل کو ہوئی تو رسل نے مبارز الدولہ کے والد سکندر جاہ آصف جاہ ثالث سے اس کی شکایت کی۔ سکندر جاہ کی بے بسی کا یہ حال تھا کہ "مصنف گلزار آصفیہ" لکھتے ہیں کہ سکندر جاہ نے رسل کو یہ اختیار دیدیا کہ وہ خود اس کا تدارک کرے۔

چندو لعل اور رزیڈنٹ رسل کی متحدہ سعی سے اسی زمانے میں ایک فوج کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ جو رسل کے نام پر "رسل بریگیڈ" سے موسوم تھی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مملکت نظام کے خلاف کوئی فوجی نقل و حرکت عمل میں آئے تو اس سے کام لیا جا سکے۔ چنانچہ بعض مواقع ایسے پیدا ہوئے بھی، لیکن

ریزیڈنٹ نے نظام کو اس بریگیڈ کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔ اسکے برخلاف یہ بریگیڈ نظام کے بھائی کے خلاف میدان میں لائی گئی۔

بریگیڈ نے مبارز الدولہ کی حویلی کو گھیر لیا اور توپیں نصب کر دی گئیں۔ محل پر گولہ باری شروع ہوئی دوسری طرف سے تیروں سے اس کا جواب دیا گیا۔ کیونکہ مبارز الدولہ کے یہاں توپ اور گولہ بارود کی قسم سے کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ مبارز الدولہ کے تیر سے ایک انگریز سپاہی زخمی ہو گیا۔ اس کا زخمی ہونا تھا کہ انگریزی جمعیت میں کھلبلی مچی۔ توپوں کے دہانے کھول دیے گئے اور چاروں طرف سے گولہ باری شروع ہوئی۔

رسل نے چھاؤنی سے مزید سپاہیوں کی کمک طلب کی اور مہاراجہ چندولعل کی بارہ دری میں ٹھہرایا۔ چندولعل کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا کیونکہ ایک طرف تو وہ انگریزوں کے دوست تھے۔ اور دوسری طرف نظام سے اپنی وفاداری پر کوئی حرف آنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے انگریزی فوجوں کو کثیر رقم دے دلا کر اپنی بارہ دری سے چلتا کیا۔ فوجیں ہٹائی گئیں لیکن شرط یہ قرار پائی کہ باغی شہزادے کو دار السلطنت سے دور گولکنڈہ میں بھیج دیا جائے۔ اس طرح گولکنڈہ بھیجا جانا دراصل نظر بندی کے مترادف تھا۔ وطن کی آزادی کے لیے سرفروشی کی پاداش میں مبارز الدولہ پانچ سال تک قلعہ میں نظر بند رہے۔ اس اثنا میں رسل اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے اور ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف مقرر ہوئے۔ مٹکاف کے جائزہ لینے سے پہلے مہاراجہ چندولعل نے مبارز الدولہ کو قلعہ سے واپس بلوانے کا بندوبست کر لیا۔

اس واقعہ کے پندرہ سال بعد مبارز الدولہ دیسی فوجوں کے باغی سردار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جب رسل بریگیڈ کا قیام عمل میں آیا تو دیسی فوجوں کی تخفیف عمل میں آئی تھی ۔ ان بے یار و مددگار فوجیوں کو مبارز الدولہ کی صورت میں اپنا ایک ہمدرد نظر آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ کچھ ایسے فوجی بھی تھے جن کو تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں چنانچہ ۱۲۴۶ھ میں فساد برپا ہو گیا اور یہ شہرت دی گئی کہ مبارز الدولہ تنخواہ نہ ملنے کو بنیاد بنا کر خفیہ طور پر بیروزگاروں کو ریاست کے خلاف اکسایا کرتے ہیں۔ ان بے روزگاروں کی حمایت میں دوسری بار مبارز الدولہ کو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کیا گیا۔

حیدرآباد کے عوام بھی انگریزوں کے تسلط بے جا سے ہیجان زدہ ہو رہے تھے۔ ان کی نظر میں مبارز الدولہ ہی وہ ہیرو تھے جو ان غاصب اجنبیوں کو ریاست سے باہر نکال سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب عوام کو یہ معلوم ہوا کہ شہزادہ مبارز الدولہ پھر ایک بار قلعہ گولکنڈہ میں قید کیے جا رہے ہیں تو ان کے ہیرو پرستی کے جذبات ابھر آئے۔ ایک عام ہیجان برپا ہو گیا۔

گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ جب مبارز الدولہ گولکنڈہ جا رہے تھے، ان کی حویلی سے جو اعتبار چوک میں واقع تھی قلعہ گولکنڈہ تک لوگوں کا اژدہام تھا۔ مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور درختوں پر بھی چڑھ چڑھ کر لوگ انھیں دیکھ رہے تھے۔ شاہی محل میں کہرام برپا تھا۔ خاص طور پر ان کی والدہ ملکہ فضیلت النساء بیگم کو بڑا قلق تھا۔ ان کی دلجوئی کی خاطر وہ بھی قلعہ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ گلزار آصفیہ کے مصنف غلام حسین خاں جوہر بھی ملکہ کی سواری کے ہمرکاب چلے۔

اس دفعہ مبارز الدولہ دو سال تک قلعہ میں نظر بند رہے ۔ بالآخر جمیلہ بیگم کی مساعی اور چندولعل کی کوششوں کی بدولت ۱۲۴۸ھ میں حیدرآباد واپس آنے کی اجازت ملی۔ نوروز کے جشن کے موقع پر چندولعل اور ان کے خاندان کے افراد کو والیِ ریاست کی طرف سے منصب اور خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

ریاست کے اندرونی معاملات میں غیر ملکی مداخلت اور انگریزوں کا ظلم مبارز الدولہ کے لیے بہر حال ناقابل برداشت تھا۔ انگریز انھیں ایک خطرناک اور پریشان کن شخصیت سمجھتے تھے۔ کرنول کے نواب غلام رسول خاں بھی درپردہ مبارز الدولہ کے مشن کے حامی اور شریک تھے۔ خفیہ طریقے پر اپنے یہاں انھوں نے وسیع پیمانہ پر اسلحہ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انگریزوں کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کی خواہش میں بعض مقامات کی فوجیں

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

نیاز سلطانپوری

جشنِ آزادی

وہ ماہ و سال میں لپٹا ہوا اگست آیا
حیات کا کوئی پیغامِ جانفزا لایا
بچھا ہوا ہے ہر اک سمت نور کا سایا
پلٹ کے رکھ دیا تاریک رات کی کایا

ہر ایک راہ تجلی سے جگمگاتی ہے
کہ آبِ زر سے عروسِ چمن نہاتی ہے

اگست گاندھی و نہرو کے خواب کی تعبیر
اگست، خونِ شہیداں کی آخری تصویر
اگست، کاٹنے والا غلامی کی زنجیر
اگست، ہی سے ہے وابستہ قوم کی تقدیر

فقط یہی نہیں بھارت کی آبرو ہے اگست
ظفر کی حیدر و ٹیپو کی آرزو ہے اگست

اگست، مادرِ ہندوستاں کی دھڑکن ہے
جسے گلے سے لگائیں وہ پاک دامن ہے
اگست لکشمی بائی کی شوخ چتون ہے
اگست ہی سے تو وابستہ آج کن کن ہے

ملا اگست سے تاریخ کو نیا اک موڑ
جسے دیا تھا کبھی کاروانِ ہند نے چھوڑ

مناؤ جشنِ چراغاں، جلاؤ گھی کے دیے
بڑھے چلو سوئے منزل بلند عزم کیے
ہے اذنِ عام ہر اک رندِ میکدہ کے لیے
شرابِ عیش و مسرت بہ قدرِ ظرف پیے

نہ تیرگی کا ہے شبہ، نہ رات کا کھٹکا
لگا ہے چار طرف نورِ صبح کا پہرہ

ہر ایک راہ گزر مثلِ کہکشاں ہو جائے
زمیں کو اتنا اٹھاؤ کہ آسماں ہو جائے
نقیبِ امن کے دشمن کا منھ دھواں ہو جائے
نئے سرے سے مکمل یہ داستاں ہو جائے

مٹا دو سارے وطن سے وجوہِ بربادی
ہر ایک بشر کو ہوں حاصل حقوقِ آزادی

قاضی سید عرشی کاظمی

اشتراکِ عمل

آؤ پھر عہد کریں آج سے ہم ایک ہیں ایک
اپنا غم، اپنی خوشی، اپنے الم ایک ہیں ایک
ایک ہے ذوقِ طلب، دیر و حرم ایک ہیں ایک

ربط باہم سے ہے رشتوں میں رسن کی طاقت
ہم بھی ہیں ایک تو طاقت ہے وطن کی طاقت

آؤ پھر پیار کے ایثار کے پیماں باندھیں
درد سے درد، رگِ جاں سے رگِ جاں باندھیں
سارے عالم میں ہوائے "چمنستاں" باندھیں

اپنے بیگانے کو پھر راحت و آرام ملے
ایک مرکز پہ فضائے سحر و شام ملے

آؤ پھر ایک ہوں تزئینِ چمن کی خاطر
غنچہ و برگ و گل و سرو و سمن کی خاطر
عظمتِ گنگ کی تقدیسِ جمن کی خاطر

بکہ آپس میں شناسا و یگانہ نکلیں
کوئی میدان ہو سب شانہ بہ شانہ نکلیں

اپنی ہی لاج ہے کانٹا ہو کہ پھول، اپنائیں
اپنی ہی آن ہے غازہ ہو کہ دھول، اپنائیں
آؤ قرآن کے، گیتا کے اصول اپنائیں

پھر ہم آہنگیِ ناقوس و اذاں زندہ کریں
پھر وہی اگلے زمانے کا سماں زندہ کریں

ہم میں وحدت ہے تو کثرت کا تماشا ہم سے
ہم میں الفت ہے تو سو حسن ہویدا ہم سے
ہم ہیں دنیا کے لیے، ہم سے ہے دنیا ہم سے

ایک ہوں ہم تو ہر اک کارِ گراں ہو جائے
امنِ عالم نصب العینِ جہاں ہو جائے

شہناز کنول

(افسانہ)

آپ کاج مہا کاج

"میاں جی سلام" ؟

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو کہو بھئی خیریت ہے۔" ؟

"جی ہاں دعا ہے آپ کی۔"

"اور سناؤ کیا کر رہے ہو آج کل" ؟

"جی سوچا ہے کوئی بزنس کر لوں۔"

"بزنس۔۔؟ کیا بزنس۔"

"یہی اکسپورٹ امپورٹ کے لیے سوچ رہا ہوں۔"

"کچھ روپیہ پیسہ ہے ؟"

"اسی سلسلے میں کچھ سوچنا ہے"

"میاں عقل کے ناخن لو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تمھاری پیدائش بن پروں ہی اڑنے لگے۔ اور پھر لگی لگائی نوکری کا کیا ہوگا۔"

"وہ تو چھوڑ دی۔"

"ہائیں۔۔ چھوڑ دی، لو بھئی تمھاری وہ مثال ہوئی کہ گھٹا دیکھ کے گھڑے پھوڑ ڈالے۔ پاس پلے پیسہ نہ دھیلا چلے ہیں بزنس کرنے، ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔ کیا کہا پہلے دن کر چکے اس لیے تجربہ ہے۔ کوڑیوں کے مول سامان بیچنے کو بزنس کہتے ہیں۔ میں نہیں مانتا تمھارا وہ حساب ہو رہا ہے کہ اصیل مرغی کی ایک ٹانگ، ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، یوں دو دو پیسہ میں تجارت ہوا کرتی تو ہرا یرا غیرا نتھو خیرا تاجر ہوتا۔ اجی یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے پتا پانی کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہم تو یہ دیکھتے ہیں جسے دیکھو نوے کا سونٹا بنا پھرتا ہے۔ میاں ہم نے دنیا دیکھی ہے رانڈ کے سانڈ بن کر نہیں رہے۔ مگر آج کے بچے تو عجیب ہیں نہ بڑوں کا ادب، نہ چھوٹوں کا لحاظ اپنی مٹر الگ بھنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن کہیں ایک چنا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ اکیلے ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی۔ تجارت کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ کچے گھڑے پانی بھرنا ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہیں کھرے کھوٹے کی پہچان رکھتے ہیں۔ کام انسان ایسا کرے کہ دنیا تعریف کرے، ورنہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ ڈر اور خوف سے کچھ کیا تو کون سا تیر مارا۔ مگر ہم پرانے وقتوں کے لوگ ہیں، بری بھلی سمجھانا ہمارا فرض ہے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

نیا زمانہ کہاں کا کہاں نکل گیا اور ہم ابھی تک لکیر ہی پیٹ رہے ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا رسّی جل گئی پر بل نہ گئے۔ ہم آج بھی آن پر جان دینے والے لوگ ہیں۔ اب تمھیں کیسے سمجھائیں ہمارا زمانہ کیسا تھا۔ دلہن بوٹی دیکھے بنا تو رشتہ ناطہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج کا کیا ہے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے جیسوں میں ملے ویسے ہو گئے۔

"کیا کہا دنیا بدل گئی ہے۔ ہاں جی سچ ہی ہے آنکھ پھوٹی پیڑ گئی۔ ہمارے زمانے کا کوئی ہو تو پیٹ میں درد اٹھے۔ جیسی گندی سیتلا ویسے پوجن ہار۔ ہم تو اپنی لگی کو کہتے ہیں ورنہ کون سے تمھارے خالہ کے خلیرے ہیں۔ تم جوان ہم بوڑھے۔ آج مرے کل دوسرا دن

ھارے بھلے کو سمجھایا ہے۔ بزنس ایسا ہو کہ جو لگاؤ اس پر نفع ی ہو گر نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی بعد کو جو نقصان ہوگا ہ شل ہوگی کہ اتنے کی بڑھیا نہیں جتنے لہنگا پھٹ گیا۔ اپنے ن گنوا کر در در کی بھیک مانگنا تو کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ کیا چھ روپے ہیں۔ بھلا اتنے سے سرمایہ سے تجارت ہوگی یا دُ سیر چاول ر جو بارے رسوئی۔ پھر اتنے شور کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے کی نہ ہوگی جتنا اس کو لانے لے جانے میں خرچ ہوگا۔ کسی نے کہا ہے ری کی گڑ یا ٹکا ڈولی کا، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوگی۔

" تمھارا ابھی جواب نہیں قرض لے کر تجارت کروگے خود سوچو نے پاس نہ پیسا تو پرایا آسرا کیسا۔ لو ابھی سے سٹی گم ہونے لگی، تے ہو اور کیا کروں۔ میاں محنت کرو۔ آج کا زمانہ مزدور کا نہ ہے وہ دن لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ذ یہ جانتے ہیں کہ جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا جے۔

" نہیں میاں اب میری عمر اس قابل کہاں ہے کہ ارا ساتھ دوں۔ وہ حال ہے کہ آٹے کا چراغ گھر رکھوں کھا جائے باہر دھروں کوا لے جائے۔ تم خود کرو مگر کام ایسا ہ جو بہ آسانی کر سکو۔ ورنہ کیا مذاق ہوگا کہ چوہا بل میں سماتا ب دم میں باندھا چھاج۔ ایسے کام کو دو ہاتھوں سے سلام۔

" لو اور سنو ساجھے میں بزنس کروگے۔ دو ملاؤں میں مرغی سرام والی شل سچ کر دکھاؤگے۔ بڑے بزرگ سمجھ گئے ساجھے نڈی چورا ہے پر پھوٹتی ہے۔ بانٹ بٹی ہاڑ کے تجارت ب ہوا کرتی۔ ابھی ایسے دوستوں کا کیا بھروسہ جب تک ، تھالی بھات تب تک نیرا میرا ساتھ جب واسطہ پڑے گا ، خیر ہوگی راہ پڑے جلئیے یا باہ پڑے جلئیے۔ یوں تو سبھی ، دوست ہوتے ہیں۔ وقت پہ جو کام آئے وہی دوست ہو رہے نادان کی دوستی جی کا جنجال۔

" لو اور سنو تمہیں کیا ضرورت تھی تجارت کی وہ بات نہیں ی کر رانی کو دانا اور کانی کو کانا، اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ہمارا زمانہ فراغت کا زمانہ تھا۔ کیا کہا ہمارے دور میں جھگڑے بہت تھے ہاں جی ہم لوگ زمیندار تھے اور تم جانو زر، زمین، زن زبان قضیہ چاروں کے گھر۔ ہم تمھاری طرح نہیں تھے کہ دیکھا نہ بھالا صدقے گئی خالہ' آن بان والے تھے۔ کسی کی دو بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ بھلے گھوڑے کو لات اور بھلے آدمی کو بات کافی ہے۔ ارے میاں تم کس برتے پر بولتے ہو کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ ہم محنت کرتے تھے عزت کی کھاتے تھے۔ تم لوگوں کا کیا ہے اس کو نوچ اس کو کھسوٹ چاہیے پیسے کمانے ہو تمھاری وہ مثل ہے کہ دکھ سہیں بی فاختہ کوّے انڈے کھائیں دوسروں کے بل پر کیوں سبنے اور دماغ عرش معلیٰ پر پہنچا۔ میاں تم جیسوں کے لیے ہی تو کہا ہے کہ ابھی برتن کچا ہے لکڑی کچی ہے۔ کام کرنے والے بیٹھے نہیں رہتے ہر دم انھیں کام کا خیال رہتا ہے۔ ان کی مثال تو ایسی ہے کہ اٹھاؤ میرا لکنا میں گھر سنبھالوں۔ اپنا میاں غرض باؤلی ہوتی ہے۔ وقت پڑے پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے جو سویا سو کھویا کاہلی مفلسی کی ماں کہلاتی ہے۔ ذرا سی غفلت ہوئی اور سارا کاتا بنا کپاس ہوگیا۔ یہاں باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ سنا نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ خالی باتوں سے پیٹ نہیں بھرا کرتا۔ انسان کمائے اور اس میں سے تھوڑا اچھے برے وقت کے لیے بھی رکھے ورنہ وہی بات کہ سب دن چنگے عید کے دن ننگے۔

"خوب کہا بھلا اس میں کسی کا کیا قصور۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا والی بات تو کرو مت۔ سانچ کو آنچ نہیں خود کر کے دیکھو ابھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ محض زمین آسمان کے قلابے ملانے سے کیا ہوتا ہے۔ عمل بھی تو ہو۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اس کے سر الزام رکھ دیا اس کے سر کھ دیا زبانی جمع خرچ میں کون سے ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں۔ آج کے جوانوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر عقل حیران ہے۔ کہو زمین کی سنتے ہیں آسمان کی۔

"ابی دوسرے ملکوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔

دور کے ڈھول سہانے ہیں۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ وہاں بھی کون سے سارے خوش حال ہیں۔ میاں محنت کرنے والے کہیں کبھی مار نہیں کھاتے حرکت میں برکت ہے۔ جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگا۔ اپنے ملک میں کون سے کیڑے پڑے ہیں مگر عادت ہو گئی ہے دوسروں کی تعریف کرنے کی۔ نہیں جی انگریزوں کے دور میں کون سا اچھا انتظام تھا اگلے کو گھاس نہ پچھلے کو پانی۔ آزادی ملی تو میاں ہم نے گھی کے چراغ جلائے تھے کیونکہ ہم جانتے تھے پرائی آنکھیں کام نہیں آتیں۔

"لو اور سنو تم تو میرا بنگو بنائے دے رہے ہو۔ خدا نہ کرے جو ہم نے بیٹھ کے ٹکڑے توڑے ہوں۔ میاں ہمارے جیسی محنت کرتے تو چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ دن رات کولھو کے بیل کی طرح جتے رہتے تھے۔ تم جیسوں کو تو نانی یاد آجاتی۔ اب ہمارے میں دم نہ درود۔ ایک تو بڑھاپا پھر دکھ بیماری جھیلتے جھیلتے انگنی پہ ڈالنے کے قابل ہو گئے۔ مگر اب بھی کون سا کام سے انکار ہے بیکار تو ہم سے بیٹھا ہی نہیں جاتا بڑے کہہ گئے ہیں بیکار مباش کچھ کیا کر کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر۔ دیکھا ہو گئی نا ترکی تمام۔ ہم تو ہمیشہ سے یہی کہتے آئے ہیں ارے بھئی اچھے برے کس زمانے میں نہیں ہوتے مگر ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا غلط ہے۔ ہاں ہاں ہمیں کب انکار ہے۔ کہتے ہیں ایک توے کی روٹی کوئی چھوٹی کوئی موٹی۔ پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتیں۔ نئی نسل بھی ساری کی ساری ہی خراب نہیں ہے۔ لیکن ہمارے وقت میں مروت اور وضع داری محبت اور انکساری تھی۔ بڑوں کا احترام تھا۔ ہمارے بزرگوں کو ہمارے سلسلے میں یوں بار بار ڈانٹ پھٹکار کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اصیل گھوڑے کو ایک چابک کافی۔ میں تو خدا لگتی کہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہو کہ ہم اپنے سامنے کے بچوں سے اس طرح ناراض ہوں کہ تعلق ہی توڑ لیں بھلا کہیں لاٹھی مارے پانی پھٹتا ہے مگر سچی بات زبان پر آئے بنا رہتی بھی نہیں۔ آج کے پیچھے آج ہی نہیں چلتے ابھی دنیا دیکھنی ہے۔ اچھے برے لوگوں سے ملنا ہے۔ اس زندگی کے اتار چڑھاؤ انسان کا سارا کس بل نکال دیتے ہیں۔ مجھے تم سے دشمنی تو ہے نہیں مگر وہ مثل مت کرو کہ بارہ برس کی بٹیا بھی برمانگے — وقت اور حالات کے تحت زندگی گزارو۔ جتنی چادر ہو اتنے پاؤں پھیلاؤ۔ بزرگوں نے غلط نہیں کہا آگ کھائے منہ جلے ادھار کھائے پیٹ جلے۔ لیکن ہتھیلی پہ سرسوں نہ جماؤ۔ کہتے ہیں قطرہ قطرہ دریا می شود۔

"اب شیخ نثار کے فتن ہی کو لے لو۔ کیا کیا میری برائی کرتا ہے۔

خیر کرلے وہ تو ہمیشہ کا فتنہ ہے۔ ایسے عزت داروں کے لیے کہا گیا ہے۔ اب ستونتی ہو کر بیٹھی جب لوٹ کھایا سنسار۔ ٹھیک کہتے ہو برائیاں کس میں نہیں ہوتی ہیں۔ بے عیب ذات، خدا کی۔ مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آئے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی دیکھ لیں۔ ارے اس کی کیا پوچھتے ہو گنگا بیٹھے گنگا رام جمنا بیٹھے جمنا رام۔ آنکھیں پھوڑ کے پلکوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اللہ بری بات اور بری گھڑی سے سب کو بچائے۔ ہمارے بھی کان گنہگار ہیں۔ جو کچھ سنتے ہیں افسوس ہوتا ہے دنیا کا کیا ہے رو رو کے سنتی ہے ہنس ہنس کے اڑاتی ہے۔ ہاں یہ فتن بھی دسیوں کام کر چکا مگر دل لگا کے کبھی نہ کیا جب بات بنتی نہیں تو الزام دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے وہی مثل ناؤ کس نے ڈبوئی خواجہ خضر نے۔ دن بھر لفنگوں لنگاڑوں کے ساتھ پھرتا ہے۔ پرسوں اس کے باپ خود کہہ رہے تھے کہ کم بخت کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا میاں جی تم ہی اسے سمجھاؤ جس طرح تمھیں اچھا برا بتاتا رہتا ہوں ایسے ہی ایک دن اُسے چار نصیحتیں کر دی تھیں بس اس دن سے میں برا ہوں۔ باپ محنت سے کما رہے ہیں وہ اڑا رہا ہے مال مفت دل بے رحم اس کی گانٹھ سے تھوڑی جا رہا ہے۔ باپ اتنے شریف اولاد ساری نامعقول نکلی راجہ کے گھر موتیوں کا کال اسی کو کہتے ہیں۔ میرے عزیز یہ زبان ہی عزت کرواتی ہے اور یہی جوتے کھلواتی ہے۔ کہتے ہیں نا زبان شیریں ملک گیری۔ ماں باپ سدا کس کے رہے ہیں تم دیکھ لینا باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی ساری چوکڑی بھول جائیں گے۔ بیٹھ کے کھانے سے تو قارون

کا خر۔ انہیں خالی ہو جائے۔ ہمیں برا کہیں یا بھلا ہمارا تو کچھ نہیں جاتا مگر تم ہماری بات لکھ لو یہ لڑکا ہمیشہ جوتیاں چٹخاتا پھرے گا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔ اس کا تو ابھی یہ حال ہے کہ نکھٹو گئے بیٹھے ہاٹ انھیں سیر ملا نہ باٹ۔ بس میری نصیحت اتنی ہی ہے کہ اپنے بزرگوں کا ادب کرو اور کوئی کام کرنے سے پہلے بڑوں سے مشورہ ضرور کر لو۔ اپنے پرائے میں فرق کرنا سیکھو۔ کہتے ہیں گاڑھی بھری دوستی اور تل بڑا خون۔ ایسے مت بنو جیسے کسی کھونٹے بندھے ہی نہیں۔ بزرگوں کی مرضی سے ہر کام کرو۔ کہا جاتا ہے بارہ برس گھٹا لے تب ایک لال پالے۔ جبھی دکھ تکلیف سے ماں باپ پالتے ہیں اس کا احساس تب کرو گے جب صاحب اولاد ہو جاؤ گے۔ نائی رے نائی بال کتنے اس نے کہا۔ ججمان آگے آئے جاتے ہیں، بس اس قرض ادھار کے بزنس کا خیال چھوڑ دو اور محنت کر کے عزت کی روٹی کماؤ۔ ہر کام کرنے کی عادت ڈالو۔ آپ کاج مہا کاج تم نے بھی سنا ہوگا۔ گھبراتے کیوں ہو، ہمت مرداں مدد خدا اور بھئی ہم تو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اپنا من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔

نہیں بیٹے اس میں ناراضگی کیسی۔ میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تم میرے لیے بجائے اولاد ہو۔ اچھا اچھا چلو، معاف کیا، میں خوش میرا خدا خوش۔

★

جنگ آزادی کا ایک گمنام مجاہد (صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

اتنی بے چین ہو رہی تھیں کہ ینلور کے قلعہ میں وقت سے پہلے بغاوت ہوگئی۔ اسٹون ہار نے جو اس وقت ینلور کا مجسٹریٹ تھا۔ بر وقت شورش کا پتہ چلا لیا اور اس طرح انگریزوں کو بے دخل کرنے کی پہلی کوشش ناکام ہوگئی۔ واقعات کی تحقیق کے لیے کمیشن مقرر کیا گیا، جس میں انگریز اور ہندستانی عمائد شریک تھے۔ تحقیقات کی رو سے اس ساری شورش کی تہہ میں مبارزالدولہ کا ہاتھ تھا۔ ملک کے طول و عرض میں انگریزوں کے خلاف تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ٹونک، رامپور، سندھ اور کرنول کے رئیسوں کے ساتھ اسلحہ اکٹھا کرنے میں مبارزالدولہ کے ربط کا پتہ چلتا تھا اس کو بغاوت پر محمول کیا گیا اور اس کی پاداش میں ان کو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا گیا۔

مبارزالدولہ کے ساتھ ان کے دس متوسلین خاص بھی حراست میں لے لیے گئے۔ اور وہابیوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی غیر معینہ مدت کے لیے قید کر دیا گیا۔ اس طرح حصول آزادی کی یہ جدوجہد بھی ناکام ہوگئی جو حقیقت میں مبارزالدولہ کی آخری منظم کوشش تھی۔ قلعہ میں نظر بندی ہی کی حالت میں مبارزالدولہ کا انتقال ہوگیا۔

★

افادات مہدی (صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

اور جم کر علم و ادب کی خدمت نہ کرتے تو اس زمانے میں جہاں دوسرے بہت سے لوگ قلم نہ اٹھاتے وہاں مہدی بھی اس طرح ابھر کر سامنے نہ آتے اور نہ اس طرح آج وہ دنیائے اردو ادب میں جانے پہچانے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

وہ اس تحریک کی سب سے زیادہ قد آور شخصیت شبلی نعمانی سے بے حد متاثر تھے۔ وہ ان کی عظمت اور قدر و قیمت کے معترف تھے اور ان سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ شبلی ان کے دل و دماغ پر جس حد تک چھائے ہوئے تھے اس کا نمایاں اثر ان کی تحریر و تقریر اور فکر و خیال پر پڑا۔ وہ بہت کچھ نہ لکھنے کے باوجود وہ مقام حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوگئے جو بہتوں کو بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی نہیں ملتا ہے۔ مہدی قابل تعریف اور قابل احترام ہیں کہ وہ چند منتشر مضامین کے سہارے اردو ادب میں بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

★

دور سیفی

اندوہناک موڑ

نظروں میں تیری پیار کی سوغات اب نہیں
زلفوں میں خوشبوؤں کی وہ برسات اب نہیں
ملتا نہیں وہ پہلا سا اندازِ حسن بھی !
جو بارہ سال پہلے تھی وہ بات اب نہیں

کرتہ ترا پھٹا ہے، دوپٹہ ہے تار تار
میرا بھی جوتا حال پہ ہنستا ہے بار بار
اک ساتھ گھر میں رہ کے بھی ہیں اجنبی سے ہم
تیرا بھی حال زار ہے میرا بھی حال زار

آٹا سنا ہے ہاتھوں میں چہرہ اُڑا ہوا
کالک توے کی غازۂ رخ ہے بنا ہوا
مدقوق سا ہے آج وہ مہکا ہوا بدن
کیا سوچیے کہ گذرے زمانے کو کیا ہوا؟

آنکھیں دھواں دھواں تری الجھے ہوئے ہیں بال
میں بھی اداس تو بھی فسردہ، عجب ہے حال
اندوہناک موڑ پہ ہم ہیں کھڑے ہوئے
دونوں کے ایک ذہن میں ہیں ان گنت سوال

خوشیوں کی جستجو میں پریشان حال ہیں
اب زندگی کے گرد بڑے سخت جال ہیں
گھر میں سکون نام کی اب کوئی شے نہیں
اس کا سبب یہ ہے کہ کثیر العیال ہیں

بسنت کمار بسنت

آج کے دن

تابِ نظارہ کہاں کس کو بھلا آج کے دن
ذرہ ذرہ ہوا خورشید نما آج کے دن

مست و سرشار چمن، لالہ و نرگس شاداب
جھوم کر چھائی ہے گلشن پہ گھٹا آج کے دن

جام پر جام چھلکنے لگے میخانے میں
ساتھ مے پیتے ہیں اربابِ وفا آج کے دن

توڑ دو اہلِ چمن رسمِ عناد اور نفاق
دوستو! ہے یہی اندرا کی صدا آج کے دن

مہندی ہاتھوں میں رچا پیرہنِ رنگیں میں
مہ وشوں کی کوئی دیکھے تو ادا آج کے دن

دوستو! صدق و اہنسا کے اصولوں پہ چلو
چھوڑ دو رسم رہِ جور و جفا آج کے دن

مطربِ وقت سے کہہ دو کوئی نغمہ چھیڑے
گونج اٹھے ساز پہ شاعر کی نوا آج کے دن

ذہن و باطن کو کرو صاف ذرا ہم وطنو
سیکھ لو رسمِ وفا، صدق و صفا آج کے دن

کون سی بزم ہے جس میں نہیں سامانِ طرب
ہے بشر کون جو شاداں نہ ہوا آج کے دن

مٹ گئی تیرہ شبی ہر سو منور ہے بسنت
نور ہی نور گلستاں میں ہوا آج کے دن

امیر حسن نورانی

لکھنوی تہذیب میں
قومی یک جہتی کی جھلکیاں

لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کو اپنی مخصوص رنگا رنگ خصوصیات کی بدولت ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کا روشن رُخ کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ہماری قومی اور سماجی زندگی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس تہذیب کے اثرات سے قومی یک جہتی اور اتحاد کی روایت کو نہ صرف تقویت ملی بلکہ اس کی بنیادوں میں استحکام پیدا ہوا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتہائی پرآشوب دور اور نامساعد حالات میں بھی لکھنوی تہذیب کے اثرات نمایاں رہے اور آج بھی باقی ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کی آغوش میں پرورش پانے والی نسل، اتحاد و یک جہتی کی علم بردار رہی ہے۔ امیروں کے ایوانوں اور غریبوں کی جھونپڑیوں میں اسی کی جھلکیاں یکساں نظر آتی ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار اور میلے، مسلمان بزرگوں کے عرس اور دیگر معاشرتی مذہبی اور ثقافتی مجالس مشترکہ تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ اس اشتراک کا نمایاں اثر شہروں اور قصبوں میں یکساں نظر آتا تھا۔ مذہبی رسوم سے قطع نظر سب ایک تمدنی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے تھے۔

انیسویں صدی کا نصف آخر سارے ملک کے لیے پرآشوب دور رہا ہے کہ جب سلطنت مغلیہ دم توڑ چکی تھی اور دوسری خودمختار ریاستیں زوال و انحطاط کی کشمکش میں مبتلا تھیں اس زمانے میں اودھ کی شان و شوکت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور لکھنوی تہذیب و تمدن کو اپنی رنگا رنگ اور پرکشش خصوصیات نے مزید عروج و استحکام سے نوازا اور اس کے زیر سایہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

لکھنوی تہذیب کیا ہے؟ اس کے پس منظر کی تہذیبی تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو پیش نظر کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ لکھنوی تہذیب و معاشرت دراصل، عربی، ایرانی، تورانی اور ہندستانی تہذیب کی آمیزش سے وجود میں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کے ذوق جمال، ترکوں کی سخت کوشی و فراخ دلی، عربوں کی مساوات و اخلاقی قدر اور آریائی تہذیب کی رنگا رنگی نے ہم آغوش ہو کر ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، جس نے اتحاد و یک جہتی کی فضا میں نشو و نما پائی ہے اور سارے ملک کو اپنے غیر معمولی اور پرکشش اثرات سے متاثر کیا۔ یہاں عبا و جبّہ کے بطن سے انگرکھا اور شیروانی پیدا ہوئی۔ پگڑی اور چوگوشیہ ٹوپی کی جگہ ہلکی پھلکی دو پلی ٹوپی رونما ہوئی۔ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ لباس کے خاص جزو بن گئے۔ اسی طرح میل و ملاقات کے وقت سلام اور رام رام کی جگہ، آداب و تسلیمات نے لے لی۔ تلوار تو انقلاب و حوادث نے چھین لی تھی لیکن اس کی جگہ نرم و نازک چھڑی شرفا کے ہاتھوں کی زینت بن گئی۔ چوڑی دار پائجامہ کرتا اور ناگرہ جوتا مغلوں کا عطیہ تھا۔ لکھنؤ نے ان کو بھی اپنایا اور اس میں زری اور کامدار جوتوں کا وجود مشترکہ ذوق کا رہین منت ہے۔ لکھنؤ کی مشترکہ تہذیب کے اثرات عوام و خواص کے علاوہ علما و صوفیا پر بھی نمایاں ہوئے۔ بعض لکھنوی علما کے لباس میں بھی تبدیلی آئی۔ علماء فرنگی محل اور شیعہ علما کا لباس خالص لکھنوی ہو گیا کیونکہ نہ وہ خالص عربی رہا نہ اسلامی۔

دلی کی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت اودھ کی سرزمین امن و امان کا مرکز تھی جہاں مال و دولت کی فراوانی اور علم و ہنر کی قدردانی باعث کشش تھی۔ دلی کے ارباب فضل و کمال، ادیب و شاعر، صنّاع و

فن کار، قسمت آزمائی کرنے لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کی بدولت لکھنؤ، اتحاد و یگانگت میل و محبت کا گہوارہ بن گیا اور اس گہوارے میں جو داخل ہوا وہ اسی کے رنگ میں رنگ گیا۔ دلی کے بلند پایہ شعرا جو اس دور میں اردو کے آسمان پر چاند تارے بن کر چمک رہے تھے ان میں سے بیشتر دلی چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ میر، سودا، انشا، مصحفی وغیرہ اس زمانے میں لکھنؤ کے مذاق سخن پر تکلف و تصنع کی ایسی ملمع کاری ہو چکی تھی کہ اس کی ظاہری چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دلی کے شعرا اس ماحول اور رنگ سخن کے عادی نہ تھے۔ اس لیے ان کو اپنے دہلوی مذاق کی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے ناکوں چنے چبانا پڑے۔ لکھنؤ کی رنگین ادبی فضا کو حقیقت آشنا بنانے اور ماحول کو متاثر کرنے کی کوشش میں خود ان کے قدم ڈگمگانے لگے اور ان کے لیے اپنا رنگ سخن قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔ یہی حال نثر نگاروں کا تھا۔ پر تکلف اور رنگین نثر کے شاہکار فسانۂ عجائب، نوطرز مرصع اور بعض دوسری کتابیں اس دور کی یادگار ہیں۔ علمی و ادبی محفلوں میں دونوں فرقوں کے ادیب و شاعر اور سامعین شریک ہوتے تھے اور شرکا کے لباس میں بھی عموماً یکسانیت ہوتی تھی۔ جب تک فارسی زبان کا دور دورہ رہا مسلمانوں کی طرح ہندوؤں میں بھی بکثرت فارسی زبان و ادب کے عالم و شاعر پیدا ہوئے۔ فارسی ادبیات کو ترقی دینے میں اودھ کے ہندو عالموں ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی شہرت ہندستان کے علاوہ ایران و افغانستان میں بھی ہوئی۔ بعض ایسے علمی و تحقیقی کام ہوئے جو ہندستانی تو کیا ایرانی فضلا سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ٹیک چند بہار کا مقبول عام لغت بہار عجم اور شرح بوستان سعدی سے علمی حلقے بخوبی واقف ہیں۔ ٹیک چند کا یہ لغت ایرانی لغت نویسوں کے لیے مشعل راہ بن گیا۔ اسی طرح اودھ کے ہندو شاعروں کے دیوان اور نثری جواہر پارے بہت سے شائع ہو چکے ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں غیر مطبوعہ مسودے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔

علوم و فنون کی ترقی، شعر و شاعری، صنعت و حرفت، محافل و مجالس میں دونوں فرقوں کے ہنرمندوں اور فن کاروں میں اشتراک و تعاون جس حد تک تھا اس کا اندازہ موجودہ دور میں کرنا آسان نہیں۔ رسم و رواج، شادی و غمی کے موقعوں پر باہمی رسم و رواج، شادی و غمی کے موقعوں پر باہمی میل و محبت کے نظارے عام تھے دونوں فرقے شیر و شکر کی طرح گھل مل کر وقت گزارتے تھے۔ لکھنؤ کے حکمران نوابوں اور ان کے اراکین حکومت نے تعصب و تنگ نظری کی راہ نہیں اختیار کی۔ اردو دونوں فرقوں کی مشترکہ زبان تھی اور دونوں میں یکساں مقبول تھی۔ جب فارسی کا زوال ہوا تو اردو نے اس کی جگہ لے لی۔ جو پہلے عام بول چال کی زبان تھی۔ اس کی ترویج و ترقی میں دونوں فرقوں کی مشترکہ جد و جہد شامل رہی۔ دونوں نے مل جل کر گیسوے اردو کو سنوارا ہے۔ زبان و تہذیب کے اشتراک نے لکھنؤ میں قومی یک جہتی کی بنیاد مستحکم کی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اتحاد و یک جہتی کو استوار کرنے میں لکھنؤ کے کائستھوں اور کشمیری برہمنوں کا بڑا حصہ ہے۔ کشمیری برہمنوں کے بہت سے خاندان لکھنؤ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان خاندانوں نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ میل و محبت کی فضا قائم رکھی۔ یہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی شخصیت کے سہارے جاری ہے۔ اردو زبان کے دو عظیم شاہکار اسی دور کی یادگار ہیں۔ دیا شنکر نسیم (شاگرد خواجہ آتش) کی مثنوی گلزار نسیم اور رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد۔ جب ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد لکھنؤ کی مغموم فضا پر میر انیس کے مراثی اور ان کی اخلاقی شاعری کا رنگ چھا گیا تو لکھنوی شاعری کا روائتی رنگ بھی اڑ گیا۔ اس کے بعد انیس کے رنگ میں قومی شاعری کا علم بلند کرنے والا لکھنؤ کا پہلا شاعر چکبست تھا۔ برج نراین چکبست کشمیری برہمن خاندان کے فرد تھے۔ ان کی پر جوش نظمیں اور طرز انیس میں لکھے ہوئے مسدس آج بھی دلوں میں میل و محبت کا دیا روشن کرتے ہیں۔

کایستھ فرقے نے ہندستانی سلاطین و شاہان مغلیہ کے زمانے میں فارسی زبان و ادب کی خدمت کی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں پیش قدمی کی۔ لکھنؤ کے کائستھ خاندان جن کے باقیات اب بھی موجود ہیں، اتحاد و یک جہتی اور بے تعصبی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے میل محبت کی ایسی فضا پیدا کر دی جس کے اثرات اس پر آشوب دور میں بھی ختم نہ ہو سکے۔

اودھ کے حکمرانوں کے دربار میں کائستھ فرقے کے دانش وروں کی بڑی قدر و منزلت تھی، یہاں تک کہ اہم کلیدی اسامیوں پر ان کا تقرر ہوتا

تھا۔ نواب صفدر جنگ کے دیوان نول رائے سکسینہ اٹاوہ کے کائستھ تھے جب صفدر جنگ ایک بار طویل عرصے کے لیے دہلی چلے گئے تو نیابت کے فرائض نول رائے نے انجام دیے۔ عدل گستری اور ملکی انتظامات میں نول رائے کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ بات کے پکے اور وعدے کے سچے تھے، فارسی ادبیات میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی۔ ایک بار نواب محمد خاں والی فرخ آباد نے صفدر جنگ کو ۱۱۴۴ھ میں خط لکھا جس کی عبارت یہ تھی :

نواب نامدار۔ سلامت !

شمشیر خود، درمیان بکن، دگر نہ آب نخواہد ماند"

صفدر جنگ نے اس مختصر مگر جامع خط کا جواب لکھنے کے لیے دیوان نول رائے کو حکم دیا اور کہہ دیا کہ ترکی بہ ترکی جواب لکھو۔ نول رائے نے نہایت مختصر اور جامع جواب لکھا۔

"نواب نامدار۔ سلامت "۔

ایں شمشیر مرداں، درمعرکہ میدان بے خون چشیدہ بہ میان نمی آید"

(تاریخ اودھ جلد اول ص ۱۰۷)

صفدر جنگ کے بعد اودھ کے دوسرے حکمرانوں نے بھی کایستھوں کو وزارت کا منصب دیا۔ راجہ جھاؤ لال اور راجہ ٹکیٹ رائے کو لکھنؤ میں جو عروج حاصل ہوا اس کی تفصیلات اودھ کی تاریخوں میں موجود ہیں۔

ہولی، دسہرہ، محرم اور عید کے تہواروں میں دونوں فرقوں کے لوگ شریک ہوتے تھے اور ان تہواروں کو میل و محبت کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں دونوں ہی شانہ بہ شانہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ کہیں ہندو افسر کے ماتحت مسلمان سپاہیوں نے داد شجاعت دی اور کہیں مسلمان افسر کی نگرانی میں ہندو جانبازوں نے میدان کارزار میں جرأت و ہمت کے جوہر دکھائے۔ تفرقہ اندازوں کی کوششوں کے باوجود اتحاد و اتفاق کی دیوار میں کوئی رخنہ نہیں پڑ سکا۔ اودھ کی راجدھانی لکھنؤ کو بچانے کے لیے دونوں نے دوش بہ دوش رہ کر انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی جد و جہد کی۔ یہ اتفاق ہے کہ اس راہ میں انھیں کامیابی سے ہمکنار ہونا نصیب نہ ہوا۔

ہمارے قومی رہنماؤں کو اتحاد و یکجہتی کے لیے سب سے زیادہ سازگار فضا لکھنؤ ہی کی نظر آئی، اسی لیے علی برادران نے مہاتما گاندھی کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے لا ملایا اور اس اتحاد کی بدولت تحریک آزادی کو ایک نیا موڑ ملا۔ اور اس میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔

لکھنوی تہذیب کے اخلاقی پہلوؤں کو سنوارنے اور سدھارنے میں علمائے فرنگی محل اور ان کے متعلقین کا بڑا حصہ رہا ہے۔ آج بھی ان کے باقیات صالحات اخلاق و شرافت کے ساتھ ساتھ اتحاد و یگانگت کے علمبردار ہیں۔

علمی و ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو آخری دور میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، گنگا پرشاد ورما، بشن نرائن در، برج نرائن چکبست، منشی نول کشور، دوارکا پرشاد افق وغیرہ اور ان سب کے خاندانوں کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان و ادب اور مشترکہ تہذیبی اقدار کے فروغ میں ان کی خدمات مسلم ہیں۔ سرشار نے اتحاد و یگانگت کے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس کا اندازہ فسانہ آزاد سے ہو سکتا ہے۔

لکھنؤ کی روایتی تہذیب کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہ تھی، نہ اس کے پیچھے کوئی روایت تھی جس کے سہارے وہ دوسری تہذیبوں کی طرح صدیوں زندہ رہتی۔ اس میں چونکہ تکلف اور تصنع کا بڑا حصہ تھا اور وہ وقتی و ہنگامی حالات کی پیداوار تھا اس لیے اس کو سرعت کے ساتھ زوال سے ہمکنار ہونا پڑا۔ لیکن تکلف و تصنع سے قطع نظر اس تہذیب کے جو اجزا اعلا اخلاقی قدروں سے مرکب تھے، ان کے اثرات لازوال ثابت ہوئے اور پے در پے حوادث و انقلابات کے باوجود لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے ان اجزا نے بہت کم خارجی اثرات قبول کیے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ملک کے دوسرے حصوں سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ میں بہ کثرت آباد ہونے والے باشندے لکھنؤ پر اپنا مستقل اثر نہ ڈال سکے بلکہ بتدریج لکھنوی تہذیب شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی معاشرت میں سرایت کرتی رہی اور ان پر لکھنویت کا اثر غالب نظر آتا ہے اس کے برعکس دلی کی تہذیب و معاشرت خارجی اثرات سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس نے اپنی انفرادیت کو بھی تقریباً خیر باد کہہ دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں بھی لکھنؤ میں اتحاد و یکجہتی کی فضا قائم رہی۔ اور اس کے بعد سے اب تک اس کے آغوش میں ملک کے مختلف حصوں سے آکر آباد ہونے والے اتحاد و یکجہتی کی پرسکون فضا میں میل و محبت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

★

م۔ک۔ مہتاب

(افسانہ)

دیوار

آج کے زمانے میں اچھا نوکر کہاں ملتا ہے۔ جنھیں مل جائے وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ اب تو پہاڑی علاقوں میں بھی اتنے ام دھندے نکلنے لگے ہیں کہ پشتوں سے شہروں میں آکر بڑے گھروں میں غلامی کرنے والے لوگوں کے بچے بھی نیچے آنے سے کتراتے ہیں۔ لہذا دیوان صاحب اور ان کی بیوی بہت خوش تھے کہ نھیں مائی داس جیسا محنتی اور ہاتھ کا صاف لڑکا گھر کے کام کاج کے لیے مل گیا تھا۔

بات یوں تھی کہ دیوان صاحب کا چپراسی بدری داس ان کا مقروض تھا۔ وہ قرضہ کیا چکاتا غربت کے بوجھ سے ہی چل بسا۔ اس کے بھائی نے قرض چکانے کے طور پر بدری داس کا یتیم بیٹا دیوان صاحب کے گھر بھیج دیا۔ دیوان صاحب مائی داس کو کوئی تنخواہ نہیں دیتے تھے لیکن اس کے حق محنت کے طور پر اس کے کھانے پینے کے علاوہ گھر کے پرانے جھوتے کپڑے وغیرہ مائی داس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اس کے گاؤں بھیج دیے جاتے۔ دیوان صاحب اور ان کی بیوی مائی داس کے کھانے کپڑے کا بھی خاص خیال رکھتے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنا سستا ملازم اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ پھر بھی مائی داس شہر میں رہ کر اداس اداس سا رہتا تھا۔ یہی کوئی بارہ برس کا اکہرے بدن کا لڑکا گول گول آنکھیں نکھری رنگت۔ ماں بہت دن ہوئے مر گئی تھی۔ باپ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی چل بسا۔ گاؤں میں مائی داس اپنے چچا کے آلوؤں کے کھیت میں کام کرتا۔ پہاڑ

ڈھلان ہی سے ایک سے دوسرے کھیت تک بھاگا کرتا۔ گلہریوں اور چڑیوں سے کھیلا کرتا۔ گھر سے جو دال بھات آتا وہ کھاتا اور رات کو کھیت میں بنی پھوس کی ایک جھونپڑی میں ہی سو جاتا۔ وہ چچا کے گھر نہیں جاتا تھا کیوں کہ چچی اسے منحوس ہی نہیں اپنے پر بوجھ بھی سمجھتی تھی جو اس کے ماں باپ کی وفات کے بعد ان پر ڈال گئے تھے۔ وہ جب بھی گھر جاتا اسے چچی کی جھڑکیاں اور صلواتیں سننے کو ملتیں۔ کبھی کبھی تو وہ مائی داس کی خوب پٹائی بھی کر دیتی۔ اس لیے مائی داس گھر کی چہار دیواری میں سونے کی بجائے جھونپڑے کے کچے فرش پر دری بچھا کر سو رہنا بہتر سمجھتا تھا۔ چچی اس کے کھانے کے لیے جو دال بھات بھیجتی کئی بار وہ اس کی بھوک کی نسبت بہت کم ہوتا مگر وہ اس کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھوک بہت تنگ کرتی تو آگ جلا کر اس میں آلو یا آلو کی جڑیں دبا دیتا اور رات کو یہ بھنے ہوئے آلو کھایا کرتا۔

چنانچہ دیوان صاحب کے گھر آکر مائی داس بہت خوش تھا اسے پیٹ بھر کھانا ملتا اور پورے بدن کے کپڑے ملتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک کام میں جٹا رہتا اس پر بھی دیوان صاحب کی بیوی مائی داس کو ڈانٹ دیتی تھی کیونکہ وہ اس عقیدے کی مالک تھی کہ ملازموں کو ڈانٹتے رہنے سے ہی وہ آپ کو مالک سمجھتے ہیں۔ لہذا اپنے مالک ہونے کے جذبے کی تشفی کے لیے وہ مائی داس کو کسی نہ کسی بات پر

دن میں دو چار بار ضرور ڈانٹ دیتی تھی۔ کئی بار یہ ڈانٹ ڈپٹ سن کر مائی داس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اسے گوشت چھلی پلاؤ اور دیوان صاحب کے گھر میں پکنے والے پکوان بھول جاتے۔ اسے پھر سے بھنے ہوئے آلو اور کھیت میں سے گزرتے والی پہاڑی کول کا میٹھا پانی یاد آجاتا۔ وہ کام ختم کرنے کے بعد مکان کی تیسری چھت پر جا بیٹھتا اور بانسری پر کوئی پہاڑی گیت چھیڑ کر رونے لگتا۔

مائی داس کو تنخواہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گاؤں میں نہ ماں تھی نہ باپ۔ نہ شہر میں گھومنے کو جی چاہتا تھا نہ گاؤں جانے کو۔ ہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کو ضرور جی چاہتا تھا۔ دیوان صاحب کے بچے مالک تھے اور وہ ان کا غلام اور ملازم۔ مالک اور غلام مل کر کیسے کھیل سکتے ہیں۔ ارد گرد کے مکانوں میں جو ملازم لوگ تھے مسز مہتی دیوان مائی داس کو ان سے ملنے نہیں دیتی تھیں۔ کیوں کہ وہ چور تھے اچکے تھے، بیڑیاں پینے والے اور جیبیں کاٹنے والے چالاک لڑکے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مائی داس جیسا معصوم لڑکا ان سے مل کر ویسا ہی مجرم بن جائے۔ چناں چہ مائی داس دیوان صاحب کے گھر کی چہار دیواری میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ وہ بازار جا سکتا تھا نہ گلی میں کھیل سکتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی جب دیوان صاحب بیوی بچوں کو کہیں پکنک کے لیے لے جاتے تو مائی داس بھی گھر سے باہر جاتا۔ وہ باغوں میں جا کر ان کے لیے دریاں بچھاتا۔ برتن صاف کرتا۔ پانی لاتا۔ دیوان صاحب اور ان کے بچے خوب ڈٹ کر کھاتے پیتے۔ مائی داس کو کسی کاغذ پر کھانا ڈال کر الگ بٹھا دیا جاتا۔

دیوان صاحب کو کئی بار مائی داس سے یہ سلوک اچھا نہیں لگتا تھا لیکن مالتی کا ایک ہی جواب تھا "آپ کے گھر میں کبھی نوکر رہا ہو تب نا۔ میرے مائیکے میں بارہ بارہ نوکر تھے۔ میں جانتی ہوں ان سے کیسے نپٹا جاتا ہے۔ نوکر کو سر چڑھاؤ تو وہ ایک ہفتے میں ہی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔"

دیوان صاحب کبھی کبھی رات کو مکان کی چھت پر بیٹھے مائی داس کی بانسری کا پُر درد نغمہ سنتے تو من ہی من میں محسوس کرتے کہ انھوں نے ایک آزاد پرندے کو اس مکان میں لا کر قید کر دیا ہے۔ یہ دکھ اس وقت اور بھی بڑھ جاتا جب وہ مائی داس کو حسرت بھری نگاہوں سے بچوں کے ساتھ ماں باپ کو لاڈ و پیار کرتے دیکھا کرتا۔ مائی داس جس نے نہ ماں کی ممتا دیکھی تھی نہ باپ کا پیار۔ جب مالتی صبح بچوں کو نہلاتی، کپڑے پہناتی۔ عمدہ کھانے کھلاتی اور ان کے گال چوم چوم کر اسکول کے لیے رخصت کرتی تو مائی داس بت کی طرح یوں کھڑا دیکھتا رہتا جیسے یہ کسی اور دنیا کا منظر ہو۔ شام کو جب دیوان صاحب دفتر سے لوٹتے تو تینوں بچے ممی ڈیڈی آگئے۔ کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے۔ دیوان صاحب بچوں کے لیے کھلونے، ٹافیاں، بسکٹ وغیرہ لایا کرتے۔ کچھ دیر بعد بچوں کو لے کر وہ بازار کی سیر کے لیے چلے جاتے۔ نل پر برتن دھوتا ہوا مائی داس منہ پھیر پھیر کر ان کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک شام دیوان صاحب نے مائی داس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے بھی دیکھے تھے۔ اس رات وہ بہت دیر تک چھت پر بیٹھا بانسری بجاتا رہا جیسے پہاڑوں کو بلا رہا ہو اپنی بھیڑ بکریوں کو آواز دے رہا ہو۔ دیوان صاحب نیچے کمرے میں بیٹھے نغمے سنتے رہتے اور سوچتے رہے کہ انھیں بچوں کو سیر پر لے جاتے دیکھ کر مائی داس کو ضرور وہ دن یاد آ رہا ہوگا جب میلی سی چادر اور کھدر کی ٹوپی والا ایک شخص جو اس کا باپ تھا ایک ہاتھ میں ناریل کی گرگری اور دوسرے ہاتھ میں اس کی انگلی تھامے اسے میلہ دکھانے لے جا رہا ہوگا، اس نے اپنے بیٹے کو گڑ کی مٹھائی لے کر دی ہوگی اور کوئی تماشا بھی دکھایا ہوگا لیکن نہ اب ماں ہے نہ باپ۔ شہر میں کھانے پینے اور پہننے کو کتنا کچھ ہے لیکن کوئی انگلی نہیں جسے تھام کر مائی داس چل سکے۔ کہیں کرم ہونٹ نہیں جو اس کی پیشانی پر ثبت ہو سکیں۔ پہاڑ پر کم از کم خنک ہوائیں تو ہوں گی جو اس کے خشک بھورے بالوں میں کنگھی کر جاتی ہوں گی۔

لیکن مکان کی چھت پر تو وہ ہوا ابھی نہیں پہنچ پاتی۔ اسی لیے مائی داس بانسری پر رو رہا ہے۔

دیوان صاحب کا من چاہا کہ مائی داس نیچے آئے وہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے باہر لے جائیں۔ لیکن یہ بات مالک اور ملازم کے تصوراتی رشتے کے کتنی خلاف ہوگی اور مالتی تو مساوات کا یہ کرشمہ دیکھ کر اپنے بال نوچ لے گی۔ اس غریب کی شامت آجائے گی۔ مالتی اسے کھانے پینے کے لیے سب کچھ دے سکتی ہے لیکن ملازم کی سطح پر رکھ کر انگلی پکڑ کر نہیں۔ اس کی ممتا اپنے بچوں کے لیے ہی ہے۔ وہ اس میں مائی داس کو شریک نہیں کر سکتی۔ اسی طرح وہ دیوان صاحب کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ مائی داس کو اپنی پدرانہ شفقت میں حصے دار بنائیں۔ یہ ایک دیوار تھی جسے مالتی ہر قیمت پر کھڑا رکھنا چاہتی تھی اور اسے تھامے رکھنے کے لیے دیوان صاحب کو بھی کئی بار مائی داس سے ناز یبا سلوک کرنا پڑتا۔

مائی داس بانسری پر رونے کے بعد جب نیچے آیا تو دیوان صاحب نے اسے ڈانٹ دیا کہ وہ کہاں تھا، بچوں کو دودھ دینا ہے۔ بستر لگانے ہیں۔ کتّے کو دوائی کھلانی ہے اور تو ابھی سے چھت پر جا کر گانا بجانا کرنے لگا ہے! ابھی وہ اسے اور بھی سخت سست کہنے والے تھے کہ دیوان صاحب کا بڑا لڑکا آ کر ان کے گلے لگ گیا۔ وہ اسکول سے انعام لایا تھا۔ دیوان صاحب نے اسے گلے لگایا۔ اس کے گال چومے۔ پیار کیا اور پیٹھ تھپکتے رہے۔ مائی داس بت بنا سب کچھ دیکھتا رہا۔ دیوان صاحب نے اسے یہ کہہ کر بھگا دیا۔ "ابے الّو کیا دیکھ رہا ہے جا بستر لگا۔"

سردیوں کی راتیں گذارنے کے لیے ایسے نرم و گداز بستر مائی داس نے کہاں دیکھے تھے۔ اسے تو چچا کے کھیت میں کھپریل کی جھونپڑی یاد تھی جس میں پڑی گھاس پھوس پر وہ اپنا بستر لگایا کرتا تھا۔ وہ مخمل کے بستروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی نرمی کا احساس کرتا لیکن اسے اس بات پر بھی حیرانی ہوتی کہ دیوان صاحب کے بچوں کو ان عمدہ بستروں پر بھی نیند نہیں آتی تھی وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ممی اور ڈیڈی کے بستروں میں چلے جاتے تھے۔ انھیں اپنے بستروں میں سردی لگتی تھی۔ مائی داس اپنے چھوٹے سے کمرے میں سینے سے گھٹنے لگائے سوچا کرتا کہ ماں کی قربت میں کتنی گرمی ہوگی جو یہ بچے راتوں کو ایسے اچھے اچھے بستروں سے اٹھ اٹھ کر ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ماں کیا ہوتی ہے؟ ممی۔ ماں۔

ایک رات برف کا طوفان آیا تھا۔ اولے پڑے تھے۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ مائی داس نے دیوان صاحب اور بچوں کے کمروں میں ہیٹر لگا دیے تھے اور خود اپنی کوٹھری میں آ کر پرانے کمبل اور رضائی میں دبک رہا تھا۔ لیکن دانت کٹکٹا رہے تھے۔ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔

اچانک دیوان صاحب کی بیوی مالتی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چور چور کا شور مچا دیا۔ اور پھر بے تحاشا مائی داس کو پیٹنے لگیں جو سردی میں ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا ان کے بستر میں گھس آیا تھا اور گلے میں بانہہ ڈال کر ان سے لپٹ گیا تھا۔

دیوان صاحب نے اسے کھینچ کر مالتی کے بستر سے الگ کر دیا۔ مائی داس ان کے قدموں میں گرا گڑگڑا رہا تھا۔

"ڈیڈی مجھے ایک رات ممی کے پاس سو لینے دو۔۔۔۔"

اور دیوان صاحب اسے بازوؤں سے کھینچ کر یوں کھڑا کر دیتے تھے جیسے گرتی ہوئی دیوار کو پھر سے کھڑا کر دیتے ہوں۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر
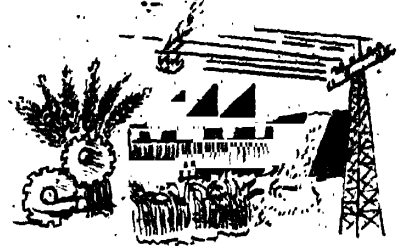
جنتا سروس کے تحت بجلی کے ۵۰۰۰ کنکشن دیے گئے ●●● آگرہ کو خوبصورت بنانے کی اسکیم جنگی پیمانے پر بروے کار لائی جائیں گی ●●● وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں آگرہ ٹرانسپورٹ نگر کا افتتاح ●●● بندیل کھنڈ میں آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی : قواعد نرم کر دیے گئے ●●● آزاد کا پستول میونسپل میوزیم الہ آباد کو منتقل، ●●● بارہ بنکی کتائی مل میں مشینوں کی تنصیب ●●● ڈپلوما ہولڈروں کے لیے اپرنٹس شپ اسکیم ●●● یو پی ریاستی تیل کارپوریشن کے نئے مینیجنگ ڈائرکٹر۔

اتر پردیش میں ۲۰ نکاتی پروگرام اور دوسری ترقیاتی سرگرمیوں پر پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ذیل میں بعض اہم اقدامات اور پروگراموں کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے:

جنتا سروس کنکشن : اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی جنتا سروس کنکشن اسکیم کے پہلے مرحلہ کے تحت راٹھ (ضلع ہمیر پور) میں وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے جیسے ہی بجلی کے کنکشنوں کا رسمی افتتاح کیا، اتر پردیش کے وسیع دیہی علاقوں میں بسنے والے ہریجنوں، بے زمین مزدوروں، چھوٹے کسانوں اور دوسرے غریب اور کمزور طبقوں کی پانچ ہزار جھونپڑیاں اور مکانات بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔ اس اسکیم کے تحت ریاست میں اس سال کل ایک لاکھ کنکشن دیے جائیں گے۔

اس سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ وزیر اعظم کے نئے معاشی پروگرام کے تحت جنتا سروس ایک اہم قدم ہے جس سے ترقی اور خوش حالی کی نئی راہیں کھل جائیں گی اور اتر پردیش کے دیہی علاقوں کا سماجی اور معاشی نقشہ ہی بدل جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی اسکیم کو ملک کی ایک انوکھی اسکیم بتاتے ہوئے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ نے ایسی نئی ڈیزائن تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے جن سے دیہات کے کچے مکانوں میں بھی بآسانی بجلی لگائی جا سکتی ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ بجلی بورڈ اس طرح کی دوسری اسکیمیں بھی شروع کرے گا جس سے گاؤں کے محنت کش طبقے کا معیار زندگی بلند کیا جا سکے بشری تیواری نے بتایا کہ اتر پردیش ریاستی بورڈ ۷۷-۱۹۷۶ء کو "صارفین خدمت سال" کی حیثیت سے منا رہا ہے اور اس دوران صارفین کی ہر امکانی خدمت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ان پروگراموں کی کامیابی کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے اس اسکیم کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی بجلی بورڈ بہت ہی کم قیمت پر بجلی کے کنکشن دے گا اور وہ خود ہی گھروں پر وائرنگ بھی کرائے گا۔ چنانچہ سروس کنکشن اور وائرنگ کی لاگت ایک بلب کے لیے ۶۰ روپے، دو بلبوں کے لیے ۸۰ روپے اور تین بلبوں کے لیے ۱۰۰ روپے ہوگی۔ یہ پوری رقم صارفین کی سہولت کے لحاظ سے یک مشت یا بالترتیب ۶ روپیہ، ۸ روپیہ اور ۱۰ روپیہ کی ۱۲ ماہانہ قسطوں میں وصول کی جائے گی۔ اسی طرح بجلی کی قیمت بھی۔ انھوں نے کہا بہت کم رکھی گئی ہے۔ یعنی ایک بلب کے لیے ۴ روپیہ، دو بلبوں کے لیے ۶ روپیہ اور تین بلبوں کے لیے ۷ روپیہ ماہانہ۔

وزیر اعلیٰ نے دیہی علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے لیے جس پر ریاست کی معاشی خوشحالی کا انحصار ہے، بجلی کو اولین شرط قرار دیتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت زرعی مقاصد کے لیے بجلی کی مسلسل فراہمی کے واسطے ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔ اگرچہ پچھلے کچھ برسوں میں بجلی کی فراہمی پر بعض پابندیاں عائد کرنا پڑیں، لیکن اب بجلی رات دن دستیاب

ہے اور بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ریاست میں دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اور تنہا سال رواں کے دوران ۴۰۰۰۰ نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

آخر میں وزیر اعلا نے کہا کہ ریاستی حکومت اور اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی مشترکہ کوششوں سے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو بجلی فراہم کرنا ممکن ہو سکے گا اور صارفین کو حتی المقدور سستی سے سستی بجلی مہیا کی جا سکے گی۔

وزیر اعلا کے ہاتھوں آگرہ ٹرانسپورٹ نگر کا افتتاح

آگرہ، متھرا روڈ پر وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے گزشتہ ۲ جولائی کو گرو کا تال، گرودوارہ کے قریب آگرہ میں ٹرانسپورٹ نگر کے پہلے مرحلہ کا افتتاح کیا۔

انھوں نے اس موقع پر ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سول حکام، فوج کے جوانوں، مزدوروں اور تکنیکی ماہروں کی محنت و جانفشانی سے ٹرانسپورٹ نگر کے اول مرحلہ کی تکمیل مقررہ مدت کے اندر ممکن ہو سکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آگرہ شہر کو دلکش بنانے کے دیگر منصوبے بھی مقررہ وقت کے اندر مکمل کر لیے جائیں گے۔

شری تیواری نے کہا کہ بین اقوامی شہرت کا مالک شہر آگرہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سڑکوں کو چوڑا کر کے، ناجائز قبضے ہٹا کر اور گندی بستیوں کی صفائی کر کے شہر کو خوبصورت بنانے کی کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ مہاتما گاندھی مارگ کو چوڑا کرنے کا کام آئندہ یکم نومبر تک مکمل ہو جانے کی توقع ہے۔ آگرہ میں جمنا ندی پر ایک بیراج تعمیر کرنے کا معاملہ بھی زیر غور ہے۔ انھوں نے کہا کہ فتح پور، متھرا اور بندرابن کے نواحی علاقوں کو ترقی دینے کے لیے بھی اقدامات کیے جائیں گے۔

آگرہ ڈولپمنٹ اتھارٹی ۳ کروڑ ۳۸ لاکھ روپئے کی مجموعی لاگت سے دو مرحلوں میں ٹرانسپورٹ نگر کی تعمیر کر رہی ہے۔ ٹرانسپورٹ نگر کا کل رقبہ ۱۲۶ ایکڑ ہے جس میں سے ۶۴ ایکڑ زمین پر پہلے مرحلے کے تحت کام شروع کیا گیا تھا۔ یہ زمین غیر ہموار تھی اور ٹیلوں کے بھٹوں کی وجہ سے اس پر جا بجا گہرے گڑھے ہو گئے تھے۔ اس پراجکٹ کا پہلا مرحلہ ۳۰ جون تک مکمل کر لینے کا فیصلہ گزشتہ مئی میں اس وقت کیا گیا تھا جب وزیر اعلا نے آگرہ کا دورہ کیا تھا۔ ٹرانسپورٹ نگر کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ ٹرانسپورٹ کے کام میں لگے ہوئے لوگوں اور ان کی کمپنیوں کو خاص شہر کے بجائے زیادہ مناسب مقام پر منتقل کیا جا سکے اور جمنا سڑک پر قلعہ کے قریب اور دیگر علاقوں، مثلاً کوتوالی، موتی کٹرہ اور درانسی کے علاقوں میں بھاری موٹر گاڑیوں کی وجہ سے آمد و رفت میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دور کیا جا سکے۔ نیز آگرہ کو خوبصورت بنانے کی اسکیموں کو آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ مکمل کیا جا سکے۔

زمین کو ہموار کرنے کے علاوہ سڑکوں کی تعمیر کرنے، پائپ لائین بچھانے اور بجلی مہیا کرنے کے سلسلے میں کافی کام مکمل ہو گیا ہے۔ ٹرانسپورٹ نگر میں ٹرانسپورٹ کمپنیوں، ٹرک کی باڈی بنانے والوں، فاضل پرزے تیار کرنے والوں، مرمت کی دوکانوں، عام دکانوں، کینٹینوں، پیٹرول سروس اسٹیشنوں، کولڈ اسٹوریج، بینک، تھانہ اور گوداموں وغیرہ کے لیے پلاٹوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔

آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی: قواعد نرم کر دیے گئے

ریاستی حکومت نے بندیل کھنڈ علاقے میں آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے مالی امداد کی منظوری کے مروجہ قواعد نرم کر دیئے ہیں۔

حکومت نئے قواعد کے بموجب بندیل کھنڈ کے ایسے علاقوں کے کاشتکاروں کو، جن کے پاس دو ہکٹیر سے زیادہ زمین ہے اور جہاں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق اسکیم زیر عمل ہے، پمپنگ سیٹ یا نجی ٹیوب ویل کی واقعی لاگت کے ۲۵ فیصد یا قابل منظوری قرضے کی انتہائی حد کے ۲۵ فیصد کے برابر (جو بھی کم ہو) مالی امداد دے گی لیکن اس کی انتہائی حد ۳۰۰۰ روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

اسی طرح ان علاقوں میں جہاں سوکھے کے علاقوں کی اسکیم زیر عمل نہیں ہے ایک ہکٹیر جوت تک کے کاشتکاروں کو پمپنگ سیٹ یا نجی ٹیوب ویل کی واقعی لاگت کے ۳۳ ۱/۳ فیصد یا

قابل منظوری قرضے کی انتہائی حد کے ۱/۳ ۳۳ فیصد کے بقدر (جو بھی کم ہو) سرکاری امداد دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں ایک ہکٹیر سے زیادہ جوت والے کاشتکاروں کو پمپنگ سیٹ یا نجی ٹیوب ویل کی واقعی لاگت کے ۲۵ فیصد یا قابل منظوری قرضے کی انتہائی حد کے ۲۵ فیصد کے مساوی (جو بھی کم ہو) مالی امداد دی جائے گی لیکن یہ امداد ۳۰۰۰ روپیہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔

اس سلسلے میں صرف ایسے کاشتکار حکومت سے مالی امداد پانے کے مستحق ہوں گے جو اپنی درخواستوں کا اندراج بلاک ترقیاتی افسر کے دفتر سے کرائیں گے اور اپنی درخواستوں کے اندراج کی تاریخ سے پمپنگ سیٹ کے معاملے میں چھ ماہ کے اندر اور نجی ٹیوب ویل کے معاملے میں ایک سال کے اندر کارروائی پوری کرائیں گے۔ بہر حال ضلع حکام کو اس ضمن میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ خصوصی حالات میں اس مدت میں، پمپنگ سیٹ کے معاملہ میں چھ ماہ اور ٹیوب ویل کے معاملہ میں ایک سال تک کی توسیع کر سکتے ہیں۔

کسان اگر اپنے ذاتی وسائل سے یا قرضے حاصل کر کے چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کے وسائل مکمل کر لیتے ہیں تو ایسی صورت میں ان دونوں زمروں کے کاشتکار سرکاری مالی امداد کے مستحق ہوں گے۔

یہ مالی امداد ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ (منصوبہ بندی)۔ یا ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ (پراجکٹ) یا ضلع منصوبہ بندی افسر منظور کریں گے۔

امید کی جاتی ہے کہ ان قواعد کو نرم کر دینے سے بندیل کھنڈ کے علاقوں میں چھوٹے پیمانے کے آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ سال ۷۶-۱۹۷۵ کے دوران ۸۰ نجی ٹیوب ویلوں کی تعمیر اور ۱۴۸ پمپنگ سیٹوں کی تنصیب کی گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ سال رواں کے دوران اس کارگزاری میں دوگنا اضافہ ہو جائے گا۔

آزاد کا پستول میونسپل میوزیم، الہ آباد کو منتقل: ممتاز مجاہد آزادی اور شہید وطن شری چندر شیکھر آزاد کا پستول ۳ جولائی کو ریاستی میوزیم کے آڈیٹوریم میں محکمۂ ثقافتی امور کے کمشنر و سکریٹری شری مہیش پرشاد نے میونسپل میوزیم الہ آباد کو پیش کیا جسے میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس سی کالا نے قبول کیا۔

اس موقع پر شری مہیش پرشاد نے شری آزاد کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حب الوطنی اور جرأت کی کوئی حد نہ تھی اور وہ ہندستانی انقلابی جماعت کے ایک سرگرم کارکن تھے۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ شری مہیش پرشاد نے کہا کہ آزاد کا پستول جو ملک کا ایک بیش بہا تاریخی اثاثہ ہے میونسپل میوزیم، الہ آباد کو نمائش کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں مادر وطن کی آزادی کی حفاظت کے لیے ان کی زندگی سے تحریک حاصل کر سکیں۔

محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اور ثقافتی امور کے ڈائرکٹر شری آر ڈی موہن سیٹھی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔

بارہ بنکی کتائی مل میں مشینوں کی تنصیب: چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی نے ۲ جولائی کو بارہ بنکی میں اتر پردیش ریاستی کتائی مل میں مشینوں کی تنصیب کی افتتاحی رسم ادا کی۔

اتر پردیش ریاستی ٹکسائل کارپوریشن پانچ کروڑ روپے کی لاگت سے یہ مل قائم کر رہا ہے۔ اس مل میں مجموعی طور پر ۲۵۰۸۰ تکلے ہوں گے جن کی پیداواری صلاحیت تقریباً ۴۰ لاکھ کیلو گرام یارن سالانہ ہوگی۔ یہ مل ابتدائی مرحلوں میں ۵۰ فیصد سوتی دھاگا اور ۵۰ فیصد اسٹیپل یارن تیار کرے گی جس کے لیے ہر سال تقریباً ۱۶۰۰۰ گانٹھ روئی اور ۵۰۰ گانٹھ ریشم تیار ہوگا۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ مل مارچ ۱۹۷۷ء تک مکمل ہو جائے گی۔ اور اس میں تقریباً ۱۱۰۰ افراد کو براہ راست اور کئی ہزار افراد کو بالواسطہ روزگار ملے گا۔ اس مل میں ۲۰ ایس اور ۳۰ ایس قسم کا یارن تیار ہوگا جس سے تقریباً ۲۹۸ لاکھ میٹر سالانہ کپڑا

تیار کرنے میں مدد ملے گی۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شریمتی قدوائی نے کہا کہ اس مل کے قیام سے بنکروں کی ایک دیرینہ مانگ پوری کرنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ یارن کے معاملہ میں خود کفالت کے حصول اور معاشی پروگراموں کی تکمیل کے سلسلے میں یہ پہلا قدم ہے۔

شریمتی قدوائی نے مل کے قیام سے وابستہ افراد سے اپیل کی کہ وہ مقررہ مدت سے قبل ہی بقیہ تمام کام پورا کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقے کے بنکروں کو فوری راحت ملے گی جو یارن کی قلت سے دوچار ہیں۔

ڈپلوما ہولڈروں کے لیے اپرنٹس شپ ٹریننگ: محکمہ تعمیرات عامہ میں اپرنٹس شپ اسکیم کے تحت، جو ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا ایک اہم جزہے، امسال ایک سال کی تربیت کے لیے ۳۰۵ ڈپلوما ہولڈروں اور ۴۰ ڈگری ہولڈروں کا اندراج کیا جائے گا۔

تربیت حاصل کرنے والے امیدواروں کی فوری تقرری کے لیے جن ۲۲ سپرنٹنڈنگ انجینئروں کو مامور کیا گیا ہے ان کی رپورٹ کے مطابق اب تک ۹۴ ڈپلوما ہولڈروں اور ۲۳ ڈگری ہولڈروں کی تقرری کی جا چکی ہے۔ ان میں سے پانچ ڈپلوما ہولڈروں اور چار گریجوٹ انجینئروں کا تعلق اقوام مندرجہ فہرست سے ہے۔ مطلوبہ تعداد میں امیدواروں کے دستیاب نہ ہونے کے باعث سپرنٹنڈنگ انجینئروں سے کہا گیا ہے کہ وہ بورڈ آف اپرنٹس شپ ٹریننگ کانپور سے اقوام مندرجہ فہرست اور عام امیدواروں کی فہرست حاصل کریں اور خالی اسامیوں پر فوری تقرری کر دیں۔

پل کارپوریشن کے نئے منیجنگ ڈائرکٹر: ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ کے جوائنٹ سکریٹری شری ٹی۔ سی۔ چترویدی نے اترپردیش ریاستی پل کارپوریشن کے نائب چیرمین اور منیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا ہے۔ انھوں نے شری رتیش موہن کی جگہ چارج لیا ہے جو ریٹائر ہو گئے ہیں۔

★

اردو افسانہ

(صفحہ ۱۱ کا بقیہ)

بھی مجبور کرتے تھے کہ فنکار اس طرف متوجہ ہو۔ ایسا نہیں تھا کہ زندگی طرف توجہ نہ دی گئی ہو، لیکن فرد بہرحال ایک معاشرے کا حصّہ ہوتا ہے اور جب معاشرے کا یہ حال ہو، جو اس زمانے میں تھا تو پھر افسانہ نگار کا کام بھی نسبتاً آسان تھا وہ بہت کچھ تو بغیر کسی مزید رنگ آمیزی کے پیش کر دیتا تھا اور یہ قاری کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ادب میں حقیقت پسندی کسی چور دروازے سے نہیں بلکہ صدر دروازے سے داخل ہوئی ہے۔ اس کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوا۔ مختصر افسانہ ابتدا ہی سے تاریخ کے ادبی تقاضوں سے پورے طور پر ہم آہنگ تھا۔ اس کے بعد پھر اس میں موضوعات کا تنوع ہوا۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی عوامل اس پر برابر اثر انداز ہوتے رہے۔ تقسیم ہند نے ایسے سیاسی مسائل پیش کیے جن کے اثرات نہ صرف سیاسی حد تک محدود رہے بلکہ اس نے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات بھی ڈالے چنانچہ اردو افسانہ اُن سے متاثر ہوا۔ منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد وغیرہ نے اپنے افسانوں سے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں اردو افسانے نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور بقول ڈاکٹر محمد حسن آج مختصر افسانہ اردو نثر کا سب سے ترقی یافتہ فارم ہے اور اس کی بدولت اردو نثر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب۔ آگ اور دھواں۔ مصنف: احمد ابراہیم علوی۔ قیمت: دو روپیہ مجلد، خوشنما کور۔ عمدہ کاغذ، نفیس کتابت، اعلیٰ طباعت۔ علوی پبلشرز۔ ۳۔ ہیلیٹ اسکوائر لکھنؤ۔

آگ اور دھواں فلسطینی مجاہدین کے سرفروشانہ کارناموں اور لبنان کی خانہ جنگی کے متعلق تین مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلے دو مضامین 'جنگ کیوں؟' اور 'آگ اور دھواں' فلسطین اور فلسطینی مجاہدین کے سلسلے میں ہیں اور آخری تیسرا مضمون "جلتا ہوا شہر" لبنان کی خانہ جنگی اور اس سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی کی المناک اور عبرت انگیز داستان ہے۔ ہر مضمون بصیرت افروز، نتیجہ خیز اور انتہائی موثر ہے۔

احمد ابراہیم علوی اردو کے ہونہار اور حقیقت پسند ادیب و افسانہ نگار ہیں۔ 'متاع قلم' ان کا ورثہ ہے۔ حریت پسندی، حق گوئی، جرأت اور بیباکی فطرت ثانیہ ہے! اظہار خیال پر قدرت ہے۔ اسی لیے ان کے قلم میں دلکشی و رعنائی، سچائی و توانائی پائی جاتی ہے "انھیں فطری طور پر حریت پسندوں سے ہمدردی اور ان کو کچلنے والی طاقتوں سے نفرت ہے۔" اسی لیے جب لوگوں کو اپنے وطن سے بے وطن کیا جاتا ہے۔ بچوں کو یتیم اور ماؤں کو بیوہ کیا جاتا ہے تو ان کا دل دکھتا ہے، آنکھ روتی ہے اور قلم چل دیتا ہے، اور وہ "اسے تحریر میں مصنوعی حسن پیدا کرنے یا کسی بھی قسم کی روایت یا بندش کو مدنظر رکھنے کے لیے" رکتے نہیں۔

علوی نے بڑے موثر پیرایہ میں تاریخی حقائق کے ساتھ، عرب اسرائیل جنگ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اسرائیل کو "ایک مصنوعی ملک سمجھتے ہیں جو غیر قانونی اور ناجائز طریقے سے وجود میں آیا ہے۔ ہندستان نے ہمیشہ فلسطین کے عربوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس نے اب بھی اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔ مہاتما گاندھی نے ۱۲ نومبر ۱۹۳۸ء کے ہریجن میں لکھا تھا کہ:۔

"فلسطین اسی طرح سے عربوں کا ہے جس طرح فرانسیسیوں کا فرانس اور انگریزوں کا انگلینڈ"

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے روزنامہ ھند و مدراس مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء میں لکھا کہ:

"فلسطین ایک عرب ملک ہے اور وہاں پر عرب مفادات ہی کو برتری حاصل ہونی چاہیئے۔"

لیکن عظیم طاقتیں، جمہوری قبا پہن کر 'دیو استبداد' بنی ہوئی ہیں، اقوام متحدہ کے اکثریتی فیصلے ان کے 'ویٹو' سے مسترد ہو جاتے ہیں، جمہوریت، انصاف اور انسانیت سے اتنا بڑا مذاق، آمریت، ظلم، اور بربریت کے زمانے میں بھی کبھی نہیں کیا گیا۔

علوی کے الفاظ میں:

" دنیا کی تمام بڑی طاقتیں دنیا کے انصاف پسندوں کے ساتھ بڑا بے رحمانہ کھیل کھیل رہی ہیں اور یہ اتنا خطرناک کھیل ہے کہ اس میں ایک دن ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔"

لیکن یہ کھیل بڑی طاقتیں زیادہ دنوں تک نہیں کھیل سکتیں حق قوت ہے، قوت حق نہیں ہے۔ آج اسرائیل اپنے آقاؤں کی بے پناہ امداد سے خواہ کتنا ہی طاقتور اور مسلح ہو جائے لیکن مجاہدین فلسطین کے عزائم کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور وہ دن دور نہیں ہے جب حق حقدار کو ملے گا اور جابر و ظالم کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

دوسرا مضمون "آگ اور دھواں" ہے۔ اس کے لکھنے کا سبب، علوی کے الفاظ میں، یہ ہوا کہ:

"میں نے لندن میں رنگین ٹی وی پر یروشلم اور اسرائیل کے دوسرے شہروں میں عرب حریت پسندوں کے مظاہرے، احتجاج اور غم و غصے کو دیکھا اور اسرائیلی بربریت اور ظلم کے دل ہلا دینے والے مناظر سے دل کانپ اٹھا تو پھر قلم اٹھایا اور "آگ اور دھواں" کی تخلیق ہوئی۔"

یہ مضمون کیا ہے؟ ہمت و جرأت، قربانی و ایثار، عزم و حوصلہ، سرفروشی و جانثاری کا پیکر حریت ہے۔

میں نے اس مضمون یا کہانی کو پیکر حریت کہا، اس کا ایک ایک کردار 'کوہ استقامت' ہے۔ علوی نے بڑے پر جوش اور خوبصورت الفاظ میں مرقع کشی کی ہے۔

تیسرا مضمون 'جلتا ہوا شہر' وجود میں اس وقت آیا، جب علوی نے بیروت میں خانہ جنگی کے بدترین مناظر دیکھے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تو ان کے قلم نے جنبش کی اور جلتا ہوا شہر وجود میں آگیا۔

'آگ اور دھواں' کی تینوں کہانیاں، حریت و انسانیت، اعلیٰ جذبات اور مثالی کردار کا مرقع ہیں۔ علوی کے قلم میں سادگی، روانی، جوش، جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک ایک لفظ، دل پر اثر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنا قلم ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کی حمایت میں اٹھایا ہے۔ اس سے ہمارے ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ ظلم کہیں بھی ہو کسی شکل میں ہو، اس کے خلاف قلم چلنا چاہیے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ نوجوان ادیبوں میں علوی نے شعوری طور پر اس کو اپنا نصب العین بنایا۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

نام کتاب۔ پچھلے پہر۔ مصنف۔ جاں نثار اختر۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ ۔ صفحات ۹۶ قیمت۔ سات روپے۔ شائع کردہ۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

ترقی پسند تحریک کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن کے پردے پر صف اول کے جن شعراء کے نام ابھرتے ہیں ان میں جناب جاں نثار اختر کا نام بہت ہی نمایاں ہے۔ جاں نثار اختر اس تحریک کے ان قدآور شعراء میں ہیں جنھوں نے ماحول میں اپنی شخصیت کو ضم نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی شخصیت سے ماحول کو نکھارا ہے۔ نعرے بازی کے اس پورے ماحول میں فیض، مجاز، مخدوم اور

جذبی کے بعد اگر کوئی شاعر ایسا نظر آتا ہے جس نے روایت کی صالح نزاکتوں کو محلِ نظر رکھتے ہوئے غزل کو نرم ولطیف لب ولہجے کے ساتھ سرمایۂ سخن بنایا ہے تو وہ ہیں جناب جاں نثار اختر۔

پچھلے پہر جاں نثار اختر کی نئی غزلوں کا دلکش مجموعہ ہے جس کے لیے اگر آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ "جاں نثار کی شاعری آج بھی جوان ہے اور آج کی حسیت کی عکاسی کر رہی ہے" تو ڈاکٹر محمد حسن کہہ رہے ہیں کہ "جاں نثار اختر ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو زندگی کے بارے میں شاعری نہیں کرتے، شاعری کو زندگی بنا کر گزارتے ہیں" خواجہ احمد فاروقی فرماتے ہیں کہ "جاں نثار اختر کو یقین اور کیٹس کی طرح ادبی مصوری میں بڑا ملکہ ہے۔ وہ ذہنی اور تجریدی تصورات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کر سکتے ہیں"

حقیقت بھی یہی ہے کہ طویل ترین خاموشی کے بعد جاں نثار اختر صاحب نئی غزل کے جلو میں جو تازگی اور دلکشی لے کر ادبی دنیا میں واپس آئے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ الفاظ کی دلکشی، فکر کی تازگی اور تخیل کی رفعتوں کے حصار میں انھوں نے تجربات، حالات اور واقعات کو جس انداز سے مصور کیا ہے وہ ان کی شعری سحر کاری کا ثبوت ہے۔

پچھلے پہر کے چند متفرق اشعار آپ بھی بلاحظہ فرمائیں۔

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو — زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

کم نہیں نشے میں جاڑے کی گلابی راتیں — اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

زندگی ایک خلش دے کے نہ رہ جا مجھ کو — درد وہ دے جو کسی طرح گوارا ہی نہ ہو

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں — تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان — تجھ کو دیکھوں تو مجھ کو پیاس لگے

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں — کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو — غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے

مختصر یہ کہ پچھلے پہر ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کے بغیر کسی بھی لائبریری کا عصری ادب نامکمل سا معلوم ہوگا۔

نام کتاب۔ ہماری زندگی : مصنف۔ شفیع الدین نیر۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
ضخامت۔ ۸۰ صفحات۔ قیمت: دو روپے
ناشر۔ نیر کتاب گھر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

بچوں کا ادب بادی النظر میں کتنا ہی آسان و سہل کیوں نہ معلوم ہوتا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ اس ادب کی تخلیق کے لیے بچوں کی پسند اور ان کی نفسیات کا گہرا شعور ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو زبان وادب کے تمام گراں بہا سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں تو چند ہی ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے بھرپور کام کیا ہے۔

ایک ماہر نفسیات کی طرح ننھے ننھے ذہنوں میں جھانکنا، ان کی انہونی اور انوکھی خواہشات کا مطالعہ کرنا، ان کی عجیب وغریب الجھنوں سے واقف ہونا اور پھر بچوں ہی کی زبان میں ان کے پسند کے فن پاروں کی تخلیق کرنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بچوں کے لکھنے والوں کا جب ذکر آتا ہے تو مولانا اسمٰعیل میرٹھی۔ حامد اللہ افسر، ڈاکٹر ذاکر حسین اور شفیع الدین نیر کے علاوہ جلد ہی کوئی نام ذہن میں نہیں آتا ہے حالانکہ اردو زبان کا دامن مختلف اصناف کے ادب پاروں سے بھرا پڑا ہے۔

"ہماری زندگی" جناب شفیع الدین نیر کی ۳۲ مختلف نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں مختلف پیشوں کے نمائندوں کا ذکر کیا ہے۔ فن کے ان ماہرین میں ڈاکٹر صاحب، استاد صاحب اور بابوجی کے علاوہ ممتی یا درجی، مولا بخش بھشتی، رامو کنجڑا اور رابعہ رام مہتر جیسے وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کو سماج کا بڑا طبقہ آج بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ نیر صاحب نے ان تمام فن کاروں کا تعارف جس خوبصورت انداز میں کرایا ہے اس سے بچوں کے ذہنوں پر یقیناً ایک اچھا اثر پڑے گا۔ آج کے ترقی پذیر دور میں جبکہ طبقاتی نظام کے خلاف بھرپور جنگ چھڑی ہوئی ہے "نئی زندگی" کی اشاعت ایک حوصلہ مند، خوبصورت اور قابل قدر کوشش ہے۔

نام کتاب۔ اردو ہے جس کا نام : مصنف۔ ضیا بانی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت۔ چھ روپے
ناشر: نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ۔ ۴۴ جیل روڈ ایسٹ۔ ڈونگری بمبئی ۹

جیسا کہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے اردو سے متعلق جناب ضیا بانی کی ایک طویل نظم ہے جس میں اردو کے بیشتر شعراء وادبا کے اسمائے گرامی نظم کیے گئے ہیں اور اس طرح یہ نظم ادیبوں اور شاعروں کا ایک "منظوم انڈکس" کہی جا سکتی ہے۔

جناب ضیا بانی صاحب نے کہنہ مشقی اور شعری مہارت کے ساتھ ناموں کو حد درجہ خوش اسلوبی سے نظم تو یقیناً کر دیا ہے لیکن اردو زبان وادب کے آغاز و ارتقا کی داستان اتنی طولانی ہے کہ پوری نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی تشنگی یقیناً برقرار رہتی ہے۔ اگر ضیا صاحب صرف ناموں ہی کو نظم نہ کر کے ابتدا میں مختصراً اردو زبان کی تاریخ بھی نظم کر دیتے تو یقیناً یہ ایک قابل قدر اضافہ ہوتا۔ پھر بھی جناب خلیق انجم کے بقول "ممکن ہے اس کی کوئی غیر معمولی افادیت نہ ہو لیکن تجربے کی بعض اوقات یہی اہمیت ہوتی ہے کہ وہ تجربہ ہوتا ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنتا ہے۔"

بہر حال "اردو ہے جس کا نام" جناب ضیا بانی جیسے پرستار اردو کی ایک ایسی مخلصانہ اور بھرپور کوشش ہے جو یقیناً ادبی حلقوں میں سراہی جائے گی۔

—— ساحر لکھنوی

نیا دور
جلد ۳۲ نمبر ۶
ستمبر ۱۹۷۶ء
ایڈیٹر: خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی
★

عنوانات

پبلشر: یوگیندر نرائن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ، لکھنؤ
شایع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔ پی۔ لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
زیر اہتمام: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔ پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

مادرِ ہند کے جن جاں باز سپوتوں اور جیالوں نے ملک کی آزادی کے لیے انگریزی سامراج سے بڑی ہمت اور بہادری سے ٹکر لی اور اس کے اقتدار کی چولیں ہلا کر رکھ دیں ان میں چندر شیکھر آزاد کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد اور اشفاق اللہ خاں، رام پرشاد بسمل، راجیندر لہری، روشن سنگھ اور سردار بھگت سنگھ جیسے جواں عزم اور حریت پسندوں کے کارنامے ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ یہ وہ سپہ سالاران حریت ہیں جنھوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے عزیز وطن کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ چندر شیکھر آزاد کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے گزشتہ مہینے پورے ملک میں ان کی جینتی منائی گئی۔ وہ مدھیہ پردیش کے موضع بھاورا (ضلع جھبوا) میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوے تھے۔ ان کے والد پنڈت سیتا رام تیواری ضلع اناو کے موضع بدرکا کے رہنے والے تھے لیکن فکر معاش نے ان کو مدھیہ پردیش پہنچا دیا تھا۔ ان کی بہت ہی قلیل آمدنی تھی جس سے گھر والوں کی گزر بسر مشکل سے ہورہی تھی۔ اسی لیے آزاد کا بچپن بڑی عسرت اور پریشانی میں گزرا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں وہ علم کی پیاس بجھانے کاشی آے اور سنسکرت کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی۔ آزاد کے دل میں نوعمری ہی سے آزادی کی چنگاری روشن ہوچکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی تو وہ اس میں بلا تامل پھاند پڑے۔ گرفتار ہوکر جب وہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیے گئے تو اس نے ان سے پوچھا — تمھارا نام؟ — جواب ملا "آزاد"، باپ کا نام — سوتنتر — رہائش؟ — جیل خانہ، کام؟ — جدوجہد آزادی۔ مجسٹریٹ ایک نوعمر ہندستانی لڑکے کی اس بیباکی کو برداشت نہ کرسکا اور پندرہ بید لگانے کا حکم دیا۔ بید لگانے کے لیے جب ان کو سپاہی رسیوں سے باندھنے لگے تو انھوں نے گرج کر کہا — "باندھتے کیوں ہو؟ مارو! میں کھڑا تو ہوں"۔ پولیس نے پوری مستعدی دکھائی۔ بید پڑنے لگے اور بید کی ہر ضرب پر وہ "مہاتما گاندھی کی جے" اور "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے رہے۔ زبان سے نہ اُف کی اور نہ چہرے پر شکن آئی۔ پورا جسم لہولہان ہوگیا اور آخر کار بیہوش ہوگئے۔ ہوش آنے پر ایسے اٹھے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اس واقعہ کو جس نے بھی سنا انھیں دیکھنے کے لیے بیتاب ہوگیا۔ لوگوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور پھولوں سے ان کو لاد دیا گیا۔ اخباروں میں ان کی تصویریں بھی شائع کی گئیں۔ بیدوں سے صرف ان کا جسم ہی لہولہان نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا دل بھی زخمی ہوگیا تھا۔ نوجوان آزاد کے خون کی گرمی نے برطانی سامراج کو اس ظلم و تعدی کا مزا چکھانے اور بہر قیمت ملک کو آزاد کرانے کا ناقابل تسخیر جذبہ ان کے دل میں بھر دیا اور وہ دہشت پسندی کی طرف مائل ہوگئے۔ اس دوران میں وہ راجیندر ناتھ لہری اور سچیندر ناتھ بخشی وغیرہ کے قریب آگئے اور والنٹیروں کی بھرتی شروع ہوگئی۔ "ہندستان پرجاتنتر" سنگھ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مسلح انقلاب کے ذریعہ ملک میں جمہوریت قائم کرنا تھا۔ آزاد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن وہ بہترین تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے۔ کاکوری ڈکیتی سازش میں آزاد نے اہم حصہ لیا تھا۔ کاکوری کے پاس ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا تھا۔ حکومت نے کاکوری ڈکیتی کیس کے نام سے مقدمہ چلایا۔ اشفاق اللہ خاں، رام پرشاد بسمل، راجیندر ناتھ لہری، ٹھاکر روشن سنگھ جیسے بہادر نوجوانوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور متعدد کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ لیکن آزاد کو آخر دم تک گرفتار نہ کیا جاسکا۔ صوبائی حکومت نے ان کی گرفتاری کے لیے دو ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان کیا۔ انھوں نے عہد کیا تھا کہ وہ خود کو کبھی زندہ گرفتار نہ ہونے دیں گے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ کچھ عرصے تک کانپور میں رہنے کے بعد آزاد جھانسی پہنچ گئے جہاں انھوں نے بہت سے انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا۔ جھانسی میں ہی انھوں نے 'اچوک نشانہ' میں مہارت حاصل کی اور وہیں ان کی ملاقات سردار بھگت سنگھ سے ہوئی اور وہ ان کے دست راست بن گئے۔ آزاد کو گرفتار تو نہ کیا جاسکا لیکن اپنے تقریباً تمام قریبی ساتھیوں سے بچھڑنے پر وہ یکہ و تنہا رہ گئے۔

الہ آباد میں ایک دن جب وہ الفرڈ پارک میں بیٹھے تھے پولیس کے ایک مخبر کی اطلاع پر یکایک پولیس کے ایک دستے نے ان کو گھیر لیا۔ آزاد پر پوری صورت حال واضح ہوگئی اور ان کو یقین ہوگیا کہ اب وہ یہاں سے نکل نہ پائیں گے۔ انھوں نے پستول سنبھال لیا اور دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس جب صرف ایک گولی رہ گئی تو انھوں نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھ کر داغ دیا۔ اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہوگئے۔ پولیس نے ان کی لاش ان کے خاندان والوں کو نہیں دی بلکہ خود ہی اس کا کریا کرم کیا۔ شریمتی کملا نہرو اور راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن کو کسی طرح اس کا علم ہوگیا۔ انھوں نے بنارس میں پنڈت شیو ونائک مصرا کو مطلع کیا۔ مصرا جی کے تشریف لانے پر ان کی استھیوں (راکھ) کو اکٹھا کرکے ہندو مذہب کے رواسم کے مطابق دوبارہ داہ سنسکار کیا گیا۔ کچھ استھیاں مصرا جی اپنے ہمراہ لے گئے جنھیں وہ انقلابی جلوس میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ان استھیوں کو ایک ٹرسٹ کے سپرد کردیا تھا۔ حال ہی میں ۱۱ر جولائی کو وزیر ریاست شری کلتار سنگھ، شری سچیندر ناتھ بخشی اور شری رام کرشن کھتری (جو کاکوری کیس میں شامل تھے) کی کوششوں سے استھیوں کے کلس کو کاشی ودیا پیٹھ میں رکھ دیا گیا تھا جہاں سے اس کو چنار، مرزاپور، راے بریلی، الہ آباد، اورئی، جھانسی، کالپی، کانپور، بدرکا (اناؤ) ہوتے ہوے لکھنؤ لایا گیا۔ یہاں وزیر اعلی نے اس کا خیر مقدم کیا اور جلوس کی شکل میں خاص خاص راستوں سے ہوکر کلس سیلی گارڈ شہید اسمارک اور امین آباد کے عام جلسے میں لے جایا گیا۔ آخر میں اس کو ریاستی میوزیم میں رکھ دیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آزاد کا پستول جو انگلینڈ سے منگاے جانے کے بعد لکھنؤ کے ریاستی میوزیم میں رکھا ہوا تھا اس کو حال ہی میں الہ آباد میوزیم کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔

چندر شیکھر آزاد

——— ایڈیٹر

آوارہ

آگ کا کھیل

برس ساٹھ ایک کی پیٹ میں، بلند قامت، گٹھا ہوا جسم، بھرا بھرا چہرہ، کرڑ بڑی داڑھی، ہاتوں کی کھال جیسے کیمخت، کہیں کہیں پھٹی ہوئی گندھک کی بو میں بسی میلی جیکٹ فوجی پہنے، پیڑھیوں کے کاریگر میاں مدار آتش باز، دکان کے آزو بازو دیوار کی کھونٹیوں پر بانس کی کھپانچیوں پہ منڈھے کاغذ کے پتلے، تلعے کے ٹوٹے ڈھانچے، پرانی چرخیوں کے چکر اور نمونے کے لیے چھوٹے بڑے چھوٹے ہوے اناڑ ناشپاتیاں تلے اوپر۔ آپ کو دیکھا، بھانپ گئے کہ آیا گاہک۔

"آیئے ادھر آیئے۔ یہ کس عطائی کو بیعانہ دے رہے تھے آپ! چار چھچھوندروں کی نقلیں لے کے بیٹھ گئے" "کیا نام کہ سجالی دکان بن گئے آتشباز۔ کوئی پوچھے میاں، کتنے وزن جانتے ہو دارو کے تو ـــــــ ایں! دارو کے نام پہ آپ نے ناک سکیڑلی۔ حضور، آتشبازوں کی بولی میں بارود کو دارو کہتے ہیں۔ پہلے مجھ سے سودا کیجیے، پلٹ کر ان سے پوچھیے کیا نام کہ دارو کسے کہتے ہیں؟ بزرگوں کے نام پہ کان کو ہاتھ لگا کے، خاک چاٹ کے کہتا ہوں کنپٹی کھجانے لگیں گے۔ تو وجہ کیا، دلی کی لال حویلی کے میر آتش کلن خان کے نام لیوا تو ہیں نہیں۔ باوا ساگ بھاجی بیچتے تھے جیسے دیکھا دیکھی ان کے سپوت نے لے لیا لیسن سرکار سے اور کھول بیٹھے دکان آتش بازی کی، کیا نام کہ وہی مثل ہے کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا، کھول کے دیکھو تو آدھا بڑا۔ حضور یہ آگ کا کھیل عطائیوں کے کھیلنے کا نہیں ہے۔ بڑی کتاب کی قسم دے کے پوچھئے جو اڑن گولے کا نام بھی سنا ہو۔ بہت کہیں گے تو یہی کہ شورہ گندھک اور کوئلہ ملا کے پیسا اور گولے میں بھر کے داغ دیا۔ تو وجہ کیا؟ اناڑی سے پوچھئے ان مسالوں کا وزن۔ تو اب گول ہیں، کیا نام کہ بغلیں جھانک رہے ہیں۔ حضور اڑن گولے بنائے تھے کیا نام کہ اللہ بخشے دادا کلن نے۔ بھگدر کے دونوں ناریل کے خول میں بارود بھر کے لوہے کے نکیلے ٹکڑے ملائے۔ گولہ چلا، جس کے چھو بھی گیا، چیتھڑے اڑا دیئے۔ اب نمائش کے لیے اگن گولے میں بھی بناتا ہوں۔ ہری لال، نیلی اودی پٹاس کی گولیاں بارود میں ملاتا ہوں۔ گولہ پھٹتے ہی رنگ برنگے پھول ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ چمن کھلا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے گولے کو تارہ ماشیہ، چھتہ ہوائی اور کیا نام کہ گولہ ہفت رنگ بھی کہتے ہیں۔

ایک بات کہوں، برا نہ مانئے گا، اللہ پاک کا دیا پیسے کا کال نہیں پہ شوقینی کا توڑا ہے۔ وہ دن ہوا ہوے جب دو دو چار چار ہزار کی آتش بازی دلہن کے دروازے پہ دھواں ہو جاتی تھی۔ اب تو برات چڑھی شگن کے لیے چار چھ ناشپاتیاں، دو چار ہوائیاں چھوٹ گئیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ شبرات کے وہ ملے، وہ دھوم دھڑکے خواب ہو گئے۔ رئیسوں کی ڈیوڑھی میں ٹوکرے بھر بھر کے مال جاتا تھا۔ دیوالی آئی تو بچوں کو بہلانے کے لیے دھیلی آٹھ آنے کی پھلجھڑیاں مرچ پٹاخے لے دیئے، چلیے تیوہار منا گیا۔ کہیے اب کس برتے پہ باپ دادا کے نسخے نکالیں، اور کیا نام کہ کانٹے میں تول تول کے مسالوں کا وزن ملائیں۔ دیکھنا ہو تو چار قدم بڑھا کے غریب کے اس کوٹھے

میں دیکھئے، آتش بازی کے کیسے کیسے عجوبہ نمونے رہے ہیں۔

شادی کی شوبھا بنانا ہو، پسند کیجئے، حکم دیجئے، تیاری کا سامان کر دوں۔ دیکھیے یہ آتشی انار ہیں۔ شتابہ دکھاتے ہی انار نے آگ پکڑی، پھولوں کا سرو بن گیا۔ بارود میں ناپ جوکھ کر پٹاس کی پُٹ، اور لیموں کی چٹکی دے دی یہی آتشی انار ستارے بکھیرتا ہوا ہوا میں اُڑ گیا۔ اور لیجیے یہ ہے اگن چرخ۔ استاد لوگ اسے اگن پنکھ بھی کہتے ہیں۔ بانس کی پوریں کاٹ کے تیز وزن کی بارود بھری۔ پلیتے سے ایک دوسرے کو جوڑ دیا۔ شتابہ دکھایا۔ بارود کے زور سے چرخ کیلی پر گھومنے لگا۔ حکم ہوگا اسی چرخ کو جگمگا، موج دریا جگنو یا نوچندہ بنا دوں گا۔ میری ایک بات مانیں تو میاں اگن چادر ضرور بنوائیں۔ ر اس غدار شہر میں بنانا تو کیا، اگن چادر کا نام بھی کوئی نہ جانتا ہوگا۔ پرکھوں سے سنا لکھنؤ میں کیا نام کہ بیر دل نے بیٹے کی سوگھی میں اور دلی میں فرخ سیر بادشاہ نے شجاع الدولہ کی شادی میں بنوائی تھی۔ بل بل جائیے ان کے ناؤں کے سونے کی ہزار مہریں اور تین پارچے کا خلعت بخشا تھا۔ آپ ہیں تو کہتا ہوں پاسوز کا نام سنا ہوگا؟ اگن چادر کے مسالے کا بڑا جز یہی ہے۔ ادھر شتابہ دکھایا اُدھر اندھیاری رات میں سنہری چادر چمکنے لگی۔ مسالے میں ذرا پھیر بدل کر دیا یہی چادر روپہلی ہوگئی۔ چاروں طرف چاند نکل گیا۔ سو پچاس مہتابیاں چھڑوائیے، برات کی برات چمک اٹھے۔ کچھ چندر مکھی ہوں، کچھ سورج مکھی۔ اور یہ دیکھئے دو کھنڈا اور سنگھاڑیہ پٹاخوں کی دو لڑیاں لٹک رہی ہیں۔ اس دو کھنڈے پٹاخے کا گُن یہ ہے کہ شتابہ لگتے ہی تڑاق پڑاق، ایک آواز زمین پر، دوسری اڑ کے ہوا میں۔ البتہ ختنگے بنانا چھوڑ دیے ہیں۔ ایک آدھ بار اس ہاتھ کا ختنگا چھوڑا گیا۔ پروائی چل رہی تھی راس نہیں آئی۔ ختنگے کا رخ مڑ گیا اور ترچھا اڑ کے شہر آبادی سے ذرا دور کسی گاؤں کے چھپر پہ گرا۔ آگ لگ گئی اور سارا گاؤں جل کے بھسمنت ہوگیا۔ اُسے ہوائی بھی کہتے ہیں۔ اسی پر کسی نے شعر بھی بنائی ہے ؎

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہوگی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

کسی کسی استاد کی زبانی شوردار اگنی بان بھی سنا ہے۔ پرانے زمانے میں اگنی بان چلا کے دشمن کے مورچے پھونک دیتے تھے۔

خوب یاد آیا۔ برتیوں کی چہل دیکھنا ہو، دو چار درجن بچھو بھی بنوائیے کاغذ کی پتلی نلکی میں خاص دم کی بارود بھر کے موڑتے ہیں اور جلیبی بنا کے اوپر سے پتلی جھلی منڈھ دیتے ہیں۔ دلگی دیکھنا ہوئی۔ بچھو کا منہ کاٹا اور آتشی پر کالا دکھا دیا۔ پھر دیکھئے ناچا ناچا پھرتا ہے۔ ادھر گیا ادھر گیا، چائیں مائیں کھیلنے لگا۔ اچانک پلٹ پڑا۔ مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی۔ بچھو جلیبی کی صورت کا گول ہوتا ہے۔ اور چھچھوندر لانبی قلم کی شکل۔ اسے چھکا بھی کہتے ہیں اور کیا نام کہ آخیر میں رہ گیا قلعہ۔ اس کے ٹھاٹر کا نمونہ دیکھیے وہ لٹک رہا ہے۔ بانس کی کھپاچیوں سے اس کا ڈھانچہ بنا کر الگ الگ وزن اور دم کی بارود ذنتی کی نلکیوں اور خولوں میں بھر کے پورے ڈھانچے پہ تانت کے ریشوں سے باندھ دیتے ہیں: نلکیاں اور خول بارود چڑھے ڈورے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ادھر آپ نے شتابہ دکھایا، نلکیاں روشن، اور قلعے کے پورے ڈھانچے پہ چراغاں ہوگیا۔

بس میاں۔ اس وقت آتش بازی کے جو دو چار نمونے پڑے تھے دکھا دیے۔ آپ کو نیا مال دوں گا۔ کیا کیا بناؤں گا یہ مجھ پہ چھوڑیئے اور ڈھنڈورا پٹوا دیجیے کہ اس برات میں کیا نام کہ مدار کے ہاتھ کی آتش بازی چھوٹے گی۔ سارا شہر نہ ٹوٹ پڑے تو ہاتھ قلم کرا دوں۔

★

جگن ناتھ آزاد

غزل

اسی نے آکے مجھے اذنِ رہنمائی دیا
عجیب سایہ تھا ظلمت میں جو دکھائی دیا

یہ اور بات کہ ہمعصر مجھ کو سُن نہ سکے
وگرنہ میں تو ہر اک دَور میں سُنائی دیا

ابھی تک اُس کو مرے پاؤں یاد کرتے ہیں
وہ جس نے عزم کو ذوقِ شکستہ پائی دیا

ہمالیہ کی طرح تھا میں ان زمینوں پر
عجیب لوگ تھے جن کو نہ میں دکھائی دیا

مہکتے پھول کی خوشبو کہاں کہاں نہ گئی
اسی نے مجھ کو بھی احساسِ خودنمائی دیا

بغیر حیرہ تو تھے بے ضمیر لوگ بھی تھے
نہ اپنا نالۂ ماتم جنھیں سنائی دیا

کہاں گئی مری خلوت کی زندگی آزاد!
یہ کس خلش نے مجھے دردِ آشنائی دیا

نجم الدین شکیب

سیّد رشید احمد

غالبؔ کا شعر ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

زندگی کا قافلہ رواں دواں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہم اس سفر میں بے اختیار ہیں۔ اپنے نزدیک ہم اپنے ہر قدم کو سمت دیتے ہوئے چلتے ہیں، لیکن بس خود فریبی ہی ہماری تقدیر ہے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہو کہ ہمارے قدم ہماری آرزو کا احترام کریں۔ اکثر ہمارے سفر کا ماحصل شکستِ آرزو کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آرزو کی شکست ہی میں تازہ آرزوؤں کی تخلیق کے جراثیم چھپے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کھونے اور پانے کے درمیان اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ ہم لمحۂ گزشتہ کی ناکامی کا جی کھول کر ماتم کر سکیں ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اگر احساسِ غم کی شدت ہمارے پیر کی زنجیر نہ بنے اور ہم سینہ کوبی کے لیے دم بھر ٹھہرے تو آرزو کی بازیابی کا سلسلہ ختم ہو کر ہم کو جمود کے قعرِ عمیق میں گرا دیتا ہے۔ یہاں سے نکلنا توفیق کی ارزانی پر منحصر ہے۔ سنّتِ الٰہی کا فیصلہ ٹھہرنے اور ماتم پر سینہ کوبی کرنے والے کے حق میں نہیں ہے ؎

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

رشید صاحب نے تعلیم کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک پولیس افسر کی حیثیت سے کیا۔ لیکن ماحول کا جبر ان کے اندر جو فنکار چھپا ہوا تھا اُسے خاموش نہ کر سکا۔ ان کی شخصیت زندگی بھر ایک کشمکش سے دوچار رہی اور اس نے اپنی تکمیل کے لیے اسی کشمکش سے غذا اور اسی اندرونی پیکار سے آب و رنگ حاصل کیا ؎

مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

ان کا ظاہر ایک پولیس افسر کی حیثیت سے گرمِ عمل تھا اور ان کا باطن اسی ماحول میں ایک فنکار کی ذہنی آسودگی کے سامان تلاش کر رہا تھا۔ شخصیت کی یہ تقسیم ایک ہی پیکر میں نور و نار کو سمو کر ان کے کردار کی تشکیل کی موجب ہو رہی تھی۔ یہ کشمکش ہم کو اس قتل کے مقدمہ کی روداد میں صاف نظر آتی ہے جو ثبوت کے ناکافی ہونے کے باوجود اور اس خامی کے پورے احساس کے ساتھ رشید صاحب نے ناصل جج آر۔ بی ڈی یو ہرسٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایک پولیس افسر کے لیے بقول رشید صاحب محکمۂ پولیس کی شہرہ آفاق "خوش فکری اور طلسم بندی" سے کام لینے کی پوری چھوٹ تھی۔ لیکن رشید صاحب نے اپنے ضمیر کی روشنی میں:

"اپنے روزنامچۂ تفتیش میں ثبوت کی خامیوں کا صاف صاف اظہار اعتراف کیا اور لکھا کہ باوجودیکہ ملزموں کے خلاف کوئی عینی شہادت نہیں ہے تاہم موقعہ واردات کی عام تفتیش اور قرائن کی عام شہادت سے میرا ضمیر انھیں مجرم تصور کرتا ہے۔ اس لیے

میں اس ٹوٹے پھوٹے ثبوت ہی پر انھیں عدالت کے عدل و انصاف کے سپرد کرتا ہوں۔ عدالت ان کو ثبوت کی خامیوں کی بنا پر رہا کر سکتی ہے۔" (ڈیو ہرسٹ)

"بیتمبر بھوج" اور "ہمارا تاج محل" میں فنکار اپنے لطیف احساسات کے ساتھ ایک پولیس افسر کے بھیس میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ فرائض اسے مقدمہ کی تفتیش پر مجبور کرتے ہیں، وہ پولیس کی روایتی ڈگروں پر چلتا بھی ہے۔ لیکن اندر بیٹھا ہوا فنکار خاموش نہیں ہے اسے مقدمہ کی روایتی ترتیب سے بہت کم لیکن مقدمہ کے اہم کرداروں سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ انھیں اپنے ذہن کے پیمانوں سے ناپتا ہے اور ان قدروں کی کھوج میں سرگرداں ہے جو خود اسے عزیز ہیں۔ رشید صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے لیکن بیتمبر بھوج کو نہ بھولے اور اپنی سبکدوشی سے کافی دنوں کے بعد اخبار میں ان کا نام پڑھ کر ایک عام شہری کی حیثیت سے پھر لکھنؤ آئے۔ اب ملزم ان کا دوست تھا۔ اب ان کو اس کے جرم سے نہیں (اگر وہ کوئی تھا بھی) اس کی شخصیت سے دلچسپی تھی۔ اس کی شخصیت کے جو نقوش رشید صاحب نے اپنے مضمون میں ابھارے ہیں، وہ ایک لائق پولیس افسر کا کارنامہ نہیں ہیں بلکہ ایک فنکار کی جنبشِ قلم کا شاہکار ہیں۔ وہ تصویر کشی تو بیر برج کے کردار کی کر رہے ہیں لیکن دراصل یہ اپنے کو پالینے کی ایک کوشش ہے۔ ان قدروں کی نقاب کشائی ہے جو خود فنکار کو عزیز ہیں۔ رشید صاحب بیر برج کی زبان سے کہتے ہیں:-

"میں ایک آزاد منش، خوددار اور بے پروا انسان ہوں"

دوسری جگہ بیر برج اپنے فلسفۂ حیات کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

(مصائب) کا "تمام تر تعلق انسان کے احساس و ادراک سے ہے وہ غم میں بھی نشاط اور قید و بند میں بھی آزادی کے تصور کا خلاق بن جاتا ہے۔"

ہمارا "تاج محل" کا ہیرو جالمس بھی رشید صاحب کی طرح ماحول کے جبر کا شدید احساس رکھتا ہے۔ وہ فوجی ڈسپلن کے آہنی شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن باہر کی تازہ ہوا حاصل کرنے کے لیے اپنے ذہن و دماغ کے دریچے کھلے رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے انسانیت کو اپنی زندگی کے تشخص کے لیے ایک قدر کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اپنی جہاں گردی کے سلسلے میں وہ لکھنؤ میں جس حادثہ کا شکار ہوا، اس نے اسے اپنے فلسفہ کی عملیت کے امتحان کا پورا موقع دیا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کا ہندستان بغاوت کے لاوے سے تپ اور بھڑک رہا تھا۔ گاندھی جی کے فلسفہ میں انگریز دشمنی کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اوسط درجہ کا تعلیم یافتہ ہندستانی سماج انگریز کو معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جالمس عیسائیت کی گود میں پلا اور بڑھا تھا۔ اس لیے اس کو گاندھی جی کے فلسفے کی جہانگیری پر یقین، ہندستانیوں سے کہیں زیادہ تھا، جو گاندھی جی کے بھگت ہونے کے باوجود ان کے پیرو نہ تھے ——

جالمس نے ایک ہندستانی دیوانہ کے ہاتھ سے گولی کھائی لیکن اس نے اپنی روح کی عظمت اس یقین کے سہارے قائم رکھی کہ مجرم کو اپنی غلطی کا احساس ضرور ہوگا۔ رشید صاحب کے الفاظ میں "وہ اکثر بڑبڑا کر خود کہنے لگتا:

"اس غریب سے نہ معلوم کس وحشت اور جنون کے عالم میں اضطراری طور پر یہ فعل سرزد ہو گیا ورنہ کسی سمجھ دار اور صحیح الدماغ شخص کا یہ فعل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ٹھنڈے دل سے اُسے اپنے اس فعل پر غور کرنے کا موقع ہوا تو خود اس کا ضمیر یقیناً اسے ملامت کرے گا" —— اور وہ اپنی روح کی تسکین و نجات کے لیے ایک نہ ایک دن خود پردے سے باہر نکل کر اپنے جرم کا اقرار و اعتراف کرے گا۔"

جالمس کا اندازہ غلط نہ تھا اس کی یہ پیشں گوئی پوری ہوگی۔ ملزم اپنے ضمیر کے کچوکے نہ سہہ سکا اور اپنے پاؤں چل کر مجرم کے کٹہرے میں آکھڑا ہوا۔ پولیس افسر کے اندر جو فنکار چھپا ہوا تھا۔ وہ جالمس سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک فرض شناس پولیس افسر کو کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اب اس کا ضمیر جالمس کے دردِ دل کا امین تھا۔ جالمس کا درد اب اس کا درد تھا یا یوں کہئے کہ اب وہ خود جالمس تھا جو پولیس افسر کی وردی میں ملزم کو جالمس کا نہیں خود اپنا خون معاف کر رہا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت تعین کی حدود کو توڑ کر ایک ہمہ گیر ماورائی رشتے کا احساس کرتی ہے۔ یہ رشتہ

جغرافیہ، رنگ ونسل اور ملک ووطن کی حدود سے کہیں بلند، لیکن سب
کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے، کبھی فلسفی کے ادراک کو اپنا ناتمام جلوہ
دکھاتا ہے اور کبھی شاعر کی تخئیل میں اس کی ایک کرن چمکتی ہے اور کبھی کوئی
پیغمبر اس کی رہنمائی کے لیے طور زیتون اور فاران کی بلندیوں کی طرف
اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

انسانی احوال کے اسی نقطۂ عروج کا جو سماج شکنی اور انسان
دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ہر پولیس افسر کو سابقہ پڑتا ہے۔ پولیس افسر
کے فرائض اور اس کی تگ و دو کا میدان ہی وہاں سے شروع ہوتا ہے،
جہاں شہریت پاریدہ اور وحشت خیز کیفیت نظر آتی ہے۔ لیکن کتنے پولیس
افسر ایسے ہیں، جن کو مجرم سے زیادہ اس کھوئے ہوئے انسان کی تلاش
ہو، جس کے بغیر جرم آزاد اور انسانیت پابہ جولاں ہے۔ اس انسان کا
نشیمن بھی، انھیں انسانی اجسام کے حدود اربعہ میں ہے۔ اس کی تلاش
دشوار سہی لیکن اگر صید افگنی کا ہنر آتا ہو تو ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

رشید صاحب کا مضمون "حسو خاں" کردار نویسی اور مرقع کشی کا
نادر نمونہ ہے۔ رشید صاحب کے حافظے اور ان کے ذوق کی تعریف
کرنا پڑتی ہے کہ انھوں نے حسو خاں کو اتنے طویل عرصے تک اپنی تمام
خصوصیات کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ حسو خاں ایک فرد نہیں ہیں
ایک عہد ہیں جو رشید صاحب کے الفاظ کا جامہ پہن کر شاہی محلسرا کے
تمام ہنگاموں کو، اس عہد کی رعنائی اور سرمستی کے ساتھ جگا کر اپنے ساتھ
لے آئے ہیں۔ "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی" یہ شمع ان محفلوں
سے کسب نور کر چکی ہے۔ جن کو اپنے ادبار کے دور میں بھی آنے والی
ظلمت کے تصور کا بھی ہوش نہ تھا۔ حسو خاں لوٹ کر پھر اس صحبت شب
میں شریک نہ ہو سکے لیکن وہ اپنے تصور کے موقلم سے اس دور کی تصویر
اس طرح کھینچتے ہیں:

"شب ماہ میں کنار چمن بیگمات کے گل گشت" ـــ وہ خرام ناز
جس سے موسیقی کے بہترین نغمات سیکھے جا سکتے ہیں اور نہر سیمیں
پر چاند کی شفاف روشنی کے انعکاس کا وہ طلسمی نظارہ،
ایسا معلوم ہوتا کہ موتیوں کو سنہری شراب میں حل کر کے فرش
مرمریں پر پھیلا دیا گیا ہے اور چاند نے اپنی تجلی سے سارے عالم
کو غرق نور کر دیا اور فطرت اس دریائے نور میں نہا نہا کر نکھر رہی
ہے۔ نہر کے پانی پر کنول اور اس کے مست تعطر غنچے اس طرح
پڑے لوٹ رہے ہیں جیسے کسی پری کا ہار ٹوٹ کر سطح آب پر
بکھر گیا ہو۔"

حسو خاں نے جاگیرداری کی چھاؤں میں اس وقت آنکھ کھولی،
جب شمع طرب اپنی آخری سانسیں پوری کر کے سرمایہ داری کے ابھرتے
ہوئے آفتاب کو آخری سلام کر کے رخصت ہو رہی تھی۔ حسو خاں
بادۂ شبانہ کے نشہ میں اتنے چور تھے کہ انقلاب کا سویرا ہو جانے کے
بعد بھی، انھیں ہوش نہ آیا تھا۔ اس وقت بھی دربار کی رنگ رلیاں
اور محلسرا کی عطر بیز بہاریں ان کے تصور کو دعوت خرام دے رہی
تھیں۔ یہ رشید صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے حسو خاں کی
روح میں سما کر ان کے تصور کے وہ سب رنگ اڑا لیے۔ جو حسو خاں
کے گزر جانے کے بعد بھی ان کے شہپارہ میں ترو تازہ ہیں۔

حسو خاں کے پردے میں رشید صاحب نے اس وقت کے
جاگیرداری سماج کے دور آخر کی بہت کامیاب عکاسی کی ہے اور ان
تمام طبقات کو ایک ساتھ اسٹیج پر لے آئے ہیں، جن کے بغیر اس سماج
کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اس خاکے میں رنگ بھرنے میں رشید صاحب
کی موسیقی سے واقفیت بھی کام آئی ہے اور وہ تجربہ بھی یقیناً کام آیا
ہے جو بحیثیت پولیس افسر، ان طبقات کے سابقے میں ان کو حاصل
ہوا ہے۔ ایک صاحب قلم کے لیے، جس کا اسلوب بیان کتنا ہی رنگین
کیوں نہ ہو، بزم نشاط کی یہ مرقع کشی، اسی علم، بصیرت اور اشخاص
سے واقفیت کے بغیر ممکن نہ ہوتی۔ یہ چھوٹا سا مضمون ان طالب علموں
کے لیے مشعل راہ کا کام دے گا جو اس وقت کے سماج کے اس رنگین
پہلو پر تحقیق کا قلم اٹھائیں گے۔

اصغر اور جگر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن معلومات کے

اس اعتبار میں وہ عناصر نہیں ملتے جن سے ان کی شخصیت ابھرتی ہو اور ان کی نفسیات کے پیچ و خم اپنی پوری خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہوں۔ لکھنے والوں نے اصغر کو فرشتہ اور جگر کو بچوں کی طرح معصوم تو ثابت کر دیا ہے لیکن ان باتوں سے انسانیت کی سطح پر ان کے صحیح مقام کے تعین میں مدد نہیں ملتی اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اصغر اتنے بلند قامت اور جگر اتنے معصوم کیوں ہوئے؟

پولیس کے محکمے میں، جہاں رشید صاحب نے اپنی عملی زندگی کا بڑا حصہ گزارا تھا، ایسے کرداروں کے مطالعے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے جو یا تو عام سطح انسانی سے بہت بلند ہوتے ہیں یا بہت پست۔ ایسے افراد بھی یقیناً ان کے مطالعے میں آئے ہوں گے جو اگرچہ عام سطح انسانی کے متوازی چلنے کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن پیروں کی ڈگمگاہٹ ان کو کبھی اپنے جسم و جان کی طہارت کا پورا یقین نہیں ہونے دیتی۔ یہی وہ افراد ہیں جو انسانیت کے ابھرنے اور گرنے کے لیے مثبت اور منفی اقدار متعین کرتے ہیں۔ یہی سواد اعظم ہیں۔ اصغر اور جگر دونوں کا اسی سواد اعظم سے تعلق تھا۔ اصغر کی مروت اور شرافت نے ان کو اپنے دوست ریلوے بابو کے رنگ پر چلایا۔ لیکن ان کو اپنی فطرت کی نشو و نما کے لیے وہاں کی آب و ہوا راس آتی ہوئی نہ معلوم ہوئی اصغر کشاں کشاں اسی ڈگر پر چل پڑے تھے لیکن ضمیر جو فرد کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا مثبت کردار ادا کرتا ہے، اس فضا میں گھٹن محسوس کرتا ہوگا۔ رشید صاحب نے اپنے مضمون اصغر میں کتنی اچھی بات کہی ہے:

"زندگی کا حق ادا کرنے میں سب سے پہلے خود آگہی لازم ہے۔ انسان خود اپنی زندگی کا کارساز ہے۔ زندگی میں توانائی خود اپنے زور بازو سے آتی ہے۔ انسان کا ظرف خود اپنی ہمت پر موقوف ہے اور دنیا سے وہ خود بقدر ظرف مستفید ہوتا ہے۔"

اصغر کی خود آگہی نے انھیں اصغر بنا دیا اور انھوں نے بقول رشید صاحب:-

"خدمت علم و ادب اور انسانیت کو اپنا گوہر مقصود بنایا جس سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی اور شرف نہیں۔"

اصغر نے اپنے ذہن اور عمل کی تنگنائے سے نکل کر روایتی خیال بندی کے بندھے ٹکے ظرف کو توڑ کر:-

"احساس جمال کو حیات اور کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کیا۔"

جگر کا خمیر جس مٹی سے اٹھا تھا وہ اس سے بہت مختلف تھی، جس سے اصغر بنے تھے۔ لیکن جگر کے شعری تجربات میں انفرادیت تھی اور خلوص نے ان کے نغمات میں تاثیر پیدا کر دی تھی۔ ان کے اشعار شکست دل کی جھنکار تھے۔ غالباً اصغر کو ان کو اس شکستگی ہی کی وجہ سے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے کوشش کی کہ یہ لاابالی نوجوان جو شعری صلاحیتوں سے معمور ہے، فکر و فن کے میدان میں اپنا مقام متعین کر سکے۔ رشید صاحب اپنے مضمون "اصغر" میں لکھتے ہیں:

"دنیا میں سوا انسان کے ہر چیز اپنا مخصوص اور متعین مقام رکھتی ہے۔ مگر انسان خود اپنا مقام پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا تمام شرف اپنے مقام کی تخلیق و تعمیر ہی میں مضمر ہے۔ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ، اس کی ریاضتیں و مجاہدہ، اس کی فکر و نظر اور اس کا تزکیۂ نفس، سب اسی مقصد کے حصول کے لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام کو معلوم و متعین کر سکے۔"

یہ اصغر کا احسان ہے کہ جگر عوام کے "چہیتے مغنی" کی سطح سے ابھر کر خواص کی بزم سخن میں بھی بڑے شاعروں کے ہم پلہ قرار پا سکے۔ جگر نے سماج اور ایوان ادب میں جو بھی مرتبہ اور اعزاز حاصل کیا وہ سب اصغر کی نگاہ فیض اثر کا کرشمہ ہے۔ جگر داماندۂ محبت تھے۔ محبت ہی سے ان کا خمیر بنا تھا۔ یہ ان کے دل کی آگ ہی تھی جو ان کو جلا جلا کر ان کے نغموں کو آتش سیال بنا رہی تھی۔ جگر کی سرمستی میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ وہ کوئی ڈسپلن قبول کرتے۔ وہ شراب کیا جو خط پیمانہ کی پابند رہے۔ لیکن اصغر نے اس ابلتی ہوئی آگ کو "پیالہ نشین" بنایا اور جگر نے ان کے سامنے ارادت کی نگاہ جھکا دی۔ جگر میں یہ کیفیت اچانک نہیں پیدا ہوئی۔ ان کے اندر سپردگی کی یہ ادا یہ یک جنبش نگاہ نہیں آئی۔ اصغر کی محفل میں جگر کو تنہائی کا احساس کچھ کم ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ ان کو ایک ایسی نگاہ کیمیا اثر ملی جو ان کے

زخموں کو تاب کرم مرہم جاں کا سامان فراہم کر سکے۔ نغمہ پر سر تو سب دھنتے ہیں لیکن نغمہ میں جو آگ جذب ہوتی ہے اس کی ماہیت اور قوت کا اندازہ کرنے والے کم لوگ ہوتے ہیں۔ نغمہ ایک راز ہے جو اہل کر دل کی گھٹن کم کرتا ہے۔ دل کی گھٹن اور نغمہ کے تعلق کو جو سمجھ لے وہی ایسے آہوے رم خوردہ کو رام کر سکتا ہے۔ اصغر نے یہی کیا۔ رشید صاحب نے اصغر اور جگر کے گھریلو تعلقات پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ بات اب پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ جگر کیوں اور کیسے اصغر کی تحلیم فقر کا پیوند ہو گئے۔ اور اکھڑنے کے بعد پھر کہیں اور رحم نہ سکے اور مرہم جاں کے لیے آخر میں ان کو اصغر ہی کا گوشۂ داماں تلاش کرنا پڑا۔

رشید صاحب اپنی زندگی کا بظاہر کار آمد حصہ محکمۂ پولیس کی خدمت میں گزار کر تھکے ہارے گھر لوٹے تھے۔ ان کی واپسی اس نبرد آزما کی واپسی تھی، جو فتح و شکست کے احساس سے بے نیاز ہو کر اپنے جوڑ جوڑ سے بیتی ہوئی کشاکش کی روداد سنتا ہے اور اکتا رگی اس گرانی سے نجات پانے کے لیے ان گلیوں میں جا نکلتا ہے، جہاں لڑکپن اور جوانی نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اسے نبرد حیات کے سپرد کیا تھا۔

شہروں کی فلک نشینی رشید صاحب کی دسترس سے اونچی نہ تھی۔ لیکن انھوں نے زندگی کی جدیت کے طویل تجربے کے بعد شہروں کے ہنگاموں کے مقابلے میں، مادر وطن ہی کے دامن میں سکون کی جستجو کی اور اوسرا‌ئے (فیض آباد) میں " فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے" کی فضا سنوار کر بیٹھ گئے۔ مضامین کا یہ طویل سلسلہ، جو رشید صاحب کی سبکدوشی کے بعد اہل نظر کی ضیافت طبع کا موجب ہو چکا ہے، اپنی بازیابی اور اپنے کھوے ہوئے تشخص کو متعین کرنے کی بڑی اچھی اور مفید کوشش تھی، جس کی توفیق زندگی کی بھول بھلیاں میں کھو جانے کے بعد بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ رشید صاحب خوش نصیب تھے کہ ان کو سبکدوشی کے بعد کی زندگی کو کار آمد بنانے کا سلیقہ آیا

ایں سعادت بزور بازو نیست

تازہ بخش، غذائے بخشندہ

رشید صاحب کے قلم سے جو مضامین نکلے ہیں وہ تاثراتی بھی ہیں، مقصدی بھی اور "ثقافتی" بھی۔ ان کی زندگی کے بہت سے تجربے ایسے ہیں جو ان کی افتاد طبع کی وجہ سے ان کے لیے مخصوص تھے۔ ان تجربوں نے ان کے دل میں جو احساسات جگائے وہ ان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ہم ان کی تہوں میں جھانک کر اس انسانیت کا نظارہ کر سکتے ہیں، جس کے احساس سے نہ جینے والی زندگی بھی جینے کے لائق بن جاتی ہے اور نامرادی کے اس خلا میں بھی تنہائی کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے ؎

مومن، یہ عالم اُس صنمِ جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

رشید صاحب کے ان اصنام جاں فزا نے ان کے وطن فیض آباد کے خزف ریزوں کو دُرتاب بنایا ہے، اجودھیا اور فیض آباد کی زمین اتنی شوق انگیز ہے جتنے متھرا اور بندرابن کے سبزہ زار شور انگیز ہیں۔ اجودھیا کی زمین پر عشق و وفا، دلداری و دلبازی اور جاں نثاری جاں سپاری کے جو ڈرامے تاریخ نے کھیلے ہیں، انھوں نے ہندستانی سماج کو ان قدروں سے روشناس کیا جن کے سہارے ہم بین الاقوامی برادری کے سامنے سربلند اور اپنی روحانی عظمت میں منفرد نظر آتے ہیں۔ تلسی داس نے سرجو کے کنارے جو جامِ آتشیں نوش کیا تھا۔ اُس نے نغموں میں ڈھل کر دنیا کے ادبیات عالیہ میں بڑا مقام پایا اور اسی کی بدولت ہندستانی کا روحانی حسن لازوال ہے اور اس کی سماجی ادائیں اپنی آبرومندی اور دل فریبی میں رہتی دنیا تک مثال بنی رہیں گی۔ رشید صاحب کو اپنے وطن عزیز کی تاریخی عظمت کا احساس تھا۔ یہی احساس ان کو وصالی نثار اور دوسرے ہندو مسلمان ادیبوں، شاعروں، فلسفیوں اور سنگیت کاروں کے آستانوں تک لے گیا۔ انھوں نے اپنے ماحول میں جو کچھ سنا اور پایا اسے من و عن قبول نہیں کیا بلکہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے تلاش و جستجو اور جرح و قدح کا جو ملکہ انھیں حاصل ہوا تھا، اس سے علمی تحقیق کا کام لیا۔ علاء الدین صفائی اور نثار ان کی خاص دریافت ہیں، جن سے ہندستانی ادبیات میں قابل

قدرے اضافہ ہوا ہے۔

سب سے آخر میں جو بات کہنے جا رہا ہوں وہ سب سے پہلے کہنے والی بات تھی۔ لیکن رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کے مطالعے میں میرے ذہن نے منزلیں جس ترتیب سے طے کی ہیں، اُن کا تقاضا یہی ہے کہ سب سے پہلے کہنے والی بات آخر میں کہوں۔ سید رشید احمد صاحب کو میں نے ادیب اور فنکار کی حیثیت سے بعد میں جانا۔ سب سے پہلے جب میں نے انھیں دیکھا تھا وہ محض ایک پولیس افسر تھے۔ حسرت کو اپنے محبوب سے گلہ تھا کہ ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

حسرت کا یہ شعر، غزل کی زبان میں برطانوی سیاست پر بڑی اچھی تنقید ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ برطانوی سیاست کو جن شخصیتوں نے عوام سے روشناس کرایا، ان میں دس روایتی پولیس افسر کو اولیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے حسرت اگر اس شعر میں اسی محبوب سے الٹی گنگا بہانے کی شکایت کر رہے ہوں، تو بات خلاف قیاس نہ سمجھی جائے۔ میں نے ایک عام آدمی کی حیثیت سے رشید صاحب کو اپنی نگاہ سے دیکھا اور قریب آنے کے بجائے دامن کشی ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ میری یہ روش اسی تجربے کی وجہ سے جو مجھے رشید صاحب کے پیشرو افسر کی خوئے صید افگنی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر اس افسر کا دورِ انتظام زلفِ محبوب کی طرح کچھ اور دراز ہو گیا ہوتا تو شاید راقم الحروف یہ مقالہ پیش ہی نہ کر پاتا۔ قید و بند کے مصائب شاید انسان کی فطری نیکی سے میرا عقیدہ اٹھا کر میری رگوں سے انسانیت کا وہ رس چوس لیتے، جس سے علم و ادب اور شعر و نغمہ کو "ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں" کا احساس ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے معاملات کا رخ کچھ اس طرح موڑا کہ مجھے "کردہ گناہوں کی سزا" اور "ناکردہ گناہوں کی حسرت" کی فکر نہ رہی۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے محسوس ہوا کہ پولیس کا یونی فارم رشید صاحب کے اصل کردار کے لیے ایک حجاب کا کام کر رہا تھا۔ میری دیر آشنائی کے باوجود رفتہ رفتہ اب وہ منزل آگئی تھی جب وہ اپنے فرائض سے چھٹی پا کر ہم سب نوجوانوں کو لے کر بیٹھتے اور جاڑے کے دنوں میں دیر تک طرح طرح کے مسائل پر گفتگو کرتے۔ اس محفل میں رشید صاحب ایک شفیق بزرگ، سرپرست اور بالغ نظر انسان کی روپ میں ظاہر ہوتے۔ سرکاری معاملات پر نہ انھوں نے کبھی زبان کھولی اور نہ ہم کو کبھی ان کے معلومات میں اضافے کا شوق دامنگیر ہوا۔

رشید صاحب رائے بریلی سے لکھنؤ آگئے اور بار بار ملاقات کے امکانات کچھ مختصر ہو گئے۔ اسی زمانے میں سرکاری ملازمت مجھے دیو ریا لے گئی۔ دو ایک سال کے بعد میں نے سنا رشید صاحب سبکدوش ہو گئے اور پھر برسوں ملنے اور ایک دوسرے کے اندر عمر کے ساتھ بڑھنے والی تبدیلیوں کو جاننے اور پرکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب آب و دانہ مجھے پھر لکھنؤ لایا۔ اس وقت دانش محل میں ایک مضمون نگار سید رشید احمد صاحب کا ذکر آیا اور یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ فنکار ہم سب کے پرانے کرم فرما پولیس افسر ہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اس طرح بدل دیا ہے کہ اب پولیس افسری کا جامہ ان کی شخصیت کے سامنے سمٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پل بھر میں ان کی کئی سال کی زندگی سامنے آگئی اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ انھوں نے ایک ہی قالب میں دوہری شخصیتوں کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال کر رکھا تھا۔ جب تک وہ پولیس افسر رہے ان کی اصل شخصیت زیرِ نقاب رہی اور ملازمت کے ڈسپلن نے اس کو کسمسانے کا بھی بہت کم موقع دیا۔ اب جبکہ وہ سفرِ آخرت اختیار کر چکے ہیں مجھے اس کردار کی دلچسپی کا اور بھی احساس ہوا اور میں نے از سرِ نو رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی۔

★

برسات کی رات

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

واہ کیا رات ہے، کیا رات ہے، برسات کی رات
آسمانوں سے برستے ہوئے نغمات کی رات

سازِ فطرت پہ یہ بجتے ہوئے آہنگ لطیف
شادیانوں کی سلامی ہے کہ بارات کی رات

جس طرح کوئی پلاتا ہی رہے جام پہ جام
بارشِ کیفِ مسلسل ہے یہ برسات کی رات

خوابِ نوشیں سے خجل نشۂ آبِ انگور
آج قدرت نے منائی ہے خرابات کی رات

کیسے یہ لطف و سرور آج نہ دونا ہو جائے
آج کی رات ہے دلبر سے ملاقات کی رات

اک طرف ابرِ سیہ مست سے بھیگی ہوئی شب
اک طرف گیسوئے جاناں کی مہک رات کی رات

لطفِ گل چینیٔ فردوسِ تمنا، یعنی
بارشِ ابرِ کرم، مہرِ عنایات کی رات

کوثر چاند پوری

آن کی فتح

(افسانہ)

رنجیت بھون کی تین منزلہ عمارت گھنی اور گنجان آبادی میں بے وجہ نہیں بن رہی تھی شہر کے باہر رنجیت سنگھ بہت بڑا رقبہ خرید چکے تھے وہیں رنجیت بھون تعمیر کرنے کا منصوبہ تھا مگر ماتا جی کو پرکھوں کی یہ جگہ پسند نہ تھی، انھوں نے بیٹے سے کہا:

" رنجو بڑا بھاگوان استھان ہے یہ تیرے باپ کو خوب پھلا ہے وہ ادھ گزی ہاتھ میں لیے کپڑوں کی بھاری گٹھری کمر پر لادے دن بھر گلیوں میں آوازیں لگا کے پھرا کرتے تھے "

لے لو کپڑا۔

لٹھا

ململ

تنزیب

پیٹ بھی مشکل سے بھرتا تھا یہاں آکر دن پھر گئے، چھوٹا سا گھر بنا لیا بینک میں کھاتہ بھی کھل گیا، ایک سے لاکھ ہوا اس جھونپڑے کو نہیں چھوڑوں گی جیتے جی نیا مکان بنانا ہے تو یہیں بنا اتنی بڑی فرم کا مالک یوں ہی نہیں بن گیا اسی پوتر بھومی کی دین ہے۔

بات رنجیت کے گلے اتر گئی انھوں نے یہیں رنجیت بھون کا سنگ بنیاد رکھ دیا، سوٹ کیس بنانے کا کارخانہ دور ایک کالونی میں تھا انھوں نے دفتر کرائے کے کمرے میں منتقل کر لیا تاکہ راج اور مزدور ان کے ڈر سے لگن کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتے رہیں اور دفتر کی نگرانی بھی ہوتی رہے، سو سوا سو مزدور جن میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی قطار باندھے ہر آن آگے پیچھے بھاگتے رہتے تھے۔

سیمنٹ، ریت اور اینٹوں کی ڈلیاں سروں پر رکھے وہ کڑکتی دھوپ میں چیونٹیوں کی سی لائن بنائے ہر آن رینگتے رہتے تھے مردوں کی کالی ننگی سوکھی پنڈلیوں کے لمبے بال دھول میں اٹ کر مٹیالے ہو جاتے، ان کی دھوتیاں رانوں تک اوپر چڑھی رہتیں، سانولی (رانوں) کی مچھلیاں جو نہ جانے کب سے موم بتیوں کی طرح مندمتی ہوئی دکھائی دیتیں عورتیں لال پیلے اور ہرے دوپٹے کمر پر لپیٹ کر خالی پیٹوں میں بھرے ہوئے پانی کو تھل تھل بولنے سے روکنے کی کوشش کرتیں، کرائے کے آفس میں چند کلرک کرسیوں پر بیٹھے فائلوں پر لکھنے میں مصروف رہتے ایک کونے میں شام لال ہیڈ کلرک کی میز تھی، وہ گھومنے والی گول کرسی پر بیٹھنے کا عادی تھا کرسی کا یہ گول چکر ہی اس کا شخصی امتیاز تھا۔ باز دکا کمرہ رنجیت سنگھ کے لیے مخصوص تھا دروازے پر رنگین پردہ لٹکتا رہتا تھا، شام لال کے سامنے فائلوں کا بے ترتیب سا ڈھیر لگا رہتا وہ کہیں کہیں بال پن سے نشانات لگاتا رہتا گھنٹہ دو گھنٹہ بعد پہلی فائلیں چپراسی اٹھا لے جاتا تو ان کی جگہ دوسری فائلوں کا انبار لگا دیا جاتا۔ رنجیت بھون کی دیواریں کئی فٹ بلند ہو چکی تھیں، راجوں کے لیے بلیاں گاڑ کر پاڑھ بنا دی گئی تھی وہ پاڑھ پر اکڑوں بیٹھے کنی سے بھیگی ہوئی اینٹیں جما کر ان پر ریت ملا ہوا سیمنٹ پھیلاتے رہتے ایک دن شام لال ہیڈ کلرک نے شیو پرشاد خزانچی کے خلاف فائل پر بہت سخت نوٹ لکھا کئی بار اسے پڑھا جب پورا اطمینان ہو گیا کہ کوئی کور کسر باقی نہیں رہی تو چپ چاپ بیٹھ کر باس کے آنے کا انتظار کرنے لگا،

گھنٹی کی آواز پر لگے رہے، وہ کمرے میں آکر گھنٹی بجا دیا کرتے تھے۔
کی نغمہ ریز صدائیں فضا میں بکھرتے ہی شیام لال ضروری کاغذات
بڑا باس کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر جا بیٹھا۔ رنجیت سنگھ
کاغذ پر سُرخ روشنائی سے دستخط کرتے رہتے۔ آج سب سے
پہلے شیام لال نے شیو پرشاد خزانچی کی فائل میز پر رکھ دی، رنجیت
عینک لگا کر نوٹ پڑھا بھنویں تن گئیں، پیشانی شکن آلود
گئی، طیش میں آکر بولے "آج ہی نکال دو گدھے کو۔" اسی دن
خزانچی کو ڈسمس آرڈر پکڑا دیا گیا، شیو پرشاد منھ لٹکائے دفتر سے
چلا گیا کلرکوں کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی صرف ایک
دبلا پتلا بوڑھا جو انسان کو گدھے کے روپ میں ہانکنے پر بری طرح کڑھ
گیا اور اندر ہی اندر کھولنے لگا بالکل اسی طرح جیسے ہیٹر پر بند دیگچی
میں رکھا ہوا پانی ابال کھانے لگتا ہے۔

کب تک آدمی کی یہ گت بنتی رہے گی —— وہ قلم دانتوں میں
دبائے دیر تک اسی سوال پر غور کرتا رہا، رنجیت بھون کی دیواریں
بہت اونچی کھڑی ہوگئیں پہلی منزل پر چھت ڈالنے کی تیاری ہونے
لگی مغربی دیوار ایک تنگ گزرگاہ میں کھڑی کی گئی تھی۔ گلی میں ملبے
کے کئی بالشت اونچے ڈھیر لگ گئے تھے۔ راستہ چلنے والے ٹھوکریں
کھانے لگے۔ رنجیت نے لائٹ لگوا دی تھی پھر بھی لوگوں کو گلی پار کرنا
دوبھر ہو گیا وہ روز ہی رنجیت سے شکایت کر رہے تھے، رنجیت نے
شیام لال سے کہا:

"بڑے بابو ملبہ جلد ہٹانا چاہیے۔"
میں کوشش کر رہا ہوں آج ہی کل میں راستہ صاف ہو جائے گا۔"

سڑک تک لمبی گلی چلی گئی تھی، ٹرک بہت دور کھڑا ہوتا تھا
مزدوروں کے سروں پر ملبہ ڈھلوانے میں خرچ بہت آرہا تھا یہ مہم
صرف گدھوں ہی سے سرکرائی جاسکتی تھی شہر میں جگہ جگہ تعمیریں ہو
رہی تھیں گدھے فالتو نہیں تھے۔ کمہاروں کو بھی فرصت نہ تھی انھوں
نے دوسری عمارتوں کی صفائی کے ٹھیکے لے رکھے تھے۔ شیام لال برابر دوڑ دھوپ
کرتا رہا بڑی مشکل سے ایک کمہار سے معاملہ طے ہوا اُسکے پاس دس بارہ مریل سے
گدھے تھے۔ گلی صاف ہونے لگی، دن رات کام لگا رہا، تین چار دن ہی

میں سارا کوڑا کرکٹ گدھوں پر لاد کر باہر پھینک دیا گیا محلہ والوں نے
رنجیت کی ہمدردی اور فرض شناسی کی بے حد تعریف کی۔ ان کے
الیکشن کا میدان ہموار ہو گیا۔ شیو پرشاد خزانچی روزگار کی تلاش
میں دن رات جوتے گھستا رہا کہیں نوکری نہ ملی۔ رنجیت کے یہاں سوالی
بن کر جانا اسے گوارا نہ تھا بھوکا مر جانا پسند تھا۔ رنجیت کے آگے ہاتھ
پھیلانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بچوں کے کپڑے پھٹ گئے، پیٹ بھر روٹی
ملنا مشکل ہو گئی، اسکول کی فیس ادا نہ ہو سکی۔ ایک روز خزانچی کی بیوی
موہنی نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

کیا سیٹھ سے معافی مانگتے شرم آتی ہے، ناک نیچی ہو جائے
گی، ایک دن بال بچوں کی خاطر چلے جاؤ سُنا ہے کہ وہ بڑے دیالو ہیں
ضرور بحال کر دیں گے۔"

"معافی نہیں مانگوں گا، ایک سے ہزار بگٹ تک۔ وہ جو کسی
نے کہا ہے جان جائے پر آن نہ جائے بالکل ٹھیک ہے"۔

"دو بچوں کا اسکول سے نام کٹ گیا دو کو میں نے آپ ہی اٹھا
لیا کھانے پینے کا خرچ زیور بیچ کر چلا رہی ہوں"

شیو پرشاد نے موہنی کے گورے چٹے چہرے کو عجب انداز سے
دیکھا مرجھائے ہوئے گالوں کو دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا گلاب
کے دونوں پھول سوکھ گئے تھے، خزانچی کے شعور میں چنگاریاں سی سلگ
اٹھیں جس کہاوت پر اسے پکا عقیدہ تھا وہ ماند پڑنے لگی اس نے گرتی
ہوئی دیوار کو سنبھالا اور بیوی کو مخاطب کیا۔

"موہنی میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ ہیڈ کلرک کی بیوی نے
دوکان سے راشن لانے کو کہا تھا میں نے انکار کر دیا"۔

"میڈم یہ ہمارا کام نہیں"
وہ چڑھ گئی ہیڈ کلرک کے کان بھر دیے۔ اس نے اسی غصہ
میں نوکری سے الگ کرایا جھوٹی شکایت کر کے، معافی کس بات کی
مانگوں؟ کوئی غلطی ہوتی تو ضرور شرمندہ ہوتا"

"میں کہتی ہوں کھڑے کھڑے صورت ہی دکھا آؤ انھیں شاید
موڈ بدل جائے"

موہنی! —— اس نے بیوی کو مخاطب کیا وہ بڑے لڑکے کی کنگھی

ہوئی بش شرٹ سی رہی تھی نگاہیں اٹھائیں تو شوہر کی کمھلائی ہوئی اداس اداس صورت دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں پلکوں پر آنسوؤں کی سفید بوندیں لرزنے لگیں۔ جیسے سچے موتیوں کو لڑی میں پرو دیا گیا ہو، سوچنے لگی مجبوری کتنی بری چیز ہے آج میں اپنے پتی کو آن توڑنے کا مشورہ دے رہی ہوں جس کو اس نے ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھا۔

"موہنی، تمہارے کہنے سے جاؤں گا ضرور مگر بات پر آنچ نہیں آنے دوں گا عزت کے آبگینہ میں بال آجائے یہ کبھی گوارا نہ ہوگا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے، میں بھی مر جاؤں گی پر تمہاری بات بگڑنے نہیں دوں گی، زیور گہنا، کیا چیز ہے جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں بلا سے اولاد ان پڑھ رہ جائے میں تمہارے جیتے جی اپنی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں موُلنے نہیں دوں گی۔" موہنی کی آنکھیں برساتی جھیلوں کی طرح سوکھ گئی تھیں سانس زور سے چل رہی تھی۔

موہنی غم مت کر، میں جا رہا ہوں، اگرچہ دل کہہ رہا ہے، "شرم مرد خدا نہیں آتی"، مگر میں بے شرمی کا ارتکاب نہیں کروں گا ہاتھ نہیں پساروں گا رنجیت کے آگے۔

کئی مہینے بیت جانے پر وہ آج آفس آیا تھا رنجیت بھون کی تیسری منزل پر لوہے کے بھاری بھرکم گارڈر چڑھائے جا رہے تھے۔ مزدوروں کی قطاریں بلڈنگ کے آگے یوں متحرک تھیں جیسے بہادر جوانوں کے دستے دشمن پر حملہ کرنے جا رہے ہوں اس کا دل دھڑکنے لگا عورتوں کے رنگ برنگے دوپٹے لہرا رہے تھے۔ اس نے مضبوط ارادے کے ساتھ دفتر میں پاؤں رکھ کر پھر عہد کیا۔

"ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا"

کلرکوں نے حیرت سے اسے آتے دیکھا۔

شیام لال ہیڈ کلرک نے اشارے سے بلایا۔

ادھر آؤ شیو پرشاد ــــ کہو کہاں رہے؟

"یہیں"

"کس حال میں ؟"

"بہت اچھے ڈھنگ سے زندگی بتا رہا ہوں آپ کی کرپا سے"

نوکری کرو گے ؟

"نہیں"!

"کر لو میرے بھائی، افسوس ہے میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے تمہاری جگہ خالی ہے ــ وہ اب بھی تمہارا ہی انتظار کر رہی ہے"۔

شیو پرشاد نے کچھ نہیں کہا، صرف مسکراتا رہا۔ شیام لال نے گرد آلود فائل نکال کر اسے جھاڑا کچھ لکھا اور باس کے کمرے میں چلا گیا۔

"ایک درخواست ہے سر"

کیسی درخواست ؟

"شیو پرشاد کو دوبارہ وہی جگہ دیدی جائے"۔

"دوبارہ جگہ دیدوں، اس گدھے کو ؟"

سر، گدھوں کے بغیر بھی تو کام نہیں چلتا، الماری میں فائلوں کا ملبہ بھرا پڑا ہے۔

رنجیت بہت نرم دل تھے ہنس کر چپ ہو گئے اسی زمانہ میں رنجیت الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے تھے، شیو پرشاد کا نام ان کے ورکروں نے ووٹر لسٹ میں لکھوا دیا تھا خزانچی کو بالکل خبر نہ تھی۔ مقابلہ بڑے کانٹے کا تھا حریفوں کے کارندے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ وقت ختم ہونے لگا تو ایک ایک ووٹ سونے سے زیادہ قیمتی ہو گیا سب سے آخر میں ایک کلرک نے شیو پرشاد سے کہا،

"شیو جی آؤ اپنا پرچہ ڈال دو"

اس نے حیران ہو کر پوچھا

میرا نام ہے لسٹ میں ؟

بالکل ہے آؤ میرے ساتھ

وہ آخری پرچہ تھا جو شیو پرشاد نے بیلٹ بکس میں ڈالا اور رنجیت کی جیت اسی ووٹ سے ہوئی جو ایک معیاری انسان کا ووٹ تھا۔

★

مہاکوی کالی داس

بابا کرشن گوپال مغموم

واہ! نقاشِ حُسن! کالی داس!
خوب منظر کشیِ فطرت کی
کیا تعجب کہ تیرا مولد[1] تھا
حسن ہی حسن تھا جو پیشِ نظر
والمیک اور ویدویاس کے بعد
تو کہ تھا آفتابِ چرخِ کہن
مردِ حاضر جواب و خوش گفتار
حسنِ صورت کے ساتھ تجھ کو ملی
تو کہ تھا بحرِ حُسن کا غواص
بہرِ گنجِ گرانِ علم و ادب
دفترِ شعر تھی ترے حق میں
تو نے جس چیز پہ نظر ڈالی
سرِ کہسار، برف کا منظر
پھول، پھل اور طرفہ شادابی
برگ و گل کا بیاں بصد ندرت
کوک کوئل کی، آم کے باغات
کہیں آبِ روانِ گنگ و جمن
نربدا، سرسوتی و کاویری
تذکرہ ہے کہیں گھٹاؤں کا
کہیں موروں کا ناچ جنگل میں
کہیں ہجر و وصال کے منظر
کہیں عاشق کی حسرتوں کا بیاں
چھیڑ بھونروں کی تازہ کلیوں سے
مضطرب دل کی دھڑکنیں ہیں کہیں
گھنے پیڑوں کے سائے میں تالاب
مست و سرخوش ہیں راج ہنس کہیں

تو مصور تھا ایک بے تمثال
تجھ میں صنعت یہ تھی بہ حدِ کمال
رشکِ فردوس، خطۂ کشمیر
بن گیا خود بھی حُسن کی تصویر!
تیرا دنیا میں نام نامی ہے
لائقِ شہرتِ دوامی ہے
اس میں آمیز تھی ظرافت بھی
جودتِ طبع بھی ذہانت بھی
لولوے تابدار لایا تھا
گوہرِ شاہوار لایا تھا
دلکش و دلربا ہی دنیا
زیورِ شاعری اسے بخشا
دل فزا حُسن دیوداروں کا
واہ! نظارہ مرغزاروں کا
ذکر جھرنوں کا آبشاروں کا
کیف جادو بھری بہاروں کا
کہیں گوداوری کا لطفِ خرام
جن کے سنگیت میں سرورِ دوام
کہیں برسات کے نظارے ہیں
آہوؤں کے کہیں طرارے ہیں
کہیں گھاتیں ہیں نازنینوں کی
کہیں باتیں ہیں مہ جبینوں کی
کہیں ذکرِ نسیمِ عنبر بیز
کہیں ہنگامۂ نشاط انگیز
کنولوں سے بھرے سرودر ہیں
کہیں فردوس پاش منظر ہیں

رُوح افروز تیری گل کاری
کون ہے تجھ سا محرمِ فطرت
تو نے فطرت کے ہر نظارے کو
اپنے حُسنِ نظر سے بھر اس کو
حسن اور عشق تیری جولانگاہ
خوش جمالوں سے پیار کی باتیں
نازکی برگ ہائے گل سے سوا
ہائے! دوشیزگانِ گل اندام
تیری طبعِ رسا کا کیا کہنا
کیا لطافت ہے استعاروں میں
نظر آیا نہیں کوئی تجھ سا
خوب کی ترجمانیِ جذبات
نقشِ عظمت ترے کوئی دیکھے
تیرے کردار مر نہیں سکتے
تیرے سرمایۂ سخن کی رُوح
آفریں باد! قوتِ اظہار
تیرے الفاظ کی لطافت پر
نکتہ در رس کا کیا کہنا
شاعری ہے کہ بولتا جادو؟
کہیں قاصر نہیں ہے اشہبِ فکر
تیرا حسنِ قبولِ عالمگیر
کتنی صدیاں گزر گئیں پھر بھی
تیرے نغموں کی گونج آفاقی
تیری نکر و نظر کا ہر شہکار
تیرے مداح ہو گئے دنشگور
تھا ستائش گزار ولیم[2] جونز

تیرے پھولوں کی آب و تاب ہے اور
تو نے کھولی ہے جو کتاب ہے اور!
بہ نگاہِ دقیق دیکھا تھا
اک نیا رنگ روپ بخشا تھا
تو تھا آگاہِ بزمِ راز و نیاز
دل بے تاب اسیرِ زلفِ دراز
چاندنی سے لطیف پیکرِ ناز
طوطیانِ چمن سے نرم آواز
نادرہ کار تیری تشبیہات
کتنے نازک ہیں تیرے محسوسات
ماہرِ نفسیاتِ انسانی
ایک دنیا ہے تیری دیوانی
غیر فانی ترے ڈراموں میں
تا قیامت ترے فسانوں میں
حسن و رنگینی و لطافت ہے
کیا فصاحت ہے، کیا بلاغت ہے
وجد کرتے ہیں اہلِ ذوقِ سلیم
تیرے مداح ہیں عقیل و فہیم
واہ وا! تیری بزم آرائی
حبّذا! تیری رزم آرائی
شہریارِ دیارِ شعر و سخن!
نظر افروز ہے ترا گلشن
تیری پرواز لامکانی ہے
غیر فانی ہے، جاودانی ہے
تیری شہرت ہے بین الاقوامی
کون ہے تجھ سا شاعرِ نامی

---

[1] ایک مکتبۂ خیال کے مطابق کالی داس کشمیری تھے۔ (مغموم)　[2] سر ولیم جونز

غزلیں

کرشن بہاری نور

جنم جنم کا چکر اک عجیب چکر ہے
کشتیاں ہیں خوابوں کی، نیند کا سمندر ہے

اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ رہے قائم
تیری یاد کا عالم کتنا خواب آور ہے

بے تعلقی اس کی کتنی جان لیوا ہے
آج ہاتھ میں اس کے پھول ہے نہ پتھر ہے

اس سے اپنا غم کہہ کر کس قدر ہوں شرمندہ
میں تو ایک قطرہ ہوں اور وہ سمندر ہے

کیا بتاؤں دنیا کو کیا چھپاؤں دنیا سے
تم جو خواب میں آئے سارا گھر معطر ہے

بے نیاز سکھ دکھ سے رہ کے جی نہ پاؤں گا
سکھ مری تمنا ہے دکھ مرا مقدر ہے

نور زندگی میری اک کھلا ہوا خط ہے
جو بھی میرے دل میں ہے وہ مری زباں پر ہے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

مرا غم تھا نامکمل غمِ ناگہاں سے پہلے
مری زندگی تھی مبہم ترے امتحاں سے پہلے

ترا حسن ہے عبارت مرے عشق کی یہ دولت
تری داستاں کہاں تھی مری داستاں سے پہلے

یہی اصل عاشقی ہے، یہی عینِ زندگی ہے
غمِ دوست چاہتا ہوں غمِ دو جہاں سے پہلے

بہ ایں حادثاتِ پیہم، سرِ منزلِ محبت
کوئی کارواں نہ پہنچا مرے کارواں سے پہلے

ترے عشقِ بے اماں نے مجھے دی نہ اتنی مہلت
کوئی مشورہ ہی کرتا کسی مہرباں سے پہلے

ترے سنگِ در سے پوچھے کوئی اس جبیں کی عظمت
جو کہیں نہ جھک سکی ہو ترے آستاں سے پہلے

یہ وفا کی سخت منزل کہ جہاں پہنچ کے جوہر
کئی کارواں ہوئے گم مرے کارواں سے پہلے

ضیا بختیاری

ادب کا تعمیر پسند نظریہ

ادبی قدروں کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ ادب کائنات اور حیات کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے اور اس نظریہ کی روشنی میں وہ زندگی اور اس کے مختلف مسائل کو اس کے واقعات اور اس کے تجربات کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کس طرح ان کا تجزیہ کرتا ہے اور کیونکر ان سے استفادہ کرتا ہے۔

دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاملہ ہو یا بڑے سے بڑا مسئلہ ایک صحیح الدماغ اور صحیح الفطرت انسان کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ بالکل خالی الذہن ہو کر وہ اس چھوٹے سے معاملے کی کوئی توجیہ کر سکتا ہے یا بغیر کسی نظریہ کے کسی مسئلہ کا حل پیش کر سکتا ہے۔ ذہن خالی ہی کب رہتا ہے اگر اسے کوئی اچھا نظریہ نہیں ملے گا تو لا محالہ وہ برے اور ناقص تصورہی کو اپنے اندر بسالے گا۔ یہی نظریہ اسے زندگی کے ہر مرحلے اور ہر موڑ پر روشنی دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ منزل کا تعین اور راہ انتخاب بھی اسی کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اس کی صحت و عدم صحت اور اہمیت و عدم اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ممکن ہے ادب کی قدروں کو متعین کرتے وقت فلسفۂ زندگی کے بنیادی تصورات کا تذکرہ کچھ لوگوں کی نظروں میں زیادہ اہم نہ ہو لیکن یہ صحیح ہے کہ اس کے بغیر ادیب بہت سی لغزشوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ہم آہنگی سے محروم اس قضا کی مثالیں ہمارے ادب میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ — کیا صرف اس اشارے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے کہ سماجی زندگی میں ایک ایسا خارجی قانون چل رہا ہے جو تغیر پسند ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اس سماجی تغیر کو بالکل واضح کر دیا جائے جو اس خارجی قانون کے تحت ہوتا ہے۔ آخر ہمارے پاس حقائق و شواہد کے وہ کون سے ٹھوس دلائل ہیں جن سے ایک دور کے قانون کو اور اس کے تغیر کو دوسرے دور سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ تبدیلی اگر غیر مبہم اور واضح نہ ہوئی تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ آج کا یا کسی بھی مخصوص زمانے کا عمل غلط ہے چاہے وہ فرد کا عمل ہو یا سوسائٹی کا عمل — جب تک تبدیلی غیر مبہم اور واضح نہ ہو، غلط یا صحیح کا معیار متعین نہ ہوگا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی ایک معمہ اور نا قابل فہم تاریخی حادثہ بن کر رہ جائے گی۔ اور چوں کہ ادب اس سماج اور اس کے افراد کی زندگی کا عکاس ہوتا ہے، اس لیے وہ بھی غلط روی کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر غلط اور صحیح کو جانچنے کا معیار کیا کوئی انصاف پسند کبھی مبہم پیش گوئی کی بنیاد پر متعین کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔؟ اور کیا وہ یہ نہیں چاہے گا کہ غلط اور صحیح کا معیار مبنی بر حقیقت ہو۔

یہاں یہ بھی سوال ذہن میں جنم پاتا ہے کہ تعمیر کیا ہے اور تخریب کیا؟ تعمیر پسند نظریہ اس کے بارے میں کیا کہتا ہے

اس کا صحیح اور واضح جواب یہ ہے کہ اس بالاتر ہستی کا ایک قانون تو وہ ہے جسے کائنات کی ہر شے نے قبول کیا ہے اور وہ ایک مکمل قانون ہے جو حیات انسانی کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے اختیار کرنے کی آزادی انسان کو حاصل ہے اس قانون پر سماجی زندگی کو ریاضی کی صداقتوں کی طرح جانچا جا سکتا ہے ــ فرد یا سماج کا عمل اگر اس ہی قانون کے خلاف ہے جو اس فوق الفطرت ہستی کا عطا کردہ ہے تو سماجی زندگی کو اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے اور ایسا عمل تخریبی ہے اس کے برعکس اگر اس کے عمل میں فوقیت پائی جاتی ہے تو وہ نہ صرف معروف قدروں کا حامل ہے بلکہ اس نظریے کے تمام پہلو مثبت ہیں اور یہ نظریہ تعمیری ہے۔

اب تک ہمارے ادب میں جو نظریے پیش کیے جاتے رہے ہیں اور مختلف فلسفوں کو سمونے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، ان کی حیثیت کیا رہی ہے۔ کیا ہم نے ان کی نظری اہمیت کو زیادہ شدت سے جگہ دی ہے یا عملی نتائج کے بل پر اپنے فلسفہ کو ادب میں پیش کیا ہے

ایک مدت سے سن رہے ہیں کہ ادب زندگی کا عکاس ہے، اس کا ترجمان ہے۔ اس کا آئینہ دار ہے، اور جانے کیا کیا اسی طرح کے بے شمار الفاظ ہیں جو اس کے بارے میں کہے جاتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے چرچے بھی کم نہیں رہے ہیں۔ گویا سماجی زندگی کی تصویر کشی ہی ادب کا مقصد ہے۔ ظاہر ہے ان سب باتوں سے زندگی کی عملی تفسیر کا فرض ادب پر عائد ہوتا ہے۔ ادب سماج کو کیا دیتا ہے یہ سوال پھر بھی باقی ہی رہتا ہے۔ کیا وہ محض عکاس ہے اگر ایسا ہے تو شاید ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ادیب کسی وقت بالکل خالی الذہن بھی ہو سکتا ہے، حالانکہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ انسان کا ذہن خالی رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ محض عکاس ہے تو پھر یہ حقیقت نگاری کیسی؟ کیونکہ حقیقت نگاری کا نام لیتے ہی ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی وضاحت کریں کہ حقیقت کیا ہے۔ اگر حقیقت کی وضاحت نہیں کریں گے تو پھر سماجی یا انفرادی عمل کو حقیقی انداز میں ہم پیش ہی کس طرح کر سکتے ہیں۔ جبکہ ادب کوئی میکانکی عمل نہیں ہے، بلکہ اس میں ادیب کی نفسیات کو دخل ہے۔ اور نفسیات کے اصول دیے بغیر کسی عمل کی حقیقت معلوم کر لینا ممکن نہیں

ادیب اور شاعر کو چاہیے کہ وہ ان تاثرات کا جائزہ لے جو نظریۂ حیات و کائنات کے اپنانے سے ادبیات کے اساسی ارکان یعنی فکر، فن اور تنقید پر پڑتے ہیں۔ ایک مخصوص نظریۂ حیات ایک فن کار کا مخصوص فکری میلان اور ذہنی رجحان بناتا ہے جن سے زندگی کی مختلف قدروں کو جانچنے پرکھنے اور ان کے نکات و مفہوم کو زندگی کے رواں دواں عناصر سے ہم آہنگ کرنے کی فنی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور فکر حسنِ تناسب کی صورت گری سے فن کا وہ پیکر جمیل اختیار کرتا چلا جاتا ہے، جس کے نفسیاتی و ذہنی اثرات انسان کے فطری جذبات کو جمالیاتی ذوق کی مدد سے ابھارا کرتے ہیں۔ اور زندگی کے جذباتی پہلوؤں کے بناؤ بگاڑ میں حصہ لیتے ہیں صحیح تنقید ان فنی اور جذباتی پہلوؤں کو حقیقت کی کسوٹی پر جانچتی ہے۔ اور زندگی کے مختلف مسائل کو فکر و فن کی روشنی میں پرکھتی ہے۔

ادب کا نفسیاتی مقصد

ہر نظریہ جو ایک مخصوص فکری میلان رکھتا ہے ادب کے نفسیاتی و ذہنی اثرات سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نظریہ کے مبادی سے ہم آہنگ ہوں۔ ادب جمالیاتی ذوق کو ابھار کر اور حسنِ تناسب کی پسندیدگی کے احساس کو اکسا کر زندگی کے بنیادی مقاصد کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ عمل خالص نفسیاتی اور ذہنی ہے جس سے ادیب ان مظاہر کائنات اور حالات زندگی کی عکاسی سے انسان کے طبقاتی شعور کو ابھارنا چاہتا ہے۔ اس قسم کا مختلف طبقاتی شعور دراصل ان ادیبوں کے پیش کیے ہوئے ادب کا نفسیاتی مقصد ہوتا ہے ــ اس نفسیاتی مقصد کو مبنی بر حقیقت ثابت

کرنے کے لیے دو باتوں پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ کیا وہ واقعی مقصدِ زندگی کے واقعات اور نفسیاتِ انسانی کی تہہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے؟ دوسرے یہ کہ اس سے نظریۂ حیات اور عمل کے اس امتزاج کی جسے ہم سماجی عمل کہتے ہیں تعمیر ہوتی ہے یا نہیں۔

تعمیر پسند ادب بھی ایک نظریۂ حیات و کائنات رکھتا ہے۔ اس کا بھی ایک نفسیاتی مقصد متعین ہے۔ جو جدید و قدیم ادب کے صحیح امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا ہے؟ تعمیر پسند ادیب کس نفسیاتی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کا نفسیاتی مقصد کیا زندگی کے تقاضوں کی تہہ میں موجود ہے یا نہیں۔ اور وہ کم اہم ہے یا اہم ترین؟ اس کے علاوہ جدید ادب کے وہ مختلف نظریات کیا ہیں جو اپنے اثرات سے قدیم ادب سے الجھ کر تعمیرِ حیات کے اعلیٰ مقصد سے دور ہو جاتے ہیں۔ ان سب پہلوؤں پر منصف مزاجی کے ساتھ گفتگو کی جائے تب ہم تعمیری ادب کو بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

ادب کا صحیح نفسیاتی مقصد

ترقی پسندی کی موافقت میں جو دلائل بھی ملتے ہیں ان کا تجزیہ کرنے کے بعد یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل جذبہ انسانی بھلائی کا جذبہ ہے جو ہر سوسائٹی اور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔ اگر سوسائٹی اچھی ہے اور اخلاقی حیثیت سے اونچی ہے۔ تو یہ جذبہ اپنی بہترین شکل میں ملتا ہے۔ اور بری ہے تو اس کے چہرے پر غلط توجیہات کے پردے پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ اس سے ادب میں اخلاقی رجحانات کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہی ایک تعمیر پسند ادیب کا نظریہ ہے تعمیر پسند ادیب ادب کا نفسیاتی مقصد متعین کرتا ہے کہ وہ ذہن میں اخلاقی حس کو بیدار کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ بنیادی چیز ہے جو واقعاتِ زندگی اور جمالِ فطرت کی عکاسی میں جذب ہو کر ادب کو تعمیرِ حیات کی راہ پر لے جاتی ہے۔

تعمیر پسند ادب بھی مظلوم طبقہ سے ہمدردی رکھتا ہے وہ مزدوروں کی حمایت بھی کرتا ہے لیکن اس کا انداز تخریبی نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں ان اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھتا ہے جو سماج کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔ خواہ وہ مظلوم کی حمایت ہو یا ظالم طبقہ سے بیزاری۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر تعمیر پسند ادب اور ترقی پسند ادب کے نفسیاتی مقاصد میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تعمیر پسند ادب نے کیوں اخلاقی نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔ ادب اور اخلاق کے اس خوشگوار تعلق کو ہر اچھے ادب میں اہمیت حاصل رہی ہے۔

چند ادبی مسائل

تعمیری ادب کے اس نظریاتی پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد قنوطیت، رجائیت، قدامت، جدّت اور زبان و بیان کی خوبصورتی اور ایسے ہی دوسرے مسئلوں پر زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت کم ہی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعمیرِ حیات کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بڑے حوصلہ کی ضرورت ہے۔ ذہنی تعمیر کے وقت اس حوصلہ کو ابھارنے میں ادب بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس لیے ادب میں رجائیت سے بھرپور لہجہ ہی تعمیر پسند نقطۂ نظر کے لحاظ سے درست کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے ادب میں راہِ فرار اور عزم و عمل کا چرچا بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔ مشکل حالات سے مقابلہ کرنے کا جذبہ یا ان سے گھبرا کر دور بھاگنے کی ذہنیت دو مختلف نفسیاتی کیفیتیں ہیں۔ تعمیر پسند ادب زندگی کی مشکلوں کے مقابلہ میں عزم و حوصلہ کا حامی ہے۔ راہِ فرار اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اب رہا قدامت اور جدّت کا سوال۔ تعمیر پسند ادب کے علمبرداروں کے سامنے یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اصول جسے ہم ٹھیک اور صحیح سمجھ رہے ہیں وہ نیا ہے یا پرانا۔ اصول چاہے نیا ہو یا پرانا، اگر وہ صحیح ہے تو اسے قبول کرنے کے لیے یہی ایک خوبی کافی ہے کہ وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ جو

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

حفیظ بنارسی

رسمِ جہیز

جہیز ایک سیاست ہے زر پرستی کی
جہیز اصل میں لعنت ہے زر پرستی کی

یہ رسم بد ہے نہایت بری روایت ہے
جو سچ کہو تو چلن اس کا اک جہالت ہے

مرے وطن کے جوانو ذرا سنو اس کو
کسی دھرم میں اجازت نہیں کہ لو اس کو

کوئی جو شوق سے دے بھی تو مت قبول کرو
خدا کے واسطے اب تم نہ ایسی بھول کرو

نہیں یہ داغ کسی انجمن کے ماتھے پر
کلنک ہے یہ ہمارے وطن کے ماتھے پر

نہ جانے کتنوں کو زندہ جلا دیا اس نے
نہ جانے کتنے گھروں کو مٹا دیا اس نے

مرے عزیز رفیقو کبھی یہ سوچا بھی
کہ اس کا لینا بھی ہے جرم اور دینا بھی

شکایتیں ہیں مجھے ان سے ان کی عادت سے
خریدتے ہیں جو لڑکوں کو اپنی دولت سے

یہی دکھاتے ہیں اوروں کو بھی جہیز کی راہ
یہی سکھاتے ہیں کرنا یہ بدترین گناہ

وطن کے جسم پہ ناسور ہے جہیز کی رسم
بڑی خرابی سے معمور ہے جہیز کی رسم

تم اس کے داغ سے دامن کو اپنے پاک کرو
خدا کے واسطے اس کو سپرد خاک کرو

حسیں شعور کی اچھے چلن کی مانگ کرو
جو مرد ہو تو نہ عورت سے دھن کی مانگ کرو

تلک جہیز کا یہ کاروبار بند کرو
جو ناپسند ہے وہ شے نہ تم پسند کرو

جلاؤ شمع محبت نیا سویرا ہو
کسی غریب کے گھر میں نہ اب اندھیرا ہو

جوان چہرے نہ مرجھائیں گھر کے آنگن میں
کوئی بھی پھول نہ کمھلائے اپنے گلشن میں

کسی کی آبرو برباد ہو نہ دھن کے لیے
جہیز مانگے نہ کوئی کسی دولہن کے لیے

کسی کے سینے میں خنجر یہ اب اتر نہ سکے
اسے مٹاؤ تم ایسا کہ پھر ابھر نہ سکے

ذکی کاکوروی

جلیلؔ مانکپوری کی اصلاحِ سخن

جلیلؔ ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ وہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر اور بہترین غزل گو تھے بلکہ فن شاعری میں بڑی مہارت اور زبان پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ امیرؔ مینائی کے سب سے قابل شاگرد اور ان کے متفق علیہ جانشین قرار پائے۔ تلامذۂ امیرؔ میں سے بیشتر نے امیرؔ کے انتقال کے بعد جلیلؔ سے اصلاح لینی مناسب سمجھی، جو جلیلؔ کی استادی کا بیّن ثبوت ہے۔ یہی نہیں داغؔ کے انتقال کے بعد ان کے متعدد شاگرد جلیلؔ کے شاگرد ہو گئے۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں آصفؔ نے داغؔ کے بعد جلیلؔ ہی کو شرف استادی بخشا، جو اس زمانہ میں بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میر محبوب علی خاں آصفؔ کے بعد ان کے جانشین سلطان دکن میر عثمان علی خاں نے بھی منصب استادی پر جلیلؔ ہی کو سرفراز فرمایا اور جلیلؔ اس مرتبہ جلیلہ پر اپنی زندگی کے آخری وقت تک انتہائی عزت اور وقار کے ساتھ فائز رہے۔

جلیلؔ، امیرؔ مینائی کی زندگی میں ہی ان کے شاگردوں کی اصلاح سخن ان کے حکم سے کرتے تھے جو بعد کو استاد کے ملاحظہ میں پیش کر کے منظوری حاصل کر لیتے تھے۔ اس لیے ایک مشاق مسلم الثبوت استاد میں جو جو خوبیاں اصلاح سخن کے لیے درکار ہیں وہ سب جلیلؔ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی اصلاح سخن کا انداز بڑا ادب آموز تھا۔ وہ عام طور پر صرف لفظی ہیر پھیر کر کے اصلاح دیتے تھے اور حتی الامکان شاگرد کی فکر، موضوع سخن اور معنی میں تغیر نہ فرماتے تھے۔ اس لفظی اصلاح سے ہی شعر کی تاثیر، حسن و لطافت اور شعریت میں بڑا اضافہ ہو جاتا تھا اور اچھے شعر پر ان کی بیشتر اصلاح سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ اصلاح کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس سے شاگرد کی صلاحیت، علم، ذوق اور نظر میں وسعت ہوتی تھی جس سے وہ فن، زبان اور شاعری کے محاسن و معائب کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اصلاح کے معاملے میں جلیلؔ کی نظر شعر کی عروضی خامیوں پر پہلے پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان کی صحت اور عمدگی کی جانب توجہ فرماتے تھے۔ تضاد معنوی یا غیر فطری خیال نیز دوسری اغلاط کی درستگی بھی پیش نظر رہتی۔ فنی مہارت کا یہ کمال تھا کہ اکثر ایک دو لفظوں کے تغیر و تبدیل سے ہی شعر زمین سے آسمان پر پہنچ جاتا۔ شعر کی تاثیر میں اسلوب بیان کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ جلیلؔ داغؔ کی طرح اسلوب بیان کے ماہر تھے۔ معمولی سی معمولی خیال کو صرف اسلوب بیان کی خوبیوں سے بلند کر دیتے تھے۔

جلیلؔ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسی نسبت سے اصلاح سخن کا بار بھی ان پر بہت زیادہ تھا جو بعض اوقات ان کے لیے بہت زحمت طلب اور دماغی بوجھ بن جاتا تھا۔ مگر وہ اپنی شرافتِ نفس اور اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو فیض پہنچاتے تھے۔ ہر چند کہ ان کے سر پر بڑی بڑی ذمہ داریاں تھیں جن میں فرائض منصبی، تصنیف و تالیف، فکر سخن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جلیلؔ کی اصلاحیں کافی تعداد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں ملتی ہیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر چند منتخب اشعار درج ذیل

کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین جلیل کی اصلاح کی خوبیوں سے کما حقہ لطف اٹھائیں۔

مندرجہ ذیل اصلاحیں مجلۂ عثمانیہ کے جلیل نمبر، "ہندستانی ادب" مئی جون ۱۹۴۶ء کے جلیل نمبر اور مشاطۂ سخن از صفدر مرزا پوری سے منتخب کی گئی ہیں اور ان میں ذیلی وضاحتیں راقم الحروف نے اضافہ کر دی ہیں۔"

(۱) مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد۔

شاد ؎

کیا منحصر اک طور پہ دیدار خدا ہے ۔۔۔ موسیٰ سے کہو ہر جگہ وہ جلوہ نما ہے

اصلاح " " " " ۔۔۔ آنکھیں ہوں تو ہر ذرہ میں وہ جلوہ نما ہے

'موسیٰ سے کہو' میں حسن تخاطب کی بڑی کمی ہے اور 'ہر جگہ' کے مقابلے میں 'ہر ذرہ میں' زور کلام اور معنویت بہت زیادہ ہے دوسری بات اس اصلاح میں یہ ہے کہ موسیٰ کی مخاطبت میں زلق کے حق خطابت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اصلاح کے بعد یہ معنوی نقص بھی ختم ہو گیا اور شعر میں بڑی آفاقیت یا وسعت پیدا ہو گئی جس کا احساس صحیح ذوق سے تعلق رکھتا ہے۔ 'آنکھیں ہوں تو' کے ٹکڑے نے تو شعر میں ناقابل بیان بلندی اور تاثیر پیدا کر دی ہے یہی اصلاح کا کمال ہے۔

شاد ؎ ہر کام میں اب ہوتی ہے تائید خدا کی
اے شاد ترے ساتھ بزرگوں کی دعا ہے

اصلاح :۔ ہر کام میں تائید نہ کیونکر ہو خدا کی
" " " " "

'اب' کا لفظ بے محل اور بیکار تھا۔ اصلاح نے اس نقص کو دور کر کے زور کلام میں بڑا اضافہ کر دیا اور دونوں مصرعوں کے معنوی ربط کو بڑھا دیا۔

(۲) احمد علی شباب۔

شباب۔ کریں گے قتل وہ دشمن کو میرے
مرا۔ یہ حق بھی مارا جا رہا ہے۔

اصلاح :۔ وہ آمادہ ہیں بہر قتل دشمن " " " " "

مصرع اولیٰ میں تعقید لفظی کا عیب تھا اور بندش بھی سست تھی۔ اصلاح کے بعد یہ صورت نہیں رہی اور شعر میں حسن پیدا ہو گیا

(۳) صدیق الزماں وفا۔

وفا ؎

بندھی ہے کوچۂ محبوب میں کیسی ہوا میری ۔۔۔ لپٹتی ہے کسی کی زلف سے آہ رسا میری

اصلاح " " " " ۔۔۔ کہ ہے دست و گریباں زلف سے آہ رسا میری

مصرع اولیٰ میں 'محبوب' کہنے کے بعد مصرع ثانی میں کسی کی کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ زلف سے آہ رسا کے لپٹنے کے مقابلے میں دست و گریبان ہونا زیادہ مناسب اور بہتر انداز بیان ہے۔

وفا :۔

میں ہوں، وہ ہیں، شب مہتاب ہے، تنہائی ہے
آج بگڑی ہوئی قسمت مری بن آئی ہے

اصلاح۔ آج قسمت جو لڑی ہے، مری بن آئی ہے

'آج قسمت جو لڑی ہے'، کی اصلاح کا جواب نہیں۔ قسمت کے لڑنے کے بعد بات کا بن جانا ظاہر ہے اور یہ حسن کلام کی بہترین صورت ہے جس کا لطف صرف اہل زبان کا حصہ ہے۔

وفا ؎

اک نگاہ ناز سے میری طرف بھی دیکھ لو ۔۔۔ ہے قرار زندگی کا کیا بھروسہ آجکل

اصلاح " " " " ۔۔۔ بندہ پرور زندگی کا کیا بھروسہ آجکل

"ہے قرار زندگی"، کی تعقید لفظی کے مقابلے بندہ پرور، کس قدر برمحل اور بلیغ انداز کلام ہے، جس میں قرار زندگی کی غیر واضح معنویت کے بجائے خود زندگی کے وجود اور عدم وجود کا سوال پیدا ہو گیا۔ ہے جس نے شعر کو شعریت اور زور کلام سے ہمکنار کر دیا ہے۔

وفا ؎

سکۂ بہار حسن کا دل پہ بٹھا گئی ۔۔۔ صورت تمہاری صورت یوسف دکھا گئی

اصلاح :۔ آنکھوں میں رنگ خواب زلیخا جما گئی ۔۔۔ " " " " "

"سکۂ بہار حسن کا"، کس قدر بھونڈا اور مصنوعی انداز بیان تھا، جس کی جگہ 'آنکھوں میں رنگ خواب زلیخا'، کے ٹکڑے نے شعر کو انتہائی رنگین اور پراثر بنا دیا اور پھر مصرعۂ ثانی میں زلیخا کے ساتھ یوسف کی

ہمایت کا کیا کہنا۔ اصلاح دینا اسے کہتے ہیں

(۴) داؤد علی خاں واقفؔ۔

واقفؔ ۔

دیدۂ بسمل سے اب اس کا تماشا دیکھنا رہ گیا ہے اور جو قاتل تری تلوار میں

اصلاح :۔

آب حیواں سے نہیں کم تشنہ کاموں کیلئے رہ گئی ہے آب جو قاتل تری تلوار میں

واقفؔ کے شعر کے معنی صاف نہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کو مناسب الفاظ میں ادا نہ کرسکے، جس کی وجہ سے شعر میں اور خصوصاً مصرعۂ ثانی میں انداز بیان اور خیال عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ جلیلؔ نے شاگرد کی ہمت افزائی کے لیے اسی قسم کا ایک شعر لکھ دیا۔

(۵) اسماعیل احمد تسنیمؔ مینائی :

تسنیمؔ :۔

وعدہ سچا، وصال ہے یہ وہ دن تجھ سے دوری میں جو گزارے ہیں

اصلاح

دن وہ ہیں حدِ زیست سے باہر " " " " "

ایک بے معنی شعر کو بامعنی اور حسین بنا دیا۔

(۶) عزیز احمد :۔

عزیزؔ :۔

چٹکتی شاخ میں، غنچوں کی مسکراہٹ میں بیک نظر تجھے دیوانہ وار دیکھا ہے

اصلاح " " " " بیک نظر تجھے اے گلعذار دیکھا ہے

چٹکتی شاخ اور غنچوں کی مسکراہٹ کے ساتھ گلعذار کا لفظ کس قدر مناسب، خوبصورت اور دلکش ہے۔ ایک لفظ نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

(۷) علی احمد۔

علیؔ :۔

سمجھا ہوا ہے لطف کو بھی پردۂ ستم آئے سکوں کہاں سے دل بدگماں کو یاں

اصلاح :۔

سمجھے ہوئے ہے لطف کو بھی پردۂ ستم " " " "

"سمجھا ہوا ہے" غلط زبان ہے۔

(۸) صدقؔ جائسی۔

صدقؔ :۔

عقبیٰ ہوئی بخیر تو جنت کی سیر ہے جنت میں درد عشق کی دولت مگر کہاں

اصلاح " " " " " جنت میں درد عشق کی لذت مگر کہاں

دولت کے مقابلے میں لذت کا لفظ زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔

(۹) صفدرؔ مرزا پوری۔

صفدرؔ :۔

جو میں نے چوم لیا منھ بہت ہی شرمائے خطا مری تھی تھیں مفت انفعال ہوا

اصلاح " " " " " انھیں " " "

شعر میں شتر گربہ کا عیب تھا۔ مصرع اولیٰ میں واحد غائب کا صیغہ اور مصرع ثانی میں واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ اصلاح نے عیب کو درست کر دیا۔

صفدرؔ :۔

ادھر ہم سے ذرا آنکھیں ملاؤ نگاہ ناز کیا قاتل نہیں ہے

اصلاح۔

ادھر دیکھو سوئے خنجر نہ دیکھو " " " "

مصرع اولیٰ کا اسلوب بیان بہت غیر فصیح تھا۔ جلیلؔ نے اسے بولتا ہوا مصرع بنا دیا۔

صفدرؔ :۔

آنکھوں سے دیکھ کر کوئی محفل میں رہ گیا کانٹا سا اک کھٹک کے مرے دل میں رہ گیا

اصلاح۔

وہ دیکھ کر کنکھیوں سے محفل میں رہ گیا " " " "

آنکھوں سے دیکھ کر کہنا نامناسب انداز بیان ہے۔ کنکھیوں سے دیکھنے کا لطف کا جواب نہیں۔ اصلاح نے غضب ڈھا دیا۔ استادانہ اصلاح اسی کو کہتے ہیں۔

صفدرؔ :۔

سمجھنے والے اس کو ماجرائے درد دل سمجھے نظر آئے جو قطرے خون کے کچھ نوک مژگاں پر

اصلاح :۔

سمجھنے والے روداد دل بسمل اسے سمجھے " " " "

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۔
۳۰ جولائی ۱۹۷۶ء کو ودھان بھون
میں سرکاری افسران اور ملازمین
۷۵-۱۹۷۴ء کے اسٹیٹ ایوارڈ تقسیم
کیے تصویر میں شری روی موہن سیٹھی
سابق ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ
عامہ اتر پردیش وزیر اعلا سے ایوارڈ
حاصل کر رہے ہیں

وزیر ریاست شری رمیندر ورما ۲۴ جولائی
کو اسٹیٹ بینک کے ذریعہ ترقی کے لیے
منتخب کیے گئے محلہ گولہ گنج (لکھنؤ) میں
نقد قرضے اور سلائی مشین وغیرہ
تقسیم کرتے ہوئے
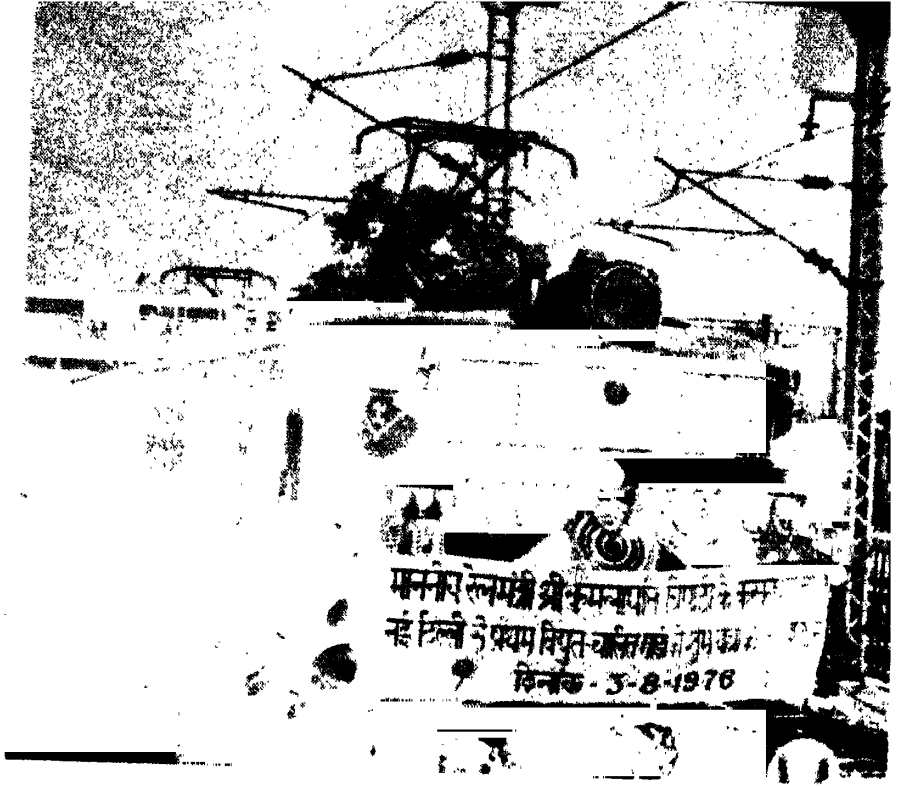
مرکزی وزیر ریلوے شری کملاپتی ترپاٹھی گذشتہ ۳ اگست کو نئی دہلی اسٹیشن پر ہوڑہ ریل راستے پر بجلی سے چلنے والی پہلی ٹرین کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیر زراعت شری ویریندر
ورما اسپورٹس کالج کے
میدان میں ۲۲ جولائی
کو کدمب کا پودا لگاتے
ہوئے

ڈاکٹر ایم چنا ریڈی گورنر اتر پردیش ۱۴ر جولائی ۱۹۷۶ء کو چار باغ (لکھنؤ) میں بال چکستالیہ (بچوں کا اسپتال) کا افتتاح کرتے ہوے۔
بائیں جانب اسپتال کی ایک تصویر

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۲۵ر جولائی ۱۹۷۵ء کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی کونسل کے پانچویں سالانہ اجلاس کو
اکاڈمی کے کمیٹی ہال میں خطاب کرتے ہوے

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۸ ار جولائی کو ٹنک پور (نینی تال) میں آئی. ٹی. آئی کا افتتاح کر رہے ہیں

چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی بینک آف بڑودہ لکھنؤ کی خواتین شاخ واقع نرہی پارک روڈ کا افتتاح کرتے ہوئے

دوسرے مصرعے کی مناسبت سے روداد دل بسمل کی اصلاح کس قدر موزوں ہے۔ ماجرائے درد دل میں اظہار کیفیت دل بسمل کی بات کہاں؟"

صفدرؔ۔

بارہا لوٹ گئی آ کے اجل بالیں سے — رحم آیا نہ اسے بھی ترے بیمار و پر

اصلاح:۔

بارہا پھر گئی آ آ کے اجل بالیں سے " " " " "

صفدرؔ۔

ادا سمجھ کے وہ دامن سے منہ چھپاتے ہیں — حجاب ہے جو یہی تو حجاب کیا ہوگا

اصلاح:۔

ادا سمجھ کے وہ آنچل سے منہ چھپاتے ہیں " " " " "

دامن میں منہ چھپانے کا محل نہیں۔ آنچل میں منہ چھپانا خاص ادا ہے۔ ایک لفظ کی اصلاح نے شعر میں جان ڈال دی۔

(۱۰) عبدالغفور شہرؔ استھانوی بہاری۔

شہرؔ۔

آتش الفت میں جل بھن کر بجھے دونوں بلا — شمع روتی ہی رہی پروانہ جلتا ہی رہا

اصلاح:۔

آتش الفت نے دونوں کو نہ دم لینے دیا " " " "

شعر کے پہلے مصرع کی بندش سست تھی اور الفاظ بھی اچھے نہ تھے، جس کی وجہ سے جلیلؔ نے مصرع بدل دیا۔

شہرؔ۔

غم میں رہنے دو مبتلا کر کے — درد بڑھ جائے گا دوا کر کے

اصلاح " " " " کیا بناؤ گے تم دوا کر کے

دوسرا مصرع بے جان سا تھا۔ اصلاح نے شعر میں تغزل کی روح پھونک دی۔ کیا بناؤ گے، میں بڑی معنویت ہے۔

شہرؔ۔

ذرا غمزہ سے اپنے پوچھ لینا — ادا تیری اگر قاتل نہیں ہے

اصلاح

کیا ہے خون کس نے حسرتوں کا " " " " "

پہلے مصرع کا انداز اور لہجہ نامناسب تھا۔ جلیلؔ نے ایک معنی خیز مصرع لگا دیا۔

شہرؔ۔

چھپے گا ہم سے کیا محشر میں قاتل — شہادت دیں گی یہ چھینٹیں لہو کی

اصلاح۔

کہاں جائے گا بچ کر ہم سے قاتل " " " "

اصلاح کے بعد شعر میں زور اور کیفیت کا اضافہ ہو گیا۔

شہرؔ۔

میں کیا کہوں کہ کیا نگہ شوخ یار ہے — کوئی شہید ناز کوئی دل فگار ہے

اصلاح " " " " " کوئی جگر فگار کوئی دل فگار ہے

"نگہ شوخ یار" کو شہید ناز سے کوئی ظاہری علاقہ نہیں۔ اصلاح نے یہ نقص دور کر دیا۔

(۱۱) محمد عبدالعلی شوقؔ سندیلوی۔

شوقؔ۔

صورت حال یہ آئینہ راز دل ہے — رنگ چہرے کا سر بزم ہوا ہو جانا

اصلاح۔

جلوہ افروزی جاناں کی خبر دیتا ہے — شمع کا رنگ سر بزم ہوا ہو جانا

شوقؔ کے شعر کے معنی گنجلک تھے۔ جلیلؔ نے اسی قافیہ میں دوسرا شعر کہہ دیا۔

شوقؔ۔

اس شے پہ ناز کیا جو نہ ہو اختیار کی — بنیاد دیکھ ہستی بے اعتبار کی

اصلاح " " " " " " " ناپائیدار کی

بنیاد کے ساتھ ناپائیدار کا لفظ ہی صحیح معنی دے سکتا ہے۔

(۱۲) سید شاہ یحییٰ عالم سردارؔ۔

سردارؔ۔

کھائی ہے جب سے اس نگہ فتنہ گر کی چوٹ — یہ عمر بھر کا داغ ہے یہ عمر بھر کی چوٹ

اصلاح۔ " دل پہ " " " " " "

جب سے، کہنے کا کوئی محل نہیں تھا کیونکہ دوسرے مصرع میں وقت کی کوئی رعایت نہیں! دل پہ، کی اصلاح نے شعر کے معنوی

نقص کو دور کر دیا۔

سردارؔ۔

وہ پھر مری طرح سے ہوں پائمالِ آزار   کھاتے پھریں گے یونہی وہ اب دربدر کی چوٹ

اصلاح۔ " " " "   کھاتے پھریں ہمیشہ یونہی دربدر کی چوٹ

اصلاح نے دوسرے مصرعے کے 'وہ اب' کے حشو کو ختم کر دیا، لیکن پہلے مصرع میں 'پھر' کا مرتبہ اب بھی محل نظر ہے میرے خیال میں اس کی جگہ 'بھی' کا لفظ زیادہ مناسب ہوگا!

سردارؔ۔

اے چارہ گر دکھاؤں یہ کیونکر میں زخم دل
کچھ دیکھنے کی چیز نہیں ہے جگر کی چوٹ

اصلاح۔

کیونکر دکھاؤں زخم نہاں چارہ گر تجھے
کچھ دیکھنے کی " " " "

سردارؔ کے شعر میں جگر کی چوٹ اور زخم دل کا تعلق برائے نام ہے۔ نیز الفاظ کی بندش بھی چست نہ تھی۔

(۱۳) نرسنگ راج عالیؔ۔

عالیؔ۔ واعظا خاموش رہ کیا فائدہ   دل نہ سمجھے تو کسے سمجھائیں گے

اصلاح۔

آپ واعظ چپ رہیں کیا فائدہ   " " " " "

عالیؔ کے پہلے مصرع کا اندازِ تخاطب کچھ بہتر نہ تھا۔

(۱۴) محمد یوسف نفیسؔ بنگلوری۔

نفیسؔ۔

ہیں بیقرار قلب و جگر اے خدنگ ناز   دونوں کو ایک نظر میں ٹھکانے لگا جائے

اصلاح: " " " " ادا " "

نازؔ کا تعلق ادا سے ہے، نظر سے نہیں۔ ادا کی اصلاح کس قدر مناسب ہے۔

نفیسؔ۔

ٹکڑے دل و جگر کے بچھا کوئے یار میں   اے چشم تر وفا کے خزانے لٹائے جا

اصلاح۔ " " اس کی راہ میں   " " " " " "

اصلاح نے شعر کے روایتی رنگ کو کم کر دیا ہے۔

(۱۵) وجیہہ الدین حشرؔ سہسرامی

حشرؔ:۔

مے کش سے تو نے پھیر لیں آنکھیں بُرا کیا   اے محتسب یہ شیوۂ اہل نظر نہیں

اصلاح۔ " " " " " "   پیرِ مغاں " " " "

محتسب سے شکایت غلط تھی۔ پیرِ مغاں ہی سے ایسی شکایت مناسب ہے۔

(۱۶) زین العابدین عابدؔ۔

عابدؔ۔

ناصحا کیوں نہ میں اس بت پہ فدا ہو جاؤں
لطف جینے میں نہ زیادہ ہے کہ مر جانے میں

اصلاح۔

مانع عشق جو ناصح ہے خبر کیا اس کو
لطف جینے میں " " " " "

مندرجۂ بالا اصلاحیں جلیلؔ کی چند اصلاحیں ہیں جن سے ان کی استادانہ شخصیت کا کافی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اصلاح سخن کا کام وسعت نظر، فنی مہارت اور بڑی قادر الکلامی کا طالب ہے۔ یہ صفات جلیلؔ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ محمد ابراہیم عارجؔ اپنے مضمون (داب فصاحت جنگ جلیلؔ مرحوم) میں لکھتے ہیں:۔

"اصلاح سخن پر آپ کو عجیب قدرت حاصل تھی۔ صرفی عروضی یا معنوی غلطی تو کیا، خلاف فصاحت لفظ بھی فوراً کھٹک جاتا تھا۔ اصلاح میں شاگرد کے مضامین اور خیالات کو امکان بھر قائم رکھنے کی کوشش فرماتے ... آپ کی قابلیت اور سخن دری ایسی مسلم ہے کہ دوسرے گروہوں کے قابل اساتذہ بھی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔"[1]

اس سلسلے میں جلیلؔ کی ایسی اصلاحیں جن میں انھوں نے خود اصلاح کی ضرورت واضح کر دی ہے، خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہے۔ مثلاً

---

[1] ہندستانی ادب جلیلؔ نمبر صفحہ ۱۱۱

محمد ابراہیم خاں بدر (رامپور) کو ان کے مندرجہ ذیل اشعار کی اصلاح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں [1]۔

نیچی نظروں کا جو مقصود ہے وہ ظاہر ہے
یعنی کچھ سامنے کچھ آڑ لیے بیٹھے ہیں

"اس میں یعنی کی یا بنیک تقطیع سے گرتی ہے بشعرا حتی الامکان فارسی عربی الفاظ کی یا نہیں گراتے لیکن اتفاقی طور سے اگر گر جائے تو اس کو غلط نہیں سمجھتے، کیونکہ اساتذہ کے کلام میں اس کی نظیریں ملتی ہیں کہ مفرد الفاظ کی یا گرا دی گئی"

بے پئے حضرت زاہد کی بری حالت ہے
یہ ہمیں ہیں کہ جو خاموش پئے بیٹھے ہیں

"اس میں ایک حرف زائد ہے یا تو 'کہ' رکھا جائے یا 'جو' رکھیں۔ لیکن اس کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا البتہ بدنما ضرور ہے"

ہم سے پوچھو کہ محبت کے نتیجے کیا ہیں
داغ پر داغ کلیجے میں لیے بیٹھے ہیں

"داغ پر داغ اٹھانا کہنا زبان ہے۔ لیے بیٹھے کے ساتھ بول چال نہیں ہے۔"

ہو چکے سیکڑوں مجروح مگر جی نہ بھرا
تیر اسی طرح سے چٹکی میں لیے بیٹھے ہیں

"اسی طرح سے 'میں'، 'سے' زائد ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ بغیر 'سے' کہا جائے لیکن غلط نہیں ہے۔ کیونکہ اچھے اچھے شعراء کے کلام میں موجود ہے۔ 'سے' کے بجائے 'وہ' کہا جائے تو ہر پہلو سے بہتر ہے۔"

مندرجۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ جلیلؔ اپنے شاگردوں کی بڑی ہمت افزائی فرماتے تھے اور اصلاح کے ساتھ ساتھ زبان و بیان نیز فن کے نکات برابر ذہن نشین کراتے رہتے تھے تاکہ شاگرد کی علمی استعداد میں اضافہ ہو اور اسے اصلاح سے پورا پورا فائدہ پہنچے۔ ان کے ایسے عدیم الفرصت استاد کے لیے جس کے ذمہ ہزاروں کام اور شاگردوں کی بہت بڑی تعداد ہو، اتنی بڑی توجہ دینا بہت بڑی بات ہے۔

اسی طرح غلام حسن کسرنی منہاس [2] کو ایک خط میں اصلاح میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہم تو آئینہ نمط منھ پہ بتا دیتے ہیں
عیب ہے کس میں یہاں کون ہنر رکھتے ہیں

"دوسرا مصرع اسی طرح درست ہے۔ میری رائے میں مصرع اوّل کو اس طرح بدل دیجیے تو بہتر ہوگا۔

"صورت آئینہ ہم منھ پہ بتا دیتے ہیں"

آئینہ نمط کے مقابلہ میں صورت آئینہ کس قدر برمحل اور عمدہ اصلاح ہے۔"

★

---

[1] ماہنامہ نقوش، لاہور کا خطوط نمبر صفحہ ۳۶۸۔ [2] صفحہ ۳۷۷۔

واحد پریمی

باعثِ فخرِ وطن ہیں اندرا

ہر نفس یوں ضو فگن ہیں اندرا
جیسے شمعِ انجمن ہیں اندرا

واقفِ ہر منزلِ راہِ حیات
قائدِ قوم و وطن ہیں اندرا

قاتلِ ظلماتِ تخریب و فساد
امن کی روشن کرن ہیں اندرا

اک نئی تہذیب کی معمارِ نو
دشمنِ طرزِ کہن ہیں اندرا

خیر خواہِ کاروبارِ خاص و عام
قدر دانِ علم و فن ہیں اندرا

عزم و سعی و جہد کی تصویرِ خاص
دورِ نو کی کوہکن ہیں اندرا

جذبہ و جوشش و طلب کا ذکر کیا
سر سے پا تک اک لگن ہیں اندرا

دل کشی جنت نشاں کشمیر کی
عظمتِ گنگ و جمن ہیں اندرا

سربلندی ہیں قطب مینار کی
تاج کا بھی بانکپن ہیں اندرا

برگ و گل کو اب خزاں کا خوف کیوں
جب نگہبانِ چمن ہیں اندرا

کیوں نہ ہم اہلِ چمن کو ناز ہو
باعثِ فخرِ وطن ہیں اندرا

کیوں نہ ہو واحد ثنا خواں آج کل
ایک موضوعِ سخن ہیں اندرا

پیکر جعفری اترولوی

ترانۂ بیداری

ہوئی ہے کس لیے تخلیق اس کو کچھ جانو
خدارا اپنی حقیقت کو آج پہچانو
جو ہو سکے تو ہماری یہ بات تم مانو
شعور یہ تو نہیں زیست کے نگہبانو
جو زندگی کے طریقے ہیں وہ بتا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

ملی ہے زندگی کچھ کام اس میں کر جاؤ
تم اٹھ کے صفحۂ ہستی کے نقش بھر جاؤ
نہ اپنی زیست کو یوں شرمسار کر جاؤ
مثال اپنی بنو تم جدھر جدھر جاؤ
قدم قدم پہ متاعِ وفا لٹا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

گلوں کے تذکرۂ شوق کو بس اب چھوڑو
بدل چکا ہے زمانہ بہت اٹھو دیکھو
اب اتنا وقت نہیں ہے کہ راستے میں رکو
تم اپنے ہاتھ میں رفتارِ وقت کی لے لو
ہر ایک شے کے مقدر کو جگمگا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

ابھی تو اور بھی باقی ہیں امتحانِ وفا
ابھی تو اور بڑھانا ہے عز و شانِ وفا
دکھانا ہے تمھیں دنیا کو اپنی آنِ وفا
بلند رکھنا ہے ہر حال میں نشانِ وفا
ہر انقلاب سے اپنی نظر ملا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

حاجی محمد عثمانی

مولانا شاہد فاخری

مولانا شاہد فاخری جنگِ آزادی کے ایک جانباز مجاہد اور ایک شعلہ بیان مقرّر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ملک و ملّت کا یہ مخلص خادم گزشتہ سال ۹ ستمبر کو اس دار فانی سے ہمیشہ کے لیے کُوچ کر گیا۔

مولانا الہ آباد کے مشہور و معروف دائرہ شاہ اجمل کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ یہ دائرہ صدیوں سے علم کا مرکز اور شرافت کا منبع رہا ہے۔ مولانا کے والدِ ماجد حضرت مولانا سید محمد فاخر علمائے ہند کی صف اول میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ جنھوں نے تحریکِ خلافت میں سرگرم حصّہ لیا اور ۱۹۱۹ء میں سب سے پہلے جیل بھیجے گئے۔ گرفتاری کے وقت مولانا نے شعر فرمایا تھا ؎

بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں
باپ دادا کا طریقہ سنّتِ سجادؑ ہے

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے مولانا کی گرفتاری کی خبر سن کر ارشاد فرمایا تھا

مولوی جیل میں بیٹے کو جو موج اٹھتا ہے
گنبدِ چرخ مری آہ سے گونج اٹھتا ہے

مولانا شاہد فاخری نے علم و عمل کی فضا میں آنکھ کھولی اور ابھی صرف انیس سال کے تھے کہ ۱۹۲۱ء میں تحریکِ خلافت و کانگریس کے سلسلہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ قید و بند کا یہ سلسلہ ایک عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ وہ دور غیروں کی حکومت کا تھا اور اس زمانے میں حق کے لیے زبان کھولنا جیل میں بند ہونے کا مترادف تھا لیکن مولانا نے حق گوئی راست بازی اور دیانت کو مصلحت پر کبھی قربان نہ ہونے دیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد قومی حکومت نے مولانا کی خدمات کے اعتراف میں دنیوی اعزاز میں کوتاہی نہیں کی لیکن نئے بدلے ہوئے حالات میں بھی مولانا کی جسارت و جرأت کی قدیم خصوصیت ہر حال میں قائم رہی۔ مجلسوں میں، محفلوں میں، جلسوں میں، کاؤنسل میں اور اسمبلی میں ہر جگہ اور ہر مقام پر مولانا اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے حقوق کی علمبرداری کرتے رہے اور ان کی شکایتیں حکومت کے سامنے پیش کرتے رہے زندگی کے کسی حصّے میں مولانا اس فرض سے غافل نہیں ہوئے۔

جسارت و جرأت ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ گرفتاری کے ایّام میں نینی جیل میں عجیب واقعہ پیش آیا جس کی توقع ایک بیس سالہ نوجوان سے نہیں کی جا سکتی۔ مولانا جیل میں جماعت سے نماز پڑھاتے تھے۔ مسلمان قیدی مقتدی ہوتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے حکم بھیجا کہ جماعت سے نماز نہ پڑھی جائے۔ مولانا نے حقارت سے اس حکم کو ٹھکرا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے سختی کرنے کا حکم دیا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھی گئی تو نمازیوں کو گولی مار دی جائے۔ اس حکم کے باوجود مولانا نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور صفیں درست ہونے لگیں یہ دیکھ کر تمام ہندو قیدی جو تحریک کے سلسلے میں جیل گئے تھے جماعت میں شریک ہونے کے لیے دوڑ پڑے۔ مولانا اور مقتدیوں کی اس جرأتِ بیباک کو دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور جماعت سے نماز بدستور ہونے لگی۔

سراپا اخلاق و وفا، مجسّم مہر و محبت، دوستوں کے دوست، مخالفین کو معاف کر دینے والے، صاف دل، صاف گو، گفتار میں آتش بیانی، الفاظ

میں روانی، ان کی تقریر سحر آفرین۔ یہ تھے مولانا شاہد فاخری جنھوں نے
نڈر اور بیباک بن کر ہمیشہ اپنی رائے کا اظہار کیا لیکن راہ حق سے کبھی منھ
نہ موڑا۔

مولانا کی ساری زندگی ملک و ملت کی محبت میں گزری ــــ وہ
بیک وقت محبِ وطن، قوم پرور، عالم، صوفی، واعظ، مذہبی پیشوا اور
قومی لیڈر رہے۔ وہ عاشقِ رسولؐ تھے محفلِ میلاد کے دیوانے اور قبرستانوں
اور مساجد کے تحفظ و حرمت میں تن من دھن لگا دینے والے بیباک مجاہد
بھی۔ مجمع کو مسحور کر لینے والی شیوا بیانی ایسی رکھتے تھے جس کے لیے اب
کان ترستے رہیں گے۔ حق کی اس آواز کی حکمرانی قوم و ملت کے دل و دماغ
سے کبھی نہ نکل سکے گی۔ حق تلفی تو اس مردِ خدا نے کبھی برداشت کی ہی
نہیں خواہ وہ کسی کی بھی حق تلفی ہو۔ مخالفین کی حمایت اولیاء اللہ کا شیوہ
رہا ہے۔ اس کا مظاہرہ اس عالی حوصلہ بزرگ اور اس ایثار و کرم کے
مجسمہ نے اس طرح کیا کہ اپنے اقتدار کے زمانے میں انتقام کا خیال بھی
دل میں نہ لایا۔ یہ صفت عام سطح سے بہت بلند انسانوں میں پائی جاتی
ہے اور بس۔

وہ مجاہدِ آزادی تھے اور آج جو آزادی نصیب ہے وہ ان کے
جیسے مجاہد ساتھیوں کی کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ آج کے
نوجوان ان شدائد کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ہمہ وقت ان کی نظر کے
سامنے تھے۔ لیکن ان کا مقصود ان زحمتوں کو کب نگاہ میں لانے والا تھا
وہ عزم کے پیکر تھے، ان کا ایمان مستحکم تھا، ان کو یقین تھا کہ زندگی جد و جہد
کا نام ہے اور یہ ممکن نہیں کہ کام کیا جائے اور اس کا انجام نہ نکلے۔

مولانا کو ہر صنف میں سرفرازی حاصل تھی۔ اعزا میں سربلند، شہر
میں محترم، ملک میں مقتدر، جمعیۃ العلماء ہند کے مستقل نائب، صدر،
کونسل کے ممبر، اسمبلی کے رکن، پارلیمنٹری سکریٹری، حج کمیٹی کے ذمہ دار
آفیسر اور ڈائرکٹر مغل لائن، وقف بورڈ کے صدر بھی۔

غرضیکہ جس زمیں پہ رہے آسماں رہے

وہ صوفی بھی تھے، سجادہ نشین بھی لیکن خشکی و بدمزاجی کا ان میں شائبہ بھی
نہ تھا۔ وہ دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے اور سیاست و سیادت
کے ساتھ ساتھ سخن سنج و سخن طراز بھی تھے۔ شاعری خاندانی ملکیت تھی

کیسے ممکن تھا کہ مولانا فاخر بیخود کا نور نظر شاعری میں نام روشن نہ کرتا۔
یہ ضرور ہے کہ سیاست کی مشغولیات اور فرائض نے مولانا کی شاعری کو جلوہ
گری کا موقع نہ دیا اور جو غزلیں اور نظمیں مولانا نے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائیں
وہ محفوظ نہ رہ سکیں۔

تحریکِ خلافت کے آغاز میں دائرہ شاہ اجملؒ سیاست کا مرکز تھا
بعض دیکھنے والے زندہ ہیں جنھوں نے دائرہ کے میدان میں مہاتما گاندھی
کو دیکھا، موتی لال نہرو کا لیکچر سنا۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کی زیارت
کی اور مولانا آزاد کی وجد آفریں تقریر سنی۔ جواہر لال نہرو تو ہمہ وقت آتے
جاتے رہتے تھے۔ غرضیکہ آج جن لیڈروں کے نام وردِ زبان ہیں سب
نے بقولِ ناسخ "ہر کبھی کے دائرہ میں قدم رکھا" اور اسی راستے سے
آگے بڑھے۔

مولانا کے تعلقات کی وسعت کا اندازہ صرف وہی کر سکے گا جس
نے ان کا وسیع دسترخوان دیکھا ہے۔ مقررہ اوقات میں مہمانوں کی آمد
کے سلسلے میں اہتمام اور انتظام تو سمجھ میں آنے والی شے ہے۔ یہاں ذکر
ہے ان اوقات کا جب غیر متوقع طور پر متعدد مقتدر حضرات تشریف لے
آتے تھے اور دسترخوان پر کوئی شے کم نہ ہوتی

زندگی تنگ و تاریک راہ سے بھی گزرتی ہے اور خوش خرمی کے انبار
بھی بکھیرتی ہے ایسے میں صاحبانِ عزم اور خدا کی مشیت پر یقین رکھنے والے
نہ راہ کی تاریکی سے گھبراتے ہیں اور نہ آسانیوں اور آسائشوں پر نازاں
ہوتے ہیں اس صفت کو کلام مجید نے انسانی بلندی کا درجۂ اعلیٰ قرار دیا ہے
اور یقین کیجیے مولانا نے زندگی کے نشیب و فراز میں صبر و سکون اور عزم و
ثبات کا وہ نمونہ چھوڑا ہے جس کی مثال آسانی سے نظر نہیں آتی۔

مولانا نے خاندانی روایات اور دینی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے
اپنے بچوں کو دنیاوی منفعت اور مفاد کے لیے غلط راستے پر چلنے کی کبھی
اجازت نہیں دی۔ وہ قناعت پسند اور بے نیاز بزرگ تھے۔

ملک کا خادم قوم کا سرپرست اقلیتوں کے مفاد کا علمبردار
اور اعزا و اقربا کا مددگار نہ رہا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سراج مرزاپوری

شاہد فاخری

کیوں نہ ہوتے پرتوِ انوار شاہد فاخری
بادۂ عرفاں سے تھے سرشار شاہد فاخری

جگمگاے عظمت انسانیت کے چرخ پر
آفتابِ عظمت کردار شاہد فاخری

محوِ حیرت ہو کے آخر دی سلامی وقت نے
بن گئے جب وقت کی رفتار شاہد فاخری

لے کے پہنچے انقلابِ وقت کی دہلیز پر
حلقۂ زنجیر کی جھنکار شاہد فاخری

پرچمِ تحریکِ آزادی لیے دیکھے گئے
ہر قدم پر برسرِ پیکار شاہد فاخری

ملک و ملت کی طرف جب بھی کوئی طوفاں بڑھا
بن گئے فولاد کی دیوار شاہد فاخری

عظمتِ خاکِ وطن کی آبرو بن کر رہے
بر بنائے جذبۂ ایثار شاہد فاخری

زندگی میں رہ کے سرگرمِ سفر، طے کر گئے
زندگی کی منزلِ دشوار شاہد فاخری

آیئے ہم بھی اسی پر گامزن ہو لیں سراج
کر گئے جو راستہ ہموار شاہد فاخری

نثار الماس

اے صبحِ وطن

اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن
گنجینۂ علم و جوہرِ فن
نانک کی صدا اٹھی ہے یہاں، ٹیگور کے نغمے گونجے ہیں
بھارت کی مقدس دھرتی پر، آکاش کے تارے اترے ہیں
پھیلی ہے یہاں سے جب خوشبو، آفاق کے آنچل مہکے ہیں
فردوس یہاں کے کوہ و دمن
اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن
اس گلشنِ علم و حکمت پر انوار کی بارش ہوتی ہے
ہر ذرہ یہاں کا ہیرا ہے، ہر قطرہ یہاں کا موتی ہے
تو آنکھوں کا ہے اجیالا، تو سارے دلوں کی جوتی ہے
تو تاج و اجنتا گنگ و جمن
اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن
یہ تیری عظمت کہتی ہے چاہو تو گلے کا ہار ہوں میں
اٹھو تو دہکتا لاوا ہوں، نفرت کے لیے تلوار ہوں میں
محکوم نہیں آزاد ہوں میں، مجبور نہیں مختار ہوں میں
تو چاند ستاروں کا مسکن
اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن
کہتی ہے ہمالہ کی چوٹی ہر دور میں سرافراز ہوں میں
دعویٰ ہے یہ، وادی وادی کا غمخوار ہوں میں دمساز ہوں میں
خود ناز قدم چھو لے جس کا اک ایسا سراپا ناز ہوں میں
جلوہ ہے مرا گلشن گلشن!
اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن
کشمیر سے راس کماری تک، چھائی ہے عجب ہی رعنائی
لیتی ہے بہارِ لالہ و گل ہر ایک قدم پر انگڑائی
اور اس کی ہر اک رعنائی پر المآس ہے دل سے شیدائی
ہیں تجھ پہ تصدق تن من دھن
اے صبحِ وطن، اے صبحِ وطن

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کی عمارت

سید نظر برنی

دہلی کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

ایک مطالعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مرکزی لائبریری ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کا یہ نام یوں تو زیادہ قدیم نہیں لیکن اس کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا جامعہ ملیہ اسلامیہ کا۔ شہر دہلی سے ۱۵ کیلومیٹر دور واقع جامعہ نگر کی تعلیمی بستی کے بالکل وسط اور سابق صدر جمہوریہ ہند و امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی آخری آرام گاہ سے متصل ایک خوب صورت عمارت کی یہ لائبریری نہ صرف اپنے خارجی حسن سے دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے بلکہ یہ اپنے بے شمار نوادرات، مخطوطات اور مشرقی علوم و ادبیات کی بیش بہا کتابوں کی وجہ سے بھی پرستارانِ علم و ادب کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں رکھی گئی تھی جب تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات پورے شباب پر تھیں۔ ابتدا میں یہ خود نمائندہ تعلیمی ادارہ علی گڑھ کے چند

تھیوں تک محدود رہا لیکن دہلی پہنچ کر اس کی نشو ونما میں یک لخت تیزی آ گئی۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد، اور ڈاکٹر ذاکر حسین ان قومی شخصیات میں تھے جنھوں نے جامعہ کی بقا اور استحکام کے لیے جی جان کی بازی لگا دی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں حکیم اجمل خان کی ایما پر جامعہ کا قافلہ دہلی کے قرول باغ میں آ کر ٹھہر گیا اور وہاں تقسیم ملک کے وقت تک مقیم رہا۔ یوں تو سنہ ۱۹۳۶ء سے ہی رفتہ رفتہ جامعہ کے بعض ادارے اور شعبے جامعہ کی موجودہ جگہ (اوکھلا) منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے جامعہ والوں کو قرول باغ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کتب خانہ جامعہ اسی زمانے میں اوکھلے منتقل ہوا تھا جس کی نئی ترتیب و تنظیم میں کارکنان کے کئی سال صرف ہوئے۔

علی گڑھ کی جامعہ بے سروسامانی سے دوچار تھی۔ اس لیے اس کا کتابی سرمایہ بہت تھوڑا تھا۔ جامعہ کے پاس اس وقت مالی وسائل کا بھی فقدان تھا۔ اس لیے عطیات میں موصول ہونے والی کتابوں پر ہی قناعت کی گئی۔ بانی جامعہ مولانا محمد علی نے اپنا پورا کتب خانہ، جامعہ ملیہ کے سپرد کر دیا۔ یہ امر باعث تعجب ہو سکتا ہے کہ اس درس گاہ کا کتابی سرمایہ اس وقت ایک چھوٹی سی الماری تک محدود تھا۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا نے جس جوش و خروش کے ساتھ اس مادر درس گاہ کی بنیادیں استوار کرنے میں حصہ لیا، اسی جذبے سے کتب خانہ کی نشو و ترقی میں جٹ گئے۔ وہ اس ادارہ کے لیے فنڈ جمع کرتے تو ساتھ ہی کتابوں کے عطیات اپنے ہمراہ لے آتے۔ مربیان جامعہ کی اپیل پر جو بڑے بڑے ذخیرے ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء تک دستیاب ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) عطیہ مفتی انوار الحق
(۲) عطیہ مولانا سیف اللہ
کھٹی رئیس گجرانوالہ
(۳) عطیہ مولانا
محمد علی
(۴) عطیہ عبدالمجید خواجہ

ظاہر ہے کہ کتابوں کا یہ سرمایہ نہایت قلیل تھا اور اس سے جامعہ کی ضرورتیں قطعاً پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ فوری ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سی کتابیں قیمتاً بھی خریدی گئیں اور اس سلسلے میں فروری سنہ ۱۹۲۳ء تک تقریباً آٹھ ہزار روپے کا صرفہ ہوا۔ عطیات اور خریداری دونوں کا سلسلہ بیک وقت جاری رہا۔ بعد کے عطیات میں عطیہ صاحبزادہ ساجد علی (علی گڑھ) عطیہ عبدالقیوم نقوی (سہسوان)، عطیہ بیگم ڈاکٹر انصاری اور عطیہ حضرت میر خاں (فرخ آباد) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سید جالب دہلوی ایڈیٹر ھمدم کا کتب خانہ بھی مرحوم کے صاحبزادے سید عشرت حسین نے جامعہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ذخیرہ ہائے متذکرہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین، جسٹس ہدایت اللہ، سید سجاد ظہیر، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے گرانقدر عطیات کتب شامل ہیں۔ یہاں گوشۂ جگر کا ذکر بھی ضروری اور برمحل معلوم ہوتا ہے جو ایک خوب صورت شوکیس میں مخصوص ہے اور جس کے مشتملات میں رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی کی بیاضیں مطبوعہ دواوین، ذاتی ڈائریاں، خطوط، ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ جیبی گھڑی اور عینک قابل ذکر ہیں۔

عمارت

جامعہ اسلامیہ کی مرکزی لائبریری، نئی عمارت میں آنے سے قبل سنہ ۱۹۷۲ء تک تعلیم و ترقی کی عمارت میں مقیم تھی۔ یہاں اس کے پاس صرف ایک ہال اور تین کمرے ہی تھے جو یقیناً ناکافی تھے۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں جب جامعہ ملیہ کو یونی ورسٹی کا درجہ حاصل ہوا، اس وقت سے ارباب حل و عقد مسلسل کوشاں رہے کہ کتب خانہ کو اپنی عمارت مل جائے۔ چناں چہ یو جی سی نے مرکزی لائبریری کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے منظور کر دیے۔ یہ عمارت سنہ ۱۹۷۲ء میں پانچ لاکھ چھبیس ہزار روپے کی لاگت سے تیار ہو گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کا کل رقبہ ۲۶-۷ مربع گز ہے اور کور ڈائمنشن ۱۶۳۲×۵ مربع فٹ ہے۔ اس میں ۔ ار دیسرچ کیوبکلز، دو ریڈنگ روم ایک

ٹیکنکل سیکشن، ایک ریفرنس سیکشن، ایک مخطوطات سیکشن چارٹ اسٹیک روم اور ایک اشو سیکشن قائم ہیں۔ عمارت کتب خانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہے۔

خدماتِ قارئین

کسی کتب خانہ کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں کہ اس کی عمارت فلک شگاف یا تاج محل کی طرح خوب صورت ہو یا اس کی کتابوں کے ذخیرے بے پایاں ہوں بلکہ ایک مثالی کتب خانہ وہ ہے جہاں کتابوں کا استعمال کثرت سے ہو اور طریقۂ استعمال زیادہ تکنیکی اور دشوار نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لائبریری میں موجود کتابوں اور رسائل تک قارئین کی دسترس آسانی سے ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں قارئین کی مطلوبہ کتابوں کے اجرا میں ریزرویشن سلپ کا طریقہ مزید سہولت کا باعث ہے۔ ریفرنس سروس کتب خانہ کی ایک اہم خدمت کا درجہ رکھتی ہے۔ جامعہ میں بھی اس کا التزام بڑے سائنٹفک اور جدید ڈھنگ سے رکھا گیا ہے۔ اساتذہ اور کارکنان کے لیے اسٹیک میں داخلہ کھلا ہوا ہے لیکن طلبا کے لیے پابندی ہے اور انھیں اپنی کتاب کے لیے کیٹلاگ کی مدد سے کال نمبر کی پرچی دینا ہوتی ہے۔

کیٹلاگ سازی اور کلاسی فکیشن

دہلی یونی ورسٹی اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی کیٹ لاگ سازی اور کلاسی فکیشن کے رائج الوقت اور جدید طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیٹلاگ سازی میں کلاسی فائڈ کیٹلاگ کوڈ اور کلاسی فکیشن میں کلاس نمبر کے لیے ڈی وی ڈیسی مل کلاسی فکیشن اسکیم کو اور بک نمبر کے لیے رنگا ناتھن کے اصولوں کو برتا جاتا ہے۔

اخبارات و رسائل

اس شعبہ میں خریدے ہوئے رسائل و جرائد کے علاوہ اعزازی طور پر آنے والے رسائل کی بھی خاصی تعداد ہے۔ اردو اور انگریزی کے ادبی رسائل کے علاوہ سائنس، انجینیرنگ، تاریخ، سیاست، معاشیات، جغرافیہ اور تعلیم کے موضوعات پر نمایندہ رسائل کے فائل موجود ہیں۔

اردو کے قدیم رسائل میں ہمدرد، کامریڈ، ہمدم، مخزن، دل گداز، زمیندار، زمانہ، اودھ پنچ اور یادوطن اس لائبریری کا قابل فخر سرمایہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اردو اخبارات کے سلسلے میں لائبریرین کی کوشش ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے اچھے اردو اخبارات کی فائلیں لائبریری میں موجود ہوں۔ اس منصوبے کے پیش نظر سنہ ۱۹۷۲ء سے اردو کے معیاری اور اہم اخبارات کی جلدوں کو محفوظ رکھنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔

مخطوطات اور ذاتی کاغذات

کتب خانہ میں مطبوعہ کتب و رسائل کی تعداد ایک لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے لیکن اس کا عظیم سرمایہ بہر حال عربی فارسی اور اردو کے مخطوطات ہیں جن کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ مخطوطات کی فہرست سازی کے لیے ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ہر تین زبانوں کی مفصل فہرست مخطوطات "فہرست قسطِ اول" کے عنوان سے دستیاب ہے۔ ان میں ۳۹۵ فارسی کے، ۲۳۸ عربی کے اور ۳۷ اردو کے مخطوطات کی فہرست شامل ہے۔

فارسی مخطوطات میں ابوالفضل کا اکبر نامہ، مکتوبات علامی (۱۱۹۱ھ) آمی کا دیوان (۱۱۶۴ھ) مجدد الف ثانی کے مکتوبات، الواعظ الکاشفی کی لطائف وظرائف (۱۲۵۴ھ) ٹیک چند بہار کا نوادر المصادر (۱۲۰۹ھ) بیدل کے رقعات (۱۲۵۴ھ) چہار عنصر (۱۱۲۷ھ) جامی کے انشائے جامی (۱۲۴۸ھ) یوسف زلیخا (۱۲۳۲ھ) نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کا شرح الطستہ وصول الی الحق، حافظ شیرازی کا دیوانِ حافظ، خان آرزو کا ثمر الفوائد، خسرو دہلوی کا خسرو شیرین (مثنوی ۱۰۵۸ھ) دارا شکوہ کا مجمع البحرین (۱۰۶۵ھ) شیخ سعدی کے بوستان (۱۱۹۹ھ) گلستان

(۱۲۳۸ھ) عالمگیر اورنگ زیب کا دستور العمل آگاہی رقعات عالمگیری (۱۲۴۷ھ) عطار کا پند نامہ (۱۳۲۴ھ) فردوسی کا شاہنامہ (۱۲۴۷ھ) نظامی گنجوی کا سکندر نامہ (۱۱۰۸ھ) نعمت اللہ خاں عالی کا وقائع حیدرآباد (۱۱۹۷ھ) قابل ذکر ہیں۔

عربی مخطوطات میں سب سے قدیم مخطوطہ ابن سینا کا احکام الادویہ القلبیۃ ہے جو علی محمد خطاط نے ۲۹ جمادی الاول ۶۵۵ھ (۱۲۵۷م) تحریر کیا تھا۔ اس مخطوطہ کے علاوہ عربی مخطوطات میں ابن حجر العسقلانی کا نزھتہ المنظر (۱۰۰۶ھ) ابن عربی کا شرح خصوص الحکم (۱۲۱۲ھ) ابوحنیفہ کا شرح المواقف السید الشریف علی من محمد الجرجانی (۸۰۷ھ) بخاری کا فضائح الملحدین، ترمذی کا الشمائل النبویۃ، غزالی کا احیاء علوم الدین (۱۱۰۰ھ) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا البدور البازغۃ (۱۳۰۲ھ) اور جنید بغدادی کا معانی الھمم بھی شامل ہیں۔

اردو مخطوطات کی فہرست قدرے تشنہ ہے۔ اس میں صرف ۲۷ مخطوطات کی فہرست دی گئی ہے۔ قابلِ ذکر مخطوطات حسب ذیل ہیں:

خواجہ میر اثر کا دیوان (۱۲۶۲ھ) امراؤ سنگھ کا اشارات التعلیم (۱۸۹۲ء) امیر مینائی کا واسوخت امیر (۱۲۸۴ھ) تاریخ ریاست رام پور (۱۹۰۱ء) میر حسن کا دیوان (۱۸۲۴ء) خواجہ میر درد کا دیوان اور اسماعیل شاہ خاں کا تاریخ سلطنت دولت عثمانیہ اقلیم روم (۱۲۹۰ھ)

ان مخطوطات کے ساتھ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لائبریری میں اردو فارسی اور عربی کتابوں کے پہلے ایڈیشن محققین کے لیے سامان دل چسپی فراہم کرتے ہیں۔ مجلس پریس، مکتبہ سلطانی، نامی پریس، مجتبائی پریس، نظامی پریس، نول کشور پریس کی مطبوعات کے علاوہ کتب خانہ میں قومی آزادی کی تحریک کے متعلق وافر تعداد میں مواد دستیاب ہے۔

کتب خانہ کے نوادرات میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دوسرے مسلم عمائدین کے ذاتی کاغذات خطوط، روزنامچے، ڈائریاں، بعض کتابوں کے قلمی مسودے اور ذاتی البم بھی شامل ہیں۔ مولانا محمد علی کے کاغذات میں مولانا کی معرکۃ الآرا کتاب (ISLAM THE KINGDOM OF GOD) کا مسودہ موجود ہے۔ ذاتی کاغذات اور خطوط کا یہ ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس سے تحریک آزادی اور اس عہد سے پر کام کرنے والے محقق کو کافی مدد مل سکتی ہے۔ کامریڈ اور ھمدرد کے ساتھ ساتھ قومی مشاہیر کے خطوط کی مائیکرو فلم کاپیاں موجود ہیں اور ان کے مطالعہ کے لیے لائبریری میں مائیکرو فلم ریڈر دستیاب ہے۔ نوادرات کا شعبۂ فارسی، اردو اور عربی زبان کی نایاب کتابوں سے مالامال ہے اور ان ذخیروں میں بیشتر کتابوں کے پہلے ایڈیشن محققین کی دل چسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

★

"ہمارے ملک میں فیملی پلاننگ کا پروگرام عوامی فلاح و بہبود کے وسیع تر پروگرام کا لازمی جزو ہے۔ کنبے کو چھوٹا رکھنے کی ضرورت پر اس لیے ہمیں زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں بچے پسند نہیں، بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہر بچے کو ملک میں ترقی کرنے کے بہترین مواقع ملیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو ایک بہتر دنیا ورثے میں دیں۔ ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے اور ہماری منصوبہ بند ترقی کا بھی یہی مقصد ہے۔"

——— اندرا گاندھی

احترام اسلام

غزل

مٹ کر ہماری طرح کوئی بے نشاں نہ ہو
کاش اب کسی پہ بھی کرمِ دوستاں نہ ہو

لے چل جنونِ عشق مجھے اس دیار میں
پتھر کی مورتی بھی جہاں بے زباں نہ ہو

دنیا کا التفات ہے تیرے کرم کے ساتھ
تو مہرباں نہ ہو تو کوئی مہرباں نہ ہو

دھرتی پہ دستیاب نہیں کون سی خوشی
ہے کون سا الم جو تہہِ آسماں نہ ہو

اک عمر سے تلاش میں ہیں رہروانِ شوق
اس رہ کے جس پہ تیرے قدم کا نشاں نہ ہو

یہ کامنا ہے دھرتی کا سنگار بن سکے
میرا وجود نازشِ ہفت آسماں نہ ہو

آئے ہو جب یہاں، نہیں دل اختیار میں
یہ احترامِ محفلِ جادوگراں نہ ہو

نثار چنگیزی

عید

آئی ہے عید جشنِ مسرت لیے ہوئے
دامن میں اپنے سازِ صداقت لیے ہوئے

صبحِ نشاط نور کے سانچے میں ڈھل گئی
آئی ہے شام نغمۂ عشرت لیے ہوئے

ہونٹوں پہ سب کے رقص کناں ہیں مسرتیں
دل ہے تمام پیار و عقیدت لیے ہوئے

باہم خوشی میں لوگ ہیں مصروفِ گفتگو
ہر گفتگو ہے حرف و حکایت لیے ہوئے

خاموشیوں سے بھی ہے عیاں کیفِ سرخوشی
صورت ہے سب کی ایک عبارت لیے ہوئے

دیکھو ہر ایک شخص گلے مل رہا ہے آج
دل میں وفورِ شوق و محبت لیے ہوئے

بچے بھی آج اپنی شرارت میں ہیں مگن
ان کی شرارتیں بھی ہیں راحت لیے ہوئے

روزے سے جو ہیں ان کی مسرت نہ پوچھیے
چہرہ ہے ان کا زہد و عبادت لیے ہوئے

کپڑے یہ زرق برق، معطر، نظر فروز
ہر آدمی ہے ایک نفاست لیے ہوئے

دنیا بنی ہوئی ہے سراپا خلوصِ عام
سب کی نظر ہے صرف اخوت لیے ہوئے

جنت سے آ رہی ہے صبا جھوم جھوم کے
ہم عاصیوں کے واسطے رحمت لیے ہوئے

اب جا رہے ہیں لے کے دلوں میں نشاط و نور
سب عیدگاہ عید کی عظمت لیے ہوئے

آؤ چلو نثار دوگانہ ادا کریں
یہ فرض ہے خلوص کی نیت لیے ہوئے

شمس الدین

(افسانہ)

پیاسا تالاب

روپا نسوانی خوبصورتی کا بے مثال شاہکار تھی۔ سرخ و سپید رنگ، نازک اور تیکھے نقوش، چودھویں کے چاند کی طرح روشن چہرے والی اس حسینہ کی آنکھوں میں کسی بیاکُل ہرنی کی آنکھوں کی طرح تڑپ اور شباب کی متوالی چمک تھی۔ گلاب کی نازک پنکھڑیوں کی طرح سرخ و ملائم ہونٹ، شب دیجور کی طرح سیاہ لانبے بال اور گھنی پلکوں والی یہ ماہ جبیں راجہ اندر کے دربار کی روایتی اپسرا لگتی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ خوب سیرت بھی تھی۔ اوائل عمر ہی میں اس کو معاشرے کی پرانی تہذیب کا سبق پڑھا دیا گیا تھا۔ عصمت، عزت اور شرافت اس کا مقصد حیات تھا۔ اس کے والدین غریب ضرور تھے لیکن عزت و خودداری ان کا شیوہ تھا۔ وہ لوگ مالوہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کو اپنے اعلیٰ حسب نسب پر ناز تھا۔ ان کا آبائی پیشہ تالاب اور کنویں کھودنا تھا۔ بچپن میں روپا کسی آزاد پرند کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ لوگ اس کے حسن سے متاثر ہوتے اور اپنی حقیقی اولاد کی طرح پیار کرنے لگتے۔ عہد شباب میں قدم رکھتے ہی اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور انھوں نے اس کے لیے کسی لائق شوہر کی تلاش شروع کر دی۔

وقت گزرنے لگا ساتھ ہی والدین بوڑھے ہوتے گئے۔ ان میں کام کرنے کی زیادہ طاقت بھی نہیں رہ گئی اور گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا۔ روپا ایک سمجھدار اور دور اندیش لڑکی تھی۔ اس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کو باہر جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے کئی بار اس بات کا اظہار بھی کیا کہ اسے کام کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ گھر کا کچھ بوجھ ہلکا ہو سکے لیکن اس کو کبھی اجازت نہیں ملی۔ اس کے باپ نے ہمیشہ پیار سے ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنی اکلوتی جیتی بیٹی کو کام کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک دن شام کے وقت روپا اپنے گھر کے برآمدے میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر اور اداسی کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کا باپ سات دن سے بستر علالت پر پڑا تھا۔ ماں تیمارداری میں لگی ہوئی تھی اور آج گھر کا آخری دانہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اب کل کیا ہوگا۔ باپ کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی اور گھر میں پیسے بھی نہیں تھے کہ دوا لائی جا سکے۔

"دَدّا او دَدّا" کسی نے باہر سے آواز دی۔ وہ چونک کر اٹھی اور آنے والے کے بارے میں ماں کو بتلانے اندر چلی گئی۔ ماں باہر آئی اور آنے والے جوان کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔ وہ تھم تھا جس کی ماتحتی میں بہت سے مزدور گاؤں کے اندر اور گاؤں کے باہر کام کرتے تھے۔ روپا کے والدین چونکہ کئی دن سے کام پر نہیں گئے تھے اس لیے وہ غیر حاضری کی وجہ معلوم کرنے آیا تھا۔ روپا کی والدہ نے شوہر کی علالت کے بارے میں تفصیل سے بتا کر کہا کہ ان کے ایک ہی بیٹی ہے۔ لیکن اس کے باپ کا حکم نہیں ہے کہ وہ کام پر جائے کیونکہ اب وہ جوان ہو گئی ہے۔ تھم نے ہر بات کو خاموشی سے سنا پھر روپا کے والد کے پاس جا کر خیریت پوچھی

دوران گفتگو میں اس نے روپا کو کام پر بھیجنے کی صلاح دی کیونکہ بہت سے نئے کنوئیں کھودے جانے تھے۔ مزدوروں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کا باپ ہچکچایا لیکن نجم نے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا پورا یقین دلایا۔ روپا کے باپ نے صاف طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اس پر غور کرے گا۔ نجم خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

روپا جو ساری باتوں کو سن رہی تھی، برداشت نہ کر سکی، وہ دوڑ کر باپ کے بستر کے قریب پہنچی اور بڑی منت سے کام پر جانے کی اجازت مانگی۔

اس نے آہستہ سے کہا! "اس کی عمر کی دوسری لڑکیاں بھی تو کام پر جاتی ہیں میں انھیں کے ساتھ جاؤں گی۔" اس کے باپ کا دل بھر آیا اس نے خاموشی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

روپا نے اپنی ماں سے منت کی۔ وہ بھی خاموش رہی لیکن جب اسے یہ علم ہوا کہ گھر میں ایک دانہ بھی نہیں ہے تو اس نے مجبوراً اجازت دے دی۔

دوسرے دن روپا بہت سویرے اپنی ایک سہیلی کے گھر سے تھوڑے چاول مانگ لائی۔ اس کو پکا کر تھوڑا کھایا اور کام پر چل دی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ سیدھی نجم کے پاس پہنچی اور نگاہیں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

نجم نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسن و جمال کے اس مجسمے کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اس نے روپا کو کام بتا دیا اور وہ خاموشی سے کام پر لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب نجم معائنے پر آیا تو اس کو اندازہ ہوا کہ روپا ہزاروں لڑکیوں میں ایک ہے۔ وہ اپنی ہر عادت سے ہزاروں میں پہچانی جا سکتی ہے۔ دوسری لڑکیاں آرام کرنے کے بہانے ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتیں۔ لیکن روپا صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی، اسے دنیا جہان کی کوئی خبر نہ رہتی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے ایک باعصمت مخلص اور بلند خیال لڑکی نظر آئی تھی۔ شام کے وقت کام کرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں گل لالہ پر شبنم کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ جب مزدوری بٹ گئی تو وہ خاموشی سے مزدوری لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

اسی طرح روپا معمول کے مطابق کام پر آتی، شام کے وقت خاموشی سے چلی جاتی۔ حالانکہ وہ ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کرتی تھی اسے اپنے مالکوں اور آقاؤں کے خاموش اشاروں کا احساس بھی ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی محنت پر خوش تھی اور عزت و خودداری کے ساتھ کام کرتی رہتی۔ بذات خود نجم نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا لیکن اس کی سنجیدگی اور وقار کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ روپا سے بات کر سکے۔ ایک دن اس نے سوچا کہ وہ روپا کے والد کی خیریت پوچھنے کے بہانے اس سے بات کرے گا۔ لیکن پورا دن گزر جانے کے بعد بھی اسے موقع نہ مل سکا کہ بات کر سکتا۔ ایک دن اس کو ایک سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ افسر اعلیٰ کے معائنے کی وجہ سے شام کے وقت مزدوری تقسیم کرنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ روپا اپنی جگہ خاموشی سے کھڑی رہی، یکے بعد دیگرے سارے مزدوروں کو تنخواہ تقسیم کر دیا گیا۔ سب سے آخر میں روپا کی باری آئی، اس نے مزدوری لی اور دُور جاتی ہوئی دیگر لڑکیوں کی جانب تیزی سے گھومی۔ اسی وقت نجم نے پوچھا،

"تمھارے والد کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"اب وہ ٹھیک ہو رہے ہیں۔" روپا نے جلدی سے جواب دیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ہی نجم نے دوسرا سوال کیا! "کس کا علاج ہو رہا ہے۔"

"میں نام تو نہیں جانتی لیکن ماں نے بتایا تھا کہ وہ کسی وید سے دوا لائی ہے جو گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔" روپا نے جواب دیا۔

"اس سے کوئی فائدہ ہے۔" نجم نے دوبارہ پوچھا۔

"جی ہاں۔ اب ان کو بخار نہیں رہتا لیکن نقاہت کی وجہ سے ابھی ان کو آرام کی ضرورت ہے۔" کچھ لمحہ کے وقفے کے بعد روپا نے پوچھا!

"اب میں جاؤں، شاید میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں۔"

گی، کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔"

تحم کرسی سے کھڑا ہو گیا اور روپا کے سامنے آکر بولا، شاید وہ لوگ چلے گئے، تھوڑی دیر رکو، میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں تاکہ تم کو گھر تک پہنچا دوں، میں خود ہی تمھارے گھر تمھارے والد کی خیریت پوچھنے جانے والا تھا۔"

روپا دوڑ کر اپنی سہیلیوں کو پکڑ لینا چاہتی تھی لیکن تحم کی تجویز پر وہ پریشان سی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ اسی وقت تحم نے حساب ختم کیا اور ہر چیز رکھ کر گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر پر ماں بے چینی سے منتظر تھی۔ روپا اندر چلی گئی۔ تحم بہت دیر تک اس کے والد کے پاس بیٹھ کر یقین دلاتا رہا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے فکر مند نہ ہوا کرے وہ سب سے بہتر کام کرتی ہے۔

تحم روپا کی پاکدامنی اور بلند اخلاقی سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن جب روپا کے باپ نے روپا کے لیے کسی لڑکے کو ڈھونڈنے کی بات کہی تو تحم نے خود کو پیش کر دیا۔ دونوں کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ تحم نے ایک باعصمت، اور بے مثال بیوی پائی اور روپا کو بھی ایک مثالی شوہر حاصل ہو گیا۔ روپا دل کی گہرائیوں سے تحم کو پیار کرتی اور اس کی خدمت کرتی رہتی تھی۔ تحم نے بھی روپا کو اپنی ساری خوشیوں کا مرکز بنا لیا۔ دونوں کی ازدواجی زندگی بڑے پرمسرت اور خوشیوں کے سائے میں گزر رہی تھی۔

اچانک ایک دن مشرقی گجرات میں واقع ایک ریاست کے مہاراج کا پیغام آیا کہ وہ اپنے شہر میں ایک بڑا تالاب بنوانا چاہتے ہیں جس کی کھدائی کے لیے مالوہ سے ہزاروں مزدور درکار ہیں۔ تحم فوراً راضی ہو گیا۔ اس نے جلدی سے ایک ہزار مزدور جمع کیے اور وہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

روپا بھی اس کے ساتھ ہی گئی۔ کام شروع ہو گیا۔ ان دونوں کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ ہر مزدور ان کو دل و جان سے چاہنے لگا۔ وہ لوگ ان دونوں کو اپنا محافظ اور سرپرست سمجھتے تھے، کام کے دوران مہاراج بذات خود معائنہ پر آتے رہتے۔ ایک دن جب وہ تالاب کے کنارے ایک کرسی پر بیٹھے کام دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر روپا پر پڑی۔ اور اس کی ہلکی سی جھلک نے ان کو اس کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ کام کرتے وقت جب وہ ان کے قریب سے گزری تو ان کی نگاہیں اسی پر جم گئیں اور جس وقت روپا نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھنے کی کوشش کی تو مہاراج نے اس کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ جس طرح ساون کی گھٹاؤں میں اچانک بجلی چمک جاتی ہے اسی طرح میلے اور گرد آلود کپڑوں میں روپا کا حسن و جمال چمک رہا تھا۔ راجہ اس بے پناہ خوبصورتی کو دیکھ کر کھو سا گیا۔ اس کے جذبات میں طوفان اٹھنے لگے۔ وہ اس خوبصورتی کو اپنی باہوں میں لینے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ اس نے روپا کو کئی بار اشارہ کیا، لیکن ایک باعصمت عورت کی طرح اس نے ان کی جانب دیکھا تک نہیں۔

اس بات سے مہاراجہ کی انا کو ٹھیس پہنچی، اس کے خیال میں ریاست کا مالک کسی مزدور کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا اسے یہ علم نہیں تھا کہ روپا دوسری مٹی سے بنی ہے۔ حالانکہ اس کی عمر ابھی زیادہ نہیں تھی لیکن پاک دامنی اور عقل مندی کا سبق اسے اوائل عمری سے دیا جا چکا تھا۔ اس کے والدین کی تعلیم اس کی رگوں میں رچی بسی تھی، کسی لالچ سے اس کے قدم پھسل نہیں سکتے تھے۔ وہ ایک جوہر بے بہا تھی جس کی بنا پر لوگ تحم کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

روپا کا انداز دیکھ کر اس وقت تو راجہ خاموش ہو گیا لیکن روپا کے حسن نے اس کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی اس کی خلش اور سوزش نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ہر وقت روپا کو حاصل کرنے کے بارے میں ہی وہ سوچا کرتا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی جس کے ذریعہ بغیر قوت و طاقت کا استعمال کیے ہی روپا حاصل ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ روپا ایک معمولی مزدور ہونے کی وجہ سے جواہرات، قیمتی کپڑوں اور آسائشوں کی خواہاں ہو گی۔ اس طرح کے لالچ سے وہ پھسل سکتی ہے۔ دوسرے دن اس نے ایک آدمی کے ذریعے روپا کے پاس پیغام بھیجا۔ پیغام لے جانے والا روپا کے قریب گیا اور آہستہ

سے بولا "روپا تم مزدوروں کے افسر اعلیٰ کی بیوی ہو، مٹی سے بھرا ٹوکرا تمھارے سر پر اچھا نہیں لگتا۔"

"اس میں شرم کی کیا بات ہے۔" روپا نے سختی سے جواب دیا۔ "اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ہم لوگ مزدور ہیں، یہ تو ہمارا فرض ہے۔"

"لیکن تم سے اس طرح کا کام لینا بے انصافی ہے۔" اس نے دوبارہ کہا: "تم ایسی حسین وجمیل عورت کو تو شاہی محل کی رانی ہونا چاہیے تھا۔"

"تم میری قسمت کے بارے میں باتیں کرنے والے کون ہوتے ہو؟" اس نے تلخی سے کہا ۔۔۔ "میں اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہوں، میرا جھونپڑا محل سے لاکھ درجہ بہتر ہے ۔۔۔"

"خیر یہ سب باتیں چھوڑ دو اور سنو، مہاراجہ نے کہلایا ہے کہ کسی دن ان کے محل میں آکر پرسکون اور پر آسائش زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ جاؤ، اس کے بعد شاید تم کبھی محل چھوڑنا بھی پسند نہ کروگی۔" اس آدمی نے ہمت کرکے سب کچھ کہہ دیا۔

"کیا؟ کیا تو نے مجھے بدکردار عورت سمجھا ہے؟ میں ایک باعزت شخص کی بیٹی ہوں، جاؤ اپنے راجہ سے کہہ دو مجھے محل کی خواہش نہیں ہے۔" روپا نے تیز لہجے میں جواب دیا، اور ٹوکری رکھ کر آگے بڑھ گئی۔

وہ شخص بدحواس ہوکر بھاگا اور جاکر راجہ کو ساری تفصیل بتادی۔ راجہ نے بڑی خاموشی سے پوری بات سنی، اور ایک بار پھر کسی خیال میں کھو گیا۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ روپا کوئی معمولی عورت نہیں ہے وہ ضرور کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کسی لالچ کا شکار نہیں بن سکتی۔ ان خیالوں نے روپا کو بھلانے کے بجائے اس سے اور قریب کردیا۔ دوسرے دن وہ خود روپا کے پاس گیا اور بولا، "یہ سب کام تمھارے کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ تمھارے خوبصورت ہاتھ مٹی اور کیچڑ سے گندے ہوجاتے ہیں۔ چاند کی طرح روشن تمھارا چہرہ گرد و غبار میں دھندلا جاتا ہے، تمھارے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے، تم کو تو شاہی محل کی زینت ہونا چاہیے۔ میرے محل میں چلو جہاں دنیا کی ساری لذتیں اور آسائشیں تمھاری منتظر ہیں ۔۔۔"

روپا نے نہایت نرمی سے جواب دیا! "مہاراج میری عزت وعصمت پر کیچڑ مت اچھالیے، میرا غریب شوہر میرا سرتاج ہے جس کی خدمت کرنا ہی میرا فرض اولین ہے، میرا چھوٹا سا جھونپڑا کسی جنت سے کم نہیں ہے مجھے آپ کے شاہی محل کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن روپا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس خوشی و مسرت سے کہیں زیادہ تم کو سکون دوں گا، میں تم کو رانی بناؤں گا جو پوری ریاست پر حکمرانی کرے گی، میں تمھارا غلام بن جاؤں گا ۔۔۔"

"بہت ہوچکا" روپا نے چیخ کر کہا "اس کو یہیں ختم کیجیے آپ ایک راجہ ہیں جسے اپنی رعایا کی حفاظت کرنی چاہیے، کسی عورت سے ایسی باتیں کرتے آپ کو شرم نہیں آتی؟ آپ ایک ریاست کے حکمراں ضرور ہیں لیکن اس بات کو یاد رکھیے کہ میں ایک باعزت شخص کی بیوی ہوں، میرا جسم، دماغ، روح اس مقدس رشتے کے تحت صرف شوہر کا ہے۔ آپ ایک راجہ ہیں مجھے قتل کرا سکتے ہیں۔ لیکن زندگی کی آخری سانس تک مجھے میرے شوہر سے جدا نہیں کرسکتے۔ میں اس کی پرستش کرتی ہوں صرف اس زندگی میں نہیں، جتنی بار بھی زندگی ملے گی میں اس کی پرستش کروں گی۔"

راجہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کچھ کہہ سکے، اس نے خاموشی سے نگاہیں جھکالیں اور بوجھل قدموں سے محل کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کا شاہی غرور ایک معمولی عورت نے پاش پاش کردیا تھا۔ اس نے ایک وفادار پرانے دیوان کو بلایا اور اسے کچھ سمجھایا، اس کو ابھی تک یہ امید تھی کہ اگر روپا اس جگہ کسی طرح لے آئی جائے تو وہ راضی

جائے گی۔ وفادار دیوان نے راجہ کو بہت سمجھایا کیونکہ اس طرح راجہ کی عزت پر آنچ آنے کا خطرہ تھا لیکن راجہ نے ایک نہیں سنی۔

ادھر رُوپا نے ساری باتیں تکم سے بتائیں اور اُسے اُس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا کیونکہ خطرہ سامنے پیش تھا۔ تکم غصے میں آگ بگولا ہوگیا لیکن اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ راجہ کو جواب دے سکتا۔ رُوپا ایک لمحہ ٹھہرنے کے لیے راضی نہیں تھی۔ تکم نے مزدوروں کو تیزی سے تیار کیا اور اندھیرے ہی میں فرار ہوگیا۔ سویرا ہوتے ہی ان لوگوں کے فرار کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ راجہ کو اس کی اطلاع ملی، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر راجہ نے کچھ سواروں کو لیا اور تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ جلدی وہ ان لوگوں کو پکڑ لینے میں کامیاب ہوگیا، اس کے مسلح سپاہی مزدوروں کی اس چھوٹی غیر مسلح جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ زیادہ تر مزدور قتل کر دیے گئے۔ تکم نے راجہ پر حملہ کیا لیکن وہ تنہا تھا۔ شدید زخم کھا کر اسی جگہ گر گیا۔ اس کو گرتا دیکھ کر رُوپا تیزی سے اس کے قریب آئی۔ تھیلے سے خنجر نکال کر اس نے اپنے سینے پر مار لیا اور شوہر کے پہلو ہی میں گر گئی۔ ایک کراہتی ہوئی آواز سنائی دی! "ملعون شخص! تو اپنے ناپاک اور گندے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہوں گی۔ اسی کے ساتھ سورگ کو جا رہی ہوں۔ لیکن اس بات کو یاد رکھنا کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو تیرا تالاب ہمیشہ پیاسا ہی رہے گا۔ اس میں پانی کبھی نہ رک سکے گا۔" اتنا کہتے کہتے اس کی سانسیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ اس سے پہلے کہ راجہ رُوپا کے قریب پہونچ کر اس کے جسم کو ہاتھ لگاتا، موت کے آہنی پنجے نے سدا کے لیے اس کو دبوچ لیا۔

★

ادب کا تعمیر پسند نظریہ ..

لوگ ہر پرانی چیز کے مخالف ہیں یقیناً وہ اپنے اصول سے انصاف نہیں کرتے اور جو لوگ ہر نئی چیز کے خلاف ہیں وہ اپنے اصول کی عظمت کو گھٹاتے ہیں۔

قدامت اور جدیدیت کے الگ الگ خانے بنا لینا صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس اصول کی روشنی میں ہم قدیم و جدید ادبی سرمائے پر نظر ڈالیں اور نئے پرانے تجربات کی روشنی میں مستقبل میں ادب کی تعمیر کا خاکہ بنائیں۔ تجربات سے استفادہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی قدر قدیم ادبی سرمایے کی اہمیت

(صفحہ ۲۰ کا بقیہ) .. ..

ہے۔ اس ادبی سرمائے کے حاصل شدہ تجربات سے کیونکر استفادہ کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب بہرحال یہی ہے کہ ان سے اصول اور نظریہ کی روشنی میں ہی استفادہ ممکن ہے۔ اس طرح اصول اور نظریہ کی اہمیت بنیادی ہے۔ مگر اس سے قدیم ادبی سرمائے یا نئے ادبی تجربات کی اہمیت اور افادیت کی نفی نہیں ہوتی ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

★

عارف عزیز قدوائی

ہمارے بچے

امریکہ اور روس دو انتہائی وسیع وعریض اور بہت ترقی یافتہ ملک ہیں۔ ان کے رقبہ کے تناسب سے ان کی آبادی بے حد کم یعنی بالترتیب صرف ۲۰ کروڑ اور ۲۴ کروڑ ہے۔ دونوں قومیں زرعی اور صنعتی ہی نہیں ہر میدان میں لمبی لمبی چھلانگیں لگا رہی ہیں اور وہاں کے عوام اس پیش رفت سے بخوبی مستفید ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں صورت یہ نہیں ہے کہ جتنی ترقی ہو اسے آبادی کا اضافہ ہڑپ کر جائے۔

ان دونوں ممالک کا مقابلہ ہندستان سے کیا جائے تو بڑا فرق نظر آئے گا۔ تقسیم مملکت کے بعد بھی ہمارے پاس دنیا کا ۴ء۲ فی صد رقبہ ہے لیکن دنیا کی آبادی میں ہندستان کی آبادی کا تناسب ۱۵ فی صد ہے۔ صرف چین ایسا ملک ہے جہاں ہمارے ۶۰ کروڑ عوام کے مقابلے میں ۷۰ کروڑ عوام بستے ہیں۔ افرادی طاقت کی اہمیت بیشک ہے۔ ماضی میں کچھ زیادہ ہی تھی۔ مستقبل میں بھی رہے گی لیکن نسبتاً کم۔ مشینوں کی افادیت میں جو وسعت ہو رہی ہے اسے ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی روز افزوں ترقی میں یہ ضرورت کم سے کم ہوتی جائے گی۔

عرب ممالک پر ایک نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ وہاں آبادیاں بہت کم ہیں۔ اس برادری کے ملکوں کی تعداد کم و بیش بیس ہے۔ لیکن صرف پانچ ایسے ہیں جن کی آبادی کروڑ میں ہے۔ مصر میں تین کروڑ ۸۰ لاکھ، مراکش میں ایک کروڑ ۶۲ لاکھ، الجزائر میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ، سوڈان میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ اور عراق میں ایک کروڑ ۷ لاکھ نفوس بستے ہیں۔ بقیہ عرب ملکوں کی آبادی لاکھوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح قوموں کی اس برادری کو بھی خاندان کی منصوبہ بندی کی شدید ضرورت اور اہمیت کا احساس ہے۔ پاکستان والے بھی اس طرف پوری طرح متوجہ ہیں اور نہیں چاہتے کہ آبادی میں تیز رفتار اضافہ ملک کی ترقی کو پچھاڑ دے۔

خاندانی منصوبہ بندی کا ایک پہلو جسے عموماً نظر انداز کرنے کا رجحان ہے خالصتاً فطری ہے۔ مرد کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شریک حیات کا حسن اور جوانی زیادہ سے زیادہ ممکن عرصے تک برقرار رہے۔ خوش گوار اور آسودہ ازدواجی زندگی کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن جو مرد جان بوجھ کر عورت کو شریک زندگی سمجھنے کے بجائے صرف بچے پیدا کرنے کی مشین تصور کرتے ہیں وہ اپنے آپ پر اور اپنی بیوی پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ افزائش نسل کی ضرورت سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن زیادہ بچے پیدا کرنے سے نسوانی حسن پر جو مضر اثرات پڑتے ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔

موجودہ نسل جو عمر کا بیشتر حصہ طے کر چکی ہے اس کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی۔ اصل مسئلہ ہمارے بچوں اور ان بچوں کی اولاد کے لیے ہوگا۔ یہ بڑی خود غرضی کی بات ہوگی کہ ہم اپنے دلارے اور لاڈلے بچوں کے وسیع تر مفاد سے قطعاً بے پروا ہو کر خاندانی منصوبہ بندی کے اصول سے بے اعتنائی برتیں۔ جن بچوں کو عالم وجود میں لانے کا وسیلہ ہم بنتے ہیں ان ہی کی خوش حالی کا تقاضا ہے کہ ہر خاندان اور ہر کنبہ منصوبے کے مطابق محدود ہو۔ اگر ہمیں اپنی اولاد عزیز ہے اس کا مستقبل اور بہبود عزیز ہے تو اپنے لیے کچھ پابندیاں لانا قبول کرنا ہوں گی۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ بڑے فخر کے ساتھ اپنے بچوں کی تعداد ایک درجن ڈیڑھ درجن بتلاتے تھے۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب آبادی کے مسئلے کو قطعاً درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر اس قسم کا تصور تھا کہ ہمارا ملک بڑا وسیع و عریض ہے اور بڑی سے بڑی آبادی کو کھپا سکتا ہے۔ وہ زمانہ تعلقہ داری، زمیں داری اور جاگیرداری کا تھا۔ ایک شخص کئی کئی مواضعات کا مالک ہوتا تھا، ایکڑوں قابل کاشت اراضی اس کی ملکیت تھی۔ اس دور کا نہ صرف کلیتہً خاتمہ ہو گیا ہے بلکہ اب اس کے واپس آنے کا قطعاً کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے۔ اراضی رکھنے کی ایک حد (سیلنگ) مقرر ہو چکی ہے شہری زمینوں کے لیے بھی اسی قسم کا قانون بن چکا ہے۔ اس صورت حال میں باپ کے مرنے پر کئی لڑکوں والے کنبے میں جائداد جس طرح تقسیم ہوگی اس کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر لڑکے کی اگر کئی اولادیں ہوئیں تو جائداد کی حیثیت بس ویسی ہی رہ جائے گی جیسی اودھ کے نوابوں کا ایک ڈیڑھ روپیہ وثیقہ ہوتا تھا۔

آبادی میں بے تحاشا اضافے کا خطرہ عین ہمارے دروازے تک آ پہنچا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی تھی۔ اس وقت سے اب تک آبادی میں ۲۵ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ گویا کہ ایک "نئے روس" نے ہمارے ملک کے اندر جنم لیا ہے حالانکہ رقبے کے اعتبار سے سویت یونین کے پاس ہمارے ملک کا چھ گنا علاقہ ہے۔ ہر سال ہندستان کی آبادی میں اتنا اضافہ ہو رہا ہے جتنا آسٹریلیا کی کل آبادی، حالانکہ آسٹریلیا ایک براعظم ہے اور ہندستان کا ڈھائی گنا رقبہ رکھتا ہے۔ یہ اعداد و شمار ہیبت ناک ہیں اور اصلاح حال کی فوری کارروائی کے طالب ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ عوام کو اس کی ہیبت ناکی ذہن نشین کرانے کا ہے۔ سچ پوچھیے تو توجہ شہر کی طرف نہیں بلکہ دیہات پر مرکوز کرنے کی ہے جہاں اب بھی ہماری ۸۰ فی صد آبادی ۵ لاکھ ۷۶ ہزار مواضعات میں پھیلی ہوئی ہے، بقیہ بیس فی صد آبادی تقریباً تین ہزار شہری مرکزوں میں بکھری ہوئی ہے۔ شہر میں بہت کچھ کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ ضرورت دیہات کے سادہ لوح لوگوں کو سمجھانے اور ترغیب دینے کی ہے۔ وہ اگر خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت کو سمجھ لیں تو راہ کی تمام دشواریاں دور ہو جائیں گی۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنے بیس نکات کے بعد چند اور نکات کا اعلان حال ہی میں کیا تھا۔ ان میں خاندانی منصوبہ بندی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے دستور اساسی میں جو ترمیم ہونے جا رہی ہے۔ اس میں خاندانی منصوبہ بندی کو مملکت کے رہبر اصولوں میں شامل کرنے کا فیصلہ تقریباً ہو چکا ہے۔

ہندستان کی لائق اور بیدار مغز قیادت جس کی عظیم ترین رہنما مسز گاندھی ہیں، اس مسئلے سے نپٹنے کی جو کوشش فی الوقت کر رہی ہیں ویسی کوشش اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور پوری توقع ہے کہ مرکزی حکومت کے فیصلے کے مطابق شرح پیدائش جو پانچویں پانچ سالہ منصوبے کی ابتدا میں ۳۵ فی ہزار تھی اسے چھٹے منصوبے کے آخر تک گھٹا کر ۲۵ فی ہزار کیا جا سکے گا۔ اترپردیش بھی اس عظیم قومی پروگرام میں اپنے طور پر پوری جد و جہد میں مصروف ہے اور ہر محاذ پر اس سلسلے میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ مرکز نے یوپی کے لیے سال بھر میں چار لاکھ نس بندیوں کا نشانہ مقرر کیا تھا لیکن ریاستی حکومت نے از خود اسے بڑھا کر ۱۵ لاکھ کر لیا ہے تاکہ اس اہم پروگرام کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے میں پوری معاونت ہو سکے۔ اس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت اترپردیش اس مسئلے کو کس درجہ اہمیت دے رہی ہے۔ لیکن یہ کام تنہا حکومت کے کرنے کا نہیں ہے۔ اگر ہمیں اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہے، اگر ہمیں اپنی خوش حالی اور معیشت کو مستحکم بنانا، ترقیاتی پروگراموں کے فوائد کو گھر گھر پہنچانا اور ہر خاندان کو آسودہ حال بنانا ہے تو اسے منصوبے کے تحت محدود رکھنا ہوگا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔ بلکہ عمل بھی کریں۔

★

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

سماج دشمن عناصر کو وزیر اعلا کا سخت انتباہ ••• ٹریفک کے قواعد وضوابط کی پابندی: وزیر اعلا نے ریاست گیر مہم شروع کرنے کا حکم دیا ••• لکھنؤ کو دل کش بنانے کے لیے تین اسکیموں کی منظوری ••• اترپردیش تقاوی قواعد میں ترمیم ••• سرکاری واجبات کی تیز تر وصولی: محکموں کو وزیر اعلا کی ہدایت ••• وزیر ریاست شری رمیندر ورما کی جانب سے محکمہ اطلاعات کے جرنلسٹوں کو ترقی کے بہتر امکانات کی یقین دہانی ••• ہینڈلوم کی ترقی کے لیے جامع پروگرام ••• معذور بچوں کے لیے اقامتی اسکول

سماج دشمن عناصر کو وزیر اعلا کا سخت انتباہ۔ وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں سماج دشمن عناصر کو سخت انتباہ دیتے ہوئے کہا کہ ذخیرہ اندوزوں، چور بازاری کرنے والوں اور اسمگلروں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے کہا ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔

شری تیواری نے کہا کہ بددیانت تاجروں اور چور بازاری کرنے والوں کے خلاف میسا کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے ضلع حکام سے کہا کہ وہ ایسے عناصر کے خلاف فوری کارروائی کریں۔

وزیر اعلیٰ نے ہلدوانی (ضلع نینی تال) میں ایم بی کالج گراؤنڈ پر عوام کے ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت کے پاس غلہ کا کافی اسٹاک ہے۔ ریاستی حکومت نے اب تک ۷ لاکھ ٹن گیہوں کی خریداری کی ہے۔

انھوں نے کہا کہ غلط کاروں کو بچانے کے لیے کسی قسم کی سفارش نہیں کی جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی سفارش کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

ٹریفک کے قواعد وضوابط کی پابندی:
وزیر اعلا نے ریاست گیر مہم شروع کرنے کا حکم دیا۔ اترپردیش میں ٹریفک کے قواعد وضوابط کی پابندی کے لیے جلد ہی ایک ریاست گیر مہم شروع کی جائے گی۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تواری نے اس سلسلے میں ریاستی محکمہ ٹرانسپورٹ کی عملدرآمد مشنری کو حرکت میں لانے کی ہدایت کی اور اس مہم کی تکمیل کے لیے تین ماہ کی مدت مقرر کر دی ہے۔

یہ ہدایات ۲۰ جولائی کو ودھان بھون میں منعقدہ ایک اعلا سطحی کانفرنس میں لیے جانے والے ریاستی ٹرانسپورٹ تنظیم کی کارکردگی کے تفصیلی جائزہ کے دوران دی گئیں۔

وزیر اعلیٰ نے ٹریفک کے ضوابط اور سڑک ضوابط کی خلاف ورزی پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ڈرائیوروں کو ضبط و نظم کا پابند بنانے اور ان میں ٹریفک کے قواعد کے احترام کا جذبہ پیدا

کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

وزیر اعلا نے محکمہ نقل و حمل کے عملدرآمد شعبے کو قواعد کے سختی سے نفاذ اور اندھا دھند موٹر گاڑیاں چلانے والے خطا کار ڈرائیوروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی ہدایت بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اچانک معائنے کئے جانا چاہئیں اور رات کے معائنوں کے پروگرام پر سختی سے عمل کیا جانا چاہیئے۔

لکھنؤ کو دلکش بنانے کے لیے تین اسکیموں کی منظوری۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں ایک اعلا سطحی جلسے میں جو شہر لکھنؤ کو دل کش بنانے کے طریقے اور ذرائع کی فراہمی پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا لکھنؤ کی سڑکوں کو کشادہ اور درست کرنے کے لیے تین کاموں کی منظوری دیدی۔

ان کاموں کی تخمینی لاگت ۹۴ لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ ہے اور ان کو محکمۂ تعمیرات عامہ اولیت کی بنیاد پر مکمل کرے گا۔ ان میں ۱۷ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کی تخمینی لاگت سے لکھنؤ کانپور روڈ پر شاردا نہر سے کارپوریشن کی جانچ چوکی تک ۲۸ لاکھ ۵۵ ہزار روپے کی تخمینی لاگت سے ہیوٹ روڈ کے چوراہے سے چھوٹے امام باڑے تک اور ۳۳ لاکھ ۷۳ ہزار روپے کی تخمینی لاگت سے کنٹونمنٹ روڈ بر ٹیڑھی نلیا سے این۔ آر۔ اسپتال تک سڑک کو چوڑا کرنے اور اسے بہتر بنانے کے کام شامل ہیں۔

اس جلسے میں دیگر شرکا کے علاوہ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ ڈاکٹر شریمتی راجین۔ رکماری باجپئی وزیر ہریجن و سماجی فلاح ڈاکٹر چرن سنگھ، چیف سکریٹری اور ریاستی حکومت، لکھنؤ ڈیولپمنٹ اتھارٹی اور محکمۂ تعمیرات عامہ کے دیگر سینیر افسروں نے شرکت کی۔

وزیر اعلا نے کہا کہ لکھنؤ شہر کو دلکش بنانے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کے کام میں کوئی تساہلی نہ برتی جائے۔ مختلف اسکیموں کو مربوط طور سے اور مقررہ مدت کے اندر عملی جامہ پہنانے کو یقینی بنایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ نالوں کی صفائی اور تاریخی عمارتوں کے قریب کی جگہوں کو دلکش بنانے پر خصوصی توجہ دی جانا چاہیئے۔

شری تیواری نے سیلاب سے بچاؤ کے لیے گومتی ندی پر تعمیر ہونے والے بند کی رفتار ترقی کے بارے میں بھی استفسار کیا اور کہا کہ وہ لوکل سیلف گورنمنٹ کے ہمراہ جلد ہی بند کا معائنہ کریں گے۔

جلسے میں امام باڑوں اور دیگر تاریخی عمارتوں کے گرد و پیش کو صاف ستھرا رکھنے اور دل کش بنانے، وکٹوریہ اسٹریٹ اسکیم کی تکمیل صفائی اور کوڑا کرکٹ اٹھانے کے لیے کام میں جدید طریقوں سے کام لینے، نالوں کو ڈھکنے۔ نیز سڑکوں اور چوراہوں کو درست کرنے کی اسکیموں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ گومتی بیراج کی تکمیل اور باغبانی سے متعلق پروگراموں پر بھی جلسے میں تبادلۂ خیال ہوا۔

اتر پردیش تقاوی قواعد میں ترمیم۔

ریاستی حکومت نے اتر پردیش تقاوی قواعد ۱۹۴۲ء کے قاعدہ ۵۲ میں ترمیم کی ہے جس کا اطلاق گزٹ میں اس کی تاریخ اشاعت سے ہوگا۔

ترمیم شدہ قاعدہ کے تحت یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ کلکٹر زرعی قرضہ ایکٹ اور اصلاحات آراضی قرضہ ایکٹ کے تحت افراد کو وقتاً فوقتاً حکومت کی مقرر کردہ شرطوں کے مطابق یا حسب قاعدہ اس حد تک قرضے منظور کر سکتا ہے جس حد تک وہ ضروری سمجھے گا۔ بشرطیکہ اس طرح منظور شدہ رقم اس رقم سے تجاوز نہ کرے جو مجموعی طور پر ضلع کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

چنانچہ پرگنہ حاکم مذکورہ بالا دونوں قوانین کے تحت ۵۰۰۰ روپے تک اور ڈپٹی کلکٹر یا بلاک ترقیاتی افسران ۲۵۰۰ روپے تک کے انفرادی قرضے منظور کر سکتے ہیں۔ تحصیل دار ایکٹ ۱۲ کے تحت صرف ۵۰۰ روپے تک اور نائب تحصیلدار ناگہانی آفات کے معاملے میں ۱۰۰ روپے تک کے قرضے منظور کر سکتے ہیں۔

سرکاری واجبات کی تیز تر وصولی: محکموں کو وزیر اعلا کی ہدایات :-

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے بورڈ

آف ریوینیو اور سرکاری محکموں نیز سرکاری زمرے کے کارپوریشنوں کے درمیان مسلسل رابطہ کی ضرورت پر زور دیا جو اپنے واجبات کی وصولی کے لیے اول الذکر پر انحصار کرتے ہیں۔ انھوں نے متعلقہ محکموں اور کارپوریشنوں کو ہدایت کی کہ وہ ایسے افسر نامزد کریں جو واجبات کی وصولی کا جائزہ لینے اور تیز رفتار وصولی میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لیے مہینہ میں کم سے کم ایک بار بورڈ کے نمائندوں سے ملیں۔

وزیر اعلا نے ان خیالات کا اظہار اعلا سطح کے ایک جلسہ میں کیا جو دوسری باتوں کے علاوہ زمین کی تقسیم، چک بندی اور مالگزاری نیز دیگر سرکاری واجبات کی وصولی کا جائزہ لینے کے لیے حال ہی میں ذدھان بھون میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں دیگر شرکا کے علاوہ وزیر مال شری سوامی پرشاد سنگھ، وزیر ریاست برائے مال شری دیر بہادر سنگھ، چیف سکریٹری شری محمود بٹ بورڈ آف ریوینیو کے چیرمین اور مال اور دیگر محکموں کے سینیر افسروں نے شرکت کی۔

وزیر اعلا نے سرکاری محکموں کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنے وصولی سرٹیفکیٹ مناسب طور سے تیار کریں اور انھیں بورڈ آف ریوینیو کو وقت کے اندر بھیج دیں تاکہ بورڈ اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق وصولی کا بندوبست کر سکے۔ انھوں نے خبردار کیا کہ وصولی سرٹیفکیٹ ایک بار جاری ہونے کے بعد کسی بھی صورت میں واپس نہیں لیے جانا چاہیے۔

وزیر ریاست شری رمیندر ورما کی جانب سے محکمۂ اطلاعات کے جرنلسٹوں کو ترقی کے بہتر امکانات کی یقین دہانی

اطلاعات، بجلی اور محنت کے وزیر ریاست شری رمیندر ورما نے نظامت اطلاعات کے جرنلسٹوں کو (انفارمیشن افسروں) کو یقین دلایا کہ ان میں مایوسی اور جمود کی جو کیفیت ہے اس کو دور کرنے کی غرض سے ان کے لیے ترقی کے مواقع پیدا کیے جائیں گے اور ان کی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا جائے گا۔

انھوں نے کہا کہ اس محکمہ کے جرنلسٹوں کو جو ذمہ داریاں سپرد کی گئیں ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے میں وہ اہل ثابت ہوئے ہیں اور اس طرح وہ پوری ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جن غیر مستقل جرنلسٹوں نے ۲۰-۲۰-۲۱ و ۲۲ سال تک قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں انھیں جلد سے جلد مستقل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ان میں تحفظ کا احساس پیدا ہو۔

وزیر موصوف سال رواں کے لیے نئے عہدہ داروں کا انتخاب ہونے کے بعد نظامت اطلاعات اتر پردیش کی جرنلسٹوں ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی کے پہلے جلسہ کا افتتاح کر رہے تھے۔ ایسوسی ایشن کے صدر شری رمیش چندر استھانہ نے جلسہ کی صدارت کی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ باجپئی کمیٹی کی کچھ سفارشات کو لیکر اور متعدد نئے اقدامات کر کے محکمے کی نو تنظیم کی جا رہی ہے۔ تاکہ اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کیا جا سکے اور اسے ان مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جا سکے جن کے تحت آنجہانی گووند بلبھ پنت اور سابق وزیر اعلا ڈاکٹر سمپورنا نند جیسی عظیم شخصیتوں نے اس محکمے کو معرض وجود میں لانے اور اس کی تنظیم کرنے کی شدید ضرورت محسوس کی تھی۔

شری ورما نے محکمہ کے جرنلسٹوں کے مسائل کو ہمدردی سے سنا اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ان کے جائز مطالبات مناسب پیروی نہ ہونے کی وجہ سے پورے نہ ہو سکے۔

انھوں نے کہا کہ جرنلسٹوں کو ان کے فرائض منصبی کی بہتر انجام دہی کے لیے مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

وزیر اعلا کے ڈپٹی سکریٹری شری ٹھاکر پرشاد سنگھ نے کہا کہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ محکمے کے جرنلسٹ اپنے فرائض حسن و خوبی سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ منصفانہ سلوک کے مستحق ہیں۔

اس سے قبل ایسوسی ایشن کے صدر نے وزیر موصوف کی توجہ جرنلسٹوں کی مستقل ترقی تنخواہ کی شرحوں اور کام کے مناسب حالات

سے متعلق مسائل کی جانب مبذول کرائی۔

٭ ٭ ٭

ہینڈلوم کی ترقی کے لیے جامع پروگرام :- ریاستی حکومت

سیوارمن کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر ریاست میں ہینڈلوم زمرہ کی ترقی کے لیے ایک جامع پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پانچ سال کی مدت میں بنکروں کو ۔۔۔۔ ۱ ہزار کرگھوں پر ٹریننگ دے کر اور انھیں اعلا درجے کے کرگھے، سوت، رنگ اور کیمیاوی اشیا فراہم کرکے ہینڈلوم کو معیاری کپڑا تیار کرنے کی ایک اسکیم وضع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بنکروں کو کاروباری سرمایہ فراہم کیا جائے گا اور ان کے تیار کردہ مال کی بڑے پیمانے پر خرید و فروخت کے لیے انتظامات بھی کیے جائیں گے۔

اٹاوہ، فرخ آباد، منطقے میں تقریباً ۔۔۔ اکرگھوں کا احاطہ کرنے کے لیے ایک برآمدی اسکیم بھی تیار کی گئی ہے۔ میرٹھ، بلند شہر، ایٹہ اور وارانسی اضلاع میں ہینڈلوم کمپلکس قائم کیے جا رہے ہیں۔ جن میں ہتھکرگھا واحدے قائم کرنے کے لیے ۱۹۵ درخواستیں موصول ہو چکی ہیں اور سات صنعت کاروں نے اپنی پراجکٹ رپورٹیں پیش کر دی ہیں۔

ریاست میں گزشتہ ۱۵ر جون تک ۱۳۵۴ کرگھوں، اور ۱۲۴۳ بنکروں کو امداد باہمی کے دائرۂ عمل میں لایا گیا اور ریزرو بینک آف انڈیا کی اسکیم کے تحت امداد باہمی زمرے میں ۶۷ لاکھ ۴ ہزار روپے کی گارنٹیاں بنکروں کو جاری کی گئیں۔

بنکروں کی انجمنوں کو ۴ لاکھ ۵۶ ہزار روپے کا سرمایہ حصص منظور کیا گیا اور ۴۸ نئی امداد باہمی انجمن قائم کی گئیں جن میں سے چار قالین سازی کی صنعت سے متعلق ہیں۔

سوت کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اترپردیش ٹیکسٹائل کارپوریشن نے سرکاری زمرے میں آٹھ کتائی ملیں اور امداد باہمی زمرے میں دو کتائی ملیں قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔

ہینڈلوم کارپوریشن کے فروخت مرکزوں نے جولائی ۱۹۷۵ء سے ۱۵ر جون ۱۹۷۶ء تک کی مدت میں ۱۰ لاکھ ۲۷ ہزار روپے مالیت کے ہینڈلوم کپڑے فروخت کیے۔ اس کے علاوہ ایک عارضی فروخت مرکز الموڑہ میں اور دوسرا بہرائچ میں قائم کیا گیا۔

مئو، سندیلہ، گورکھپور، بارہ بنکی، رام پور اور امروہہ میں جو پیداواری مرکز قائم ہیں انھوں نے جولائی ۱۹۷۵ء سے ۱۵ر جون ۱۹۷۶ء تک کی مدت میں ۹۰۳ ہزار روپے کی مالیت کا ہینڈلوم سامان تیار کیا۔

اس کے علاوہ ہینڈلوم کارپوریشن نے بنکروں یا ان کی انجمنوں سے براہ راست ۱۳ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کا ہینڈلوم کپڑا خریدا جو کارپوریشن کے مختلف فروخت مرکزوں کے ذریعہ فروخت کیا جائے گا۔

٭ ٭ ٭

معذور بچّوں کے لیے اقامتی اسکول :- ریاستی حکومت

نے اندھے بہرے اور گونگے بچوں کے علاوہ جسمانی طور پر معذور بچّوں کی تعلیم کے لیے لکھنؤ میں ایک اقامتی اسکول قائم کرنے کی غرض سے ۔۔۔۱۶ روپے منظور کیے ہیں۔ اس اسکول میں ۵۰ بچّوں کے لیے گنجائش ہوگی۔ انھیں ہائی اسکول تک کی تعلیم مفت دی جائے گی۔ ایسے طالب علموں کو مفت قیام و طعام کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔ جن کے والدین کی آمدنی ۔۔۵ روپے ماہانہ تک ہوگی۔ البتہ جن طلبا کے والدین کی ماہانہ آمدنی ۔۔۵ روپیہ سے زیادہ ہوگی۔ انھیں قیام و طعام کے لیے ۵۰ روپے ماہانہ ادا کرنا ہوگا۔

٭ ٭ ٭

★

نقد وتبصرہ

ابرو باد (مجموعہ کلام) پیام فتح پوری۔ صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۳ روپے۔ ملنے کے پتے:۱- ادارۂ شعر و ادب ۵/۸۶ ہمایوں باغ کانپور ۲- دانش محل۔ امین آباد۔ لکھنؤ۔

"ابرو باد" مجموعہ کلام ہے مشہور و معروف اور جانے پہچانے شاعر پیام فتح پوری کا۔ اس سے قبل پیام صاحب کے دو مجموعے لالہ زار ۱۹۵۸ء اور "بیاض شبانہ" ۱۹۶۰ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ "ابرو باد" میں ۲۴ نظمیں اور ۵۸ غزلیں، چند قطعات و متفرق اشعار شامل ہیں۔ گرد پوش کے حاشیوں پر شور واحدی، قمر رئیس، احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کی آرا مجموعہ کے وزن و وقار کی ضمانت کے طور پر شریک ہیں۔ مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ دیباچہ کے طور پر پیام صاحب نے سب کچھ خود ہی تحریر کیا ہے اور رسمی دیباچہ نگاری کی روایت کو توڑا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پیش لفظ میں انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں کم اور اردو نظم و غزل کی روایت اور تاریخ سے زیادہ بحث کی ہے۔ ابرو باد کی کئی نظمیں۔ ظلم و جبر اور نا انصافیوں کے پس منظر میں شاعر کے لطیف اور نازک احساسات و خیالات کی ترجمان ہیں۔ مگر نظموں سے زیادہ پرکشش اور دلکش ان کی غزلیں ہیں جن میں جگہ جگہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو دعوت فکر و نظر دینے کے ساتھ ساتھ محسوسات کی جھلک رکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مری حیات ہے خالی مکان کی صورت
مرے حبیب تری راہ کب سے تکتا ہوں

پیام میں ہوں نئے انقلاب کا نغمہ
لہو کی طرح رگوں میں مچلتا جاتا ہوں

میں چلا تو ساتھ میرے کتنی صدیاں چل گئیں
اور دنیا نے یہی سمجھا میں تنہا چل گیا

کیوں نہ میں ایک نئی صبح کی تخلیق کروں
کس لیے ڈوبتے سورج سے اجالا مانگوں

کہاں میں گم ہوں مجھے دوستو تلاش کرو
بہت دنوں سے میں خود اپنے انتظار میں ہوں

ظلمتیں چھائی ہیں مے خانے پر
میرے ساغر سے اجالا تو ہوا

دن کے ہمراہ ہو گئے رخصت
دوست بھی روشنی کے سائے ہیں

——— ساغر مہدی

عشرتِ غم مجموعۂ کلام۔ شیو دیال سحاب۔ قیمت۔ ۶½ روپے
ملنے کا پتہ۔ سیکٹر ۲۲ چنڈی گڑھ۔

سحاب، جوش ملسیانی کے ہونہار شاگردوں میں نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی خداداد صلاحیتوں، خوش مذاقی اور فنی پختگی پہ استاد نے بھی اپنے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے:

"سحاب پیدائشی شاعر ہے اور انسانی زندگی کے دوسرے فرائض کی انجام دہی کے علاوہ خدمت شعر و ادب کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔"

سہل ممتنع میں شعر کہنا آسان کام نہیں۔ اس میں الفاظ کی شوکت اور تزئین و آرائش تو ہوتی نہیں بلکہ مضامین کی فراوانی خوب ہوتی ہے۔ بمقام اطمینان ہے کہ سحاب کے اس مجموعہ میں بیشتر غزلیں اس خوبی سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ ان کی پہلی غزل کا ایک شعر زبان کی منھ بولتی مثال بن گیا ہے ؎

ہر کسی کے لیے غمِ عشرت
عشرتِ غم کسی کسی کے لیے

مشہور طنز نگار فکر تونسوی نے سحاب کی شاعری کے متعلق بہت دلچسپ اور پتے کی باتیں تحریر کی ہیں:

"آپ سحاب صاحب کا ایک شعر پڑھ لیجئے۔ اس کے بعد سحاب صاحب کی شخصیت کو پڑھیے تو دونوں چیزیں ایک دوسرے کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیت بھی ان کا ہی ایک شعر معلوم ہوتی ہے۔ وہی ٹھہراؤ، وہی متانت، وہی سنجیدگی جو تجربے اور مشاہدے کی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے۔ وہی غور و فکر جس میں ایک صوفی کی سی نرم نرم شوخی اور ایک درویش کی سی بے نیازی شامل ہوتی ہے۔ جو سحاب صاحب کے اشعار میں ملتی ہے اس کی شخصیت کا بھی مستقل حصہ بن چکی ہے۔"

سحاب صاحب کے کلام میں خمریات کے متعلق بھی اشعار ہیں لیکن وہ شراب معرفت اور فطرت کے شیدائی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے شراب، ساقی، ساغر و مینا اور مے خانہ کی اصطلاحیں ضرور استعمال کی ہیں لیکن ان سے دنیاوی تصورات کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا بلکہ سننے والے کا ذہن حقیقی و ابدی لذت کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام:

؎ وہ روبرو ہوں تو یہ کیفِ اضطراب نہ ہو
خدا کرے نگہِ شوق کامیاب نہ ہو

؎ اس کو دیکھے گا عزا اسی کی طرح
غم کو دیکھے جو اجنبی کی طرح

؎ زندگی بھر موت سے ڈرتے رہے
کیا اسی جینے پہ ہم مرتے رہے

(رشید نظر برقی)

جلد ۳۳ نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

عُنوانات

اپنی بات

خاندانی منصوبہ بندی ہمارے ملک کی ترقی اور معیشت کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہے۔ گزشتہ ۲۵ برس میں ہندستان کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھ گئی ہے کہ اگر اس کی روک تھام فوراً نہ کی گئی تو ہمارے تمام ترقیاتی منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہوگی کہ دنیا کی آبادی کا ۱۴ فی صد سے زیادہ حصہ ہندستان میں آباد ہے جبکہ ہمارے ملک کا زمینی رقبہ دنیا کے کل رقبے کا صرف ۲ فی صد ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ملک کی آبادی کے بڑھنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر سال ہمارے یہاں ایک آسٹریلیا پیدا ہو رہا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں اب ہر شخص بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی کی سنگینی کو محسوس کرنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں عوام زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اور عملی تعاون دے رہے ہیں جس کے نتیجے میں مرکزی حکومت نے اتر پردیش کے لیے اس سال ۴ لاکھ کا جو نشانہ مقرر کیا تھا اس کو نہ صرف پورا کر لیا گیا ہے بلکہ ہم اس سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن یہ انتہا نہیں آغاز کار ہے۔ چنانچہ یہ پروگرام پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا جا رہا ہے اور پوری امید ہے کہ خود پردیش نے اپنے لیے ۱۵ لاکھ کا جو نشانہ مقرر کیا ہے وہ پورا کر لیا جائے گا۔ کوئی مذہب خاندانی منصوبہ بندی کا مخالف نہیں۔ لیکن بعض مفاد پسند عناصر طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر اس پروگرام کے خلاف عوام میں بدظنی پھیلانے اور اسے ناکام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک کھیل ہے جو ملک کی ترقی اور خوش حالی کے ساتھ یہ عناصر کھیل رہے ہیں۔ حکومت ان سے سختی سے نمٹنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان شرارت پسندانہ چالوں کو سمجھیں اور انھیں ناکام بنانے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں نس بندی کو قانوناً لازمی قرار دینے کا مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن حکومت اس سلسلے میں کسی جبر اور زبردستی کو روا رکھنے کے حق میں نہیں ہے بلکہ پرچار کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کی افادیت کو ذہن نشین کرنے اور ترغیب و تحریک سے کام لینے پر زور دے رہی ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے ۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء تک قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں ایک پندرہ روزہ خصوصی ثقافتی پروگرام کا اہتمام اور ایک نمائش کا انعقاد کیا گیا تھا۔ وزیر اعلا اتر پردیش نے اس پروگرام اور نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاست کے تقریباً ۵۰ ترقیاتی بلاکوں کو کنبہ بندی پروگرام میں ان کی کارگزاری کی بنیاد پر گرانٹ دی جائے گی۔ اسی طرح کنبہ بندی پروگرام کو اپنانے کے لیے متعدد ترغیبات سے متعلق قواعد و ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ حکومت جبر اور زبردستی سے کام نہیں لینا چاہتی۔

گاندھی جی نے کہا تھا "روز افزوں مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے ہی میں انسان کی آئندہ ترقی کا راز مضمر ہے۔" آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ جس کی سنگینی بڑھتی جا رہی ہے اضافہ آبادی کا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر قابو پا لینے پر ہمارے اقتصادی استحکام، غربت و افلاس کے خاتمے، اخلاقی اقدار کے بلند ہونے اور ترقیاتی کوششوں کے بارآور ہونے کا انحصار ہے۔ گاندھی جینتی کے اس موقع پر اگر خاندانی منصوبہ بندی پر عامل ہونے کا عہد کر کے ہم اسے پورا کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں تو قوم کے باپو نے انسان کی آئندہ ترقی کی جو کسوٹی ہمارے سامنے رکھی ہے ہم اس پر پورے اتریں گے ـــ اور یقیناً یہ ہمارے لیے بڑی سعادت ہوگی۔

آہ قاضی نذرالاسلام قاضی نذرالاسلام کا شمار یقیناً دنیا کے ان چند عظیم المرتبت شعرا میں کیا جائے گا جن کے انقلابی نغموں کو ہماری آنے والی نسلیں کبھی نظر انداز نہ کر سکیں گی۔ برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کا یہ بلند پایہ شاعر ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے لاکھوں پرستاروں کو داغ مفارقت دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دار فانی کو کوچ کر گیا۔ قاضی صاحب جن کو عرف عام میں نذرل کے نام سے پکارا جاتا تھا، سامراج، مذہبی عصبیت اور چھوت چھات کے سخت دشمن تھے۔ بنگلہ زبان نے دو عظیم شاعر پیدا کیے۔ ایک رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے قاضی نذرالاسلام۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک بار ٹیگور نے نذرالاسلام سے کہا تھا "نذرل! تم بہت بڑے شاعر ہو۔ بنگالی شاعری کو تم پر ناز ہے۔ لیکن تم سیاست سے دور رہ کر ادب اور صرف ادب کی خدمت کرو تو بہت اچھا ہو۔" ٹیگور کی اس بات پر نذرالاسلام نے جواب دیا تھا: "یہی بات مجھ سے نہ کہئے گورو دیو۔ میں دوسروں کو جس راہ پر چلنے کی ترغیب دیتا ہوں اس پر خود بھی چلتا ہوں۔" "ودروہی" نذرل کی وہ شہرۂ آفاق نظم ہے جس نے بنگال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آزادی کی زبردست لہر پیدا کر دی تھی۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ آگ اگل رہا تھا۔ اسی لیے برطانی حکومت نے اس نظم کو ضبط کر لیا تھا۔ قاضی نذرالاسلام بظاہر ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن ان کے انقلابی نغمے اور باغیانہ ترانے ہمارے سوئے ہوئے دلوں کو ہمیشہ بیدار کرتے رہیں گے۔ قاضی نذرالاسلام جیسے عظیم المرتبت شاعر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جاں نثار اختر اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر جاں نثار اختر کا ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو بمبئی میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے صف اول کے شعرا میں کیا جاتا رہا ہے۔ جاں نثار اختر نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور رباعیاں بھی اور ان اصناف میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں، لیکن ان کا اصل میدان غزل کا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں غزل کے مزاج داں تھے۔ جاں نثار اختر ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں ان کے والد مضطر خیرآبادی بہ سلسلۂ ملازمت سکونت پذیر تھے۔ مضطر کا تعلق اودھ کے مردم خیز قصبہ خیرآباد کے مشہور خانوادہ علم و ادب سے تھا جس نے غالب کے یار غار اور مجاہد وطن مولانا فضل حق خیرآبادی جیسی عظیم شخصیت پیدا کی ہے۔ مضطر ایک باذوق اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ جاں نثار اختر نے شاعری اپنے والد بزرگوار سے ورثے میں لی تھی۔ جاں نثار اختر سے لکھنؤ کا بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ ان کی پہلی شریک حیات صفیہ، شاعر شہر نگاراں مجاز مرحوم کی بہن تھیں۔ صفیہ کے انتقال کے بعد جاں نثار نے دوسری شادی بھوپال میں کی تھی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ جاں نثار کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو خاک دل، پچھلے پہر، اور گھر آنگن کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ ان کے شعری کارنامے موضوع و مواد اور زبان و اسلوب کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی انفرادیت سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے انتقال سے اردو ادب اور شاعری کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نظر نہیں آتی ہے انھوں نے اپنے بارے میں تو یہی کہا ہے ؎ ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو ٭ غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے ـــ ایڈیٹر

فراق گورکھپوری

غزل

وعدے کی رات مرحبا آمدِ یارِ مہرباں — زلفِ سیاہ شب فشاں، عارضِ نازمہ چکاں

برقِ جمال میں تری خفتہ سکونِ بیکراں — اور مرا دلِ تپاں آج بھی ہے تپاں تپاں

میری نگاہِ شوق میں آئینہ ہو گیا جہاں — خالِ رخِ حسیں نہ تھے آنکھوں کی تھیں وہ پتلیاں

چھیڑ کے داستانِ غم اہلِ وطن کے درمیاں — ہم ابھی بیچ ہی میں تھے اور بدل گئی زباں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس — یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں

اپنی غزل میں ہم جسے کہتے رہے ہیں بار بار — وہ تری داستاں کہاں وہ تو ہے زیبِ داستاں

کوئی نہ کوئی بات ہے اس کے سکوتِ یاس میں — بھول گیا ہے سب گلے آج تو عشقِ بدگماں

رات کمال کر گئیں عالمِ کرب و درد میں — دل کو مرے سلا گئیں تری نظر کی لوریاں

سرحدِ غیب تک تجھے صاف ملیں گے نقشِ پا — پوچھ نہ یہ پھرا ہوں میں تیرے لیے کہاں کہاں

کہتے ہیں میری موت پر اس کو بھی چھین ہی لیا — عشق، کہ مدتوں کے بعد ایک ملا تھا ترجماں

رنگ جما کے اٹھ گئی کتنے تمدنوں کی بزم — یاد نہیں زمین کو بھول چکا ہے آسماں

عارضیت کا سوز بھی دیکھ تو سوزِ عارضی — بیتے ہوئے جگوں سے پوچھ کس کو ثبات ہے یہاں

کوئی نہیں جو ساتھ دے تیرے حریمِ راز تک — بکھرے ہوئے مہ و نجوم دیتے ہیں سب ترا نشاں

جس کو بھی دیکھیے وہی بزم میں ہے غزل سرا — چھڑ گئی داستانِ دل بہ حدیثِ دیگراں

پا نہ سکا تجھے کہیں اے مری جانِ آرزو ڈھونڈھ لیا عدم عدم دیکھ لیا جہاں جہاں

ایک حقیقتِ وجود کچھ نہیں جس کے ماسوا گاہ وہی یقیں یقیں گاہ وہی گماں گماں

بیت گئے ہیں لاکھ جگ سوئے وطن چلے ہوئے پہنچی ہے آدمی کی ذات چار قدم کشاں کشاں

پاؤں سے فرقِ ناز تک برقِ تبسّمِ نشاط حُسن چمن فروش کو دیکھ جہاں سے گلستاں

دادِ سخن وری ملی ابروِ ناز اُٹھ گئے ہے وہی داستانِ دل حُسن بھی کہہ اٹھے کہ ہاں

جیسے کھلا ہوا گلاب چاند کے پاس لہلہائے رات وہ دست ناز میں جامِ نشاطِ ارغواں

رازِ وجود کچھ نہ پوچھ صبحِ ازل سے آج تک کتنے یقین چل بسے کتنے گزر گئے گماں

تجھ سے یہی کہیں گی کیا گزری ہے مجھ پہ رات بھر جو مری آستیں پہ ہیں تیرے غموں کی سُرخیاں

حُسنِ ازل کی جلوہ گاہ آئینۂ سکوتِ راز دیکھ تو ہے عیاں عیاں پوچھ تو ہے نہاں نہاں

دُور بہت زمین سے پہنچی ہے اک کرن کی چوٹ نیم تبسم خفی رہ گئیں پس کے بجلیاں

کتنے تصورات کے، کتنے ہی واردات کے لعل و گہر لٹا گیا دل ہے کہ گنجِ شائیگاں

سینوں میں درد بھر دیا چھیڑ کے داستانِ حُسن آج تو کام کر گئی عشق کی عمرِ رائیگاں

آہ فریب رنگ و بو اپنی شکست آپ ہے بعدِ نظارۂ بہار بڑھ گئیں اور اُداسیاں

اے مری شامِ انتظار کون یہ آ گیا لیے زلفوں میں اک شبِ دراز آنکھوں میں کچھ کہانیاں

مجھ کو فراقؔ یاد ہے پیکرِ رنگ و بوئے دوست
پاؤں سے تا جبینِ ناز مہر فشاں و مہ چکاں

★

حضور سہسوانی

حضرت جوش ملسیانی

حضرت داغ دہلوی کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر کے ہزاروں تک جا پہنچی تھی. جن میں ایک سے ایک بہتر اور رفیع شاعر ہوا ہے اور تقریب قریب سب کے سب فنکارانہ حیثیت کے مالک تھے حضرت نوح ناروی جو حضرت داغ مرحوم کے جانشین کہے گئے اور ایک بلند مرتبہ شاعر تھے. جنہیں تاج الشعرا اور ناخدائے سخن وغیرہ القاب سے نوازا گیا اور فنی اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتے تھے ان کا ارشاد گرامی ہے کہ حضرت داغ کے تلامذہ میں منتہی فن دو ہی ہوئے ایک تو حضرت مولانا احسن مارہروی اور دوسرے حضرت جوش ملسیانی۔!!

حضرت احسن نے ۱۸۹۳ء میں مرزا داغ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ۱۸۹۷ء میں ان کے پاس حیدر آباد تشریف لے گئے، جہاں کئی برس ان کی صحبت میں رہ کر اپنے ذوق شعری کا تکملہ کیا۔

جوش ملسیانی ۱۹۰۲ء میں داغ مغفور کے شاگرد ہوئے اور خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں حضرت داغ کا انتقال ہو گیا. اس کے بعد آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ہمیشہ اپنے ہی ذوقِ صحیح کی رہنمائی پر بھروسہ کیا. اگرچہ حضرت جوش کا زمانہ شاگردی بہت مختصر رہا تاہم آپ نے اپنے ذوق سلیم کی بدولت کافی استفادہ حاصل کیا یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں داغ کی سی سادگی و برجستگی محاکات و اندازِ بیان میں بے ساختہ پن، محاورات، ضرب المثال اور روزمرہ کا مناسب استعمال بندش کی چستی، لطفِ زبان، معنی آفرینی، تشبیہات، استعارات اور اشارات وکنایات بکثرت موجود ہیں. جہاں کہیں استاد کے رنگ میں قلم اٹھایا ہے تو بس یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرت داغ بول رہے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

زمانے کی باتوں میں آنا بُرا ہے
بُرے تم نہیں ہو زمانہ بُرا ہے

وہ اب اپنا منھ بھی چھپانے لگے ہیں
کہا تھا کہ آنکھیں دکھانا بُرا ہے

خدا جانے گزری ہے کیا آج ان پر
وہ خود کہہ رہے ہیں زمانہ بُرا ہے

دعاؤں میں ہوگا اثر ہوتے ہوتے
شبِ غم کی ہوگی سحر ہوتے ہوتے

گلہ لب پہ اے دل نہ لانا تھا ہرگز
ستم بھی اگر جان پر ہوتے (ہوتے)

جوش نے اپنی نفاست پسندی، حسنِ مذاق اور ذوقِ سلیم کے تحت اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کرلی تھیں اور اپنی زبان کو اس قدر سلیس، عام فہم اور صاف بنالیا تھا کہ جس کی مثال شاذ و نادر ملتی ہے. آپ اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ایک مشاق اور قادر الکلام شاعر ہونے کی وجہ سے آپ کی توجہ کسی ایک ہی صنف پر مرکوز نہ تھی. بلکہ آپ نظم غزل، قطعہ، رباعی، قصیدہ، تخمیس، تضمین، سلام، ترجیع بند مرثیہ، تاریخ، اور خمریات وغیرہ جملہ اصنافِ سخن پر طبع آزمائی فرماتے

تھے۔ آپ نے جس موضوع پر بھی جو کچھ کہا ہے حقیقت میں حق ادا
کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہم نے زمینِ شعر کو زرخیز کر دیا
جو نخل بو دیا وہی گل ریز کر دیا

آپ کا یہ شعر شاعرانہ بات نہیں بلکہ حق و صداقت پر مبنی
ہے۔ لیکن دراصل آپ غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ اردو
شاعری میں رباعی کے بعد غزل ہی مشکل ترین چیز ہے۔ رباعی گو
شاعر ہر دور میں کم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اچھا رباعی گو بننے کے لیے
چالیس پچاس برس کی مشقِ سخن کی ضرورت بتائی جاتی ہے غزل
گوئی بھی مشکل فن ہے۔ اس کے لیے بھی اچھی علمی استعداد، اور گہرے
مطالع و مشاہدے کے ساتھ ساتھ نفاست و نزاکتِ زبان اور معرفت
فصاحت و بلاغت نیز پاکیزگیٔ تخیل اور رازشناس مزاجِ غزل
ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن اس کے کہنے والے جس قدر نظر
آئیں گے کسی دوسری صنفِ سخن میں اس کا بیسواں حصہ بھی
دکھائی نہ دیں گے۔ مگر اچھے غزل نگاروں کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔
مختصر یہ کہ غزل گوئی ہر دور میں شعراء کو محبوب رہی ہے شاید
اسی لیے اسے عروسِ سخن کہا جاتا ہے۔ اگرچہ نظم بھی مسلسل اظہار
خیال کے لیے ایک اچھی صنفِ سخن ہے۔ مگر اس کے اثرات محض وقتی
ہوتے ہیں جب کہ صدیوں پہلے کہی گئی غزلوں میں آج بھی پہلی
سی تازگی پائی جاتی ہے۔ ولی دکنی، جیدا بائی، حاتم، شاہ نصیر
وغیرہ کسی بھی قدیم شاعر کی غزل گنگنا کر دیکھئے یہی محسوس ہوگا
جیسے یہ ابھی تخلیق کی گئی ہو۔ بہ لحاظ تخیل ـــ بہ لحاظ زبان نہیں۔
ایک کامیاب غزل گو میں جن خوبیوں اور صلاحیتوں کا ہونا
ناگزیر ہے جوشؔ میں وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود
ہیں۔ ان کے اشعار سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان کے کلام
کی روانی میں گنگ و جمن کا بہاؤ ہے جو پہاڑ سے میدان کی طرف
اترنے میں ہوتا ہے۔ ان کی خوش بیانی سے روح شادمانی و مسرت
سے لبریز ہو جاتی ہے ان کے مضامین کی گرمی دلوں میں حرارت
پیدا کرتی ہے۔ آپ نے کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی ٹکسالی زبان
میں فصاحت و بلاغت کے ایسے دریا بہائے ہیں کہ دلی اور لکھنؤ والے
بھی غرقِ حیرت ہو گئے ہیں۔ روزمرہ کی باتوں کو اس انداز سے نظم کیا
ہے کہ ان میں جدت و ندرت پیدا ہو گئی ہے۔

آپ کا کلام محاسنِ سخن سے آراستہ و پیراستہ ہے آپ کی شاعری
واقعیت کے ساتھ ساتھ صاف، سلیس، سہل اور دل نشین اسلوب
اور طرزِ بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے لفظی مناسبت، جذباتی ہم آہنگی اور
آسودہ لیکن پرسکون بہاؤ کے امتزاج سے وہ بعض اوقات ہمیں
ان غنائی وادیوں کی سیر کراتے ہیں جن کا تعلق قلم یا جذبات سے
زیادہ وجدان سے ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میرے بیان کی صداقت
کے ضامن ہیں۔

آئینے کو بھی نہیں اس جلوۂ تاباں کی تاب
آپ نے پانی کو بھی آتش بداماں کر دیا

صحرا سے اے جنوں مجھے انکار تو نہیں
لیکن اگر وہاں بھی گزارا نہ ہو سکا

زندگی و مرگ دونوں میں قرینا آ گیا
جس کو مرنا آ گیا سمجھو کہ جینا آ گیا

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائے گی

ہمیں تو کر دیا خاموش تم نے
مگر روکو گے کس کس کی زباں کو

جنوں کے ہر انداز میں ہے تغزل
یہ دیوانگی ہے کہ دیوان اپنا

ابھی عرض کرتا ہوں رودادِ وحشت
ذرا چاک کر لوں گریبان اپنا

منظرِ تصویرِ دردِ دل مٹا سکتا نہیں
آئینہ پانی تو رکھتا ہے پلا سکتا نہیں

داغؔ کے گھر ملنے کا یہ سبق ہے کہ آسان الفاظ میں اونچی بات
کہو۔ جوشؔ کے یہاں اس چیز کی افراط ہے۔ آپ نے حسنِ بیان، اور
حسنِ زبان کا بھی خاص طور پر خیال رکھا ہے علاوہ بریں آپ کے لہجے

شہد ایسی مٹھاس، پھولوں ایسی ملائمیت اور کلیوں ایسی لطافت و نفاست ہے۔

دل ہمارا غم سے کب خالی رہا   اپنا بھر تارات دن بھرتے رہے

دور کر دیتا ہے راہِ شوق کی تاریکیاں
شمع بن جاتا ہے ہر پروانہ جل جانے کے بعد

کیوں کیا دیر سے حرم کا سفر
تو وہاں بھی نہ تھا یہاں بھی نہیں

اب اتنے پریشان ہوتے ہو کیوں   تمھیں نے تو پہلے شروعات کی
کرم میں تجلی کا یا رب اثر کیوں   بنایا زندگی کو مختصر کیوں
بہت معصوم تھیں ان کی نگاہیں   زمانہ ہو گیا زیر و زبر کیوں

تمنا خود تمنا کا ثمر ہے
اسے کہیے نہالِ بے ثمر ہے

جناب جوش اپنی کتاب "آئینہ اصلاح" میں لکھتے ہیں:

"صحت زبان کے بعد شعر کی دوسری خوبی حسن بندش ہے۔ مضمون میں لطافت بھی ہو شعریت بھی ہو۔ زبان بھی فصیح اور ٹکسالی ہو۔ پھر بھی حسنِ بندش کے بغیر شعر بے لطف رہتا ہے۔"

ع   چست جب بندش نہ ہو لطفِ بیاں آتا نہیں

موصوف کے اشعار دوسری شعری خوبیوں کے ساتھ ساتھ حسن بندش کا بہتر نمونہ ہیں:

ناخدا! غافل، ہوائیں تند، موجیں ہولناک
وہ تو قسمت تھی کہ ساحل پر سفینا آ گیا

رنجِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، یادِ غم، فکرِ نجات
ایک جانِ ناتواں پر سو عذابِ زندگی

عقل بھی رکھتا تھا، طاقت بھی، پرِ پرواز بھی
پھر یہ کیا سوجھی کہ طائر زیرِ دام آ ہی گیا

وہ لطف ہی نہیں اب وہ بات ہی نہیں اب
یا میں بدل گیا ہوں یا تو بدل گیا ہے

آگے فرماتے ہیں:

"شعر کی زبان بول چال سے پوری مطابقت رکھتی ہو۔ یا بول چال کے قریب ہو اور شعر حشو و زوائد سے اس حد تک پاک ہو کر کوئی لفظ نثر بناتے وقت کم نہ کیا جا سکے اور ان کی ترتیب و تناسب بھی ترنم یا موسیقیت کے معیار پر ہو ایسی ٹھوس بندش ہی کو حسن بندش کہا جا سکتا ہے۔ سہل ممتنع سے بھی یہی مراد ہے کہ شعر کی نثر نہ بن سکے۔"

عدم کی مسافت ہو کیوں بار ہم کو
کفن کے سوا کیا ہے سامان اپنا

غم کی بھرمار ہوئی جاتی ہے   زندگی بار ہوئی جاتی ہے
موت کے دھوکے میں ہم کیوں آ گئے   زندگی کا بھی مزا جاتا رہا

جب سے تو نے دشمنی کی اختیار
اعتبارِ دوستی جاتا رہا

حضرت جوش کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ میں ایک آدھ لفظ ایسا شامل کر دیتے ہیں جس سے شعر میں بے پناہ پہنائیاں اور وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس سے شعر کے ایک مرقع میں ان گنت، محاکاتی شکلیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً

عنایت بہت ہو چکی زخمِ دل پر
اٹھا لو خدا را نمک دان اپنا

اے دلِ دردآشنا، خط کا جواب سن لیا
اور تو بے قرار ہو اور تو انتظار کر

کس گنہگار کو یقین نہیں   اتنے قول و قرار کیا معنی
یاد آتا ہے تبسم ان کا   سانس تلوار ہوئی جاتی ہے
اے شیخ اگر خلد کی تعریف یہی ہے   میں اس کا طلبگار کبھی ہو نہیں سکتا
دل کو کل تک تو چین حاصل تھا   آج کیا ہو گیا خدا جانے

رنج، غم، درد، آرزو، حسرت
یہ کہیں پنجۂ قضا تو نہیں

اشعار مرقومہ بالا میں ہر ایک شعر اپنے دامن میں معانی و مطالب کا ذخیرہ چھپائے ہوئے ہے۔ کسی ایک شعر کا بھی مفہوم

بیان کیا جائے تو کتنی ہی سطور درکار ہوں گی

خمریات، حضرت داغ اور ان کے تلامذہ کا خاص موضوع رہا ہے۔ جوش نے بھی رندی و سرمستی کے بہت سے مضمون باندھے ہیں جنھیں پڑھ کر ذہن پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور قاری یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان اشعار کا خالق یقیناً پرلے درجے کا مے نوش ہوگا۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساقی مجھے دو گھونٹ پہ ٹالا ہے جو تو نے
دل بھی مرا توبہ کی طرح ٹوٹ گیا ہے

حشر میں تھا نامۂ اعمال سب کے ہاتھ میں
میرے ہاتھوں میں مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

وہی رندی ہے جس کے ساتھ شانِ پارسائی ہو
وہ مے کیا دامنِ تقوی میں جو چھانی نہیں جاتی

بات رندی کی مجھ کو آتی ہے
پارسائی کی پارسا جانے

داد کے قابل ہیں اس کی مصلحت اندیشیاں
جس نے توبہ توڑ ڈالی ہو گھٹا کو دیکھ کر

جناب جوشؔ کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی کی طرح جدت کو بھی بڑا دخل ہے۔ ذیل کے اشعار جہاں آپ کی جدت طرازی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ وہاں آپ کی فنکارانہ عظمت کو بھی واضح کرتے ہیں۔:

میری ہر مشکل کو محسن بن کر آساں کر دیا
حق تو یہ ہے موت نے جینے کا ساماں کر دیا

گریۂ شرم گنہ سے اور رسوائی ہوئی
داغ عصیاں میں نے دھو دھو کر نمایاں کر دیا

ہر وقت التجائیں خدا کی جناب میں
کہتے ہیں جس کو عشق عبادت سے کم نہیں

لٹ گئیں جب آرزوئیں، دشمن جاں ہو گئیں
ان کی بے سامانیاں بھی حشر ساماں ہو گئیں

بزرگ ہیں جلالی صورتیں رندوں کی اے زاہد
فرشتے بن گئے یہ لوگ مے خانوں میں رہ رہ کر

حضرت جوشؔ نے سنگلاخ اور خشک زمینوں میں بھی گل کھلائے ہیں۔ اور اسے موصوف کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی ہی کہا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی
دیکھ لو زور ہیں موجود ہے زر پیدا

ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کون
جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر پیدا

اشارہ تک نہ لکھا اس نے کوئی ربط باہم کا
بہت بے ربط ہے خط کا جواب اوّل سے آخر تک

میسر خاک ہوتا زندگی میں لطف تنہائی
رہے دو دو فرشتے ہم رکاب اول سے آخر تک

حضرت جوشؔ کے اشعار برائے بیت نہیں ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں تجربات، مشاہدات، آپ بیتی اور جگ بیتی کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نیز آپ نے مضمون اور بیان دونوں کی پیچیدگیوں سے احتراز کیا ہے۔ دقت پسندی اور فارسیت کی فضول بھرمار آپ کے نزدیک علمیت کا نشان نہیں بلکہ ایک قابلِ ترک لغویت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اپنے بچوں کو یہ ناگن مار کے خود کھا جاتی ہے
کس برتے پہ دنیا والے دنیا دنیا کرتے ہیں

انجامِ بقا تو ظاہر ہے انجام بقا پر بحث نہ کر
ہر سانس خبر دیتی ہے تجھے ہستی کے ہوا ہو جانے کی

ہر گام پہ آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے
ہستی مری نظروں میں گناہوں کی سزا ہے

حضرت جوش ملسیانی ہماری پرانی تہذیب کے آئینہ دار۔ اسلیے آپ کا شمار باقیات صالحات" میں تھا۔ موصوف نے تقریباً اسّی برس اردو ادب اور شاعری کی بے لوث خدمت کی۔ اردو کی نوک پلک سنوارنے اور اسے نکھارنے میں جو محنت

آپ نے کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ آپ نے کلام میں رطب ویابس کی صفائی کی اور متروکات کی سختی سے پابندی کی۔ موصوف اپنی خوش بیانی اور ترزبانی کے لیے اپنا جواب آپ تھے۔ آپ نے ملک کو بڑے بڑے قابل شاگرد بہ کثرت دیئے ہیں۔

موصوف صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے، ایک مستند ادیب اور ایک مایۂ ناز نقاد بھی تھے۔ بادۂ سرجوش، جنون و ہوش، فردوسِ گوش، دعوت عمل" کے علاوہ آپ کا مجموعہ کلام اور شائع ہو چکا ہے۔ "آئینہ اصلاح" میں چار سو سے بھی زیادہ اصلاحات مع توجیہ درج ہیں اور ایک نہایت جامع اور ادبی مضمون بھی شامل ہے۔ جس سے اصلاحات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب مبتدیا اور نومشق شعرا کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ "شرح دیوان غالب" آپ کی ایک معرکہ آرا تصنیف ہے۔ دستور القواعد" ایک کارآمد درسی کتاب ہے۔ "مجموعۂ مضامین" (دو حصّے) آپ کے ادبی مضامین کا مرقع ہے۔ اس کے علاوہ متعدد کتابوں میں جوش کے دیباچے، مقدمے اور تقریظیں، ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔ "جوش ملسیانی یا ابھیندن گرنتھ" (نذرنامہ یا پیش کش نامہ) پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک یادگار کتاب ہے۔ جو بزم ادب پنجاب، جالندھر نے ان کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات پر انھیں ۱۹۵۸ء میں پیش کی تھی۔

اس ضخیم کتاب میں ملک کے تقریباً تمام وزرا، مشاہیر شعرا اور ادبا کے پیغامات تہنیت ہیں جن میں آپ کی خدمات کو خلوص دل کے ساتھ سراہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی شخصیت اور فن پر مشاہیر کے مقالات ہیں۔ اس کے بعد آپ کے شاگردوں، اور شاگردوں کے شاگردوں کا نمونہ کلام اور مختصر حالات زندگی درج ہیں۔

آخر میں موصوف کا ایک مقطع، جو ان کے بارے میں عام خیال کا ترجمان ہے درج کر دینا ضروری ہے:

انکار کیجیے نہ کمالات جوش سے
کم گو سہی مگر وہ سخن در ضرور تھا

★

غزل

حرمت الاکرام

کیا پکارے گی مجھے سطوت جم کی نگری
میں کہاں اور کہاں جاہ و حشم کی نگری

کہیں پگھلی ہے دو اک روز میں زنجیر وجود
مدتوں دیتی ہے آواز، عدم کی نگری

کس لیے ہو کوئی آوارۂ صحرائے خیال
دل ہی اللہ کا گھر دل ہی صنم کی نگری

درد سینوں سے گیا نور جبینوں سے گیا
کیا کرے، کس سے کہے دیر و حرم کی نگری

راز بوالہوسوں کو ملتا نہیں اتنا بھی سراغ
کن خرابوں میں ہے روپوش ارم کی نگری

دل مجروح! فقط اپنے ہی زخموں کو نہ گن
آسماں بھی ہے سجائے ہوئے غم کی نگری

جھلملاتے ہوئے تاروں سے نہ کھیلو حرمت
محفل آرا ہے پس پردۂ عدم کی نگری

عبدالرشید

فنِ سیرت نگاری

— اور —

جیمس باسول کی لائف آف جانسن

ہر زمانے کا بڑا شاعر یا مصنف مقبول و محبوب ہوتا ہے۔ محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کی زندگی کی دلنواز باتیں اور یادیں اس کے بعد بھی بطور یادگار باقی رکھی جائیں۔ سیرت نگاری کا اصلی محرک یہی داعیہ انس و محبت ہے جس کو ایک باکمال سیرت نگار اپنے ناظرین کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

بڑے آدمیوں کے محاسن و کمالاتِ ذاتی کا ذکر سن کر ہمارے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم اس کے زمانے میں ہوتے اور دیکھتے کہ وہ بڑا آدمی کہاں اور کس طرح رہتا تھا۔ اس کے روزمرہ کے مشاغل کیا تھے، کن لوگوں کے ساتھ وہ اٹھتا بیٹھتا تھا، زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے وہ کیونکر متاثر ہوتا تھا، اس کی شکل و شباہت کیسی تھی، ؟ اس کے پسندیدہ مشغلے کیا تھے،

باسول کی معروف و مشہور تصنیف لائف آف جانسن (LIFE OF JOHNSON) اسی تمنائے مشاہدہ وہم عصری کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ جیمس باسول نے ڈاکٹر سیموئل جانسن کی سیر و کردار کا ایسا ہو بہو نقشہ پیش کیا ہے کہ سیرتِ جانسن کا مطالعہ کرنے والے محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ بھی جانسن کی ادبی مجلسوں میں شریکِ صحبت ہیں باسول نے سیر نگاری کا ایک نیا باب کھولا۔ اس نے ڈاکٹر جانسن کی شخصیت کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اس کا کوئی رُخ نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا جانسن کی سیرت و کردار کو ان ہی کے دلچسپ مکالمات و مقالات کے اقتباسات کی صورت میں پیش کیا ہے جن میں سے ہر ایک مقالہ بجائے خود مکمل ہے، ایک دوسرے پر منحصر نہیں۔ ہر اقتباس ایک دریچہ ہے جہاں جانسن کی شبیہ اپنی مخصوص وضع و قطع میں نظر آتی ہے۔

کسی سیر یا سوانح عمری کی خوبی کا دار و مدار صاحبِ سیرت کے محاسنِ ذاتی پر اتنا نہیں ہے جتنا کہ خود سیرت نگار کے ذوقِ سلیم اور شعور انتخاب پر۔ سیر نگاری کی اولین غرض و غایت انبساطِ خاطر اور دلچسپی ہے اور افادۂ روحانی یا اصلاحِ اخلاقی اس کا ضمنی فائدہ ہے۔ جن سیرت نگاروں نے اس مقصد کو نظر انداز کر دیا ہے ان کی تالیفات مایوس کن حد تک بے لطف اور بے کیف ہیں۔

سیرت یا سوانح عمری سے متعلق عام تصنیفات جو عموماً امراء و سلاطین یا علماء و مشائخ دین یا شعراء و مصنفین کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہیں ان میں بادشاہوں اور امیروں کی اصلاحاتِ ملکی و مہماتِ سیاسی کا ذکر ہوتا ہے۔ علماء و مشائخ کے سوانح حیات میں ان کے علمی و تبلیغی کارنامے تفصیل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ اولیاء اللہ کے ذکر کے ساتھ ان کا زہد و تقویٰ، ان کی ریاضت و عبادت، تجرد و کرامت کے ایسے واقعات مذکور ہوتے ہیں جو عوام الناس کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں ان سوانح عمریوں میں بشریت کے تقاضے اور حیاتِ انسانی کے نشیب و فراز جن کا لُبِّ لباب گلستانِ سعدیؒ کے باب سیرتِ درویشاں کا یہ شعر ہے ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کہیں نظر نہیں آتے۔ زندگی میں اختلافِ احوال اور تناقضِ کردار عین مقتضائے فطرت ہے۔ بزرگوں اور باکمال لوگوں کی سیرت میں بڑی دلچسپی کی چیز ہے لیکن اکثر تذکرہ نویس ان حالات کو نظر انداز

کر دیتے ہیں۔ باسول کی لائف آف جانسن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اس نے اپنے ہیرو کی عظیم شخصیت اور اس کے کردار کی بلندی کا تذکرہ کیا ہے وہاں اس کی بعض خلقی کمزوریوں کو بھی منظر عام پر لایا ہے جو بجائے خود دلچسپ ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باسول کا ممدوح کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ایک انسان ہے اور کوئی انسان تمام عیوب بشری سے بالکل پاک و مبرّا نہیں ہو سکتا۔ ان بعض فطری خامیوں کے بالمقابلہ ڈاکٹر جانسن کی ذاتی خوبیوں کی آب و تاب اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ باسول اپنے محبوب ڈاکٹر کو ان کی مخصوص وضع قطع کے ساتھ دوبارہ زندگی دے کر زندوں کی محفل میں کھڑا کرتا ہے اور ان کو چلتا اور بولتا ہوا دکھاتا ہے۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر سیموئل جانسن کے نام کے ساتھ ان کے سیرت نگار جیمس باسول کا نام بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

باسول کو جانسن کی صحبت کا فیض بیس سال تک حاصل رہا۔ اس طویل مدت میں اس نے اپنے ممدوح کی زبان سے نکلا ہوا ہر علمی نکتہ، ہر لطیفہ بلکہ ان کی زبان و قلم کا ہر چبھتا ہوا فقرہ نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اہل علم کے ساتھ جانسن کے مفید دلچسپ مکالمے، جانسن کا مردانہ کردار، ان کی عظیم اخلاقی خوبیاں، ان کے قومی مذہبی رجحانات، ان کا طریق بحث و استدلال، ان کی نکتہ سنجی، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی، ان کی ظاہری طبعی خشونت اور باطنی مہر و محبت، ان کا وہ عجیب و غریب کنبہ جس میں اندھے، اپاہج، لنگڑے اور ادنیٰ طبقہ کے افراد شامل تھے، ان کا غیر معمولی جُثّہ، ان کی مخصوص وضع قطع، ان کا ممتاز لباس یہ سب چیزیں باسول نے ایسی وضاحت اور آب و تاب کے ساتھ پیش کی ہیں کہ ہر طبقہ کے ناظرین ڈاکٹر جانسن سے اسی طرح شناسا ہو گئے ہیں جیسے اپنے ہی خاندان کے کسی فرد سے۔

تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ فن سیرت نگاری میں باسول کی تصنیف اپنا جواب نہیں رکھتی۔ لارڈ مکالے کا مشہور مقولہ ہے کہ سیرت نگاری کے میدان میں باسول کو اپنے حریفوں پر ایسی فضیلت و سبقت حاصل ہے کہ اس کے نام کے ساتھ اوروں کا ذکر کرنا بھی بے محل ہے۔

سیرت جانسن کی ہر عہد میں مقبولیت کے خاص اسباب اس کے مصنف کا خلوص و انکسار اور راست بیانی ہیں۔ باسول نے جانسن کی زندگی کا کوئی واقعہ بغیر عینی شاہد و ثبوت کے کتاب میں درج نہیں کیا ہے۔ جانسن کی تقریروں اور تحریروں میں ایک لفظ کا بھی تصرف اس نے جائز نہیں سمجھا۔ بعض دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح اپنی شخصیت کو کو نمایاں کرنے کے بجائے اس نے اپنے ہیرو کی ذات میں اپنی انفرادیت گم کر دی ہے۔ صاحب سیرت اور ناظرین کے درمیان سیرت نگار کہیں حائل نظر نہیں آتا۔ وہ جانسن کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے مگر خود پس پردہ رہتا ہے۔ اپنے آپ کو اگر کہیں نمایاں بھی کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ جانسن ہی کی سیرت کا کوئی امتیازی وصف واضح ہو جائے۔ جانسن کے ملکہ ظرافت و بذلہ سنجی کے اظہار کے لیے وہ بعض اوقات ایسے مباحث میں حصہ لیتا ہے جن میں اس کی شکست یقینی ہوتی ہے اور اس کو جانسن کی ستم ظریفی کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اپنے ممدوح کی عظمت کے سامنے وہ اپنے وقار و خودداری کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔

باسول کے دل میں ڈاکٹر جانسن کا جس قدر احترام تھا اس کا اظہار کتاب کے دیباچہ ہی سے ہوتا ہے۔ لائف آف جانسن کا آغاز وہ اس عقیدت و نیازمندی کی تمہید سے کرتا ہے:۔

"اس عظیم المرتبت شخص کی سیرت پر قلم اٹھانا جو خود فن سیرت نگاری میں تمام ابنائے جنس پر فوقیت رکھتا تھا اور جو اپنی غیر معمولی فطری قابلیتوں اور مختلف علمی کارناموں کے باعث ہر عہد میں عدیم المثال تھا، مجھ جیسے کم مایہ شخص کے لیے ایک جسارت و گستاخی تصور کی جا سکتی ہے۔ مگر چونکہ مجھے ان کے فیض صحبت کا اعزاز بیس سال سے زیادہ عرصہ تک حاصل رہا ہے اور چونکہ اس مدت میں ان کی سیرت لکھنے کا منصوبہ برابر میرے پیش نظر رہا ہے جس سے کہ وہ خود بھی واقف تھے اور میری پرسش حالات کا اطمینان بخش جواب دیتے رہتے تھے۔ اور چونکہ میں ان کے حالات و اقوال کو صحت کے ساتھ قلمبند کرنے میں نہایت محتاط تھا اور ان کی زندگی سے متعلق ضروری اطلاعات فراہم کرنے میں تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان میں نے فروگذاشت نہیں کیا اس لیے میں بزعم خود فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک بہت ہی کم سیرت نگار اس نوعیت کی تصنیف، اس سے زیادہ مفید صورت میں معرض تحریر میں لائے ہیں۔ البتہ ادبی محاسن کے اعتبار سے مجھے ان فاضل مصنفین سے ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے جو مجھ سے پہلے

گوریکے میں:

جیمس باسول اسکاٹ لینڈ کے ایک معزز خاندان کا فرد تھا۔ علوم مروجہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ادبی تحقیقات اور انسانی زندگی کا مطالعہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ مشاہیر وقت سے ملاقات کے شوق میں وہ اسکاٹ لینڈ سے لندن اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ جانسن کے علمی و ادبی کارناموں کی شہرت اور ان کی تصنیفات کے مطالعہ نے باسول کے دل میں جانسن سے ملنے اور اُن کے عقیدتمندوں کے حلقہ میں داخل ہونے کا ذوق و شوق پیدا کیا اور بالآخر اُن سے ملاقات کا ایک ذریعہ نکل ہی آیا۔ ڈاکٹر جانسن سے باسول سے پہلی ملاقات کی تفصیل، باسول ہی کی زبان میں ناظرین کے لیے لطف سے خالی نہ ہوگی۔ باسول لکھتا ہے:

"۱۷۶۳ء میرے لیے ایک یادگار سال ہے کیونکہ اس سال مجھے اس بلند پایہ انسان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کی سیرت میں لکھ رہا ہوں۔ اس تعارف کو میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں گا۔ میری عمر اس وقت صرف بائیس سال کی تھی۔ ڈاکٹر جانسن کی تصنیفات سے مجھے روحانی مسرت و ہدایت حاصل ہوئی تھی اور میرے دل میں ان کے لیے ایک عظیم جذبۂ عقیدت و احترام تھا۔

میرے ایک دوست مسٹر ٹامس ڈیویز نے جن کی دکان رسل اسٹریٹ میں تھی مجھے بتایا کہ ڈاکٹر جانسن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور جانسن اکثر ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ دوشنبہ ۱۶ مئی کی شام کو جب میں مسٹر ڈیویز کے مکان کے دیوان خانے میں مسٹر اور مسز ڈیویز کے ساتھ چائے پی چکا تھا، مسٹر ڈیویز نے ہماری نشست کے کمرے کے شیشے کے دروازے سے جانسن کو ہماری طرف آتے ہوئے دیکھا اور مجھے ان کی مرعوب کن آمد کی اطلاع ہوریشیو کی طرح اس انداز میں دی جب وہ ہیملٹ کو اس کے والد کی روح کی آمد کے موقع پر آگاہ کر رہا تھا "میرے آقا! دیکھیے وہ آ رہی ہے" ڈاکٹر جانسن کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شکل و شباہت اور جُثہ میرے تصور کے بالکل مطابق تھا۔

مسٹر ڈیویز نے نہایت ادب کے ساتھ جانسن سے میرا تعارف کرایا اور میرا نام بتایا۔ یہ بات یاد کرکے کہ ڈاکٹر جانسن کو اسکاٹ لینڈ کے باشندوں سے طبعی نفرت تھی میرے خیالات میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں نے چپکے سے ڈیویز سے کہا کہ ان سے یہ نہ بتانا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں (کہاں کا باشندہ ہوں) مگر ڈیویز نے شوخی سے چلا کر کہا "اسکاٹ لینڈ سے"۔ جب میں نے دیکھا کہ افشائے راز ہو چکا ہے تو میں نے خود ہی جانسن سے عرض کیا۔

"جناب میں واقعی اسکاٹ لینڈ سے وارد ہوا ہوں — (اسکاٹ لینڈ کا باشندہ ہوں) لیکن اس کے لیے میں معذور ہوں"۔ میری یہ گزارش نامبارک ثابت ہوئی انھوں نے اپنی فطری ذہانت طباعی سے میرے اسکاٹ لینڈ سے وارد ہونے والے فقرے کی گرفت کرلی اور اس کا یہ مطلب لے کر کہ گویا تلاش معاش میں ترکِ وطن کرکے میں اسکاٹ لینڈ سے انگلستان چلا آیا تھا برجستہ کہا

"جناب کچھ آپ ہی اس کے لیے معذور نہیں ہیں بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ملک کے باشندوں کی اکثریت ایسا کرنے کے لیے مجبور ہے"۔ جانسن کے اس جملے سے میں حواس باختہ ہو کر رہ گیا اور اس الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ دیکھیے اس کے بعد کیا پیش آتا ہے۔ خوش قسمتی سے میں اس پہلی ملاقات میں بالکل محروم و مایوس نہیں ہوا کیونکہ جلد ہی مجھے ان کی درج ذیل مفید علمی گفتگو سننے کا موقع ملا جس کی روداد آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

جانسن ڈیویز سے مخاطب ہو کر گویا ہوئے" وہ لوگ غلطی پر ہیں جن کا خیال ہے کہ ایک بڑا مصنف اپنی خانگی یا پرائیویٹ زندگی میں بھی عام آدمیوں سے فائق و ممتاز ہوتا ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ غیر معمولی قابلیت کے اظہار کے لیے غیر معمولی موقع و محل ضروری ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس کا مظاہرہ بے محل ہے"۔

"ایک غیر متمدن سوسائٹی میں علمی اور عقلی برتری قابل قدر ہے لیکن تہذیب کی مُلمع کاری کے زمانے میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہوتی جو ہر کام مالی اُجرت کے عوض میں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاندانی وجاہت، جاہ و ثروت اور عہدے کی فضیلتیں انسان کی ذاتی فضیلت یا عقلی تفوق کے لیے تعظیم و احترام کا کوئی معتد بہ حصہ باقی نہیں رکھتیں۔

اس میں قدرت کی یہ حکمت ہے کہ بنی نوع انسان میں مساوات باقی رہے۔"

ڈاکٹر جانسن کی زندگی سے متعلق جو واقعات باسول نے بیان کیے ہیں ان میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے جانسن کی افتاد طبیعت یا ان کے جذبات رغبت و نفرت کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ ڈاکٹر جانسن نے جب انگریزی زبان کا ایک مبسوط لغت مدوّن کرنے کا ارادہ کیا تو لارڈ چسٹر فیلڈ (جو اس زمانے میں ادبی و علمی خدمات کی سرپرستی کے لیے مشہور تھے) کے سامنے اپنی تجویز پیش کی اور انھوں نے ڈاکٹر جانسن کی ہمت افزائی کی چسٹر فیلڈ کی سرپرستی و امداد کی توقع کے ساتھ جانسن نے تدوین لغت کا کام تنہا شروع کر دیا لیکن پھر چسٹر فیلڈ نے اس اہم ادبی خدمت کی کچھ خبر نہ لی۔ جانسن کو ان کی بے التفاتی بہت شاق گزری۔ بغیر کسی قسم کی اعانت و امداد کے سات سال تک جانسن تنہا لغت کی تدوین میں نہایت انہماک کے ساتھ مشغول رہے۔ جب لغت تکمیل کے قریب پہنچا اور اس کی طباعت و اشاعت کا وقت آیا تو لارڈ چسٹر فیلڈ نے اس توقع کے ساتھ کہ جانسن اپنی اس بلند پایہ تالیف کا انتساب ان کے نام سے کریں اور اہل علم یہ سمجھیں کہ یہ بیش بہا علمی خدمت انھیں کی سرپرستی میں پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، لغت کی تعریف میں دو مقالے لکھ کر دی ورلڈ اخبار میں اشاعت کے لیے بھیجے۔ اخبار کے مالک کے ذریعہ جانسن کو جب اس کی خبر ہوئی تو ان کے جذبۂ دقار و خودداری کو زبردست ٹھیس لگی۔ انھوں نے اپنے مخصوص ادیبانہ انداز میں ایک طنز آمیز خط لارڈ چسٹر فیلڈ کو لکھا جس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ یہ خط سیمول جانسن کی طنز نگاری کا بلیغ نمونہ ہے اور انگریزی ادب کے کلاسکی طنزیات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ترجمہ حتی الامکان لفظی کیا گیا ہے اور انگریزی عبارت کی طرز نگارش اور اسلوب بیان کو تا بمقدور باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو اور انگریزی طرز انشا کی ہم آہنگی کا یہ ترجمہ ایک نمونہ ہے:

"جناب والا! دی ورلڈ اخبار کے مالک نے مجھے حال ہی میں اطلاع دی ہے کہ آنجناب نے میری ڈکشنری کی علانیہ ستائش و سفارش میں دو مقالے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ خصوصی امتیاز ایسا اعزاز ہے کہ اہل کرم کی امداد و اعانت سے اب تک ناآشنا ہونے کے باعث میں نہیں جانتا کہ کس طرح اس کی پذیرائی کروں اور کن الفاظ میں اس کی قبولیت کی اطلاع دوں۔

آنجناب کی تھوڑی سی ہمت افزائی کی بنا پر جب میں پہلی بار آپ کے در دولت پر حاضر ہوا تھا تو آنجناب کے طرز تخاطب سے مسحور ہو کر ابنائے جنس کی طرح یہ تمنا کیے بغیر نہ رہ سکا کہ میں بھی اسی التفات و عنایت کا مستحق ہوں جس کے لیے دنیا جد و جہد کر رہی ہے لیکن میری حاضر باشی اس درجہ بے وقعت سمجھی گئی کہ خودداری اور انکسار دونوں نے مجھے اس اقدام کو جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔

ایک بار جب میں نے مجمع عام میں آپ کی خدمت میں پیام پیش کیا تھا تو آپ کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لیے اپنی ساری قابلیت جو ایک خلوت نشیں غیر درباری ادیب میں ہو سکتی ہے ختم کر دی تھی۔ میرے امکان میں جو خدمات تھیں وہ سب بجا لایا اور کوئی شخص اس بات سے خوش نہیں ہو سکتا کہ اس کا سارا سرمایۂ عمل خواہ وہ کتنا ہی قلیل ہو اکارت کر دیا جائے۔

جناب والا، پورے سات سال گزر گئے جب میں نے آنجناب کے در دولت پر حاضری دی تھی اور ناکام واپس کر دیا گیا تھا اس عرصہ میں تدوین لغت کی جد و جہد بڑی دشواریوں میں میں نے جاری رکھی اور بالآخر بغیر کسی سرپرست کی عنایت و ہمت افزائی یا ایک مشفقانہ تبسم کے اس کام کو منزل تکمیل تک کھینچ لایا۔ آنجناب سے ایسے برتاؤ کا مجھے گمان نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے میرا کوئی سرپرست نہ تھا۔

بندہ نواز! کیا سرپرست اسی شخص کو کہتے ہیں کہ جو ایک ڈوبتے ہوئے اور دریا کی موجوں سے لڑتے ہوئے انسان کو ایک غلط انداز بے تعلقی کی نگاہ سے دیکھ لیا کرتا ہے مگر جب وہی آدمی کنارے آ لگتا ہے تو اس کو اپنے احسان سے زیر بار کرنا چاہتا ہے۔

میری محنت و کاوش کی جانب جو التفات آنجناب نے اب فرمایا ہے اگر اس سے پہلے فرمایا ہوتا تو آپ کا عین احسان ہوتا لیکن اس میں اس قدر تاخیر کی گئی کہ اب مجھے اس کی حاجت نہیں رہی اور میں اب اس سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس میں اس حد تک

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

وفا ملک پوری

حسرتِ شعلگی

اپنے اشکوں سے جو آنچل کو بھگو کر تم نے
میرے تپتے ہوئے زخموں کا بنایا پھاہا
اس سے کچھ کم ہوئی سینے کی تپش دل کی خلش
اس سے کچھ کم ہوئی وہ کیفیتِ سوختگی
جو علامت تھی مرے جینے کی

اب نہ وہ شعلگیِ دل ہے نہ وہ سوزِ دروں
اب وہ آتش نفسی ہے نہ وہ آہ سوزاں
اب سُلگتی ہے کہیں آگ نہ اُٹھتا ہے دھواں
اب جلن ہے نہ کسک ہے، نہ تپش ہے نہ خلش
اب نہ انگارے دہکتے ہیں مرے سینے میں
سچ تو یہ ہے کہ مزا اب نہیں کچھ جینے میں

اپنی معصوم محبت کا سہارا دیکر
اپنے اشکوں سے مری آگ کو ٹھنڈا کر کے
میرے تپتے ہوئے زخموں کا مداوا کر کے
تم نے اک رسمِ وفا خوب نباہی لیکن
حسرتِ شعلگیِ عشق کو رسوا کر کے

دعوتِ نظارہ

فرحت قادری

حسنِ معصوم جلوہ فگن دیکھیے
ذرہ ذرہ میں اک بانکپن دیکھیے
دیکھیے دستِ قدرت کا فن دیکھیے
اپنی دھرتی کا رنگیں چمن دیکھیے

اس کو سب لوگ کہتے ہیں ہندوستاں
ہیں یہاں عام قدرت کی فیاضیاں
حسن ہی حسن چاروں طرف ہے یہاں
رشکِ فردوس میرا وطن دیکھیے

ترک و قندھار کی داستاں سُن چکے
مصر و ایران کے پھول بھی چُن چکے
دجلہ و نیل کے خواب تو بُن چکے
آئیے! حُسنِ گنگ و جمن دیکھیے

یہ اجنتا، الورا کی ہے سرزمیں
اس کی مٹی حسیں، اس کے پتھر حسیں
شامِ لندن سے شامِ اودھ کم نہیں
تاج پر چاندنی کی پھبن دیکھیے

مالوہ کی حسیں رات کا یہ سماں
اُف یہ صبحِ بنارس کی انگڑائیاں
اور کشمیر کی خوش نما وادیاں
یہ ہمالہ کا سیمیں بدن دیکھیے

حسنِ پنجاب کی اس میں تابندگی
زلفِ بنگال کی اس میں جادوگری
ہر جگہ حسنِ فطرت کی ہے دلکشی
گلستاں دیکھیے، خواہ بن دیکھیے

یہ مساوات و الفت کا دمساز بھی
شانتی اور اہنسا کا ہمراز بھی
رنگ و نکہت بھی ہے ساز و آواز بھی
شاخِ گل کو یہاں نغمہ زن دیکھیے

وقار عزیز

گاندھی جی کی انسانیت دوستی

گاندھی جی صرف اپنی قوم اور ملک ہی کا بھلا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کا وسیع دل تمام انسانوں کی محبت سے لبریز تھا چاہے وہ کسی ملک و قوم اور ذات و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ انھوں نے ستیہ گرہ کا تجربہ سب سے پہلے افریقہ میں کیا۔ وہ افریقہ ایک ہندستانی تاجر کے مقدمے کی پیروی کے لیے گئے تھے لیکن وہاں کالے باشندوں کے ساتھ گوروں کے بے جا اور انسانیت سوز سلوک سے ان کا دل تڑپ اٹھا اور انھوں نے اس برتاؤ کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کے لیے سخت ترین تکلیفیں بھی جھیلیں۔

انھوں نے خود کہا ہے کہ "دنیا کا مٹ جانے والا راج پانے کی مجھے کوئی آرزو نہیں میرے لیے نجات کا راستہ اپنے ملک اور انسانیت کی خدمت ہے، میں ہر ذی روح سے خود کو ملا دینا چاہتا ہوں، گیتا کے مطابق میں دوست اور دشمن دونوں سے یکساں سلوک رکھنا چاہتا ہوں اس لیے میری حب الوطنی اسی راستے کی ایک منزل ہے جو کامل آزادی اور امن کی طرف جاتا ہے۔"

گاندھی جی کی اپنے وطن اور قوم سے محبت تنگ نظر قوم پرستی نہیں تھی بلکہ انسانیت دوستی کی ایک منزل تھی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی فرد یا ملک کسی شخص یا ملک پر بے جا دباؤ ڈالے یا اس کے ساتھ نامناسب برتاؤ کرے اسی لیے انھوں نے ملک پر بیرونی اقتدار کے خلاف جھنڈا بلند کیا لیکن جنگ آزادی کے دوران ہر منزل پر اس کا پورا خیال رکھا کہ ان کی یہ جنگ انگریزوں کے خلاف نہ لڑی جائے بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑی جائے۔

'ہندستان چھوڑو' کی تحریک جب اپنے شباب پر تھی اس وقت جیسے ہی انھیں یہ معلوم ہوا کہ برطانی حکومت کے خلاف جنگ کرنے والوں نے اہنسا کا راستہ چھوڑ کر تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور حکومت کے بجائے افراد کے خلاف جنگ شروع کر دی ہو تو انھوں نے بے مثال اصول پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے تحریک روک دینے کا بے دھڑک اعلان کر دیا اور اس کی بالکل پرواہ نہ کی کہ اس سے ان کی ہر دلعزیزی پر آنچ آ سکتی ہے۔ وہ اس اصول کے سختی سے پابند تھے کہ 'نفرت گناہ سے کرو گنہگار سے نہیں'، یہی وجہ ہے کہ جب ایک ناعاقبت اندیش نے ان کے سینے پر گولی ماری تو ان کی زبان پر رام نام تھا اور لبوں پر مسکراہٹ اور غصے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

سچائی اور اہنسا گاندھی جی کے بنیادی اصول ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے ان دونوں کو زندگی میں برتنے کی بھی پوری کوشش کی۔ سب جانتے ہیں کہ سیاست کا خارزار میدان ایسا ہے کہ اس میں سچائی اور اہنسا کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا آسان کام نہیں اس کے لیے غیر معمولی روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت ہوتی ہے گاندھی جی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے سیاست میں بھی اخلاقی اعلا قدروں کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

ملک کے دو حصے ہو جانے کے بعد جب ملکی سرمایہ کی تقسیم ہوئی تو گاندھی جی نے بعض لیڈروں کی سخت مخالفت کے باوجود پاکستان کے حصے کا ایک ایک پیسہ ادا کرنے پر اصرار کیا۔ وہ فوری فائدے

کے لیے کوئی چھوٹی بات کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے۔ ان کا اس پر پکا عقیدہ تھا کہ اچھے مقصد کے حصول کے لیے اچھے ذرائع بھی استعمال کرنا ضروری ہیں کیونکہ خراب ذرائع استعمال کرنے سے قوم کا اخلاق گر جاتا ہے۔ اگر خراب ذرائع استعمال کر کے آزادی حاصل بھی کر لی گئی تو اخلاقی طور پر گری ہوئی قوم اس آزادی کی زیادہ دنوں تک حفاظت نہ کر سکے گی بلکہ ملک کے اندر ایسی غیر صحت مند فضا پیدا ہو جائے گی کہ کوئی تعمیری یا ترقیاتی کام خوش اسلوبی سے نہ کیا جا سکے گا۔

ستیہ گرہ جس کے ذریعہ کشت و خون کے بغیر آزادی حاصل کی گئی وہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا جو گاندھی جی نے اپنی زبردست اخلاقی اور روحانی قوت کے بل بوتے کامیابی سے کیا جس سے دنیا بھر کی آنکھیں ہندستان کی طرف اٹھ گئیں۔ ستیہ گرہ کا یہ طریقہ جنگ دنیا کے دبے ہوئے غریب اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے لیے ایک ایسا تحفہ تھا جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اس ایٹمی دور میں بیرونی اقتدار کے خلاف غریب ملکوں کا مسلح جنگ کرنا اور آزادی حاصل کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہی طریقۂ جنگ اپنا کر تمام ایسے دبے ہوئے غریب ملکوں کے ہاتھ میں ایک غیر دھاردار لیکن موثر ہتھیار دے دیا جس کے ذریعہ وہ اپنی جنگ جاری رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس ستیہ گرہی جنگ کے لیے بھی بڑی تیاری اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ستیہ گرہ کے سپاہیوں کو سچائی، محبت اور عدم تشدد کی اخلاقی اعلا قدروں سے پوری طرح لیس ہونا چاہیے اور اپنے مخالف کے خلاف ان کا استعمال بغیر کسی نفرت کے کرنا چاہیے۔ انسان بنیادی طور پر شریف ہوتا ہے۔ ایک سچے ستیہ گرہی کا کام اپنے مخالف کے شریفانہ سوئے ہوئے جذبات کو اپنی اخلاقی قوت سے ابھار کر اسے اپنی غلطی کا احساس دلانا ہے۔ تاکہ وہ خود اس غلطی سے منھ موڑ لے۔ طاقت اور جبر و تشدد سے اپنے مخالف سے کوئی بات منوا لینا جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کرتا بلکہ ملتوی کر دیتا ہے اور اس طرح جنگ ختم ہو جانے کے باوجود جنگ کی تیاری مسلسل جاری رہتی ہے دنیا میں پائدار

اور مکمل امن کے لیے صرف وہی ایک راستہ ہے جس کی طرف گاندھی جی نے رہنمائی کی ہے یعنی سچائی، اہنسا اور محبت۔

اہنسا کے بارے میں بعض وقت یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ایک طرح سے مجبوری کا نام ہے یعنی ایک کمزور کا عدم تشدد ہے جو خوف کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ گاندھی جی نے اس کے متعلق واضح طور پر کہا ہے کہ اہنسا بزدلی نہیں بلکہ ایک نادان کی غلطی پر رحم کا اظہار ہے۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ اگر کسی عورت کی عصمت پر حملہ کیا جائے تو کیا اس وقت بھی اسے اہنسا کی پیروی کرتے ہوئے مزاحمت سے پرہیز کرنا چاہیے تو انھوں نے کہا کہ بزدلی کے ساتھ خاموش رہنے سے بہتر ہے کہ بہادری کے ساتھ مزاحمت کر کے جان دے دی جائے۔ اہنسا کی صحیح پیروی بزدل آدمی نہیں کر سکتا حملہ ہونے پر کمزور سے کمزور آدمی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگتا ہے۔ لیکن حملہ آور کے خلاف دل میں نفرت لائے بغیر سینہ کھول کر گولی کھانے کے لیے سامنے کھڑا ہو جانا کسی بزدل کے بس کی بات نہیں۔

کمزوروں کی بھلائی

ایک بہادر انسان کی طرح گاندھی جی کی توجہ سب سے پہلے غریب اور کمزور طبقہ کی بھلائی کی طرف گئی۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا "اگر میں دوبارہ جنم لوں تو میری خواہش ہے کہ میں کسی اچھوت کے گھر پیدا ہوں تاکہ ان کے دکھ درد میں ان کا حصہ دار بنوں اور ان کی تکلیف دور کر سکوں۔"

گاندھی جی نے اچھوتوں اور پسماندہ طبقہ کو اوپر اٹھانے کے لیے بالکل ان میں گھل مل جانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس احساس کمتری سے نجات پا سکیں جس کا شکار وہ صدیوں سے تھے۔ گاندھی جی نے اپنا لباس اور رہن سہن ایسا رکھا کہ ان میں اور ملک کے غریب طبقہ سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی فرق نہ محسوس ہو۔ انھوں نے ہریجنوں کی تعلیم، ترقی اور بہبود کے مسئلہ کو ہمیشہ اہمیت دی۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ کام جو گاندھی جی نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل کے لیے ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بڑی مستعدی سے

قدامات کر رہی ہیں اور تیزی کے ساتھ ان کی حالت میں سدھار
ورہا ہے اور وہ سماج میں برابر کا درجہ حاصل کر رہے ہیں۔

گاندھی جی ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے یہاں کے
تلف مذہبی فرقوں میں اتحاد و یگانگت پر ہمیشہ زور دیا کرتے
تھے لیکن ان کے نزدیک یہ اتحاد خلوص اور محبت کی بنا پر
ناچاہیے فوری مصلحت کی بنا پر نہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار
نگ انڈیا میں اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "اتحاد
ں بنیاد باہمی خوف پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ دو برابر کے ساتھیوں
اتحاد ہونا چاہیے جو ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے
ہوں۔"

گاندھی جی کا خیال تھا کہ عوام لڑنا نہیں چاہتے لیکن کچھ
یڈر اپنے مفاد کے لیے ان کو اس کے لیے اکساتے رہتے ہیں اور
چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دے دیتے ہیں جیسے کہ وہ مذہب
کا جز ہوں۔ لوگوں کو اس سلسلے میں چوکنا رہنا چاہیے اور ان کے بہکانے
میں آکر کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے ہمارے اتحاد کو نقصان
پہنچے، اتحاد کے لیے رواداری اولین شرط ہے ہر فرقہ کو دوسرے
فرقے کے مذہبی جذبات کا پورا خیال رکھنا چاہیے اور ایک دوسرے
کے مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔ یہی طریقہ ہے جس سے فرقہ وارانہ
اتحاد مضبوط اور مستحکم ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے سب سے بہتر اور مفید
طریقہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اور ان کے ذہن میں
آزاد ہندستان کی جو تصویر تھی اس کو مکمل کرنا ہے جس کے لیے سچائی،
انسانیت دوستی اور کمزوروں اور غریبوں کو اونچا اٹھانے کی
لگن ضروری ہے۔

★

ماتا پرشاد استھانہ زیب بریلوی

اے باپو

ابھی تک آپکے ایثار کی تصویر بنتی ہے — ابھی تک آپکے پیغام کی تحریر بنتی ہے
ابھی تک آپکے ارشاد کی تاثیر بنتی ہے — ابھی تک آپکے احساس کی تنویر بنتی ہے
ابھی تک انجمن میں آپکا پیغام رقصاں ہے
ابھی تک آپکے انوار سے محفل فروزاں ہے

حدیثِ قوم لکھدی آپنے لوحِ محبت پر — بنادی شکل انساں کی دماغِ آدمیت پر
یہاں تک دسترس تھی آپکو قانونِ قدرت پر — لگادی مہر اپنے ظرف کی ایوانِ فطرت پر
حقیقت آپ کی منظور ہے اہلِ حقیقت کو
محبت آپ کی تسلیم ہے اہلِ محبت کو

جوانوں میں وطن کے وقت کی رفتار پیدا کی — زبانِ دل میں تم نے فطرتِ اظہار پیدا کی
نگاہِ دل میں تم نے قوتِ دیدار پیدا کی — مزاجِ زندگی میں جرأتِ ایثار پیدا کی
نمایاں ہو گیا خونِ شہیدانِ وطن جس سے
فروزاں ہے زمانے میں چراغِ انجمن جس سے

سمجھ کر سوچ کر ہر مقصدِ قومی کا افسانہ — اٹھا کر چل دیے ہاتھوں میں کشکولِ فقیرانہ
عجب انداز سے تم نے کیا ہے نظمِ میخانہ — چلایا بادۂ ملت کا تم نے ایک پیمانہ
شعورِ ذہن فطرت نے وقارِ آدمیت نے
کہ جس کی پیروی انداز سے کی عہدِ حکمت نے

تمھیں انسانیت کا دیوتا دنیا نے سمجھا ہے — تمھیں عرفانیت کا دیوتا دنیا نے سمجھا ہے
تمھیں حقانیت کا دیوتا دنیا نے سمجھا ہے — تمھیں روحانیت کا دیوتا دنیا نے سمجھا ہے
تمھیں نے پرچمِ انسانیت دنیا میں لہرایا
تمھیں نے انجمن میں داستانِ دل کو دہرایا

ہر اک درسِ محبت کو حسیں انداز دیتا ہے — مزاجِ قوم و ملت کو نیا انداز دیتا ہے
ہر اک پیغام کو آہنگ سوز و ساز دیتا ہے — زمانہ آپ کی آواز پر آواز دیتا ہے
جسے اندرا کے عہدِ نو نے دہرایا ہے دنیا نے
بآوازِ بلند ارشاد فرمایا [illegible]

یہاں تک رنگ لائی ہیں خلوصِ دل کی تدبیریں — وطن میں ہو رہی ہیں ہر طرف جلووں کی تنویریں
سنائی جا رہی ہیں آپکی دنیا میں تقریریں — لگائی جا رہی ہیں آپکی محفل میں تصویریں
سجاتے ہیں وطن حسنِ وفا سے آپکا باپو
مناتے ہیں جنم دن اس ادا سے آپکا باپو

غزل

ساحرؔ لکھنوی

سیماب سے تھے، نقش بہ دیوار ہو گئے
ہم کیسی سازشوں میں گرفتار ہو گئے

لفظ وفا کا صرف بھی آتا نہیں جنھیں
جنسِ وفا کے وہ بھی خریدار ہو گئے

نکلے تھے بانٹنے کے لیے دوسروں کے غم
خود اپنے ہی غموں میں گرفتار ہو گئے

کیا بات ہے کہ جتنے بھی حسّاس لوگ تھے
اے زیست تیرے نام سے بیزار ہو گئے

یوں چند سائے سے ہیں اماوس کی رات میں
آسیب جیسے نیند سے بیدار ہو گئے

اٹھو کہ ختم ہو گئی ساحرؔ غموں کی رات
آثار صبح دیکھو نمودار ہو گئے

غزل

تسنیمؔ فاروقی

راس آئے جنوں کو تو یہ انجام بہت ہے
جینے کے لیے مجھ کو ترا نام بہت ہے

شمشیر برہنہ ہے تو اچھی بھی ہے لیکن
دامن پہ تیرے خون کا الزام بہت ہے

کھلتے ہوئے ان پھول سے چہروں پہ نہ جاؤ
اس شہر میں جذبات کا نیلام بہت ہے

یہ زلف کی مہکار میں سمٹا ہوا ساون
مل جائے تو اس چھاؤں میں آرام بہت ہے

آنکھیں ہوں تو ہر گام پہ مکتب ہے یہ دنیا
جینے کا سلیقہ ہو تو پیغام بہت ہے

سب اس کو ترے نام سے پہچان رہے ہیں
اب تک ترے نزدیک جو گمنام بہت ہے

اے ریشمی احساس میں الجھے ہوئے لمحو
تسنیمؔ کو روکو نہ اسے کام بہت ہے

اقبال متین

دستک

(افسانہ)

میں بیٹھا ہوا بچوں کے جھرمٹ میں کھو گیا ہوں۔

سیاہ اور اندھیری رات میں جگمگاتے ستاروں کی طرح وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں چھوٹے بڑے جھلملاتے اور جگ مگ کرتے ہیں۔

کیسی کیسی باتیں ہو رہی تھیں، میٹھی میٹھی، توتلی توتلی۔ امیش اس طرح دیدے ٹمکا رہی ہے کہ سامنے کھڑی ہوئی چھوٹی ٹکو بس محو حیرت ہے۔ شاید وہ دل ہی دل میں سوچ رہی ہے کہ جب وہ اپنے گھر لوٹے گی اور اپنی ماں سے بات چیت کرے گی تو بالکل امیش کی طرح دیدے ٹمکائے گی۔

میں چاہتا ہوں کہ ان بچوں کی ساری کی ساری باتیں سن لوں — امیش اور چھوٹی ٹکو ایک ہو گئے ہیں۔ ان کی زبان میں جو لکنت ہے جو توتلا پن ہے وہ انسانی ضمیر کی ایسی دھڑکن ہے جسے سچائی کی آنکھ ضرور دیکھ سکتی ہے۔ جھوٹ کے کان اسے سن بھی نہیں سکتے اور وہ شاید اسی لیے مجھے اپنی معصومیت کے قریب آنے دیتے ہیں کہ میرے کان بہرے ہو گئے ہیں۔

ننھا زاہد، پائلٹ نشو اور ببلی خاں یہ مثلث اپنی عمر اور شعور کے ناطے دوسروں سے الگ الگ اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں — ان سے بڑی عمر کے بچے انھیں جب چھیڑتے ہیں تو مشترکہ احتجاج کر کے ہم بڑوں سے وہ اپنے موافق فیصلے لیتے ہیں۔ اور اسی طرح اپنی بات منوا لیتے ہیں۔ اپنے سے بڑے بچوں کے خلاف ان کا احتجاجی شعور بیدار ہو گیا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے وہ مل جل کر قدم اٹھانے کے قائل ہیں۔

امیش اور چھوٹی ٹکو، میں نے دیکھا ہے کہ ایک دوسرے پر رعب نہیں کستے ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بچیاں ہیں۔ گڑیاں اور گھروندے ان کے درمیان امن اور محبت کا ایک ذریعہ ہیں، ایک وسیلہ ہیں۔ دونوں میں اَن بن ہوتی بھی ہے تو ایک دوسری کو طرح دے جاتی ہے۔ اور اس طرح ہر گتھی سلجھ جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے پر فوقیت جتانے کی شعوری کوشش کا ان کے ننھے سے ذہنوں میں ابھی کوئی خیال نہیں گزر رہا ہے۔

پائلٹ نشو (PILOT NASSH SHOO) ببلی خاں اور ننھے زاہد کی بات جدا ہے۔ کھیل کھیل میں ایک دوسرے پر اپنی برتری جتلانا اس عمر کا وطیرہ ہے۔

ببلی خاں نام کے پٹھان ہیں۔ چھریرا بدن، سانولے سلونے بڑے بانکے سے ہیں۔ لیکن کھیل کھیل میں ذرا ان بن ہوئی کہ انھوں نے ننھے زاہد میاں کو جنھیں پیار سے لوگ زدّو بھی پکارتے ہیں بس چیلنج ہی تو کر دیا۔

کہنے لگے۔ لڑ لو کشتی۔

کشمیری سیبوں جیسے گال والے زدّو میاں نے ذرا سا سوچا۔ دہرا بدن ہے کس بل میں بھی ببلی خاں سے زیادہ ہی ہوں گے۔ بڑے ذہین بھی ہیں۔ پتا نہیں کب انھوں نے کھیلتے میں ببو خاں سے کوئی اڑنگا کھایا تھا کہ بے وجہ کچھ دہشت سی بیٹھ گئی ہے اور

وہ اپنی دانست میں سمجھ بیٹھے کہ بیلی خاں بڑے طاقت ور آدمی ہیں حالانکہ زدّو میاں ذراسی جی داری اور ڈھٹائی سے کام لیں تو شاید بیلی خاں کو پچھاڑ لیں لیکن ایسے موقع پر ان کی عقل ان کے آڑے آتی ہے۔

کشتی کا چیلنج ادھر سے ہوا تو جواب میں کہنے لگے۔

"لڑ لیں گے، ذرا گدا بچھا لیں" — یعنی لڑیں گے لیکن نرم گدے پر۔

ادھر ان کی کنّی دبی اور ادھر بیلی خاں شیر ہوئے۔

"گدا ودا کچھ نہیں، بس آ ؤ لڑ لو!" ——————

علم ٹھہرے پائلٹ نتّو — بڑے سجیلے تیکھے نقوش والے دھان پان سے آدمی ہیں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ کشتی دشتی کا چکر ان کے بس کا روگ نہیں ہے تو بیچ بچاؤ کو اپنا فرض گردانا۔ کہنے لگے ہم تو بڑے ہو کر پائلٹ بنیں گے کشتی لڑیں گے کنگ کانگ اور دارا سنگھ' اور انھوں نے ہوا میں کاغذ کا جٹ پھینکا — زوں۔ جٹ اڑا اور سب کے سب لڑنا بھڑنا بھول کر جٹ کی طرف بھاگے جو دالان سے ہو کر آنگن میں پہونچ گیا تھا۔

آنگن میں کھڑے تھے ننھے منّے غفورے۔ یہ ابھی ابھی آئے ہیں ننھی ککو کے بڑے بھائی ہیں۔ کچھ سہمے سہمے سے ہیں۔ کاغذ کا جٹ زمین سے اٹھا کر چپکے سے نتّو میاں کے حوالے کر دیا ہے جو ان سے ٹکرا کر آنگن میں گرا تھا۔

میں جان گیا ہوں — وہ کون سی کمی کا احساس ہے جو ننھّے غفورے کو بیلی خاں پائلٹ نتّو اور زدّو میاں سے گھل مل کر، شیر و شکر ہو جانے سے روک رہا ہے۔ یہ صرف نیا پن نہیں ہے۔ کچھ اور ہے — یقیناً کچھ اور ہے۔

غفورے کی قمیص میں دو جگہ پیوند لگے ہیں۔ اور میں دیکھ رہا کہ غفورے کی چار سال عمر میں چار پیوند اس طرح لگ گئے ہیں کہ وہ اپنی عمر کے تقاضوں ہی کو بھول گیا ہے۔

زاہد میاں کہنے لگے میں بھی پائلٹ ہوں۔ دارا سنگھ نہیں ہوں میں "کیری ڈول" اڑاؤں گا۔

بیلی خاں نے بھی جیسے لنگوٹ کھول دی ہو کہنے لگے، "میں بھی نہیں ہوں کنگ کانگ"۔ اور اب سب کے سب پائلٹ تھے۔ کاغذ کے جٹ اور کاغذی کیرے وِل طیارے اب آنگن میں ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ غفورے میاں ہر طیارے کو جو آنگن میں اتر پڑتا تھا اٹھا کر اس کو اپنے پائلٹ کے ہاتھ میں تھما دیتے تھے۔

میرا جی چاہا کہ میں غفورے میاں سے کہوں کہ تم بھی اڑاؤ ہوائی جہاز اور شامل ہو جاؤ اس صف میں۔

میں نے جھٹ سے اخبار پھاڑا اور جٹ سے ہوائی جہاز بنا ڈالا یہ بھی بھول گیا کہ یہ آج ہی کا اخبار تھا۔ آنگن میں کان پڑے کا شور تھا۔ زوں زوں — زوں تین کرے دل ایک ساتھ اڑ رہے تھے۔

آنگن میں پہنچ کر میں نے غفورے میاں کے ہاتھ میں بھی جٹ تھما دیا۔

"اڑاؤ — اڑاؤ بھئی" — وہ ہیں کہ سمٹ رہے، سکڑ رہے ہیں، لجا رہے ہیں۔ شرما رہے ہیں، میں نے سوچا، میری موجودگی شاید ان کے کھل کر کھیلنے میں مانع ہو — یہ لجا — یہ شرم۔ سمٹنے سکڑنے کی یہ ادائیں کہیں وہی تو نہیں ہیں جو میں سمجھ بیٹھا ہوں — غفورے میاں کہیں اپنے ہی ہاتھوں، اپنی عمر کا ٹینٹوا تو نہیں دبا رہے ہیں — میں چپکے سے کھسک آیا۔ بالکل اس طرح ان سے الگ ہو گیا۔ جیسے میں انھیں کن انکھیوں سے بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اور میں ستون کی اوٹ سے سب کچھ بغور دیکھتا رہا — غفورے میاں نے اپنا ہوائی جہاز جب اڑایا تو یہ زوں کرتا ہے نہ زاں — اس ہوائی جہاز کی کوئی آواز ہی نہیں ہے۔ چپکے سے اڑتا ہے چپکے سے اتر پڑتا ہے۔ زوں، زوں کے اس شور میں غفورے میاں کی آواز بھی دب گئی ہوگی کیوں کہ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ اس کی بے آوازی کو مان لوں — میں نے بغور دیکھا کہ غفورے میاں کے لب نہ ہلتے ہیں نہ کوئی آواز ہی نکالتے ہیں۔

مجھے ایسا لگا کہ میرے معاشرے نے غفورے میاں کے ہوائی جہاز کی آواز ہی نہیں چھین لی ہے بلکہ ان سے ان کا بچپن

بھی چھین لیا ہے۔

بوڑھے لوگ بچے نظر آئیں تو پھر زندگی پر پیار آتا ہے اور اگر بچے بوڑھے دکھائی دیں تو یوں لگتا ہے جیسے ساری تہذیب مر رہی ہے۔ سارا معاشرہ دم توڑ رہا ہے۔

جب کوئی بچہ اپنے بچپن سے جدا ہو جاتا ہے تو عمر کے لمبے لمبے فاصلے وہ ڈگ بھرنے میں ناپ لیتا ہے

میں نے امیش اور چھوٹی لگو کی طرف دیکھا۔ ان میں کوئی ایسا فرق نہ تھا۔

دو اور تین سال کی عمر میں گندی کرتنی اور کلف دار فراک تنا تینہ ایک ہی منزل میں ہوتے ہیں ۔۔۔ اور پھر انسان اپنے ہی ہاتھوں میلی کرتنی کو کسی بدرو میں پھینک دیتا ہے اور کلف دار فراک کو ہینگر میں لگا کر شوکیش میں لگا دیتا ہے ۔۔۔ ننھی امیش اور چھوٹی لگو ان ساری باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

لکڑی کے گھروندے پر رنگ برنگی بتیاں جگمگا رہی ہیں۔

کپڑے اور پلاسٹک کی چھوٹی بڑی گڑیاں ان میں بٹھائی جا رہی ہیں۔ سلائی جا رہی ہیں ۔۔۔ اور دونوں بس ایک دوسرے میں مگن ہیں ۔۔۔ دیدے مٹکا مٹکا کر امیش کچھ کہے جا رہی ہے اور حیرت زدہ ہو کر ننھی لگو سر ہلا رہی ہے ۔۔۔ پھر ننھی لگو کچھ کہتی ہے اور دونوں بے ساختہ ہنستے ہیں ۔۔۔ ان کے قہقہے جب فضا میں گونج اٹھتے ہیں تو مجھے یہ سوچ کر تسلی ہوتی ہے کہ ان کے قہقہوں کی کھنک ایک سی ہے اور ابھی ننھی لگو کے ذہن میں سمٹے اور سکڑے ہوئے غرور نے کہیں جنم نہیں لیا ہے۔

میں اپنے ہی خیالوں میں گم ہو کر رہ گیا ہوں۔

آنگن میں اڑتے ہوئے طیاروں کی زوں زوں مجھے سنائی نہیں دے رہی ہے۔ چمک دار چھوٹے سے گھروندے سے بھی میری نظریں ہٹ گئی ہیں۔ میں خلا میں کیا دیکھ رہا ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم۔

ننھی امیش نے لمبی سی جمائی لی ۔۔۔ میں پھر اس جگمگاتے گھروندے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ جس میں کچھ گڑیاں بیٹھی ہیں ۔۔۔ کچھ سو رہی ہیں۔

امیش کی مٹکنے والی آنکھیں اب نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔

"نیند آ رہی ہے"۔ وہ ننھی لگو سے مخاطب ہوتی ہے اور اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ننھی لگو کا دل ابھی اس جگمگاتے گڑیا گھر سے باہر نہیں آ سکا ہے۔

امیش چپکے سے اٹھ کر چلی آئی اور تخت پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

اس نے پھر ایک جماہی لی ۔۔۔ ننھی لگو کی طرف دیکھا جو گڑیا گھر کے پاس بیٹھی گڑیوں کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔

ننھی امیش نے ننھی لگو کو پکارا۔

"لگو ادھل آئی"۔۔۔ یعنی اس نے کہا لگو ادھر آؤ۔

"لگو اٹھ آئی تو امیش نے کہا۔

"جلا میلی جوتی اتال دو"۔۔۔ یعنی ذرا میری جوتی اتار دو۔

ننھی لگو پتھر کے فرش پر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی ۔۔۔ اس نے امیش کے پیر اپنی گود میں رکھ لیے اور بڑے انہماک سے چمکتے ہوئے جوتے کے بٹن کھولنے لگی۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کوئی چنگاری میرے دل کے قریب جل کر پل بھر میں بجھ گئی اور میں ایک جلن سی محسوس کرتا ہوا سوچ رہا ہوں کہ میرے ملک کے بچے کچھ بننے سے پہلے ہی اپنے بچپن کا ادھورا خواب بن کر رہ جائیں تو؟ ۔۔۔ پھر اس مستقبل کا کیا ہوگا جو ان سب کا منتظر ہے اور جن کے ہاتھوں اسے سنورنا ہے۔

میں اپنے ہی خیالات میں گم تھا کہ میں نے دیکھا کہ پائلٹ نتو کا ہوائی جہاز جو ابھی ابھی میرے اوپر سے گزرا ہے روشنی پھینکتا ہوا لینڈ کر رہا ہے۔ سارے بچے تالیاں بجاتے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

بچوں نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی باریک تھیلی میں ایک جگنو رکھ چھوڑا تھا اور یہ چمکتی تھیلی چھوٹے سے دھاگے سے کاغذ کے ہوائی جہاز میں ٹانک دی گئی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا نام ہے اس طیارے کا؟"

بچوں میں سے کسی نے پکارا ۔۔۔ "اندرا درشنی، اندرا درشنی"۔

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

نصر قریشی

قطعات بنام شعرائے کرام

زلف و قد و رخسار کے افسانے چھوڑ — اب حسن کی سرکار کے افسانے چھوڑ
اس دور کی تنظیم تجھے کرنی ہے — پازیب کی جھنکار کے افسانے چھوڑ

(۲)

زلفوں کی حکایات میں کیا رکھا ہے — الطاف و عنایات میں کیا رکھا ہے
مستقبل رنگیں کے ترانے اب چھیڑ — ماضی کی روایات میں کیا رکھا ہے

(۳)

افکار میں یہ سلسلۂ زلف بتاں — یہ حرف و حکایات، یہ انداز بیاں
ڈرتا ہوں کہ سو جائے نہ تو موں کا ضمیر — اے شاعر رنگین بیاں روک زباں

(۴)

اشعار میں پھولوں کی نمائش کیسی — بت خانوں میں پھر آج رہائش کیسی
مستقبل انساں کا معمار ہے تو — ماضی کے بتوں کی یہ ستائش کیسی

(۵)

آسانی سے مٹتے ہیں کہیں کہنہ رواج — اک روز میں بدلا نہیں کرتے ہیں مزاج
تشکیل تو ہر آن ہوا کرتی ہے — صدیوں میں ہوا کرتی ہے تکمیل سماج

(۶)

آؤ غم دوراں کا مداوا کر لیں — یعنی غم انساں کا مداوا کر لیں
تخریب میں تعمیر کا ساماں کر کے — ہم زخم بہاراں کا مداوا کر لیں

خوشنود اعظمی

نہرو کی بیٹی زندہ باد

اک ایمرجنسی میں پوشیدہ تھے کس درجہ مفاد
جس طرف دیکھو اُدھر ہے امن و چین و اتحاد
کارناموں کو ترے ہم تا ابد رکھیں گے یاد
تیرے اس اقدام پر کم ہے ملے جتنی بھی داد
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

چور بازاری فنا کے گھاٹ جا پہنچی ہے اب
ایک ہنگامہ یہیں تو تھا اسی کا روز و شب
لوٹ مار اور قتل و غارت ہر طرف تھا بے سبب
ختم تو نے کر دیے فتنے یہاں سے سب کے سب
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

کل بلا رشوت دیے اک کام بھی ہوتا نہ تھا
نام سے رشوت کے آج ہر اک یہاں ہے کانپتا
انقلاب آخر کہاں سے یک بیک یہ آ گیا
جو نہ کوئی کر سکا وہ کام تو نے کر دیا
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

گوشہ گوشہ میں وطن کے چھا چکی تھی تیرگی
تیری شمع فیض نے ہر سمت کر دی روشنی
نزع کا عالم تھا نبض ملک تھی ڈوبی ہوئی
تو مسیحا بن کے اٹھی دے دی تو نے زندگی
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

ناخدائے کشتی ہندوستاں اندرا ہے تو
بزم اہل ہند کی روح رواں اندرا ہے تو
گلستان بھارت تو جان گلستاں اندرا ہے تو
سچ تو یہ ہے اک بہار بے خزاں اندرا ہے تو
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

تو مرے پیارے وطن کی جاگتی تقدیر ہے
نور سے تیرے جبین ہند پر تنویر ہے
تیرے دم سے روز افزوں دیش کی توقیر ہے
تو ہی تو گاندھی کے خوابوں کی حسیں تعبیر ہے
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

تیرے قدموں کے تلے جب منزل مقصود ہو
تجھ سے ٹکرانے کی کوشش کیوں نہ پھر بے سود ہو
فیض اور ایثار تیرا جبکہ لامحدود ہو
سرزمین ہند کی ہر شے نہ کیوں خوشنود ہو
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

پروفیسر افتخار احمد فخر

راز چاند پوری

دبستان سیماب کا مایۂ ناز شاعر اور ایرانی تہذیب اور روایت کا پرستار راز چاند پوری جب ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو چل بسا تو راقم الحروف نے قطعۂ تاریخ وفات کہا تھا کہ ؎

راز منصف مزاج و صاحب دل   بودہ در فن شاعری کامل
فخر چوں رفت، راز سیمابی   گفت ہاتف کہ "آہ بوالفاضل"
۱۹۶۹ء

مرحوم کا پورا نام محمد صادق، راز تخلص، اور کنیت ابوالفاضل تھی۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۸۹۲ء[1] کو جمعہ کے دن اس عالم آب و گل میں تشریف لائے تھے۔ والد کا نام منشی حافظ محمد جعفر اور دادا کا نام منشی شیخ نذر تھا۔ راز چاند پوری کا مولد و مسکن قصبہ چاند پور ضلع بجنور (یو۔پی) تھا جس کی خاک سے قائم چاند پوری جیسا باکمال سخن در پیدا ہوا، اور تاریخ ادب اردو کی زینت بنا۔ راز چاند پوری کے آبا و اجداد فوج سے متعلق تھے مگر زوال سلطنت مغلیہ کے بعد ان کا خاندان صاحب سیف کے بجائے صاحب قلم ہو کر رہ گیا۔ ان کی تعلیم دستور قدیم کے مطابق مکتب میں ہوئی کلام پاک ختم کرنے کے بعد اردو فارسی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں منشی شرف الدین عرف میاں جی کلو مرحوم سے پڑھیں۔ فارسی کا نہایت نفیس اور نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ تحصیلی اسکول چاند پور اور گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ذاتی شوق اور توجہ کی بنا پر عربی اور ہندی میں بھی کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔

راز چاند پوری کو ذوق شعری ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد مرحوم بھی شاعر تھے، اور حافظ تخلص کرتے تھے، اگرچہ فن شاعری میں زیادہ مشاق اور مشہور نہ تھے، تاہم راز چاند پوری کے ذوق شعری کو ابھارنے اور تیز کرنے میں ان کے والد مرحوم کی توجہ اور تربیت کو زیادہ دخل رہا۔ وہ خود بھی اردو فارسی کے عالم تھے علمی ادبی نکات بطریق احسن سمجھاتے تھے اتنا ہی نہیں جب انھیں راز چاند پوری کی موزونیٔ طبع کا علم ہوا تو انھوں نے بیٹے کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ خود مرحوم راز چاند پوری کا بیان ہے کہ "جب میں ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں تعلیم پا رہا تھا تو میرے ہم درس اور ہم عمر ایک صاحب تھے جن کا نام شاید عبدالصمد تھا۔ وہ فتنہ تخلص کرتے تھے۔ ان سے اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی اسی زمانہ میں میں نے راز تخلص اختیار کیا تھا۔ جب میں ۱۹۱۲ء میں بسلسلۂ ملازمت آگرہ میں مقیم تھا تو علامہ سیماب اکبر آبادی کے ایک شاگرد قدیم باغ اکبر آبادی کے توسط سے سیماب صاحب کا شاگرد ہو گیا" آگے چل کر وہ بیان کرتے ہیں کہ "جب تک میں آگرہ میں رہا، ہر ہفتہ سیماب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور وہ بھی کبھی کبھی غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات بڑھ کر دوستی کی حد تک پہونچ گئے اور سیماب صاحب کی زندگی کے آخری ایام

[1] "شاعر" آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۶ء میں ۲۵ شعبان ۱۳۱۰ھ درج ہے۔

تک قائم رہے ہے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی کی شاگردی پر راز صاحب کو بڑا ناز تھا اور استاد کو بھی اپنے اس مایۂ ناز شاگرد پر کامل اعتماد تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اپنے خطوط میں علامہ مرحوم نے اکثر راز صاحب کو اپنا رفیق صادق تسلیم کیا ہے جیسا کہ علامہ کے مطبوعہ خطوط سے ترشح ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے مابین یہ مخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ مرحوم راز چاندپوری نے اپنے استاد کی عظمت کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

سیکھی ہے راز میں نے سیماب نکتہ داں سے
یہ رمز شعر گوئی یہ طرز خوشنوائی

وہ نہایت منکسر المزاج، صلح جو اور ملنسار، شہرت سے بے نیاز اور خاندانی شرافت و نجابت کی زندہ تصویر تھے، کشمکش حیات اور ملازمت روزگار کے باوجود ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وضعداری کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہر حال میں خوش رہے اور اردو فارسی اور انگریزی ادب کے مطالعہ نے انہیں عصری و ادبی تحریکوں سے باخبر رکھا۔ میرے چند استفسارات کے جواب میں جو میں نے اپنے تحقیقی مقالے "سیماب اور دبستان سیماب" کے سلسلہ میں کیے تھے اپنے خط یکم مارچ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا!

"....... زندگی کے تین دور مانے جاتے ہیں بچپن، جوانی اور بڑھاپا کسی ظالم نے ان تینوں ادوار کو ایک مصرع میں موزوں کر دیا ہے ع "خام بدم، پختہ شدم، سوختم" جو میرے ذاتی حالات پر پورے طور سے منطبق ہوتا ہے اور اگر اس وقت کا قصہ معلوم کرنے کا شوق ہو "جب آتش جوان تھا" تو اس کی ایک سرسری جھلک "شاعر" آگرہ ۱۹۳۷ء کے آگرہ اسکول نمبر میں دیکھی جا سکتی ہے میری نظموں کا، ایک مجموعہ "دنیائے راز" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا جس کی صرف ایک جلد ہی میرے پاس باقی ہے۔ غزلوں کا انتخاب "نوائے راز" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا اور وہ پبلشر سے مل سکتا ہے۔ نظموں کا مجموعہ اب بازار میں شاید ہی کہیں ہو "شاعر" کے دفتر میں ہونے کا امکان ہے۔ رباعیوں اور نظموں کا انتخاب مرتب کر چکا ہوں لیکن کوئی پبلشر نہیں ملتا۔ خیر میں تو کسی قابل نہیں ملک میں بڑے بڑے شعراء و ادباء ایسے موجود ہیں جو وسائل نشر و اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ دنیا واقعی مردہ پرست ہے" ع

"وائے گر ایں پس امروز بود فردائے"[1]

یہاں مرحوم راز چاندپوری کی تصانیف و تالیفات کی ایک نامکمل فہرست درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں۔

(۱) "دنیائے راز" یہ نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔

(۲) "نوائے راز" انتخاب غزلیات ۱۹۱۶ء تا ۱۹۵۵ء) مطبوعہ ۱۹۶۱ء جسے ادارۂ انیس اردو، الہ آباد نے شائع کیا تھا۔

(۳) "زرینے افسانے" جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئے تھے۔

(۴) "صحیفۂ راز" قدیم و جدید نظموں کا مکمل مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۵) "حدیث راز" رباعیات کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۶) "روداد محبت" ٹالسٹائی کے ایک دلکش ناول کا ترجمہ (غالباً غیر مطبوعہ)

(۷) "داستانے چند" ۱۹۶۸ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۸) "داستانے عہد گل" مشاہیر علماء و ادباء کے خطوط کا مجموعہ، اسے بھی مئی ۱۹۷۱ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے ان کی وفات کے بعد چھاپا ہے۔

---

[1] "داستان عہد گل" از راز چاندپوری ص ۱۱ و ۱۲   [2] راقم کے نام ایک خط یکم مارچ ۶۵ ۱۹ء

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم. چنا ریڈی یوم آزادی کے موقع پر پریڈ کی سلامی لے رہے ہیں

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوششوں سے بی۔ اے (فرسٹ ایر) کے ہندی نصاب کے لیے شائع کی جانے والی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم چناریڈی نے ۲۰ اگست کو راج بھون لکھنؤ میں متعدد ممتاز ادیبوں کو ایوارڈ عطا کیے۔ تصویر میں شریمتی گورا پنت شیوانی (بائیں) اور ڈاکٹر رام کمار ورما انعامات حاصل کرتے ہوئے

مرکزی وزیر پٹرولیم شری کیشو دیو مالویہ ۱۴ اگست کو بستی میں ۳ کروڑ روپیہ کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی پلاسٹک صنعتی بستی کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے ۳ اگست ۱۹۸۵ء کو رامپور میں گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج رام پور کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیراعلا شری نرائن دت تیواری ۲۰ راگست ۱۹۷۶ء کو مظفر نگر میں تار گھر کی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے

شہید چندر شیکھر آزاد کی استھیاں جب لکھنؤ میوزیم پہنچیں
تو وزیر ریاست برائے اطلاعات شری رمیندر ورما اور وزیر برقیات
شریمتی راجندر کماری باجپئی نیز دیگر لوگوں نے استھیوں کی
کی گل پوشی کی
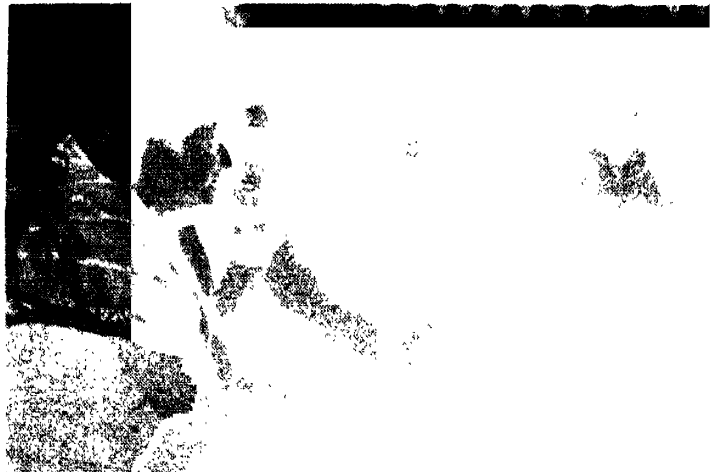
چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی ۲۰ راگست کو
صدر، لکھنؤ میں یونین بینک کی جانب سے دیے گئے
قرضے تقسیم کر رہی ہیں

(اوپر) وزیراعلیٰ ۱۳ اگست ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں
ڈسٹرکٹ پبلیسٹی و ضلع انفارمیشن افسروں کو
خطاب کر رہے ہیں۔
(بائیں) ضلع بلند شہر میں ۲۰ اگست کو نس بندی
آپریشن کا ایک منظر
(نیچے) وزیر آبپاشی شری لوک پتی ترپاٹھی آگرہ میں
حالیہ سیلاب کا معائنہ کرتے ہوئے

ان تصانیف کے علاوہ مختصر افسانوں کا دوسرا مجموعہ اور علمی و ادبی مضامین کے بھی مجموعے شائع کیے جاسکتے ہیں، کیونکہ اپنے دور میں مرحوم راز چاندپوری نے خوب خوب داد شعر و ادب دی ہے۔ وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھے اور علمی ادبی کاموں میں اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھا۔ ان کی پوری زندگی خدمت ادب و شعر میں گزری۔ انھیں ترجمہ کرنے میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا اور وہ اس فن میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے تراجم کے علاوہ بیشتر غزلیں، نظمیں، رباعیاں، افسانے، علمی ادبی مضامین، آئے دن اخبارات اور ملک کے مقتدر معیاری رسائل میں شائع ہوکر خراج تحسین وصول کرتے رہے ہیں۔ ان سب کو یکجا کرکے سلیقہ سے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ کتابی صورت میں محفوظ ہوجائیں جوکہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

میرے ایک دوسرے استفسار پر مرحوم نے اپنی نجی زندگی سے متعلق ایک بار لکھا تھا:

"حضرت!

"..... چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط تھے، جو، اب نذر طاق نسیاں ہوگئے ہیں۔ خیر ——— مختصر گویم ——— چالیس سال کے قریب ملازمت میں گزارے گورنمنٹ سیکریٹریز میں فائلوں کی ورق گردانی کے ساتھ، کچھ لکھتا پڑھتا رہا۔ کان پور اور جبل پور میں ملازمت کی مدت گزری۔ ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر کان پور میں مقیم تھا کہ رفیقۂ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۵ء میں میرا بڑا لڑکا علی گڑھ یونی ورسٹی میں ملازم تھا، منجھلا میرے پاس تھا اور چھوٹا علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا۔ راز بیگم کے مرنے کے بعد بڑے لڑکے کی خواہش پر میں یہاں آگیا۔ (۱۹۵۵ء کے آخر میں) آٹھ بچوں میں اب صرف تین باقی ہیں بڑا لڑکا ریڈر ہے، منجھلا اسٹینو گرافر، چھوٹا لکچرار، اور یہ آج کل امریکہ گیا ہوا ہے۔ تینوں کی شادیاں کرچکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے اب مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے ——— باقی پھر کبھی ——— یاد زندہ صحبت باقی، والسلام نیاز کیش راز

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ۲۵ راگست ۱۹۶۹ء کو ۷۷ سال کی عمر میں راز چاندپوری کا انتقال ہوا، اور وہیں علی گڑھ میں مدفون ہیں۔ اپنی آخری عمر میں انھوں نے اپنی تحریروں، یادداشتوں اور نظم و نثر کو مرتب کرنے کا کام کیا۔ شعر گوئی عرصے سے ترک تھی ان کے قدیم کلام میں بھی بڑی ندرت و سادگی ہے اور وہ بھی قدر و قیمت کا حامل ہے چنانچہ راز چاندپوری کے کلام پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے کہا ہے کہ ——— "..... شاعر کے یہاں محسوسات بھی ہیں اور تجربات بھی، غم و افسردگی، ناکامی و نامرادی کے لمحے بھی، لیکن شاعر نے ان کو ہضم کرنے کے بعد اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ شدت ایک خوشگوار اعتدال میں تبدیل ہوگئی ہے، اور زہر کی تلخی امرت رس معلوم ہونے لگتی ہے ..... راز صاحب کی شاعری ایک نارمل اور عام انسان کے دکھ درد، مسرت و انبساط۔ اور اس کی آرزوؤں اور خوابوں کا نارمل اور سادہ اظہار ہے، اس لیے اس میں رنگینی سرشاری، ربودگی، اڑان، فلسفیانہ فکر، پیچیدگی اور بہت سے ایسے عناصر نہیں ملیں گے جو عام اردو غزل کا طرۂ امتیاز ہیں[1] چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:—

میرے ساقی! ایک ساغر، ایک جرعہ، اک نظر

گفتۂ واعظ پہ کچھ تنقید ہونا چاہیے

شعر جدید پر راز چاندپوری کی رائے ملاحظہ ہو ؎

کیا کہا؟ کیا بے اثر ہے بادۂ شعر جدید

راز اس الزام کی تردید ہونی چاہیے

ان کی غزلوں کے چند منتخب اشعار دیکھیے:—

خود غرض ہے برہمن بھی شیخ بھی

ایک دنیا، ایک عقبیٰ سا نہ ہے

---

[1] راقم کے نام ایک خط ۲۲ رمئی ۱۹۶۵ء مع "نوائے راز" از راز چاندپوری دیباچہ ص ۱۴

یہی ہے مختصر روداد راہ و رسمِ منزل کی
کہ میں خود کھو گیا، ایسا بھی آخر آن مقام آیا

شاید فریب خوردۂ حسنِ بہار ہوں
دشمن سمجھ رہا ہوں ہر اک دیدہ ور کو میں

یہ بزم دہر اور یہ دنیائے روزگار
مدت ہوئی زیارت انساں کیے ہوئے

ہجومِ غم میں ہنسنا بولنا دشوار ہوتا ہے
شراب تلخ سے پیدا کیا ہے انگبیں میں نے

انقلاباتِ جہاں دیتے ہیں درسِ زندگی
ہے اگر جینا تو کچھ جینے کا ساماں کیجیے

اہلِ ظاہر بے خبر ہیں غالباً اس راز سے
خود فراموشی بھی اک صورت ہے اس کی یاد میں

یوں دے رہا ہوں دادِ کرم ہائے بے حساب
گویا نظر میں گردشِ دورِ زماں نہیں

پروفیسر عبد القادر سروری مرحوم نے حضرت راز چاند پوری کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے راز چاند پوری کی نظم گوئی کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

" راز صاحب کی شاعری زیادہ تر داخلی رنگ رکھتی ہے۔ ان کی نظمیں واردات قلبی اور احساسات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ اس کیفیت کا غلبہ ان پر اس قدر ہے کہ جو نظمیں خارجی تفصیلات سے پُر ہونی چاہییں ان میں بھی شاعر کے جذبات کی فراوانی داخلی رنگ نمایاں کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "سکوت شب" ـــ کافی ہے ـــ راز کی مرقع نگاری کی عام طور پر یہی خصوصیت ہے۔ راز کی شاعری میں بھی اس زمانے کی جدت پسندی کا اثر موجود ہے۔ بحروں کے انتخاب اور لفظوں کی نشست ترنم اور موسیقی کی نگہداشت، ان کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے [1]"

یہاں نظم "سکوت شب" کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جن سے عبد القادر سروری کی رائے کی صداقت کا اندازہ ہو سکے گا:

طاری ہے اک سکوت جہانِ خراب پر
ہنگامہ زارِ دہر کی ہر شے خموش ہے

لیلائے شب کے حُسن کی جادو طرازیاں
آشفتگانِ عشق کا اب سرد جوش ہے

تنہائی کا خیال نہ احساسِ دردِ دل
پیشِ نگاہ اب کوئی گیسو بدوش ہے

میخانۂ حیات ہے گہوارۂ سکوں
میخوار ہوش میں ہے نہ بادہ فروش ہے

دستِ طلب ہے سبحہ شماری سے بے نیاز
مصروفِ خواب زاہدِ پشمینہ پوش ہے

رندِ خراب حال بھی ہے بے نیازِ ہوش
فردا کی اب ہے فکر نہ کچھ رنجِ دوش ہے

غافل ہے اپنے فرض سے خود ساقیِ حسیں
اب نیم باز نرگسِ پیمانہ نوش ہے

مضرابِ حُسن نغمہ طرازی سے بے خبر
سازِ حیاتِ عشق سراپا خموش ہے

المختصر ہے سارا جہاں وقفِ بے خودی
اک رازِ دل فگار کو البتہ ہوش ہے

الغرض راز چاند پوری مرحوم نے تقریباً چالیس سال پہلے ایسی نظمیں لکھی تھیں جنھیں ہم انگریزی زبان میں منظر نگاری یا فطرت کی عکاسی پر مشتمل نظموں کے دوش بدوش رکھ سکتے ہیں۔

وہ نظم و غزل کے نہ صرف اچھے شاعر ہی تھے بلکہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی اپنی طبع رواں کے جوہر انھوں نے دکھائے ہیں۔ افسانے، تراجم اور علمی ادبی مضامین سے بھی اردو ادب کے دامن کو وسیع کرنے کی انھوں نے سعیِ بلیغ کی ہے اور نصف صدی سے زائد اردو ادب و شعر کی خدمت کی ہے۔ ان کی تخلیقات نظم و نثر قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

---

[1] جدید اردو شاعری از عبد القادر سروری ص ۲۷۴ و ص ۲۷۵

شاکر جروالی

غزل

ذی پرایا کیسے کہہ دے کون کہے انجانے ہیں
جتنے چہرے آنچل میں ہیں سب جانے پہچانے ہیں

پیار کی ترسی اس دھرتی پر ایسے بھی دیوانے ہیں
پریت نگر میں رہتے ہیں اور چاہت سے بیگانے ہیں

اند کی دیوی اتنی جلدی کرنوں کا بستر نہ اٹھا .
نگ ابھی بھرنا ہے اس کی گیسو بھی سلجھانے ہیں

دل کا ورق سادہ تو نہیں ہے جس کا جی چاہے پڑھ لے
چند ادھورے گیت ہمارے کچھ ان کے افسانے ہیں

س کا راہی کیسے گذرے یاس کی سونی راہوں سے
سر پر اڑتی ریت کے بادل پاؤں تلے ویرانے ہیں

من کی دھیرج کیوں کھوتا ہے دکھ کی آندھی میں پنچھی
اک ڈالی گر ٹوٹ گئی تو تیرے لاکھ ٹھکانے ہیں

جتنے بیروں کا جادو تو سب کو لبھاتا ہے لیکن
سنگت کا بھید نہ جانیں وہ گھنگھرو بیگانے ہیں

دیپ جلے تو اپنے اپنے من کی جوت جگا لیں گے
جان جلانا ایک نہ جانے یوں تو سب پروانے ہیں

میر کی صورت صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
کون بھلا سمجھائے ان کو شاکر تو دیوانے ہیں

غزل

[illegible]

اغیار کے محلوں پر تنقید نہ کر پہلے
مضبوط بنا اپنا ٹوٹا ہوا گھر پہلے

راحت کے گھر تہہ میں مل جائیں گے اے ناداں
آفات و مصائب کے دریا میں اتر پہلے

اک روز بلندی خود چومے گی قدم تیرے
ماحول کی پستی سے ناداں ابھر پہلے

منزل کی طلب ہے تو چل راہ تجسس میں
مضبوط ارادوں کو لے ساتھ مگر پہلے

خوشیوں کی تمنا میں غم سہتے ہیں لوگ اکثر
پھولوں کی طلب ہے تو کانٹوں سے گزر پہلے

شیشے کے مکانوں میں کچھ لوگ مقید ہیں
برسائے ہوا لاکر کچھ سنگ ادھر پہلے

جس گل سے گلستاں میں افزائش زینت ہے
اس پر ہی نہ گلچیں کی پڑ جائے نظر پہلے

گم ہو گئے جلوے وہ صحرائے تصور میں
پھیلے تھے مرے دل پر جو شام و سحر پہلے

اب شہر تمنا میں مدت سے ہے ویرانی
آباد تھا اے یارو، کتنا یہ نگر پہلے

تنقید جو کرتے ہیں وہ کرتے رہیں لیکن
رحمٰن انھیں لازم ہے تحصیل ہنر پہلے

تلک راج گوسوامی

آخری فیصلہ

(افسانہ)

جونہی گاڑی نے رفتار پکڑی سریکھا کے دماغ میں خیالات کا ٹوٹا ہوا سلسلہ ایک بار پھر جڑ گیا۔ اپنے دماغی تناؤ اور تھکاوٹ کو کم کرنے کے لیے اس نے ابھی کچھ دیر پیشتر چائے کا ایک پیالہ لیا تھا۔ چائے کے بعد پان بھی چبایا تھا۔ پان کھانے کی اسے عادت نہیں ہے لیکن جب کبھی وہ دماغی پریشانیوں میں گھر جاتی ہے پان کی ایک گلوری اسے کچھ راحت دیتی ہے۔ اتنا کرنے پر بھی خیالات کی ادھیڑ بن ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ وہ بڑی بے چینی سی محسوس کر رہی تھی کبھی وہ پیشانی و کنپٹیوں کو ہاتھ سے دباتی کبھی پر تھوڑا آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی لیکن دماغی پریشانی کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ابھی چار دن پہلے ہی راجیندر نے اس کے سامنے شادی کی بات کی تھی اور کل شام کو اسے بابوجی کا تار ملا تھا۔ اسے فوراً جبلپور پہنچنے کے لیے لکھا تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ایک بار پھر وہی پرانا ڈرامہ کھیلا جائے گا۔ اسے بنا سنوار کر اسٹیج پر لایا جائے گا۔ تھوڑی دیر تک اپنی خونخوار نظروں سے اس کے جسم کی بوٹی بوٹی گننے کے بعد تماشبین لوگ اس کے چہرے پر تھوک کر چل دیں گے۔ لیکن اب وہ ایسا موقع نہیں آنے دے گی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس بات کے لیے تیار کر رہی تھی کہ اب وہ کسی بازاری شے کی طرح خود کو فروخت کرنے کے لیے پیش نہیں کرے گی۔ وہ بابوجی اور ماں کو صاف الفاظ میں اپنا آخری فیصلہ سنا دے گی۔ کہ اب وہ کسی اور کی ہو چکی ہے اس نے اپنا رفیق حیات چن لیا ہے۔

تبھی اس نے قریب بیٹھے مسافروں کی نظریں بچا کر آہستہ سے اپنا وینٹی بیگ کھولا۔ بیگ میں پڑے ہوئے راجیندر کے فوٹو کو ایک نظر دیکھا دل و جسم میں ایک طرح کی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور اس نے پھر بیگ بند کر دیا۔ راجیندر کی شخصیت اس کے دل و دماغ میں ابھرنے لگی۔ وہ کتنا خیال کرتا ہے میرا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے۔ دفتر کے کام میں بھی وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ میری سیٹ پر تین ماہ کا ایریر پڑا ہوا تھا۔ اکاونٹس آفیسر ہر روز اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹتا تھا شرمسار کرتا تھا۔ دوسرا کوئی بھی میرا ہاتھ بٹانے کو تیار نہ تھا۔ یہ راجیندر کی محنت اور میرے تئیں پریم تھا جس کے تحت اس نے میرے کام کو اپنے گھر لے جا کر اور لنچ ٹائم میں پورا کیا۔ پھر وہ سوچتی کہ اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ اپنا شاندار مکان ہے اسکوٹر ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے پوری جائیداد کا وہی حقدار ہے۔ اس کے پتا شہر کے مانے ہوئے گھڑی فروش ہیں جو گھڑی شہر میں کسی دوکاندار کے یہاں نہیں ملتی وہ ان کی دوکان پر دستیاب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی نظر اپنی آٹومیٹک کلائی گھڑی پر پڑ گئی جو گذشتہ ماہ تحفے کی شکل میں راجیندر نے اسے دی تھی۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ دفتر تو محض اس کے لیے ایک اڈا ہے جہاں پہونچ کر وہ اپنے دوستوں کی محفل میں گپ شپ کرتا ہے۔ جہاں اسے اپنے سوٹوں بوٹوں کی نمائش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دوسروں کی طرح روزی کمانے کے لیے نوکری نہیں کرتا۔ دفتر سے ملنے والی چھ سو روپے کی تنخواہ سے تو اس کا پندرہ بیس دن کا جیب خرچ ہی چل پاتا ہے۔

لیکن کبھی اس کے دماغ میں ایک دوسری رو بہنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اس کے بابوجی اور ماں اس کی پسند کو منظور کریں گے۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ گو وہ دونوں پڑھے لکھے ہیں لیکن اس طرح کی باتوں میں وہ دونوں ہی پرانے خیالات اور رسم و رواج کو اہمیت دیتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں اور برادری میں اپنی اونچی ناک کا انھیں بہت خیال رہتا ہے۔ اگر انھوں نے میرے جواس کو پسند نہ کیا تو۔۔۔۔ لیکن پسند کیسے نہیں کریں گے آخر انھوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے محض ایک بے زبان گڑیا نہیں اب تو میں اپنی مرضی کے مطابق ہی قدم اٹھاؤں گی۔ بہت دنوں آزمالیا ان کو۔ آخر انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ان کے بھروسے پر ہی تو میں نے اپنی جوانی کا بہترین حصہ ویسے ہی گزار دیا۔ اور یہ رشتے دار خاندان برادری والے یہ سب بیکار کے اڑنگے ہیں۔ ان سب کو بھی دیکھ لیا۔ اس معاملے میں کس نے بابوجی کی مدد کی۔ خالی بیکار کا زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ اوپر سے پریم اور ہمدردی دکھائیں گے لیکن من کے بڑے کالے ہیں یہ لوگ۔ کسی کا کام ذرا بنتے جا رہا ہو تو یہ ٹٹی کی آڑ میں اپنا چوک نشانہ مارنے سے باز نہیں رہیں گے۔ کسی کی خوشی میں ان کی خوشی کہاں۔

گاڑی اپنی رفتار سے دوڑتی جا رہی تھی اور اب سریکھا اپنی زندگی کے گزشتہ دس بارہ برسوں کے وقت پر نظر ثانی کرنے لگی تھی وہ اس عمر میں لوٹ گئی تھی جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ جب وہ تیزی سے کلی سے پھول میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جسم میں چمک اور نکھار آ رہا تھا۔ دن بدن بھرتے ہوئے سینے کولہے اور بانہوں کی گولائیوں کو آئینے میں دیکھ کر وہ اپنے آپ سے شرمانے لگتی تھی اور پھر منوہر کی شخصیت اس کے دماغی پردے پر ابھر آئی۔ منوہر جو اس پر پوری طرح لٹو تھا جو اکثر اس کی ایک چھوٹی سی جھلک پانے کے لیے بیقرار سا رہتا تھا۔ اور پھر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے جب اس نے اس کے سامنے اپنے پیار بھرے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پھر کبھی اس طرح کی بات کرنے کی منوہر میں ہمت نہیں ہوئی۔ شاید اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ کاش اس نے اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا ہوتا۔ کتنی ہی لڑکیاں تو رومانس لڑاتی ہیں اور پھر لو میرج کر لیتی ہیں۔ کاش اس نے بھی ایسا کیا ہوتا۔

ان دنوں اس پر بابوجی کی اور ماں کی نگرانی قدرے کڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ماں تو کبھی کبھی اسے لیکچر ہی پلانے لگتی تھی کہ بیٹی آجکل زمانہ بڑا خطرناک ہے ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے کبھی کبھی ذرا سی بھول کے لیے زندگی بھر پچھتانا پڑتا ہے۔ یہاں وہاں ادھر ادھر بنا مطلب کے نہیں جانا چاہیے۔ کتنی پابندیاں لگائی جاتی تھیں اس پر۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق کپڑے تک نہیں پہن سکتی تھی۔ یہ بلاؤز نہیں چلے گا۔ اس طرح کا کرتہ پہن کر کیا باہر جایا جاتا ہے۔ بالوں کی یہ ٹیڑھی مانگ تمھارے بابوجی پسند نہیں کرتے بڑوں کے سامنے سر ڈھک کر جایا کرو۔ بات کرتے وقت نظر نیچے رکھنی چاہیے۔

پھر سریکھا کو اس بات کی یاد آئی جب کانپور سے شری و شریمتی جوشی اپنے بیٹے اروند کے ساتھ اسے دیکھنے آئے تھے۔ یہ شاید پہلا موقع تھا جب کوئی اسے پسند کرنے آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے آنے سے پیشتر اس کے دل میں کتنے ہی رنگین ارمان مچل رہے تھے۔ جسم کی نسوں میں کیسا نشیلا رس گھل رہا تھا۔ اس نے نہ معلوم کتنی مرتبہ اور کس کس زاویے سے خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔ تب کتنا غرور تھا اسے اپنی خوبصورتی پر اپنی پوری شخصیت پر۔ وہ دن میں بھی صوفے پر پڑی پڑی دماغ میں سپنے سجاتی رہتی تھی کہ ان کے گھر کے سامنے والے میدان میں شامیانہ لگے گا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں، غبارے اور ہزاروں رنگین بلب اس پنڈال کی سجاوٹ میں چار چاند لگا دیں گے۔ وہ شادی کا جوڑا پہنے گی۔ ہاتھوں میں مہندی رچے گی۔ گوری گوری کلائیوں کو لال چوڑیاں اپنی گرفت میں کس لیں گی عورتیں سہاگ گیت گائیں گی وہ دلھن کے روپ میں کتنی خوبصورت لگے گی۔ اور پھر بینڈ باجے کے ساتھ بارات آئے گی وہ سہیلیوں کے ساتھ دروازے پر آئے گی۔ دولھا راجہ کے گلے میں جے مالا ڈالے گی۔ پھر

دہ دلہن بن کر سسرال جائے گی کوئی اس کا گھونگھٹ پلٹے گا اور پھر ... لیکن یہ سب محض ایک خواب ہی نکلا۔ شری دسترتھ جوشی کو لڑکی تو پسند آ گئی لیکن جہیز کی بات پہ بات آگے نہ بڑھی۔ وہ لوگ اس کے پتا کی بات کو ٹھکرا کر چلے گئے۔ تب اس نے من ہی من اس سماجی نظام کے ٹھیکیداروں کو کتنی گالیاں دی تھیں اس کا بس چلتا تو وہ جہیز کی بے جا مانگ کرنے والوں کا منہ نوچ لیتی۔ ان کی بوٹی بوٹی کر دیتی لیکن وہ محض پریشان سی ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کے بعد اکثر گھر میں اس کے رشتے کی باتیں ہوتی رہتیں کبھی کسی شہر سے کچھ لوگ اسے دیکھنے آئے کبھی بن سنور کر اسے ماں کے ہمراہ کسی پارک میں جانا پڑتا کبھی اسے دکھانے کے لیے کسی چائے پارٹی میں لے جایا جاتا بہانے بہانے سے کہاں کہاں اور کن کن لوگوں سے دکھانے کے لیے اسے نہیں لیجایا گیا۔ کتنی بار اسے اس طرح کی اداکاری کرنی پڑی۔ لیکن آنے والے کوئی نہ کوئی کمی کھوج کر اسے نامنظور کر کے چلے جاتے۔ کئی مرتبہ اس کے نازک دل پر چوٹیں پہنچائی گئیں۔ اس کے دل میں اس سماج کے لیے بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ آخر مجھ میں کیا کمی ہے۔ پڑھی لکھی ہوں، پوسٹ گریجوٹ ہوں، ساڑھے پانچ سو تنخواہ پاتی ہوں۔ یہ مانتی ہوں کہ میں بہت خوبصورت نہیں ہوں۔ لیکن بدصورت بھی تو نہیں ہوں۔ ذرا تھوڑا گندمی رنگ ہے تو کیا ہوا۔ اس سے کیا خاص فرق پڑتا ہے۔ کتنے ہی لوگ تو اس صورت کو محض دیکھنے کے لیے بیقرار رہتے ہیں۔ پھر سریکھا کو ان دنوں کی یاد آنے لگی۔ جب وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ پڑھائی میں تو وہ تیز تھی ہی۔ اس کے کتنے ہی ہم جماعت اس سے دو بات کرنے کو ترستے رہتے تھے۔ نہ معلوم کتنوں کے دلوں میں ارمان مچلتے ہوں گے کہ کاش ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کسی ہوٹل یا کافی ہاؤس میں ناشتہ وغیرہ کرے۔ کبھی سینما دیکھنے چلے لیکن وہ تھی کہ اپنی شخصیت پر سنجیدگی کا مصنوعی پردے ڈالے رہتی تھی۔ آج وہ پچھتا رہی تھی کہ شرم و حیا کے اس جال میں اپنے آپ کو پھنسا کر اسے کیا ملا۔ آج باوجی اور ماں اسے کسی بھی قیمت پر بیچنے کے لیے کہاں کہاں نہیں جاتے لیکن کوئی خریدار اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پرانی بنا آب شئے کوئی کیوں خریدے گا۔ گذشتہ دسمبر میں اس نے اپنی زندگی کے تیس برس پورے کر لیے ہیں وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی جوانی کی چمک اس کے جسم کو الوداع کہہ رہی تھی۔ آخر شادی کرنے کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ اچھے خاندانوں کے تعلیم یافتہ اور برسر روزگار لڑکے تو پچیس ستائیس سال کی عمر میں شادی کر ہی لیتے ہیں۔ کون اس کی راہ دیکھتا رہتا اور پھر تھوڑی دیر بعد اسے کچھ تسکین محسوس ہوئی تھی کہ اس نے ٹھیک ہی کیا جو شرم و حیا کو چھوڑ کر راجیندر سے رسم و راہ بڑھالی۔ اسے راجیندر میں لگ بھگ وہ سبھی خوبیاں نظر آ رہی تھیں جو ایک اچھے رفیق حیات میں ہونی چاہئیں۔ وہ گھر پہنچ کر اپنے دل کی بات بلکہ اپنا آخری فیصلہ باوجی اور ماں کو بتا دے گی اور اگر انھوں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ بغاوت کی کسی بھی حد تک پہونچ جائے گی۔ اب وہ ان کی ایک نہیں سنے گی۔ اس نے انکی بیٹی پر دری کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ اگر انھوں نے اپنی منظوری نہ دی تو مجبور ہو کر اسے سول میرج کے رجسٹرار کا سہارا لینا پڑے گا۔ مجھ کو دکھانے کے لیے کسی کو بلانے سے پیشتر اگر مجھ سے پوچھ لیا گیا ہوتا تو کون سی مصیبت آ جاتی۔ بڑے آئے تار دے کر بلانے والے۔

خیالات کی اسی ادھیڑبن میں وہ صبح گھر پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں جھاڑ پونچھ کر رہی تھیں۔ چیزوں کو قرینے سے سجا رہی تھیں۔ باوجی شیو کر رہے تھے اور ماں پوجا والے کمرے میں بھگوان کی تصویر کے سامنے پوجا پاٹھ میں مشغول تھی۔ اسے دیکھ کر سب نے اس کا خیر مقدم کیا۔ سب کے چہروں پر خوشی اور امید رقص کر رہی تھی۔ باوجی اور ماں کے طرز گفتگو اور چہروں کو دیکھ کر اسے لگا کہ وہ آنے والے مہمانوں سے کافی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ باوجی کے خطوط اور اس کے فوٹو سے وہ لوگ کافی مطمئن ہو گئے تھے اور انھوں نے لگ بھگ اپنی منظوری کا خط بھی بھیج دیا تھا۔ اب وہ محض ابتدائی رسم اور آگے کا پروگرام ہی طے کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سریکھا اور گھر کے دیگر ممبران چائے پی رہے تھے آنے والے مہمانوں کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی تبھی ماں نے بابوجی سے کہا کہ گاڑی آنے سے پندرہ بیس منٹ پیشتر ہی مہمانوں کو ریسو کرنے کے لیے وہ ریلوے اسٹیشن پر ضرور پہنچ جائیں۔ سریکھا کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوب رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بغاوت اور سول میرج کی بات سوچ رہی تھی لیکن اب اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی ہو۔ اسے اپنا حلق سوکھتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن نہیں وہ خاموش نہیں رہے گی۔ وہ اپنے دل کی بات بلکہ اپنا آخری فیصلہ بابوجی و ماں کو بتا کر رہے گی۔ اس وقت اس کی خاموشی سے سب کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ اس کا راجیندر اس کے متعلق کیا سوچے گا۔ نہیں وہ اسے دھوکا نہیں دے گی۔ تبھی ہمت بٹورنے کے لیے اور دماغ کو دوسری طرف موڑنے کے لیے وہ تپائی پر رکھے اخبار کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ایک خبر کو پڑھ کر وہ چونک اٹھی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر گھونسہ مار دیا ہو۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنے خوابوں کا محل مسمار ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ بابوجی اور ماں کو اپنا آخری فیصلہ نہیں بتا سکے گی۔ شاید اب وہ زندگی بھر بغاوت اور سول میرج کی بات سوچ تک نہ پائے گی۔ اب اسے لگا تھا کہ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی۔ وہ راجیندر جس کے اخلاق پر اسے اتنا بھروسہ تھا جسے وہ ایک باعزت رفیقِ حیات سمجھے بیٹھی تھی وہ اس وقت اپنے باپ کے ساتھ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ پولیس کے ایک خاص دستے نے ان کے گھر پر چھاپا مارا تھا گھر کے اندر ایک تہہ خانے سے اسمگلنگ کی لگ بھگ اسی ہزار روپے کی مالیت کی گھڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔

فنِ سیرت نگاری: (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

تعویق ہوئی کہ اب میں تنہا رہ گیا ہوں (بیوی کی وفات کی طرف اشارہ ہے) اور اس خوشخبری میں اپنی شریک حیات کو شریک نہیں کر سکتا۔ اس میں اس قدر دیر کی گئی کہ میری شہرت عام ہو گئی اور اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔

میرا گمان ہے کہ یہ بدخوئی یا احسان فراموشی نہ سمجھی جائے گی اگر کسی شخص کے اس احسان کا اعتراف شکر گزاری کے ساتھ نہ کیا جائے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا ہو یا یہ کہ میں اس بات کو پسند نہ کروں کہ لوگ سمجھیں کہ میں اس کامیابی کے لیے کسی مربی یا سرپرست کا ممنون احسان ہوں جو محض فضل ایزدی سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔

علم و ادب کے کسی سرپرست کا احسان اٹھائے بغیر جب میں نے لغت نگاری کے کام کو اس منزل تک پہنچا دیا ہے تو اگر میں اسے اسی حالت میں ختم کر دوں تو میں مایوس نہ ہوں گا کیونکہ عرصہ ہوا میں اس خواب امید سے بیدار ہو چکا ہوں جس کے مزے میں کبھی بڑے فخر کے ساتھ لیا کرتا تھا۔ جناب کا نہایت خاکسار و فرمانبردار خادم

سیموئل جانسن"

خالد ندیم
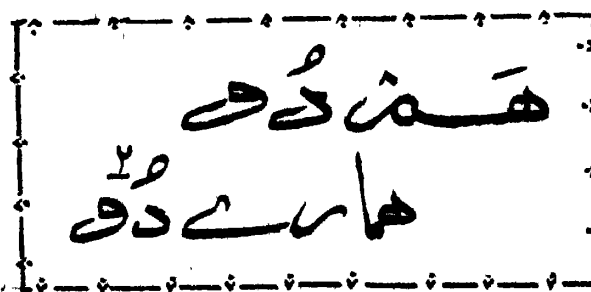
اس کا ذکر کریں

شعور و حق و صداقت کی انتہا گاندھی
وفا و مہر و مروت کا آئینا گاندھی
رہِ خلوص و مروت کا رہنما گاندھی
سکون و امن کا پیکر مہاتما گاندھی
جسے ہر اک سے محبت تھی اس کا ذکر کریں
دلوں پہ جس کی حکومت تھی اس کا ذکر کریں

وہ کوہکن تھا اسی کوہکن کی بات کریں
وہ صف شکن تھا اسی صف شکن کی بات کریں
اسی کی رسم اسی کے چلن کی بات کریں
اسی کے ذوق اسی کی لگن کی بات کریں
جسے عزیز تھا جو سازِ آرزو چھیڑیں
پریم و ستیہ و اہنسا کی گفتگو چھیڑیں

عجیب شان و ادا سے کھلا لبِ فریاد
عجیب ڈھب سے کیا چاک دامنِ بیداد
چمن جو اجڑا ہوا تھا اسے کیا آباد
وطن کو اس نے غلامی سے کر دیا آزاد
ندی تمام مصائب کی پاٹ دی اس نے
بغیر تیشہ کے چٹان کاٹ دی اس نے

وہ جس نے بکھری ہوئی زلف کو سنوار دیا
وہ جس نے اجڑے ہوئے روپ کو نکھار دیا
وہ جس نے روٹھی ہوئی زندگی کو پیار دیا
وہ جس نے گرتی ہوئی قوم کو ابھار دیا
اندھیری رات میں آیا خوشی کی دھوپ لیے
وہ دیوتا تھا مگر آدمی کا روپ لیے

وہ شانتی کا پجاری تھا امن کا پیکر
وہ آشتی کا پرستار صبر کا خوگر
تمام عالمِ انسانیت کا تھا رہبر
یقین و عزم کا پتلا مگر بدن لاغر
ندیم آہنی زنجیر توڑ دی اس نے
کلائی ظلم و تشدد کی موڑ دی اس نے

محمد غلام رسول اشرف

یہ ہندوستاں ہے

نشاں ہائے عظمت ہیں اس کی جبیں پر
تقدس فدا اس کے تخت و نگیں پر
گگن کو تفوق بہشتِ بریں پر
مجھے ناز کیوں ہو نہ اس سرزمیں پر
یہاں سرنگوں رفعتِ آسماں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

مجھے عشق ہے اس کے دشت و دمن سے
ہمالہ سے، وادیٔ گنگ و جمن سے
میں مانوس ہوں اس کے ہر اک چمن سے
مشابہ ہے ہر سنگ، لعلِ یمن سے
یہاں کی فضا پر فدا میری جاں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

یہ پاکیزہ ماحول، یہ چاند تارے
یہ کہسار و دریا، یہ دل کش نظارے
لگیں یوں کہ جنت سے اترے ہیں سارے
مسرت سے شام و سحر دل پکارے
زمینِ وطن غیرتِ صد جناں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

ہے خیر و اماں کا یہ شفاف درپن
وفاؤں کا مامن ہے ہر فرد کا من
رہا ہے یہ ولیوں کا رشیوں کا مسکن
یہ ہے علم و تہذیب و حکمت کا مخزن
جو خوبی یہاں ہے بعید از بیاں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

مجھے کیوں نہ ہو عشق ہندوستاں سے
تمدن کے پھوٹے ہیں چشمے یہاں سے
بہت دور ہیں اس کے گلشن خزاں سے
وطن میرا بہتر ہے سارے جہاں سے
یقیناً یہ مہر و محبت نشاں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

محمد اسحاق صدیقی

بھوکی بے چین دنیا

ہر طرف انسان ہی انسان، سڑک پر انسانوں کا بے پناہ ہجوم، فٹ پاتھ پر چلنے کے لیے جگہ نہیں۔ آخر آدمی چلے تو کیسے؟ ذرا سا فاصلہ طے کرنا مشکل۔ ہر دم ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی زبردست میلہ ہے جس میں ہم پھنس گئے ہیں جوں کی چال سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جب ریلا آتا ہے آگے بڑھ جاتے ہیں ورنہ پھر ایک جگہ تھم جاتے ہیں۔ موٹروں کا دھواں اور ان کے ہارن کی آوازیں، اسکوٹر اور موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، سائیکل اور رکشا والوں کی گھنٹیاں۔ شور سے کان پھٹے جاتے ہیں، دھوئیں کی بو سے متلی ہوتی ہے ——— لیکن کیا کیا جائے اس بھیڑ کو بڑھانے والے ہم ہی تو ہیں۔

بھیڑ سڑکوں ہی پر نہیں، ہر جگہ ہے، کیا گھر، کیا باہر، کیا دفتر، کیا کارخانہ، کیا سینما، کیا اسپتال، انسانوں کا امڈتا ہوا سیلاب تھمنے کا نام نہیں لیتا۔

سرکار کا کیا کہنا ہے: "چھوٹا پریوار سکھی پریوار ——— "ہم دو۔ ہمارے دو ——" لیکن سرکار کا کہنا کون سنتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بچے پیدا کرنا ان کا پیدائشی حق ہے، روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنا سرکار کا کام ہے۔ گویا سرکار ہم سے الگ کوئی چیز ہے یا سرکار کے ہاتھ میں جادو کا ڈنڈا ہے کہ ادھر گھمایا ادھر عالیشان مکان بن گئے، اور ہر ایک کی ضرورت کی چیزیں منہ سے نکلتے ہی حاضر ہو گئیں۔

روزگار کی تلاش میں چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کے لوگ بھاگ کر بڑے شہروں میں جاتے ہیں اور جب انھیں وہاں رہنے کے لیے مکان نہیں ملتا تو فٹ پاتھ پر یا شہر کے کنارے جھونپڑیوں میں جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کولھو کے بیل کی طرح کام کرنے اور لائنیں لگانے میں ختم ہو جاتی ہے ——— کبھی نل کے سامنے کبھی راشن کی دکان پر، کبھی سڑک پار کرنے کے لیے، کبھی بس کے انتظار میں، کبھی اسپتال یا مطب میں ——— آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ لائنیں لمبی ہوتی جائیں گی۔ ان کے چھوٹا ہونے کا کوئی امکان نہیں، جب تک انسان خود اپنی آبادی کو بڑھنے سے نہ روک دے۔

آبادی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے، اس کا اندازہ یوں کیجیے کہ ہمارے ملک کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۳۶ کروڑ ۱۰ لاکھ تھی جو ۱۹۷۱ء میں ۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی۔ گویا ۲۰ سال میں ۱۸ کروڑ ۷۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس وقت ملک کی آبادی تقریباً ۶۰ کروڑ ہے اور اسی رفتار سے آبادی بڑھتی رہی تو اب سے ۲۸ سال بعد یعنی ۲۰۰۴ء میں یہ آبادی ایک ارب ۱۶ کروڑ ۲۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

ہمارے ملک کی ۸۰ فی صد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے ہندستان میں تقریباً ۵،۶۷،۰۰۰ دیہات ہیں۔ تقریباً ۴½ کروڑ دیہاتیوں کے پاس کھیتی کے لیے زمین نہیں ہے۔ وہ مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ ملک میں تقریباً ۸ کروڑ ۲۷ لاکھ ایسے خاندان ہیں جن کے پاس یا تو رہنے کے لیے مکان نہیں ہے یا جو مکانات

ہیں، وہ رہنے کے لائق نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک میں ہر چار خاندان کے بعد پانچویں خاندان کے پاس یا تو مکان نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو صرف نام کے لیے۔ ایسے لوگ جن کے پاس مکان نہیں ہیں اُن میں سے ۶ کروڑ دیہی علاقے میں رہتے ہیں۔

تعلیم کے معاملے میں بھی ہم کافی پچھڑے ہوئے ہیں ملک میں اَن پڑھ لوگوں کی تعداد ۳۸ کروڑ ۶ لاکھ ۵۰ ہزار ۵۳۷ ہے۔

ہندستان میں فی کس آمدنی دنیا میں سب سے کم ہے۔ عجیب بات ہے کہ ملک کی قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن فی کس آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا سبب بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔

ان اعداد و شمار سے کچھ اندازہ ہندستان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور غریبی کا ہو سکتا ہے۔ اب ذرا دنیا کی آبادی پر ایک نظر ڈالیے۔

آبادی کے لحاظ سے دنیا میں پہلا نمبر چین کا ہے جس کی آبادی ۸۵ کروڑ سے زائد ہے۔ ہندستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے جس کی آبادی تقریباً ۶۱ کروڑ ہے۔ ان دونوں ملکوں کی مجموعی آبادی (ایک ارب ۴۶ کروڑ) پوری دنیا کی آبادی کا لگ بھگ ایک تہائی ہے۔

دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے دس بڑے ملک یہ ہیں:
(۱) چین (۲) ہندستان (۳) روس (۴) امریکہ
(۵) جاپان (۶) انڈونیشیا (۷) برازیل (۸) مغربی جرمنی
(۹) بنگلہ دیش (۱۰) نائجیریا۔

ان ملکوں کی مجموعی آبادی دنیا کی آبادی کا دو تہائی ہے۔ براعظم ایشیا کی آبادی دنیا کی آبادی کا ۸٫۶۵ فی صد ہے گویا ایشیا میں دنیا بھر کی نصف آبادی رہتی ہے اور دنیا کے ہر دو افراد میں ایک ایشیائی ہے۔ سب سے کم آبادی والا براعظم آسٹریلیا ہے، جس کی آبادی دو کروڑ سے کچھ زائد ہے۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ گزشتہ صدی کے وسط میں ساری دنیا میں تقریباً ایک ارب انسان تھے۔ انسانی آبادی کو یہاں تک پہنچنے میں ہزاروں سال لگے تھے لیکن اسی آبادی کو دوگنا ہونے میں سو سال سے بھی کم لگے اور اس کے صرف تیس سال بعد انسانی آبادی تین ارب ہو گئی:

۱۶۰۰ء	۵۰ کروڑ
۱۸۵۰ء	۱ ارب
۱۹۳۰ء	۲ ارب
۱۹۶۰ء	۳ ارب

دنیا کی موجودہ آبادی چار ارب ہے یعنی ۱۶ سال میں ایک ارب انسانوں کا اضافہ ہوا۔ اضافہ آبادی کی رفتار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں دنیا میں فی سکنڈ ۴٫۲ بچے پیدا ہو رہے تھے اور ۱٫۷ انسان مر رہے تھے گویا آبادی میں ۲٫۵ فی سیکنڈ کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روزانہ ایک لاکھ ۹۰ ہزار نئے کھانے والے پیدا ہو رہے تھے۔ آبادی میں سالانہ اضافہ ۷ کروڑ ۱۰ لاکھ تھا۔ یہ تعداد پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ہلاک ہونے والے کل انسانوں سے زیادہ تھی۔ انسان کی بار آوری نے ان اعداد و شمار کو بھی اب پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

دنیا میں روزانہ تین لاکھ ۵۰ ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں اور ایک لاکھ ۳۵ ہزار انسان مرتے ہیں گویا روزانہ ۲ لاکھ ۱۵ ہزار کا اضافہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یہ آبادی جو دو فی صدی سالانہ کی شرح سے بڑھ رہی ہے اب کی دوگنی ہو جائے گی۔ دنیا کی موجودہ آبادی کو زندہ رکھنا ہی مشکل ہے۔ ذرا سوچیے ۲۰۰۰ عیسوی تک یعنی اب سے صرف ۲۴ سال بعد انسانوں کی کیا حالت ہوگی۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی کے آغاز میں تقریباً سات ارب آبادی ہوگی۔ اس آبادی کو دوگنا ہونے میں صرف ۳۵ سال لگیں گے اور پھر اُسے دوگنا ہونے میں محض ۹ سال

دنیا کے بعض حصّوں میں پیدائش کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ اگر اُسے روکا نہ گیا تو صرف سو سال میں دنیا کی آبادی ۵۵ ارب تک جا پہنچے گی اور ۵۰۰ سال کی مدت میں موجودہ آبادی کی ۰۰۰ ۲۲ گنا ہو جائے گی اور تب زمین پر ہر انسان کے لیے ایک مربع گز زمین یعنی کھڑے رہنے بھر کی جگہ رہ جائے گی۔

لیکن آپ اتنی دور کی بات کیوں سوچیں؟ موجودہ صورت حال پر نظر ڈالیے۔ دنیا میں روزانہ تقریباً دو لاکھ انسانوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ جنھیں بسانے کے لیے ایک چھوٹا شہر چاہیے۔ ہر مہینے ۶۰ لاکھ آبادی والا ایک بڑا شہر اور ہر سال مغربی جرمنی کے برابر ایک نیا ملک۔ ذرا سوچیے ایک سال میں بڑھنے والی آبادی یعنی ۷ کروڑ ۳۰ لاکھ انسانوں کے لیے روٹی کپڑا، مکان اور روزی فراہم کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جتنی بھی کوشش کی جاتی ہے اُس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ یعنی انسانی آبادی میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا ہے اُس رفتار سے ہم اس کی ضرورت کی چیزیں نہیں مہیا کر سکتے۔ کھانے کے لیے اناج، رہائش کے لیے مکان علاج کے لیے اسپتال، تعلیم کے لیے اسکول اور روزگار کے لیے دفتر اور کارخانے اتنی تیزی اور آسانی سے فراہم نہیں کیے جا سکتے جس تیزی اور آسانی سے بچے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا ایک انفرادی فعل ہے لیکن اُس کی ضرورت کی چیزیں فراہم کرنے کے لیے پورے انسانی سماج کے تعاون کی ضرورت ہوتی

اضافۂ آبادی کی ایک وجہ یہ ہے کہ موت کی شرح گھٹ رہی ہے اور اوسط عمر بڑھ رہی ہے، یعنی لوگ مرتے کم ہیں، پیدا زیادہ ہوتے ہیں، اور زیادہ عمر تک جیتے ہیں، اس کی وجہ سائنس کی ترقی ہے۔ پہلے جو امراض جان لیوا تھے، اب اُن سے لوگ کم مرتے ہیں: بچوں اور عورتوں کی قبل از وقت موتوں میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور دیہی علاقوں میں چھوٹے اسپتال قائم کر کے طبی سہولتیں دی جانے لگی ہیں۔ ہندستان میں اب مردوں کی اوسط عمر ۵۰ سال ۷ ماہ اور عورتوں کی ۴۹ سال ۲ ماہ ہے جبکہ آزادی سے پہلے مردوں کی اوسط عمر ۲۲ سال ۶ ماہ اور عورتوں کی ۳۱ سال ۷ ماہ ہوتی تھی۔

اضافۂ آبادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پہلے کے مقابلے میں ارضی اور سماوی آفات (زلزلے، سیلاب، قحط اور وباؤں) سے لوگ اب کم مرتے ہیں کیونکہ نقل و حمل کے اتنے ذرائع نکل آئے ہیں کہ بروقت امداد سے مصیبت زدہ لوگوں کو بڑی حد تک مرنے سے بچا لیا جاتا ہے۔

مسئلۂ آبادی کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ امیر ملکوں کے مقابلے میں غریب ملکوں میں آبادی کے اضافے کی شرح دُگنی ہے۔ اس وقت بھی غریب ملکوں میں امیر ملکوں کے مقابلے میں تقریباً تگنی آبادی ہے۔ دنیا میں بیس سال سے کم عمر والی آبادی کا نصف حصّہ غریب ملکوں میں آباد ہے۔ ذرا سوچیے ان غریب ملکوں (یعنی ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکا کے ممالک) میں پیدا ہونے والے بچوں کا مستقبل کیا ہے؟

دنیا کی آبادی کا ۲۴ فیصد حصّہ یورپ، شمالی امریکا اور جاپان میں آباد ہے۔ اور ان ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی دنیا کی کل سالانہ آمدنی کا ۸۲ فی صد ہے جب کہ غیر ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی ۱۸ فی صد ہے اور آبادی ۷۶ فی صد ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی خوراک ہے اگر وہ سب جمع کر کے دنیا کے سارے انسانوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جائے تو ہر شخص کو روزانہ ایک چائے کی پیالی بھر کھانا ملے گا۔ آپ کو یہ جان کر دکھ ہوگا کہ دنیا کی دو تہائی آبادی کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، دنیا کی نصف آبادی جوتے نہیں پہنتی اور دنیا کی دو تہائی آبادی اَن پڑھ ہے۔

اگر دنیا کی آبادی کو بڑھنے سے روکا نہ گیا تو حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے، کیونکہ جیسے جیسے آبادی بڑھتی جائے گی فی کس آمدنی گھٹتی جائے گی۔ ضروریات زندگی اور جگہ کی کمی کی وجہ سے لوگ خود غرض ہو جائیں گے۔ جب بے کاری

بڑھے گی تو [illegible] میں اضافہ ہوگا۔ عدالتیں مقدمات سے اور جیلیں مجرموں سے بھر جائیں گی۔ مفلس اور صاحبِ حیثیت کے درمیان کشمکش بڑھتی جائے گی۔ لوٹ مار شروع ہو جائے گی۔ حکومتِ وقت کے لیے ملک میں امن و امان قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اناج اور دواؤں کی کمی کی وجہ سے بھوک اور بیماریوں سے مرنے والوں کو بچانا ناممکن ہو جائے گا۔

اس تاریک مستقبل سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ بعض سیاست دانوں کا خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا واحد حل تیسری جنگ عظیم ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑ کر مر جانا کون سی دانش مندی ہے۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے۔ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو نہ کسی کی جیت ہوگی نہ کسی کی ہار۔ دنیا البتہ تباہ ہو جائے گی اور جنگ کے ساتھ دنیا سے تہذیب و تمدن کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو بچ جائیں گے، زندہ درگور ہوں گے۔ اُن کی زندگی اتنی تکلیف دہ ہوگی کہ وہ خودکشی کر لینا ہی بہتر سمجھیں گے۔ اس لیے بھلائی اسی میں ہے کہ ہم آبادی کو جلد سے جلد بڑھنے سے روک دیں اور اس کا واحد طریقہ خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید کے طریقوں پر پر عمل کرنا ہے۔

آج دنیا کے ہر ملک میں خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید پر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن تنگ نظر اور خود غرض عناصر نسل، زبان، مذہب یا تہذیب کے نام پر اور سیاسی اغراض کے تحت اس کام میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ اب اگر اُن کی بات مان لی جائے اور خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید کے طریقوں پر عمل نہ کیا جائے تو دنیا کی آبادی بڑھتی ہی چلی جائے گی اور لوگ یا تو لڑ کر مر جائیں گے یا پھر قحط اور وباؤں کا شکار ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ تم اپنی اولاد کو زمانے اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے ہو یا جنگ کا ایندھن بنانے کے لیے تیار ہو یا اتنی ہی اولاد پیدا کرنے پر رضامند ہو، جن کی ضرورتیں تم اور تمہارا ملک پوری کر سکے؟ آخر قدرت نے تمھیں دماغ کس لیے دیا ہے؟ تم سوچتے کیوں نہیں؟ "چھوٹا پریوار سکھی پریوار" محض پروپیگنڈہ نہیں حقیقت ہے۔ جاؤ ان کنبوں کی حالت دیکھو جن کے دو یا تین بچے ہیں اور اُن کی حالت کا مقابلہ ان خاندانوں سے کرو جن کے آدھے درجن یا زیادہ بچے ہیں۔ دونوں میں کون سکھی ہے؟ کم اولاد والے یا زیادہ اولاد والے؟ زیادہ بچے پیدا کرنا غریبی کو دعوت دینا ہے۔ دنیا میں غریب ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ غریب کی تو عزت آبرو تک بک جاتی ہے اور بچے زمانے کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑوں میں کن کی صحت اچھی ہے، ان کی جو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کرتے ہیں یا جو ہر سال بچے پیدا کرتے ہیں؟ دو یا تین تندرست بچے اچھے یا درجن بھر مریل بچوں کی فوج جو ہر وقت بھوک کی رٹ لگاتی رہے۔

ہندوستان میں ۱۹۵۱ سے حکومت خاندانی منصوبہ بندی کا پرچار کر رہی ہے لیکن جیسی کامیابی ہونا چاہیے تھی نہیں ہوئی اس کی وجہ تعلیم کی کمی اور عوام کی بے حسی ہے۔ جب تک ہر تعلیم یافتہ شخص گھر گھر خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام نہ پہنچائے گا، خصوصاً نچلے طبقے میں اور خود اس پر سختی سے عمل نہ کرے گا، تنہا حکومت کی کوشش ناکافی ہے۔

★

طاہر حسین الماس

وقت کی آواز

(فیملی پلاننگ سے متعلق)

شرحِ پیدائشِ اطفال اگر ہو نہ طویل
وقت کے حکم کی ہوجائے گی خود ہی تعمیل

چند بچوں سے زیادہ کی ضرورت کیسی
بن ہوئے بچوں سے آخر یہ محبت کیسی

کیا خوشی بچوں کی، دولت ہی اگر پاس نہ ہو
زیادہ بچے ہوں تو ممکن نہیں، افلاس نہ ہو

فائدہ کیا ہے اگر بچوں کو کھانا نہ ملے
کھانا مل جائے غریبوں کو تو کپڑا نہ ملے

بحرِ تعلیم سے بچے جو کنارا کش ہوں
صاف ظاہر ہے کہ ناکارہ رہیں سرکش ہوں

پڑھ نہ پائیں گے تو اوباش لفنگے ہوں گے
ان کے باعث کہیں جھگڑے کہیں دنگے ہوں گے

کس طرح اہلِ وفا، اہلِ بصیرت ہوں گے
ملک و ملت کے لیے باعثِ ذلت ہوں گے

چند اطفال کو تعلیم دلا سکتے ہو،
ان کو حیوان سے انسان بنا سکتے ہو

بچے پڑھ لکھ کے جو حیوان سے انساں ہوجائیں
اہلِ دنیا کے لیے درد کا درماں ہو جائیں

بحرِ تعلیم کے بچے جو شناور ہوں گے
کئی گاندھی، کئی نہرو، کئی جوہر ہوں گے

صرف جذبات کی رَو میں نہیں بہنا سیکھو
اے وطن والو، حقیقت کو سمجھنا سیکھو

تم سے کیا کہتے ہیں، حالات کے انداز سنو
ذہن کے ساتھ چلو، وقت کی آواز سنو

منوہر لال ہادی

دو اکتوبر

(سانیٹ)

آج کے دن کوئی آیا تھا یہاں، سنتے ہیں
جس کو تفویض ہوا تھا بڑا مشکل منصب
آدمی تھا کہ وہ تھا حُبِّ وطن کا کوکب
جس کی ہر سانس میں تھا عزمِ جواں سنتے ہیں

اس ستارے کی ضیا ہند میں جب پھیل گئی
جذبۂ حبِّ وطن نشو و نما پانے لگا
ہم کو زنداں میں چراغاں بھی نظر آنے لگا
ظلمتِ دل نہ رہی، تیرگیِ جاں نہ رہی

اس کو سوجھی کہ اہنسا کی اٹھا کر شمشیر
اپنے گلشن سے فرنگی کو نکالا جائے
رخشِ قسمت کو نئی راہ پہ ڈالا جائے
دیکھتے دیکھتے ہی ملک کی کاٹی زنجیر

کامیابی سے نوازا اسے بھگوانوں نے
پاؤں چومے بھی فرزانوں نے، دیوانوں نے

سعادت نظیر

اردو کا ایک گمنام شاعر
عبدالوہاب صرفی

اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا حیدر آباد برسوں سے شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے جہاں ہزاروں ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جن میں بعضوں نے نام کمایا اور اپنی تخلیقات سے اردو ادب میں گراں مایہ اضافہ کیا مگر کئی ایک قلم کار مناسب حوصلہ افزائی کی کمی کے سبب منظرِ عام پر نہ آسکے یا نامساعد حالات کا شکار ہوئے اور بہت سے ایسے بھی گزرے جنہوں نے شہرت سے گریز کی اور اپنے رشحاتِ قلم کو صرف اپنے ہی ذوق کی تسکین کے لیے کافی سمجھا یا اپنے ہم مذاق دوست احباب کی حد تک محدود رکھا۔ فن کاروں کے اسی آخری گروہ سے ایک سید عبدالوہاب صرفی بھی ہیں جنھوں نے موسٰی ندی کی قیامت خیز طغیانی سے چار سال پہلے ۱۹۰۴ء کو شہر حیدر آباد کے مردم خیز محلہ سلطان شاہی میں ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے والد سید عبدالرزاق جو ایک آزاد منش بزرگ تھے بچپن ہی میں انھیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے پھوپھا مولوی محمد فاضل نے انھیں اور ان کے بھائی بہن کو اپنی سرپرستی میں لیا اور ان کی تعلیم و تہذیب کا انتظام کیا لیکن شومِ بختی کہ فاضل صاحب نے بھی جلد دنیا سے منھ پھیر لیا۔ اب بیوہ ماں اور یتیم بھائی بہن کے سوا صرفی کا کوئی نہ تھا، نامساعد حالات نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ علم کی طلب گھٹنے کے بجائے بڑھتی گئی اور لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل کی، اسی طرح فارسی اور عربی بھی سیکھی البتہ کبھی کوئی شک ہوتا تو اپنے بڑے بھائی حکیم ابوالافتخار سید عبدالغفار فخر سے جو حیدر آباد کے ایک ذی علم اور کہنہ مشق شاعر تھے دور کر لیتے۔ کسی استاد کی مدد کے بغیر صرف فطری استعداد، ذوقِ جستجو اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں اردو، فارسی اور عربی ادبیات کا مطالعہ کرنا کچھ سہل نہیں مگر صرفی نے اس کارِ مشکل کو آسان کر دکھایا۔ حافظہ اس غضب کا پایا تھا کہ ہر زبان کے اچھے شعر نوکِ زبان پر تھے۔ کبھی کہیں کوئی علمی گفتگو چھڑ جاتی تو کئی شعر روانی سے سنا دیتے یا سند کے طور پر مختلف کتابوں کے حوالے پیش کر دیتے جس سے نہ صرف ان کی زبردست قوتِ یادداشت کا اظہار ہوتا بلکہ ان کے تبحرِ علمی کا بھی پتہ چلتا، لیکن ۵۵ اپنے آپ کو کبھی منتہی نہ سمجھتے جس کا ثبوت ان کی یہ مناجات ہے ؎

> فرطِ رافت پر تری، موقوف ہے میرا دماغ
> زندگی کا ہے مری، تیرے کرم ہی پہ مدار
> دولتِ علم و عمل سے مجھ کو مالا مال کر
> طبع کو میری تو استغنا کے زیور سے سنوار

لہ یگانہ چنگیزی کے ہم عصر اور دوست تھے، شہید یار جنگ کے پاس میں نے یگانہ کو انھیں اپنی فارسی غزلیں سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ سعادت نظیر

دہر میں کوئی نہیں تیرے سوا میرا کفیل
کون ہے تیرے سوا دنیا میں میرا غم گسار
بے نوائی سے ہوں دنیا کی نگاہوں میں حقیر
بے گمانی سے ہوں میں اپنی نظر میں آپ خوار
ناز کرتا ہوں تری حمد و ثنا پر رات دن
اپنے ایسوں کی خوشامد سے مجھے آتی ہے عار
صرف تو دونوں جہاں میں ایک حاکم ہو مرا
نفسِ سرکش ہو مرا محکوم اے پروردگار
اعترافِ جہلِ کامل کی مجھے توفیق دے
تا کہ میں بھی انتہائے علم کی دیکھوں بہار

صرفی ایک خوددار اور حساس انسان تھے جب گھر کو مالی مشکلات میں گھرا پایا تو غمِ روزگار دل میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگا ؎

آدمی ہوں میں فرشتہ تو نہیں
کوئی کب تک ضبط کرتا جائے گا؟

تلاشِ معاش میں عروس البلاد بمبئی کا رُخ کیا جس کو فردوسِ بریں سے کچھ کم نہ پایا۔ اس کے خوش نما گلی کوچے، جن کے دامن میں دل کشی کے ہزاروں سامان موجود تھے، دعوتِ نظارہ دیتے محسوس ہوئے، کہیں یوسفی حسن نظر آیا تو کہیں زلیخائی شان اور کہیں سارہ و ثریا کا نشاط آہنگ جلوہ ہائے جمال ؎

نہیں یہ بمبئی، خلدِ بریں ہے
وہاں کیا ہے؟ یہاں پہ کیا نہیں ہے
یہاں کا کوچہ کوچہ ہے خیاباں
زلیخا زار ہے اور یوسفستاں
یہ لالہ رُخ ہے اور وہ گلبدن ہے
یہ نسرین، نسترن وہ یاسمن ہے
کوئی خورشید کوئی ماہ پارہ
نشاط آہنگ ہے ہر اک نظارہ
مجسم رنگ ہے کوئی کوئی نور   کوئی ہے جلوۂ برقِ سرِ طور

بمبئی میں ایک بزرگ شاعر و سیاح نظر کے ہاں قیام کیا دیگر علمی شخصیتوں سے ربط ضبط بڑھایا اور علمی تبادلۂ خیال کیا جس سے صرفی کے جوہر نکھرنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا صرفی نے بھی طبع آزمائی کی، ان کی غزل کو سبھوں نے پسند کیا اور یہی غزل ان کی شاعری کا نقطۂ آغاز ہوئی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حقیقت بھی مری کیا ہے حقیقت ہے حقیقت میں
شجر ہوں نا رسیدہ شاخِ موجِ آبِ گوہر کا

شاعری میں صرفی نے کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا بلکہ ذوقِ سلیم کو اپنا رہبر بنایا۔ شاعر کو بالعموم "تلمیذ الرحمٰن" کہا جاتا ہے لیکن ان کی جدتِ طبع تو دیکھیے کہ خود کو "روح القدس" کا شاگرد سمجھا ؎

وجہِ نازش کیوں نہ ہو شاگردیٔ روح القدس
کر رہے ہیں اکتسابِ فیض فرزندانہ ہم

روح الامین کا یہ مایۂ ناز شاگرد رہِ حیات کے پیچ و خم سے گزرتا ہے مگر سرسری نہیں بلکہ مشاہدات و تجربات کی رہبری میں ذرے ذرے کو نظر کے کانٹے میں تولتا، کائنات کے رموز کو کھولتا اور زمانے کے نشیب و فراز سے سبق لیتا گزرتا ہے، دنیا کی کوئی چیز بھی جو سرگرمِ تجسس ہے، اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ؎

درسِ ازل کے فیض سے میری نظر میں ہے
ہر ایک شے جو نامِ خدا خشک و تر میں ہے
بے شبہ بے شمار ہیں آیاتِ بیّنات
اہلِ نظر کے واسطے لیل و نہار میں

عالمِ امکان کے مشاہدے سے شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہر ذرہ اپنی زندگی میں کچھ کمی سی پاتا ہے اور یہی بات نظمِ دنیا کی بنیاد ہے ؎

نظامِ بزمِ عالم کی یہی بنیاد ہے گویا
کہ ہر اک زندگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے

اور زندگی کی اسی کمی کو دور کرنے کے لیے ایک ایک ذرہ منزل کمال کی تلاش میں مضطرب نظر آتا ہے ؎

قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا ہے وقفِ جستجو
ماہی بے تاب ہے ہر موج ساحل کے لیے

ہجومِ آلام میں بھی صرفی دامنِ ہمت تھامے رہتے ہیں، اپنی آرزوؤں اور محنتوں کے ثمرے کے لیے جان پر بھی کھیلنے سے پیچھے نہیں ہٹتے جس سے ان کی جواں مردی اور بلند حوصلگی بے باکانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے ؎

میں وہ دہقاں ہوں کہ جس کو زندگی اک کھیل ہے
برق کا بھی سامنا کر لوں گا حاصل کے لیے

بمبئی میں پانچ چھ سال بُرے بھلے گزرے ہی تھے کہ حیدرآباد کی یاد نے صرفی کے دل میں چٹکیاں لیں اور انھیں حیدرآباد لوٹتے ہی بنی۔ کچھ دن بیکاری میں بسر ہوئے اور پھر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد کھاتے پیتے گھرانوں میں ٹیوشن مل گئے، جن سے انھوں نے ہزاروں روپے کمائے، لیکن کھلے دل، کھلے ہاتھ تھے جو کچھ کما پاتے، عزیزوں اور دوستوں پر بے دریغ خرچ کر دیتے۔ صرفی کی تدریس و تفہیم کا طریقہ اتنا دل نشین و ذہن فروز ہوتا تھا کہ طالب علم متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے، ان کے مقابل لکچرار اور پروفیسر بھی پانی بھرتے نظر آتے تھے، طلبا سے ان کا رشتہ دوستانہ تھا، شاگردوں کو اعلیٰ مدارج طے کرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور یہی حال طالب علموں کا بھی تھا جو فارغ التحصیل ہونے کے باوجود بھی ان سے ادب و احترام سے پیش آتے اور ان کو ہمیشہ اپنا شفیق و عزیز رہنما سمجھتے تھے ؎

اللہ، اللہ، پیشوائے اہلِ دل ہے آج وہ
کل بزعمِ عقل کہتے تھے جسے دیوانہ ہم

ایک زمانہ تھا کہ حیدرآباد رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا، عشق و عشرت کا دور دورہ تھا۔ سماج پر زندہ دلی چھائی ہوئی تھی۔ فیض، توفیق، مائل، امیر، داغ اور جلیل کے نغمے گونج رہے تھے، گھر گھر شاعری کا چرچا تھا، شعر و سخن کی محفلیں سجتی رہتی تھیں، اسی رنگین فضا میں صرفی پل کر جوان ہوئے، حسن پسندی کا ذوق لے کر آئے تھے، دل عاشقانہ، دماغ مفکرانہ، طبیعت موزوں اور مذاقِ شعری نکھرا ستھرا پایا تھا، فطری تقاضے سے مجبور ہو کر شعر کہنے لگے، اردو میں بھی اور فارسی میں بھی، غزل جو ایک لطیف آرٹ ہے اس کی فسوں کاری اُن پر اثر کر گئی کہ ان کو اس سے اپنا شعری رشتہ باندھتے ہی بنی، اسی میں ان کی زندگی کے حسین راز شائستہ انداز میں بے نقاب ہوئے، اسی کے رمز و ایما کے حسین پردوں میں ان کے احساسات کی لطافت نظر آئی اور ان کے تجربات و مشاہدات کی روح جلوہ گر ہوئی ؎

دلِ حزیں نے تماشے دکھائے ہیں کیا کیا!
مرے تڑپنے پہ وہ تلملائے ہیں کیا کیا!
فراق و وصل، بہار و خزاں، نعیم و سقر
امید و بیم نے نقشے جمائے ہیں کیا کیا!
کہیں پری ہے، کہیں حور ہے کہیں انساں
تمھارے جلوے نے بھی نام پائے ہیں کیا کیا!
کہیں حیاتِ ابد، شہرتِ دوام کہیں
صلے وفا کے، محبت نے پائے ہیں کیا کیا!
نگاہِ شوق نے اک مشتِ خاک میں صرفی
خدا گواہ کہ جلوے دکھائے ہیں کیا کیا!

علمی مصروفیات نے صرفی کو شادی یا کسی مستقل ذریعۂ روزگار کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا، اس میں کچھ ان کی آزادہ منشی کا بھی دخل تھا، رشتہ داروں اور دوستوں نے توجہ بھی دلائی تو کسی نہ کسی بہانے ٹال دیا لیکن جب ماں بہن اور بھاوج کے دل میں ان کا سہرا دیکھنے کا ارمان مچلنے لگا تو انھوں نے ازدواجی زندگی کا ارادہ کیا، حیدرآباد میں جاگیر شاہی نظام تھا، عام رجحان ملازمتوں کی طرف تھا، آزاد پیشہ معتبر نہیں سمجھے جاتے تھے، لوگ اپنی لڑکیوں کا بیاہ ان ہی سے رچاتے جو ملازمت میں ہوتے، اسی لیے صرفی نے بادلِ نخواستہ مفید الانام ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی اور کچھ عرصہ بعد

صرفہ خاص سے منسلک ہو کر شادی کر لی مگر ملازمت کی گھٹی گھٹی فضا کی تاب نہ لا کر مستعفی ہو گئے۔ آزاد پیشہ اختیار کرنے کی سوجھی دوستوں کے مشورے پر تجارتی کاروبار شروع کیا، کچھ دن کشائش میں گزرے لیکن بعد میں "سولہ سو کے ہزار کر بیٹھے" کیونکہ تاجرانہ ماحول سازگار نہ آسکا اور تجارت سے ہاتھ اٹھانا ہی پڑا، زندگی کے آخری ایام بڑی ہی تنگ دستی اور کسمپرسی کے عالم میں بسر ہوئے لیکن ان کی فطرتِ خوددار نے آخری عمر تک ذلتِ سوال گوارا نہ کی ؎

زندگی گھل رہی ہے، گھلنے دے
دل اگر جل رہا ہے، جلنے دے
رحم کی تو کسی سے بھیک نہ مانگ
دم نکلتا ہے تو نکلنے دے

حاصل ہے واقعی جو حمیدہ صفات کا
بجتا نہیں وہی تجھے روزگار میں

تلخیٔ حیات کو انھوں نے اتنی شدت سے محسوس کیا کہ وہ مرض دق میں مبتلا ہو گئے اور انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ؎

ہر سانس میرے کیف پہ اک تازیانہ ہے
صہبا سے بے نیاز ہوا ہوں بہار میں

اور ایک سوال رہ رہ کر ان کے ذہن میں نامعلوم طور پر ابھر رہا تھا ؎

ہر نفس اک سانحہ ہے اب مرے دل کے لیے
جانے کتنے مرحلے ہیں اور، منزل کے لیے

اور یہ احساس خصوصاً اس وقت کچھ اور تیز ہو جاتا جب کہ اپنے ہم عصروں کی موت کے سانحے کی خبر ملتی اور اس خبر کے ملتے ہی وہ یہ شعر گنگنانے لگتے ؎

سب اٹھ گئے دکن سے میں جی کے کیا کروں گا
اٹھ جائے کاش یارب میرا بھی آب و دانہ

ساتھ ہی ساتھ انھیں اپنی موت کے قریب ہونے کا یقین ہونے لگتا، وہ اپنے دل سے فکرِ عقبیٰ کرنے کو کہتے اور دلِ غم دنیا سے دور یادِ الٰہی میں ڈوب جاتا ؎

نجاتِ اخروی کا فکر کیجیے
قریب الختم ہے عمرِ گرامی

موت کے جلد آنے پر لاکھ یقین سہی پھر بھی چارہ گروں کا دلاسا تھا کہ جیئے جا رہے تھے مگر کب تک؟ "مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی" بالآخر نبضیں ڈوبنے لگیں، جینے کی رہی سہی آس بھی باقی نہ رہی اور اسی پس منظر میں ان کی زبانِ شیریں بیان سے بے ساختہ نکلا ہوا شعر ایک لازوال نغمہ بن گیا ؎

محسوس کر کے ڈوبتی نبضوں کو دیر تک
تکتا رہا طبیب مجھے، میں طبیب کو

اور حیدرآباد کا یہ گمنام شاعر زمانے کی بے حسی پر مسکراتا ہوا اپنی تین دختران نیک اختر اور زوجۂ وفا شعار کے علاوہ اپنے کچھ سعادت مند شاگردوں کو سوگوار چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا اور تکیۂ روشن دل واقع دبیر پورہ حیدرآباد دکن میں ۱۹۶۸ء سے ابدی نیند سو رہا ہے ؎

مرنے کا غلط گماں ہے تم کو
جاگے تھے بہت کہ سو گئے ہم

★

(دستک .... صفحہ ۲۱ کا بقیہ)

میں نے دیکھا پالمٹ نشو تن کر کھڑے تھے۔
ننھی لگو تالیاں بجا کر ناچ رہی تھی۔
غفورے میاں برآمدے کی گگر پر کھڑے پالمیٹ نشو کے کندھے پکڑے اچھل رہے تھے اور آنکھیں اس روشنی والے بجوبے پر جمائے ہوئے تھے۔
میرے خیالات کے سارے تانے بانے بکھر چکے تھے۔

★

قطعہ

۲۰ نکاتی پروگرام

ہم سے سنیے پیامِ تاریخی
ملک اندرا کے نام کے ساتھ
شمع پر شمع جگمگا اٹھی
جس پیامِ رفاہِ عام کے ساتھ

ربط جو بیس انگلیوں کو ہے
زندگی کے ہر ایک کام کے ساتھ
وہی اپنے وطن کا رشتہ ہے
بیس نکتوں کے پروگرام کے ساتھ

چار سے بھی نے بھی بڑھائے ہیں
خوبیٔ حسنِ انتظام کے ساتھ
اب جو نکتے یہ ہو گئے چوبیس
جیسے گھنٹے ہوں صبح و شام کے ساتھ

شانِ تکمیلِ زندگی بن کر
بادشاہت چلی عوام کے ساتھ

چودھری تربھان شنکر سروش

غزل

سیّد محی الدین اظہر

آئینہ ٹوٹا، کیسے احساس ہے
رو پڑا میرا دلِ حساس ہے
زندگی! تج کر تجھے جاتا ہوں میں
اب تو قسمت میں لکھا بن باس ہے
داستاں جب عشق کی چھیڑی گئی
زخمِ دل کا تب ہوا احساس ہے
ٹوٹے رشتے اب جوڑوں گا کبھی
ہر گرہ پیغامِ حزن و یاس ہے
خوفِ رسوائی سے آنسو پی گیا
اور ہنسنا بھی نہ آیا راس ہے
گفتگو گھنٹوں ہوئی ہے بارہا
پھر بھی تجھ کو دیکھنے کی پیاس ہے
بیچتا شہروں میں لیکن کیا کروں
مجھ کو تیری آبرو کا پاس ہے

اقبال قریشی

غزل

(ایمرجنسی کے پس منظر میں)

ہر سمت نئی صبح چمن جاگ پڑی ہے
پھر خواب سے تقدیرِ وطن جاگ پڑی ہے
یوں لرزہ بر اندام نظر آتی ہے ظلمت
جیسے کوئی خوابیدہ کرن جاگ پڑی ہے
غم اپنا مقدر تھا بایں فصلِ بہاراں
پھولوں میں بھی کانٹوں کی چبھن جاگ پڑی تھی[1]
پابندِ جفا رہ کے بھی جو مہر بہ لب تھا
اس دل میں بھی اب روحِ سخن جاگ پڑی ہے
آفاق کے ہر غم کو میں اس دل میں سمو لوں
کچھ دن سے یہ تحریکِ محن جاگ پڑی ہے
اقبال میں مایوس نہیں غم کی فضا سے
تدبیر کے ابرو پہ شکن جاگ پڑی ہے

---

[1] کچھ بزرگ سیاستدانوں کے آزادی سے پہلے کے تعمیری اور آزادی کے بعد کے تخریبی رول سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہے۔

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر
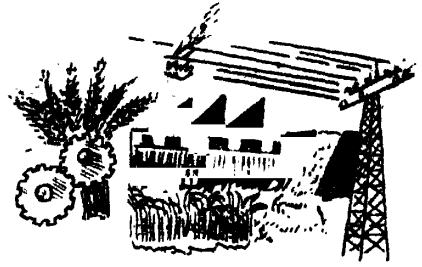
جذباتی یکجہتی پر گورنر کا زور ●●● وزیر اعلا کی مسلم لیڈروں سے اپیل ●●● خاندانی منصوبہ بندی غریبی دور کرنے کا ایک طاقتور ہتھیار ●●● خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی ●●● کمزور طبقوں کے لئے مرغبانی ترقیاتی اسکیم ●●● انڈے اور مرغیوں کی پیداوار بڑھانے کی اسکیم ●●● امداد باہمی بینکوں میں کھاتے کھولنے کے لئے وزیر اعلا کی اپیل ●●● اتر پردیش روڈ ویز ٹرانسپورٹ کارپوریشن کو پانچ کروڑ روپیہ کی مالی امداد ●●● اضلاع میں نمائشوں کے لیے مستقل جگہوں کا بندوبست ●●● ضلع فرخ آباد میں خاندانی منصوبہ بندی زوروں پر

جذباتی یکجہتی پر گورنر کا زور : ۔ اتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر چنا ریڈی نے ہندی بولنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ دیگر زبانوں کے الفاظ قبول کریں تاکہ ملک میں ہر شخص یہ محسوس کرے کہ ہندی اسکی اپنی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ جذباتی یکجہتی کے بغیر ملک کی جغرافیائی وحدت بے معنی ہوگی۔ گورنر راج بھون میں ایک ادبی سیمپوزیم سے خطاب کر رہے تھے۔

انھوں نے کہا کہ جذباتی یکجہتی کے لیے تلسی داس اور دیگر ممتاز ہندی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کا جنوب میں اور جنوبی ہند کے ادیبوں کی تخلیقات کا شمال میں پرچار کیا جانا چاہیے۔

اس سے قبل شری بی۔ رام مورتی رینو نے کہا کہ ہمارے سنت اتحاد کے عظیم علمبردار ہیں جنھوں نے تمام کائنات میں خدا کا جلوہ دیکھا ہے۔ انھوں نے گورنر کو اپنی کتاب " بھارتیہ سنتون کا تلناتمک ادھین " بھی پیش کی۔

وزیر اعلا کی مسلم لیڈروں سے اپیل : ۔ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے کہا کہ ملک کو ایسے تبلیغی اداروں کی ضرورت ہے جو قدامت پسندی اور مذہبی تعصب کی طاقتوں سے برد آزما ہوسکیں اور عوام کے اندر فکر اور نظریات کو جدید اور سائنسی رنگ و آہنگ عطا کریں۔

وزیر اعلا نے مسلم لیڈروں کے ایک نمائندہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ان سے پرزور الفاظ میں کہا کہ وہ وزیر اعظم کے لیے معاشی پروگرام کی اہمیت بالخصوص خاندانی منصوبہ بندی شجر کاری اور صفائی جیسے اہم پروگراموں سے عوام کو آگاہ کریں نیز غریبی دور کرنے اور عوام کے ساتھ منصفانہ سلوک کو یقینی بنانے کے پیش نظر اس کو تیزی سے بروئے کار لانے کے لیے عوام کا تعاون اور حمایت حاصل کریں۔

وزیر اعلا نے کہا کہ انھیں عوام کی جرأت مندانہ رہنمائی کرنا چاہیے اور انھیں ایک چھوٹے خاندان کا تصور بخوشی قبول کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ آبادی میں اضافہ کی موثر روک تھام اشد ضروری ہے۔ تاکہ اس سے ہماری ترقیاتی کوششیں رائیگان نہ ہوں۔ انھوں نے بڑے پیمانہ پر چھوٹی بچت کو ترقی دینے کی ضرورت پر زور دیا

وزیر اعلانے کہا کہ وزیر اعظم کے پروگرام کے تحت زرعی زمین اور مکانات کی تعمیر کے لئے قطعات آراضی کی تقسیم، قیمتیں کم کرنے کے اقدامات اور گیہوں کی خریداری کے سلسلہ میں ریاست کی کامیابیاں قابل ذکر ہیں۔ لیکن اب بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ریاست نے ترقی کا ایک حوصلہ مندانہ خاکہ مرتب کیا ہے۔ جس کے تحت مشرقی اترپردیش کی زرعی پیداوار دگنی کرنے کے پیش نظر اس کے لئے صد فیصد آبپاشی کا بندوبست کرنے اور مغربی اضلاع کو بھرپور ترقی کے ذریعہ غلّہ کا قومی گودام بنا دینے کی تجویز ہے۔ حکومت کا مقصد ریاست میں ۱۲ء۵ لاکھ ہیکٹر گھوں کی نوتنظیم کرنا اور آئندہ چند برسوں میں قالین کی برآمد ۳۴ کروڑ روپیہ سے بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپیہ سالانہ تک کر دینا ہے۔

وزیر اعلانے کہا کہ ان سب کاموں کے لیے سماج کے تمام کمزور طبقوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ہر فرقہ کے لیڈروں سے کہا کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرنے میں مدد دیں جس میں عوام ترقی کے لیے اور سائنسی طریقہ اپنا کر معاشی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے سلسلہ میں اور زیادہ سرگرم اور موثر رول ادا کرنے کے لیے آگے آئیں۔

اس جلسہ میں ممبران مجالس قانون ساز، سیاسی اور سماجی کارکنوں، صحافیوں، شاعروں، ڈاکٹروں، ٹیچروں اور وکیلوں نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی اور وزیر ریاست برائے اطلاعات شری رمیندر ورما بھی موجود تھے۔

خاندانی منصوبہ بندی غریبی دور کرنے کا ایک طاقتور ہتھیار

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے ملک میں غریبی، اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے سلسلہ میں لڑی جانے والی جنگ کو جلد سے جلد سر کرنے میں خاندانی منصوبہ بندی کو ایک طاقتور ہتھیار قرار دیا ہے۔

قومی خاندانی منصوبہ بندی پندرھواڑہ کے ۱۶ ستمبر کو آغاز سے قبل ۲۸ اگست سے شروع ہونے والی خصوصی پبلسٹی مہم کے موقع پر ایک پیغام جاری کرتے ہوئے وزیر اعلانے ریاست کے عوام سے اپنی فلاح نیز اپنے خاندانوں، سماج اور قوم کی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کو بخوشی قبول کر لینے کی اپیل کی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی :-

اترپردیش کابینہ نے جس کا جلسہ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کے زیر صدارت منعقد ہوا بعض مفاد پرست عناصر اور ممنوع تنظیموں کے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ چنانچہ ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ اس سرکاری پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی کریں۔

کابینہ کو مطلع کیا گیا ہے کہ ۲۶ اگست تک مجموعی طور پر ۱۶۹۴۰۶ نس بندی آپریشن کئے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں گڑھوال ڈویژن ریاست کے دوسرے ڈویژنوں سے آگے ہے جس نے اپنا نشانہ کا ۶۲ء۴ فیصد پورا کر لیا ہے۔ اتر کاشی اضلاع میں سرفہرست ہے۔ جہاں کی کارگزاری مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۱۰۶ فیصد ہے۔

کمزور طبقوں کے لیے مرغباتی ترقیاتی اسکیم

ریاست میں بے زمین افراد کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے پیش نظر ۹۸،۷ء۳۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک مرغباتی ترقیاتی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے دائرہ عمل میں دس اضلاع یعنی لکھنؤ، وارانسی، کانپور، گورکھپور، بریلی، آگرہ، فیض آباد، جھانسی، الہ آباد، اور مرادآباد آئیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہر ضلع کے ایک علاقہ میں تقریباً ایک ہزار بے زمین افراد (جنھیں زمین دی جا چکی ہے)

کا انتخاب کیا جائے گا اور انھیں پچاس مرغیوں کے پولٹری یونٹ قائم کرنے کی لیے مالی امداد فراہم کی جائے گی۔

اس قسم کے ایک پولٹری یونٹ کی تخمینی لاگت ۲۲۳۸۵ روپیہ ہے۔ منتخب افراد کو پونجی کی ۳۳⅓ فیصد مالی امداد دی جائے گی۔ بقیہ رقم کا بندوبست ادارہ جاتی سرمایہ فراہم کرکے کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت اس اسکیم کے تحت چوزوں اور دانہ کی فراہمی مرغیوں کی نگہداشت اور خرید و فروخت کا بندوبست کرے گی۔ اس مقصد کے لیے ۱۰.۳۳ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے یہ اسکیم ۷۸-۱۹۷۷ء اور ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران جاری رہے گی اور اس مقصد کے لیے ۱۰.۳۷۶ لاکھ روپیہ اور بالترتیب ۱۰.۶۳۹۹ لاکھ روپیہ کے مصارف کی تجویز ہے۔

انڈے اور مرغیوں کی پیداوار بڑھانے کی اسکیم

ریاستی محکمہ نگہداشت مویشیان نے پانچویں پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک انڈوں کی پیداوار میں ۲۳۱۱ لاکھ کا اضافہ کرنے کے لئے ایک اسکیم وضع کی ہے۔ اس اسکیم کا منشاء یہ ہے کہ پہاڑ کے ان سیاحی مرکزوں اور بستیوں کے آس پاس نیز ان مقامات پر جہاں اہم ادارے واقع ہیں اور جہاں انڈوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ مرغبانی کو ترقی دی جائے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ سماج کے کمزور طبقوں کے افراد کی مرغبانی کے پروگرام کو اپنانے کے لیے زیادہ ہمت افزائی کی جانا چاہیے۔

مرغبانی کو ایک اہم صنعتی پیشہ تسلیم کیا جا چکا ہے جس سے نہ صرف لوگوں کو روزگار فراہم ہوتا ہے بلکہ اس سے سماج کے کمزور طبقوں کی آمدنی بڑھانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

آبادی میں اضافہ اور غذائی عادتوں میں تبدیلی کے باعث انڈوں کی مانگ کافی بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ نے پانچویں پنجسالہ منصوبہ کے دوران مرغ بانی کو ترقی دینے کے پروگرام پر خاص زور دیا ہے۔ ریاست میں ۵۶ مرغ بانی فارم یا توسیع مراکز ہیں جن میں چوزوں کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے

۔۔۔۔۲ انڈے دینے والی مرغیاں ہیں۔ ریاست میں ۱۹۷۲ء کی مرغ شماری کے مطابق پولٹری فارموں میں مرغیوں وغیرہ کی تعداد ۳۹ لاکھ ۲۰ ہزار ہے۔

☆ ☆ ☆

امداد باہمی بینکوں میں کھاتے کھولنے کے لیے وزیر اعلا کی اپیل

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے عوام، خاص طور سے دیہی باشندوں سے اپیل کی کہ وہ ریاست کے امداد باہمی بینکوں میں زیادہ سے زیادہ انفرادی کھاتے کھول کر جمع کی جانے والی رقم میں اضافہ کریں اور اس طرح اس ۴۵ روزہ مہم کو کامیاب بنائیں جو بچت کھاتوں میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے کے لیے ۱۶ اگست سے چلائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کارپوریشن اور دیگر اداروں کو بھی امداد باہمی بینکوں میں کھاتے کھولنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

وزیر اعلا نے اپنی اپیل میں کہا کہ اس مہم کے دوران امداد باہمی انجمن کے ممبروں سے بھی کھاتے کھلوانے اور پیداواری قرضہ کی سہولیتیں بآسانی کسانوں کو فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آبپاشی کے چھوٹے وسائل، گوبر گیس پلانٹ، اور کیمیاوی کھاد، زمین کے تحفظ، جراثیم کش دواؤں اور باغبانی کے پروگراموں کے لیے قرضے کی درخواستوں، بلاک اور بنیادی پنچایتوں کی سطح پر قبول کی جائیں گی۔

وزیر اعلا نے ریاست میں امداد باہمی تحریک کو فروغ دینے اور مستحکم بنانے کے سلسلہ میں حکومت کے اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امداد باہمی واجبات کی ریکارڈ وصولیابی کے نتیجہ میں امداد باہمی بینکوں نے پہلی مرتبہ ریزرو بینک کے تمام بقایاجات کی ادائیگی کر دی جس کے نتیجہ میں ریاست امسال زرعی مقاصد کے لیے ۱۵۰ کروڑ روپیہ کے قرضہ تقسیم کرنے کے قابل ہو گئی جبکہ اس سے پہلے برسوں میں ۷۰ کروڑ روپیہ سے ۸۰ کروڑ روپیہ تک کے قرضے تقسیم کیے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ پیداواری قرضوں

کے علاوہ ابتدائی قرضہ انجمنیں، جن کی پنچایت کی سطح پر تنظیم کی جا رہی ہے، کمزور طبقوں کے افراد کو اشیائے صرف کے لیے بھی قرضے فراہم کریں گی۔ وزیر اعلا نے عوام سے یہ بھی اپیل کی کہ وہ زرعی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لیے امداد باہمی قرضوں کی سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

٭ ٭ ٭

اترپردیش روڈ کارپوریشن کو پانچ کروڑ روپیہ کی مالی امداد

انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف انڈیا کے چیرمین شری رگھو راج اترپردیش روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کو پانچ کروڑ روپیہ کی مالی امداد مہیا کرنے پر رضامند ہوگئے ہیں تاکہ کارپوریشن اپنی کارکردگی بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ مسافر بسوں کی خریداری کر سکے۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری اور انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف انڈیا کے چیرمین کے درمیان کل ملاقات کے دوران مذاکرات کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس ملاقات کے دوران جس میں ریاستی حکومت اور مذکورہ بینک کے افسروں نے بھی شرکت کی تھی، اترپردیش کی صنعت کاری کے مسائل کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا گیا۔

وزیر اعلا نے اس موقع پر کہا کہ ریاست کی ۳۷۶ شکر ملوں کی جدید کاری، بحالی اور توسیع اترپردیش کی شکر کی صنعت کا اہم مسئلہ ہے۔ ان ملوں کی پیرائی کی صلاحیت ۱۲۵۰ ٹن یومیہ سے کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان ملوں کو معاشی واحدوں کی شکل میں تبدیل کر کے ان کی پیرائی کی صلاحیت ۲۵۰۰ ٹن یومیہ کرنے پر تخمیناً ۱۰۰ کروڑ روپیہ کے مصارف ہوں گے۔

ان مذاکرات کے نتیجہ میں مذکورہ بینک کے چیرمین نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ بینک ریاستی حکومت کے زیر انتظام چلنے والی آٹھ شکر ملوں کی بحالی اور جدید کاری کے لئے بینک کی عام شرائط پر براہ راست امداد مہیا کرنے کے معاملہ پر غور کرے گا جس کے لیے بینک سے پہلے ہی رجوع کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے دیگر ملوں کی جدید کاری اور توسیع کے سلسلہ میں مشورہ دیا کہ انھیں بینک کی حالیہ اعلان شدہ نرم قرضہ اسکیم کے تحت امداد حاصل کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بینک ریاست کے پسماندہ علاقوں میں قائم کی جانے والی نئی شکر ملوں کو امداد دینے کے معاملہ پر بھی غور کرے گا۔

شری رگھو راج نے ریاست کی آٹھ نئی کتائی ملوں کو بھی بینک کی امداد کی یقین دہانی کرائی جس کے لیے ہندستان کا صنعتی مالیاتی کارپوریشن ایک لیڈ مالیاتی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

وزیر اعلا نے مذکورہ بینک کے چیرمین کو مطلع کیا کہ لکھنؤ، الہ آباد، کانپور اور وارانسی کے میونسپل کارپوریشن کو جو خود مختار ادارے ہیں مشینی کمپوسٹ پلانٹ قائم کرنے کے لیے حکومت ہند کی منظوری حاصل ہو چکی ہے اور اس طرح وہ قرضے لینے کے حقدار ہیں۔ ان کارپوریشنوں کو مجموعی طور پر تقریباً دو کروڑ روپیہ کی امداد درکار ہے۔

شری رگھو راج نے اترپردیش میں صنعت کاروں کو فروغ دینے اور اس سلسلے میں ترقیاتی کاموں سے امداد کی ضرورت پر زور دیا۔

ضلع فرخ آباد میں خاندانی منصوبہ بندی زوروں پر

ضلع فرخ آباد میں مختلف مقامات پر خاندانی منصوبہ بندی کے کیمپ لگ چکے ہیں اور اس ضلع میں خاندانی منصوبہ بندی کا کام زور شور سے ہو رہا ہے۔ قنوج میں قومی یک جہتی کمیٹی کے سکریٹری شری رتی رام بھائی نے ایک کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ خاندانی منصوبہ بندی ایک عوامی پروگرام ہے اور اس کا خاص مقصد ملک سے غریبی کو دور کرنا ہے۔ کمال گنج انتخابی حلقہ کے ایم۔ ایل۔ اے سید انوار جمیل نے اپنی تقریر میں خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے امتحان کا وقت ہے۔ اگر ہمارا ملک اس امتحان میں پورا اترتا ہے اور ہم خاندانی منصوبہ بندی کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں تو ہمارا ملک اقوام عالم میں بہت جلد ایک بلند مقام حاصل کرے گا۔

ضلع کے پانچ مقامات چھبرامئو، تالگرام، اگرسہائے گنج، قنوج اور کمال گنج میں نس بندی کے آپریشنوں کو زور شور سے چلایا جا رہا ہے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

رہنمائے بیت بازی (حصہ نون) مرتب : کاظم علی خاں
طابع : راج پرنٹنگ پریس، لکھنؤ۔
صفحات ۳۲ ۔ قیمت ۔ ایک روپیہ پچیس پیسے ۔ ملنے کا پتہ :
اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ

یاد بخیر! ایک زمانہ تھا جب نہ صرف ہائی اسکول بلکہ انٹر اور ڈگری کالجوں میں بیت بازی کے مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے اور طلبہ اچھے اور معیاری اشعار اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا کرتے تھے ۔ مگر اب بیت بازی کا رواج نسبتاً کم ہو گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اشعار کو صحیح اور موثر طور پر پڑھنے سے وہ طلبہ بھی بے نیاز ہو گئے جو اردو کی اعلا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جس زمانے میں اس ادبی تقریب کا عام رواج تھا، اس وقت اس فن پر کوئی کتاب نہیں تھی، اب اس مذاق کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے لیے جناب کاظم علی خاں نے رہنمائے بیت بازی کے عنوان سے کتابچے مرتب کیے ہیں اور زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔

کاظم علی خاں صاحب نے اس کتاب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ متقدمین سے لے کر دور حاضر تک کے شعراء کے اچھے اور معیاری اشعار ایک جگہ پر جمع ہو جائیں اور سبھی کا اختتام حرف نون پر ہو تاکہ بیت بازی میں شکست و فتح کا فیصلہ ہو سکے ۔ بظاہر تو یہ ایک مختصر کتابچہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ بیت بازی کے ذوق کی یہ آبیاری بہت ہی دور رس نتائج کا پیش خیمہ ہوگی، اور طلبہ کو صحیح تلفظ، اشعار کے معیاری انتخاب اور ان کو ادا کرنے کے مناسب و موثر طریقے سے آشنا کرے گی ۔ اور یہ امر خصوصیت کے ساتھ اس وقت بہت ہی مفید و معاون ثابت ہوگا جب وہ ایک خصوصی مضمون کے طور پر اردو کی اعلا تعلیم حاصل کریں گے ۔

میں کاظم علی خاں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنی توجہ اس "خشت اول" پر مرکوز کی ہے جس پر اردو پڑھنے والے مستقبل میں اپنے ذوق کا قصر تعمیر کریں گے ۔

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد)

بساط رقص مجموعۂ کلام : مخدوم محی الدین ۔ ناشر : ادبی ٹرسٹ
حیدر آباد ۔ قیمت : ۱۲ روپے
ضخامت: ۲۶۲ صفحات

زیر نظر کتاب مشہور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کے کلام کا مجموعہ ہے جو ادبی ٹرسٹ نے بہت سلیقے کے ساتھ بساط رقص کے دوسرے اڈیشن کی شکل میں شائع کیا ہے ۔ ابتدا میں عابد علی خاں صاحب کے پیش لفظ کے بعد زینت ساجدہ اور راج بہادر گوڑ صاحب کے مضامین ہیں ۔

مخدوم کی شاعری تعارف کی محتاج نہیں، وہ ترقی پسند حلقے کے بہت ممتاز شاعر تھے اور دور حاضر کے اچھے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ کلام بیشتر نظموں پر مشتمل ہے مگر کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتے تھے ۔

مخدوم کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ وقت کی آواز ہے جس میں ان کے عصر کی عام زندگی کی عام کیفیات ، رنگینیں، رنگ ڈھنگ، دکھ سکھ کی بڑی اچھی اور حقیقی ترجمانی ملتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری اگر ایک طرف اس کی انفرادیت کا پرتو ہے تو دوسری طرف اپنے وقت کی آواز بازگشت بھی ہے ۔ مخدوم محدود فکر و نگاہ کے شاعر نہیں ۔ ان کے یہاں قابل قدر سیاسی، انقلابی اور فکری بصیرت ہے ۔ ان کی شاعری میں رومانی عناصر کی بھی کمی نہیں ــــ بہت سے مقامات پر ان کی رومانیت بڑی سحر کن اور دل فریب ہو جاتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ۔

مخدوم کی شاعری میں ہیئت کے کچھ کامیاب تجربے بھی ملتے ہیں ۔ مخدوم کا انتقال ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا ۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ حیدر آباد میں گزرا اور وہ حیدر آباد میں بے حد مقبول رہے ۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اہم اور سرگرم رکن تھے مگر مزاج رومانیت پسند شاعر کا تھا ۔
بساط رقص اردو شاعری سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے جس میں ذوق و نظر کی تسکین کے سامان کی کمی نہیں ۔

مثلاً نظم چارہ گر کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرف وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا

ایک کا فرغزل کے چند کافر شعر بھی سن لیجیے :

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

بے صحبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی، مے وہی، میخانہ وہی ہے

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

مصنف: اخلاق حسین عارف

نام کتاب: **ذوق طلب و جستجو** ملنے کا پتہ: ۱۵ ایاز خانہ لکھنؤ۔ قیمت: دس روپے

صفحات ۲۵۶

یہ کتاب جناب اخلاق حسین عارف کے ۱۶ عدد مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختصر ہونے کے باوجود ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اور خصوصاً طالب علموں کے لیے کارآمد اور مفید ہیں۔ بعض مضامین میں علمی اور ادبی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ مضامین کا تنوع جو امیر خسرو، عرفی سے لے کر نظیر اکبر آبادی، غالب، مومن، اکبر الہ آبادی، محسن کاکوروی، شبلی، رسوا، شاد، صفی، ظریف، ثاقب اور خبیر تک ہے، مصنف کے مطالعے کی وسعت کا مظہر ہے۔ اور اس لحاظ سے کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

کتاب اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

—— ذکی کاکوروی

گزرتے لمحوں کی چاپ رام لعل۔ سن اشاعت ۱۹۷۴ء ضخامت ۲۰۷ صفحات۔ قیمت ۷ روپے (علاوہ محصول ڈاک)، کتاب مکتبۂ دین و ادب، پڑائن کی مسجد، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب رام لعل کے آٹھ افسانوں پر مشتمل ہے جن میں چند طویل مختصر افسانے اور ایک ناولٹ "حریف نقش پنہاں" بھی شامل ہے۔ رام لعل کا شمار ان اردو افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے جن کی قلمی کاوشوں نے اردو افسانہ نگاری کو سجایا اور سنوارا ہے اور جن کے قلمی آثار میں بعض ایسے افسانوی شاہکار موجود ہیں جو زمانے کے سیل اور وقت کی گرد سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں رام لعل نے شہرت عام کا قلعہ یقیناً فتح کر لیا ہے اور اب بقائے دوام کے دربار میں وہ کس مقام کے مستحق ہیں اس کا فیصلہ مستقبل کے ناقدین کر سکیں گے۔ رام لعل کی کہانیوں پر اس مختصر سے تبصرے میں کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں مجملاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کے افسانوں میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کے لیے رام لعل کی کہانیاں مشہور رہیں اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

کتاب کی طباعت، کتابت اور گٹ اپ اوسط درجے کا ہے۔ لیکن معنوی خوبیاں ان معمولی خامیوں کی تلافی کے لیے کافی ہیں۔ اس دلچسپ کتاب کے لیے رام لعل اور مکتبہ دین و ادب لکھنؤ دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

—— کاظم علی خاں

اردو قواعد حصہ اول۔ مصنف: اے دائی انصاری،

صفحات: ۸۰۔ قیمت: ڈیڑھ روپے

ملنے کا پتہ:

کتب خانہ امدادیہ دیوبند ضلع سہارن پور۔

اردو میں پچھلے دس سال کے دوران قواعد اور صرف و نحو کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اردو کے مبتدی طالب علموں کے علاوہ خود معلموں کو اپنی مادری زبان کے اس پہلو سے کما حقہ واقفیت کی جو ضرورت ہے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی بڑی وجہ موضوع کی خشکی اور اردو داں طبقہ کی تن آسانی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ اے دائی انصاری صاحب کی اس چھوٹی سی کتاب میں حروف تہجی سے لے کر لفظ، اسم، صفت، فعل، حرف اور ان کی قسمیں، پھر جملہ، جملہ کے اجزا اور ان کی قسمیں، سوال و جواب کے ذریعے نہایت دلچسپ طریقہ پر بچوں کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو معلموں کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے۔

—— (سید نظر برنی)

★

—— سچائی سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے۔

—— سچا مذہب ہمیشہ بہتر اخلاق سے منسلک ہوتا ہے مذہب میں اخلاقیات کی اتنی ضرورت ہے جتنی ایک بیج کو پھلنے پھولنے کے لیے پانی کی ضرورت۔

—— مہاتما گاندھی

نومبر ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش اُن سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

نومبر کا مہینہ ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس مہینے میں ملک کی دو عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیتوں پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے جنم لیا ہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے آزادی کے بعد نئے ہندستان کی تعمیر کی نہایت ٹھوس بنیادیں رکھیں اور آج انھیں بنیادوں پر ہماری ہر دلعزیز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نہایت بلند اور مستحکم عمارات کی تعمیر کر رہی ہیں۔

ہندستانی قوم اپنے ان دونوں عظیم محسنوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی اور نئے ہندستان کی تعمیر و ترقی کی تاریخ میں ان کے نام ہمیشہ سنہری حرفوں میں ثبت رہیں گے۔

پنڈت نہرو ہندستان کو بہت جلد دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں نمایاں دیکھنا چاہتے تھے، اس کے لیے ملک میں بڑے پیمانے پر صنعتی انقلاب کی ضرورت تھی اور یہ انقلاب وافر برقی قوت کی دستیابی اور منصوبہ بند معیشت کے تحت ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ چنانچہ برقی قوت کے حصول کے لیے ملک میں بڑے بڑے باندھوں کی تعمیر کی گئی جن میں پنجاب کا بھاکرا ننگل باندھ اور مرزا پور (اتر پردیش) کا رہاند باندھ آپ اپنی مثال ہیں۔

منصوبہ بند معیشت کے لیے پنج سالہ منصوبوں کی بنیاد رکھی گئی اور ان منصوبوں کے تحت ملک میں بھاری صنعتوں کا قیام عمل میں آیا اور ملک میں بڑے بڑے انجنوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی پن اور سوئیاں تک بننے لگیں چنانچہ ملک ان اشیا کے معاملے میں خود کفیل ہو گیا اور حتیٰ کہ وہ اپنی مصنوعات ممالک غیر کو بھی برآمد کرنے لگا جس سے ہمارے زرمبادلہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، اسی کے ساتھ زراعت کی ترقی کی بنیادیں بھی جدید اور سائنٹفک ڈھنگ پر استوار کی گئیں جس سے ہماری غذائی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا اور اب ہم اس معاملے میں بھی خود کفیل ہو چکے ہیں، لیکن ان تمام زرعی اور صنعتی ترقیوں کے باوجود ملک سے عام غریبی دور نہ کی جا سکی، اس بات کو شریمتی اندرا گاندھی نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور انھوں نے اس لعنت کو دور کرنے کے لیے "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ دیا جو ہندستان کے عوام الناس کے لیے تو ضرور خوش آیند اور امید افزا تھا، لیکن وہ طبقہ جو سرمایہ داری نظام میں یقین رکھتا تھا وہ چاہتا تھا کہ غریب ہمیشہ مفلس رہیں اور وہ ان کا استحصال کرتے رہیں، چنانچہ اس طبقے کے لیے یہ نعرہ نہایت پریشان کن تھا، اسی کے ساتھ ملک کی وزارت عظمیٰ سنبھالنے کے بعد جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے عام لوگوں کے فائدے کے لیے بعض دیگر ترقی پسندانہ اقدامات کرنا شروع کیے تو نہایت گہری اور وسیع پیمانے پر سازشیں شروع کر دی گئیں جن کا اعادہ یہاں مقصود نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان سازشوں کے نتیجے میں نظام حیات درہم برہم ہونے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ملک کی آزادی، ہماری سالمیت اور جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو گیا چنانچہ وزیر اعظم کے دلیرانہ مشورے پر صدر جمہوریہ نے ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو ایمرجنسی کا اعلان کیا جو ملک کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد ہی ہماری وزیر اعظم کو "غریبی ہٹاؤ" کے سلسلے میں ٹھوس قدم اٹھانے کا پورا موقع ملا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ملک کے سامنے "بیس نکاتی معاشی پروگرام" پیش کیا جس کی تکمیل کے لیے آج ہماری حکومت اور پردیش کے عوام نہایت جوش و خروش کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ ان بیس نکاتی معاشی پروگرام میں سری سنجے گاندھی کے چار نکاتی پروگرام بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان معاشی پروگرام میں خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ہمارے لیے اولین اہمیت کا حامل ہے، یہ ایک ایسا اہم اور بنیادی پروگرام ہے جس کی تکمیل میں ہی ہمارے سارے معاشی پروگراموں کی کامیابی کا راز مضمر ہے، وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں پردیش کے عوام کو اس پروگرام کی اہمیت بتاتے ہوئے ایک بیان میں کہا ہے کہ:

"خاندانی منصوبہ بندی پروگرام نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ دوسرے بہت سے ملکوں میں بھی شروع کیا گیا ہے کیونکہ آبادی میں اضافہ ترقی کے فوائد کو رائیگاں کر رہا ہے اور عوام ان سے پورے طور پر بہرہ مند نہیں ہو رہے ہیں، یہ پروگرام انڈونیشیا، ایران، ترکی، پاکستان اور دیگر متعدد ممالک میں شروع کیا گیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس پروگرام کے بارے میں کچھ سماج دشمن عناصر گمراہ کن پروپیگنڈہ کر رہے ہیں تاکہ عوام گمراہ ہوں اور اس پروگرام سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، کہیں کہیں تو یہ خبر بھی اڑا دی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایسی گولیاں کھلائی جا رہی ہیں جس سے آگے چل کر ان کے کبھی اولاد پیدا نہ ہو سکے، یہ بالکل غلط ہے اور تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ کیسے ایسی بے سرپیر کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی تندرستی ٹھیک رکھنے کے لیے ان کو وٹامن کی گولیاں کھلائی جاتی ہیں اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر بی سی جی کا ٹیکہ لگانے کا پروگرام بھی جاری ہے تاکہ ان بچوں کو آیندہ تپ دق کی بیماری سے محفوظ رکھا جا سکے، یہ کوئی نیا پروگرام نہیں ہے بلکہ کئی سال سے جاری ہے۔ لیکن افواہیں پھیلانے والے کچھ افراد نے اس پروگرام کے خلاف کچھ سراسر غلط اور بے بنیاد باتیں پھیلائی ہیں۔ یہ غلط فہمی بھی پھیلائی جا رہی ہے کہ مرد نس بندی آپریشن کرانے کے بعد قوت مردمی سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف بڑے بڑے ماہرین بلکہ ان لوگوں کا بھی جو نس بندی پہلے کرا چکے ہیں یہ کہنا ہے کہ اس سے ان کی ازدواجی زندگی پر کوئی خراب اثر نہیں پڑا ہے اور وہ اب بھی اسی طرح مسرور و مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں جیسی نس بندی سے پہلے کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اگر کسی شخص کو کوئی شک و شبہ ہو تو وہ ان لوگوں سے بات کر کے اپنا اطمینان کر سکتا ہے جو پہلے نس بندی کرا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی ہے کہ لوگوں کی نس بندی زبردستی کی جا رہی ہے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ حکومت کی ایسی کوئی پالیسی نہیں ہے اور اسی لیے جہاں دیگر محکموں کے ملازمین کے لیے نشانہ مقرر کیے گئے وہاں پولس کے ملازمین کے لیے کوئی نشانہ مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت نے اپنے ملازمین کے لیے ضرور کچھ قواعد وضع کیے ہیں تاکہ لوگ اپنی نس بندی کرا لیں۔ ان قواعد کے تحت یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ کچھ سہولتیں جو حکومت کی طرف سے عام طور سے ملا کرتی تھیں وہ اب انہی لوگوں کو ملیں گی جو خاندانی منصوبہ بندی کو اپنائیں گے۔ یہ اقدام اس غرض سے کیا گیا ہے کہ حکومت اپنے افسران اور ملازمین سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے وضع کردہ ایسے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تاکہ عوام میں ان کے تئیں زیادہ اعتماد پیدا ہو۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نس بندی کرانا مذہب اور دھرم کے خلاف ہے۔ دراصل اس پروگرام کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے یہ تو صرف ایک معاشی اور سماجی پروگرام ہے جس کا مقصد عوام کی معاشی اور سماجی زندگی کا معیار بلند کرنا ہے۔"

—— ایڈیٹر

پنڈت میلا رام وفا

ہم رعبِ حسنِ یار سے تتلا کے رہ گئے
شکوے زباں تک آئے مگر آ کے رہ گئے

آیا نہ کوئی لے کے خطِ شوق کا جواب
سب نامہ بر نہ جانے کہاں جا کے رہ گئے

یوں سا لگا کہ مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا
جب عرضِ مدّعا پہ وہ شرما کے رہ گئے

وہ پھول میری آرزوؤں کی ہیں اک مثال
کھلنے سے پیشتر ہی جو مرجھا کے رہ گئے

ایفائے وعدہ کا نہ دلا پائے وہ یقیں
کھائی ہوئی سی ایک قسم کھا کے رہ گئے

محفل میں کر رہے تھے وہ غیروں سے شوخیاں
مجھ پر پڑی نگاہ تو شرما کے رہ گئے

نغمہ تو اک طرف، نہ ہوا نالہ بھی رواں
سب تارِ سازِ شوق کے تھرّا کے رہ گئے

اٹھے بھی لے کے دعوئے عظمت جو اے وفاؔ
اجداد کے عروج پہ اترا کے رہ گئے

ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی

جواہر لال نہرو اور تعلیم

ایک ترقی پذیر معاشرہ میں تعلیم کی جو اہمیت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک بہتر تعلیمی نظام کے ذریعہ ہی ایک بہتر سماجی نظام کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان کے معمار اول اور عظیم رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کے تعلیم کے بارے میں کیا خیالات تھے؟ وہ ہندوستان میں کس قسم کے تعلیمی نظام کو رائج کرنا چاہتے تھے اور ان کے ذہن میں کس طرح کے نظامِ تعلیم کا نقشہ تھا؟

پنڈت نہرو کی تقریروں اور تحریروں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کے موضوع سے ان کو خصوصی دلچسپی تھی اور وہ قومی ترقی میں تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ ایک دور اندیش اور قومی رہنما اور مصلح ہونے کی حیثیت سے تعلیم اور اس کے مسائل سے گہری دلچسپی ناگزیر بھی تھی۔ تعلیم کے بارے میں نہرو جی کا ایک خاص نظریہ تھا جس کا اظہار ان کے اکثر خطبات اور تقاریر میں ملتا ہے۔ نہرو کا عقیدہ تھا کہ کسی ملک کی بڑائی اور عزت وہاں کی آبادی اور دولت سے نہیں آنکی جا سکتی بلکہ اس کی قدر و منزلت اور عظمت کا سہرا اس ملک کے تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کے سر ہوتا ہے جو ملک و قوم کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہیں۔ اگر ہم شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونا چاہتے ہیں تو ملک کا ایک بڑا سرمایہ تعلیم اور اس کی ترویج پر صرف کرنا چاہیے۔

نہرو کے نزدیک تعلیم کے معنی میں بڑی وسعت ہے۔ اسے سانچوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کو ہمہ صفت ہونا چاہیے۔ ایک ماہرِ نباتیات کی طرح نہیں جو پھولوں کے نام تو از بر کر لیتا ہو لیکن پھول کی خوشبو، حسن و نزاکت سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے۔ وہ تعلیمی اداروں میں محض نصابی تعلیم کافی نہیں سمجھتے تھے۔ صرف نصابی علم حاصل کر لینے کو وہ گدھے پہ کتابیں لادنے کے مترادف تصور کرتے تھے۔ انھوں نے تعلیمی اداروں کو ایک کارگہِ شیشہ گری سے تشبیہ دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے قوم کے نوجوان اپنی متاعِ زندگی لے کر عملی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔

یہیں ان کے کردار اور شخصیت کی تراش خراش ہوتی ہے اور انھیں سجایا جاتا ہے۔ اگر دانش گاہیں اپنے فرائض سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہوتیں، اور محض ڈگریاں دے دے کر ہر سال طلباء کو چلتا کر دیتی ہیں تو ایسے لوگ ملکی مسائل کا کوئی حل نہیں نکال سکتے۔ بلکہ قوم کے لیے وہ خود ایک مسئلہ بن جائیں گے۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو عقل و انسانیت کا بھی سبق پڑھانا چاہیے، تاکہ ان کے خیالات بلند ہوں اور وہ برے بھلے کی میز کر سکیں۔ انھوں نے کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اقدار کی تبلیغ و اشاعت پر بھی بہت زور دیا کہ دماغ کے دریچے کھلیں اور اس میں باہر کی تازہ ہوا بھی اندر آ سکے۔

تعلیم کے بارے میں نہرو کے خیالات مولانا آزاد یادگار لکچر ۱۹۵۹ء میں نہایت صفائی کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔ اس موقع پر نہ صرف انھوں نے اپنے تاثرات بیان کئے، بلکہ ملک کے تعلیمی نظام اور اس کے مسائل و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی۔ ان کے سامنے سوال تھا کہ کن سے نئے نصب العین نئے تقاضوں کے مطابق بنائے جا سکتے ہیں جو مادی زندگی کی ضرورتوں کو بھی پورا کریں اور ذہنی و روحانی بالیدگی کے بھی موجب ہوں۔ انھوں نے اپنے اس تاریخی لکچر کے دوران بار بار یہ سوال اٹھایا کہ مادی ترقی بذاتِ خود کافی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی درکار ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خواہ مذہب کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن کسی اچھے آدرش پر اعتماد ضروری ہے کیونکہ اس سے زندگی میں حرارت آتی ہے اور وجود کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کو زندگی بنانے کے لیے ایک اعلیٰ اور ارفع مقصدِ حیات اشد ضروری ہے۔

اگرچہ نہرو کو ہندستان کے قدیم تہذیبی اور علمی ورثہ پر بڑا ناز تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ سائنس اور جدید ٹیکنولوجی کے بھی بہت مداح اور معتقد تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنس قدرت کا ایسا معجزہ ہے جس کی سحر کاریاں عام ہیں اور اس نے انسانی معیارِ زندگی کو بہت بلند کر دیا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک سائنس کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے فکر و نظر میں تیر کی سی تیزی اور "سیدھ" پیدا ہو جائے۔ ان کو دورِ حاضر کا نصب العین سائنٹفک نظریہ حیات میں نظر آتا ہے

لیکن وہ اس سائنس کے مخالف تھے جو روحِ انسانی کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محض سائنس ہی، زندگی کی گتھیوں کو کھولنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ گدازِ قلب کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے انھوں نے سائنس اور روحانیت میں تال میل پیدا کرنے پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "سائنسی اور فنی ترقی کے بغیر مستقبل سے آس نہیں باندھی جا سکتی اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ یہ مستقبل بڑا سطحی اور بے معنی رہے گا اگر ہم اپنے ماضی کو فراموش کر دیں گے۔"

نہرو نے ساگر یونیورسٹی میں خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا "کسی قوم کے لیے اس کی تہذیبی میراث سے زیادہ مفید اور قابلِ قدر چیز کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خطرناک چیز بھی کوئی نہیں کہ وہ اس پرانی زندگی بسر کرے۔ جو قوم محض اپنے اجداد کی نقالی کرتی ہے وہ کبھی پوری طرح پھل پھول نہیں سکتی۔ قومیں صرف ایجاد، تخلیق، اور صلاحیتِ عمل کے بل بوتے پر اپنی توانائیوں کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اس میں ایک ایسے تخلیقی ذہن کی ضرورت ہے جس میں سماجی احساس ہو۔ رواداری اور بھائی چارے کا سلوک کرنے کی صلاحیت ہو۔"

مختصر الفاظ میں نہرو کے نزدیک تعلیم کا مقصد نوعِ انسان کی روح کو برے بھلے کی تمیز کرنے کی صلاحیت بخشنا ہے۔ اچھی تعلیم انسان کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں ہوتی بلکہ علمی سوتے دوسروں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ وہ ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو قومی پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں معاون ہو۔ جو نہ موجودہ حالات سے بے خبر ہو اور نہ مستقبل کے امکانات سے، جسے وقت کے تقاضوں کا بھی پورا احساس ہو اور آئندہ کی ضرورتوں کا اندازہ بھی۔ وہ ایسی تعلیم چاہتے تھے جو محدود نظریات کی حامل ہرگز نہ ہو۔ بلکہ انسانی زندگی میں شائستگی کی ضامن بنے۔ نہرو کے تعلیمی فلسفہ کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مشرق اور مغرب کے نظریات میں تال میل پیدا کیا جائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی قسم کی ترقی کوئی فائدہ نہیں دے گی اگر تعلیم پیچھے رہ جائے۔ نہرو کا تعلیمی فلسفہ آج بھی زندہ ہے اور ان کے تعلیمی خیالات آج بھی مشعلِ راہ کا کام دے رہے ہیں۔

★

اور تھے وہ، جنگ کے میداں میں جو اپنا لہو
اپنے منھ پر مل کے، ماتھے پر سجا کر آ گئے

چاہتے ہو تم کہ دنیا تم کو بھی تعظیم دے
تم کہ اپنی لاش کاندھوں پر اٹھا کر آ گئے

مسخرے کچھ اور ہوتے ہیں مجاہد اور کچھ
مسخرو! یہ تم کفن کس کا چرا کر آ گئے؟

جگن ناتھ آزاد

تخریبی قوتوں کے نام

کس سے اب دادِ وفا پانے چلے ہو احمقو!
تم کو آدابِ وفا آئے نہ آدابِ جفا

تم ہمارے خون کی سرخی پہ ڈالو اک نظر
اس کو کہتے ہیں جہاں میں خونِ شادابِ جفا

بڑھ رہے ہیں اب تمھاری سمت اس کے دائرے
وہ جو خود تم نے کیا تخلیق گردابِ جفا

سچے جھوٹے جس کے تم نعرے لگاتے آئے ہو
اک حقیقت بن کے اب وہ انقلاب آنے کو ہے

تم سمجھتے ہو اندھیرا ہے ابھی تک رات کا
نیند سے جاگو کہ سر پر آفتاب آنے کو ہے

اے جفا کارو! ستم گارو! ستم تو ہو چکا
اک ذرا ٹھہرو کہ اب یومِ حساب آنے کو ہے

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

سنہ ۱۹۵۰ء میں میری ایک کتاب "مرزا شوق لکھنوی" شائع ہوئی۔

ذاکر صاحب قبلہ کا یہ دستور تھا کہ جب بھی ملاقات ہوتی۔ پوچھتے:
"میرے لیے کیا تحفہ لائے؟
کوئی نئی کتاب؟ کوئی نیا مضمون؟"
میں نے عرض کیا: "شوق پر ایک کتاب لکھی ہے۔"
فرمایا: "ذوق پر کیوں نہیں؟"
عرض کیا: "سوائے اپنی بدذوقی کے اور کوئی چیز اپنی شفاعت میں پیش نہیں کر سکتا۔"

ہنسنے لگے۔ جب کتاب پڑھ لی اور ملاقات ہوئی تو بہت دیر تک تعریف اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ آخر میں فرمایا: "اس پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو نیاز صاحب نے کیا ہے۔"

"مرزا شوق لکھنوی" کا مقدمہ علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا تھا۔ ان کے جن جملوں کی طرف ذاکر صاحب نے اشارہ کیا تھا وہ یہ ہیں:

"فاروقی صاحب کوئی غیر معروف نقاد و انشا پرداز نہیں ہیں۔ دس بارہ سال سے ادب و انشا کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور "نگار" کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس نے ان کا اکتشاف کیا۔ ان کے تبصرے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ وہ ضرورت سے زیادہ تمنا ہو کر رہ گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر فاروقی صاحب کے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اسی زمانے میں پہنچا دیتے۔ پھر اگر یہ صحیح ہے کہ ایک نقاد اپنے فرض کو اسی وقت صحیح انجام دے سکتا ہے جب وہ تصنیف کے ماحول کو اپنے اندر پوری طرح جذب کر لے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں مثنویوں پر تبصرہ کرنے کا حق فاروقی صاحب سے زیادہ کسی کو نہیں پہنچتا۔"

نیاز صاحب نے یہ بھی لکھا تھا:

"حاسدوں نے (شوق کی) ان مثنویوں کی لغزش مستانہ کو پستیِ اخلاق سے تعبیر کیا۔ برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔ بزرگوں کی صحبتوں میں ان کا تذکرہ اخلاقی جرم قرار پایا۔ لیکن شمع کی روشنی دامن سے اور چاند کا نور خاک سے نہیں چھپ سکتا۔"

"مرزا شوق لکھنوی" کا دیباچہ حضرت جوش ملیح آبادی نے تحریر فرمایا تھا اور اس میں انھوں نے ان نقادوں پر سخت نکتہ چینی کی تھی جو ادب کو اخلاق کے تنگ معیاروں سے جانچتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"ہمارے عفیف اور چھوٹی موٹی قسم کے نقاد ان مثنویوں کی "عریانی" پر خیر سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور جی کھول کر بدمزاج بوڑھی عورتوں کی طرح جن کے احساسات فنا ہو چکے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں اور یہ بھی ایک محکم دلیل اور زبردست ثبوت ہے ان مثنویوں کے بے نظیر ہونے کا۔"

"مرزا شوق لکھنوی" پر ہندوستان اور پاکستان کے تمام رسالوں میں بہت ہمت افزا ریویو ہوئے لیکن نومبر سنہ ۱۹۵ء کے "شاہراہ" دہلی میں ہنس راج رہبر نے بہت سخت اعتراض کیا اور لکھا:

"مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے

ہیں۔ کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے اسے بلند نہیں کیا؟ کیا ان کی بستی میں عفونت ہی عفونت ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بستی میں عفونت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانیاں بیان کرکے زندگی کو بلند کرنے کی بات کہنا زندگی کو منہ چڑانا ہے۔ فاروقی صاحب معاف فرمائیں گے انھوں نے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے دور میں اس دور کی عفونت ہی کچھ کم نہیں کہ مرزا شوق کی فحش نگاریوں کو دہرایا جائے۔"

سید سجاد ظہیر مقدمہ سازش کراچی میں ماخوذ تھے۔ موت کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا۔ انھوں نے یہ تبصرہ پڑھا اور تڑپ اٹھے اور فوراً لکھا "مجھے (ہنس راج رہبر کے) اس تجزیے سے قطعی اختلاف ہے... یہ نقطۂ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف جد و جہد کرنا چاہیے۔" یہی نہیں بلکہ "غلط رجحان" کے عنوان سے ایک پورا مضمون میری اور مرزا شوق کی حمایت میں شائع کیا۔

میں ششدر او حیران: بہ دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت۔ اس لیے کہ اس وقت تک بنے بھائی سے صرف غائبانہ ملاقات تھی۔ کبھی دیکھنے اور ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد دیکھنے اور ملنے کی بے کراں خواہش پیدا ہو گئی۔ میں نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ رضیہ سجاد ظہیر سے خط و کتابت شروع کی۔ وہ اس زمانے میں لکھنؤ میں تھیں۔ اس دوری و مجبوری و گرفتاری سے بہت پریشان تھیں۔ بڑے دلچسپ خط آئے ان کے۔ اور وہ غالباً میرے پاس بکھرا وں میں محفوظ بھی ہیں۔ رضیہ آپا سے یہ ذکر بھی آیا کہ ان کو آپا کے القاب سے یاد کیا جائے یا بھابی کے لفظ سے۔ میں نے بھابی کے رشتے کو پسند کیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان سے یہ مراسم بنے بھائی کی وجہ سے پیدا ہوئے دوسرے اس رشتے میں چھیڑ اور شکوہ و شکایت کا زیادہ موقع تھا۔

بھابی سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی لیکن بنے بھائی سے سب سے پہلی ملاقات حیدرآباد میں زور صاحب کے مکان پر ہوئی۔ اس وقت مجھے یہ بات کچھ اَن مل بے جوڑ سی معلوم ہوئی۔ زور صاحب سجادہ نشین قسم کے آدمی۔ زاہد مناجاتی — بنے بھائی، رند خراباتی۔ ان دونوں میں کیا جوڑ ہے؟ معلوم ہوا کہ دونوں برس میں ساتھ رہ چکے ہیں اور دونوں میں بالکل دھول دھپّے کے تعلقات ہیں۔

بنے بھائی سے مل کر دل خوش ہو گیا۔ گلزارِ ابراہیم سے گزر کر ایک عجیب مسکراہٹ ان کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ حسنِ عارض اور اس پر حسنِ ظن! دیدن ہماں و دل دادن ہماں۔ ان کے ہاتھوں کی ریشمیت اب تک یاد ہے۔ نرمی اور شائستگی ایسی کہ لکھنؤ کی تہذیب کا نقشہ سامنے پھر گیا۔ لیکن دل میں فولاد کا سا عزم۔ رائے پیش کرنے میں شرافت اور بلا کا احترام۔ رُخِ سخن پہ رنگ ادب موجود لیکن ہر رائے ان کی اپنی تھی جس کے لفظ لفظ سے ان کے دل کا خلوص اور ذہن کی جودت ظاہر ہوتی تھی۔ کہنے لگے: "ہنس راج رہبر آپ کو اور آپ کی کتاب کو غلط سمجھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ترقی پسند تحریک کو بھی غلط سمجھے۔ راجندر سنگھ بیدی میرے اور ہنس راج رہبر شوق سے خفا ہیں اور یہی دو شاعر ہیں جو آپ کی توجہ خاص کا مرکز رہے ہیں۔"

پھر فرمایا: "فاروقی صاحب، میرے خیال میں تو شوق کی مثنوی زہرِ عشق اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے جسے جاگیرداری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ شوق کی ہیروئن تو زہر کھا کر مر جاتی ہے لیکن وہ جو زہر نہیں کھاتیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ یہ ناکام بغاوتیں تاریخ کے ارتقائی عمل کو آگے بڑھاتی ہیں اور زندگی کو پہلے سے زیادہ مہذب اور خوب صورت بنا دیتی ہیں۔"

میں نے عرض کیا: "رہبر کا خاص اعتراض یہ ہے کہ یہ مثنوی پست قسم کے جذبات کو ابھارتی ہے۔"

فرمایا: "ہرگز نہیں۔ اسے پڑھ کر لوگ زیادہ پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے۔ ان کا تزکیۂ نفس ہوگا۔ ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات ابھریں گے۔"

اس کے بعد بنے بھائی سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس زمانے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

راز الہ آبادی

نغمۂ وطن

میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیری تہذیب سنگم کی موج رواں — مندروں میں بھجن مسجدوں میں اذاں
تجھ میں پیدا ہوئی میری اردو زباں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیری خوشبو ملی سب چمن در چمن — ذکر تیرا ہوا انجمن انجمن
نام تیرا ملا داستاں داستاں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

میرے اپنے ہوں یا پرائے ہوں — تو ہر سب کو گلے سے لگائے ہوئے
تیرے کردار میں ہے تعصب کہاں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیرے آنچل میں حسن بہو آہر گئی ہے — اندرا تیرے ماتھے کی جھومر بنی ہے
تجھ میں گزرا ہے آزاد سا خوش بیاں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تجھ میں گاندھی سا انصاف پرور ہوا — تجھ میں ٹیگور جیسا سخن ور ہوا
میر و غالب نے کھولی یہیں پر زباں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیرے آنگن میں کشمیر کا بانکپن — تجھ میں اقبال سا صاحبِ علم و فن
سنے گاندھی ہوا تجھ میں پاکر جواں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

خاک نے تیری کندن بنایا مجھے — پیار سے تیرے جینا سکھایا مجھے
میں ترا راز ہوں تو مرا رازداں — میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

چودھری برہمان شنکر سرورشتے

اِندرا گاندھی

صبح انیسؔ نومبر کی تھی سن سترہ تھا
عطر و گل پاش ہے جو جشن ولادت بن کر
تھا مبارک یہ وہی دن کہ زمیں پر اتری
عرش سے ایک کرن تابشِ حکمت بن کر
علم و دانش کی ضیا، فہم و فراست کا فروغ
ڈھل گیا پیکرِ ادراک کی صورت بن کر
زر فشانی جو اہر لیے موتی کی لڑی
جلوہ آرا ہوئی سنگم کی طہارت بن کر
ہر حرف ہے جو بہ اندازِ نسیمِ سحری
گل فشاں شاخِ گلستانِ فصاحت بن کر
گرم بازاریِ ہنگامہ طرازی پہ کبھی
پرتو افگن ہوئی تنویرِ قیادت بن کر
شورِ دریا سے تسلط بھی زباں پر آیا
زمِ گفتاری و لہجہ کی نزاکت بن کر
ثبت ہے سرخیِ تنظیم نشیمن کی طرح
سرِ تاریخِ وطن، حسنِ عبارت بن کر
اندرا نام ہے جو ہند کے اندر اس کی
نقشِ تدبیر ہے تقدیر کی زینت بن کر

جگمگا اٹھی جو آئینۂ عالم پہ سرِدش
قوم کی، ملک کی، انسان کی عظمت بن کر

سید قمر الحسن

اندرا گاندھی اور جمہوریت

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اور جس فضا میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی وہ جمہوریت، انفرادی آزادی اور حب الوطنی کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو جیسے جمہوریت پسند کے گھر میں جنم لیا انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو ان کے ارد گرد مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور دوسرے جمہوریت پسند اور حب الوطن لیڈروں کا جمگھٹا تھا۔ جس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو جس نے بچپن سے لے کر سن بلوغ تک انھیں باتوں کے چرچے سنے ہوں اور جس کا کردار اسی جمہوری فضا میں پروان چڑھا ہو اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک ڈکٹیٹر بن جائیں گی سوائے بدگمانی اور رشک وحسد کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس قسم کے خیالات کا اظہار وہ مفاد پرست کرتے ہیں جن کے مفاد کو مسز اندرا گاندھی کے ترقی پسندانہ اقدامات سے دھکا لگا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جس چیز کو صحیح اور عوام کے مفاد میں سمجھتی ہیں اس کے اظہار میں نہ تو جھجکتی ہیں اور نہ اس کے حصول کے لیے موثر اقدام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں بلکہ پختہ عزم اور بلند ہمتی کے ساتھ کسی مخالفت دشواری یا رکاوٹ کی پرواہ کیے بغیر مستقل مزاجی سے آگے قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی انھوں نے بنکوں کو قومیانے، سابق راجواڑوں کے صرف خاص اور مراعات کو ختم کرنے کے اقدامات شروع کر دیے۔ ان ترقی پسندانہ اقدامات کی مخالفت سرمایہ داروں جاگیرداروں اور ان کی زیر سرپرستی چلنے والی سیاسی اور فرقہ پرست جماعتوں نے پوری شدت سے کی لیکن مسز اندرا گاندھی کے عزم اور صحیح کام کرنے کی لگن نے راہ کے روڑوں کو صاف کر دیا اور کامیابی نے قدم چومے۔ دوسری طرف ان اقدامات سے مفاد پرستوں اور اونچی پتیوں کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی لیکن وہ ان اقدامات کی جو عوام کے مفاد میں تھے کھلم کھلا مخالفت کی ہمت نہ رکھتے تھے کیونکہ ان اقدامات کے پیچھے عوام کی طاقت تھی اس لیے انھوں نے سازش کا راستہ اختیار کیا یعنی جمہوری طریقہ پر منتخب کی گئی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے غیر جمہوری جارحانہ طریقے اختیار کرنے کے منصوبے بنانے لگے مرکزی وزیر شری للت نرائن مشرا کا قتل اور ہندستان کے چیف جسٹس پر حملہ اسی منصوبے کی کڑیاں تھیں۔

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی جمہوریت پسند ہونے کے ساتھ نظم وضبط کی سختی سے پابندی کی قائل ہیں کیونکہ انتشار اور بدنظمی کی حالت میں حکومت کوئی ترقیاتی یا اصلاحی کام انجام نہیں دے سکتی۔ مفاد پرستوں کی جانب سے پیدا کیے جانے والے انتشار کو انھوں نے بڑی تشویش کی نظر سے دیکھا اس لیے نہیں کہ انھیں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا بلکہ اس لیے کہ پورے جمہوری نظام اور ان جمہوری روایات کے ختم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا جن کی بنیاد ہمارے بڑے لیڈروں نے بڑی محنت سے ڈالی تھی۔ یہ محسوس کرتے ہی انھوں نے اس خطرناک

رجحان کی روک تھام کے لیے بلا جھجک پُرعزم قدم اٹھایا اور صدر جمہوریہ نے ان کے مشورے پر ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔

اس موقع پر انھوں نے قوم کے نام جو پیغام نشر کیا اس میں واضح الفاظ میں اس سازش کا ذکر کیا جو مفاد پرستوں کی جانب سے وسیع پیمانے پر کی جا رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہنگامی حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب سے میں نے عوام اور کمزور طبقے کی بھلائی کے لیے اقدامات شروع کیے اس وقت سے مفاد پرست جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو ناکام بنانے کی سازش کرنے لگے جس کے نتیجے میں متعدد تشدد آمیز واقعات ہوئے۔ یہاں تک فوج اور پولیس میں بغاوت پھیلانے کی بھی کوشش کی گئی۔ میرے خلاف الزام تراشی کی گئی لیکن ہندستان کے لوگ مجھے بچپن سے جانتے ہیں۔ یہ میرا کوئی ذاتی معاملہ نہیں۔ میں وزیر اعظم رہتی ہوں یا نہیں، اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن وزیر اعظم کا عہدہ ایک اہم عہدہ ہے اس کے وقار کو کم کرنے کی سوچی سمجھی سازش نہ تو جمہوریت کے مفاد میں ہو سکتی ہے اور نہ قوم کے مفاد میں بلکہ اس سے استحکام کو نقصان پہنچتا ہے اور حکومت ترقیاتی اور عوامی فلاح کے کاموں کی طرف پوری توجہ نہیں کر پاتی۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر وہ کسی بات کو صحیح اور مناسب سمجھتی ہیں تو پھر اس کی انجام دہی میں راہ کی دشواریوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتیں اور بے دھڑک اس پر عمل درآمد کے لیے قدم اٹھا دیتی ہیں۔ بالکل شروع میں جب ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بعد صدر جمہوریہ کے عہدے کے لیے کانگریس امیدوار چننے کا سوال اٹھا تو انھوں نے بعض مصلحت پسند ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام تجویز کر لیا جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے کیونکہ وہ انھیں اس کا مستحق سمجھتی تھیں اور مصلحت کی بنا پر ان کے ساتھ ناانصافی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں ان کے عزم اور استقلال نے ہمیشہ انھیں اپنے نیک فیصلوں میں کامیابی سے ہمکنار کیا چنانچہ انھیں اس معاملہ میں بھی شاندار کامیابی حاصل ہوئی اسی بنا پر عوام کا اعتماد تیزی سے بڑھتا گیا۔ اسی عزم اور بلند ہمتی سے کام لے کر انھوں نے کانگریس کو ان رجعت پسند عناصر سے صاف کر دیا جو ہمیشہ ترقی پسندانہ اقدامات کی راہ میں روڑے اٹکایا کرتے تھے اس جراتمندانہ اقدام میں بھی انھیں وہ کامیابی حاصل ہوئی کہ ان کے مخالف بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

جمہوریت پسندی۔ جمہوریت کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کا ذہن بالکل صاف ہے۔ انھوں نے ۲۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو لوک سبھا میں ایمرجنسی کے نفاذ پر بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا میں ایک ایسی جمہوریت پر یقین رکھتی ہوں جس میں اقتدار پارٹی پر ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مخالف پارٹیوں کو اظہار خیال اور تنظیم کی آزادی دے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ امید کرتی ہے کہ مخالف پارٹیاں اور دوسرے لوگ حکومت کے کاموں میں روڑا نہ اٹکائیں گے اور قومی پروگراموں کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا کریں گے۔

اسی طرح انھوں نے جمہوریت کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے راجیہ سبھا میں ایمرجنسی کے نفاذ کے متعلق ایک بیان میں کہا کہ ایمرجنسی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم نے جمہوریت کی راہ سے منھ موڑ لیا ہے یا ہم جمہوریت کو ملک کے لیے ناموزوں تصور کرتے ہیں، میں اس موقع پر اس بات کو بالکل واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ ہمارے جیسے وسیع ملک کے لیے جس میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں اس کے لیے جمہوری نظام کے سوا اور کوئی دوسرا نظام کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

انھوں نے ۲ اگست ۱۹۷۵ء کو بندرگاہوں کے منتظمین کے جلسے میں جمہوریت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میں جمہوریت کی صرف اس لیے قائل نہیں ہوں کہ وہ ایک اچھا آدرش ہے بلکہ اس لیے قائل ہوں کہ ہمارے جیسے ملک کے لیے جمہوری طریقہ

ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم عوام کو حکومت کے کاموں میں شرکت کا زیادہ سے زیادہ موقع دے سکتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی شرکت ہی جمہوریت کی جان ہے۔

انھوں نے کہا کہ جمہوریت کا مطلب محض انتخابات کی آزادی یا آزادانہ انتخاب نہیں بلکہ جمہوریت دراصل ملک کی تعمیر و ترقی میں عوام کی پر خلوص شرکت ہے

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ہمیشہ اس بات پر زور دیتی رہی ہیں کہ ملک کی حکومت، اس کے انتظام اور اس کی سرگرمیوں میں غریب عوام برابر کے شریک ہوں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں اور خود کو تمام کاموں اور پروگراموں میں برابر کا شریک سمجھیں اور لگن اور جوش کے ساتھ ان پر عمل درآمد کی کوششیں کریں۔ کیونکہ اچھے سے اچھا پروگرام عوام کے پرخلوص تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۲۰ نکاتی پروگرام - مسز اندرا گاندھی نے اپنے ۲۰ نکاتی پروگرام میں سب سے زیادہ زور ملک کے غریب اور کمزور طبقہ کی فلاح و بہبود پر دیا ہے۔ ملک کی آزادی سے ملک میں جو ترقی ہوئی اور جو خوشحالی آئی اس سے اب تک محض ایک مخصوص طبقے کو فائدہ پہنچا اور بڑھی ہوئی قومی دولت کی تقسیم مساوی طور پر نہیں ہوئی اور جس کی وجہ سے غریب اور محنت کش طبقہ جس کی محنت اور جانفشانی کے نتیجے ہی میں ملک کی دولت میں اضافہ ہوا اس سے خود اسے کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ نہ تو اس کا معیار زندگی بلند ہوا اور نہ اسے ترقی کے مساوی مواقع فراہم ہو سکے۔ دولتمند طبقہ کے لوگ اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر تعلیم و ترقی کے تمام مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے اور سماج میں عزت و وقار حاصل کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال نہ تو صحت مند معاشی ترقی کے لیے مفید تھی اور نہ اس سے ملک میں استحکام اور اطمینان پیدا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ دولت کے چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے اور ایک مخصوص طبقہ کے خوشحال ہو جانے سے ملک خوشحال اور ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کی اصلی پہچان ملک کے عوام کی مجموعی ترقی اور خوشحالی ہے۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اسی لیے ملک کے غریب اور کمزور طبقے کے لوگوں کی ترقی اور بہتری کی طرف خاص توجہ دی اور اپنے ۲۰ نکاتی پروگرام میں زرعی اراضی کی حد بندی سے حاصل ہونے والی فاضل زمین کی بے زمین کاشتکار مزدوروں اور پچھڑے ہوئے لوگوں میں صحیح طور پر تقسیم کیے جانے کے بندوبست کے ساتھ ساتھ انھیں قرض کے بار سے سبکدوش کرنے، پابند مزدوروں سے آزاد کرانے اور ان کے رہنے کے لیے مناسب جگہ کا بندوبست کرنے کے لیے باقاعدہ اور سرگرم پروگرام رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں ملازمتوں میں مراعات دینے انھیں قانونی امداد اور تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ ان کے دور قیادت میں ہمارے ملک نے اقوام عالم میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ ★

بنے بھائی مرحوم ——— (صفحہ ۸ کا بقیہ)

میں زور صاحب بھی مع قبائل کے میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چار بچے، بیگم، دو ملازم، زور صاحب کتنا اور تکلف التفات چاہتے تھے اور ان کا خاموش مطالبہ یہ تھا کہ جہاں کہیں وہ جائیں، میزبان بھی جوابی پوسٹ کارڈ کی طرح ان کے ساتھ جائے۔ ایک روز میں زیادہ مصروف تھا ان کے ساتھ نہیں جا سکا اور ایک طالب علم سے کہا کہ آپ زور صاحب کے ساتھ چلے جائیے۔ شام کو میں نے پوچھا: "زور صاحب آج کا دن کیسا گزرا۔ سب کام ہو گئے آپ کے؟"

کہنے لگے: "میاں یہ طالب علم ہمارے مرتبے کو نہیں پہچانتا۔ اس نے ہمیں بس میں بٹھا دیا!"

زور صاحب پان بناتے رہتے اور بنے بھائی سے اردو کے متعلق گفتگو کرتے رہتے۔ یا اپنی تحقیقیں دہراتے جائیں۔

بنے بھائی مجھ سے کہنے لگے: "فاروقی، تمھیں معلوم ہے میں زور سے کیوں محبت کرتا ہوں۔ میں دکن کے عظیم ورثے کو یک قلم مسترد نہیں کر سکتا۔ اسی لیے شوق اور زور دونوں مجھے عزیز ہیں۔"

★

شوکت بنارسی

جواہر لال

نتا ہے کچھ وہی سیرت جواہر لال کی
ں کو کچھ حاصل رہی قربت جواہر لال کی

ہند پہ موقوف کیا ہے جانتے ہیں اہلِ ہند
غیر ملکوں میں بھی تھی شہرت جواہر لال کی

بس کو کر سکتی نہ تھی مرعوب شانِ خسروی
قابلِ تعریف تھی فطرت جواہر لال کی

دوستوں کا ذکر کیا دست گیر تھی دوست کے
دل میں دشمن کے بھی تھی عزت جواہر لال کی

جس طرف جاتے ادھر جاہ و حشم لیتے قدم
دیکھو یہ تھی شان یہ شوکت جواہر لال کی

پھر خیال آیا ہمیں پھر یاد تازہ ہو گئی
پھر نظر میں پھرتی ہے صورت جواہر لال کی

دیکھیے شوکت ہر اک لب پہ ہے ان کا تذکرہ
جاگزیں ہر دل میں ہے الفت جواہر لال کی

نصر قریشی

روحِ نہرو کا پیغام

شمعِ حق بادِ مخالف میں جلائے رکھیے
ہر گزرگاہ کو پُرنور بنائے رکھیے
قاتلِ نور پرستار ہیں تاریکی کے
اپنے سورج کو تو راہو سے بچائے رکھیے
سوختہ ذہنوں کی قندیل کو روشن کر کے
اُجڑے، تاریک مکانوں کو سجائے رکھیے
حق پرستی ہی عبادت کا لقب پاتی ہے
سچ کی آواز میں آواز ملائے رکھیے
ظلم اور جور کا ماحول مٹانے کے لیے
خود کو تخریب پسندوں سے بچائے رکھیے
زندگی جہدِ مسلسل سے سنور جاتی ہے
عزمِ محکم سے دلِ خفتہ جگائے رکھیے
دامنِ صبر و رضا ہاتھ سے چھوٹے نہ کبھی
خود کو آئین کا پابند بنائے رکھیے
گلشنِ وقت کے پھولوں میں چھپے ہیں کانٹے
دامنِ فکر کو کانٹوں سے بچائے رکھیے
ضربِ تیشہ سے چٹانوں میں بھی نغمہ گونجے
پھول محنت کے ہر اک سمت کھلائے رکھیے
دشت در دشت سرابوں کے سفر میں گذری
چشمۂ آبِ رواں خود کو بنائے رکھیے
ٹوٹی دیواروں کا منظر بھی بدل جائے گا
دل میں تعمیر کے جذبات بسائے رکھیے
کاروانِ وقت کا ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا کبھی
دور منزل بھی نہیں، پاؤں بڑھائے رکھیے
جن اصولوں کے لیے وقف تھی میری ہستی
ان کو سرگرمِ عمل رہ کے بنائے رکھیے
دوستی، پیار، وفا، امن کا پیغام لیے
ملک کا نام زمانے میں جگائے رکھیے

رفیعہ منظور الامین

(افسانہ)

کاگال

اس چھوٹے سے گاؤں کے تقریباً سارے ہی بغیچے کندنا کے باپ ہلیا کے تھے۔ پان کے باغیچے جہاں سوزن نما تپلے تپلے لمبے پیڑوں کی جلد میں اپنی شہ رگ سموئے پان کی نازک بیلیں اوپر تک لپٹی چلی گئی تھیں اور چھوٹے بڑے کلی دار پانوں کے پتے کسی بھارت ناٹیم رقاصہ کی خوبصورت ہتھیلیوں کی طرح ہلکی ہوا میں تھر کتے جاتے۔ جب کامگار اپنی انگلیوں میں لوہے کے تیز ناخون پہنے کٹ کٹ ــ ان پانوں کو ڈنڈی سے کاٹ کر جمع کرتے تو ہمیشہ گیلی رہنے والی زمین میں ان کے پیر دھنستے جاتے، بغیچے کے اندر گہرے زمردی سائے میں دوسرے ہر رنگ کا احساس مٹ جاتا۔

پان کے ان بغیچوں کے کناروں پر سپاری کے اکہرے تپلے بانس نما پیڑ تھے۔ جو ایک دوسرے سے دور، دور ــ شیو جی کے لمبے ترشول کی طرح ایستادہ اور سیدھے تھے۔ اتنی نازک محبوب کی کمر بھی ہوتی تو دوہری ہو جاتی۔ لیکن یہ تپلے بنسی نما لمبے لمبے پیڑ اپنے سروں پہ سپاری کے ٹوکرے اٹھائے کیسا برسوں سے یونہی کھڑے تھے۔

ان بغیچوں سے کچھ دور جہاں سے ایک راستہ شری لبو میشور کے مٹھ کو جاتا ــ بس وہیں نکڑ پہ ــ ناریل اور چیکو کا بڑا بغیچہ تھا جہاں ناریل کے ہاتی برڈ پیڑوں میں ناریل نیچے نیچے لگتے ــ زمین پر کھڑے کھڑے ــ ہاتھ بڑھا کر توڑے جا سکتے تھے۔

"یلی گے ہوگتی ؟" (کہاں جا رہے ہو؟") کندنا نے مینڈ پر کھڑے کھڑے کنڑی میں پوچھا ــ وہ باسکٹ میں بڑے بڑے چیکو جمع کر رہی تھی۔ وہ کرناٹک کی سانولی سحر تھی جس میں کولار کے سونے کا رنگ گھلا تھا۔

منگل گٹی، رک گیا ــ اکا مہادیوی کا وچن اس کے لبوں پر ادھورا ہی ٹھٹک گیا۔

بٹادِ میلے مینا ماڈی مرگا گلی دے انجی درے ....

"جب تم پہاڑ پہ گھر بناتے ہو ــ تو جنگلی درندوں سے ڈر کیسا۔

جب تم سمندر کے کنارے نواس کرتے ہو ــ تو لہروں کا کیا رونا۔

جب تم بازار میں رہتے بستے ہو ــ تو شور شغابے کا کیا گلہ اے بھائی زندگی تو....."

اس نے کندنا کو ایک نظر دیکھا۔

"اڈکی (سپاری) نکالنی ہے ــ وہیں جا رہا ہوں"۔ اس نے درانتی اور کندھے پر رکھی رسّی سنبھالتے ہوئے کہا۔

منگل گٹی ابھی تین چار مہینے سے کام پر لگا تھا ــ وہ سارے کامگاروں میں زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ یوں تو کندنا کے پتا اپنے سارے ہی کامگاروں سے گہرا تعلق رکھتے اور حتی الامکان ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن منگل گٹی سے انھیں خاص لگاؤ تھا، کیونکہ اس سے ان کی دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ وہ اس کی ہمیشہ ہمت بندھاتے بلکہ اس کے امتحانوں کی فیس اور کتابوں کی ذمہ داری سب کچھ وہی اٹھاتے اور اس کے بدلے میں منگل نے بھی کسی کام میں آنا کانی نہیں کی، حساب کتاب سے لے کر معمولی سے

معمولی کام میں بھی اس نے کبھی عیب نہیں سمجھا۔

اپنی آمد کے ان تین ہی چار مہینوں میں منگل سپاری توڑنے میں بھی ماہر ہو گیا تھا۔ اس کا چست بدن اس کام کے لیے بہت موزوں تھا۔ چڑھنا اسے ایک ہی درخت پر پڑتا۔ سپاری کے پتلے پتلے تنے کو اپنی بانہوں کی گرفت میں لیے درانتی منھ میں پکڑے وہ گلہری کی طرح اوپر تک چلا جاتا۔ وہ وہاں رسّی سے خود کو پیڑ سے باندھ لیتا اور درانتی سے ساری سپاری نوچ لیتا اور پھر کمر کی رسی کھول کر اوپر پیڑ پر جھولنے لگتا۔ ملناڈ کی تیز مانسونی ہوا، جھونکوں کو تیز تر کرتی۔ اس کے بدن اور پیر دل کی جنبش سے یہ جھونکے بڑھتے جاتے اور ہر جھونکا اس کے پیڑ کو دوسرے پیڑ سے قریب تر کرتا جاتا۔ ایک دو، تین، چار اور ایک آخری جھونکا اسے دوسرے پیڑ سے حتی الامکان قریب کر دیتا۔۔۔

اچانک وہ پہلا پیڑ چھوڑ دیتا اور چھلانگ لگا کر پچاس ساٹھ فیٹ کی بلندی پر دوسرے پیڑ پر جا بیٹھتا۔۔۔ پہلے پیڑ اور دوسرے پیڑ کے درمیان یہ خلائی پل کبھی آٹھ دس فٹ لمبا بھی ہوتا۔ اتنا کہ دیکھنے والوں کی سانس رک جاتی اور نظر یخ بستہ ہو جاتی۔

کندنا نے کئی کاریگروں کو سپاری کے ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگاتے دیکھا تھا، لیکن اس کی سانس کبھی نہیں رکی تھی۔۔۔ نظر کبھی یخ بستہ نہیں ہوئی تھی، لیکن منگل کو چھلانگ لگاتے دیکھ کر جب پہلی بار اس کی سانس رکی تو اس پر ایک بالکل نئی حقیقت کا انکشاف ہوا اور وہ سپاری کے لچکیلے پیڑ کی طرح کانپ گئی۔

"آج بھی وہاں آؤں گی ۔۔۔ تم جو سپاری پھینکو گے تو جمع کر دوں گی۔"

"نہیں ۔۔۔ تم نا آؤ۔" منگل بولا۔

"کیوں؟ ۔۔۔ بغیچہ تم نے لگایا ہے کیا؟" اس نے ہنس کر کہا۔

"میں نے کب کہا کہ بغیچہ میں نے لگایا ہے ۔۔۔ تم سامنے رہو تو پیڑ پر میرے پیر نہیں جمتے ۔۔۔ ہوگ پٹ برتنی (میں ہو آؤں)" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

کندنا جیکو سے بھری ٹوکری لیے گھر کی طرف چل پڑی۔ ٹیوب ویل کے جوشیلے پانی سے وہ ہاتھوں کو گھس کر جیکو کا لیس دار مادہ چھڑانے لگی ۔۔۔ لیکن وہ وہاں جم چکا تھا۔ اس کے دل پر منگل کی شبیہ کی طرح ۔۔۔ اب مشکل ہی سے چھوٹے گا، ۔۔۔ اس نے سوچا۔

لیکن منگل اور کندنا کی الفت ٹیوب ویل کے جوشیلے پانی کی طرح نہیں تھی جو اپنے بہاؤ میں خس و خاشاک لے اڑے، بلکہ سبک روی سے بہتا وہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایسا چشمہ تھی جس کے کنارے ساف ساف جنگلی پھول اگتے ہیں۔ کوئی ان پھولوں کو نوچ نہیں پھینکتا۔ کیونکہ وہ کسی کی نظروں میں نہیں سماتے۔

منگل بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کب ہوا ۔۔۔ وہ پھول کب کھلے۔ لیکن وہ شروع ہی سے جانتا تھا کہ اس پھول کی آرزو کرنا بھول ہوگی۔ ظاہر ہے اس کی غریبی آڑے آتی تھی۔

بی۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دے کر جب وہ اپنے کام پر واپس آیا تو اس نے سوشیل بابو کو بھی وہاں پایا ۔۔۔ وہ کندنا کے باپ ہلیا کے دوست کے لڑکے تھے۔ خوبصورت جوان اور پڑھے لکھے۔ تعلق تو ان کا پیڑھیوں سے کرناٹک ہی سے تھا لیکن ان کے دادا نے بمبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور اب پہلی بار وہ کرناٹک آئے تھے۔ بمبئی میں ان کی کافی جائیداد تھی ۔۔۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے آبائی وطن کرناٹک کی لڑکی ان کی بہو بن کر آئے۔ اور اسی غرض سے وہ وہاں آئے تھے کہ کندنا کو خود ہی دیکھ بھال لیں، اور کندنا انھیں پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی۔ انھیں اس چھوٹے سے گاؤں سے بھی ایک لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ شیوا کے مندر کے اندر ستونوں پر کندہ شبیہوں پر انگلیاں پھیرتے۔ مندر کے سامنے بنے پکے تالاب میں کھلے ان گنت کنول کے پھولوں کو گنتے ہوئے ۔۔۔ وہ خود کو اس ماحول کا ایک حصّہ سمجھنے لگے تھے۔ سرِ شام مویشیوں کے گھر لوٹتے وقت اڑتی ہوئی دھول، کھیتوں میں سرِ شام سے بولتے ہو جھینگر اور گنّے کے کھیتوں میں سرسراتی ہوائیں یہ سب کچھ بمبئی کی مشینی زندگی سے اتنا مختلف، اتنا سکون آگیں لگا کہ وہ خود بھی اس بہاؤ کے بارے میں سنجیدگی

سے غور کرنے لگے کہ بمبئی کا کاروبار حسب معمول اپنے بڑے بھائی سدیش بابو کے ہاتھوں میں چھوڑ کر خود گاؤں کے ہو رہیں —
پہلے تو انھوں نے بڑی سختی سے اس گھر داماد ی کی مخالفت کی۔ لیکن حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی نہ کبھی انھیں گاؤں کی ذمے داری سنبھالنی ہی تھی کیونکہ کندنا بلیا کی اکلوتی لڑکی تھی اور اب گاؤں پہونچ کر — کندنا کو دیکھ کر ان کا خیال بدل رہا تھا۔

"منگل، سوشیل بابو کھیتوں میں اکیلے مارے مارے پھرتے ہیں — اب تم آگئے ہو تو ان کا خیال رکھنا۔" بلیا نے کہا۔ اور پھر انھوں نے منگل کو ان کے آنے کی وجہ بتائی — وہ نہ بھی بتاتے تو منگل سمجھ چکا تھا۔ اس نے سوشیل بابو کی آنکھوں میں علانیہ وہ چمک دیکھی تھی جس کا وہ خود اپنے دل کی کال کوٹھری میں گلا گھونٹ رہا تھا — سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انھیں ایسا لگا جیسے ان کی بوجھل بیل گاڑی کا ایک پہیہ اچانک نکل آیا ہو —

سوشیل بابو بہت سوشل انسان تھے۔ لائق ہونے کے باوجود ان میں عام پڑھے لکھوں کا غرور بالکل نہیں تھا — وہ منگل سے بالکل گھل مل گئے۔ گوبھی میں پتھر رکھ کر گھمانے کا آرٹ منگل نے ہی انھیں سکھایا تھا۔ وہ منگل سے پوچھ گچھ کرتے رہتے کہ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ کیا کرنے والا ہے — اسے معلوم تھا کہ اگر وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو ان ہزاروں سند یافتہ نوجوانوں میں سے ایک ہوگا جو ہر سال سند کی ہتھکڑی ہاتھ میں لگائے بیروزگاری کے اندھیرے میں ڈھکیل دیئے جاتے ہیں — قیدیوں کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ کوئی منزل نہیں ہوتی۔

"جب ہماری شادی ہو جائے تو تم بھی بمبئی آیا کرنا —" سوشیل بابو بولے —

"ضرور آؤں گا" — منگل نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سوشیل بابو نے گاڑی میں جتے بیل کی پیٹھ پر کوڑا جمایا — منگل کو ایک جھرجھری سی آئی، جیسے وہ کوڑا اسی کی پیٹھ پر پڑا ہو۔"

"تم شادی نہیں کروگے منگل؟" — سوشیل بابو نے ڈوبتے سورج کے شعلوں کو دیکھ کر کہا۔

منگل ہنسا "مجھ سے کون شادی کرے گا۔؟"

"ہم تمھاری شادی بمبئی میں کروائیں گے۔"

وہ سوشیل بابو سے پوچھ نہیں پایا کہ انھوں نے خود اپنے لیے کوئی لڑکی بمبئی میں کیوں نہیں ڈھونڈ ھی!"

کندنا اب اس سے کترانے لگی تھی — ایک روز وہ اسے کوئیں کی منڈیر پر مل گئی۔ شکوے گلے تو اس صورت میں ہوتے ہیں جب کچھ عہد و پیمان ہوئے ہوں — ان دونوں کی محبت تو آنکھوں کی چوکھٹ پر ہی رک گئی تھی۔

"سوشیل بابو بہت اچھے آدمی ہیں" — منگل نے ایک پتلے لمبے بانس کو درانتی سے باندھتے ہوئے کہا۔

کندنا چپ رہی۔

"وہ تمھیں بہت پیار کرتے ہیں۔"

کندنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ تمھیں بہت خوش رکھیں گے۔"

کندنا چلی گئی۔

اس کی آنکھوں میں برسات کی بدلیاں تھیں جو نہ کھلتی تھیں نہ برستی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ منگل نہیں اس کا جذبۂ احسان مندی بول رہا ہے — جس دیوار نے اسے سہارا دیا تھا — وہ اسی پر اپنا قلعہ کیسے بنا سکتا تھا۔ اسے اچانک منگل پر غصہ بھی آیا۔ کیوں نہیں مردانگی سے وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے باپ سے کہہ دیتا کہ تم نے بیشک مجھے سہارا دیا ہے۔ اب ایک مرد کی طرح میں تمھاری لڑکی کا سہارا بننا چاہتا ہوں — اس نے منگل کی جھجک کو کم ہمتی پر محمول کیا — کم از کم وہ اس سے ہی کہہ دیتا کہ، کندنا جو کچھ میری آنکھیں تم سے کہتی ہیں جھوٹ نہیں کہتیں — مجھے واقعی تم سے پیار ہو گیا ہے — میں تمھیں اپنانا چاہتا ہوں لیکن کسی کے احسان کا بوجھ سب سے پہلے چٹان بن کر زبان پر ہی بیٹھتا ہے اس کے علاوہ منگل خود غرض بھی نہیں تھا۔ اس

نے اپنا اور سوشیل بابو کا مقابلہ کیا۔ کئی زاویوں سے جو د کو تصور میں ان کے مقابل کھڑا کیا اور آخرکار اپنے آپ اس کی ہنسی چھوٹ گئی — پتہ نہیں کندنا نے اس میں کیا دیکھا تھا۔ اس نے سوچا۔ لیکن سوچتے سوچتے اس کے ہونٹوں کی ہنسی غائب ہو گئی۔ جوہڑ کے گدلے پانی میں تکتے تکتے اس نے دیکھا کہ کندنا سجی سجائی دلہن بنی سوشیل بابو کے پیچھے سر جھکائے مقدس آگ کے پھیرے لے رہی ہے۔ وہ ہون کے ان اٹھتے شعلوں کو دیکھتا رہا — اچانک ان شعلوں نے لپک کر اس کے دامن کو چھو لیا اور ساتھ ہی کندنا کی شعلہ بار آنکھیں اس کی طرف اٹھیں اور کہا، ڈرپوک — منگل چونک کر پیچھے ہٹا۔

اس نے خاموشی سے اٹھ کر کھونٹی سے اپنا اجلا کرتا اتارا اور تیار ہو کر باہر نکلا —

مانسون آنے والے تھے۔ کھیتوں میں کھاد بکھیری جا رہی تھی۔ ہلیا آدم کے گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھے اسے مل گئے — شاید ٹریکٹر میں کوئی خرابی آ گئی تھی۔ اس کی دیکھ بھال وہ ہی کرایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی کوئی پرزہ ان کے ہاتھ میں تھا جسے وہ درست کر رہے تھے۔

منگل گہری سوچ میں ڈوبا ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہلیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا — اس کی نظریں اسی طرح جھکی رہیں۔

"کیوں کیا بات ہے منگل؟" ہلیا نے نرمی سے پوچھا — وہ بہت کم اونچا بولتے تھے۔

"کندنا سے میں بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے نظریں اٹھا کر ہلیا سے کہا۔ ہلیا کچھ دیر تک ان آنکھوں میں دیکھتے رہے جن میں خود اعتمادی تھی، عزم تھا، سچائی تھی — انھوں نے ہاتھ سے ٹریکٹر کا پرزہ رکھ دیا۔

"بیٹھ جاؤ —" انھوں نے منگل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سمجھ رہے ہو منگل، تم کیا بات کہہ رہے ہو؟"

منگل نے صرف سر ہلا دیا۔

"یہ بات تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہیں کہی؟

"مجھ میں ہمت نہیں تھی — اب کہہ رہا ہوں۔"

"اب تو دیر ہو چکی ہے — میں نے سوشیل بابو کو ہاں کر دی ہے" — وہ پلٹ گئے۔

انھوں نے ٹوٹے ہوئے پرزے سے پھر کھیلنا شروع کر دیا۔ "کندنا کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔" انھوں نے کہا۔

منگل کچھ دیر کھڑا ان کی پشت دیکھتا رہا اور پھر سر جھکائے چلا آیا —

رات کو اس کی کٹیا میں دیا نہیں جلا — ہوا سے دروازہ پھڑ پھڑاتا رہا۔ اور وہ یونہی دیوار سے ٹیک لگائے ساری رات بیٹھا رہا۔ وہ بچپن سے دل کی نازک آرزوؤں کو مجبوری کے وزنی پتھروں تلے دباتا آیا تھا۔ آج اسے لگا جیسے من کے احساس پر ایک سنگلاخ چٹان آ گری ہو — اب اس کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ جیسے اس کی زندگی اب ہمیشہ کے لیے ایک دلدل بن گئی ہو۔ جس میں آرزو کا سفینہ کبھی نہیں ڈولے گا۔

صبح جیسے اس کے دروازے پر آ کر ٹھٹک گئی تھی — وہ سوچنے لگا کہ کندنا کے دل پر بھی کیا یہی کچھ گزر رہی ہو گی — لیکن جواب میں صرف ہوا کی سسکیاں سنائی دیں۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ لیکن کام پر تو جانا ہی تھا — وہ کام کیسے چھوڑ سکتا تھا — اس نے رسی اور درانتی اٹھائی اور کھویا ہوا سا پیاری ترکلانے کے لیے چلا گیا۔

اسی روز کندنا اور سوشیل بابو ٹہلتے ہوئے کچھ دور نکل آئے تھے — اب یہ جانی مانی بات تھی کہ اگلے مہینے ان دونوں کا بیاہ ہو جائے گا — اور ہلیا کی روشن خیالی نے اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھی تھی کہ کبھی کبھار انھیں اکٹھا چھوڑ دیا جائے۔ سوشیل بابو اسے اپنے دل کے اندر اور دل کے باہر کی دنیا کی بہت سی باتیں بتا رہے تھے۔ اور وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

"بس اب اور آگے نہیں جائیں گے —" وہ اچانک رکتی ہوئی بولی۔

"کیوں چلی ہو — مجھے دیکھنا ہے سپاری کس طرح اُتاری جاتی ہے۔"

"نہیں — میں نہیں جاؤں گی۔" وہ جانتی تھی وہاں باغ کے بغیچے کے پاس منگل ہی سپاری اتار رہا تھا۔

"ٹھیک ہے — اگر تم نہ چلنا چاہو۔" سوشیل بابو اس کے اچانک انکار پر حیران ہوتے ہوئے بولے۔ لیکن اسی وقت ہلیا سامنے سے چلے آئے اور دونوں کو دیکھ کر کہا:

"آؤ — آؤ — چلے آؤ — میں تمھارے ہی انتظار میں تھا۔"

اور کندنا آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ روک سکی — سوشیل بابو کو افسوس ہوا کہ ناحق انھوں نے زور لگایا۔ کندنا کے نا کہنے پر وہ اسی طرح لوٹ جاتے تو ہلیا انھیں دیکھ بھی نہیں پاتے۔

پیپتے کی نیگی سے کچھ ناریل کا پانی پیتے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ منگل سپاری توڑ توڑ کر نیچے پھینکتا جا رہا ہے — وہ ان کی موجودگی سے بےخبر اپنے کام میں گم تھا۔ کندنا کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کے دل کی دھڑکن اس کے جسم کو کپکپانے لگی تھی۔ ہلیا کچھ کامگاروں کو ساتھ لیے جا چکے تھے۔

سوشیل بابو کے لیے یہ نظارہ بڑا حیران کن تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے منگل کا پیڑ لچکنے لگا — پاؤں اور بدن کی جنبش سے وہ اسے لچکاتا رہا۔ جھونکے رفتہ رفتہ بڑھنے لگے۔ اچانک اس نے ایک بڑی جست لگائی اور دوسرے پیڑ پر جا رہا۔ کندنا کے ہاتھ سے ناریل گر پڑا — اس کی گھبراہٹ سوشیل بابو سے بھی چھپی نہ رہی لیکن وہ اس کا باعث سمجھ نہ پائے۔

منگل کا دوسرا پیڑ لچکنے لگا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ منگل کی مہارت کی داد دے کر کندنا کے ساتھ واپس ہو جائیں۔ انھوں نے زوردار تالیاں بجائیں۔

"واہ واہ منگل — یار تم نے کمال کر دیا۔" منگل نے جھولتے پیڑ سے نیچے دیکھا — کندنا کی پھٹی پھٹی ان حیران آنکھوں کو دیکھا جو اسے دیکھ رہی تھیں — اس تناؤ کو محسوس کیا جو کندنا کی رگ رگ میں سما گیا تھا — پیڑ کی لچک بڑھتی رہی۔ لیکن اسے ایسا لگا کہ جیسے ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ اس نے اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش کی اور ایک سانس بھر کر دوسرے پیڑ کی طرف جست لگا دی۔ لیکن اس کا پیڑ لچک کر پیچھے جا چکا تھا۔ ایک دھڑ کی آواز کے ساتھ وہ نیچے کیچڑ اور پانی سے بھرے گڈھے میں آ رہا۔

کندنا کے منھ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بےتحاشہ دوڑ کر اس کے ساکت جسم سے لپٹ گئی — سوشیل بابو اسے آواز لگاتے رہے۔ "کندنا — کندنا" لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ سوشیل بابو نے اسے الگ کیا اور منگل کی نبض دیکھنے لگے — کندنا کی چیخ سن کر آس پاس کام کرنے والے دوڑے آئے — اور بےہوش منگل کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ سوشیل بابو نے سختی سے کندنا کا ہاتھ پکڑا اور گھر لے چلے۔

دوسرے روز وہ کندنا کے پتا سے دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

"میرے خیال میں بیاہ جلد ہو جائے تو بہتر ہوگا۔" — سوشیل بابو نے کہا۔

ہلیا نے صرف سر ہلا دیا۔

لیکن گاؤں والوں میں کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سوشیل بابو اچانک کیوں واپس ہو گئے — وہ اتنے اداس کیوں تھے۔ اور منگل کے لیے شہر سے بڑا ڈاکٹر بلا کر ہلیا کیوں اسے اپنے گھر اٹھا لے گئے۔

★

د۔ د۔ ورمہ

بنام اندرا گاندھی

ارضِ وطن پہ چھائی ہوئی تھی سیاہ رات
شمعیں جلا گئی ہے مگر ایک تیری ذات
جمہوریت کی لاج بچانے اٹھی ہے تو
دراصل تیرے ہاتھ ہیں ہندوستاں کے ہاتھ
اب روشنی کی سمت رواں ہے قافلہ
اب مل گئی ہے قوم کو ظلمات سے نجات
اب سانس لے رہی ہے ہر اک سمت زندگی
ملنے لگی عوام کو اب لذتِ حیات
شام و سحر تو اب بھی وہی ہیں جو تھے مگر
محسوس ہو رہا ہے کہ بدلی ہے کائنات
یا اپنے اپنے فکر میں کھوئے ہوئے تھے لوگ
یا ہو رہی ہے عظمتِ ہندوستاں کی بات
ہر دل عزیز راہنمائے وطن ہے تو
سارا وطن ہے تیری طرف اور تیرے ساتھ
سانپوں کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دیا
بروئے کار آ نہ سکے تلخ سانحات
تیری وجہ سے ملک تباہی سے بچ گیا
تو نے کیا ہے قوم کو محفوظِ حادثات
سوگند کھائے گا تری عظمت کی حشر تک
چشمِ فلک نے دیکھے ہیں کچھ ایسے واقعات
پہلی جگہ ملے گی یقین و خلوص کو
لکھے گا جب مورخِ فردا ترے صفات
کچھ اور بھی بلند کرے جرأتیں تری
اللہ اور تیرے عزائم کو دے ثبات
اے مادرِ وطن کی نگہدار اندرا!
سچی ہے تیرے منہ پہ اگر تو کہے یہ بات
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"

عبدالمنان

اندرا گاندھی

اندرا اے ساورنے ہندستان کی فرمانروا — مخزنِ عقل و خرد اے قابلِ مدح و ثنا
اے بہارِ باغِ نہرو بانیٔ امن و اماں — سارا عالم مانتا ہے تم کو یکتائے جہاں
پوتی موتی لال کی دخترِ جواہر لال کی — تم نے ہر اہلِ وطن کی زندگی خوشحال کی
آفریں صد آفریں اے اندرا صد آفریں — عقل اور دانش سے تم نے مشکلیں آساں کیں
تم نے ہر دشتِ وطن کو رشکِ گلشن کر دیا — اور ہر اک گوشۂ تاریک روشن کر دیا
گلستانِ ہند کو تم نے شگفتہ کر دیا — جو بنے تھے خار ان کو دست بستہ کر دیا
کامرانی ساتھ ہے ہر امر کی ابتدا — کی ہے خالق نے تمہیں کچھ عقل ہی ایسی عطا
راستی پر آ گئے وہ جو کہ تھے باغی سر — ایمرجنسی کو بس رکھتے ہوئے مدِ نظر
کتنی بہتر یہ نکاتی بیس کی اسکیم ہے — قابلِ تحسین ہے اور لائقِ تسلیم ہے
بس یہی ہر دم تمہارے دل میں رہتی ہے لگن — بھارتی ہوں شادماں اور دور ہوں رنج و محن
خوش گماں ہے نس بندی کی یہ اسکیم ہے — کنبہ بندی کی پلاننگ یہ نئی تنظیم ہے
صرف دو بچوں سے ہی خوشحال ہوتا ہے گھر — ہے بہتر گیدڑوں سے ایک ہی بہتر شیر نر
کثرتِ اولاد ہی برباد کر دیتی ہے گھر — غم کا ہوتا ہے بسیرا ہر در و دیوار پر

تم ہزاروں سال اس کرسی پہ بیٹھو اندرا
دے رہا منان تم کو صدقِ دل سے یہ دعا

ڈاکٹر حنیف نقوی

منشی احمد حسین سحر

احمد حسین سحر اور ان کے تذکرے بہارِ بے خزاں سے عام اہلِ علم غالباً سب سے پہلے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی تصنیف میر تقی میر۔ حیات اور شاعری کے ذریعے متعارف ہوئے جس میں اس تذکرے کے حوالے سے میر کے اپنی ایک "پری تمثال عزیزہ" کے ساتھ معاشقے کا انکشاف کیا گیا ہے۔

بہارِ بے خزاں کا سالِ تالیف ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء ہے۔ اس کے دو قلمی نسخے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں انہی مخطوطات کی بنیاد پر اس کے دو ایڈیشن دہلی کے دو مختلف علمی اداروں کی طرف سے طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ڈاکٹر نعیم احمد کے مقدمے کے ساتھ علمی مجلس سے، اور دوسرا ایڈیشن حفیظ عباسی صاحب کی تصحیح اور تعلیقات کے ساتھ مجلسِ اشاعتِ ادب سے شائع ہوا ہے۔ ان دونوں ہی ایڈیشنوں کے مرتبین نے سحر کے زمانۂ حیات اور سوانحِ زندگی کے بارے میں مطلق لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے مقدمات کو صرف تذکرے کے مالہٗ و ما علیہ تک محدود رکھا ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد لکھتے ہیں:

"بہارِ بے خزاں کا مصنف احمد حسین سحر لکھنوی ہے۔ اس کے حالات کا پتہ نہیں چل سکا۔ تذکرے کے اختتام پر تاریخِ تصنیف مندرج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں مکمل ہوا (مقدمہ ص ۱)"

حفیظ عباسی صاحب کا بیان ہے کہ:

"احمد حسین سحر ابتدا میں آشفتہ تخلص کرتے تھے کچھ دن بعد انھوں نے غلام مینا ساحر سے اصلاح لینی شروع کی چونکہ استاد کا تخلص ساحر تھا، اسی کی مناسبت سے اپنا تخلص آشفتہ سے بدل کر سحر کر دیا۔"

"کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی سحر کے حالاتِ زندگی کے متعلق معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ انھوں نے خود اپنے حالاتِ زندگی کے متعلق کچھ تحریر نہیں کیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے والد کا نام بھی نہیں لکھا۔" (مقدمہ ص ۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نگار پاکستان کے تذکروں کا تذکرہ نمبر کے بعد اپنی تازہ تصنیف اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری میں بیشتر معلوم الاسم تذکروں اور ان کے مصنفین کے بارے میں حتی المقدور تمام ضروری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سحر کے حالات انھیں بھی معلوم نہیں ہو سکے چنانچہ انھوں نے بھی نام اور تخلص کے بعد صرف اس قدر لکھ کر کہ "پہلے آشفتہ تخلص کرتے تھے۔ غلام مینا ساحر سے تلمذ کے بعد سحر کو اپنا لیا تھا۔"[1] بہارِ بے خزاں سے سحر کے ترجمے کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔

---

[1] اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ص ۴۶۳

سحر نے اس تذکرے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی تلخیص یہ ہے :

"کاتب الحروف احمد حسین از ابتدائے سن تمیز تا ایندم بہ تلاش کلام موزوں عمرے بسر کردہ و با اکثر شعرائے فی زماننا سرگرم اتحاد پرستی ہا بودہ ...... چوں اتفاق موزوں کردن اشعار شاذ و نادر افتادہ ...... مناسب نمی دانست کہ شعرے از موزوں کردۂ خود داخل تذکرہ کند لیکن بعض یاران طریقت کہ از فکر ناقص ایں ننگ خلائق آگاہی داشتند نگزاشتند کہ ازیں معرکہ دست کشیدہ پا بیروں گزارد .. .. ازیں پیش آشفتہ تخلص می کرد، اکنوں بہ نظر ایں کہ خوشہ چین خرمن استفادہ استادی غلام مینا ساحر ہستم سحر تخلص پسندیدہ ام"

بہار بے خزاں سے قبل سحر "طہد معنی" کے نام سے شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دے چکے تھے۔ اس تذکرے میں انھوں نے اپنا ترجمہ شامل نہیں کیا البتہ دیباچے میں اپنے بارے میں یہ معلومات فراہم کی ہے :

"چوں از سلیقۂ شعر گوئی زبان پارسی حرماں نصیب است، لہٰذا بزمرۂ ایں نکتہ پردازان خود را محسوب نہ کردہ است وگاہ گاہے کہ در زبان ریختہ بمقتضائے درد دل دگدازی طبع با صرار بعض اتحاد پرستان محبت سرشت شعرے کہ می گوید بحکم استاد نیز کالمعدوم است۔"

اپنے استاد غلام مینا ساحر کے ترجمے میں اس معلومات پر یہ اضافہ کیا ہے :

"فقیر از مین عنایت، وتلمذ او حرف آشنا گردیدہ سر افتخار از نسبت شاگردی او بفلک می ساید"

ان مجمل و مختصر بیانات سے نہ تو سحر کی زندگی کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی ہے اور نہ ان کی شخصیت کا کوئی واضح نقش ابھرتا ہے البتہ یہ بات متیقن ہو جاتی ہے کہ وہ خود کو ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے معاصرین سے متعارف کرانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور کے تمام تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

شعرائے اردو کے تذکروں سے متعلق اپنے تحقیقی کام کے دوران اور خاص طور پر بہار بے خزاں کی اشاعت کے بعد راقم السطور نے کئی بار سحر کے حالات زندگی کی تلاش و جستجو کی کوشش کی اور حتی الامکان وہ تمام کتابیں دیکھ ڈالیں جن سے اس سلسلے میں کچھ مدد ملنے کی توقع تھی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی ایک مدت کے بعد گزشتہ سال اپریل (۱۹۷۵ء) کے مہینے میں تاریخ گوئی سے متعلق بعض مسائل کے سلسلے میں منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی تصنیف ملخص تسلیم کی ورق گردانی کے دوران بالکل غیر متوقع طور پر سحر کے بارے میں ایک حوصلہ افزا انکشاف ہوا جس نے اس سمت میں تلاش و تحقیق کی نئی راہیں کھول دیں اس انکشاف کا سرچشمہ اس کتاب کی مندرجہ ذیل عبارت تھی۔

از مولف تاریخ تذکرۂ احمد حسن کاکوروی۔

شنیدم بتاریخ می گفت ہاتف
کہ گلدستۂ نو بہار نزاکت[1]

سحر عام طور پر منشی احمد حسین سحر لکھنوی کے نام سے معروف ہیں۔ اس کے برخلاف تسلیم نے ان کا نام احمد حسن اور وطن کاکوری بتایا ہے۔ مزید براں تخلص کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ ان ظاہری اختلافات کے باوجود راقم السطور کو یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں ہوئی کہ یہ بلا شک و شبہہ "بہار بے خزاں" کے مولف ہیں۔ کیونکہ اول تو اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۱ھ ہی برآمد ہوتا ہے جو بہار بے خزاں کا سال تالیف ہے اور اس تذکرے کے علاوہ کسی ایسے تذکرے کا وجود نہیں جو ۱۲۶۱ھ میں لکھا گیا ہو اور اس کے مولف کا نام احمد حسن اور وطن کاکوری ہو۔ دوسرے یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جس سے سحر کے قریبی تعلقات کا علم

[1] ملخص تسلیم مطبوعہ مطبع مطلع العلوم مراد آباد (دسمبر ۱۸۹۶ء) ص ۸۰ [2] بہار بے خزاں طبع ثانی۔ ص ۴۸

خود ان کی اس تحریر سے ہوتا ہے کہ "با راقم السطور اتحاد دلی دارد و مارا ہم با مزاج و طبع او نسبتے خاص است"[1] اس کے علاوہ اس بات سے بھی کہ تسلیم نے سحر کے دو دوسرے تذکروں کی تاریخیں بھی کہی ہیں، اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ مادۂ تاریخ "بہار بے خزاں" سے متعلق ہے۔ مولف کے نام کے معاملے میں دو سرے ذرائع "محض تسلیم" کی تائید نہیں کرتے، اس لیے اسے سہو کاتب قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن لکھنؤ کی بجائے کاکوری سے وطنی نسبت کے بارے میں تسلیم کا بیان ہمارے معلومات میں ایک اہم اضافہ ہے جو سحر کے حالات زندگی کی تلاش و تحقیق کے سلسلہ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے

کاکوری کا شمار اودھ کے مردم خیز قصبوں میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۵ کلو میٹر ہے۔ حافظ محمد علی حیدر علوی سجادہ نشین خانقاہ کاظمیہ کاکوری نے اس قصبے کے نامور فرزندوں کے حالات "تذکرۂ مشاهیر کاکوری" کے نام سے ایک کتاب میں یکجا کر دیے ہیں جو ۱۹۲۷ء میں مطبع اصح المطابع، گولہ گنج اسٹریٹ لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں منشی احمد حسین سحر کا نام دو جگہ (صفحہ ۱۹۲ و صفحہ ۲۱۰) "طور معنی" اور "بہار بے خزاں" کے مولف کی حیثیت سے ان تذکروں کے اقتباسات کے ساتھ اور ایک جگہ غلام مینا ساحر کاکوروی کے تلامذہ کے ذیل میں مذکور ہے۔ ساحر کے جن شاگردوں کے نام مصنف کے علم میں تھے وہ انھوں نے اس ترتیب کے ساتھ تحریر کیے ہیں:

(۱) نواب امیر حسن خاں متخلص بہ بسمل کاکوروی (۲) منشی مومن علی خاں مفتوں کاکوروی، (۳) مولوی محی الدین خاں ذوق کاکوروی (۴) مرزا حیدر بیگ کاکوروی (۵) مولوی غلام امام شہید امیٹھوی (۶) منشی احمد حسین سحر

اس فہرست میں دوسرے پانچ ناموں کے برخلاف سحر کے نام کے ساتھ وطنی نسبت کا عدم التزام یہ ظاہر کرتا ہے کہ عام لوگوں کی طرح علوی صاحب کو بھی کاکوری سے ان کے وطنی تعلق کا علم نہ تھا۔ اس لاعلمی کی بنیادی وجہ سحر کی شاعرانہ حیثیت ہے جو اہل کاکوری کے لیے قطعاً غیر متعارف تھی، سحر خود بھی اپنی شاعری کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اور ان کی شعر گوئی کے راز سے چند "یاران طریقت" اور "اتحاد پرستان محبت سرشت" کے علاوہ کوئی واقف نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تذکروں میں جو "تذکرۂ مشاہیر" کے مآخذ میں شامل ہیں، اپنے وطن اور حسب و نسب کی طرف کوئی اشارہ کرنے کی بجائے آتش، ناسخ اور بعض دوسرے لکھنؤی شعرا سے معاصرانہ روابط اور ملاقاتوں کا ذکر کر کے لکھنؤ میں بود و باش کے قرائن کو تقویت بخشتے ہیں۔ اس لیے فاضل مصنف کا انھیں احمد حسین کاکوری سے مختلف شخصیت تصور کرنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ زیر نظر کتاب میں شیخ احمد حسین علوی، اور منشی احمد حسین حجاجی[2] کے زیر عنوان اس نام کے دو اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق آخر الذکر احمد حسین ہی مولف "بہار بے خزاں" ہیں جن کے حالات سے ان کے تذکرہ نگار عام طور پر ناواقف ہیں۔ فاضل مصنف نے ان کے ترجمے میں جو کچھ لکھا ہے وہ من و عن درج ذیل ہے:۔

"منشی احمد حسین ابن شیخ عبدالحبیب۔ یہ اصل باشندے قصبہ دیوہ

[2] "حجاجی" پر علوی صاحب نے بطور حاشیہ تحریر فرمایا ہے "حجاجی" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے اجداد میں امیر حسام نے بغداد سے آکر قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں سکونت اختیار کی اور اپنے صاحبزادے ضیاء الدین کی شادی وہیں کی۔ بادشاہ وقت کے یہاں سے عہدۂ قضا عطا ہوا قصبہ دیوہ میں جس محلے میں انھوں نے قیام کیا وہ بوجہ ان کے تازہ وارد ہونے کے حجازی محلہ مشہور ہوا۔ کثرت استعمال سے حجاجی محلہ کہا جانے لگا۔ اور امیر حسام کی اولاد حجاجی کہی گئی اور یہ جو مشہور ہے کہ یہ لوگ حجاج بن یوسف ثقفی ظالم حاکم عراق کی اولاد سے ہیں اور اس وجہ سے حجاجی ہیں۔ یہ اب تک پایۂ تحقیق کو نہ پہونچا۔ قصبہ دیوے کے قدیم باشندے وہی بیان کرتے ہیں جو میں نے اوپر لکھا ہے اور یہی مجھے بتحقیق ہوا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال" مقالہ نگار کے نزدیک یہ نسبت حجاج ابن عباس کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے۔ جو امیر حسام سے نویں پشت میں اس خاندان کے ایک بزرگ تھے۔

ضلع بارہ بنکی کے تھے (ص ۲۴) ان کے والد شیخ عبدالحبیب صاحب نے بوجہ تعلق ننہالی یہاں کاکوری میں سکونت اختیار کی۔ ان کے قیام کی وجہ سے ان کے تمام قریبی اعزا یہاں آکر سکونت پذیر ہوے۔ اور کاکوروی کہلانے لگے۔ اب بھی ان کا بڑا خاندان سکونت پذیر ہے یہ قریشی النسل تھے۔ ان کا نسب نامہ حسب ذیل ہے:-

شیخ عبدالحبیب ابن شیخ غلام محمد ابن شیخ لطف اللہ ابن شیخ غلام مجتبیٰ، ابن شیخ محمد غوث ابن قاضی عثمان ابن قاضی عبدالنبی ابن قاضی محمود، ابن قاضی الہداد، ابن قاضی خضر، ابن قاضی محمد ابن قاضی ضیاء الدین، ابن امیر حسام، ابن عیسیٰ، ابن یوسف ابن امیر احمد، ابن امیر طاہر، ابن امیر مصطفیٰ ابن امیر دانیال، ابن عبدالعزیز، ابن حجاج، ابن عباس، ابن اسحاق، ابن ابی عمر، ابن عامر، ابن زبیر، ابن رضوان، ابن عبید ابن ابی ابن کعب، ابن عبد مناف جد رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم۔

منشی صاحب علوم متعارفہ میں پوری دستگاہ رکھتے تھے اور بے مثل منشی فخر خاقانی و ظہوری، رشک ظہیری و فاریابی تھے۔ نثر نویسی میں بہت کمال حاصل تھا۔ اس قصبہ کے بہت سے لوگ فن انشا پردازی و نثر نویسی میں ان سے تلمذ رکھتے تھے۔ ان کے مکان پر بیشتر اوقات اسی مشغلے کی وجہ سے معقول مجمع رہا کرتا تھا۔ اپنے زمانے میں یہ استاد مانے جاتے تھے۔ حضرت والد امجد مولانا حافظ شاہ علی نور قلندر قدس سرہ، بھی انشا پردازی و نثر نویسی میں انھیں سے تلمذ رکھتے تھے اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کی قابلیت و مہارت بیان فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے بتاریخ ۱۶ر ماہ صفر روز پنجشنبہ ۱۲۸۹ھ سفر آخرت اختیار کیا[1]۔ مولوی محی الدین ذوق کاکوروی سے بہت رسم و اتحاد تھا جیسا کہ ان کی تاریخ سے ظاہر ہے جو درج ذیل ہے:-

فغاں کز رحلت احمد حسین آں دوست ما صادق

فلک بنہاد بند نو بجان غم اسیر ما

بدر روش بسکہ آمد شرحہ شرحہ سینہ ہم چوں نے

از میان غم چوں نہ پیچید بر سر گردوں نفیر ما

سنفتہ چوں بسر در قعر حسرت ناتواں جانم

کہ از پائے حیات افتاد یار دستگیر ما

سر آید زیں دو مصرع ذوق در سال وفات او

بہ ہجری و بفصلی نامہ موزوں از صریر ما

چو بکشاد او بشوق گلشن جاوید بال اینک

بجنت زمزمہ پرواز آمد ہم صفیر ما (ص ۲۵)

(۱۲۸۹ھ ۱۲۷۹ فصلی)

غلام علیٰ ساحر کے شاگردوں کی فہرست کے حوالے سے یہ بات پہلے ہی ہمارے علم میں آچکی ہے کہ ذوق اور سحر دونوں ایک ہی استاد کے دامن فیض سے وابستہ تھے۔ اس قطعۂ تاریخ میں ذوق نے جن الفاظ میں مرنے والے کے ساتھ اپنے روابط کا ذکر اور اس کی دائمی جدائی پر رنج و ملال کا اظہار کیا ہے، اس سے یہ قیاس یقین کی حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ یہ وہی احمد حسین ہیں جو ساحر کے شاگرد اور ذوق کے استاد بھائی تھے۔ علوی صاحب کے بقول انھیں نثر نویسی میں کمال حاصل تھا اور کاکوری کے بہت سے لوگ فن انشا پردازی و نثر نویسی میں ان سے تلمذ رکھتے تھے، لیکن اس کتاب میں نہ تو ان کی نثر کا کوئی نمونہ پیش کیا گیا ہے اور نہ کسی تصنیف کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک سحر کے تذکرہ "تذکرۂ مشاہیر کاکوروی" کی اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ سحر کی طرح ان کے استاد بھی ایک بکمال انشا پرداز تھے۔ چنانچہ سحر نے "طور معنی" میں شاعری کے ساتھ نثر نگاری کی بھی تعریف کی ہے۔ اس کے معاً بعد جس انداز سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے ساحر سے بہ گمان غالب فارسی درسیات کی تحصیل اور نثر نویسی کے فن میں استفادہ کیا تھا۔ اس ضمن میں تذکرے کی اصل عبارت یہ ہے:

"در نثر ظہوری وقت خویش بود۔ فقیر از یمن عنایت و تلمذ او حرف آشنا گردیدہ"۔

---

[1] تقویم ہجری و عیسوی کے بموجب ۱۶ر صفر ۱۲۸۹ھ ۲۵ر اپریل ۱۸۷۲ء کے مطابق ہے۔

ساحر کی تاریخ وفات ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (۲۳ مارچ ۱۸۳۵ء) ہے۔[۱] "بہارِ بے خزاں" اس کے تقریباً اکیس برس بعد ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء میں مرتب ہوا ہے۔ گزشتہ سطور میں اس تذکرے سے سحر کے ترجمے کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، ان میں انھوں نے استاد کے تخلص کی مناسبت سے اپنا تخلص بدلنے کا ذکر "اکنون" کے التزام کے ساتھ کیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ تذکرے کی ترتیب کے وقت اس تبدیلی کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ گویا یہ تبدیلی کسی وقتی جذبے کے تحت محض اظہارِ عقیدت و ارادت کے لیے کی گئی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ ساحر سے فن شعر گوئی میں فیضیاب ہوے تھے۔ "ملخص تسلیم" کے اقتباسات اور ذوق کے قطعۂ تاریخ میں ان کے نام کے ساتھ تخلص کی عدم موجودگی بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کے مصنفین بھی اس فن سے سحر کے برائے نام تعلق کی بنا پر اس التزام کو غیر ضروری تصور کرتے تھے۔"

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں سحر کے تذکروں کے جو خطی نسخے محفوظ ہیں، وہ ایک ہی جلد میں مجلد ہیں۔ اس جلد کے شروع اور آخر کے فاضل اوراق کی بعض تحریریں بھی کاکوری اور اہل کاکوری سے اس تذکرے کی تعلق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مثلاً آخری ورق کے صفحہ دوم کی ایک تحریر یہ ہے:

"رقعۂ امیر حسن خاں بسمل اسمی مومن علی خاں مفتوں کہ در کانپور آمدہ ملاقات نہ کردہ بودند۔

آمدید و نہ آمدید امروز باید آمد ورنہ فردا
دستِ من و دامانِ تو اے رخنہ گرِ دل"

بسمل اور مفتوں دونوں کاکوری کے متوطن، ساحر کے شاگرد اور سحر کے استاد بھائی تھے۔

اسی آخری ورق کے اندرونی صفحے پر مختلف شعرا کے متفرق اردو و فارسی اشعار ان کے ناموں کے ساتھ منقول ہیں۔ ان شاعروں میں "سید عبدالباقی برادر زادۂ عبدالحی کاکوروی" بھی شامل ہیں جو "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" کے مطابق حافظ عبدالصمد شہید متخلص بہ یوسفی کاکوروی کے فرزند اور گلبرگہ (دکن) کے صوبہ دار تھے۔ ماہِ صفر ۱۳۱۷ھ (جون ۱۸۹۹ء) میں گلبرگہ ہی میں ان کی وفات ہوئی۔[۲]

شروع کے صفحات میں جن شاعروں کے اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک نام مولوی حامد حسن منصف کا مس گنج کا بھی ملتا ہے۔ یہ بھی کاکوری کے متوطن اور شیخ عبدالواحد (۲ فروری ۱۸۳۵ء تا ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء) کے صاحبزادے تھے۔[۳]

ابتدائی صفحات ہی میں ایک جگہ احمد حسینؒ کے نام کے ساتھ یہ دو شعر منقول ہیں جو بالیقین سحر ہی کے نتائج فکر ہیں ؂

نہیں پروا کسی کا جی نکلے تم تو کچھ خوب آدمی نکلے
باغ میں آے وہ گلے لگ جائے کچھ تو اس دل کی بے کلی نکلے

لکھنؤ سے سحر کے تعلق کی نوعیت واضح نہیں لیکن بعض شعرا کے متعلق ان کے بیانات اس وابستگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ناسخ کا کلام انھوں نے خود انھی کی زبان سے سنا تھا جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء میں ناسخ کی وفات سے قبل لکھنؤ میں موجود تھے لیکن "بہارِ بے خزاں" کی تالیف کے وقت وہاں ان کی موجودگی حتمی طور پر ثابت نہیں۔ اگر آتش کے بارے میں ان کا یہ بیان کہ "بر فقیر نظر لطف و عنایت دارد" مبہم طور پر اس کے امکان کی جانب اشارہ کرتا ہے تو مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی کے متعلق یہ جملے کہ "در شہر لکھنؤ فقیر ملاقی شد۔۔۔۔۔ شعرائے لکھنؤ او را استاد مسلم می دانستند"۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی تحریر کے وقت سحر کسی دوسری جگہ قیام پذیر تھے۔ عبدالخالق خالق (مرد سیاحت پیشہ جہاں دیدہ) اور مہر شاگرد ناسخ (مجہول الاسم اصلاً میرزا حاتم علی) سے ان کی ملاقاتیں آگرے میں ہوئی تھیں۔ خالق کے متعلق لکھتے ہیں کہ "در اکبرآباد فقیر ملاقی گردید۔ از اتفاقِ ملاقات یکدیگر سینہ سے خوش گزشت"۔ مہر کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "از فقیر بہ اکبرآباد ملاقی شد۔ از خواندن اشعار تازۂ خویش برنگ آئینہ سراپا حیرت ساخت"

۱؎ تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۳۱۴۔ ۲؎ تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۲۳۶۔ ۳؎ ایضاً ص۔

: دھان بھون لکھنؤ میں گاندھی جینتی کے موقع پر گاندھی جی کی تصویر پر پھول مالائیں چڑھائی گئیں۔ تصویر میں گورنر اتر پردیش اور وزیر اعلا بھی دکھائی دے رہے ہیں

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۶ء کو مہیلا ودیالیہ لکھنؤ میں للت کلا کے نصاب کا افتتاح کرتے ہوئے۔ اس موقع پر پیش کیے گئے رقص کا ایک منظر

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے ۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو سہارن پور میں امر شہید سردار بھگت سنگھ کے مجسمہ پر پھول مالائیں چڑھائیں۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے تحت سہارن پور کی پیپر مل کے ۱۰۴۶ مزدوروں کی مفت جنتا سانحہ بیمہ پالیسی قبول کر رہے ھیں

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو اموسی ٹیکسٹائل مل کے احاطہ میں پودا لگاتے ہوئے

وزیراعلا شری نرائن دت تیواری ۱۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو قیصر باغ بارہ دری، لکھنؤ میں خاندانی منصوبہ بندی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش کا معائنہ کر رہے ہیں
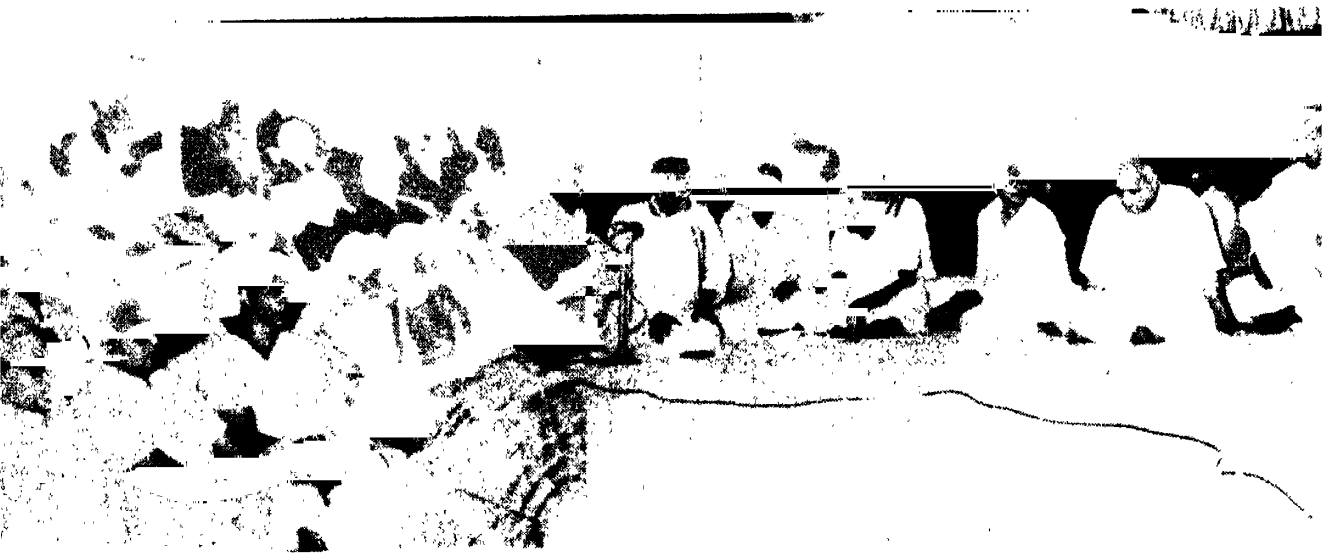
خاندانی منصوبہ بندی مہم کے سلسلہ میں قیصر باغ بارہ دری میں ۲۹ ستمبر ۱۹۷۶ء کو کوی سمیلن اور ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء کو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ تصویریں اسی موقع کی ہیں
(اوپر) ہندی کے ممتاز شاعر شری سوہن لال دویدی اور (نیچے) اردو کے مشہور شاعر جناب نذیر بنارسی اپنا کلام سنا رہے ہیں

▲ وزیراعلا شری نرائن دت تیواری مہانگر لکھنؤ میں
یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء کو رام لیلا دیکھ رہے ہیں

وزیراعلا شری نرائن دت تیواری کی رہائش گاہ پر ۱۵ ستمبر
۱۹۷۶ء کو متعدد مسلم اکابرین، علما اور پروفیسروں نے
روزہ افطار کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے ◄

► سکریٹری مرکزی وزارت اطلاعات
شری ایس۔ ایم۔ ایچ برنی (بائیں سے بائیں) ۹
کو غالب اکاڈمی، نئی دہلی میں حضرت علی
کے موقع پر منعقد کیے گئے ایک جلسہ کی
کرتے ہوئے

ان بیانات سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اکبرآباد سے دور کسی اور مقام پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اکبرآباد کا یہ قیام بہت مختصر تھا۔ یہ قیاس اس امر پر مبنی ہے کہ مہر کے محولۂ بالا، ترجمے میں ان کا نام مذکور نہیں اور چند صفحات کے بعد دوبارہ "مہر تخلص، مرزا حاتم علی بیگ لکھنوی شاگرد ناسخ" کے زیرِ عنوان ان کی ایک غزل کے چھ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ اگر سحر آگرے میں زیادہ دنوں تک مقیم رہے ہوتے اور مہر سے ان کی ملاقات محض سرسری اور رسمی نہ ہوتی تو وہ یقیناً اس طرح دو جگہ ان کا ذکر نہ کرتے۔

لکھنؤ اور آگرے کے علاوہ روہیل کھنڈ کے علاقہ کے بعض شاعروں سے بھی سحر نے اپنے دوستانہ روابط اور ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان شعرا کے تراجم کے وہ حصے جن سے اس ضمن میں اہم اور مفید مطلب معلومات حاصل ہوتی ہے، درج ذیل ہیں:

(الف) انور حسین انوار:۔ "از روسائے قصبۂ سہوان است... کمتر بفکرِ شعری پردازد۔ دحشت بہ طبعش عارض و فراحیش بہ جنون پرستی مائل است...... با راقم السطور اتحاد دلی وارد و ما را ہم بہ مزاج و طبع او نسبتے خاص است۔ چند اشعارش کہ ایں وقت بیاد فقیر (مانده، بر) تحریرش صفحۂ کاغذ را گلستان می کند و اکنوں تسلیم تخلص می کند۔"

(ب) منشی اصغر علی مفتوں:۔ "سررشتہ دار عدالتِ فوجداری ضلع میرٹھ است، بیشتر بہ محکمۂ کمشنری بریلی بہ عہدۂ منشی گری ممتاز بوده۔ از فقیر اتحاد بہ مرتبہ داشت۔"

(ج) مولوی فضل رسول مست:۔ "متوطن قصبہ بدایوں (ایں) خطہ بہ ایں نسبت کہ مولدش واقع شده، بہ خود می بالد و منبع ہزار خیر و برکات است۔ عالم متبحر و طبیب حاذق و شاعرِ بے بدل۔ بیشتر بمقتضائے صحبتِ اہلِ دنیا روزگار پیشہ بود۔ چون نسبت معنوی بہ مراتب حقیقت داشت، سالہا ست کہ بہ تعلقاتِ دنیوی پشت پا زده مردانہ بہ فقر و غنا پرداختہ۔ گدازِ طبعش بہ عشق محبوبِ حقیقی بہ مرتبہ رسانده کہ از سلسلۂ عنانِ ذوقِ طبیعت ہر رگ و پے را جادۂ منازلِ شوق ساختہ بہ کعبۃ اللہ و مدینہ منوره از چشم و سر رفتہ۔ جنابِ والدش کہ بہ سن کہولت آمدہ سراپا عالمِ نور و معرفت، بہ شوقِ آں آوازِ خانہ تا بخانۂ کعبہ رسیده و از آنجا پسر و پدر ہر دو بعد از ادائے مناسکِ حج معاودت ساختند۔ اکنوں بہ مراتبِ اولیائے کامل در بدایوں رسیده سرگرمِ استفاضہ است۔ بہ جنابِ تجلی انوارش رنگ بروئے مہر و ماه شکستہ و از جودتِ طبعش نقابِ حجاب بر رخِ معنی آشنایاں بستہ۔"

(د) دلدار علی مذاق:۔ "از قاضی زاده ہائے بدایوں و عزیزانِ ظہور اللہ خاں نوا است... با فقیر سررشتۂ اتحادش مستحکم است۔ از صحبتِ نا آشنایانِ مذاق شوریده کہ مس دارم، زنده بودم (کذا) اکنوں ہمدمی و سخن طرازی ہائے او از برائے چاره گرئی درد دل کارِ اعجازِ مسیحائی می کند۔"

(ہ) اشرف علی نفیس:۔ "از روسائے عظام بدایوں است آبا و اجدادش بہ عظمت و اقتدار بہ جملہ اقرانِ خویش شرفِ امتیاز داشتہ۔ او خود ہم بہ عہدۂ تحصیلداری و پیشکاری ملازم سرکار کمپنی بوده۔ روزے چند است کہ ترک و تجرید پسندیده..... بہ قیاس ناقص فقیر ہمچو عالی طبع نقادِ معانی درین قرب و جوار پیدا نہ گردیده..."

یہ بیانات بہار بے خزاں۔ اور اس کے مولف کے بارے میں دو اہم اور نتیجہ خیز قیاسات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت سحر بدایوں یا اس کے قرب و جوار میں

لہ مست کے والد کا نام مولانا شاہ عبدالمجید تھا، ۲۹ رمضان، ۱۱۷۷ھ / یکم اپریل ۱۷۶۴ء کو پیدا ہوئے اور سہ شنبہ ۱۷ محرم ۱۲۶۳ھ / ۵ جنوری ۱۸۴۷ء کو وفات پائی۔ (تذکرۂ علمائے اہل سنت ص ۱۳۶)

لہ مولانا عبدالمجید ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۱ء میں سفر حج و زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ (ایضاً ص ۱۳۶)

مقیم تھے۔ اس قیاس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:۔

(الف) متذکرۂ بالا شعرا میں سے منشی انوار حسین تسلیم اور دلدار علی مذاق کے علاوہ باقی تینوں شاعر قطعاً غیر معروف ہیں، اس لیے کسی دور دراز مقام پر ان سے کسی شخص کا واقف ہونا بعید از امکان ہے۔

(ب) ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء سے قبل منشی انوار حسین تسلیم کا سہسوان (ضلع بدایوں) اور مراد آباد کے علاوہ کسی اور جگہ قیام ثابت نہیں[1]۔ ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں انھوں نے مراد آباد سے سہسوان جاتے ہوئے عید کا چاند اثنائے راہ میں دیکھا تھا[2] یعنی ماہ رمضان ۱۲۶۱ھ / ستمبر ۱۸۴۵ء کے اواخر تک وہ مراد آباد میں اور شوال / اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں میں سہسوان میں موجود تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان سے سحر کے تعلقات سہسوان، بدایوں یا مراد آباد میں قیام کے دوران ہی قائم ہوئے ہوں گے۔

(ج) منشی اصغر علی مفتوں کے قیام بریلی اور اس کے معاً بعد ان سے رابطۂ اتحاد کا ذکر صیغۂ ماضی کے تحت کیا گیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تذکرے کی تالیف سے قبل سحر بریلی میں بھی قیام کر چکے تھے[3]۔

(د) مولوی فضل رسول مست، دلدار علی مذاق اور اشرف علی نفیس کے تراجم کا لب و لہجہ اور انداز بیان مجملاً اور بعض جملے صریحاً اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کی تحریر کے وقت بدایوں یا اس کے "قرب و جوار" میں قیام پذیر تھے۔

دوسری اہم بات جو متذکرہ شاعروں سے مولف کے تعلقات کی بنیاد پر ان بیانات اور بعض دوسرے ذرائع معلومات کی روشنی میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ بدایوں یا اس کے اطراف و جوانب میں قیام کے دوران وہ بحیثیت ملازم کسی سرکاری دفتر یا عدالت سے منسلک تھے۔ مفتوں کے ترجمے میں عدالتِ فوجداری ضلع میرٹھ اور اس سے بیشتر محکمۂ کمشنری بریلی سے ان کی وابستگی کا حوالہ اور نفیس کے حال میں "ترک و تجرید" سے قبل پیشکاری اور تحصیلداری کے مناصب پر فائز رہنے کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔ منشی انوار حسین تسلیم تذکرے کی تالیف کے زمانے میں عدالت دیوانی ضلع مراد آباد میں بحیثیت امین ریسر کار تھے[4] اور مولوی فضل رسول مست "روزگار پیشگی" کے دور میں کچھ دنوں تک غالباً بدایوں ہی میں مفتیٔ عدالت اور ساڑھے تین برس تک سہسوان میں سر رشتہ دار رہ چکے تھے[5]۔ اس صورت میں سحر سے ان لوگوں کے دوستانہ مراسم کی استواری میں اہم پیشگی کے دخل اور امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[6]۔ دلدار علی مذاق کے ذکر میں انھوں نے غالباً اپنے گرد و پیش کے اس دفتری اور کاروباری ماحول ہی کو جس سے انھیں بہ حیثیت ملازم دن رات واسطہ پڑتا تھا "صحبتِ نا آشنایاں" سے تعبیر کیا ہے۔

تذکرۂ مشاہیر کاکوری" میں منشی احمد حسین کے جن افراد خاندان اور شاگردوں کا ذکر موجود ہے، ان کے نام اور مختصر حالات یہ ہیں:

(۱) منشی نظیر حسن اوج[7]:۔ یہ منشی صاحب موصوف کے صاحبزادے

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون راقم مشمولہ ماہنامہ "آج کل" دہلی۔ شمارہ نومبر ۱۹۵۸ء [2] ملخص تسلیم ص ۲۲۔

[3] اس زمانے میں سحر کے برادر عم زاد منشی محمد احمد بھی بریلی ہی میں مقیم تھے۔ شوال ۱۲۵۸ھ / نومبر ۱۸۴۲ء میں وہیں ان کے صاحبزادے حکیم حافظ مسعود احمد پیدا ہوئے۔ (تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۲۹۸) [4] مضمون راقم مشمولہ "آج کل" "ملخص تسلیم" ص ۳۲۔

[5] تذکرۂ علمائے اہل سنت ص ۲۰۹۔ [6] مرزا حاتم علی مہر بھی جن کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ اولاً آگرہ میں عدالت دیوانی کے وکیل تھے (سخن شعرا ص ۴۸۷) بعد ازاں آگرہ اور دوسرے مقامات پر بحیثیت منصف مامور رہے (قاموس المشاہیر حصہ دوم ص ۲۴۴)۔

[7] شاہ علی اکبر قلندر کے تلامذہ کی فہرست میں فاضل منصف نے اوج کا نام ذال معجمہ کے ساتھ "یعنی نذیر حسن" لکھا ہے۔ لیکن ہے کہ صحیح نام "نظیر حسن" ہو جس سے ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتا ہے جو ان کا سال ولادت ہے۔

تھے۔ ماہ صفر ۱۲۲۸ھ (نومبر، دسمبر ۱۸۱۵ء) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شاعری میں منشی محمد رضا صبر سے استفادہ کیا۔ بسلسلۂ وکالت ہردوئی میں قیام تھا۔ وہیں بروز جمعہ ۱۳؍ جمادی الآخر ۱۳۱۶ھ (۲۸؍ اکتوبر ۱۸۹۸ء) وفات پائی۔ (ص ۴۵۷ و ۴۵۸)

(۲) منشی محمد رضا صبر: یہ منشی احمد حسین کے برادر حقیقی، منشی محمد حسین کے فرزند تھے۔ فن شاعری میں شیخ عبدالرؤف شعور لکھنوی شاگرد مصحفی سے تلمذ تھا۔ کاکوری اور قرب و نواح میں ان کے متعدد شاگرد تھے۔ بروز دوشنبہ ۹؍ شعبان ۱۲۹۷ھ (۱۹؍ جولائی ۱۸۸۰ء) کو سیتاپور میں انتقال ہوا۔ ایک عاشقانہ اور دو نعتیہ دیوان ان کے یادگار ہیں۔ (ص ۲۴۵، ۲۴۶)

(۳) منشی ولایت احمد: یہ منشی احمد حسین کے عم حقیقی منشی محمد بخش حجاجی کے صاحبزادے تھے۔ ولادت ماہ محرم ۱۲۲۸ھ (جنوری ۱۸۱۳ء) میں ہوئی۔ سیتاپور میں عرصے تک تحصیلداری کے منصب پر فائز رہے۔ وہیں شب عاشورہ ماہ محرم الحرام ۱۳۱۰ھ کو (۴؍ اگست ۱۸۹۲ء) کو بعارضۂ ہیضہ وفات پائی (ص ۴۷۵ و ۴۷۶)

(۴) خان بہادر مفتی عنایت احمد: منشی ولایت احمد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۹؍ شوال ۱۲۲۸ھ (۴؍ نومبر ۱۸۱۳ء) کو قصبہ دیوہ میں پیدا ہوئے تھے۔ جامع علوم معقول و منقول اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ علی گڑھ اور بریلی میں منصف اور صدر امینی کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی ہمدردیاں سرکاری منصب کے تقاضوں کے برخلاف غالباً اپنے ہموطنوں کے ساتھ رہیں۔ جس کی پاداش میں حبس بہ عبور دریائے شور کی سزا بھگتنی پڑی۔ قید سے رہائی کے بعد حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اسی سفر کے دوران ۱۷؍ ماہ شوال ۱۲۷۹ھ (۷؍ اپریل ۱۸۶۳ء) کو جدہ کے قریب جہاز کی غرقابی کے حادثے میں وفات پائی۔ (ص ۲۸۹ و ۲۹۰)

(۵) منشی مقصود احمد نطق: منشی ولایت احمد کے صاحبزادے تھے۔ ولادت کی تاریخ ۸؍ ربیع الاوّل ۱۲۵۹ھ (۸؍ اپریل ۱۸۴۳ء) ہے۔ شاعری میں اپنے ماموں منشی محمد رضا صبر سے استفادہ کیا تھا۔ اردو کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں شعرگوئی ترک کر دی تھی۔ بروز دوشنبہ ۲۵؍ رمضان ۱۳۲۹ھ (۱۸؍ ستمبر ۱۹۱۱ء) کو کاکوری میں وفات پائی۔ (ص ۴۱۰ و ۴۱۱)

(۶) منشی مقبول احمد محو: منشی مقصود احمد نطق کے چھوٹے بھائی تھے۔ ولادت ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ (نومبر ۱۸۴۴ء) میں ہوئی۔ شاعری میں اولاً منشی محمد رضا صبر سے اور اس کے بعد اپنے برادر بزرگ سے اصلاح لی اور مجموعۂ کلام "خمکدۂ خیال" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ تحصیلداری سے پنشن لینے کے بعد سندیلہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۲۷؍ جمادی الآخر ۱۳۲۵ھ (۹؍ اگست ۱۹۰۷ء) کو انتقال ہوا۔ (ص ۴۰۹ و ۴۱۰)

(۷) منشی سلطان احمد سلطان: منشی ولایت احمد کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور اپنے برادر معظم منشی مقصود احمد نطق کے شاگرد تھے۔ صفر ۱۲۶۸ھ (نومبر، دسمبر ۱۸۵۱ء) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور منجھلے بھائی کی طرح یہ بھی تحصیلداری کے عہدے پر فائز تھے۔ ۹؍ رجب ۱۳۱۹ھ (۲۲؍ اکتوبر ۱۹۰۱ء) ریٹائرمنٹ سے قبل کاکوری میں فوت ہوئے۔ (ص ۱۹۴ و ۱۹۵)

(۸) حکیم حافظ مسعود احمد: یہ منشی محمد احمد ابن منشی محمد بخش کے فرزند تھے۔ پنجشنبہ ۶؍ ماہ شوال ۱۲۵۸ھ (۱۰؍ نومبر ۱۸۴۲ء) کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ درویش صفت انسان تھے۔ عرصے تک بسلسلۂ طبابت اناؤ میں قیام رہا۔ آخر عمر میں کاکوری چلے آئے تھے۔ وہیں ۱۲؍ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ (۳۱؍ اگست ۱۹۱۶ء) کو وفات پائی۔ (ص ۳۹۸ و ۳۹۹)

(۹) منشی سجاد حسین: حاجی بغلول اور احمق الذین کے مصنف اور اودھ پنچ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں لافانی شہرت کے مالک ہیں۔ آٹھویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب بھی اس خاندان کے ایک

بزرگ شیخ محمد غوث سے مل جاتا ہے۔ (ص ۱۸۳ و ۱۸۴)

(۱۰) خان بہادر منشی محمد تاج الدین جذب: ان کے دادا شیخ غلام نجف نے بلگرام سے ترک وطن کر کے کاکوری میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جذب ۱۲۷۲ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم منشی احمد حسین سے حاصل کی تھی۔ (ص ۲۷۲ و ۲۷۳)

(۱۱) شاہ علی انور قلندر: صاحب تذکرۂ مشاہیر کے والد اور خانقاہ کاظمیہ کاکوری کے سجادہ نشین تھے۔ آپ نے نثر نویسی کے فن میں منشی احمد حسین سے استفادہ کیا تھا۔ تاریخ ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۶۹ھ (۲۲ جنوری ۱۸۵۳ء) اور تاریخ رحلت ۲۰ محرم ۱۳۲۴ھ (۱۶ مارچ ۱۹۰۶ء) ہے۔ (ص ۲۷۸ - ۲۸۳)

سحر کے قریبی اعزا کی اس فہرست پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا خاندان ایک ذی علم اور ذی حیثیت خاندان تھا۔ ان کے حقیقی چچا زاد بھائی مفتی عنایت احمد متعدد کتابوں کے مصنف، معزز سرکاری عہدیدار اور خان بہادری کے خطاب سے سرفراز تھے۔ جو برطانوی دور حکومت میں کسی ہندستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ مفتی صاحب کے بڑے بھائی منشی ولایت احمد اور ان کے دو بیٹے منشی مقبول احمد محو اور منشی سلطان احمد سلطان بھی تحصیلدار تھے۔ نواح بدایوں میں سرکاری ملازمت سے سحر کی وابستگی کے بارے میں اگر ہمارا قیاس درست ہے تو اس خاندانی روایت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی تحصیلداری یا اسی قبیل کے کسی منصب پر فائز رہے ہوں گے۔

منشی نظیر حسن اوج کے علاوہ سحر کے سلسلۂ اخلاف سے کسی اور شخص کا نام "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" میں مذکور نہیں۔ اس کتاب کے مندرجات سے ان کے زمانۂ ولادت پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ اس بنیاد پر کہ انھوں نے ناسخ متوفی ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء کی زبان سے ان کا کلام سنا تھا اور غلام بینا ساحر متوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء سے اصلاح لی تھی، قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس حساب سے اوج کی پیدائش کے زمانے میں ان کی عمر تقریباً اڑتیس ۳۸ سال اور انتقال کے وقت ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔

"بہار بے خزاں" کے خطی نسخوں کی کیفیت اور ان سے استفادہ کے سلسلے میں اس کے تبصرہ نگاروں نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

(الف) ڈاکٹر نعیم احمد: "اس تذکرے کا صرف ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔ میں نے اسی نسخے کی بنیاد پر متن تیار کیا ہے۔ اسی خطی نسخے کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے" ... سحر نے اس کے علاوہ ایک تذکرہ طور معنی کے نام سے بھی لکھوا تھا طور معنی میں ایران کے فارسی گو شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ بہار بے خزاں اور طور معنی دونوں ایک ہی جلد میں مجلد ہیں — بہار بے خزاں کے مخطوطے کا سائز ½۸" × ½۶" ہے۔ اس میں ۹۴ صفحات ہیں"۔ (مقدمہ ص ا)

(ب) حفیظ عباسی: "اس تذکرے کا ایک خطی نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہے، اور اس کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے۔ لکھنؤ کا نسخہ بوسیدہ ہے لیکن علی گڑھ کا نسخہ بہت صاف، خوش خط اور روشن ہے لیکن اس نسخے میں کاتب نے لاتعداد غلطیاں کی ہیں۔

میں چونکہ ابتدا ہی میں علی گڑھ والے نسخے کو متن بنا چکا تھا، اس لیے اسی طرح رہنے دیا، اور اصل نسخے سے لکھنؤ جا کر مقابلہ کیا۔ اس مطبوعہ نسخے میں اصل نسخے کے صفحات کی جگہ نشان دہی کر دی گئی ہے"۔ (مقدمہ ص ج)

(ج) ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اس تذکرے کا صرف ایک قلمی نسخہ اب تک دستیاب ہوا ہے۔ یہ نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ مولوی عبدالحئی مؤلف گل رعنا کی ملکیت تھا۔ بعد میں ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی ندوی نے اسے کتب خانے کو دے دیا۔ فہرست کتب میں اس کا نمبر ۳۲۸ ہے اور اس کے ساتھ مصنف کا دوسرا تذکرہ

طور معنے بھی مجلد ہے۔ اس نسخے کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی پہنچ گئی ہے۔

بہارِ بے خزاں کے مخطوطے میں ½۴ × ½۸ × ۶ سائز کے ۹۴ صفحات ہیں۔ خط اچھا نہیں ہے۔ بعض جگہ پڑھنے میں خاصی دقت ہوتی ہے: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پورے مخطوطے کا خط ایک ہی ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ مخطوطے کے ایک حاشیے پر کفایت علی کافی[1] کا یہ تاریخی قطعہ درج ہے:۔

جب ہوا یہ تذکرہ تالیف رشکِ گلستاں
یادگارِ شاعرانِ کشورِ ہندوستاں
فکرِ کافی سے ہوئی تاریخ اس کی آشکار
یہ عجب گلزارِ زیبا ہے بہارِ بے خزاں[2]

فرمان صاحب کو اس تذکرے کی تفصیلات اسحٰق صدیقی صاحب کی وساطت سے معلوم ہوئی تھیں لیکن اس کے دونوں مرتبین یعنی ڈاکٹر نعیم احمد اور جناب حفیظ عباسی ندوۃ العلماء کے نسخے کو بچشم خود دیکھنے اور تدوین و تصحیح متن کے سلسلے میں اس سے استفادہ کرنے کے مدعی ہیں۔ راقم السطور کو پہلی بار ۱۹۶۴ء میں اور دوسری مرتبہ مئی ۱۹۷۵ء میں اس مخطوطے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دوسری بار دو دن کی قلیل مدت میں جس میں سے ایک دن اس مخطوطے کی تلاش میں صرف ہوگیا، زیرِ نظر مضمون کی متوقع ضروریات کے مطابق جو یادداشتیں قلم بند کی جاسکیں، ان کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مرتبین نے محققانہ دیانت کے تقاضوں کے برخلاف اپنے ان بیانات میں بے جا مبالغہ آرائی اور غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ خیال درج ذیل دلائل پر مبنی ہے۔

(الف) حفیظ عباسی صاحب کا یہ بیان کہ "لکھنؤ کا نسخہ بوسیدہ ہے" خلافِ واقعہ ہے، اس لیے براہِ راست استفادے کی نفی کرتا ہے۔

(ب) مطبوعہ نسخوں میں ایک جگہ بھی اختلافِ نسخ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے حالانکہ نسخۂ ندوہ اور ان نسخوں کے متن میں بعض بنیادی اختلافات موجود ہیں[3] مثلاً نسخۂ ندوہ میں ردیف الف امین الدین امین کے ذکر پر ختم ہوتی ہے جبکہ ان نسخوں میں اس کے بعد مزید دو شعرا یعنی سید آلِ نبی بلگرامی اور منشی انوار حسین انور کے تراجم شامل ہیں۔ اسی طرح اس نسخے میں میر قمر الدین منت اور عبد اللہ خاں مشتاق کے تراجم کے درمیان میں ایک نامعلوم الاسم شاعر مقصود کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"مقصود تخلص، نامش نامعلوم، یک بیتش بنظر آمد"

ڈاکٹر نعیم احمد کے مرتبہ نسخے میں یہ عبارت موجود نہیں اور تذکرہ شعر منت کے نمونۂ کلام کے ذیل میں منقول ہے۔ عباسی صاحب کے مرتبہ نسخے سے بھی یہ عبارت خارج ہے لیکن انھوں نے غالباً کسی دوسرے تذکرے سے استفادے کی بنیاد پر مقصود کے اس ایک شعر سے قبل ان کا تخلص بطور عنوان درج کردیا ہے جہاں تک راقم السطور کو یاد ہے نسخۂ علی گڑھ میں بھی یہ شعر منت کے کلام میں شامل ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے بعینہٖ اسی کا اتباع کیا ہے۔

---

[1] سید کفایت علی کافی مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں انگریز دشمنی کی پاداش میں شہید ہوئے۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا۔ از امداد صابری) کافی کا یہ قطعہ بھی روہیل کھنڈ سے تحرار ان کے تذکرے کے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔

[2] اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۴۸۳ و ۴۹۳۔

[3] راقم السطور نے اس مخطوطے سے جو یادداشتیں قلم بند کی تھیں وہ بہت مجمل اور محدود ہیں۔ سرسری اندازے کے مطابق اس نسخے میں ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں جنھیں نسخۂ علی گڑھ کے کاتب نے قلم انداز کر دیا ہے اور اسی بنا پر انھیں مطبوعہ نسخوں میں بھی جگہ نہیں مل سکی ہے۔ الحاقی اور غلط انتساب کی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ فاضل مرتبین نے ان کی جانب بھی کوئی توجہ نہیں دی ہے۔

نسخۂ ندوہ سے استفادے کی صورت میں فاضل مرتبین ہرگز اس فرد گذاشت کے مرتکب نہ ہوتے۔

(ج) ندوے کا مخطوطہ منشی انوار حسین تسلیم کے شعر پر ختم ہوتا ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں اس کے بعد کفایت علی کافی کا قطعۂ تاریخ بغیر یہ بتائے ہوئے کہ اصل نسخے میں یہ کس جگہ منقول ہے، نقل کر دیا گیا ہے۔ متن کی یہ روایت نسخۂ علی گڑھ سے مطابقت رکھتی ہے۔

(د) بہارِ بے خزاں کے اس نسخے کے ساتھ صرف طورِ معنی ہی مجلد نہیں، سحر کا ایک اور تذکرہ آئینۂ حیرت بھی منسلک ہے۔ کسی مخطوطے کے متن کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں مدون کو جس طرح اس کی داخلی و خارجی کیفیات پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے اس کے پیشِ نظر نعیم صاحب کی اس تذکرے سے اور عباسی صاحب کی طورِ معنی اور آئینۂ حیرت دونوں سے لاعلمی ان کے دعووں کی ثقاہت کو مجروح کرتی ہے۔

مسلم یونی ورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں قیام علی گڑھ کے دوران راقم السطور کی نظر سے گزر چکا ہے لیکن اس سے متعلق یادداشتیں محفوظ نہیں، اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ فی الواقع نسخۂ ندوہ کی نقل ہے یا نہیں، البتہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نسخۂ عباسی کی طرح ڈاکٹر نعیم احمد کا نسخہ بھی اسی پر مبنی ہے۔ داخلی شواہد اس خیال کی پرزور تائید کرتے ہیں۔

اس تذکرے کے ایک اور قلمی نسخے کا علم تذکرۂ مشاہیر کاکوری سے ہوتا ہے۔ مصنف نے قاضی سعید الدین خاں سعید کے حالات میں ان کا ایک اقتباس نقل کیا ہے (ص ۱۹۱) اور فہرست ماخذ میں بہارِ بے خزاں تذکرۂ شعرا کے نام سے کتب خانۂ تکیہ شریف (خانقاہ کاظمیہ) کاکوری میں اس کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔ (ص ۵) سعید کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "ان کے بہت سے اشعار و قصائد وغیرہ تھے جو دستبردِ زمانہ سے معدوم ہو گئے۔ چند اشعار اردو فارسی جو مجھ کو بہت تلاش سے ملے ہیں، درج ذیل ہیں۔" (ص ۱۹۲) اس کے بعد فارسی کے آٹھ اور اردو کے تین شعر اور ایک رباعی نقل کی ہے۔ بہارِ بے خزاں کے مطبوعہ نسخوں میں یہ رباعی منقول نہیں لیکن اشعار کی تعداد چار ہے اور پہلے دو اشعار کے متن میں کچھ اختلافات بھی موجود ہیں۔ اگر مصنف نے کسی دوسری روایت کی بنیاد پر ان اشعار میں لفظی ترمیم نہیں کی ہے اور چوتھے شعر کو دانستہ نظر انداز نہیں کیا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاکوری کے خطی نسخے کا متن نسخۂ ندوہ سے کسی حد تک مختلف تھا۔ بصورتِ دیگر یہ عین ممکن ہے کہ نسخۂ ندوہ گلِ رعنا کے مصنف کو خانقاہ کاظمیہ ہی سے دستیاب ہوا ہو۔ بعض قرائن جو ابھی مزید غور و خوض کے متقاضی ہیں، اس امکان کی تائید کرتے ہیں۔

کافی اور تسنیم کے قطعات تاریخ کی رو سے بہارِ بے خزاں ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کی تالیف ہے لیکن بعض قرائن اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ سحر نے اس سنہ کے بعد بھی اس میں کچھ اضافے کیے ہیں۔ "فصل در خاتمہ" جو بلا قید حروفِ تہجی عاصی، مذاق، نفیس، اور امان علی سحر کے تراجم پر مشتمل ہے، غالباً زمانۂ مابعد ہی میں بطور ضمیمہ شامل کی گئی ہے۔ نفیس کے ذکر میں ان کے تذکرے کے بارے میں سحر کا یہ بیان اس قیاس کو تقویت بخشتا ہے:

"دریں زمانہ تذکرۂ مبسوط زباں دانانِ اردو بہ تکلفے کرمی باید و بہ لطافتے کہ می شاید بہ وضع تاریخ تالیف کردہ تیلا بخش اصنافِ کلام شعرا بلا قید رطب و یابس در دسبری برداشتہ۔"

نفیس کے اس تذکرے کا نام انتخاب دہر تھا۔ یہ نام بظاہر تاریخی معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو اس کا سالِ تالیف ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس تذکرے کے بارے میں منقولہ صدر معلومات اس کے بعد ہی فراہم کی گئی ہوں گی۔

لہ بحوالہ رسالۂ تذکرات از گارساں دتاسی مترجمہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرتبہ ڈاکٹر ثنویر احمد علوی صفحہ ۳۸

"آئینۂ حیرت" اور "طور معنی" علی الترتیب ۱۲۵۸ھ/ ۴۲-۱۸۴۱ء اور ۱۲۵۹ھ/ ۴۴-۱۸۴۳ء کی تالیف ہیں۔ اول الذکر خواتین کا تذکرہ ہے[1] اس کی ابتدا ایک مختصر مقدمے سے ہوتی ہے جس میں ان کے اسبابِ تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوئی یادداشت محفوظ نہیں لیکن جہاں تک یاد آتا ہے اس میں صرف اردو شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مخطوطے کے آخری ورق کی اندرونی جانب زیریں حاشیے پر منشی انوار حسین تسلیم کا یہ قطعہ تاریخ منقول ہے ؎

چوں تذکرہ سحر بالطاف الٰہی — دیدآئینۂ حالِ وے از خاتمہ صورت
از غیب ندا شد پئے تاریخ تمامش — آئینہ دلہاست چہ آئینہ حیرت

۱۲۵۸ھ

یہ قطعہ بہ گمانِ غالب کاتبِ تذکرہ ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہے لیکن اصل متن کی کتابت کے بعد کسی وقت اضافہ کیا گیا ہے۔

"طور معنی" ڈاکٹر نعیم احمد کے بیان کے برخلاف عام فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس کا مقدمہ "آئینۂ حیرت" کے مقدمے کی بہ نسبت کسی قدر مفصل ہے۔ اسبابِ تالیف اور تذکرے کی کیفیت کے سلسلے میں مولف کے بیانات کی تلخیص یہ ہے :۔

"مولف این تذکرہ از ابتدائے سنِ شعور از صحبت شعرا مستفیض گردیدہ و کلام ہر یک از شعرائے سابقین و حال بقدرِ فہم خویش انتخاب زدہ ۔۔۔ اکثر کتبِ تذکرہ و بیاض اشعارِ اساتذہ کہ دیدہ از قصہ طول (طویل؟) و خارج از اصل مطلب ۔۔۔۔۔۔ از ہر یک (از) سخن سنجان محض بہ لطافت اشعار گو یک بیت ہم باشد اکتفا کردہ اشعار شاب درین تذکرہ کہ موسوم بہ طور معنی ہست بکمال ایجاز و اختصار داخل ساختہ ۔۔۔۔ فصلے در باب خاتمۂ کتاب رقم زدۂ کلک معنی نگار است کہ کیفیت شاعری شعرائے متاخرین بقید تخلص کہ بلا رعایت حروف تہجی است بے تکلف سرمۂ سائے دیدۂ اہلِ بصیرت شود و این آشفتہ مزاج پریشاں روزگار احمد حسین متخلص بسحر ۔۔۔۔۔۔ غرض از تالیف تذکرہ فارسی استفادہ از تلاش و فکرِ عالی اساتذۂ فارسی کہ موجد و مخترع این فنِ شریف اند دارد۔"

"فصل در خاتمۂ کتاب مشتمل بر تذکرۂ شعرائے متاخرین" میں مؤلف نے جن شعرا کے حالات و اشعار نقل کیے ہیں ان میں سے مرزا مظہر جانجاناں، میر تقی میر، مصحفی، مرزا قتیل، قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں ثاقب کاکوروی، نواب ظہور اللہ خاں نوا بدایونی، قاضی محمد صادق خاں اختر اور غلام مینا ساحر کاکوروی کے نام راقم کی یادداشتوں میں محفوظ ہیں — ان شاعروں کی موجودگی میں "طور معنی" کو "ایران کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ" کہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ آخری دور کے ان ہی شاعروں میں سے ایک شاعر سعید الدین عزیزی عظیم آبادی مقیم لکھنؤ کا ترجمہ اس لحاظ سے اہم اور توجہ طلب ہے کہ اس سے سحر کے ایک معاشقے کا علم ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران عزیزی سے سحر کے دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے اور انھوں نے سحر کے حسبِ فرمائش ان کے "محبوب دلنواز" کا سراپا نظم کیا تھا۔ چنانچہ ان کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ :

"با فقیر سررشتۂ اتحادش مستحکم است۔ باقامت لکھنؤ، از ملاقاتِ یک دیگر خوش گہ است (کذا: خوش گزشت) حسبِ فرمائش فقیر سراپائے محبوب دل نواز کہ و مسانۂ من بود گفتہ دادِ سخنوری دادہ۔"

نمونۂ کلام میں اس سراپا کے جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں آخری دو شعر یہ ہیں ؎

لقب احمد حسین آنکہ چوں مجنوں — بہ لیلائے دلش گردید مفتوں
راشد باعثِ این نظمِ دل سوز — کہ گفتم من سراپائے غم اندوز

---

[1] مجلد ندوہ میں یہ تذکرہ ترتیبِ زمانی کے برخلاف "طور معنی" کے بعد شامل ہے۔

اس تذکرے کے آخری شاعر غلام مینا ساحر کاکوروی ہیں جن کا انتخاب کلام آخری ورق کے صفحۂ اول کی ابتدائی سطور میں ختم ہوتا ہے۔ اسی صفحہ کے وسط میں بائیں جانب حاشیے پر منشی انوار حسین تسلیم کا یہ قطعہ تاریخ تحریر ہے ؎

شدہ ہر شعر تذکرہ دلکش
کہ ہوا دست زطرہ تو راست
گفتمش فی البدیہہ تا یخش
طور معنی جو مطلع نور است
۱۲۵۹ھ

"آشنیۂ حیرت" کے قطعہ تاریخ کی طرح یہ قطعہ بھی اصل متن کی کتابت کے بعد اضافہ کیا گیا ہے۔ مخطوطے میں اس قطعے کے چوتھے مصرعے کے نیچے ۱۲۵۹ھ لکھا ہوا ہے لیکن بہ صورت موجودہ اس سے ۱۲۶۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس فرق کو "نور است" کے املا سے "الف" حذف کرکے جو قواعد کی رو سے بھی زائد اور غیر ضروری ہے دور کیا جا سکتا ہے۔

سحر اور ان کے تذکروں کے بارے میں یہ معلومات ابھی مزید تصدیق و تحقیق اور تفصیل و توضیح کی طالب ہے۔ کاکوری کے اہل علم اس طرف توجہ فرمائیں تو زیر بحث مسائل کے بعض پہلو کچھ اور روشن ہو سکتے ہیں۔

★

"ایک شاندار ورثے سے زیادہ فائدہ مند اور باعثِ فخر کوئی اور چیز نہیں ہے۔ لیکن فقط اس ورثے پر ہی زندہ رہنے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے زیادہ خطرناک بھی کوئی اور بات نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم صرف اپنے آباو اجداد کی نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتی ہے تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔"

——— جواہر لال نہرو

علی شبر حسینی کرھانی

کنبہ بندی کی کرامت

کنبہ بندی ہزار نعمت ہے
گھر میں چاروں طرف مسرت ہے
ہے میسر تمام آسائش
نہ تو کلفت ہے اور نہ حسرت ہے

ایک بیوی ہے اور دو بچے
یہی چھوٹی سی اپنی جنت ہے

اس گرانی کے دور میں سچ ہے
فوج بچوں کی ایک لعنت ہے

پیٹ بھرنا تو ان کا ایک طرف
پیار کرنا بھی ایک زحمت ہے

مل گئی راہ کنبہ بندی کی
یہ بھی ہم سب پہ اس کی رحمت ہے

دونوں بچے ہمارے دو گوہر
موتیوں سے زیادہ قیمت ہے

دولت علم سے ہیں مالا مال
علم والوں میں ان کی عزت ہے

ہند کے با سلیقہ شہری ہیں
سب کی نظروں میں ان کی وقعت ہے

کنبہ بندی کرائیے اپنی
زندہ رہنے کی گر ضرورت ہے

کوئی تکلیف کا سوال نہیں
پھر جھجک کیوں یہ کیسی وحشت ہے

جس کو زحمت سمجھ رہے ہیں آپ
میری نظروں میں عین راحت ہے

فکر سے دور ہو کے دیکھیں آپ
زندگی کتنی خوبصورت ہے

اب حسینی ہے فکر سے آزاد
کنبہ بندی کی یہ کرامت ہے

ماڈرنٹی

عابد سہیل

(افسانہ)

رام کلی نے بیجو کو سامنے کھڑے دیکھا تو ایک بار تو وہ اسے پہچان بھی نہ سکی۔ سفید دُھلے کھدّر کا کرتا، پاجامہ، پیروں میں گہرے نیلے رنگ کی پلاسٹک کی چپل اور سیدھے ہاتھ میں آستین کے اوپر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی جس کا فریم گھس گھس کر اپنی چمک کھو چکا تھا اور کونوں پر اندر اور اس جگہ جہاں چابی بھرنے کی گھنڈی لگی ہوتی ہے کچھ پیلا اور کالا میلا سا رنگ جھانک رہا تھا۔ رام کلی نے اسے پھر اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ گالوں میں ہلکے ہلکے گڈھے ضرور پڑ گئے تھے لیکن اب وہ پورا مرد ہو چکا تھا اور چہرہ تنا تنا سا لگ رہا تھا۔

"ارے تو بیجو ہی ہے نا؟" اس نے پوچھا

بیجو مسکرایا "بیجو نہیں تو کون ہوں، تو ہی بتا؟"

اس کی آواز ہونٹوں سے نکلنے کے بجائے اب جیسے گلے سے نکل رہی تھی۔ بکی گہری، بھاری اور پھٹی پھٹی آواز لیکن بات کرنے میں جب اس کے گلے کی نسیں اس طرح ابھرتی اور ڈوبتیں جس طرح تین سال ادھر ابھرتی ڈوبتی تھیں جب وہ لالہ بیج ناتھ کے ڈھوروں کو باغ کے پچھواڑے سے ان کی حویلی کی طرف ہنکا کر غائب ہو گیا تھا تو اسے ذرا بھی شبہ نہیں رہا تو وہ بالکل بے اختیار ہو گئی اور "ہائے یہ تو بیجو بھیّا ہی ہیں" کہہ کر اس سے لپٹ گئی اور بیجو نے "میری اچھی بہنیا" کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے اس خوشی کے موقع پر بھی ذرا سا سر ہلا کر اس کی کلائی پر اس طرح لگا دیا کہ اس کے کان ٹھیک گھڑی پر ٹک گئے۔

"ہائے بیجو یہ تو چل رہی ہے"

وہ بیجو کے تین برس بعد واپس آنے کی خوشی بھی ذرا دیر کے لیے بھول گئی اور یہ سوچ کر ہنسنے لگی، خوش ہونے لگی کہ گھڑی چل رہی ہے، "ٹک ٹک" کر رہی ہے۔

رامو کاکا، جھجّو، نرکی دادا اور دو تین گاؤں کے بچوں پر جب اس کی نظر پڑی تو وہ جیسے ایک دم چونک پڑی اور گھر کے اندر بھاگی۔

"مائی، او مائی، ارے بیجو آیا ہے۔ بیجو بھیا آئے ہیں۔"

اور قبل اس کے کہ بیجو کی ماں رام دئی جو اندر دالان میں چولھے میں برسات کی سیلی لکڑیاں لکڑی کی پھکنی سے پھونک پھونک کر آگ سلگانے کی کوشش کر رہی تھی میلی دھوتی کے پلو سے آنسو اور میل بھری آنکھیں پونچھتے باہر نکلے وہ دوڑ کر دوبارہ باہر آ گئی اور بیجو کا ہاتھ پکڑ کے ہوا میں جھلانے لگی۔ اس وقت بھی اس کی نظریں اس ہلتے ہوئے ہاتھ میں بندھی اس کی گھڑی پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خاندان میں بیجو پہلا مرد تھا جس نے کلائی میں گھڑی باندھی تھی۔

توار پور کے اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں زمینداری ختم ہونے کے برسوں بعد بیج ناتھ کی زمینداری قائم رہی تھی کوئی سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا اور سچ پوچھیے تو کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا تو پھر ہمت کرنے کا کیا سوال، ڈھائی تین سو کی آبادی کے اس گاؤں میں مشکل سے بیس بائیس کسان ایسے تھے جن کے پاس اپنی زمینیں تھیں اور یہ زمینیں بھی چند بسوؤں سے لے کر زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی بیگھے تک تھیں۔

ان میں وہ کیا بوتے، کیا پیدا کرتے۔ کیا کماتے اور کیا سر اٹھا کر چلتے۔ باقی لوگوں میں کچھ ہریجن تھے، کچھ موچی، کچھ لوہار، تین خاندانوں نے دو دو چار چار بھینسیں پال لی تھیں جن کا دودھ بالٹیوں میں بھر کر اور اُن بالٹیوں کو سائیکل کے ہینڈل کے دونوں طرف لٹکا کر وہ پاس کے شہر میں روزانہ فروخت کر آتے۔

اس گاؤں کے سارے ہی لوگ کسی نہ کسی طرح لالہ بیج ناتھ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ شادی غمی، مقدمہ، غرض کون سی مشکل تھی جس میں وہ کام نہ آتے اور اس کے بدلے وہ ان کی زمینوں پر کام کرتے اور انھیں کھانے کے لیے موٹا جھوٹا اناج مل جاتا۔ ان کے لڑکے اس کے یہاں بیگار کرتے، ڈھوروں کو چراتے، جھاڑ دیتے، آم کے باغوں اور پھلواریوں کی رکھوالی کرتے اور لڑکیاں حویلی کے مردانے حقہ بھر کے لے جاتیں، جوتے پر پالش کرنے جاتیں، پیر اور سر دبانے جاتیں۔

اس گاؤں کی زندگی ایک ایسے تالاب کی مانند تھی جس میں پانی ایک مخصوص سطح سے نہ کبھی نیچے جاتا نہ کبھی کناروں سے چھلکتا۔ نہ اس میں کبھی بڑی لہریں اٹھتیں نہ کبھی لہروں کا کوئی بڑا دائرہ ہی بنتا۔ کوئی چھوٹی موٹی کنکری پھینک بھی دیتا تو دو چار دائرے بن جاتے۔ ہفتہ دس دن چوپالوں، کچے مکان کے چھجوں، اور کھیت کی مینڈوں پر اس کے بارے میں باتیں ہوتیں اور پھر دھیرے دھیرے سب کچھ معمول کے مطابق ہو جاتا۔

پانچ سال قبل اس خاموشی اور سناٹے کو سدری نے اس وقت توڑا جب وہ چیخ مار کر حویلی کے مردانے سے بھاگی اور باہر صدر دروازہ پر آکر اس نے لالہ پر گالیوں کی بوچھار کی، اس کے زندوں مردوں کو وہ سنائیں کہ حویلی میں کام کرنے والے لالہ کے ملازم اس کی بے وقوفی پر افسوس کرنے لگے۔ پھر لالہ دھیرے دھیرے نپے تلے قدم اٹھاتے باہر آئے تو مارے ڈر کے سدری بھی خاموش ہو گئی اور ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔

لالہ بیج ناتھ نے سدری کے ماں باپ کو بلایا، ان سے دس پندرہ منٹ اکیلے میں بات کی اور جب وہ باہر نکلے تو لوگوں نے ان دونوں کو ہاتھ جوڑ کر لالہ سے کہتے سنا "تمہارا موت ہمیں کا چھنتا۔ جو کہیو لالہ ہمیں منجور ہے"

دس بارہ دن بعد سدری کی لالہ کے یہاں ڈھوروں کو سانی لگانے والے بھکا سے شادی کر دی گئی اور جب سفید لٹھے کا پاجامہ، شہر میں سلی قمیض، لال موزوں پر بادامی رنگ کا چمکدار جوتا اور پیلے رنگ کا صافہ باندھ کر بھکا منڈپ میں آیا اور سکڑی سمٹی سدری کو اندر سے لایا گیا تو گاؤں والوں نے اس نئے جوڑے سے زیادہ لالہ کو دعائیں دیں۔ پھیروں کے بعد لالہ نے سدری کو دس روپے جیتے اور کھانے کپڑے پر زندگی بھر کے لیے نوکر رکھنے کا اعلان کیا تو گاؤں والوں نے دعاؤں کے اتنے ٹوکرے لالہ کی نذر کیے کہ وہ ان کا بوجھ بھی اٹھا نہ پائے اور احسان سے بھکا کی کمر بھی دہری ہو گئی۔

یہ اور اس طرح کی چند کنکریاں گاؤں کے سکون کے تالاب میں ضرور پھینکی گئی تھیں لیکن، لیکن لالہ نے تو لہروں کو باندھ رکھا تھا، تالاب کی کگاروں کو اتنا اونچا کر رکھا تھا کہ ان کے باہر پانی کے چھلکنے کا امکان ہی نہ تھا۔

لیکن بیچو نے اس سکون پر ایسا زوردار پتھر پھینکا کہ تالاب کی لہریں کگاریں توڑ کر باہر نکلیں اور پانی کی بوندیں گاؤں کی زبان پر اس طرح پڑیں کہ مہینوں اس واقعہ کا ذکر ہوتا رہا۔

بخار کی وجہ سے جب بیچو کا باپ جگن ناتھ دو دن لالہ کے یہاں کام پر نہ گیا تو لالہ نے کھلیان کے پاس اپنے دو نوکروں سے اس کی اتنی پٹائی کرا دی کہ اس نے خون تھوک دیا۔ جگن ناتھ کی بیوی رام دئی اور بیٹی رام کلی نے گڑگڑا کر لالہ سے جگن ناتھ کی غلطی معاف کر دینے کی بنتی کی لیکن لالہ کا دل نہ پسیجا اور پٹائی کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک دونوں ملازم مارتے مارتے بے دم نہ ہو گئے۔ اس سارے دوران بیچو اکڑوں بیٹھا خاموشی سے اپنے باپ کو پٹتے دیکھتا رہا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

اگلے روز شام کو جب لالہ کے ڈھور واپس آئے اور بیچو کے علاوہ ایک بھینس بھی واپس نہ آئی تو اس خاموشی کا راز کھلا۔ تین گاؤں ادھر ڈیڑھ سو روپوں میں بھینس بیچ کر بیچو ایسا غائب ہوا کہ اس کا کوئی پتہ نہ

چل سکا۔ کچھ دنوں بعد لالہ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ بھینس کس کو بیچی گئی ہے لیکن جب وہ اسے واپس کرنے پر تیار نہ ہوا تو انھوں نے زور زبردستی کرنے میں مصلحت نہ سمجھی اور خاموش ہو گئے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر بھڑ کے چھتے کو انھوں نے زیادہ چھوا اور بھڑوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ کاٹ بھی سکتی ہیں تو شہد کی ایک بوند بھی ان کے حلق تک نہ پہنچ پائے گی۔

ایک صبح جب بھینسوں کو سانی نہ ملی اور انھوں نے ڈکارنا شروع کیا تو لالہ کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ایک ایک نوکر کو انھوں نے نام لے لے کر آواز دی لیکن وہاں کوئی ہوتا تو سنتا۔ بیچو کا باپ جگن ناتھ ایک کونے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

"سب کہاں مر گئے ہیں" لالہ گرجے

"حجور، حجور ــــ" جگن ناتھ کوشش کرنے کے باوجود اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا حجور حجور کر رہا ہے، جا میکو کو بلا کے لا۔"

میکو گھر پر نہیں ملا۔ معلوم ہوا رات ہی سے کہیں چلا گیا ہے پھر دوسرے نوکر کے یہاں جگن ناتھ کو بھیجا، پھر تیسرے کے یہاں۔ ہر جگہ سے ایک ہی طرح کا جواب ملا۔ کوئی بیمار تھا، کسی کا لڑکا بیمار تھا، کوئی گھر پر تھا ہی نہیں اور بدھ رام کے لڑکے بھگا نے تو صاف صاف کہلا بھیجا کہ اب حکومت نے سارے قرضے معاف کر دیے ہیں لالہ سے کہہ دو کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں، نہیں آئیں گے نہیں آئیں گے۔ جو کرنا ہو کر لیں۔

لالہ سناٹے میں آ گئے۔ حالات بدل گئے تھے کسی پر زور زبردستی سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن یہ پچاس گھروں کے برابر حویلی، درجنوں گائے بھینسیں پچاسوں بیگھے زمین جو اب بھی ان کے اور ان کے خاندان والوں کے نام تھی بھلا کون دیکھے گا، یہ سارا کاروبار کیسے چلے گا۔

وہ آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔

چار دن بعد گاؤں پر پولیس کی دوڑ آئی اور رام پال اور اگنو کو ایک ڈکیتی کے سلسلہ میں پکڑ کر لے گئی۔ تیسرے دن لالہ نے ان دونوں کی ضمانت کر لی اور ان دونوں کے علاوہ ان کے گھروں کے سارے لوگ پھر لالہ کے یہاں کام کرنے لگے۔

بیچو کو یہ سب کچھ اپنی ماں رام دئی کے خط سے معلوم ہو چکا تھا جو اس نے رتنی چاچا سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ اس خط میں رام دئی نے یہ بھی لکھوایا تھا کہ لالہ کہہ رہے تھے کہ اگر تمہارے بیٹا جی نے کام چھوڑا تو بھینس کی چوری کی رپٹ لکھوا کر انھیں بھی پھنسوا دیں گے۔ اس لیے ابھی دھیرج رکھو۔ وہیں کام کرتے رہو اور گاؤں کا رخ بھی نہ کرو۔ لیکن بیچو کا دل اب گاؤں لوٹنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسے رام دئی کا خط بھی نہ روک سکا۔ ویسے کانپور کیپر امل میں نوکری کر کے اب وہ پولیس چوکی جان گیا تھا۔ قانون بھی کچھ کچھ اس کے خیال میں اسے معلوم تھا۔ اخباروں میں چھپنے والی موٹی موٹی خبریں بھی یونین کے کام کرنے والے سارے مزدوروں کے ساتھ اس تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی ہمت بڑھ چکی تھی۔

لکھنؤ آ کر اس نے بڑے تھانیدار صاحب سے ملاقات کی اور ان کے کہنے پر گاؤں کی ساری کہانی منشی جی کو لکھوا کر اس پر دستخط کر دیے۔ الف کے نام لٹھ بیچو کو کانپور میں حاضری رجسٹر اور ٹھپے پر انگوٹھا لگانا جب برا لگا تو اس نے اپنا نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔

تھوڑی دیر میں اس کے گھر کے باہر سکھیا، مہا دئی، بھگوان دین، رام پال گجریا، بھگو اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔

رام دئی نے کہا "بیچو بھور اندھیرے میں واپس چلے جانا نہیں تو پولیس ڈکیتی میں پکڑ لے جائے گی۔"

"میں نے سب انتجام کر لیا ہے"، بیچو نے اطمینان سے کہا اور اپنی جیب سے ناخن پالش، بالوں میں لگانے کے کانٹے اور گھٹیا سی کریم کی شیشی نکال کر اپنی بہن رام کلی کو دے دی اور بھگا کی طرف دیکھ کر بولا

"بھگا چاچا اب پولیس کی دوڑ یہاں نہیں آئے گی، نہیں آئے گی۔ ہم کوئی چور اچکے تو ہیں نہیں۔ زمین کے مالک ہیں مالک۔ اور اب تو گورمنٹ نے بھی ہم کو مالک مان لیا ہے۔

★

دلبر عثمانی

دورِ نو

نظر آنے لگے بھارت میں بربادی کے جب ساماں
پریشاں حال جب دیکھا گیا بھارت کا ہر انساں
رتی پبلک کے مخالف پورا کرنے کو تھے جب ارماں
مسز گاندھی نے سوچا یوں بچالوں گی میں ہندوستاں
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

مقرر ہوگئی بازار میں ہر شے کی پھر قیمت
دکاں والا زیادہ پیسے مانگے یہ نہ تھی ہمت
چھپالے وہ کسی شے کو نہ اس میں یہ رہی جرأت
ہر اک شے جب ملی سستی غریبوں کو تھی یہ دولت
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

ایمرجنسی نے کالے دھن کی سب دولت نکلوائی
جو انکم ٹیکس کی باقی رقم تھی وہ بھی دلوائی
ملیں اب بے زمینوں کو زمینیں جو تھیں صحرائی
ہوے بھارت مخالف بند پھران کی نہ بن آئی
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

ہر اک دفتر میں نظم وضبط کا عالم نظر آیا
سزا اس نے کبھی پائی دیر سے افسر کبھی گر آیا
ٹرین اس نے نہ پائی جو نہ اس کے وقت پر آیا
جو اصلی چال تھی بھارت کی اس پر ہر بشر آیا
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

دکھو ایک ایک شعبہ میں ترقی ہے نمایاں اب
دیے الفت کے ہر گھر میں ہوئے ہیں یوں فروزاں اب
دوالی سے بھی بڑھ کر ہوگیا ہے یاں چراغاں اب
ہیں سب تائید میں اس کی نہ ہے کوئی پریشاں اب
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

شاہد جمیل

ناتواں شاخ پہ اب برق کا ڈیرا نہ رہا

(وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے نام)

اے نئے ہند کی معمار نکونامِ وطن — اے نئے عزم کی پہچان قدم گنگ وجمن
اے کہ تو عظمتِ اظہارِ حقیقت کی کرن — اے کہ تو باعثِ تجدیدِ تمنا کی لگن
فکرِ نہرو کو شناسائے نظر تو نے کیا
سپنا باپو کا تھا ساکار مگر تو نے کیا

یوں ہوا تھا کہ ہر اک راستہ معدوم سا تھا — پھول سا چہرہ معصوم بھی مظلوم سا تھا
حوصلہ ٹوٹتے لمحات سے موسوم سا تھا — جب کہ ہر شخص نئی صبح سے محروم سا تھا
ایسے میں تو نے ہر اک آنکھ کو کرنیں بخشیں
بے صدا لفظ تھے آواز دی رحیں بخشیں

ہر ہتھیلی پہ تھا بے زار لکیروں کا جمود — بڑھنے والے کو زیادہ تھا ٹھہرنا مقصود
صفحۂ فرض سے غائب تھا توجہ کا وجود — خود پرستی ہی ہر اک سمت بنی تھی معبود
یہ گھٹن ختم ہوئی، لائی صبا بوے سحر
وقت پر آئی جو ایمرجنسی ضرورت بن کر

بڑھ گئی اور بھی تنویرِ منوے آزادی — تیرے اقدام نے کچھ ایسی تجلی بخشی
فرد کو اپنے نئے فرض کی پہچان ہوئی — بس گئی آنکھوں میں تصویر سنہرے کل کی
انگلیاں ہاتھوں کی پاؤں کی بڑھیں اور آگے
تیرے اقدام نے ان کو نئے چہرے بخشے

دھاندلی ختم ہوئی، ظلم کا پھیرا نہ رہا — ناتواں شاخ پہ اب برق کا ڈیرا نہ رہا
بے بسی کا کہیں اب سایہ گھنیرا نہ رہا — اب کسی ذہن پہ الجھن کا بسیرا نہ رہا
جل گئی شمع نئے زاویے روشن سے ہوے
اف تری حکمتِ عملی! کہ نئے باب کھلے

آنے والا جو نیا کل ہے وہ روشن ہوگا — پھول سے چہروں پہ آشاؤں کا جوبن ہوگا
بے سہارا نہ کوئی اور نہ نردھن ہوگا — ایک ایک گھر میں مہکتا ہوا آنگن ہوگا

تو نے سمجھا دیا، کیسے یہ مگر کرنا ہے
آؤ شاہد! کہ ہمیں مل کے سفر کرنا ہے

ساحل احمد

اردو شاعری میں

بچپن سے وفات تک ایسے ہزاروں واقعات ہیں جو جواہر لال نہرو کی بُردباری، دانشوری، دور بینی، انسان دوستی، اور حق پرستی کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی عزم و ایثار کا پرتو بن گئی تھی۔ سیاسیات میں ایک بار قدم رکھنے کے بعد ان کی حب الوطنی، قوم پرستی اور حریت پسندی نے پھر انھیں پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔ اس سلسلے میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں اور سختیاں کو جھیلنا پڑا جنھیں انھوں نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کیا۔ وہ ایک عظیم سیاست داں ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ مفکر و ادیب بھی تھے۔ ان کے کارنامے زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں سے منسلک و منضبط ہیں:

گنگا کا وہ امیں، وہ ہمالہ کا پاسباں
قدموں میں جس کے اترا زمانے دور کی برات

سید حرمت الاکرام

ابھرتے حوصلوں کو اعتبار زندگی دے کر
زمیں پر آسمانوں کی بلندی کو جھکایا تھا

خورشید احمد جامی

در در پر اس نے دستک دی، انگریز کو بڑھ کر للکارا
یا ریل میں اس کی بیٹھک تھی یا جیل میں اس کا بستر تھا

وقار ابناوی

عمل کی پیہم صداؤں سے قوم کو جگایا
ادھورے خوابوں کی تکمیل کے لیے سب کو بنایا

نصر قریشی

نہرو اپنی پُرجوش قیادت کی بنا پر پہلی بار ۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز کی آمد پہ ہڑتال کرانے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد وہ تقریباً دسیوں بار گرفتار ہوئے اور مجموعی طور پر ۹ سال جیل میں رہے۔ وہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان کے پہلے وزیر اعظم منتخب کئے گئے اور ۴۷ء سے لے کر ۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء تک مسلسل اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر انھوں نے بڑے بڑے مسئلوں کو حل کیا۔ امن و آشتی کے ایک پیامبر کی حیثیت سے انھوں نے عالمی شہرت و عزت حاصل کی:

یہ نکہت آگہی تھا لوگو   نجات کی روشنی تھا لوگو
یہ پھول تھا زندگی کی خوشبو   یہ پھول خود زندگی تھا لوگو

ساغر نظامی

فیض سے اس کے شرق و غرب ملے
ہیں شمال و جنوب شیر و شکر

عرش ملسیانی

واماندگانِ شب کو پیامِ سحر دیا
وابستگانِ صبح کو ذوقِ نظر دیا
ناموسِ امن کے لیے خونِ جگر دیا
دامانِ زیست لعل و جواہر سے بھر دیا
ہندوستان میں پیار کی دولت بکھیر دی
سارے جہاں میں پیار کی دولت بکھیر دی

اختر حسن

عظیم انسان دوست نہرو
عظیم فنکار، مصلحِ عالم
عظیم دانشورِ زمانہ
وہ عالمی دوستی کا سنگِ بنیاد
وہ صلح اور امن و آشتی کا حسین پیکر

نصر قریشی

نہرو کی زندگی متعدد مرحلوں میں منقسم رہی ہے۔ کبھی انھوں نے جیل کی سختیاں برداشت کیں۔ کبھی اپنے پرمغز اور حریت افروز تقریروں اور مضامین کے ذریعے بیداری کا درس دیا۔

تلاش ہند (ڈسکوری آف انڈیا) ان کی تاریخ بینی اور تاریخی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے رمز و ایما کے ذریعے ہندستانی تہذیب و اقدار کی نقشہ کشی کی ہے۔ جس میں بصیرت اور صداقت کے پہلو ممیز ہو گئے ہیں۔ ان کی بڑائی ان کی علمی ذکاوت ذہانت اور انسانیت دوستی میں مستور ہے۔ انھوں نے وطن پرستی کے ضمن میں مقامی سرحدوں کو بھی توڑ دیا تھا۔ ان کی فطرت نوازی نے قدیم و جدید کے تقاضوں کو مرکزیت دی تھی۔ ڈسکوری آف انڈیا میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جذبات اور افکار اور ذوق و شوق کی ملی جلی طاقت نے جس کا مجھے ہلکا سا احساس تھا میرے تصورات کو عمل کے میدان میں ہمیز کیا اور پھر عمل کی قوت نے میرے اندر غور و فکر اور عہد حاضر کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی۔ اگر کبھی میں محسوس بھی کرتا ہوں کہ میں تو کسی عہد گزشتہ سے وابستہ ہوں تب بھی میرا احساس یہ ہوتا کہ گویا دورِ حاضر کے اندر بھی وہ عہد گزشتہ میری ملکیت ہے۔"

ان کا نصب العین اور نظریۂ حیات اعلا قدروں کا امین تھا۔ انھوں نے اپنی ترقی پسند فطرت کا مظاہرہ بھی کیا اور قدامت پرستوں کی نظر میں معتوب بھی رہے مگر اپنے اندر اپنی متعینہ راہوں سے ڈگمگانے کا احساس انھوں نے کبھی پیدا نہیں ہونے دیا۔ وہ اتحاد کے ایک بڑے داعی کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اور اپنی بصیرت کی روشنی میں قدامتی جہالت اور سیاہ بختیوں کا سینہ چاک کیا۔ تہذیب و تمدن کا یہی تصور وہ نقطۂ اشتراک تھا جس نے انھیں عوام میں محبوب بنا دیا تھا۔ مشعلِ گاندھی کو انھوں نے زندہ و تابندہ رکھا اور ہندِ جدید کی ایک نیو رکھی جو عالمی امن کے لیے ایک نمونہ بن گئی۔ فیڈریشن آف انڈین چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز نئی دہلی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۳ مارچ ۱۹۶۰ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"مجھے کسی مذہب یا کسی نظریے کے کٹرپن میں اعتقاد نہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ، خواہ اسے کوئی مذہب کے نام سے پکارتا ہے یا نہیں، روحانیت انسانی سرشت میں موجود ہے۔ میں انسانی وقار میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہر فرد کو مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔"

اردو شعراء نے ان کی اسی انسانی سرشت کو جو روحانیت سے متعین ہوئی تھی، اپنی نظموں میں نظم کیا ہے:

وہ اہلِ دل، وہ اہلِ نظر جس کی روح میں
سمٹی ہوئی تھی ذرّے کے مانند کائنات

سید حرمت الاکرام

وہ تیرے ذہن کی جودت وہ "عالمی افکار"
بلند کر دیا کردارِ انجمن تو نے،

فضا ابن فیضی

پھول برسائے تھے انگاروں پر چل کر جس نے
جس کی آواز پہ ہر ملک نے لبیک کہا
جس کو پیغامبرِ امن داماں مان لیا

افسر بسوانی

بھائی چارے کا امیں، انسانیت کا پاسباں

دوستی کا دیوتا، پیغمبر امن و اماں
نازشِ ہندوستاں، فخرِ زمین و آسماں

شوق لکھنوی

نہرو کا دل روحانیت کا مسکن اور ذہن نئی سیاسی اور سیمابی تعبیروں کا خزینہ تھا۔ اپنے دردمند دل، دور بینی اور روشن ضمیری کے سبب وہ عالمی حالات کے نشیب و فراز کو اسی انداز میں دیکھتے اور سوچتے تھے جیسا کہ ملکی حالات کے ضمن میں ان کا طرہ اور انداز رہا ہے۔ انھوں نے نو آبادیاتی نظام کی مذمت کی اور بین الاقوامی معاملات میں گہری دلچسپی لی۔ وہ اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد کو دوسرے غریب اور ترقی پذیر ملکوں کی آزادی سے علاحدہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان کی آزادی ایشیائی اور افریقی ممالک کی آزادی کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۴۶ء کو اخباری نمائندوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"ایک ہندستانی نوجوان کا بازو ایک ایسا طاقتور اور مضبوط بازو ہونا چاہیے جو نہ صرف ہندستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکے۔ بلکہ ایشیائی آزادی کے لیے بھی جنگ کرنے کے لیے تیار ہو۔"

قوم پرستی اور آزادی کا یہ تصور نہرو کے آفاقی ذہنیت کا پرتو ہے۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور مضامین اور مراسلوں کے ذریعے اسی آفاقی فکر کی تبلیغ کی ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ

"قومیت کو ایک دائرے میں محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ ساری دنیا کی فلاح و بہبود اور عالمی امن پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے۔"

وہ ظلمتوں کی اداسیوں میں حیاتِ نو کا تبسم
وہ کوہ و صحرا کی خامشی میں چمن کی تہذیب کا ترنم

ساغر نظامی

تھی شخصیت تری پھولوں کی پنکھڑی کا طلسم
حیات و حسن کا ایک پیکرِ جمیل ہے تو

فضا ابن فیضی

یہ واقعہ ہے کہ ایشیا کے ملکوں میں
نہ جانے کتنوں نے ایک تجھ سے زندگی پائی

نازش پرتاپگڈھی

ہر دل کو ارتقا کا جو زینہ بنا دیا
ہر موجِ ابتلا کو سفینہ بنا دیا

تاج قریشی

ہر ایک بے کس و بے زر تری پناہ میں ہے
دلوں کے زخم کا مرہم تری نگاہ میں ہے

سکندر علی وجد

گلاب بن کر مہک رہا ہے ... حسین یادوں کا آئینہ ہے

نصر قریشی

نہرو کی زندگی اپنے اندر ایک وسیع دنیا لیے ہوئے ہے۔ ان سب کا احاطہ کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ البتہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بات آجائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی، ایک پارسا کی زندگی تھی، اور ایک سچے قوم پرست کی زندگی تھی۔

ان کی شخصیت میں روشنی اور خوشبو ضم ہو گئی تھی۔ ملک کی مٹی سے، پھول اور سبزے سے، پہاڑوں اور دریاؤں سے غرض ان کی ہر شے سے عشق تھا۔ گلاب کا پھول ان کی محبت، نیک روی اور نرم گفتاری کا ثبوت ہے۔ گلاب ایک علامت تھا دوستی کا اخلاص کا لیکن وہی گلاب ان کی دائمی خاموشی کے بعد شاعر کے نقطۂ نظر سے

پھول مت دو، مجھے ہونٹوں سے لگانے کے لیے
خار کی طرح مرے دل میں کھٹکتا ہے گلاب

حکیم یوسف حسین خاں

ان کی وفات عالمی اقدار کی وفات تھی۔ ان کی موت روشنی کی موت تھی، ان کی یہ دائمی جدائی انسانیت کے دیوتا کی جدائی تھی، ان کی موت نے نہ صرف ہندستان کو بلکہ اقوامِ عالم کو افسردہ و غمگین بنا دیا تھا۔ اردو شعرا نے ان کی رفاقت سے محرومی پر جو درد انگیز مرثی

لکھے ہیں وہ شخصی مرثیہ کی اعلیٰ مثالیں ہیں:

سردار جعفری نے ان لفظوں میں ان کی شخصیت اور ان کے کردار کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے:

مرے وطن کی زمیں کے اداس آنچل میں
نہ آج رنگ نہ خوشبو بھری ہوئی ہے دھول
خبر نہیں ہے کہ کس دل جلے کی راکھ ہے یہ
کہ سر جھکائے پہاڑوں نے بھی کیا ہے قبول
سنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے
وہ فصل گل کا پیمبر تھا عہد نو کا رسول

"راکھ" نہرو کی محبت اور وارفتگی کی انسیت کا مظہر ہے۔ وطن کی مٹی سے والہانہ محبت کا نور ہے۔ ان کی وصیت تھی کہ

مری اس راکھ کو سنگم کے پانی میں بہا دینا
کہ اس پانی سے میں بچپن سے الفت کرتا آیا ہوں
مری وابستگی اس سے ابھی تک یونہی قائم ہے
مجھے گنگا پیاری ہے کہ اس کے بہتے پانی میں
مجھے اس دیس کی تہذیب کی تصویر ملتی ہے

مری یہ آرزو ہے جب میں مر جاؤں تو ہم وطنو
چتا کے آتشیں شعلوں میں تم مجھ کو جلا دینا
مرا یہ جسم فانی راکھ کا جب ڈھیر ہو جائے
تو خاکستر اڑا دینا وطن کی ان فضاؤں میں
چھڑک دینا اسے کھیتوں میں تاکہ یہ وہیں جائے
وطن کی پاک مٹی کا جدا ہونے نہ پھر پائے

یوسف ناظم

سلام مچھلی شہری نہرو کی شخصیت کی روشنی ان کی تصنیفات میں ڈھونڈتے ہیں۔

پھر آج ان کے "پرانے خطوط" دیکھتا ہوں
پھر آج ڈھونڈ رہا ہوں میں ان کی تقریریں
تلاش ہند کے اوراق پھر الٹتا ہوں
خیال تھا کہ ابھی اس کو سجدہ کر لوں گا
یہ روشنی تو بہرحال میرے گھر کی ہے
تساہلی نے مجھے ہائے کر دیا برباد
کوئی بتاؤ مری روشنی کہاں گم ہے؟
تلاش ہند کے اوراق پھر الٹتا ہوں
وہ روشنی تو یہیں تھی ابھی یہیں ہوگی

فضائے نیض گمشدہ وادی میں ان کھوئی یادوں کو یوں آواز دیتے ہیں:

وہ شیروانی میں اٹکا ہوا "گلاب کا پھول"
ترے مذاق شگفتہ کی اک علامت تھا
وہی خلوص، وہی سادگی، وہی ہمدردی
ہر اک سے ربط وفا تیرا جزو فطرت تھا
جو زندگی و حقیقت کا ایک سنگم ہے
تو اس "ثقافت و تہذیب" کی امانت تھا
تری "سماجی بصیرت" تھی "سوشلزم" کی دین
"عوامی قدروں" کا سرمایہ تیری دولت تھا
ترے بغیر ادھورا رہے گا "قومی مشن"
تو میرے دور کی سب سے بڑی ضرورت تھا

ذیل کے اقتباسات شعراء کے وہ احساسات ہیں جن میں نہرو کی محبت اور عقیدت مستور ہے:

پھول رنجیدہ، صبا غمگین، چمن افسردہ ہے
آج تاباں انجمن کی انجمن افسردہ ہے

غلام ربانی تاباں

ہزار رنگ ملے اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار کشت بہار
ہوا ہے وادی جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ کشمکش جہت کا اسیر

نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

مخدوم تقی الدین

رات نے ڈس لیا، گل ہو گئے آنسوؤں کے دیے
نیند کم کم سہی، ہر حال میں آجاتی ہے
رام لیلا کا یہ میدان، ہزاروں انساں
پھر وہی چاند سا چہرہ، وہی کندن سی جبیں
پھر وہی دیس کی باتیں، وہی پردیس کا ذکر

بیر ہاشم

نسیم صبح چلتی ہے تو ہوتا ہے گماں جیسے
کئی ناکام رہ دیں دور صحرا میں سسکتی ہیں
مغنی چاک دامن سر بہ زانو ہے
کہ تنہا فرد کا تو حسن مانگے ہے لہو دل کا

بشر نواز

*

بھارت ماں! تیرے گلشن کا
آج یہ کون سا پھول لٹا ہے
سرخ گلابی پھول لٹا ہے
لگتا ہے اب پیار کی خوشبو
کبھی نہ دھرتی پر پھیلے گی

کنول پرشاد کنول

کاروان بہار ماتم کر
جو امیر بہار تھا نہ رہا

نریش کمار شاد

سچ تو یہ ہے کہ اگر نہرو کے ان مراثی کو یکجا کیا جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہندوستان کی نہ صرف ایک تاریخ مرتب ہو سکتی ہے بلکہ نہرو کی عظمت اور بڑائی کے وہ راز منکشف ہو سکتے ہیں جنھوں نے نہرو کو بین اقوامی شخصیت اور اپنے دور کا ایک معتبر اور عظیم معمار اور آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار بنا دیا۔

★

جے۔ ایچ۔ سنہا دھقبر

غزل

عشق کا جوہر جو اس کے دل میں پنہاں کر دیا
خاک کے پتلے کو اس خالق نے انساں کر دیا

یار کی صورت کو میرے دل میں پنہاں کر دیا
عمر بھر کے واسطے ممنون احساں کر دیا

ڈال کر ساقی نے سوئے جام اک نگہِ فسوں
مئے کے ہر قطرہ میں پیدا جوش طوفاں کر دیا

دیکھئے کس کس کو دل کس کس سے الفت کیجئے
مجھ کو اہلِ حسن کی کثرت نے حیراں کر دیا

ہے مری آنکھوں میں وہ اک محشرِ حسرت نہاں
جس پہ نظریں ڈال دیں اس کو پریشاں کر دیا

آپ کا دیوانہ اس دنیا میں رہتا کس طرح
موت نے آ کر بڑی مشکل کو آساں کر دیا

سخت جانی دیکھئے اپنے مریضِ عشق کی
درد کی شدت نے خود سامانِ درماں کر دیا

آپ کیوں کرتے ہیں رہبر راہ مجنوں اختیار
کس لیے عزمِ طوافِ کوہ ویراں کر دیا

سرور جمالی

طنز و مزاح

ہوم سویٹ ہوم

ہمارے گھر کے نام نہاد ڈرائنگ روم میں "ہوم سوئٹ ہوم" کا خوب صورت فریم اس وقت سے آویزاں ہے جبکہ ہم اس کے مفہوم کو سمجھنے سے بالکل کورے تھے لیکن یہ فریم اس وقت بھی مجھے اتنا ہی پیارا لگتا تھا جتنا کہ آج۔ اس وقت ہم فریم کی خوبصورتی پر جان دیتے تھے اور آج عبارت کی خوب صورتی پر۔

اب تو اس کا فریم اتنا پرانا ہو گیا ہے جتنا کہ ہمارا گھر اور اس کے شیشے پر اتنی گرد جم چکی ہے جتنی کہ ہمارے گھر کی ہر ایک شے پر۔ لیکن اگر سچ پوچھیے تو ہمارے گھر کی خوب صورتی اور شان کو بڑھانے میں اس فریم کا بڑا ہاتھ ہے۔ کیونکہ جس گھر میں گھر کے پیارے ہونے کا تحریری ثبوت موجود ہو اس کی خوب صورتی اور جنت مکان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ہم نے اس فریم کو اتنی بار دیکھا ہے کہ اس کی عبارت شیشے سے اتر کر ہمارے دل پر نقش ہو چکی ہے۔ اور اس کا مطلب نقش کالحجر سے بھی بڑھ کر ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس گھر کے علاوہ کہیں اور اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ دوسری جگہوں پر اور سب کچھ تو مل جاتا ہے لیکن وہ فریم اور اس کی عبارت نہیں ملتی۔ بعض لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ گھر کو سجا بنا کر تو رکھتے ہیں لیکن اس کی گواہی دینے والی کوئی ایسی عبارت نہیں لگاتے۔ ایسے احمق بھی بہت پائے جاتے ہیں جو گھر کو پیارا بنانے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں لیکن کاہلی کا یہ عالم ہے کہ محض یہ فریم نہ لگا کر اس کی وقعت کم کر دیتے ہیں۔

اس طرح ہمیں اپنے پیارے "سائن بورڈ زدہ" گھر سے اتنا پیار ہو گیا ہے کہ اس کے علاوہ کہیں اور رہنے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس پیارے گھر میں ایک اکیلی میں ہی تو نہیں رہتی۔ اس میں تقریباً ۱¾ درجن تو ہمارے چھوٹے بڑے بھائی بہن ہیں۔ بھائیوں کی بیویاں اور بہنوں کے شوہر نامدار۔ اور پھر خدا نظر بد سے بچائے ہر ایک کے چیختے چلاتے روتے بلبلاتے پانچ پانچ چھ چھ بچے۔ اس پیارے گھر میں صرف انسانوں سے پیار نہیں کیا جاتا ہے بلکہ جانور بھی اتنے ہی پیارے ہیں۔ اسی لیے گھر میں مرغیاں ہیں، بطخیں ہیں، بکریاں اور کتے بلیاں ہیں۔ کسی کو شوق ہوا تو اس نے کبوتر پال لیے، کسی نے مچھلیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ کوئی طوطا پالنے کا شوقین ہے، تو کوئی مینا۔ کمال تو یہ ہے کہ اس گھر میں جانور نہ صرف پالے جاتے ہیں بلکہ ان سے مکمل طور پر مساوات اور بھائی چارہ برتا جاتا ہے۔

اگر بچوں کو صوفہ سیٹوں، مسہریوں اور کرسیوں پر کودنے پھاندنے اور چھلانگیں لگانے کی پوری آزادی ہے تو ان جانوروں کو بھی ہر جگہ اٹھنے بیٹھنے کی پوری آزادی ہے۔ اگر منے میاں کی مرغی کو بڑے بھیا کے بستر کے گھونسلے

میں بیٹھ کر انڈے دینے کی عادت ہے تو وہ بخوشی وہاں بیٹھ کر نہ صرف انڈے دے سکتی ہے بلکہ باقاعدہ سے کر بچے تک نکال سکتی ہے۔ بکریاں بڑے شوق سے صوفوں پر (جو اب صوفہ کم بیڈ سے زیادہ صوفہ کم جھولا لگتے ہیں) بیٹھ کر جگالی کر سکتی ہیں۔ بطخیں کسی بھی آ گئے پر گردنیں لمبی کر کے قیں قیں کرتی حملہ آور ہو سکتی ہیں، کتے کسی کو بھی کاٹ کھانے کو دوڑ سکتے ہیں۔ اور طوطے مہمانوں کو میٹھی میٹھی گالیوں سے خوش آمدید کہہ سکتے ہیں۔

اب آپ انصاف کیجیے کہ جس گھر کی کل آبادی خیر سے اتنی ہو کہ جس میں محلے کی آدھی سے زیادہ آبادی سما جائے تو اس کے مکینوں کا جی بھلا کہیں اور کیا لگے گا۔ یہ نہیں کہ اس گھر کے صرف کمرے، برآمدے اور آنگن وغیرہ ہی کسی نہ کسی جاندار کے دم سے آباد ہیں بلکہ اس گھر کا کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ تک بھرا پڑا ہے۔ یعنی یہ کہ کسی کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہے تو کسی گوشے میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا نقشہ دکھائی دے رہا ہے، کہیں ردی کاغذ پڑے ہوئے ہیں تو کہیں اخبار کے صفحات پھڑپھڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ کہنا یہ ہے کہ گھر کے کونے کونے سے پیار و محبت کی بو آتی ہے۔ ایسی کہ اگر کہیں جاؤ تو "ہوم سِک" کا شکار ہو جاؤ۔

ہمارے گھر کا ایک گوشہ یا حصہ وہ بھی ہے جہاں ہمارے بھائی صاحب مع بیوی بچوں کے آباد ہیں۔ بھابھی جہیز میں جہاں دنیا بھر کی چیزیں لائیں وہاں "ہوم سویٹ ہوم" کا فریم لانا نہ بھولیں۔ چونکہ ان کا فریم نیا ہے اس لیے اس کی قدریں بھی نئی ہیں۔ ہماری طرح انھیں بھی یہ گھر بڑا پیارا ہے۔ اتنا پیارا کہ اس کو چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتیں کیونکہ پیارا گھر تو رحمتوں کا مسکن ہوتا ہے۔ وہ مسکن جہاں مولا کی رحمت بصورت نزاع رات دن برستی رہتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ان کا گھر "خانہ جنگی" کا بہترین نمونہ ہے۔ صبح ہوئی نہیں کہ ادھر سے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ بچے اپنے اسکولوں کے لیے، مرد دفتروں کے لیے، نوجوان کالج دیونی ورسٹی کے لیے اور گھر کی عورتیں اپنے دن بھر کی گپ شپ کے مسالوں کو اکٹھا کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوا کرتی ہیں۔ عموماً یہ سلسلہ کھانا کھانے وقت نمک کی کمی، دمیشی کے سلسلے میں، یا روٹی کے جل جانے یا چاول کے کچے یا گیلے رہ جانے کی تقریب میں، یا بات آگے بڑھی تو قمیض یا پینٹ کے بٹن غائب ہونے پر یا جوتے کی پالش کی عدم موجودگی پر شروع ہوتا ہے اور کسی برتن کے توڑنے کپڑے کے پھاڑنے یا منے میاں کی پٹائی کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے کے تماشے پر ختم ہوتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انھیں اپنے گھر سے پیار ہے۔ اور ہر وقت ان کی زبان پر اپنے گھر کے قصیدے رہتے ہیں۔ ان کو تو جھٹلایا جا سکتا ہے، لیکن اس فریم کو آپ کیسے جھوٹا بنا سکتے ہیں جو بڑے اہتمام سے ان کے گھر پہ ٹنگا ہے۔

تو یہ ہے میرا پیارا گھر، جس کے بغیر ہم ایک پل بھی کہیں نہیں رہ سکتے اور رہیں بھی تو کیسے ہمارا پیارا گھر جو ٹھہرا۔

★

اتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

وزیر اعلیٰ کا سیاحت کی مربوط ترقی پر زور ••• خاندانی منصوبہ بندی کے لیے راغب کرنے کے کام میں پردہ کوئی رکاوٹ نہیں ••• ضلع فرخ آباد میں اقلیتی فرقہ کے افراد بڑی تعداد میں نس بندی کے لیے آ رہے ہیں ••• اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کوئی بات نہیں ہے ••• رائے بریلی میں خاندانی منصوبہ بندی اپنانے میں عورتیں مردوں سے آگے ••• شاہجہاں پور میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ریلی ••• ضلع مظفر نگر میں خاندانی منصوبہ بندی کے مقررہ نشانے سے ۲۵ زیادہ کام ••• اتر پردیش میں صنعتوں کے لیے سازگار ماحول

اتر پردیش کے اعلا اختیاری سیاحتی بورڈ نے اپنے افتتاحی جلسہ میں فیصلہ کیا کہ وہ ریاست میں سیاحت کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کمیشن کی منظور کردہ ۱۰۵ لاکھ روپیہ کی رقم کے علاوہ پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں زیادہ سے زیادہ ممکن وسائل بروئے کار لائے گا۔ ریاست میں سیاحت کی ترقی کے لیے ہریانہ سیاحتی کارپوریشن کے مشاورتی شعبہ کی خدمات حاصل کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

اہم شاہراہوں پر واقع محکمۂ تعمیراتِ عامہ، محکمۂ جنگلات اور محکمۂ آب پاشی کے بنگلوں کو محکمۂ سیاحت کو منتقل کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا تاکہ سیاحوں کو سڑک کے کنارے دورانِ سفر سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ یہ بنگلے دہلی۔نینی تال، دہلی۔منسوری، دہلی۔نروراالہ دہلی۔آگرہ شاہراہوں پر واقع ہیں۔ بورڈ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ محکمۂ صحت کے سیاحوں کے لیے مخصوص بنگلے اتر پردیش ریاستی سیاحت ترقی کارپوریشن کو منتقل کر دیے جانا چاہئیں۔ اس کے علاوہ جلسہ میں کچھ دیگر اقدامات کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے روزمرہ کے مسائل پر غور کرنے اور فوری فیصلے کرنے کے لیے بورڈ کی ایک مجلس عاملہ کی تشکیل کا اعلان کیا۔

وزیر اعلا نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ اتر پردیش میں سیاحتی، مذہبی اور تاریخی اہمیت کے بکثرت مقامات موجود ہیں، کہا کہ کم سے کم ممکن مدت میں جدید اور سائنسی خطوط پر سیاحت کی صنعت کی ترقی کے لیے مربوط کوششیں کی جانا چاہئیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ریاست میں سیاحوں کی آمد میں اضافہ کرنے کے لیے دستیاب سہولتوں کا بہترین استعمال کیا جانا چاہیے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ اگرچہ غیر ملکی سیاحوں کو مائل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانا چاہیے تاہم ہمیں ملکی سیاحوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے قیام و طعام کے سلسلہ میں تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جانا چاہئیں۔

⁘ ⁘ ⁘

سید مسلم خاندان کے قدیم روایتی ماحول میں پروردہ ۵۰ سالہ بیگم نور فاطمہ، جو ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں کی واحد خاتون پردھان ہیں، خاندانی منصوبہ بندی کو کوئی ممنوع چیز تصور

نہیں کرتی ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے گاؤں کی عورتوں کے درمیان خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی ایک پرجوش محرک ہیں۔ یہ گاؤں جس کا نام تیوارا ہے، ضلع کے مورنا بلاک میں واقع ہے۔

اپنے گاؤں کے ہر گھر میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام پہنچانے کے لیے جو امر محرک ہوا وہ ان کے گاؤں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش ہے۔ انھوں نے یہ انکشاف ایک انٹرویو میں کرتے ہوئے کیا۔ "کہ تقریباً ۲۵ سال پہلے میری شادی کے وقت میرے گاؤں کی آبادی ۲۵۰۰ تھی جو اب بڑھ کر تقریباً ۶۰۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔"

آبادی میں اضافہ کی اس شرح سے خائف معمر خاتون نے سختی کے ساتھ پردہ کے اپنے خاندانی رواج کی پابندی کرتے ہوئے جرأت سے کام لے کر عورتوں کے درمیان جا کر انھیں ایک چھوٹے خاندان کے فوائد کا قائل کیا اور اسے اپنانے کے لیے انھیں ترغیب دی۔

اپنی کوششوں کے نتائج کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے برقع پوش سن رسیدہ خاتون نے انٹرویو لینے والے کو بتایا کہ "عورتیں کچھ کوشش کے بعد یہ بات سمجھ لیتی ہیں کہ اپنے خاندان کو محدود رکھ کر وہ اپنے بچوں کے لیے بہتر کھانا، کپڑا اور تعلیم کا بندوبست کر سکتی ہیں اور خاندانی جائداد کو بہت زیادہ حصوں میں بٹنے سے بچا سکتی ہیں۔ نس بندی آپریشن کے بارے میں ایک بار اپنے غلط اندیشہ دور کرنے کے بعد وہ میری ہم نوا بن جاتی ہیں اور اپنے شوہروں کو نس بندی کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ انھوں نے آخر میں کہا "اب تک گاؤں کے غریب طبقوں کے تقریباً ایک درجن افراد نس بندی کرا چکے ہیں۔"

٭ ٭ ٭

ضلع فرخ آباد میں اقلیتی فرقہ کے افراد چھوٹے خاندان کے اصول اپنانے کے سلسلہ میں دیگر فرقوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سماج دشمن اور رجعت پسند عناصر کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے باوجود وہ اتنی بڑی تعداد میں خاندانی منصوبہ بندی اختیار کر رہے ہیں کہ یہ تعداد نس بندی کے ان کے مقررہ کوٹہ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

راشٹریہ ایکتا پریشد کے زیر اہتمام ۱۸ر جولائی سے منعقدہ چھ غیر سرکاری خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں میں ۲۲۰۰ افراد نے نس بندی آپریشن کرائے۔ یہ کیمپ بھیرا مئو، کمال گنج، تال گرام، گرسہائے گنج، سورکھ اور قنوج میں منعقد کیے گئے تھے جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ اقلیتی فرقہ کے افراد کے لیے ۱۴ فی صد کا کوٹہ مقرر کیا گیا تھا جب کہ یہ کوٹہ ۱۷ فیصد سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔

اس موقع پر ان چھ شہروں میں متعدد سمپوزیم بھی منعقد کیے گئے جن میں مسلم مذہبی رہنماؤں کے اقوال اور رائیں نیز خاندانی منصوبہ بندی کے کتابچوں سے اقتباسات مقامی مسلم لیڈروں نے پڑھ کر سنائے تاکہ مفاد پرست عناصر نے اقلیتی فرقہ میں جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کا ازالہ کیا جا سکے۔

ان غیر سرکاری خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں کے مہتمم سید انور جمیل ایڈووکیٹ نے ایک خط میں ریاستی حکومت کو مطلع کیا ہے کہ ماہ رواں کے آخر تک ضلع کے دیگر شہروں میں مزید خاندانی منصوبہ بندی کیمپ شروع کیے جائیں گے۔

٭ ٭ ٭

"میں عالم دین نہیں ہوں لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاندانی منصوبہ بندی ہماری مستقبل کی خوش حالی کے لیے اشد ضروری ہے۔"

وطن دوستی کے یہ خیالات اور یہ مخلصانہ احساسات مشہور مسلم لیڈر شری نفیس الحسن، سابق اسپیکر، یو۔ پی ودھان سبھا، سابق ممبر پارلیمنٹ، سابق چیرمین، پبلک سروس کمیشن، سابق وائس چانسلر، کانپور یونیورسٹی اور موجودہ منیجر، اسلامیہ کالج اٹاوہ کے ہیں۔ شری حسن وکالت بھی کرتے ہیں۔

شری نفیس الحسن کے بیان کا مکمل متن حسب ذیل ہے:۔

"آبادی میں زبردست اضافہ کے مسئلہ کا احساس ساری دنیا میں کیا جا رہا ہے اور بیشتر ملکوں نے آبادی میں روک تھام کی واحد تدبیر کے طور پر خاندانی منصوبہ بندی کو اپنایا ہے۔ خود ہمارے ملک میں یہ مسئلہ انتہائی سنگین ہے اور ہماری غذائی پیداوار میں خاصے اضافہ کے باوجود نہیں بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے کروڑوں روپیہ کی مالیت کا غلہ درآمد کرنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کسی ملک کی طاقت کا انحصار اس کی آبادی اور فوج کی کثرت پر تھا لیکن آج اس کا انحصار تعدادی قوت پر نہیں ہے بلکہ پیچیدہ اسلحہ جات اور ان کے استعمال سے واقف تربیت یافتہ افراد پر ہے۔

"تمام والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو اچھا کھانا اور اچھی تعلیم ملے اور وہ خوش حال رہیں۔ یہ سب باتیں ایک چھوٹے خاندان میں ہی ممکن ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں غریب طبقوں میں زیادہ بچے ملتے ہیں جن میں مسلمان شامل ہیں جو بلاشبہ سماج کے دیگر طبقوں کے مقابلہ میں معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور رہیں۔ ان کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے اس وقت تک سدھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے جب تک وہ بھی کینہ بندی کی افادیت کو نہ سمجھیں اور اپنے خاندانوں کو منصوبہ بند نہ بنائیں۔

"میں عالم دین نہیں ہوں لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ میں ایک مسلمان اور ایک ہندستانی یعنی دونوں حیثیتوں سے یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے مستقبل کی خوش حالی کے لیے خاندانی منصوبہ بندی اشد ضروری ہے۔"

❊ ❊ ❊

ضلع رائے بریلی کی بہادر اور ترقی پسند خواتین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی منصوبہ بند کینہ کی اپیل پر لبیک کہنے میں مردوں سے پیچھے نہیں رہیں گی۔ چنانچہ ضلع کے دور دراز علاقوں میں منعقدہ خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔

اس ضلع میں جسے گزشتہ سال نس بندی کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۱۲۸ فی صد کامیابی حاصل کرنے پر انعام دیا گیا تھا۔ ۲۸ ستمبر تک ۸۸۲۹ نس بندی آپریشن کیے جا چکے تھے اور وہ اس طرح ایک بار پھر مرکز کے مقرر کردہ نشانہ سے تجاوز کر گیا ہے۔

لکھنؤ سے تقریباً ۵۴ کلومیٹر دور بچھراواں میں وزیر غذا رسد و تعمیرات عامہ شری بلدیو سنگھ آریہ نے خاندانی منصوبہ بندی کے ایک روزہ کیمپ کا افتتاح کیا جہاں تقریباً ۵۰ خواتین، جن میں سے بعض کی گود میں پانچ چھ سال تک کی عمر کے بچے تھے، مانع حمل آپریشن کرانے کے لیے آئیں جبکہ صرف پانچ مردوں نے خود کو نس بندی کے لیے پیش کیا۔

اس کیمپ میں ۲۸ ستمبر تک ۳۷۵ افراد کی نس بندی کی گئی جن میں ۳۱۲ خواتین شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر دیہی علاقوں کی تھیں۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شری آریہ نے خاندانی منصوبہ بندی مہم سے وابستہ کارکنوں سے کہا کہ وہ دیہی علاقوں میں ہر ایک ہل جوڑے تک "چھوٹے کنبہ" کے پیغام کو پہنچائیں۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ برسوں کی ترقی کے فوائد اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب ہر شخص آبادی میں ہونے والے اضافہ کو روکنے کے لیے خلوص کے ساتھ کوشش کرے۔

❊ ❊ ❊

ضلع شاہجہاں پور میں چھوٹے خاندان کے فوائد کی نشر و اشاعت کرنے کے لیے مختلف قصبوں اور شہروں میں بڑی ریلیوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں جلال آباد میں دس ہزار افراد کی ایک ریلی منعقد کی گئی جس میں بڑی تعداد میں نوجوان کارکنوں، زرعی مزدوروں، شہریوں اور سماجی کارکنوں نے حصہ لیا۔

خداگنج میں بھی ایک بڑے جلوس اور ریلی کا اہتمام کیا۔

گیا۔ جلوس میں ہاتھی، گھوڑے، ٹریکٹر اور جھانکیاں وغیرہ شامل تھیں۔ اسی طرح کے جلوسوں اور ریلیوں کا اہتمام ضلع کے دیگر حصوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

⁂

ضلع مظفر نگر کے لیے گزشتہ اگست کے واسطے خاندانی منصوبہ بندی کا جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا وہاں اس کے مقابلہ میں ۲۵۰ فی صد زیادہ کام ہوا ہے۔

ضلع میں گزشتہ ۳۱ اگست تک ۴۸۹۳۳ افراد نس بندی کرا چکے تھے جب کہ ۲۱۱۵ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح اس ضلع میں اپریل سے اگست تک مجموعی طور پر ۲۲۷۲ نس بندی آپریشن کیے گئے۔

اتر پردیش کے وزیر صحت شری پربھو نرائن سنگھ نے ایک جلسہ میں عوام اور خاندانی منصوبہ بندی کے کام سے وابستہ سرکاری اور غیر سرکاری افراد کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا "میں اس ضلع میں ان تمام افراد کو ذاتی طور پر مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں جنھوں نے اپنی مربوط کوششوں اور مجموعی کارگزاری سے یہ شاندار نتیجہ برآمد کیا ہے۔"

وزیر موصوف نے چار ڈاکٹروں کو نس بندی آپریشنوں کے سلسلہ میں ان کی نمایاں کارگزاری پر ۵۰۰ روپیہ فی کس کی شرح سے نقد انعام دینے کا اعلان کیا۔ ان ڈاکٹروں میں لیڈی ڈاکٹر (مسز) کے شرما، سرجن ڈاکٹر ایس سی گپتا، ڈاکٹر بی۔ این شرما اور ڈاکٹر بی۔ پی سنگھ شامل ہیں۔

⁂

چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی نے کہا کہ ریاست میں ہر طرح کی صنعتوں کے قیام کے لیے سازگار ماحول موجود ہے۔ اس وقت بجلی، کوئلہ اور خام مال کافی مقدار میں دستیاب ہے اور متعدد ریاستی کارپوریشن ریاست کے کسی بھی حصہ میں صنعتیں قائم کرنے کے خواہش مند صنعت کاروں کو مالی اور دیگر امداد مہیا کر رہے ہیں۔

شریمتی قدوائی بندکی (ضلع فتح پور) میں مشترکہ زمرہ کے چھوٹے پراجکٹ یو۔ پی ایبکاٹ کی افتتاحی تقریب کی صدارت کر رہی تھیں۔

پسماندہ اضلاع میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے قیام سے متعلق حکومت کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے شریمتی قدوائی نے کہا کہ ان اضلاع میں دستیاب مقامی وسائل اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرنے اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ہی مراعات اور خصوصی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

شریمتی قدوائی نے کہا کہ یو۔ پی ایبکاٹ لمیٹڈ میں مجموعی طور پر ۱۷ لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ کی سرمایہ کاری کی گئی ہے جس میں سے ڈھائی لاکھ روپیہ شری ایل۔ کے سنگھ اور ان کے معاونین نے اور دو لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ اتر پردیش کی بنی ہوئی صنعتوں کے کارپوریشن نے لگایا ہے اور بقیہ رقم کا بندوبست اتر پردیش مالیاتی کارپوریشن اور بینک آف بڑودہ نے قرضہ کی شکل میں کیا ہے۔

شریمتی قدوائی نے کہا کہ کسی خاص پراجکٹ کا قیام ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بازار میں مسلسل مانگ برقرار رکھنے کے لیے اعلیٰ درجہ کا مال زیادہ مقدار میں تیار ہو۔ انھوں نے کہا کہ اس وحدہ میں تیار کیے جانے والے سامان میں تولیوں، روئی، پٹی اور گاج وغیرہ کا سب سے بڑا خریدار محکمہ صنعت ہے۔ اس کے علاوہ تیار مال کا کچھ حصہ برآمد بھی کیا جا سکتا ہے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

ہم ایک ہیں (از عرش ملسیانی، پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱ - صفحات ۲۴۸ - قیمت ۱۰ روپے -)

"ہم ایک ہیں" کے مرتب نے قومی یک جہتی کی رنگا رنگی پر اہم مواد دکھا کر کے ہندستان میں پھلنے پھولنے والی لسانی وحدتوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایک تاریخی گلدستہ پیش کیا ہے۔ اصل ہندستانیت یہی ہے جو ہماری رنگا رنگ زندگی کی آئینہ دار ہے۔ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

عرش ملسیانی نے اردو ادب کی غیر مسلم خدمات اور ہندی ادب کی مسلم خدمات، صوفیوں، بھگتوں اور شاعروں کی اخلاقی تعلیمات میں قومی یک جہتی کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ گوتم بدھ، کبیر، نانک، گورو ارجن دیو، گورو گوبند، نام دیو، تکارام، میرا بائی اور عزیب داس سے لے کر خواجہ غریب نواز، بابا فرید، امیر خسرو، شہباز، نظام اور رکھن تک کے ارشادات، تعلیمات اور کلامت اپنے موضوع کو پھیلانے میں مدد لی ہے۔ تاکہ ہندستانی زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلو اس روشنی میں سامنے آسکیں۔

انھوں نے اس کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں اردو کی عظیم الشان خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ موسیقی، مصوری، فن تعمیر، ناٹک اور تہذیبی اجتماعات کے ثقافتی پہلوؤں میں اس کی جڑیں تلاش کی ہیں۔ فرقہ پرستی ایک فریب ہے جس کے دام میں ہمارے مشترک دشمن یعنی غیر ملکی سامراج نے ہمیں پھنسا دیا ہے۔ جس سے نکلنے ہی میں ہماری کامیابی، ترقی اور خوشحالی ہے۔

شمال میں کوشل اور مگدھ کی حکومت (تقریباً ایک ہزار قبل مسیح) سے ۱۹۶۱ء تک کا ایک تاریخی جائزہ مرتب نے لیا ہے۔ خواہ حکمرانی ہو یا ملک گیری، تخت اور دربار نے رعایا کو ایک نظر سے دیکھا۔ فلسفہ و اخلاق، عقائد، تحریکات و شخصیات کی شکل میں ابھر ابھر کر قومی یک جہتی کے درس کو تیز تر کرتا رہا۔ مذاہب، سچائی، نیکی اور عبادت کے ذریعہ اس جذبے کو ابھار کر صلح، آشتی اور یک جہتی کو فروغ دیتے رہے۔

ہندو مذہب، فلسفہ اور سنسکرت میں مسلمانوں کی گہری دلچسپی اور سنسکرت کے عظیم شہ پاروں کی اردو میں منتقلی کا بھی کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب میں اکابرین ہند کے حوالوں اور ان کی تقاریر کے اقتباسات سے یہ پہلو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں تقریباً پچاس کتب سے مدد لی گئی ہے۔

عرش ملسیانی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے قومی یک جہتی کے موضوع کو اتنی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے موضوع کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ اسلوب کی شگفتگی برقرار نہ رہ سکی کہیں کہیں تاریخی حقائق کی ترتیب بھی متاثر ہو گئی ہے تکرار سے بھی دامن نہ بچا سکے اس کے باوجود "ہم ایک ہیں" اتنی اچھی پیشکش ہے کہ یہ پڑھنے والے کے لیے دلچسپ و مفید ثابت ہوگی اور اس کی معلومات میں خوشگوار اضافہ ہوگا۔

— احمد جمال پاشا

غنچہ و گل (مجموعہ کلام) نثار عباسی - قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ: عمران پبلی کیشن ۲۱- دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد -

غنچہ و گل نثار عباسی صاحب کی کم و بیش پچاس طبع زاد اور ترجمہ شدہ نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ مرحوم ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے تحریر کیا تھا۔ نثار عباسی صاحب نے بڑی لگن اور خلوص کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور سبق آموز نظموں کو تخلیق کیا ہے جو بچوں کے ادب میں یقیناً ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، محشر بدایونی اور شفیع الدین نیر کی روایت کو آگے بڑھانے میں غنچہ و گل کے شاعر کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زبان نہایت سلیس، بامحاورہ، صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔ ترجمہ میں بھی عباسی صاحب نے زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے جو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ طبع زاد نظموں کے علاوہ ورڈسورتھ، شیکسپیر، جے۔ بی۔ ایل، ہنٹ، آر۔ ڈبلیو۔ امرسن، ٹینی سن، سروجنی نائیڈو، ڈبلیو۔ کاؤپر اور ایس۔ ٹی۔ کولریج کی منظومات کے تراجم قابل داد ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ بچوں کے ادب کے لیے ایک فال نیک ہے۔

— ساغر مہدی

مخدوم علی مہائمی از مولانا عبد الرحمٰن صاحب پرواز اصلاحی، صفحات ۲۱۲ قیمت ۱۶ روپے، ناشر: نقش کوکن پبلی کیشن، ۴۴ جیل روڈ، ڈونگری، ممبئی

ہندستانی علما میں مخدوم علی مہائمی اپنی علمی خدمات کے لحاظ سے بہت ممتاز مقام کے مالک گزرے ہیں، مولانا عبد الحی حسنی مصنف 'یاد ایام' کا خیال ہے کہ ہندستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں .....

مخدوم صاحب کی دقت نظر کا اندازہ ان کے ایک رسالے سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کے اعراب کی صورتیں ۶۱ لاکھ ۱۱ ہزار ۶ سو ۴۴ کی تعداد میں بتائی ہیں۔ اس رسالے کے علاوہ بھی فقہ و تصوف اور اسرار شریعت پر آپ کی کئی کتابیں ہیں جن میں عربی میں قرآن کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان اب تک بعض مدارس کے نصاب اور علماء کے مطالعہ میں رہتی ہے، مخدوم صاحب ہندستان کے چند اولین مفسرین میں ہیں انھوں نے اپنی تفسیر میں آیتوں اور سورتوں کے درمیان ربط و مناسبت کو خاص طور پر موضوع بنا دیا ہے اور قرآن کو مربوط کلام ہی دکھایا ہے اور اس اعجاز سے پردہ اٹھایا ہے، ہر سورہ کی وجہ تسمیہ، موضوع کی نشاندہی اور حروف مقطعات کی تشریح بھی اہمیت کی حامل بحثیں ہیں جو اس تفسیر میں آتی ہیں۔ صاحب سوانح نے بڑے اچھے ڈھنگ سے مخدوم صاحب کی سیرت جمع کر دی ہے اور جدید و قدیم مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ ابن عربی کے وحدۃ الوجود کی تشریح و تفصیل اس کتاب کا خاص مضمون ہے جس سے اس کی علمی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

البتہ سوانح و حالات کے نقشے میں تشنگی محسوس ہوتی ہے اور مخدوم صاحب کی کتابوں کے تعارف میں صفحات کی تعداد واضح نہیں ہوتی جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتاب ہے یا رسالہ؟ بہ حیثیت مجموعی کتاب ہر صاحب علم کے پڑھنے کی چیز ہے۔

(شمس تبریز خاں)

جلد ۳۳ نمبر ۹

دسمبر ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پرچار انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

دسمبر کے ساتھ عیسوی کیلنڈر کا ایک اور سال ختم ہو رہا ہے اور ہم ۱۹۷۷ء میں قدم رکھنے جا رہے ہیں۔ ہماری ریاست اترپردیش نے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کی زیر قیادت ۱۹۷۶ء میں ہر شعبۂ حیات میں جو نمایاں ترقی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اترپردیش جیسی بڑی ریاست کے لیے یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ صرف ایک سال کی قلیل مدت میں بجلی سے متعلق تمام مسائل حل ہی نہیں ہو گئے ہیں بلکہ اس کی ضرورت سے زیادہ بجلی پیدا ہونے لگی ہے۔ اس کے علاوہ کسی ریاست کے لیے یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اتنی کم مدت میں غذائی پیداوار کا مسئلہ حل ہو جائے اور وہ وافر زرعی پیداوار والی ریاست بن جائے۔ ریاستی حکومت کے نئے پروگراموں سے خاص طور پر اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کو فائدہ پہنچا ہے۔ موجودہ حکومت وہ پہلی حکومت ہے جس نے حکومت ہند کے طرز پر ایک اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کمشنر مقرر کیا ہے۔ ملک بھر میں یہ پہلی ریاست بھی ہے جس نے نجی زمرے میں بھی اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے اسامیاں محفوظ کی ہیں۔ حکومت نے ان لوگوں کو رعایتی شرحوں پر قرضے دینے کے لیے ایک کارپوریشن قائم کیا ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے انھیں زمین، تعمیر مکانات کے لیے قطعات آراضی اور ضروری ساز و سامان کے ساتھ ساتھ مالی امداد بھی فراہم کی جا رہی ہے تاکہ وہ خود کفیل ہو کر سماجی اور معاشی زندگی میں اپنے لیے بہتر سے بہتر جگہ بنا سکیں۔ اب تک ۷ لاکھ ہیکٹر فاضل زمین ۱۹ لاکھ سے زائد بے زمینوں کو دی جا چکی ہے۔ ان میں سے تقریباً ۱۲ لاکھ افراد اقوام و قبائل مندرجہ فہرست سے تعلق رکھتے ہیں۔ نئے زمین پانے والوں کو نہ صرف مالی امداد دی گئی بلکہ انھیں تین سال تک مالگذاری کی ادائیگی سے مستثنیٰ بھی کر دیا گیا۔ زرعی مزدوروں کے مفاد کے پیش نظر کم سے کم اجرتوں پر نظر ثانی کر کے ان میں اضافہ کیا گیا اور مقررہ شرحوں سے کم اجرت دینے کو ایک جرم قرار دیا گیا۔ کمزور طبقوں پر ظلم اور زیادتی کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی گئی ہے۔ ان لوگوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ضلع مجسٹریٹ اور پولیس حکام کو ذاتی طور پر ذمے دار قرار دیا گیا ہے۔ شہری علاقوں میں پہلی بار زمین کو سماجی ملکیت بنانے کا کام بھی شروع کیا گیا۔ ریاست کے ۱۲ شہری علاقوں میں شہری زمین (حد بندی و ضابطہ) قانون نافذ کیا جا چکا ہے اور دیگر ۱۰ علاقوں میں اس کی توسیع کی تجویز ہے۔ اترپردیش میں اس سال ربیع میں ۱۲۰ لاکھ ٹن کی ریکارڈ پیداوار ہوئی۔ اس کے علاوہ ۵۵ لاکھ ٹن کی خریف کی متوقع پیداوار کے پیش نظر امید کی جاتی ہے کہ موجودہ خریف کے دوران پیداوار کا موجودہ ریکارڈ برقرار رہے گا۔ اس کامیابی میں آبپاشی نے زبردست رول ادا کیا ہے۔ کسانوں کو آبپاشی کے لیے ریکارڈ سہولتیں مہیا کی گئیں۔ ریاست میں ایک لاکھ ۲۸ ہزار ہیکٹر رقبے کے سالانہ اوسط کے مقابلے میں پانچ لاکھ ۸ ہزار ہیکٹر رقبہ کی آبپاشی صلاحیت پیدا کی گئی۔ زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کے سلسلے میں ۱۷،۱۰ لاکھ ٹن غلہ خریدا جا چکا ہے جبکہ ۱۲ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

بجلی کی پیداواری صلاحیت جو ۱۹۷۵ء میں ۱۹۵۰ میگاواٹ تھی اب بڑھ کر ۲۳۱۵ میگاواٹ ہو گئی ہے۔ ضلع مرزا پور میں سپر تھرمل اسٹیشن قائم کر کے اترپردیش نے بجلی کے زمرے میں ایک اور امتیازی قدم اٹھایا ہے۔ اس کے ذریعے اترپردیش کے علاوہ مدھیہ پردیش کو بھی زرعی اور صنعتی کاموں کے لیے مزید بجلی فراہم ہونے لگے گی۔ بجلی کی وافر فراہمی اور صنعت کاروں کے لیے تمام ضروری وسائل کے بندوبست سے ہماری ریاست میں صنعتی ترقی کے لیے بہت ہی سازگار ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ موجودہ ۹۵ صنعتی بستیوں میں ۱۱۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے نئے صنعتی واحدے قائم کیے جا رہے ہیں۔ دادھا میں ایک عظیم کمپلکس بہت تیزی کے ساتھ معرض وجود میں آرہا ہے۔ نئے صنعتی پراجکٹ جن پر حال ہی میں کام شروع کیا گیا ہے ان میں کجرہٹ سیمنٹ فیکٹری، ۲۵ شکر ملیں اور ۲۰ کتائی ملیں شامل ہیں۔ ان حقائق سے ۱۹۷۶ء میں زبردست صنعتی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک جامع ہینڈلوم اسکیم بھی تیار کی گئی ہے جس کے تحت بنکروں کو ۱۰ ہزار کرگھوں پر تربیت دی جائے گی۔ حکومت طلبا اور نوجوانوں کے مفاد کے تحفظ میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ضبط و نظم کا ایک نیا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک محکمہ بھی قائم کیا جا چکا ہے۔ تقریباً تمام کالجوں میں "کتب بنک" قائم ہو چکے ہیں۔ اور پہلے سے پانچویں کلاس تک کے ۴۴۰۰۰ طلبا کو مفت کتابیں مہیا کی گئی ہیں۔ صارفین کو مناسب قیمت پر ضروری اشیا فراہم کرنے کے لیے بھی ٹھوس اقدامات کیے گئے جن کے نتیجے میں ان کی قیمتیں ۱۰ سے ۴۰ فیصد تک کم ہو گئیں۔ موجودہ حکومت کے نظم و نسق سنبھالنے کے بعد سے ریاست میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہو گئی ہے اور ہر قسم کے جرائم میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ پولیس مشینری کو ایک موثر فورس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی جو ملک و قوم کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے، اس کے سلسلے میں ریاست کے لیے مرکز کے مقرر کردہ ۴ لاکھ کے نشانے کو پار کر کے ایک ریکارڈ کامیابی حاصل کی ہے۔ ۶،۳۶ لاکھ افراد کی نس بندی ہو چکی ہے اور اب حکومت نے اپنے طور پر ریاست کے لیے ۱۵ لاکھ نس بندیوں کا جو نشانہ مقرر کیا ہے اسے پورا کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دینے کے لیے ہر طرح کوشاں ہے۔ ترقیاتی کاموں اور کامیابیوں کے جو اعداد و شمار سطور بالا میں دیے گئے ہیں وہ ظاہر ہے کہ ان سطور کو ضبط تحریر میں لانے کے ٹھیک پہلے تک کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ بعض قدرتی آفتوں مثلاً سیلاب کے باوجود ہماری ریاست اترپردیش نے ۱۹۷۶ء میں ہر شعبۂ حیات میں کس تیزی سے ترقی کی ہے اور کامیابیوں کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

—— ایڈیٹر

وہ منزل ابھی نہیں آئی

نازش پرتاپ گڑھی

نظر نظر میں لیے شمع جلوہ بار، چلو
بہت قریب ہے اب خیمۂ بہار، چلو

ابھی سے پاؤں کے زخموں کی بات کیوں کیجیے
ابھی ملیں گے ہزاروں ہی خار زار، چلو

ابھی سے خرمنِ ہستی کی فکر کیا کیجیے
ابھی تو ہوگی فضا اور شعلہ بار، چلو

بڑھا ہے پنجۂ وحشت، بہت ہی شغل جنوں
مگر لیے ہوئے دامانِ تار تار، چلو

ہزار راہِ طلب ہے سیاہ رنگ مگر
تمھارے ساتھ چلے گا جمالِ یار، چلو

چھپاؤں دل میں اک اک زخم اپنے سینوں کا
بھلا کے سارے ستم ہائے روزگار، چلو

یہ وہ گھڑی ہے کہ جس کا شمار کل ہوگا
یہ وقت وہ ہے کہ بن کر پیامِ یار، چلو

اٹھو، صدا کی طرح تم نشاط جاں کے لیے
سکون دل کے لیے ہو کے بے قرار، چلو

دیارِ امن و اماں کے سفیر ہو تم ہی
تمھیں ہو شہرِ اخوت کے تاجدار، چلو

سکوتِ شب میں ضروری ہے میرے ہم سفرو!
چلو تو ساز بہ دست اور نغمہ بار، چلو

قریبِ ختم ہے اب نفرتوں کی مکّاری
شروع ہوگا محبّت کا کاروبار، چلو

قدم قدم پہ کھلاتے ہوئے ہزار چمن
مثالِ بادِ صبا، موجۂ بہار، چلو

نفس نفس میں بسائے ہوئے غرورِ جنوں
چلو عزیزو! سوئے جلوہ گاہِ یار، چلو

صدائیں دیتا ہے تم کو مورّخِ فردا
پکارتی ہے سحر تم کو بار بار، چلو

تمھارے ساتھ ہے منزل شناس راہ نما
الگ ہوئے ہیں رفیقانِ کم عیار، چلو

طلب کی راہ میں رکنا حرام ہے یارو!
چلے چلو کہ سفر ناتمام ہے یارو

فخرالکریم صدیقی

احتشام حسین
اور
مولانا حالی

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے جن لوگوں نے اردو تنقید کی سطح کو بلند کرنا شروع کیا ان میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو قدیم راستوں سے تحقیق کے نئے راستے دریافت کر کے تنقید کو اسی طرف لے چلے لیکن کچھ لوگ جو مغرب کے بدلتے ہوئے معیار اور حالی کی روایتوں کے قائل تھے انھوں نے تنقید کا وہ رخ اختیار کر لیا جس نے ادب کا محاسبہ تاریخی اور سماجی راستوں سے ان فکری سمتوں کو نظر میں رکھ کر کیا جس سے ادیب کے ذہن کی ایسی پرتیں کھلتی ہیں، جہاں تخلیق اپنی پہلی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان باتوں کا احساس بہت تیز ہو گیا تھا کہ کسی تخلیق میں ادیب کی انفرادی فکری کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس کے گرد و پیش کے عوامل کا کیا ہاتھ ہوتا ہے۔؟ ذہن کے مختلف پردوں میں فکر اور ماحول کے کون سے اثرات کام کرتے رہتے ہیں! تخلیق کسی مقصد سے ہوتی ہے یا اس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ وہ محض تفنن طبع کے لیے ہے یا اس سے کسی زندگی کا شعور ملتا ہے۔

احتشام حسین تنقید کے میدان میں ایسے ہی شعور کے حامل تھے۔ جنھوں نے تنقید کے اسی راستے کو پسند کیا جو حالی کا راستہ تھا۔ ایک طرح سے احتشام حسین کی تنقیدی نگارشات کو حالی کے طرزِ فکر کا پھیلاؤ سمجھنا چاہیے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں جو باتیں مختصر طور سے اشاروں میں بیان کی گئی ہیں اس کی توسیع ہمیں احتشام حسین کی تنقیدوں میں ملتی ہے۔ شاعری اور سوسائٹی کا کیا رشتہ ہے؟ اچھا یا برا شعر کیا ہے؟۔ شعر میں کن کن باتوں کا ہونا اس کو فکری طور پر پُراثر بناتا ہے۔ یہی وہ نظریاتی باتیں ہیں جن کے بغیر اردو تنقید نظریاتی مباحث سے دور رہ جاتی ہے۔ احتشام حسین کے مضامین اسی کمی کو پورا کرتے ہیں جو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں تشنہ رہ گئی تھی۔ جگر کی شاعری اور محرکات، اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقاء، مجاز فکر و فن کا جینے والا ادب اور افادیت، تنقید اور ادبی اور غیر ادبی قدریں، غالب کا تفکر، اقبال کی رجائیت کا تجزیہ، تنقید اور عملی تنقید، نیا ادب اور ترقی پسند ادب، جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش، یہ تمام ایسے مضامین ہیں جن میں ان نظریاتی مباحث کو پیش کیا گیا ہے جو مقدمۂ شعر و شاعری میں تفصیل سے نہیں اٹھائی گئی تھیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیے کہ احتشام حسین کی تنقید اپنا کوئی مزاج نہیں رکھتی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ نئے سماجی علوم، سائنسی ترقیاں اور تاریخ کے بدلتے ہوئے امکانات پر رکھنے والے کے لیے جو وقت سماج اور تاریخ کے تقاضوں کو سمجھتا ہے اس کے لیے ایک نئی جہت پیش کرتے تھے۔ ترقی پسند ادب اور تحریک، نے ان تمام عناصر کو یکجا کر کے تمام ان ادیبوں کے ذہن میں وہ مواد فراہم کیا جو اس سے اثر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ احتشام حسین نے وقت کے ان تقاضوں کو سمجھا اور ان پر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو صرف کیا۔

احتشام حسین اپنے تنقیدی نظریات کو وضاحت، استدلال آہنگ اور مسائل کو ادبی اور سائنٹفک طریقوں سے حل کر کے

اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں کہ بحث کا کوئی ایسا پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا جس سے پڑھنے والے کے ذہن میں کسی طرح کی خلش باقی رہ جائے اور یہ دلائل، تاریخ، عہد اور ان معاشرتی حالات کو ذہن میں رکھ کر پیش کئے جاتے ہیں جو کسی ادیب یا اس کے فکر کو پوری طرح سے احاطہ کر لیتی ہیں۔ غالب کے سلسلے میں ایک خیال یوں پیش کرتے ہیں۔

"مغل دور تہذیب صرف ہندستان کی تاریخ میں نہیں بلکہ تاریخ عالم میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں، تعمیری صلاحیتیں، موسیقی، شعر و ادب، مصوری اور منظم مرکزی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئی تھیں۔ عروج کے زمانہ میں ہر گوشہ بساط دامانِ باغباں و کفِ گل فروش رہ چکا تھا۔ تعیش کی لاتعداد صورتیں فرصت نے پیدا کی تھیں اور جس طبقے کا غالب سے تعلق تھا وہ نشاط زندگی سے بہرہ ور تھا لیکن جب حالات بدل گئے تو یہ احساس ہوا کہ وہ دور مٹ رہا تھا اور اسے پھر سے زندہ کرنا ناممکن تھا۔"

اس یقین کا احساس ان کے یہاں ہے کہ اب وہ عیش رفتہ آنے والا نہیں۔ یہ یقین بار بار مختلف اشعار میں ظاہر ہوا ہے۔

گھر ہمارا جو نہ روتے تو بھی ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

"تعمیر اور تخریب کا یہ نیم جدلیاتی تصور زبردست مشاہدہ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔"

دوسری مثال بھی ملاحظہ کیجئے:

"نظریے شعر و ادب پر کھنے اور جانچنے ہی کے دوران پیدا ہوتے ہیں اور کہیں سے بن کر نہیں آتے۔ اس لیے تنقید اور تخلیق میں بہت زیادہ فرق کرنا مناسب نہیں ہے۔ ادبی جائزہ ادیب کو اپنی کاوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور ادب کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔"

احتشام حسین کی یہ تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ حالی کے طریق استدلال اور ادبی نظریات سے کتنے قریب تھے۔ باتوں کو سمجھانے پیش کرنے اور پھر ان پر تفصیلی بحث کرنے کا ڈھنگ اگرچہ حالی سے قریب ہو کر گزرتا ہے لیکن تجزیے میں ان سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ احتشام حسین نے جہاں عملی تنقید پیش کی ہیں وہاں بھی ان کی بحث کا دائرہ ان ہی سماجی، تاریخی، اور کسی حد تک شاعر اور ادیب کی نفسیات کو نظر میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ وہ حالی سے کس حد تک متاثر تھے، اس کا خود انھوں نے کہیں اعتراف نہیں کیا لیکن اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہیں کہ حالی ان کے پسندیدہ نقاد تھے۔ تقریباً ان کے تمام مجموعوں میں حالی سے متعلق یا تو بحث ملتی ہے یا ان کے مضامین کی سرخیاں ـــ حالی اور پیروی مغرب، حالی کا سیاسی شعور، مقدمۂ شعر و شاعری، حالی اور ان کا عہد، مسدس حالی اور اس کے نقاد، اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ احتشام حسین حالی سے کس حد تک متاثر تھے۔ اردو تنقید کے ارتقاء میں وہ جن تین ناقدین کو اہم سمجھتے ہیں یعنی آزاد، حالی اور شبلی ان میں بعض حیثیتوں سے حالی کا اہم ترین مقام ہے۔ اس بات کی وضاحت، احتشام حسین کی تحریر کردہ مندرجہ ذیل سطور سے بھی ہو جاتی ہے۔

"جب ہم ان نقادوں پر یہ سرسری نظر ڈال رہے ہیں تو یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ انفرادی طور پر ان کے (آزاد، حالی، شبلی) شعور کے دائرے مختلف ہیں۔ چنانچہ مادی زندگی میں تغیر اور اس کے نتائج پر مادے اور خیال کے تعلق پر، حالی نے جس طرح نظر ڈالی ہے وہ ان کے طرز فکر کا پتہ دیتی ہے۔ انھیں اس عہد کے دوسرے نقادوں سے آگے بڑھاتی ہے اور ان کے دائرۂ خیال میں اس حصے کا اضافہ کرتی ہے جس سے آج کا نقاد بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے تنقید کی نئی

راہیں کھل گئیں۔ سماجی نقطۂ نظر کی جستجو کرنے والا حالی کے یہاں اس کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔"

(اردو تنقید کا ارتقاء
(۱)۔ ذوق ادب اور شعور ص ۲۶)

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ احتشام حسین کی تنقیدوں میں جو ہر وقت سیاسی اور سماجی شعور کی یا تاریخ کے اثرات کی بحثیں چلا کرتی ہیں وہ ان کے مضامین میں یکسانیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اور پڑھنے والوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ادب کی تنقید میں ان باتوں کے علاوہ اور کسی بات سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ یا یہ کہ احتشام حسین خالص فن اور جمالیات کی بحث اپنے مباحث میں نہیں لانا چاہتے۔ بات یوں نہیں ہے۔ دراصل احتشام حسین اور ان کے طرز فکر پر سوچنے والے تمام ناقدین خالص فن اور جمالیات کو مقصد بالذات نہیں سمجھتے۔ بلکہ کسی بھی فنی یا جمالیاتی تصور میں اس کے دور اور اس دور کے مذاق، تاریخ اور ان سماجی حالات کا بھی ہاتھ ہوتا ہے جس سے ہو کر کوئی ادیب یا شاعر گزرتا ہے۔ خالص فن نام کی چیز بغیر ان محرکات سے رشتہ جوڑے ہوئے وجود میں نہیں آ سکتی۔ اسی سبب سے احتشام حسین قاری کو بھی پہلے کسی فن پارہ کے تاریخی، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی پس منظر سے بخوبی واقف کرا دینا چاہتے ہیں اور اس کے بعد اس کے فن سے بحث کرتے ہیں۔ زیادہ تر حالی نے بھی اسی طرز سے شعر و ادب کا تجزیہ کیا ہے اور بحثیں اٹھائی ہیں، اگرچہ ان کو عملی تنقید کا ایسا موقع نہیں ملا جو ان کے بعد اس انداز پر لکھنے والوں کو ملا۔ پھر احتشام حسین کی تنقیدوں میں کسی مقام پر بھی فن یا جمالیات کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن خالص فنی اور جمالیاتی نظریوں سے فنون کو پرکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی سعی لاحاصل ضرور قرار دیا گیا ہے اور جگہ جگہ اس طرز فکر کی دلائل کے ساتھ نفی بھی کی گئی ہے۔

یہی وہ ٹھوس دلائل ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ احتشام حسین کے تنقیدی مضامین تنقیدی آدرشوں کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ حالی نے جو تخم بویا تھا وہ ایک تناور درخت کی صورت میں احتشام حسین کی تنقیدی نگارشات میں پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین میں تنقیدی ذوق کو اکسانے، نئے موضوعات کو کریدنے اور نئے ادبی مسائل کو پیش کرنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخی حقائق اور زندگی کے تغیرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فن اور فنکار کے جذبات اور افکار کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے وہ تبدیلیوں کو قوت اور حیات کی ایسی علامت سمجھتے ہیں جن کے بغیر تنقید، ادب اور زندگی کے راستے استوار نہیں ہوتے۔

★

بیکل اتساہی

ترانۂ اُتّر پردیش

بھارت ہے ہمارا پیارا وطن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
دیروں کا چلن، رشیوں کا وچن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
کیلاش اس کے ماتھے کا تلک، چرنوں پہ جھکے ہے وندھیاچل
ہری دوار حسیں ہونٹوں کی دمک، گودی میں لہکتا تاج محل
باہوں میں پگھلتے گنگ و جمن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
تہذیب کا گہوارہ ہے یہی، ہر دھرم کی انگنائی ہے یہی
جو بزم سجائیں عالم کی ان پھولوں کی امرائی ہے یہی
ہے اس کی مہک گلشن گلشن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ کرشن کی بگیا البیلی، رہتے ہیں سیا کے رام یہیں
غازی، صابر، وارث کا نگر، گوتم کا مقدس دھام یہیں
ہر دھرم یہاں من کا درپن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
لہکے ہے رسیلی شہنائی، یہ نیل کنول کی دھرتی ہے
ہے امن یہیں کی انگڑائی، یہ عزم و عمل کی دھرتی ہے
بھارت کی جبیں اس سے روشن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ ویر بندیلوں کی وادی، جانباز روہیلوں کی بستی
جو دیش پہ اپنی جاں دے دیں یہ ان البیلوں کی بستی
ہر پھول یہاں ہے شعلہ بدن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
رنگت ہے صبح بنارس کی، یہ شام اودھ کی خوشبو ہے
یہ نینی تال مسوری کی لہکی ہوئی رات کا گیسو ہے
ہر رنگ ہے فطرت کا درشن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
رامائن کی دہلیز ہے یہ، پدماوت کا سنسار یہی
یہ سنت کبیر کا تیاگ بھون، ہے مست نظیر کا پیار یہی

رسکھان کی بستی کا مدھوبن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
بسمل کا یہیں جذبہ ہے امر، اشفاق کی قربانی کی قسم
ہے عزم شہیداں کی یہ ڈگر، بڑھتے ہوئے سنیاسی کی قسم
آزادیٔ ملک اس کا جیون — اتر پردیش ہے اپنا چمن
موتی کے جواہر پارے بھی، جوہر کی ضیا باری ہے یہاں
ہیں لال یہاں انگارے بھی، ذاکر کی رواداری ہے یہاں
ہیروں سے بھرا اس کا دامن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ پنت کا پیار اجیارا ہے، قدوائی کا ارمان ہے یہی
رخ موڑتا وقت کا دھارا ہے، فتنوں کے لیے طوفان ہے یہی
سیکھے ہے یہاں ہر نیت چلن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
گیہوں کے سنہرے جھوم رہیں، دھانوں کی روپہلی پینجنیا
مکئی کی بتیسیں موند رہیں، مڑوا کی جڑا اڑکر دھنیا
کھیتہر ہے انھیں سپنوں میں مگن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
لہکا دیں نئے ڈھب سے اپنی کھیتی کو نیا جیون دے دیں
چاندی سی کھنکتی پرتی کی، فصلوں کو سنہرا پن دے دیں
ماٹی کو بنا دیں اب کنچن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
محنت کی حسیں تدبیروں سے گلزار کریں صحراؤں کو
ادیوگ کی پھیلی باہوں میں شہروں سے ملا دیں گاؤں کو
سب توڑ دیں نفرت کے بندھن — اتر پردیش ہے اپنا چمن
جو راہ ملی ہے باپو سے اس راہ کو ہم چمکائیں گے
ہر موڑ پہ ہنس برسائیں گے اندرا کی ساکھ بڑھائیں گے
یہ عہد ہے بیکل عہد سخن — اتر پردیش ہے اپنا چمن

شمس تبریز خاں

شاعر انسانیت

تلوک چند محروم کا شمار اردو ادب کے ان چند ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جن کا شمار اپنی کمیت و کیفیت دونوں کے لحاظ سے بہت ہی قابل لحاظ حیثیت کا مالک ہے وہ شعر گوئی میں اقبال، درگا سہائے سرور، چکبست اور رواں کے معاصر تھے اور سر عبد القادر کے مخزن اور دیا نرائن نگم کے زمانہ سے ہی ان کی شاعری کا بھی آغاز اور تعارف ہوا۔

محروم کو یہ خوش نصیبی بھی حاصل رہی کہ ان کے کلام میں شروع سے پختگی و سنجیدگی موجود رہی جس کے سبب وہ قبول عام سے محروم کبھی نہیں رہے "نورجہاں کا مزار" ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے لیکن جب شائع ہوئی تو ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور اقبال تک نے اس کی تعریف کی اور برسوں تک وہ اردو کے نصاب میں داخل رہی۔ مولانا حالی، آزاد، شبلی اور اسماعیل میرٹھی نے اردو نظم و غزل کو جس ڈگر پر ڈالا تھا محروم کے رہوار سخن نے اپنے لیے اسی کو منتخب کیا اور اپنی منزل متعین کر لی اور اس میں ایسی وفاداری اور استواری برتی جو آپ اپنی مثال بن گئی۔ اردو میں ادب لطیف، نظم معرا، ترقی پسندی، رومانیت اور جدیدیت کے کتنے ہی طوفان اٹھے مگر محروم ایک قابلِ قدر وضع داری کے ساتھ اور بڑے عزم و استقلال کے ساتھ اپنی راہ پر چلتے رہے۔

پرگوئی اور کثرتِ کلام کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے تقریباً ایک ہزار نظمیں کہیں اور ایک لاکھ اشعار لکھے جو تقریباً ایک درجن مجموعوں پر مشتمل ہے۔ ان کے اولین قدردانوں میں سر عبد القادر، ڈاکٹر اقبال، اکبر اور کیفی رہے ہیں اور بعد میں تو ان کا کلام سکۂ رائج ہی رہا۔

محروم کی پرگوئی، نغز گوئی سے خالی نہ تھی وہ بھرتی کے اشعار سے گریز کرتے تھے اور سخن سازی سے پرہیز ان کا شعار تھا۔ ان کے کلام کا تنوع اور رنگا رنگی بھی دیدنی ہے؛ نظم و غزل، رباعی و مثنوی، قطعہ و مستزاد کسی میں وہ بند نہ تھے نظموں میں بھی انھوں نے مختلف بحریں اختیار کی ہیں جو جدت و اختراع اور تخلیقی دسترس کی غماز ہیں۔ ان کا بڑا کمال ان کی قادر الکلامی اور غیر معمولی فنی مہارت و ہنرمندی ہے۔ الفاظ و معنی پر وہ حاکمانہ اقتدار رکھتے ہیں کہ عجز بیان کا کہیں دھوکا بھی نہیں ہوتا، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اپنے سیدھے سادے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ کہہ ڈالتے ہیں بلکہ سامع کے دل میں اتار دیتے ہیں۔ انھیں الفاظ کی گھن گرج پسند نہیں۔ وہ ایک معتدل لہجہ کے مالک ہیں جو ایک متوازن ذہن و فکر، نارمل شخصیت اور صحت مند ذوق کا اشاریہ ہوتا ہے۔ وہ کسی نفسیاتی گرہ (COMPLEX) کے شکار نہیں، نہ اپنے کو برتر سمجھتے ہیں نہ کمتر بلکہ مساوی سطح سے ہر انسان کو مخاطب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ ان کے یہاں کوئی ماورائی کیفیت ہے نہ فلسفہ طرازی ہے نہ کوئی ازم ہے۔ وہ زندگی کو خانوں میں نہیں دیکھتے بلکہ زندگی سے بہ حیثیت مجموعی محبت کرتے اور انسان سے باعتبار نوع انسانی پیار کرتے ہیں۔ امن و انسانیت، اور اخلاق و شرافت ان کی شخصیت کی طرح ان کے کلام کا بھی جوہر ہیں۔

انسانیت و اخلاق ان کی شاعری کا محور ہیں۔ اسی قابل قدر جذبے نے انھیں بچوں کے لیے نظمیں لکھنے پر مجبور کیا، اسی نے قومی تحریک سے ان کا تعلق پیدا کیا اور "کاروانِ وطن" جیسا مجموعہ تیار ہوا، اسی نے ان سے رباعیاں کہلائیں، اور انھوں نے اپنی نظموں کو اسی کا ذریعۂ اظہار بنایا۔ غرض ایک شمع تھی جو رنگ برنگے فانوسوں میں جلتی رہی۔ ایک درد تھا جو فریاد کے مختلف لہجوں میں ڈھل گیا۔

ایک ایسے دورِ خلفشار و انتشار میں جب شرافت و انسانیت

اور تمام اقدار عالیہ تہ و بالا ہو رہی تھیں، اخلاقِ فاضلہ کے پیمانے دستبرد زمانہ کے کھلونے بنے ہوئے تھے، مخدوم نے اخلاق و انسانیت کا علم بلند رکھا اور وہ انھیں کا کلمہ پڑھتے رہے اور انھیں کا دم بھرتے رہے اور بے یقینی کے طوفان میں ایمان و یقین کی مشعل لے کر آگے بڑھتے رہے۔ ان کی غزلوں کی سادگی و متانت اور تعمیری و اخلاقی رنگ دیکھ کر مجھے حافظ و سعدیؔ جامیؔ و خاقانی، کلیمؔ و نظیریؔ، جیسے شعرا یاد آجاتے ہیں جن کا کلام صحیفۂ اخلاق اور سفینۂ انسانیت ہے۔

مخدوم کے کلام کی ایک خاص چیز سوز و گداز اور ان کا غم آگیں لہجہ ہے جو ان کی غم پسند فطرت اور ان کی غمگین زندگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں" نصف صدی کی طویل ملازمت کے دوران میں بعض ناخوشگوار حالات اور کچھ ذاتی رنجیدہ واقعات پیش آئے، طبیعت شروع سے رقت آشنا تھی حالات نے میری شاعری میں غم و اندوہ کا عنصر شامل کر دیا نتیجہ گنج معانی کے دیباچہ میں سر عبد القادر نے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے[1]"

ان کا غم مصنوعی نہیں بلکہ فطری و حقیقی ہے اس لیے ایک خاص کشش اور اثر رکھتا ہے۔ ایک حادثہ جوانی میں ان کی بیوی کی وفات پر اور پھر ایک دو سالہ بچی کی موت اور ایک نوجوان لڑکی کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے جو ایک انسان کو پیکر غم بنا سکتا ہے، ان نظموں میں ایک محروم باپ کی بے قراری اور شفقت پدری کی تپش صاف محسوس ہوتی ہے، اور دوسری نظموں میں ایک غم زدہ و مہجور شوہر کی داستانِ فراق ہے جو دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔

میرے محترم دوست پروفیسر عبد المغنی صاحب نے کلام مخدوم کے بارے میں لکھا ہے کہ" اس میں غالب طور پر تین قسم کے مضامین شامل ہیں، ایک فطرت، دوسرے درس اخلاق، تیسرے ذاتی غم، اس تجزیے سے ایک اور بات معلوم ہوگی کہ ان تینوں ہی قسم کے مضامین میں تین عناصر قدر مشترک ہیں، یعنی مرقع نگاری دردمندی اور عبرت انگیزی[2]"

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مخدوم کا غم، صرف رونے دھونے تک محدود نہیں بلکہ اس میں بڑی گہرائی و گیرائی اور مہذب و شائستہ سلیقہ ملتا ہے، ان کے غم میں ایک رچی ہوئی کیفیت، اور ایک نکھری ہوئی اور کڑھی ہوئی شخصیت کی جھلک ملتی ہے، ان کے غم میں نہ اشتہار ہے نہ مریضانہ اظہار بلکہ اس میں ایک بانکپن اور مردانہ وقار شامل ہے۔ وہ ایک صحت مند اور معتدل انسان کا غم ہے جس سے شخصیت کی تطہیر اور تزکیہ کا سامان ہو جاتا ہے اور جس میں شخصیت تپ کر نکھر اور سنور جاتی ہے۔

جہاں تک مخدوم کی غزل کا تعلق ہے اس میں کلاسیکی انداز غالب ہے۔ عام طور پر ان کی غزلوں کا رنگ استادانہ ہے الفاظ اور ترکیبوں کی صحت کا انھیں پورا خیال رہتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت نہ فکر میں پسند کرتے ہیں نہ فن میں۔ انھیں لفظ و معنی دونوں ہی میں نزاکت و نفاست سے زیادہ اصلیت اور ثقاہت پسند ہے۔ ان کی غزلیں زندگی سے بہت قریب ہیں، اور ان میں غم جاناں اور غم زمانہ کے حقیقی خد و خال اس قدر نمایاں ہیں کہ ہمیں ان کے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی بے ساختگی لیکن باضابطگی کے ساتھ اپنے جذبات و محسوسات کی تصویر کھینچنا جانتے ہیں۔ اس خصوصیت میں وہ مولانا حالیؔ سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے کلام میں مومنؔ و شیفتہؔ، حسرتؔ و اصغرؔ کا رنگ کھل اٹھتا ہے۔

یہ بات بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتی ہے کہ کسی شاعر کا کلام بظاہر سادہ نظر آئے لیکن اسی سادگی میں پرکاری، بے تکلفی میں بناوٹ سنگار اور معصوم الفاظ کے اندر شوخ و شنگ معانی

۱؎ نقوش، لاہور آپ بیتی نمبر ص ۱۱۱۲ ۲؎ جادۂ اعتدال ۱۷۱ (پٹنہ ۱۹۷۲ء)

کی ایک دنیا آباد ہو اور کلام کے سطح ساکن کے نیچے معنویت و تہ داری کی تند و تیز لہریں کروٹیں لے رہی ہوں۔ مخدوم کی غزلوں میں کچھ ایسا ہی رنگ و آہنگ اور نیرنگ نظر آئے گا۔

ان کی غزلوں میں صرف دلکشی ہی نہیں دل کشائی بھی ہے، صرف جذبات کی آئینہ داری ہی نہیں بلکہ خیالات و صداقت احساس کی تازہ کاری بھی ہے۔ تصویر حیات و کائنات ہی نہیں بلکہ تعمیر کی حسرت و جرأت بھی ہے۔ مرحوم کی بیشتر غزلوں اور کچھ نظموں کی خاص نوعیت ایک بالیدہ ذوق ایک مہذب و شستہ مزاج ایک حکیمانہ اور عمومی لہجے میں پوشیدہ ہے۔ ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ ایک ٹھہرا اور رچتا ہوا انداز اور ایک فطری و حقیقی طرز فکر، مخدوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ فراق گورکھپوری نے بہت صحیح کہا ہے کہ :

"ان کی غزلوں کا کلاسیکی رکھ رکھاؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ تعلیم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں بہ یک وقت نغمگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے، وہ اخلاقی قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور اکثر زبان زد ہو جاتے ہیں۔ ایک تربیت یافتہ احساس، ایک پروقار ضبط ان کا خاصہ ہے ...... ان کی انگلیوں میں ایک باکمال ماہر فن کا جادو ہے مگر فن انھیں کبھی دھوکے نہیں دیتے وہ جوش جنون میں بہکتے نہیں ایک سلجھے ہوئے دنیا دیدہ بشر کی سی سنجیدگی اور متانت ان کا حصہ ہے صحت مندی ان کی شاعری کا وصف اعلیٰ ہے۔"[۱]

ان کے کلام کی کچھ اور خصوصیات میں سرفہرست ان کی پاک طینتی اور نیک طبعی ہے، شرافت، بلند طبعی، رواداری اور حسن بینی بلند نظری اور کشادہ قلبی ان کی نظم و غزل اور رباعی بلکہ سارے کلام کا امتیازی رنگ ہے۔ وہ مسلم تہذیب و ثقافت سے اتنے قریب ہیں کہ بیگانگی اور اجنبیت کہیں سے نہیں ثابت ہوتی وہ مذہبی و تہذیبی اور تمام گروہی حد بندیوں سے اٹھ کر اس مقام پر نظر آتے ہیں جہاں اعلیٰ انسانی اقدار اور عالم گیر صداقتوں ہی کی کارفرمائی رہ جاتی ہے۔

ان کے کلام کی ایک خاص الخاص خوبی اس کا حکیمانہ اور مبصرانہ پہلو ہے۔ وہ سعدی کی طرح ہر جگہ ایک معلم اخلاق نظر آتے ہیں۔ زندگی کے حقائق پر ان کی نظر اکثر رہتی ہے حسن و عشق کی داستان پارینہ سے زیادہ وہ حسن زندگی اور حسن فطرت پر نگاہ رکھتے ہیں اور زندگی کی بصیرتوں اور حکمتوں کو ہر خاص و عام تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ وہ بہکتے کبھی نہیں یہی ان کی خوبی بھی ہے اور اگر کہیے تو عیب بھی ان کے ساغر کی موجیں ہمیشہ "خط پیمانہ" بن کر رہ جاتی ہیں۔ ان کا جام کبھی چھلکتا نہیں لیکن اس میں سرشاری کی کیفیت ضرور ہوتی ہے۔ ان کے کلام پر عموماً تفکر کی ایک فضا قائم رہتی ہے اور ایک اعلیٰ سنجیدگی اکثر انھیں تنہا نہیں چھوڑتی۔

مخدوم کی غزلوں کے یہ اشعار شاید ان کا رنگ سخن بتا سکیں گے:

کسی کی یاد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
اسی کو راحت جاں اور سکون دل سمجھتے ہیں

سہارا ہے کہاں یا رب ترے کشتی شکستوں کا
نکل آتی ہے موج آخر جسے ساحل سمجھتے ہیں

کہاں ذرہ کہاں خورشید خوش فہمی ہے یہ اپنی
کہ خود کو جلوہ گاہ دوست کے قابل سمجھتے ہیں

بہار کس کا تبسم ہے کوئی کیا جانے
خزاں فسردگی کس کی ہے کوئی کیا جانے

ناآشنا ہیں فرق بہار و خزاں سے ہم
واقف ہیں اک فسردگی جاوداں سے ہم

خوناب دل کو بہنے دو آنکھوں کی راہ سے
پیدا ئی بہار کریں گے خزاں سے ہم

یہی انجام مسرت ہے کہ خنداں ہو کر
شاخساروں سے گرے پھول پریشاں ہو کر

دیکھیے حسن کا اعجاز کہ بے جاں ہو کر
آئینہ دیکھ رہا ہے انھیں حیراں ہو کر

رہ گئی عالم حیرت میں دم نظارہ
نگہ شوق نقاب رخ جاناں ہو کر

---

[۱] آثار مخدوم ۴۸

ارزاں سمجھ اگر غمِ الفت گراں ملے — نقصاں نہیں اگر عوضِ نقدِ جاں ملے
اے راہرو قدم نہ رکھ اس پر غرور سے — یہ خاک وہ ہے جس میں کئی کارواں ملے

قریبِ شاخِ گل ہوتی ہے جب دستاں سرا بلبل
ہمیں بھی بھولی بسری اک کہانی یاد آتی ہے
جوانی اور بوئے گل میں یا رب کیا تعلق تھا
کہ بوئے گل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

یوں زندگی سے مل کے جوانی جدا ہوئی — جیسے کوئی کسی سے سرِ رہ گزر ملے

وہی ہے فصلِ گل جب کھل گیا دل — بہار آنے کا اک موسم نہیں ہے

چمکے جگر کے داغ طلوعِ سحر کے ساتھ — پایا نہ ہم نے چین شبِ غم گزار کے

زوالِ حسن کو حسنِ نگار کیا جانے — خزاں قدم بقدم ہے بہار کیا جانے
لکھا ہے اس کے مقدر میں اضطرابِ دوام — قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے

کشتیٔ امید اپنی دورِ ساحل سے رہی — جب چلی بادِ موافق بادباں گم ہو گیا

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے — نمودِ شام سے پہلے جگر کے داغ جلے

ہو گیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو — مدتوں جس نے اڑائی دل کے ویرانے کی خاک

اس گل کی بو صبا! نفس دوست اے صبا!
غنچے سے بھی زیادہ ہوں دل تنگ آج کل

جس پہ رندوں کو گمانِ لغزشِ مستانہ تھا
پائے ساقی پر وہ اپنا سجدۂ شکرانہ تھا

پژمردہ جب سے ہے دلِ غم دیدہ کی کلی
میرے لیے ہیں ایک، خزاں کیا بہار کیا۔

اسیرِ حلقۂ گیسوئے خوباں ہو نہیں سکتا
وہ دل، تو جس کو تسکیں دے پریشاں ہو نہیں سکتا

مخدوم نے غزلوں سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ بچوں کے لیے انھوں نے 'بہارِ طفلی' اور 'بچوں کی دنیا' کے نام سے دو مستقل مجموعے تیار کیے تھے۔ وطنی اور سیاسی نظمیں 'کاروانِ وطن' میں آگئی ہیں۔ 'گنجِ معانی'، 'نیرنگِ معانی' اور 'شعلۂ نوا' میں غزلیں زیادہ ہیں۔ نظمیں زیادہ تر درسِ اخلاق و حکمت، مناظرِ فطرت، اور یادِ رفتگاں پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ان تینوں کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں ان کی نظمیں فکر و فن کے لحاظ سے ان کی غزلوں سے بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے موضوعات کے تنوع سے ان کی غیر معمولی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے نظمیں بہتوں نے لکھی ہیں لیکن محروم نے بچپن کی معصومیت اور بچوں کی نفسیات کا جیسا اور جتنا لحاظ رکھا ہے وہ کہیں اور مشکل ہی سے ملے گا۔ بچوں کی زبان سے محروم نے یہ دعا کی ہے:

حاضر ہیں تیرے در پہ پروردگار ہم بھی — ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی!
علم و عمل کا رستہ یا رب ہمیں دکھا دے — جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے
عقبیٰ کی سرخروئی دنیا کی کامگاری — حاصل ترے کرم سے ہم کو ہو ذاتِ باری

مناظرِ فطرت کی عکاسی میں محروم کو خاص ملکہ تھا۔ وہ لبادۂ قبا فطرت سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔ بادِ نسیم کے لیے اس سے بہتر کیا کہا جا سکتا ہے ؎

تاروں کی چھاؤں میں تو جو آتی ہے باغ میں
ٹھنڈک سی ڈال دیتی ہے لالے کے داغ میں

بندرابن کی صبح کی ایک جھلک دیکھیے:

صبحِ خنداں عروسِ تازہ — آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی — شانوں پر کاکلیں طلائی
ہر چیز کو پرتوِ سحر سے — قدرت نے رنگا ہے آبِ زر سے الخ

"آندھی" کا زور ملاحظہ ہو:

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے　بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر شمال سے　آتی ہے فوجِ دیو نظر جال ڈھال سے
روپوش اس کے خوف سے کوہ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رخِ آسماں ہوا

"آفتاب" کا جلوہ دیکھیے:

اے شمع دل فریب شبستانِ کائنات
تیری کرن کرن ہے رگِ جانِ کائنات
گزری ہے شب جہاں کو ترا انتظار ہے
ہر ذرہ جستجو میں تری بے قرار ہے
مرغانِ صبح خیز کی مشرق پہ ہے نظر
ہیں راہ دیکھتے تری واماندۂ سفر
چڑیوں کے دل میں پھر ہے چہکنے کی آرزو
کلیاں لیے ہوئے ہیں چٹکنے کی آرزو الخ

"بادِ بہاری چلی" کے یہ دو بند ملاحظہ کیجیے:

گلشن آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی　ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی　عطر اڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی　صبر اڑاتی ہوئی
پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی　درد اٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

حزنیہ اور المیہ شاعری کے نمونے کلام مخدوم میں بیوی اور اپنی دو بیٹیوں کی موت پر جو اشعار انھوں نے کہے ہیں وہ اردو ادب میں یادگار نوعیت کے ہیں، دو سالہ بچی "شکنتلا" کے ماتم کا انداز دیکھیے:

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں
اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک
یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا
آنکھوں میں آ گیا دلِ صد چاک کا لہو
پتھر یہ تجھ پہ دیکھ کے بھاری شکنتلا
ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر
کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

اقبال کا نوحہ اقبال کے شایانِ شان ہے:

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا　احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا
کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر　قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا
باغِ جہاں میں صورتِ گل ہائے تر رہا　باغِ جہاں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　روشن تر اس حقیقت روشن کو کر گیا
محروم کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو　یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

"نور جہاں کے مزار پر" محروم کی لافانی نظم ہے اس موضوع پر اس سے بہتر نظم اب تک نہیں لکھی جا سکی، اس کے چند بند ملاحظہ ہوں:

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلوؤں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

ہلال رضوی رامپوری

رحمت یا زحمت

ایک درویش ملے مجھ کو سرِ راہ گزر! بولے او بے خبر اپنی بھی ہے کچھ تجھ کو خبر
میں نے کی عرض کہ اک شاعرِ مخصوص نظر ہو تو جاتا ہوں کبھی خود سے بھی بیگانہ مگر
"جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے"
سُن کے اس بات کو کہنے لگے تو یہ تو بتا غور کر دل میں ذرا کچھ سوچ تو کمبخت ذرا
اس سے بڑھ کر بھی کوئی حادثہ غافل ہوگا بارھواں گھر میں ہوا ہے ترے "بچہ" پیدا
کون سے خاص گناہوں کا ہے بیکفّارا
تو ہے ماں باپ کا اک اور ترے بچے بارا
باپ بازار کو جاتے ہیں پسر گود میں ہے اک کمر پر ہے تو اک نورِ نظر گود میں ہے
ایک کے پاؤں بغل میں ہیں تو سر گود میں ہے اک اِدھر گود میں ہے ایک اُدھر گود میں ہے
واہ کیا نخلِ تمنا میں بہار آئی ہے
ہیں اُدر لوڈ تو ہر شخص تماشائی ہے
کہہ چکے جب تو کہا میں نے یہ تنقید ہے کیوں آج یہ طبعِ رواں مانعِ تولید ہے کیوں
ضبطِ اولاد کی اب ہم سے یہ تاکید ہو کیوں اپنے ہی قول کی فرمائیے تردید ہے کیوں
بڑھے اولاد یہ ہر در پہ صدا دیتے تھے
آپ تو ان کے اضافہ کی دعا دیتے تھے
بولے ہاں ٹھیک ہے سچ کہتے ہو تم یہ تو جناب وقت لیکن یہ بدل دیتا ہے قدروں کا حساب
اب جو ہوتے ہیں سوالی تو یہ ملتا ہے جواب پیٹ بچوں کا بھریں ہم کہ کریں کارِ ثواب
مانگنے والے سے پیسوں کو چھپا لیتا ہے
کوئی اب راہِ خدا میں بھی نہیں دیتا ہے
مصرفِ خیر بھلا کب ہے زمانے کی نظر فاتحہ ہے نہ کہیں اب نہ کہیں حلوۂ تر
اب جمعرات کبھی جانے لگی خالی اکثر ہاتھ پھیلائے ہوئے پھرتے ہیں مانگے در در
شانِ بخشش کی بڑے میں ہو نہ اب چھوٹے میں
ہم بھی ہیں کثرتِ اولاد سے اب ٹوٹے میں
سن چکا میں تو ہوا مجھ کو یہ فوراً ہی خیال کہہ نہ کر بیٹھیں کہیں مجھ سے یہ مسجد کا سوال
کیونکہ میں جانتا تھا اپنی بھی خود جیب کا حال ہے تو یہ سوئے ادب پھر بھی میں کہتا ہوں ہلال
یا رب ایسی بھی نہ اولاد کی کثرت ہو جائے
اتنی رحمت نہیں درکار کہ زحمت ہو جائے

اسحاق ملک

نئی غزل کی مہک

(جاں نثار اختر کی یاد میں)

اُسے شرحِ وفا لکھوں
اسے حرفِ جنوں لکھوں
نئے لہجے کی رنگینی لکھوں
لکھوں تو کیا لکھوں
غزل اس نے لکھی ایسی نئی، ایسی تر و تازہ
سنی جس نے دعائیں دیں
پڑھی جس نے بلائیں لیں
وہ "پچھلے پہر" "خاکِ دل" میں "گھر آنگن" میں روشن تھا
تو لگتا تھا خرابے میں بہاریں رقص فرما ہیں
"اشارت کیا، عبارت کیا، ادا کیا"
وہ شخصیت سراپا فکر و فن، نغمہ، محبت
ہمارے عہد میں سرچشمۂ اخلاص و الفت تھی
وہ اب ہم میں نہیں لیکن
سخن کی چاندنی، خوشبو، مہک نزدیک لگتی ہے

رام لعل

دیارام اخبار والا

(افسانہ)

دیارام جانتا تھا کہ اس کا کوئی بھی پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ یہ اس کا محض وہم ہے کہ وہ ہر وقت محسوس کرتا ہے کوئی اس کے پیچھے پیچھے ضرور لگا ہوا ہے۔ اسے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں ہے۔ اسے پہلے پہل یہ وہم کب ہوا تھا! شاید بچپن سے ہی جب وہ اسکول جانے سے جی چراتا تھا اور کندھے کے ساتھ کتابوں کا تھیلا لٹکائے گھر سے نکلتا تو اس کی خواہش ہوتی کسی ایسی گلی یا بجریا کی طرف گھوم جائے جو اسکول کی طرف نہ جاتی ہو۔ لیکن وہ جب بھی ایسا ارادہ کرتا اور مڑ کر پیچھے دیکھتا تو اپنے باپ کو پیچھے پیچھے ہی آتا ہوا دیکھتا تھا۔ سر پہ لکڑی کا پرانا بکس رکھے اور پیٹھ پر بیشمار پھٹے پرانے جوتوں اور چمڑے کی کترنوں کا ایک بورا بھی لادے ہوئے۔ اس کے خالی ہاتھ میں لوہے کا وہ فریم بھی ہوتا جس کے کئی رخ تھے اور اس پر جوتوں کو رکھ کر وہ ان کی مرمت کیا کرتا تھا۔ کبھی کیلیں ٹھونکتا، کبھی سلائی کرتا تھا۔ دیارام کو اس اوزار سے بہت ڈر لگتا تھا۔ کیونکہ ایک بار اس کے باپ نے غصے میں آکر اس کی طرف پھینک دیا تھا جب وہ اسکول جانے سے انکار کر رہا تھا۔ لوہے کا فریم اس کے ٹخنے پر آ لگا تھا اور اس کے ٹخنے کی ہڈی چور چور ہو گئی تھی۔ وہ کئی روز تک اسپتال میں پڑا رہا تھا۔ پھر کئی مہینوں تک پورے پاؤں پر پلاسٹر لگا دیئے جانے پر وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ جب پلاسٹر کاٹ دیا گیا تھا تب بھی وہ کسی قدر لنگڑا کر ہی چل پاتا تھا۔ لنگڑا کر چلنے کا نقص ابھی تک باقی تھا۔ اس کے بعد اس کے باپ نے اسے کبھی نہیں مارا تھا۔ وہ اس کی طرف بس گہری نظر سے ہی تاکتا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں اس سے کہتا ہو — کچھ پڑھ لکھ لے بیٹا۔ ورنہ میری طرح جوتیاں ہی گانٹھتا رہ جائے گا۔!

اس کا باپ شاید یہی خواب دیکھتے دیکھتے ایک دن اچانک اپنے فٹ پاتھ کے اڈے پر ہی مر گیا تھا کہ اس کا بیٹا تعلیم پا کر ایک روز بڑا آدمی بن جائے گا یا کسی دفتر کا بابو جس طرح اس کی برادری کے کئی اور لوگوں کے بیٹے بن گئے تھے۔ لیکن دیارام بڑی مشکل سے آٹھ جماعتیں ہی پاس کر پایا تھا اور اس کے بعد اپنے ایک پڑوسی سرجو کی سفارش سے ایک دفتر میں چپراسی بن گیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ اپنے کاندھے پر فائلوں کا بستہ اٹھائے اٹھائے جب صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا تھا تو اس وقت بھی اسے کوئی انجانی پرچھائیں تعاقب کرتی ہوئی لگتی تھی۔ وہ کون تھا؟ اس کا اس طرح پیچھا کیوں کرتا پھرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

اسی زمانے میں اس نے اپنے محسن سرجو کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا جو بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گیا تھا وہ اخباروں کا ہاکر تھا۔ دیارام انہی کے پاس شہر میں رہتا تھا۔ سرجو اور اس کی بیوی کے پاس، جو اب زیادہ تر وقت اپنے آدمی کے ساتھ اسپتال میں بتاتی تھی۔ صرف دو وقت کا کھانا اور ناشتہ ہی بنانے کے لیے کچھ دیر گھر چلی آتی تھی۔ ان کی مدد کرنے کے لیے دیارام تڑکے ہی اٹھ کر چھاپے خانوں میں پہونچ جاتا۔ اخبارات کے بڑے بڑے بنڈل سائیکل کے آگے پیچھے باندھ لیتا اور سرجو کے بندھے ہوئے دو سو کے قریب گاہکوں کے گھروں پر پہونچا دیتا۔ راستے

میں "اخبار، اخبار" چلاتا ہوا بھی جاتا جس طرح وہ سرجو کو کرتا ہوا دیکھا
کرتا تھا۔ کچھ اخبار اس طرح بھی بک جاتے تھے۔ یہ کام وہ بڑی آسانی
سے نو ساڑھے نو بجے تک ختم کر لیتا تھا۔ اس کے بعد ناشتہ پانی
کر کے دفتر چلا جاتا۔ سرجو کی بیوی اس کے لیے ناشتہ پانی
تیار کر کے انتظار کرتی ہوئی ملتی تھی۔ اس کی جوان خوبصورت
آنکھوں میں شکر گزاری کی بے پناہ چمک بھی ہوتی جسے وہ اس کے
ماتھے تک کانے گھونگھٹ میں سے بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ ان کے پاس
عرصہ ڈیڑھ سال سے رہ رہا تھا لیکن سرجو کی بیوی اب بھی اسی
سے کانا گھونگھٹ ضرور کرتی تھی۔ وہ بھی اس کی طرف پوری طرح
سر اٹھا کر کبھی نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ جھکی جھکی نظروں سے
ہی اس کے سامنے آتا تھا۔ پر تو کبھی کبھار ہی ہو جاتا کہ وہ ایک
دوسرے کے سامنے اچانک آ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف
کچھ لمحوں تک بڑی حیرانی سے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اس کے بعد
چمپیا فوراً ماتھے پر گھونگھٹ کھینچ لیتی اور دیارام سر جھکا لیتا۔

سرجو کی بیوی چمپیا اس سے کچھ برس بڑی ہی تھی۔ اس
لحاظ سے تو اُسے دیارام سے اس طرح پردہ نہیں کرنا چاہیے
تھا جب کہ وہ اُس کے گھر میں ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے
رہا کرتا تھا۔ لیکن عورتوں میں کچھ جھجک فطری ہوتی ہے جس سے
وہ بچ نہیں سکتیں یا شاید یہ جھجک اُن کی اندرونی کیفیتوں کی
بھی غماز ہوتی ہے! جن کے بارے میں وہ اکثر سوچتی ہیں اُن
کا سامنا ہو جانے پر پردہ کرنے کی بھی کوشش ضرور کرتی ہیں۔
دیارام کو یہ سوچ کر ہنسی آتی تھی کہ ابھی پچھلی ہولی پر اسی
چمپیا نے کتنی شوخی سے اُس پر رنگ ڈالا تھا اور اس نے بھی
سرجو کے سامنے ہی ہاتھوں بھر گلال مل کر اس کے پورے
چہرے پر پوت دیا تھا۔ سرجو تو یہ دیکھ دیکھ کر زور زور سے
ہنستا رہا تھا لیکن وہ چمپیا کے جوان گداز جسم کا اچانک لمس
پا کر کانپنے سا لگا تھا۔ چمپیا بھی اب بھرے سر پہ بھیگی ہوئی دھوتی
لے کر اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لیے اپنے اندر
کی خوشی کو چھپا لینا کتنا آسان ہو گیا تھا، جسے کوئی بھی نہیں
دیکھ سکتا تھا۔ نہ سرجو نہ وہ۔ چمپیا نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہی کہہ دیا تھا ——
"لالہ، اگلے برس اسی طرح اپنی دلہنیا کے ساتھ ہوری کھیلنا۔ کہو تو ڈھونڈ
لاؤں ایک سندر سی لڑکی؟"

دیارام گھبراہٹ کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دے سکا
تھا لیکن سرجو نے اپنی ہتھیلیوں پر تمباکو تھپتھپاتے ہوئے
کہا تھا —— "اری اس سے کا پوچھت ہے۔ تیری نجر میں
کوئی چھوکری ہے تو اُس کا اتا پتا بتا، ہم ابھئیں بارات لے
کر اُس کے گھر پہنچ جاتے ہیں!"

بات ہنسی مذاق میں ہی اُڑ گئی تھی۔ لیکن دیارام کو یقین
ہو گیا تھا چمپیا اُس کے لیے ضرور کوئی لڑکی ڈھونڈ نکالے گی۔
جو آٹھویں درجہ پاس دفتر کے چپراسی کی بیوی بننا سویکار
کرے گی۔ وہ اب ہر روز رات کو اپنی کوٹھری میں لیٹتا تو
سونے سے پہلے اسی لڑکی کے خواب دیکھتا تھا۔ کھلی آنکھوں
سے، جب تک اسے نیند آ کر دبوچ نہیں لیتی تھی۔ لیکن جب
سے سرجو اسپتال میں جا پڑا تھا دیارام کو اپنے محسن اور سرپرست
سرجو کی بیوی سے ایک خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ کیونکہ
اس نے اب اس سے پردہ کرنا اچانک چھوڑ دیا تھا۔ جب وہ
اس کے سامنے اکیلی ہوتی تو پہلے کی طرح ماتھے پر گھونگھٹ
نہیں کھینچتی تھی۔ اس قسم کا تکلف وہ صرف سرجو کی موجودگی
میں ہی کرتی تھی جب وہ اس سے اسپتال میں ملنے جاتا تھا۔
سرجو کی غیر موجودگی میں تو وہ اس سے اس قدر بے تکلف ہو
جاتی تھی کہ کوئی اور دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا وہ اسی کی جورو ہے!
دیارام گھبرا اٹھا۔ وہ اچانک ان کا گھر چھوڑ کر گاؤں چلا
گیا۔ اپنی نوکری سے کئی مہینوں تک غیر حاضر رہا —— دیارام
نے اخبار بیچنے کی جو خدمت خود ہی سنبھال لی تھی وہ بھی چھوڑ
دی لیکن گاؤں میں پڑے پڑے رہنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا
تھا۔ نوکری چھوٹ چکی تھی —— پیٹ بھر روٹی کمانے کے
لیے کچھ نہ کچھ کرنا تو ضروری تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا اُسے اخبار
ہی بیچنے چاہئیں۔ اخبار بیچنے کا کام پھر اس گرہن کرنے سے کہیں

آسان اور دلچسپ تھا لیکن یہ کام وہ شہر میں جاکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہاں جاکر اُسے سسر جو اور اُس کی بیوی کا سامنا کرنا پڑتا جن سے اسے ڈر لگتا تھا۔

اس نے شہر اور گاؤں کے بیچ پھیلے ہوئے فاصلے کا جائزہ لیا۔ اس بیس کلومیٹر لمبی سڑک کے آس پاس بکھری ہوئی آبادی تھی۔ کچھ پرانے مکان تھے کچھ نئے مکانوں کا سلسلہ حکومت نے شروع کر دیا تھا تاکہ شہر کی آبادی کم ہو اور لوگ گاؤں کے قریب رہنا سیکھیں، اُن میں رہنے والے شہر جاکر ہی نوکری کرتے تھے۔ وہ کتنے لوگوں کو صبح سویرے سائیکلوں پر شہر کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اور شام کو ادھر سے واپس آتے ہوئے بھی۔ ان میں کئی ایک گھروں میں ریڈیو اور ٹرانزسٹروں سے نغمے بھی گونجتے تھے۔ پرانی اور نئی نسل کے لوگ سائنس کی اس دین سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے دیارام نے دیکھا تھا کہ اگر کسی کے ہاتھ اچانک کوئی پرانا اخبار یا باتصویر رسالہ لگ جاتا تو وہ اسے گھنٹوں بیٹھ کر چاٹتا تھا۔ گاؤں والوں کے اندر بھی پڑھنے کی بھوک جاگ اٹھی تھی۔ یہ بھوک شہر والوں کے یہاں تو بہت زیادہ تھی جسے وہ دیکھ چکا تھا۔

دیارام تجربے کے طور پر شہر سے بیس پچیس اخبار اور کچھ باتصویر رسالے لے آنے لگا۔ جب وہ سائیکل پر سوار ہوکر آواز لگا لگا کر گاؤں والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا تو لوگ بڑی دلچسپی سے اس کی طرف تاکتے۔ بچے بالے تو اسے گھیر لیتے جو بڑی عمر کے بچے اسکولوں و کالجوں میں پڑھتے تھے وہ تو بہت ہی خوش نظر آتے۔ جو لوگ اخبار پڑھنے کے عادی تھے وہ تو اس کے فوراً خریدار بن گئے۔ جن کی عادت ابھی خرید کر پڑھنے کی نہیں بنی تھی وہ مفت میں ہی اس کے اخبار اور رسالے پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ دیارام انھیں منع نہیں کرتا تھا بلکہ خود ہی ان کے آگے اخبار کر دیتا۔ وہ جان گیا تھا جن لوگوں کو ایک بار اخبار پڑھنے کا چسکا لگ جائے گا وہ اس سے پھر بچ نہیں سکیں گے۔ ان میں سے کئی ایک اس کے مستقل گاہک بن جائیں گے۔ لیکن اس کو سب سے بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی تھی کہ جو لوگ مستقل اخبار پڑھتے تھے وہ دیش بدیس کے بارے میں کئی طرح کا علم حاصل کرکے پہلے سے زیادہ ذہین بھی نظر آنے لگے تھے وہ اس کی عزت بھی کرتے تھے، جیسے انھیں احساس ہو چکا ہو کہ ان کے علم میں اضافہ کرنے کا وہی ایک ذریعہ ہے۔

دیارام کی آمدنی بڑھنے لگی۔ وہ اور زیادہ تعداد میں اخبار لانے لگا۔ بلکہ اس نے اپنے لئے ایک مستقل اڈہ بھی ڈھونڈ لیا۔ صبح سویرے گھروں پر اخبار بانٹ آنے کے بعد وہ بس اسٹاپ پر جاکھڑا ہوتا۔ جہاں کچھ بسیں یا ٹمپو ٹیکسیاں کچھ دیر کے لیے رُک جاتی تھیں، سواریاں اُتارنے اور چڑھانے کے لیے۔ وہاں بھی کچھ اخبار بک جاتے تھے۔ دوسرے گاؤں کے پاس کچھ فیکٹریوں کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ اسی کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ بسوں، ٹمپو ٹیکسیوں اور ٹرکوں کے علاوہ موٹریں بھی آنے لگی تھیں۔ بس اسٹاپ پر جب لوگوں نے چائے اور پان سگریٹ کے اسٹال لگانے شروع کیے تو دیارام نے بھی ایک اسٹال لگوا لیا۔ مستقل اسٹال بن جانے کی وجہ سے بہت سے لوگ جو بسوں اور ٹیکسیوں کی انتظار میں کھڑے رہتے تھے اس کے اسٹال پر جمع ہو جاتے۔ کچھ نہ کچھ بکری تو یقیناً ہو جاتی تھی لیکن اس بھیڑ کے بے شمار چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے ایک خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ وہی انجانا خوف ــ ان میں سے کوئی ایک چہرہ اچانک اسے پہچان لے گا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دُھندلی یادوں میں کھویا ہوا چہرہ ایک بار تو اسے ٹیکسی میں بیٹھا ہوا اپنا صاحب بھی نظر آیا تھا جس کی نوکری اُس نے چھوڑ دی تھی۔ لیکن وہ اُسے پہچان نہیں پایا تھا، اخبار لے کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی تھی۔ کیا وہ اس قدر بدل گیا ہے کہ اُسے اُس کا صاحب پہچان ہی نہیں سکا ہے! یہ صحیح تھا کہ وہ پانچ سال اور بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں لیکن پھر بھی وہ تھا تو وہی آدمی! گاؤں کے لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ اخبار

والا بھی جوڑ لیا تھا۔ اب کوئی اُسے آدھے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ اس نے بھی اب اخبار والا کو اپنے نام کا ضروری حصہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اُسے کچھ خوشی بھی محسوس ہوئی تھی جیسے وہ پہلے ادھورا تھا۔ اب مکمل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب چائے اور پان سگریٹ والوں نے اپنے اسٹال کی پہچان کے لیے سائن بورڈ بنوا لیے تو دیارام نے بھی ایک چھوٹا سا سائن بورڈ بنوا لیا جس پر لکھا تھا "دیارام اخبار والا" اور پھر ایک دن بسوں، ٹمپو ٹیکسیوں اور مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک بے ہنگم شور مچاتی ہوئی موٹر سائیکل نمودار ہوئی جس پر دو لوگ سوار تھے۔ موٹر سائیکل سوار بڑی حیرت سے اس کے اسٹال پر لگے سائن بورڈ کو پڑھتا رہا اور اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی دھوتی میں ملبوس اور آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھائے ہوئے عورت اس کے چہرے کی طرف تاکتی رہی۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

پھر وہ دونوں جیسے خوشی سے اچھل پڑے۔ انھوں نے اس کے بڑی بڑی مونچھوں کے پیچھے چھپے ہوئے بچپن کے چہرے کو بھی پہچان لیا۔ سرجو نے اس کے سر پر ایک دھول جما کر کہا ——— "سالا ہم سے بھاگ کے کہاں جائے گا ——— ؟ ڈھونڈ ہی لیا نہ آخر!"

اُس نے آگے بڑھ کر چمپا کے پاؤں چھوئے تو چمپا نے حسب عادت اپنے ماتھے تک گھونگھٹ کھینچ لیا لیکن مسکرا کر بولی ——— "ارے، یہ تو اپنا دیارموا ہے!"

دیارام نے اُن سے اُن کے گھر سے اچانک بھاگ آنے کے لیے معافی مانگی اور ان کے لیے ٹی اسٹال سے چائے اور بسکٹ منگوائے اور جب اُن کی سگریٹ و پان سے بھی تواضع کر چکا تو ان سے ڈرتے ڈرتے ہی پوچھا ——— "آج آپ لوگ اِدھر کیسے نکل پڑے؟"

سرجو نے اسٹال سے ذرا فاصلے پر منھ سے لمبی پیک پھینکتے ہوئے کہا ——— "ہم لوگ بدرپور کے فیکٹری ایریا کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں کئی ہزار آدمیوں کی آبادکاری ہو گئی ہے۔ وہاں تک اخبار وغیرہ سپلائی کرنے کا وچار کیا ہے۔ لیکن تم چکرمت کرو ہم تمھارے ساتھ یہاں کمپی ٹیشن ہرگز نہیں کریں گے۔ بلکہ ایسا کرو تم ہمارے ساتھ ساجھے داری کر لو ——— نام تمھارا ہی چلتا رہے گا۔ ہم تمھیں صبح پہلی بس سے اخباروں کے بنڈل بھجوا دیا کریں گے۔ وہاں تک جانے کے لیے موٹر سائیکل بھی ادھار دلوا دیں گے۔ سمجھے! اور کمیشن آدھا آدھا! منظور؟"

دیارام نے پہلی بار اپنے اسٹال کے سامنے لیٹی ہوئی اس سرمئی سڑک کو غور سے دیکھا جو شہر سے آکر آگے نکل جاتی ہے اسی کی وجہ سے شہر کی تہذیب کا اژدہا بھی۔ رینگتا رینگتا اس کے گاؤں تک اور پھر اس گاؤں سے بھی بہت آگے نکل گیا ہے۔ کہیں یہ وہی اژدہا تو نہیں ہے جو اس کا پیچھا کرتا رہتا تھا اور وہ اس سے ڈر کر آگے ہی آگے بھاگتا پھرا تھا! وہ تو اُس سے بھی آگے جا چکا ہے۔ جس کا پیچھا کرنے کے لیے سرجو اَب اس کو اُکسا رہا ہے۔!

دیارام نے کسی قدر جھجک کے ساتھ پہلے سرجو کی طرف دیکھا پھر چمپا کی طرف جو آنکھوں پر ابھی تک کالا چشمہ چڑھائے اور ماتھے تک گھونگھٹ کھینچے اسی کی طرف دیکھ دیکھ کر بڑی اپنائیت سے مسکرا رہی تھی۔ وہ بولی ——— "سوچت کا ہو بھیا؟ ہاں کہہ ڈارو اب ——— اس سے تمھار کاروبار نہ پھیلی؟ اس کے بعد تمھاری سادی بھی تو رچاؤں گی۔ تم سے کہا تھا نا! ایک لڑکی دیکھ لی ہے میں نے۔ ہاں!"

وہ دونوں زور سے ہنس پڑے تو دیارام کو بھی ان کے ساتھ ساتھ ہنستے ہی بن پڑی۔

★

باوا کرشن گوپال مغموم

جوش ملسیانی

۱

متزلزل ہے قصرِ اردو کا — وہ ستونِ ادب گرا ہے آج
رحلتِ جوش ملسیانی پر — محشرِ رنج و غم بپا ہے آج

۲

ہوگئی کم چراغِ علم کی ضو — محفلِ شعر میں ہے ظلمت سی
پیکرِ غم ہیں جملہ اہلِ نظر — اہلِ دل پر ہے ایک وحشت سی

۳

وہ جو ستر برس سے جاری تھا — چشمۂ فیضِ شعر بند ہوا
تشنہ کامانِ فن کہاں جائیں — آسماں درپئے گزند ہوا!

۴

سرنگوں ہے غزل کا پرچم آج — آخری یادگارِ داغ مٹی
چھاگئی یوں زبان وفن پہ خزاں — دم زدن میں بہارِ داغ مٹی

۵

اٹھ گیا وہ مزاج دانِ غزل — فن پہ جس کو عبورِ کامل تھا
دے گیا سب زبانِ اردو کو — جو زبان و بیاں کا حاصل تھا

۶

عمر بھر کے ریاضِ پیہم سے — نورِ پاکیزگی غزل کو دیا
اور وجدان و ذوق سے اپنے — حسنِ شائستگی غزل کو دیا

۷

ماہرِ کاملِ نکاتِ عروض — وہ رموز آشنا فصاحت کا
ہوگیا راہیِ عدم، افسوس! — وہ جو نباض تھا بلاغت کا

۸

اُس کا اصنافِ شعر پر قابو — اُس کی تاریخ گوئی کامل
اُس کے رُتبے کا اب کہاں ہوگا — صاحبِ فن و شاعرِ فاضل

۹

ایک نقادِ بے بدل تھا وہ — اک ادیبِ شہیر تھا مرحوم
نکتہ سنجی میں، نکتہ فہمی میں — آپ اپنی نظیر تھا مرحوم

۱۰

بزمِ شعر و سخن میں تحت اللفظ — اُس کے پڑھنے کا باوقار انداز
چھا ہی جاتی تھی ہر "ترنم" پر — سرِ محفل وہ گونجتی آواز

۱۱

نثر و نظم و غزل کے میداں میں — سخت مشکل تھی ہمسری اس کی
مانتے تھے اکابرِ اردو — اک زمانے سے رہبری اس کی

۱۲

محترم المقام ہو کر بھی — سر بسر سادگی کا پیکر تھا
کبر و نخوت کی بو نہ تھی اس میں — وہ کہ انسانیت کا مظہر تھا

۱۳

نامِ پنجاب اس سے روشن تھا — فخرِ ہندوستاں تھی ذات اسکی
واہ رے! اس کی رفعتِ کردار — کتنی اونچی تھی بات اسکی

۱۴

محسنینِ ادب میں ہے جاوید — نامِ نامی ابوالفصاحت کا
اور تاریخِ فن میں چمکے گا — ایک اک نقش اس کی عظمت کا

سیّد محمّد امین

مومن کی قصیدہ گوئی

مومن اپنے معاصرین میں ایک اہم حیثیت کے حامل تھے۔ بحیثیت غزل گو تو ان کا ایک منفرد مقام ہے ہی، قصیدہ گوئی میں بھی ان کا اپنا الگ مقام ہے۔ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ مومن پر سیر حاصل کام نہیں ہوا۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ان چند مقتدر نقادوں میں ہیں جنھوں نے مومن پر کام کیا۔ زیر نظر مضمون میں مومن کی قصیدہ گوئی کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیات مومن میں قصائد کی مجموعی تعداد کل نو ہے، جن میں ایک حمد، ایک نعت، پانچ خلفائے راشدین کی منقبت ہیں۔ ایک محمد وزیر خاں والیِ ٹونک اور دوسرا قصیدہ مہاراجہ پٹیالہ کے بھائی راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں ہے۔ مومن نے کوئی قصیدہ حصولِ زر یا صلے کی غرض سے نہیں لکھا۔ آخر الذکر دونوں مدحیہ قصائد کی نوعیت بھی یہی ہے۔ والیِ ٹونک نواب محمد وزیر خاں کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس میں اپنی عدم حاضری کی معذرت کی گئی ہے اور راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں جو ہے اس میں مومن نے بلا طلب عطیہ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے کسی رئیس یا بادشاہ کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ اس کی اہم ترین وجہ ان کی خودداری اور غیور فطرت تھی۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے یہ چند جملے مومن کی قصیدہ گوئی کے سلسلے میں بہت اہم ہیں:

"مومن سے پہلے جس قدر شعرا گزرے ہیں (باستثنائے سودا) مومن کا کوئی ہمسر نہیں ہے اگرچہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ ان کی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر قصیدہ میں تعلّی اور شکایت زمانہ کہ سنت الشعرا ہے، اس شکوہ اور زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے۔ تخلیص یا گریز البتہ نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔ کلام میں عقیدت کی جھلک اکثر نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں مذہبی تعریض بھی کر جاتے ہیں۔ کلام میں علمی مضامین بکثرت لاتے ہیں۔ ...... کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں اور عربی جملوں کی تو اس خوبی سے تضمین کر جاتے ہیں کہ انگوٹھی میں نگینہ کا گمان ہوتا ہے[1]"

مومن نے فارسی شعرا یا سودا کے قصائد کی تقلید نہیں کی بلکہ مجتہدانہ طرز اختیار کرتے ہوئے خود اپنے لیے نئی نئی زمینوں

---

[1] مجموعۂ قصائد مومن مرتبہ ضیاء احمد بدایونی۔

کی تلاش کی ہے۔ ان کے دو قصائد چھوٹی بحروں میں بھی ہیں۔ ان سے پہلے سودا کے چھوٹی بحروں میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ مومن کے بعض قصائد مشکل زمینوں میں بھی ہیں۔ ایک قصیدے میں انھوں نے ردیف کا بھی اہتمام کیا ہے۔ ان کے قصائد کی زمینیں یہ ہیں:

۱۔ اَلْحَمْدُ لِوَاہِبِ الْعَطَایَا
اس شور نے کیا مزا اٹھایا

۲۔ چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس
کہ جیسے صبح شبِ ہجر نالہائے خروس

۳۔ کوئی اس دور میں جیے کیونکر
ملکُ الموت ہے ہر ایک بشر

۴۔ جو اس کی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل
تو بوالہوس کا کبھی ہرگز نہ چھوٹے دل

۵۔ ہے یہی صورتِ دیدار تو مرنا دشوار
دم شماری کی مری عمر ہے تا روزِ شمار

۶۔ کٹتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ
کیونکہ سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

۷۔ چاہیے خلق کو صہبائے صنم سے محروم
ایسی نیت سے ہے بہشت آپ کو اے واعظ معلوم

۸۔ یاد ایامِ عشرتِ فانی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

۹۔ صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

قصیدے کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے اور مطلع سے شاعر کے کمالِ فن کا اظہار ہوتا ہے۔ مومن کے قصائد میں بعض مطلعے بہت پر شکوہ ہیں اور بلا شبہ عمدہ مطلعوں کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ دو مطلعے:

ع صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

ع کٹتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ
کیونکہ سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

ان مطلعوں میں نازک خیالی بھی ہے اور قصیدہ کا لب و لہجہ اور شان و شکوہ بھی۔ اس کے علاوہ ان میں بلند آہنگی اور زورِ بیان کے ساتھ ساتھ جو روانی ہے اس سے بھی قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قصیدے کا پہلا حصہ یعنی تمہید تشبیب کہلاتی ہے۔ مومن نے اپنے قصائد کی تشبیبوں میں وارداتِ حسن و عشق، مناظرِ فطرت، کائنات، رندی و میخواری، گردشِ چرخ کا گلہ، شکایتِ زمانہ، تغیراتِ مملکت، اپنی ہنرمندی اور زمانے کی ناقدری کے مضامین نظم کیے ہیں۔ ان کے بیشتر قصائد بزرگانِ دین کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ ان قصائد میں بھی مومن نے عاشقانہ اور رندانہ تشبیب روا رکھی ہے۔ مومن کے اکثر قصائد کی تشبیبوں میں موضوع کے اعتبار سے غزل کا سا انداز ملتا ہے جو در اصل تشبیب کی خوبی ہے کیونکہ لفظ 'تشبیب' 'شباب' سے مشتق ہے اور عشق کے مضامین پر دلالت کرتا ہے۔ عشقیہ تشبیب کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

تم اور حسرتِ ناز، آہ کیا علاج کروں
میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوریِ منزل
یہ کیا غضب ہے کہ تم کو تو ربط غیر سے اور
مجھے یہ حکم کہ زنہار تو، کسی سے نہ مل
(قصیدہ در منقبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)۔

دوسری جگہ مومن تشبیب میں لکھتے ہیں:

ہے یہی صورتِ دیدار تو مرنا دشوار
دم شماری کی مری عمر ہے تا روزِ شمار
بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ
رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار

دور اتنے رہے محرومیٔ قسمت سے کہ ہم
سمجھے ہندی صنموں کو بھی بتانِ فرخار

(قصیدہ در منقبت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)

راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تشبیب میں اپنی بدقسمتی کا بیان کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں:

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری
چشم ستارۂ سحر لوں زحل سے سرمہ سا
دشنۂ ترک چرخ سے تیز نگاہ مشتری
مجھ کو فغاں سے کام اور ذکر میں اہلِ خانقاہ
دیر میں شور بدخواں میکدہ میں توانگری

حضرت علی کی شان میں مدحیہ قصیدے کی تشبیب فخریہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کشتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ
کیونکہ سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ
میرے نفس کی دیکھ کے معجز نمائیاں
کیا دور ہے کہ دم نہ رہے درمیانِ تیغ
فردوسی ایک خار جنانِ بیان تھا
گلریز میرے دم سے ہوئی داستانِ تیغ
میدانِ کشت و خوں میں مرادست نے سدا
جادے عناں کشیدہ تو ہو ہم عنانِ تیغ

نعتیہ قصیدے کی تشبیب مضمون کے اعتبار سے بہاریہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نوائے طوطیِ شکر فشاں کی لذّت سے
سماع و رقص میں اہلِ مذاق جوں طاؤس
نیاز صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط
بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرضِ شموس
نہ ہے فریبِ صفا، خاک بیز ہے گلچیں
پڑے جو وسعتِ گلزار میں گلوں کے عکوس
ہجوم سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی
زمیں پہ چادرِ مہتاب بن گئی ہے سدوس

مومن کی تشبیب اکثر کافی طویل ہوتی ہے۔ ان کے قصائد میں تشبیب کے اشعار تقریباً مدحیہ اشعار کے برابر ہوتے ہیں۔ مومن کی تشبیب ان کے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں بہت اعلا اور بلند مرتبہ ہوتی ہے۔ ان کے بعض قصائد کی تشبیب میں جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا تغزل کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ مومن نے بڑی کامیابی کے ساتھ تغزل کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے قصیدہ کی شان و شوکت اور بلند آہنگی کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ مومن نے جو قصیدہ نواب محمد وزیر خاں والیٔ ٹونک کی مدح میں لکھا ہے، اس کی تشبیب میں تغزل کا انداز ملاحظہ ہو:

یادِ ایّامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں جنت میں کس کو صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی

مومن نے تشبیب میں تعلّی اور ناقدریِ زمانہ کے مضامین بھی بڑی قدرت اور زورِ بیان کے ساتھ باندھے ہیں اور خصوصاً فخریہ اشعار میں ان کا لب و لہجہ قصیدہ گوئی کی اس اعلا منزل پہ پہنچ جاتا ہے۔ جہاں تک صرف سودا کی رسائی ہے بلکہ بعض اوقات تو قدرتِ بیان، جدّتِ خیال اور معنی آفرینی میں وہ سودا سے بھی آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قصیدہ کا دوسرا حصّہ گریز کہلاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے شاعر تشبیب سے گریز کر کے اصل موضوع مدح کی طرف آتا ہے۔ اس حصے کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ تشبیب سے مدح کی طرف اس طرح گریز کیا جائے کہ فطری معلوم ہو اور تصنع نہ پیدا ہونے پائے۔ علماء نے اسے دو سرکش بیلوں کو ایک جوے میں جوتنے سے تعبیر کیا ہے۔

مومن کے ہاں گریز اگرچہ اُن کے قصائد کی دوسری خصوصیتوں کی طرح پُر زور نہیں لیکن وہ تشبیب اور مدحیہ

حصّے کو ایک دوسرے سے چسپاں کر دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض قصائد کے گریز کے اشعار ملاحظہ ہوں :

ہوا ہے کون سی ایسی مگر مدینہ کی دم مسیح کو ہے جس کی حسرت پابوس
شرف مدینہ کو جس سے ہے، ہو نہ ہو وہ ہے جسے بتاتے ہیں محبوب حضرت قدوس

حضرت علی کی مدح میں قصیدے کی تشبیب میں اپنی شاعری کی تعریف کرتے کرتے اس طرح گریز کرتے ہیں :

مومن کو آرزوے ثواب جہاد ہے کفار کاش آ کے بنیں امتحان تیغ
آئی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار لے جاؤ منکروں کے لئے ارمغان تیغ

مدح، جو عام طور پر قصائد کی جان ہوتی ہے، مومن کے یہاں عروج کمال پر ہے۔ مدحیہ حصے میں جو ندرت، جدت اور نازک خیالی مومن کے یہاں ملتی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کے قصائد کی مدح میں جوش و ولولۂ عقیدت اور خلوص کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کے قصائد کی مدح کو پڑھ کر ان کی سچی عقیدت اور حقیقی خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عثمان کی مدح کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں :

لطف سے اس کے زمیں غیرتِ باغِ فردوس
خلق سے اس کے زماں رشکِ دکانِ عطّار
کرّہ آب ہو گر قطرۂ عمّان ہمسر
صدف چرخ کرے شکوۂ طغیانِ بحار
اس کے تمکیں سے اگر کوہ کو دیجے تشبیہ
ہے یقیں شعلۂ جوّالہ کو آجائے قرار

حضرت علیؓ کی شان میں مومن اس طرح مدح سرا ہیں :

وہ آنچ تیری تیغ میں جل جائے مثل طور
گر ترے ستم کدہ پہ کرے امتحانِ تیغ
حسرت ہے تیرے بوسۂ دستِ بلند کی
کس طرح چرخ پر نہ چڑھے کہکشانِ تیغ
دشمن کا ایک نیم اشارے میں کام ہو
ابرو کا تیرے عکس پڑے گر میانِ تیغ

مومن کے ان مدحیہ قصائد سا جو اجیت سنگھ اور نواب محمد وزیر خاں کی مدح میں ہیں۔ ان میں مومن بھی بعض جگہ دوسرے قصیدہ گو اردو شعرا کی طرح بہک گئے ہیں اور اپنے ممدوح کی شان میں ایسی مدح سرائی کی ہے جو مومن جیسے غیور طبیعت شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ مثلاً محمد وزیر خاں کی مدح سرائی کرتے ہوئے مومن لکھتے ہیں :

اوّل اس در پہ سجدہ ریزی کر
تا ملے مفت جاہِ کیوانی
پھر طوافِ حرم میں ہو مشغول
تیرے صدقہ شرطِ ایمانی

لیکن ان خامیوں کے باوجود ہم اس بات سے منکر نہیں ہو سکتے کہ مومن کی مدح بے حد پُر اثر اور جاندار ہوتی ہے اور مومن کی نازک خیالی اور قدرتِ بیان کا مظہر ہوتی ہے۔ یوں بھی مدح پر استدلال کرتے وقت ہمیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ان جملوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو انھوں نے قصائد مومن مع شرح مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مقدمہ میں لکھے ہیں :

"قصیدہ نگار کے لیے ممدوح دراصل ایک بہانہ ہے جس کی آڑ لے کر وہ اپنا اور اپنے فن کا کمال دکھاتا ہے۔ ممدوح بھی یہ نہیں سمجھتا کہ لفظاً و معناً ساری ثنا و صفت اس پر صادق آتی ہے وہ اپنی بڑائیاں سن کر نہیں بلکہ شاعر کے کمال فن پر انعام دیتا ہے...... آج تک کسی قصیدے سے کسی ممدوح کا مرتبہ بلند نہیں ہوا لیکن اس قصیدے کا ہوا جو ممدوح کی شان میں لکھا گیا تھا اور اس شاعر کا ہوا جس نے وہ قصیدہ تصنیف کیا تھا۔"

رشید صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں اگر ہم قصائد مومن کی مدح کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کے قصائد کا یہ حصہ فنی اعتبار سے بہت بلند ہے اور علاوہ سودا کے کوئی بھی دوسرا اردو قصیدہ نگار ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔

راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں مومن لکھتے ہیں:

دستِ گہر فشاں سے وہ نامہ اگر کرے رقم
دامِ ہما ہو حسرتِ مرتبۂ بجو تری
حامی و معن پائمال اس کے صفِ نعال میں
صدر نشینِ بزم کام بخشش و فیض گستری
لعل لب اس کے دُر فشاں جیسے گہر شابہ بدست
جائزہ کم نہ آفریں دونوں میں ہے برابری
جمع ہیں تجھ میں عدل و حسن جن سے خرابیاں خراب
مستِ شرابِ لب شراب، محو پری رُخی پری

ممدوحین کے اسبابِ متعلقات کا بیان بھی قصائد میں اکثر مروج ہے۔ مومن کے قصائد میں بھی ممدوحین کے ساز و سامان اور متعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے نعتیہ قصیدہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی شمشیر مبارک کے بارے میں لکھتے ہیں:

دو نیم ہوں تری شمشیر کے تصور سے
بسانِ ساغرِ خورشید کاسہ ہائے رؤس

دوسرے شعر میں نیزے اور گرز کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

ہلا دے گاؤ زمیں گاؤ چرخ سے نیزہ
بٹھا دے خاک پہ شیرِ سپہر کو دبوس

براق کی تعریف میں مومن اس طرح زمزمہ خواں ہیں:

براقِ اسپ ترا ابرُوے فرشتہ رکاب
کہاں ہو چشمِ بشر ایسے پاؤں سے ممسوس

محمد وزیر خاں کے لشکر اور ساز و سامان کے بیان میں مومن اس طرح رقم طراز ہیں:

اس کے ایک ایک لشکری کا تُفنگ — دعوئے سامری و نریمانی
خنجرِ جاں شکاف سیلس کے — ابروئے یار کی سی برّانی

راجہ اجیت سنگھ کے مدحیہ قصیدہ میں آلاتِ حرب و ضرب کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یاں دبیر فرشتۂ موت ہیں یا پرِ خدنگ
دشنۂ تشنۂ قضا یا تیرے تیر کی سری
خندۂ برق تیغ میں گرمیِ مہر و ماہ تیر
گریۂ زخم تیر میں جوشِ سحاب آذری

گھوڑے کی تعریف بھی قصیدہ کا ایک اہم پہلو ہے۔ مومن نے بھی اپنے بعض قصائد میں ممدوحین کے گھوڑے کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔ راجہ اجیت سنگھ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے مومن لکھتے ہیں:

توسن بادپا ترا روز دغا اُبھار دے
صرصرِ عاد کی ہوا دم میں دکھا کے سرسری
اطلسِ چرخ زیرِ گرد جوش ہوا سے رشک سے
سرکشِ سینۂ نجوم خجلت آبِ پیکری
ہائے سبک عنانیاں واہ گراں رکابیاں
گاہ غزال چیں ہے وہ گاہ پلنگ بربری

مومن نے بعض قصائد میں ممدوح کے ظاہری حسن کی بھی تعریف کی ہے۔ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تو وہ بہارِ باغِ حسن جس پہ کرے نثار جاں
لالہ رخی، سہی قدی، گل بدنی، سمن بری
لب کو مثال کس سے دوں لعل و عقیق بے مزا
گل میں کہاں یہ نازکی مُل میں کہاں یہ احمری

اردو قصائد میں مدح کے بعد فخریہ اشعار مومن کا خاصّہ ہیں۔ مدح کے بعد فخریہ اشعار کی پابندی مومن کے علاوہ کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ یہ ان کی انفرادیت ہے۔ ان فخریہ اشعار سے بھی ان کی قدرتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ فخر و خودستائی مومن کو زیب بھی دیتی ہے۔

فخریہ اشعار کے چند نمونے دیکھیے:

سامنے میری تر زبانی کے — نطق الکن حدیثِ سحبانی
میرے ربطِ کلام کو پہنچے — نثر سعدی نہ نظم سلمانی

میرے گوہر تمام ناسفتہ — میرے یاقوت سب بدخشانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں — جس کے در کا گدا ہے خاقانی

دوسرے قصیدہ میں تعلی کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں:

سحر حلال سے مرے جادو ہے سامری تخیل
طور کلیم، اوج فکر، نور خدا قسوں گری
میری زبان میں وہ بات جس سے ملک سخن بہ بست
میرے بیان میں وہ سحر جس سے جنون زدہ پری

مومن کی قصیدہ نگاری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کسی بھی قصیدہ میں مدح کے بعد اپنی دشواریوں اور بدحالیوں کا بیان کر کے ممدوح کے آگے دست سوال نہیں پھیلایا ہے بلکہ ان کے تقریباً سبھی قصائد میں مدح کے بعد خود ستائی ملتی ہے۔

دعائیہ حصے میں مومن پُر خلوص اور عقیدت مندانہ انداز میں دعا دیتے ہیں۔ چند قصائد کے دعائیہ اشعار پیش ہیں۔ نواب وزیر خاں کو دعائیہ دیتے ہوئے مومن کہتے ہیں:

جب تلک باعث نشاط و ملال — ہے وصال و فراق جانانی
تیرے حساد رنج گوناگوں — تیرے احباب اور تن آسانی
تیرا اقبال روز افزوں ہو — جیسے مومن پہ لطف رحمانی

نعتیہ قصیدہ میں دعائیہ انداز ملاحظہ ہو:

ہے جب تلک گل و برقسمت نہال و شجر
ہے جب تلک دل لالہ میں داغ حسرت بوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخل مراد
رہین داغ عدو کا رہے دل مایوس

مومن کے قصائد میں علمی مضامین بکثرت ملتے ہیں مومن بذات خود طب، نجوم، رمل، حکمت وغیرہ کے ماہر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں جا بجا ان سب علوم کی اصطلاحات ملتی ہیں مثلاً نعتیہ قصیدہ میں علمی اصطلاحات ملاحظہ ہوں:

جو ہوں معالج میلوں تو قابض ارواح
کرے دعائے رواج طریق جالینوس
کروں جو گردش انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آ کے روان بطلیموس

تلمیحات، آیات قرآنی اور احادیث کا استعمال بھی مومن نے اپنے قصائد میں بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

جو دیکھیں میری طبیعت کی گوہر افشانی
شریک در ہوں محمود و نکتہ پرور طوس (تلمیح)

بوسہ روا بہر طریق، سجدہ و فرق ہر فریق
سنگ در اس کا اک صنم رشک بتان آذری (تلمیح)

وہ ترا پایہ ہے اے شاہ جوانا بہشت
کہ ہوئی حرمت پیری کی تمنا محروم
(حدیث)

اَلْحَمْدُ لِوَاهِبِ الْعَطَايَه — اس شور نے کیا مزا چکھایا
(عربی جملے کی تضمین)

وَالشُّكْرُ لِصَانِعِ الْبَرِيَّه — جس نے ہمیں آدمی بنایا
(عربی جملے کی تضمین)

جب تب وَالضُّحٰی پڑھے ہے امام — مقتدی تا نسیں فَلَا تَنْهَر
(آیت قرآنی)

ان سب خصوصیات کے علاوہ قصیدہ میں فنی اعتبار سے اس کی زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ قصیدہ کی زبان کے لیے جزالت و متانت ضروری ہے۔ اس کے الفاظ باوقار اور پُرشکوہ ہونا چاہیے۔ قصیدے کا معیار اس کی زبان اور الفاظ کی شان و شوکت، اس کی تراکیب کی بلند آہنگی، ندرت خیال اور زور بیان ہے۔ یقیناً قصیدہ مغلق الفاظ کے مجموعہ کا نام نہیں لیکن سنگلاخ زمینیں، تشبیہات و استعارات کی جدت اور صنائع و بدائع کی فراوانی قصیدہ کی خوبیاں ہیں۔ زبان و بیان کی خوبیاں مومن کے قصائد میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ الفاظ و تراکیب کی شان و شوکت مومن کے قصائد میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ تشبیہ و استعارہ کا استعمال مومن نے اپنے قصائد میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے مثلاً

غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط
بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرضِ شموس (اسنا)

خمیدہ شاخ ہے یوں رنگِ گل چمکتا ہے
کہ جس طرح سے بھڑک اٹھے مشعلِ منکوس (تشبیہہ)

مومن کے قصائد میں صنائع و بدائع کا التزام بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کریں:

یوسف سے عزیز کو کئی سال
زندانِ عسرت میں پھنسایا (تجنیس)

حسرت لعلِ سیم تن میں ہوئے
گوہرِ اشکِ چشم مرجانی (ایہام تناسب)

خزانہ خاک میں ہر تنگ دل ملاتا ہے
زبسکہ نقطۂ خزاں جائیں سب منحوس (حسن تعلیل)

جب تلک ذلت و عزت، طرب و غم سے ہو خلق
گوشہ گیر انجمن افروز سلیمیں و معدوم (لف و نشر مرتب)

مومن نے قصیدے کے تمام اجزا کو باقاعدگی کے ساتھ برتا ہے اور اس میں جدت و ندرت کے ساتھ نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کے ایسے نمونے پیش کیے ہیں جو صرف انھیں کا حصہ ہیں۔
اگر ہم اردو کے پانچ عظیم قصیدہ گو شعرا کا نام لیں تو ان میں نصرتی، سودا، ذوق، انشا کے ساتھ مومن کا نام ضرور لیا جائے گا۔

★

شاعرِ انسانیت ـ تلوک چند محروم (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا

نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے ہو کا نظارا

محروم کی سیاسی و وطنی نظمیں جو کاروانِ وطن میں ہیں ان سے ہندستان کی جنگِ آزادی کی ایک تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ سیاسی اور بیانیہ شاعری ہونے کے باوجود لطفِ سخن اور لطافتِ بیان کی کمی نہیں محسوس ہوتی۔

★

نجم الدین نقوی

خونِ دل سے جو نہیں آب ملا میرے بعد
چمنِ حسن نہ سرسبز رہا میرے بعد

بال کھولے ہوئے آئے جو مری میت پہ
حشر میں حشر ہوا اور بپا میرے بعد

میں نہ کہتا تھا کہ مجھ تک ہے فقط ذوقِ سجود
کس نے پھر تیغ تلے سر کو رکھا میرے بعد

صرف مجھ تک تھی مگر بنتِ عنب جلوہ طراز
موج مے پھر نہ ہوئی بال کشا میرے بعد

کون سلجھائے گا الجھے ہوئے گیسو تیرے
"کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد"

کون پوچھے گا شمیمِ رُخ و گیسو کا مزاج
کس سے اٹھلائے گی پھر موجِ صبا میرے بعد

یک بہ یک جیسے ہوئی ختم حدیثِ غمِ جاں
دردِ دل کس نے کہا، کس نے سنا میرے بعد

دیکھ صورت مری ہو جاتے ہیں پتھر پانی
مجھ سا آئینہ بھلا کون بنا میرے بعد

منفعل ایسی ہوئی قتل پہ میرے نقوی
پھر نہ بے پردہ ہوئی تیغ نگہ میرے بعد

حیات وارثی

جب ترا روپ مرے فن سے سنور جاتا ہے
حسنِ دوشیزۂ افکار نکھر جاتا ہے

میری آنکھوں کے تکلم سے پریشاں کیوں ہو
چند لمحوں میں یہ طوفان گزر جاتا ہے

درِ احساس پہ پہرے ہیں غرض مندی کے
محفلِ دہر میں جس سمت نظر جاتا ہے

گل و شبنم سے حکایاتِ شبِ غم سن کر
جو سحر آئے ہے با دیدۂ تر جاتا ہے

اس طرح کٹتے ہیں کتراکے بُرے وقت میں لوگ
جس طرح خواب اک آہٹ سے بکھر جاتا ہے

ساقیِ بزم کی کوتاہ نگاہی کی قسم
خود چھلک جاتا ہے پیمانہ جو بھر جاتا ہے

میکدہ دل کا حیاتؔ آؤ پھر آباد کریں
نشہ مے تو بہت جلد اتر جاتا ہے

مجیب سہالوی

(مزاحیہ)

میری بچّی کا اللہ مالک

جمیل غسلخانہ میں نہا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گنگنا تا جا رہا ہے۔ ہم دو، ہمارے دو، ہم دو ہمارے دو۔ بی اماں ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولیں۔ نوج اب نہاتے وقت بھی یہی رٹ لگائی جاتی رہے گی۔ کیوں نہ ہو چودہ صدی ہے نا! نہ جانے نگوڑی کہاں جان اٹکی ہے کہ یہ سب سننے کو جی رہی ہوں۔ ہمارے زمانے میں تو بہو بیٹیوں کو گود بھری رہنے اور دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو کی دعائیں دی جاتی تھیں اور اگر شادی کے بعد دو تین سال تک بہو کی کوکھ خالی رہتی تو محلے والیوں کے علاوہ نائن اور دھوبن تک خیریت پوچھنے لگتی، ساس منتیں، مرادیں ماننے لگتی، رات کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھتی اور سجدے کرتی۔ ناک رگڑتی اور جب تک بہو کی پیشانی سے یہ کلنک کا ٹیکا دور نہ ہو جاتا اور بچہ بہو کی گود میں کہیوں کہیوں نہ کرنے لگتا ساس انگاروں پر لوٹتی رہتی اور بہو شرمندگی سے کسی سے آنکھیں نہ ملا سکتی۔ اب اس کلجگ میں تو بچہ ہونے پر نہیں بچہ نہ ہونے پر فخر کیا جاتا ہے۔

بی اماں کی یہ تقریر دہلیز پر سنتے سنتے جب نسیمہ اوب گئی تو اس کے صبر کا جام لبریز ہو گیا اور وہ بول اٹھی۔ بی اماں! مائیں اپنی بہو بیٹیوں کو "دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو" کی دعا اس وقت دیا کرتی تھیں جب دودھ افراط اور آبادی کم تھی اب جبکہ دودھ پینے کے لیے ملنا مشکل ہے تو پھر آپ ہی بتلایئے کہ کون اپنی بہو کو دودھوں نہلائے گا کہ وہ پوتوں پھل کر اپنے گھر والوں ہی کی نہیں، دنیا بھر کے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دے۔ بی اماں! اگر لوگ آنکھ بند کر کے بے سوچے سمجھے یوں ہی خرگوش اور چوہے کی طرح دم لیے بغیر درجنوں بچے پیدا کرتے رہے تو بیس برس میں آدمیوں کو ہماری اس لمبی چوڑی دنیا میں رہنے کی کیا کھڑے ہونے کی جگہ ملنا دوبھر ہو جائے گی۔ آبادی طوفان میل کی طرح بڑھ رہی ہے چاہے جو بھی جتن کیے جائیں اس دوڑ میں ملک کی غذائی اور صنعتی پیداوار کا بازی لے جانا تو بڑی بات ہے۔ شانہ بہ شانہ بھی چل سکنا محال ہے۔ کیونکہ زمین کی وسعت محدود اور بچوں کی پیداوار لامحدود ہے۔ ایسی صورت میں جب آبادی دنیا کی چادر سے آگے پاؤں پھیلانے لگے گی تو آدمی نہ سر چھپا سکیں گے اور نہ پاؤں اور غریبی، پسماندگی اور قلت پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔

بی اماں۔ اچھا بیٹی مجھے معاف کر دو: توبہ کرتی ہوں، کان پکڑتی ہوں کہ تمہارے سامنے زبان سے بات نہیں نکالوں گی۔ آج کل کی بہوویں تو ایسی دیدہ دلیر اور زبان دراز ہوتی ہیں کہ ان سے اگر کوئی بات کہہ دو تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اللہ کی بندی انصاف کر، آخر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی کہ تیرے بدن میں آگ لگ گئی اور اس وقت سے کترنی کی طرح جو زبان چلی ہے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بی، اے، بی ٹی، اے کیا پاس کر لیا کہ بے چاری کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتیں اور سمجھتی ہیں کہ ہم سب نرے جاہل ہیں۔ آخر ہم لوگ بھی تھے۔ بوڑھے ہو گئے، لیکن ساس کے سامنے زبان چلانا تو بڑی بات ہے نہ منھ سے کبھی ایک لفظ نکالا اور نہ آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ رشتے کی ایک بہن کی

طرف مخاطب ہوتے ہوئے بی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ اے بہن! تمھیں انصاف سے کہو کہ میں نے بہو صاحبہ کو کون سی گالی دے دی تھی کہ یہ بیچاری چراغ پا ہو گئیں۔ آٹھ سال میں اللہ آمین کر کے دو بچے پیدا کئے۔ میں چاہتی تھی کہ جیسے بھرا پرا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں، میرے بعد بھی اسی طرح آباد رہے۔ شہزادوں کے دو بچے ہیں جن میں لڑکی پرائے گھر کی ہوتی ہے۔ بیاہ ہو جائے گا میاں کا گھر آباد کرے گی۔ پھر کون رہ جائے گا ایک اکیلا جاوید، اتنے بڑے گھر میں تو پھر ہو کا عالم ہو گا۔ معلوم نہیں کیا عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں کہ سب "ہم دو، ہمارے دو" کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔

جمیل اب نہا کر غسل خانہ سے باہر آ چکا تھا اور تولیہ سے سر پونچھ رہا تھا۔ اس نے جو بی اماں کو بپھرے ہوئے دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آخر یہ ہے کیا معاملہ۔ نسیمہ پر نظر پڑی تو وہ منھ پھلائے اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ (اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے) وہ سمجھ گیا کہ ان سے بات کی تو برس پڑیں گی۔ چھوٹی بہن متینہ باورچی خانے میں بیٹھی تھی وہ سیدھا اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کسی کی تیوریاں چڑھی ہیں کوئی منھ پھلائے بیٹھا ہے۔ متینہ نے شوخی سے کہا۔ بھائی جان۔! چشمہ کہاں رکھ دیا۔ لگا لیجئے ورنہ آپ کو سبھی کا منھ پھولا نظر آئے گا۔ کیا آپ کو میرا بھی منھ بھی پھولا نظر آ رہا ہے۔؟

جمیل نے کہا اری بے وقوف! تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور یہ سب بیزار بیٹھے ہیں۔ آخر یہ ہوا کیا؟ متینہ بولی یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ آپ نہاتے وقت غسل خانے میں کیا گنگنا رہے تھے۔ جمیل فوراً معاملہ کی تہہ تک پہونچ گیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کہ گنگنا کیا رہا تھا یہ تو اب ہمارا نعرہ اور وقت کی پکار ہے۔ متینہ بولی اس وقت کی پکار ہی نے تو آؤٹ آف ڈیٹ، اور پرانے دماغوں کو چکرا دیا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان کے زمانے میں جن بچوں کی ولادت پر شادیانے بجتے تھے خوشیاں منائی جاتی تھیں اور بڑی بوڑھیاں اسے ولادت نہیں۔ شادی ہونا کہتی تھیں اب انھی بچوں کی پیدائش پر بندش لگائی جا رہی اور چیخ پکار کی جا رہی ہے۔

جمیل ۔۔ اچھا متینہ تم بتاؤ تمھارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ متینہ مسکراتی ہوئی بولی۔ اچھا اب آپ یہ چاہتے ہیں آپ کی بیگم صاحبہ کی طرح میں بھی بی اماں کی ڈانٹ کھاؤں پہلے بی اماں کا غصہ ٹھنڈا کیجئے۔ پھر مجھ سے میرا خیال پوچھئے ورنہ بھابھی کو تو صرف ڈانٹ پڑتی ہے مجھ پر تو ڈنڈے پڑیں گے۔ خیر امی کے سامنے تو میں کچھ کہہ سکتی تھی لیکن بی اماں (دادی) کے سامنے کس کی مجال ہے کہ بچوں کے متعلق منھ کھولے۔ ان کے نزدیک یہ اللہ کی دین ہیں اور ان کی روک تھام کفرانِ نعمت ہے۔

جمیل ۔۔ اللہ کی دین تو دنیا کی ہر چیز ہے۔ اللہ کی جہاں سب چیزیں دین ہیں وہاں اس نے انسان کو عقل بھی دی ہے تاکہ وہ ضرورت کے مطابق چیزیں کم یا زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے اگر گھر میں دودھ کی دو سیر ضرورت ہے تو وہ خواہ مخواہ چار سیر فراہم نہ کرے۔ کیونکہ فاضل دودھ کے خراب ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے اور اس کو محفوظ طریقہ پر رکھنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے پر بھی بلا وجہ وقت اور توجہ صرف کرنی پڑے گی۔ یہی صورت بچوں کی ہے۔ جب ملک اور دنیا کی آبادی اس کی پیداوار اور آمدنی کے مقابلے میں اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ چاہے جتنے کارخانے کھولے جائیں، اور چاہے جتنے کھیتوں کی پیداوار بڑھائی جائے بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا تو کیا یہ سمجھداری ہو گی کہ اپنی وسعت سے زیادہ بچے پیدا کر کے انھیں بھوک، بیماری اور ناداری کا شکار بنایا جائے اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو موت کے منھ میں دیدیا جائے یا یہ مناسب ہو گا کہ جتنی گنجائش ہو اتنے ہی بچے پیدا کئے جائیں۔ اور ان کی ٹھیک سے پرورش کی جائے۔

مگر بھائی جان وہ تو کہتی ہیں بچے پیدا کرنا یا نہ کرنا انسان کے بس میں نہیں یہ تو قدرت کی دین ہے جس کی چاہے بچوں سے گود بھر دے اور جس کی چاہے خالی رکھے۔ جمیل نے کہا اگر بچے پیدا کرنے میں انسان کو کوئی دخل نہیں تو پھر وہ پوری طرح بچوں کی پیداوار کا کام قدرت ہی پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ بلا وجہ شادی کے چکر میں

کیوں پڑتا ہے اور شادی کے بعد اگر دو چار سال سنا ٹا رہتا ہے تو پھر مرادیں منتیں ماننگنے اور بدوا اور دعا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کیوں شروع کر دیتا ہے۔ اب اگر بچے پیدا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ اور دوا کی جا سکتی ہے تو پھر ان کے روکنے کے لیے کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ قدرت کے کام میں دخل نہیں تو یہ کیوں ہے۔

میتنہ نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ اپنی دلیلوں کا زور خواہ مخواہ میرے اوپر کیوں صرف کر رہے ہیں۔ بی اماں کو سمجھائیے۔

جمیل تو بڑی بے وقوف ہے۔ اری ان بیچاری بڑی بوڑھیوں کو جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہیں سمجھانے سے کیا فائدہ۔ انھیں اب نہ شادی کرنا ہے نہ بچے پیدا کرنے ہیں اور نہ انھیں پالنا پوسنا ہے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈاکیہ نے دروازے پر دستک دی۔ بی اماں بولیں۔ ارے کیا کانوں میں انگلی دے کر بیٹھی ہو ڈاکیہ خط خط پکار رہا ہے اور تم شن گھسیٹے اس طرح بیٹھی ہو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مفتوں ہو گئے۔ رضیہ کا کوئی خط نہیں آیا میرا دل لگا ہے۔ اللہ اس کے بچوں کو اپنی اماں میں رکھے سب خیریت ہو۔ میتنہ دوڑ کر گئی اور خط لا کر بی اماں کے پاس ڈال دیا بی اماں بگڑ کر بولیں یہ چھوکری کیا باؤلی ہو گئی ہے۔ میرے منھ میں نہ دانت نہ پیٹ میں آنت مجھے سامنے کھڑے آدمی کا چہرہ تک نظر نہیں آتا میں خط پڑھوں گی کیا خاک!

جمیل نے لپک کر خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔

امی جان تسلیم۔

یہاں سب خیریت ہے آپ لوگوں کی خیریت بارگاہ رب العزت سے نیک چاہتی ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ پپو کے اچانک ایک سو چار ڈگری بخار چڑھ گیا تھا۔ اوّل باؤ لکنے لگا تھا لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا کہ بخار جلد ہی کم ہو گیا مگر سخت کمزوری ہے۔ مجّو اسکول جاتے ہوئے بھیگ گیا اسے سخت نزلہ ہو گیا ہے۔ ناہید کی ناک چھدوائی گئی تھی وہ ایسی پک گئی ہے کہ دیکھی نہیں جاتی۔ بچو کی آنکھ میں گیند کھیلنے میں چوٹ آ گئی ہے پڑھنا لکھنا بند ہے۔ چھوٹا بھیا ماں کے اسپتال میں داخل ہونے کی وجہ سے رو رو کر جان ہلکان کیے ہوئے ہے۔ سب کام بے چاری تھورین سنبھالے ہوئے ہے۔ وقار بھی ٹھیک ہے۔ خدا کا شکر ہے اگر یہ دونوں ٹھیک نہ ہوتے تو کھانا کون پکاتا اور اسپتال لے کر کون جاتا۔ آپ جانتی ہیں مجھے دمے کی شکایت ہے بارش میں تو میرے لیے چار قدم چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اللہ کی دین آپ کی بیٹی کے اس مرتبہ جڑواں بچے ہوئے تھے۔ لڑکا تو پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا لڑکی کی سانس چل رہی ہے۔ دیکھئے ابھی وہ کتنے دنوں تک اسپتال میں رہیں۔ دعا کیجئے زچہ بچہ خیریت سے گھر واپس آئیں۔ آمین۔

خط سننا تھا کہ بی اماں سر پکڑ کر بولیں۔ ایک ساتھ دو دو!! میری دھان پان سی بچی پر گیارہ گیارہ بچوں کا بار۔ اس کی جان کا اللہ ہی مالک ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بے ہوش ہو گئیں۔ نسیمہ نے انھیں گرتے دیکھ کر فوراً انھیں اپنی گود میں لے لیا اور گھر میں کہرام مچ گیا۔

★

عظیم امروہوی

دشمنی

یہ نونہال
یہ بچہ۔ یہ بے خطا تصویر
پھٹا لباس، اٹی دھول زرد چہرے پر
ٹہل رہا ہے —
جو فٹ پاتھ پر کئی دن سے
تڑپ اسے لیے پھرتی ہے
چند سکوں کی — کہ —
جن سے پیٹ کی بھٹی کا بن سکے ایندھن
اگر یہ ہوتا
کہیں باپ ماں کا اکلوتا
تو اس طرح سے نہ یوں بھیک مانگتا پھرتا
وہ اہلِ زر
جو اسے دے رہے ہیں کچھ سکے
وہ اس کے دوست نہیں ہیں
وہ اس کے دشمن ہیں
یقیں کے دشمن ہیں
عمل کے دشمن ہیں
وطن کے دشمن ہیں

رشید قریشی

نیا سماج

وہ بھی تو ایک دور تھا لوگو!
تیرگی، روشنی پہ ہنستی تھی
بے بسی آدمی پہ ہنستی تھی
زندگانی تھی حادثات اپنی
زخم ہی زخم تھی حیات اپنی
اس طریقے سے پل رہے تھے ہم
آگ میں اپنی جل رہے تھے ہم
آنکھیں پُرنم تھیں دل پریشاں تھا
زندگی کیا تھی غم کا طوفاں تھا
ساغرِ صبر ہنس کے پیتے تھے
روز مرتے تھے روز جیتے تھے
دفعتاً وقت کی نظر بدلی!
اک کرن[1] ابھری روشنی بن کر
اک خوشی چھائی سرخوشی بن کر
دے کے ترتیب بیس[2] نکتوں کو
اک نئی زندگی دی لوگوں کو
جس کے مدت سے تھے تمنائی
تیری جرأت وہاں پہ لے آئی
ہر طرف عشرتوں کا راج ہے آج
اک نئے موڑ پر سماج ہے آج

۱؎ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی

محسن رضا جونپوری

غزل

دل کو رہینِ لذتِ حرماں بنا دیا
ترتیب دے کے درد کو درماں بنا دیا
صحرا تجھے کبھی آبلہ پایانِ شوق نے
شائستۂ مذاقِ گلستاں بنا دیا
یہ بھی شکستِ ناز ہے اے پیکرِ جمیل
صحرا نہ بن سکا تو گلستاں بنا دیا
اہلِ جنوں کا جذبۂ تعمیر الاماں
ذروں کو جمع کر کے بیاباں بنا دیا
ہم بے نیازِ دیر و حرم جب کبھی اٹھے
ایماں کو کفر، کفر کو ایماں بنا دیا
آسودۂ ازل تھا جو رازِ بسیطِ عشق
جب منکشف کیا اسے انساں بنا دیا
کوتاہیوں کا ذکر تھا، کچھ بال و پر کی بات
دونوں کے امتزاج نے زنداں بنا دیا
خود لغزشوں نے ڈالی بنائے وقارِ غم
خود لغزشوں نے عالمِ امکاں بنا دیا
پابندِ رسم و راہ نہیں فطرتِ جنوں
یہ کیا کیا خرد کو نگہباں بنا دیا
پابندِ احتیاط نہیں ہوں میں عشق میں
سر رکھ دیا جہاں درِ جاناں بنا دیا
اک غم تھا لازوال جسے تو نے اے رضا
افسانۂ حیات کا عنواں بنا دیا

محمد اسحاق صدیقی

خاندانی منصوبہ بندی کیوں؟

بچے خدا کی دین ہیں اور بچے پیدا کرنا انسان کا فطری حق ہے۔ اس صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن بچے کتنے ہوں اور کب ہوں، یہ دونوں باتیں انسان کے اختیار میں ہیں۔ ان کی اہمیت کو سمجھنا اور ان کے لیے مناسب تدبیر کرنا ہی خاندانی منصوبہ بندی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ اسے ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں، جس میں سرکار کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اولاد کے معاملے میں "اللہ دے اور بندہ لے" کا اصول جاری ہے لیکن دراصل اس مسئلے کی حیثیت انفرادی نہیں بلکہ یہ ایک ملکی اور بین الاقوامی مسئلہ ہے جس کا تعلق دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور گھٹتے ہوئے قدرتی وسائل سے ہے۔

بہت سی باتیں جب محدود پس منظر میں دیکھی جاتی ہیں تو غلط معلوم ہوتی ہیں لیکن جب انھیں وسیع پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ جب آپ اپنے گاؤں یا شہر کو سامنے رکھ کر آبادی روکنے کی بات سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار بڑا ظلم کر رہی ہے لیکن جب آپ ساری دنیا کی حالت سامنے رکھ کر سوچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار بالکل صحیح کر رہی ہے۔

چونکہ دنیا کی اکثریت ان پڑھ ہے اور لوگوں کو اپنے محلے، گاؤں یا شہر سے باہر کا حال نہیں معلوم۔ اس لیے بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہماری زمین اور اس کے وسائل محدود ہیں۔ اس تلخ حقیقت کا پتہ تب لگا جب دنیا کے سائنس دانوں نے زمین کے قدرتی وسائل کا مفصل جائزہ لیا۔ انھیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ زمین کے معدنیات تیزی سے گھٹتے جا رہے ہیں جب کہ ان کی کھپت روز افزوں ہے اور اگر اس کھپت کو انسانی آبادی کو محدود کر کے روکا نہ گیا تو جلد ہی سارے معدنیات ختم ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ہماری موجودہ تہذیب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہی انسان جو چاند پر پہونچ گیا، جس نے زہرہ اور مریخ پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے، اسے زمین پر زندگی بسر کرنے کا شعور نہیں۔ انسان کی ساری تاریخ باہمی خوں ریزی اور خود غرضی کی ایک دردناک داستان ہے۔ حالیہ انکشافات میں غور کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم دریافت ہے کہ زمین پر جو زندگی کی رونق ہے وہ اور کہیں نہیں۔ چنانچہ جب انسان چاند پر پہنچا تو اسے وہاں کسی قسم کے جاندار نہ ملے۔ امریکہ کی وائی کنگ خود کار تجربہ گاہوں نے مریخ پر جا کر یہ پتہ لگایا کہ وہاں خوردبینی جراثیم کے پائے جانے کا امکان ہے۔ برخلاف اس کے زمین پر انسان کی ایسی ذی فہم مخلوق ہی نہیں بلکہ لاکھوں قسم کے حیوانات و نباتات پائے جاتے ہیں لیکن ہماری خود غرضی کی وجہ سے تمام جانداروں کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے، اس کے لیے اناج پیدا کرنے، عمارتی لکڑی اور کاغذ حاصل کرنے کے لیے جس تیزی سے جنگل کاٹے جاتے ہیں اس تیزی سے اُگ نہیں پاتے۔ جنگلوں کے ساتھ جنگلی جانوروں کا بھی صفایا ہوتا جا رہا ہے گویا زمین پر انسان کے سوا قدرت کی

کسی دوسری مخلوق کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ کیا یہ انسان کی سراسر خود غرضی نہیں ہے؟

جنگلات میں کمی کے معنی ہیں ہوا میں آکسیجن گیس کی کمی، جس کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا، مٹی کا تیزی سے کٹنا اور سیلاب، کیونکہ درختوں کی جڑیں مٹی کو باندھے رکھتی ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کارخانے پر کارخانے کھلتے جا رہے ہیں۔ سفر کی سہولت کے لیے پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں کے دھوئیں سے زمین کی فضا زہریلی ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں سانس کی بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔ اگر انسانی آبادی کو بڑھنے سے نہ روکا گیا اور صنعت کاری کی تیز رفتاری اسی طرح جاری رہی تو بہت جلد زمین کی فضا اس حد تک زہریلی ہو جائے گی کہ اس میں کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکے گا۔

زیادہ اناج پیدا کرنے کی کوشش میں زمین کی زرخیزی کم ہوتی جاتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ بہت سے زرخیز خطے کچھ عرصے کے بعد بنجر میدانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ کیڑے مار دواؤں کا استعمال روز افزوں ہے، جن کا زہر نہ صرف ہوا، پانی اور مٹی میں سرایت کر جاتا ہے بلکہ کھانے پینے کی چیزوں میں جذب ہو کر جانداروں کے جسم میں داخل ہو کر انھیں طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور چھوٹے جاندار مثلاً مچھلیاں اور پرند تو جلد ہی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے بہتوں کی قسمیں ناپید ہو چکی ہیں۔

کارخانوں سے بہایا جانے والا فضلہ دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں میں برابر ملتا رہتا ہے جس کی وجہ سے پانی کے تمام ذخیرے زہریلے ہو گئے ہیں۔ ہوا، پانی اور مٹی کی آلودگی کا تنہا ذمہ دار انسان ہے جو نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر اپنی نسل بڑھاتا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ اس کی وقتی تفریح کا انجام خود اُس کے لیے، اس کے اہل و عیال کے لیے، اُس کے ملک والوں کے لیے اور ساری دنیا کے لیے کس قدر تباہ کن ہو سکتا ہے۔

آپ سوچیں گے کہ آخر دنیا میں پہلے بھی لوگ آباد تھے، لیکن تاریخ میں کہیں اس بات کا حوالہ نہیں ملتا کہ آبادی نے کہیں ایک ایسے مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہو کہ دنیا کے بڑے بڑے سائنس داں اور سیاست داں اس کا حل ڈھونڈنے میں لگ گئے ہوں۔ بات در اصل یہ ہے کہ پہلے نہ تو کسی کو یہ معلوم تھا کہ دنیا کتنی بڑی ہے اور نہ کسی کو یہ اندازہ تھا کہ ساری دنیا کی آبادی کتنی ہے۔ آبادی کس رفتار سے بڑھتی ہے، اگر آپ اس کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو فرصت کے وقت میں اپنے خاندان والوں کا شجرہ بنا ڈالیے۔ زیادہ دور نہیں اپنے پردادا تک جائیے اور شمار کیجیے کہ ان سے جو نسل چلی وہ آج کہاں تک پہونچ گئی ہے۔ آبادی کے بڑھنے کا انداز کچھ ایسا ہے: ۱ - ۲ - ۴ - ۸ - ۱۶ - ۳۲ ۔۔۔۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔ آبادی کو دگنا ہونے میں کم وقت لگتا ہے۔ آئیے ہم یہاں اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی پر ایک نظر ڈالیں۔

ہماری آبادی

سنہ ۱۹۲۱ء میں ۲۵ کروڑ ۱۰ لاکھ تھی۔
سنہ ۱۹۳۱ء میں ۲۷ کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی۔
سنہ ۱۹۴۱ء میں ۳۱ کروڑ ۸۰ لاکھ تک پہنچ گئی
سنہ ۱۹۵۱ء میں ۳۶ کروڑ ۱۰ لاکھ سے آگے نکل گئی۔
سنہ ۱۹۶۱ء میں ۴۳ کروڑ ۹۰ لاکھ کے اوپر ہو گئی۔
سنہ ۱۹۷۱ء میں ۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ کے لگ بھگ ہو گئی۔

غور کیجیے کہ ہر دس سال میں آبادی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی ملک میں رہنے کے لیے جگہ تنگ ہوتی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء میں فی مربع کلومیٹر ۷۹ افراد آباد تھے۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ۸۸
سنہ ۱۹۴۱ء میں ۱۰۰
سنہ ۱۹۵۱ء میں ۱۱۳
سنہ ۱۹۶۱ء میں ۱۳۸
سنہ ۱۹۷۶ء میں ۱۷۰
} ہو گئے

جولائی سنہ ۱۹۷۶ء تک ہماری آبادی ۶۱ کروڑ تک جا پہنچی اور اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو محض ۲۵ سال میں ایک ارب ہو جائے گی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء میں فی مربع کلومیٹر ۲۸۰ افراد آباد ہوں گے۔ اس وقت ہمارے ملک کی کیا حالت ہوگی۔ یہ سوچ کر سر چکراتا ہے۔ جبکہ اس وقت یہ عالم ہے کہ زیادہ تر لوگوں کو نہ تو پیٹ بھر کھانا ملتا ہے اور نہ تن ڈھکنے کو کپڑا۔ نہ ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ ہے، نہ آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ۔ لاکھوں نوجوان تعلیم پا کر مارے مارے پھرتے ہیں لیکن نوکری نہیں ملتی۔ اسپتال میں جاؤ تو مریض کو بستر پر کیا فرش پر جگہ نہیں ملتی۔ سڑکوں پر انسانوں اور گاڑیوں کا وہ ہجوم کہ راستہ چلنا مشکل۔ راشن کی دکان پر وہ بھیڑ کہ معلوم ہوتا ہے جیسے خیرات بٹ رہی ہے۔ آخر اس بھیڑ کو پیدا کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم سب لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس بات کو محسوس کرتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو اسے روکنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

آبادی کے اضافے کی رفتار کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہمارے ملک میں ہر سال ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ۹۰ لاکھ انسان مرتے ہیں۔ گویا ہر سال ہماری آبادی میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں جتنی آبادی براعظم آسٹریلیا کی ہے، اتنی آبادی کا سالانہ ہندوستان میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲ کروڑ ۱۰ لاکھ بچے سالانہ پیدا ہونے کا مطلب ہے ہر مہینے ۱۷ لاکھ ۵۰ ہزار بچے روزانہ ۶۰ ہزار بچے یا فی گھنٹہ ۲۵۰۰ بچے یا فی منٹ ۴۰ بچے۔ کیا یہ بچوں کا سیلاب نہیں ہے؟

اب دنیا کی آبادی پر نظر ڈالیے ——— اندازہ کیا جاتا ہے سنہ ۱۸۳۰ء میں دنیا کی آبادی صرف ایک ارب تھی اس کے ایک صدی بعد یعنی سنہ ۱۹۳۰ء میں دو ارب ہو گئی۔ اس کے تیس سال بعد یعنی سنہ ۱۹۶۰ء میں تین ارب ہو گئی۔ اور اس کے پندرہ سال بعد یعنی سنہ ۱۹۷۵ء میں چار ارب ہو گئی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اب سے دس سال بعد یعنی سنہ ۱۹۸۶ء میں دنیا کی آبادی پانچ ارب ہو جائے گی اور سنہ ۱۹۹۵ء میں چھ ارب تک پہنچ جائے گی۔

اس بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرے کی بنا پر اقوام متحدہ نے سنہ ۱۹۷۴ء کو عالمی آبادی کا سال قرار دیا اور ایک بین الاقوامی جلسے میں جو بخارسٹ شہر میں ہوا تھا اپنے ممبر ملکوں سے اپیل کی کہ آبادی کی باڑھ کو ہر ممکن قیمت پر روکنے کی کوشش کریں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ آبادی کی کثرت اس دنیا کو لے ڈوبے گی انسان کے ساتھ اس کی لاکھوں سال پرانی تہذیب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ زمین اس قابل نہ رہے کہ اس پر کوئی جاندار زندہ رہ سکے۔

دنیا کی آبادی بڑھنے کے کئی اسباب ہیں مثلاً معیار زندگی کا اونچا ہونا، نئی دواؤں کی ایجاد، علاج کے نئے طریقے، حفظان صحت کے اصولوں پر عمل، اناج کی زیادہ پیداوار اور اس کی تقسیم کے بہتر طریقے، بار برداری کی آسانیاں وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں موت کی شرح گھٹ رہی ہے اور انسان کی اوسط عمر بڑھ رہی ہے۔ گویا انسان پیدا بھی زیادہ ہوتے ہیں اور زیادہ عرصے تک جیتے بھی ہیں۔ کھانے والے بھی زیادہ ہیں اور کھاتے بھی زیادہ ہیں۔ سنہ ۱۶۵۰ء تک زیادہ تر ملکوں میں انسان کی اوسط عمر ۳۰ سال تھی اور اب ۵۴ سال ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء تک ہندستان میں موت کی شرح فی ہزار ۲۷ تھی اور اب ۱۷ ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء تک ہندوستانیوں کی اوسط عمر ۳۲ سال تھی اور اب ۵۲ سال ہے۔ انسان کی اوسط عمر کا بڑھنا اور موت کی شرح کا گھٹنا قدرت پر انسان کی فتح ہے۔

لیکن دنیا کی آبادی کو حد کے اندر رکھنے کے لیے مرنا بہت ضروری ہے۔ اب اگر ہم لوگوں کو مرنے نہیں دیتے تو ہمیں چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ بچے نہ پیدا ہونے دیں۔ اسی لیے پیدائش کی شرح گھٹانے کی کوشش کی گئی لیکن ہم اسے گھٹا نہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے پنج سالہ منصوبوں سے ملک میں جو خوش حالی لانا چاہتے تھے اس میں ناکام رہے یا یوں کہیے کہ آبادی کے بے تحاشا

فضا نے ہمارے منصوبوں کو چوپٹ کر دیا۔

چونکہ انسان کو سب سے زیادہ دلچسپی اپنے خاندان سے ہوتی ہے اس لیے ہماری سرکار عوام میں یہ احساس پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی ہے کہ سب کو خوش حال زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے کنبے کو محدود کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ زیادہ اولاد پیدا نہ کریں تاکہ بچوں کی کثرت سے والدین کی صحت اور ان کی حالت خراب نہ ہو اور وہ اپنے بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے کر اچھا شہری بنا سکیں۔ خود سکھی زندگی بسر کریں اور دوسروں کو سکھی زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ اس معاملے میں امیر غریب، تعلیم یافتہ، اَن پڑھ، مذہب یا ذات پات کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ "ہم دو ہمارے دو" کا نعرہ سب کے لیے ہے۔ کم سے کم اولادیں پیدا کرنے کا مطالبہ ایک طرح سے انسان کی قوت تولید پر روک لگانا ہے لیکن اس تولیدی مساوات سے ہر گھر میں، اپنے ملک میں اور ساری دنیا میں جو خوشگوار انقلاب آسکتا ہے اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے، جس کا اندازہ کرنے کے لیے ایسے دو گھرانوں کے رہن سہن کا مقابلہ کیجیے، جن میں کمانے والوں کی آمدنی برابر ہو لیکن ایک میں کم بچے ہوں اور دوسرے میں زیادہ۔ "چھوٹا پریوار سکھی پریوار" محض ایک نعرہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

غالباً اب آپ کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی ہوگی کہ سرکار خاندانی منصوبہ بندی پر اس قدر زور کیوں دے رہی ہے۔ اگر آپ اس کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہو گئے ہوں تو آج ہی خاندانی منصوبہ بندی کو اپنائیے اور اگر آپ کے دو یا زائد اولادیں ہیں تو نس بندی سے مت کترائیے یہ چیز نہ تو مذہب کے خلاف ہے اور نہ صحت کے لیے مضر۔ مبارک ہیں وہ انسان جو اپنے کو، اپنے گھر والوں، اپنے ملک اور دنیا کی بھلائی کے لیے اس عظیم قربانی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی قربانی، دنیا کی خوش حالی کے لیے، موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے۔

★

نغمۂ آتشیں

عفت بانو زیبا کاکوروی

نگاہ میں خروش ہے ادا جنوں بدوش ہے رگوں میں خوں کا جوش ہے
نہ فکرِ ناو نوش ہے نہ زندگی کا ہوش ہے
غرورِ کہکشاں ہیں یہ ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

جبیں جبیں پہ عظمتیں قدم قدم پہ ہمتیں نظر نظر میں جرأتیں
نفس نفس صداقتیں چھپی چھپی شجاعتیں
فتح کے نشاں ہیں یہ! ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

یہ خون میں نہائیں گے ہزار زخم کھائیں گے ستم پہ مسکرائیں گے
قدم نہیں ہٹائیں گے وطن کو یہ بچائیں گے
سرورِ گلستاں ہیں یہ! ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

عصائے آتشیں لیے سنانِ احمریں لیے شکن بھری جبیں لیے
نگاہ خشمگیں لیے عزائم حسیں لیے
پیامِ گل فشاں ہیں یہ ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

جم کاربٹ

لطیف حسین ادیب

ہلدوانی (ضلع نینی تال) سے ۲۲½ کلومیٹر کے فاصلے پر ہلدوانی رام نگر سڑک کے کنارے کالا ڈھونگی کی بستی ہے۔ کالا ڈھونگی میں جم کاربٹ کا مکان ہے جہاں وہ موسم سرما میں رہتا تھا۔ جم کاربٹ کے مکان کا شمالی دروازہ ٹھیک اس جگہ پر ہے جہاں نینی تال سے آنے والی سڑک ہلدوانی رام نگر سڑک سے ملتی ہے۔ کالا ڈھونگی میں جم کاربٹ کی املاک تھی اور وہیں سے اس نے جنگل کی زندگی کا مطالعہ کیا اور قوانین شکار سے واقف ہوا۔ کالا ڈھونگی ہی سے جم کاربٹ کی کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

جم کاربٹ ۲۵ جولائی ۱۸۷۵ء کو نینی تال میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر صرف چار برس کی تھی کہ اس کے باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کی پرورش کی ذمہ داری اس کے بڑے بھائی ٹام نے سنبھالی ٹام نینی تال کے ڈاک خانہ میں ملازم تھا۔ جم کاربٹ نے اپنی کتابوں میں ٹام کا ذکر بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔

جم کاربٹ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ گھر میں ایک دوسرے خاندان کے افراد بھی رہتے تھے۔ جم کاربٹ اس خاندان کے بچوں سے بھی چھوٹا تھا۔ بچے جنگل میں تنہا نہیں جاتے تھے کیونکہ ان کے ذہنوں پر بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیاں مسلط تھیں جن سے وہ خوف کھاتے تھے۔ باورچی خانے کی ضرورت کے لیے جانور شکار کرنے کا کام بالغ مردوں کے سپرد تھا۔ اس زمانے میں جنگلات جانوروں سے بھرے ہوئے تھے۔ درندوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ جم کاربٹ کو سب سے پہلے چار برس کی عمر میں بندوق چلانے کا موقع ملا۔ ڈانسے نام کے ایک صاحب کالا ڈھونگی میں مقیم تھے۔ وہ ایک دن شیر کا شکار کھیلنے کے ارادے سے جنگل گئے۔ انھوں نے جم کاربٹ کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ان کی ملاقات شیر سے نہیں ہوئی البتہ انھوں نے جم کاربٹ کو اپنی مزل لوڈنگ گن دے کر ایک چڑیا پر فائر کرنے کی ہدایت کی۔ فائر ہوا۔ جم کاربٹ سر کے بل زمین پر اور بندوق پتھر پر گری۔ بندوق چلانے کا یہ پہلا تجربہ تھا جس کو جم کاربٹ نے تمام عمر یاد رکھا۔

ٹام نے جم کاربٹ کے لیے ایک غلیل کا انتظام کر دیا۔ وہ غلیل سے چڑیوں کا شکار کرنے لگا۔ وہ ٹام کی ہدایت کے بموجب کبوتر اور ہریل غلیل سے شکار کر کے گھر میں کھانے کے لیے دے دیتا اور دیگر چڑیوں کی کھال اتار کر محفوظ کر لیتا۔ اس طرح اس کے پاس پرندوں کے نمونے اس کثرت سے جمع ہو گئے کہ جب اس کے ایک عزیز اسٹیفنس ڈیر نے کمایوں کے پرندوں پر کتاب لکھی تو اس کتاب کی ۴۰۰ رنگین تصویریں جم کاربٹ کے محفوظ کیے ہوئے پرندوں پر مشتمل تھیں۔

جم کاربٹ نے تیر کمان اور کمانی غلیل کے ذریعہ بھی شکار کھیلنے کا شوق پورا کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ دن آ ہی گیا جب ٹام اس کو اپنے ہمراہ جنگل میں لے گیا اور اس کو بندوق دے کر ایک ریچھ پر فائر کرنے کی ہدایت کی۔ ریچھ دکھائی نہیں دیا۔ چونکہ وہ پہلی بار ایسے گھنے جنگل میں داخل ہوا تھا جس میں ریچھ پائے جاتے تھے لہٰذا وہ بہت خوف زدہ ہوا۔ دوسرے دن صبح کو ٹام پھر اسے اپنے ہمراہ جنگل میں لے گیا اور ایک مور پر فائر کرنے کی ہدایت کی مگر وہ مور پر فائر نہیں کر سکا۔ تاہم اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب وہ بندوق لے کر جنگل کے ان گھنے حصوں میں جانے لگا جہاں داخل ہونے کا وہ پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح اس پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ جنگل میں درندوں سے خوف نہیں کھانا چاہیے کیونکہ درندوں کی جبلت میں انسانوں کو ستانا داخل نہیں ہے۔ اس وقت اس کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ اس نے اپنی کتاب جنگل لور میں اسی زمانے کے دو واقعات بیان کیے ہیں جن میں سے پہلے واقعہ کو نقل کیا جاتا ہے:

"نیا گاؤں ہمارے کالا ڈھونگی کے مکان سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک دن میں اور میگاگ (کتے کا نام) صبح تڑکے مور کا شکار کھیلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں چوڑی سڑک کے بیچ میں سے گزر رہے تھے کیونکہ روشنی کم تھی اور جنگل جس میں سے سڑک گزر رہی تھی شیروں و تیندووں کا مسکن تھا۔ سورج نکلتے وقت ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک میں وہ پگڈنڈی ملی تھی جس پر جانوروں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یہاں میں نے اپنی مزل لوڈنگ گن کو بھرا ..... اس کے بعد میں اور میگاگ پگڈنڈی پر روانہ ہوئے۔ ہمارے سامنے متعدد موروں اور جنگلی مرغوں نے پگڈنڈی کو پار کیا مگر میں ان میں سے کسی پر فائر نہیں کر سکا کیونکہ وہ پگڈنڈی پر ٹھہرے ہی نہیں۔ نصف میل چلنے کے بعد ہم دونوں ایک کھلی جگہ میں داخل ہوئے اور ہم نے وہاں جیسے ہی قدم رکھا سات موروں کی ایک قطار نے اس جگہ کے آخری کنارے کو پار کیا۔ چند ثانیہ توقف کر کے ہم بھی رینگ کر وہیں پہنچ گئے جہاں سے موروں نے کھلی جگہ کو پار کیا تھا۔ .. میں نے میگاگ کو اشارہ کیا کہ وہ مور اڑا دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موروں نے کھلی جگہ کو پار کرنے کے بعد دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ میگاگ گھنی جھاڑیوں اور پیڑوں کے جنگل میں مشکل سے سو گز گیا تھا کہ میں نے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور موروں کے چیخنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد میگاگ مارے خوف کے چیخا جس کے ساتھ ہی شیر کی پُر غضب دہاڑ بلند ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میگاگ موروں کا تعاقب کرتا ہوا کسی سوئے ہوئے شیر تک پہنچ گیا اور چونکہ واقعہ اچانک رونما ہوا مور، کتا اور شیر اپنے تعجب، خوف اور غصے کا اظہار اپنے اپنے مخصوص انداز میں کر رہے تھے۔ میگاگ چیخنے کے بعد دم دبا کر بھاگا اور بھاگتے میں زور زور سے بھونکتا جاتا تھا۔ شیر میگاگ کے تعاقب میں دوڑا اور دوڑتے میں دہاڑتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ میگاگ اور اس کے پیچھے پیچھے شیر میری ہی طرف آ رہے ہیں..... اس وقت میرے دل میں بس ایک ہی آرزو پیدا ہوئی یعنی میں کہیں ایسی دور جگہ چلا جاؤں جہاں شیر نہ ہوں...... میں نے شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے وفادار رفیق کو اس کے حال پر چھوڑا اور بھاگ پڑا اور اتنا تیز بھاگا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا تیز نہیں بھاگا تھا۔ میگاگ جلد ہی میرے پاس پہنچ گیا۔ ہمارے پیچھے شیر کی دہاڑیں بھی بند ہو گئیں ..... ایک چھوٹا بچہ اور ایک بڑا کتا جب اپنی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے، شیر کھلی جگہ میں پہنچنے کے بعد بیٹھا اور مسکرانے لگا۔ وہ مسکراہٹ جو صرف شیر کے ہونٹوں پر مل سکتی ہے۔ اس نے تو یہ کارروائی ایک کتے کو بھگانے کے لیے کی تھی کیونکہ کتے نے اس کی نیند خراب کر دی تھی ......" (صفحہ ۲۳-۲۵)

اس واقعہ سے یہ قیاس کرنے میں دقت نہیں ہوگی کہ جم کاربٹ کو شیروں کی خصلت کا تجربہ کمسنی سے ہی تھا اور یہی وہ تجربات تھے جن کی بنیاد پر وہ اتنا بڑا شکاری بنا۔

جم کاربٹ کی تعلیم نینی تال کے انگریزی اسکول میں ہوئی۔ اس اسکول میں بچوں کو فوجی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ وہ اپنے اسکول کا سب سے چھوٹا کیڈٹ تھا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف دس برس کی تھی۔ اسی سال موسم سرما کی تعطیل میں جب

کالا دھونگی کو واپسی کا وقت آیا تو اس کے انسٹرکٹر نے اس کو سروس رائفل اور کارتوس لے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ رائفل اور کارتوس لے کر کالا دھونگی پہنچا اور رائفل سے شکار کھیلنے لگا۔ رائفل ملنے کے بعد اس کا حوصلہ پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا۔ رائفل سے اس نے ایک گلدار کو شکار کر لیا۔ وہ اس موقع پر مرنے سے بال بال بچا کیونکہ گولی کے بعد گلدار نے چھلانگ ماری اور اس کے سر پر سے گزر گیا۔ بعد کو خون کافی مقدار میں جاری ہو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ ہر چند کہ ایک غلط مقام سے گلدار کے سینہ کا نشانہ لے کر فائر کرنا نا سمجھی و ناتجربہ کاری کی بات تھی جس کے نتیجے میں خود اس کی موت ہو سکتی تھی مگر وہ ایسے تجربات سے دوچار نہ ہوتا تو اتنا بڑا شکاری کیسے بنتا۔ دس برس کی عمر میں بھاری بور کا رائفل چلانا اور گھنے جنگل میں تن تنہا پیدل گلدار کا شکار کرنا کسی ایسے بچے سے ہی ممکن تھا جس کی قسمت میں عظیم المرتبت شکاری بننا لکھا ہو۔

مبادیاتِ شکار کے ضمن میں اعلیٰ نشانہ بازی و حوصلہ مندی کے باوصف، جانوروں کی جبلت، اطوار، انفرادی خصوصیات اور مجموعی طور پر جنگل کی زندگی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کو جنگل کی حکمت (JUNGLE LORE) کہتے ہیں جس کی آگاہی کے بغیر اعلیٰ پایہ کا شکاری بننا ممکن نہیں ہے۔ جم کاربٹ ماہر نشانہ باز تھا۔ اس میں غیر معمولی حوصلہ مندی تھی۔ اس کی جرأت و خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ آدم خور شیروں و گلداروں کا پیدل تعاقب کرتا تھا۔ اس نے دو ایک بار اپنے لباس پر پہاڑی عورتوں کی ساری باندھی، شاید آدم خور شیر اس کو عورت سمجھ کر حملہ کرنے کی غلطی کر بیٹھے اور اس طرح اس کو فائر کرنے کا موقع مل جائے۔ اس نے کئی بار آدم خور شیروں کو ان کی آواز کی نقل کر کے قریب بلایا اور ان کو ہلاک کر دیا۔ کئی بار اس کو تمام شب پیڑوں پر اس حال میں بیٹھنا پڑا کہ فضا میں موت کا سناٹا تھا، کوئی متنفس میلوں تک نہیں تھا، پیڑ کے تنے کے پاس کسی مرد کی نعش بندھی ہوئی جس کو آدم خور شیر نے ہلاک کر کے تھوڑا بہت کھا بھی لیا تھا اور پورے علاقے پر آدم خور شیر کی حکومت تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ اندھیری راتوں میں جب کہ وہ فائر کرنے سے قاصر تھا خود آدم خور شیروں اور گلداروں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ اپنی حکمت عملی سے ہر موقع پر موت سے بچ گیا۔ ایسی صورت میں جبکہ دن کے وقت جنگل کا سناٹا دل میں خوف پیدا کرتا ہے اس کا رات کے وقت ایسے پر خطر اور پر ہیبت ماحول سے دوچار ہونا زبردست جرأت، حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔

جم کاربٹ ماہر اور نڈر نشانہ باز ہونے کے ساتھ ساتھ جانوروں کی خصلت اور جنگل کی حکمت سے کما حقہٗ واقف تھا۔ اس نے جنگل کی حکمت کو اپنی کم عمری کے زمانے میں کالا دھونگی میں سیکھا اور آئندہ زندگی میں بھی اس اکتساب کو جاری رکھا۔ کالا دھونگی کے چاروں طرف جنگل ہے۔ اس کے بچپن میں تو یہ جنگل بہت گھنا اور جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو ان جنگلوں سے واسطہ پڑا کیونکہ یہ جنگلات کالا دھونگی میں بسنے والوں کے لیے ناگزیر تھے۔ بستی کی اکثریت کے لیے وہ محض جنگل تھے جن سے ایندھن فراہم ہوتا اور ڈھور ڈنگر وہاں چرنے کے لیے جاتے تھے۔ ان جنگلوں میں سور، چیتل، مور، مرغ کا شکار کر کے کھانے کے لیے گوشت بھی مل جاتا اور جو بہر صورت گزرگاہ بھی تھے۔ لیکن جم کاربٹ کے لیے جنگلات کی اہمیت اس سے زیادہ تھی۔ وہ جنگلات کو پر از حکمت سمجھتا تھا اور اس نے بڑی لگن سے یہ حکمت حاصل کی تھی۔ اس کے مکان کے قریب ایک چھوٹے سے رقبہ میں ریتیلا راستہ تھا جس پر سے جانور گزرتے تھے۔ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں ان کے پیروں کے نشانات کا مطالعہ کیا جو ریت پر بن جاتے تھے۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھروں اور پنجوں کے نشانات کے ذریعہ جانوروں کی جنس، عمر، قد و قامت، رفتار اور ان کے جانے کی سمت کا پتہ لگا لیتا تھا۔ اس نے جانوروں کی بولیوں کا مطالعہ کیا۔ وہ بولیوں کے ذریعہ نہ صرف جانوروں کی شناخت کر لیتا بلکہ وہ یہ بھی سمجھ جاتا کہ بولی نر کی ہے یا مادہ کی۔ بولی سے جنسی اختلاط مقصود ہے یا خطرے کا اعلان کیا گیا ہے اور جانور کتنے فاصلہ پر ہے۔ اس نے گھاس، پیڑ کے سوکھے پتوں اور تنوں پر لگی، ہوئی چھال کا مطالعہ کیا اور ان پر جانوروں کے چھوڑے ہوئے نشانات کے ذریعہ ان کی عمر اور رفتار وغیرہ کا اندازہ کرنے لگا۔ اس نے ذہنی نقشے

بنانے کی عادت ڈالی جن کی مدد سے وہ جنگل میں دن ہو یا رات کبھی راستہ نہیں بھولتا تھا۔ وہ رات کے وقت جنگل میں آنے جانے سے نہیں گھبراتا تھا کیونکہ وہ تاروں کی روشنی میں تیز قدم چل سکتا تھا۔ اس نے ہوا کا رخ پہچاننے میں بھی مہارت حاصل کی۔ وہ جنگلی جانوروں کی طرح اپنے کانوں کے ذریعے ہوا چلنے کی سمت کا احساس کر لیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ علم بھی حاصل کیا کہ خطرناک جانوروں کا تعاقب کرتے وقت کس موقع پر ہوا کے ساتھ چلنا چاہیے اور کس موقع پر ہوا کے خلاف اور کن مواقع پر حملہ کا خطرہ پشت کی طرف سے ہوتا ہے یا بازو سے۔ اس نے جنگل میں رہنے والے جانوروں کی طرح بے آواز قدموں سے چلنے کی مشق کی اور وہ اس میں اتنا ماہر ہو گیا کہ جب وہ موہان کے آدم خور شیر کے تعاقب میں آخری دن گیا تو شیر صاحب کا پتہ نہیں چلا حالانکہ جنگلی جانوروں کی قوتِ سماعت و بصارت انسانوں کے مقابلے میں تیز ہوتی ہے۔ وہ شیر ایک بڑ کی چھاؤں میں سو گیا جس کو اس نے سوتے میں ہی ہلاک کیا۔ اس کی لگن کا یہ عالم تھا کہ جب وہ رات کے وقت سونے کے لیے لیٹتا تو جانوروں کی آوازیں سن کر ان کی قسم اور ان کی جگہ کا اندازہ کرتا چنانچہ جب وہ جوان ہوا اور خطرناک جانوروں کو پیدل یا پیڑ پر سے شکار کرنے لگا تو اس کے کمسنی کے تجربات اور اسی عمر میں کیا ہوا جنگل کی زندگی کا مطالعہ کام آیا۔ وہ تمام عمر خطرناک جانوروں کا شکار کھیلتا رہا مگر سوائے دو ایک بار کے کبھی کسی جانور کو اس پر حملہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے بستر پر مرا، کسی شیر یا گلدار نے اس کو ہلاک نہیں کیا۔ اس سلسلے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ خطرہ کو خطرہ نہیں سمجھتا تھا یا اس کو ڈر نہیں لگتا تھا، وہ خطرناک حالات میں ڈرتا بھی تھا البتہ اس کے اوسان کبھی خطا نہیں ہوتے تھے۔ وہ موقع کی نزاکت کے مطابق اپنی حکمت عملی سے کام لیتا تھا اور کامیاب ہو جاتا۔ اس سلسلے میں اس کی شکاری زندگی کے دو واقعات کی تلخیص پیش کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ وہ واقعات مندرجۂ ذیل ہیں۔ پہلے واقعہ کا تعلق پنار کے آدم خور گلدار سے ہے جس نے چار سو انسان ہلاک کیے اور جس کو ضلع الموڑہ کے شمالی تام کے دیہات میں ختم کیا گیا۔

"میں نے گاؤں کے لوگوں کو بتایا کہ میں نے گلدار کو زخمی کر دیا ہے مگر یہ طے کرنا دشوار ہے کہ زخم مہلک ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس وقت ہم سب گاؤں کو واپس جائیں گے اور میں زخمی گلدار کو صبح کے وقت تلاش کروں گا۔ اس بات پر گاؤں کے لوگوں نے مایوسی کا اظہار کیا۔ جب گلدار کو اسی وقت تلاش کرنے کے موضوع پر گاؤں والوں کی بحث ختم ہو گئی تو میں اپنے صحیح فیصلہ کے خلاف کھیت کے کنارے تک جانے کے لیے آمادہ ہو گیا جہاں سے ہم نشیب میں واقع سطح کھیت کو دیکھ سکتے تھے (جس میں گلدار زخمی ہونے کے بعد گیا تھا)۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ایک صف کی شکل میں میرے پیچھے چلیں، شعلوں کو اونچا رکھیں اور اگر گلدار حملہ کرے تو مجھے اندھیرے میں چھوڑ کر نہ بھاگنے کا وعدہ کریں۔ ان سب نے خوشی خوشی وعدہ کر لیا۔ ہم بہت آہستہ آہستہ خاموشی سے آگے بڑھے۔ جب ہم بکری (جس کو گلدار نے مارا تھا) تک پہنچ گئے تو نشیبی کھیت کا سرا نظر آیا۔ اس وقت (زخمی گلدار کے) خون کے نشانات تلاش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ جیسے جیسے ہم کھیت کے کنارے کے قریب ہوتے گئے، نشیبی کھیت کا زیادہ حصہ دکھائی دینے لگا اور جب کھیت کی ایک تنگ پٹی پر شعلوں کی روشنی پڑنا باقی رہ گئی تھی تو گلدار نے غصے میں گلا تا غراکر کھیت کے کنارے پر سے جست لگائی اور سامنے آگیا۔ ایک حملہ آور گلدار کی غصے میں بھری ہوئی غراہٹ میں ہولناکی ضرور ہوتی ہے کیونکہ میں نے ہاتھیوں کی ایک ایسی قطار کو جو شیر کا راستہ روکنے میں نڈر تھے۔ ایک حملہ آور گلدار کے مقابلے میں منھ موڑ کر ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا جب میرے تمام ساتھی، جو غیر مسلح تھے پشت دکھا کر تیر کی طرح بھاگے تو مجھے تعجب نہیں ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ بھاگتے میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور چیڑ کی مشعلوں کے ٹکڑے زمین پر گرے اور بدستور روشنی دیتے رہے اور مجھے گلدار کے سینہ پر فائر کرنے کا موقع مل گیا۔ آدم خور شیر یا گلدار کا خوف ہمت کو پست کر دیتا ہے اور اگر میں بھی گاؤں کے لوگوں کی طرح ایک مشعل بردار ہوتا تو بھاگ پڑتا۔[1]"

---

[1] دی ٹیمپل ٹائگر اینڈ مور مین ایٹرس آف کماؤں۔ (صفحہ ۹۱-۹۲)

دوسرے واقعہ کا تعلق رُودر پور کے آدم خور گلدار سے ہے۔

"شاید ہم تینوں گاؤں میں زندہ نہیں پہنچ پاتے اگر خوش قسمتی سے میرے پاس دیاسلائیوں کی بھری ہوئی ڈبیہ نہیں ہوتی۔ میں دیاسلائی جلا کر چاروں طرف پُرتشویش نظروں سے دیکھتا اور پھرتی سے چند قدم آگے بڑھ جاتا، اس کے بعد دوسری دیاسلائی جلاتا۔ بالآخر ہم ناہموار راستہ پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے گاؤں کے اتنا قریب پہنچ گئے کہ جب ہم نے گاؤں کے لوگوں سے آواز دے کر فوراً آنے کے لیے کہا تب وہ لالٹین اور چیڑ کی مشعلیں لے کر ہمارے پاس آگئے۔ دوسرے دن جب میں صبح تڑکے واپس ہوا، میں نے آدم خور گلدار کے پنجوں کے نشانات اس جگہ دیکھے جہاں سے وہ ہمارے تعاقب میں گاؤں تک آیا تھا۔"[1]

جم کاربٹ نے ایک موقع پر خوف اور خطرے کے سلسلے میں یوں لکھا ہے:

"ممکن ہے چند خوش قسمت افراد کو ڈر نہ لگتا ہو مگر میں ان میں سے نہیں ہوں۔ جنگل کی زندگی سے عمر بھر کی واقفیت رکھنے کے باوجود میں شیر کے دانتوں اور پنجوں سے آج بھی اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا کہ اس وقت ڈرا تھا جب شیر نے مجھے اور ریگاگ کو اس جنگل سے بھگایا تھا جس میں وہ سو رہا تھا۔ البتہ خوف کا مقابلہ کرنے اور اس کو قابو میں رکھنے کے لیے اب میں نے وہ تجربہ حاصل کیا ہے جو بچپن میں میسّر نہیں تھا۔ پہلے مجھے اپنے چاروں طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی دیتا تھا اور ہر آواز سے ڈر لگتا تھا۔ اب میں جانتا ہوں کہ خطرہ کہاں ہوگا اور کن آوازوں پر خصوصی توجہ دینی ہے اور کن آوازوں کو نظرانداز کرنا ہے۔ پہلے مجھے اپنے نشانہ پر اطمینان نہیں تھا۔ اب مجھے نشانہ پر اس حد تک اعتماد ہے کہ میں جہاں چاہوں گا گولی مار دوں گا۔ دراصل تجربہ خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا تجربہ اور خود اعتمادی کی دولت حاصل کیے بغیر آدم خور شیر کو پیدل اور تنہا شکار کرنا خودکشی کرنے کے نہایت ناخوشگوار ذریعہ سے عبارت ہوگا۔"[2]

"خطرے سے نہ صرف ہر شکار کا لطف بڑھتا ہے بلکہ اس سے ہالے حواس میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور ہماری توجہ ہر اس چیز کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جس کا دیکھنا اور سننا ضروری ہے۔"[3]

ایسے صبر آزما حالات میں جب کہ جم کاربٹ کی معمولی غفلت اس کو موت کی دعوت دے سکتی تھی، اس کا دو ایسی باتوں میں عقیدہ رکھنا جن کا عقل سے تعلق نہیں ہے، دلچسپ ہے اور حیرت انگیز بھی۔ وہ انڈوں کا ملنا اور سانپ کا مارنا فال نیک سمجھتا تھا۔ مثلاً جب وہ چوگڑھ کی آدم خور شیرنی کا تعاقب کر رہا تھا تو اثنائے راہ اس کو ایک چٹان پر چھپکا د(NIGHTJAR)کے دو انڈے ملے۔ وہ اس نے اٹھا کر اپنی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ لیے اور ان کو مع ہتھیلی کے ایک پتے دار بیل سے لپیٹ لیا اور اس کے بعد وہ شیرنی کے تعاقب میں حسب معمول روانہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی شیرنی سے ملاقات بڑے نازک موقع پر ہوئی۔ وہ نشیب میں تھا اور اس کے پیچھے دائیں طرف پندرہ فٹ کی بلندی پر سے شیرنی اس کو گھور رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ انڈوں کی وجہ سے بیکار تھا نیز اس کے دوسرے ہاتھ میں رائفل تھی جس سے شیرنی آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ شیرنی کا نشانہ لینے کے لیے رائفل کو بقدر تین چوتھائی گھمانا ضروری تھا۔ شیرنی اس کو گھورتی رہی، وہ شیرنی پر نظریں جمائے رہا اور ساتھ ہی ساتھ وہ رائفل کی نال کو شیرنی کا نشانہ لینے کے لیے گھماتا رہا۔ جب نال گھوم کر شیرنی کے جسم کی سیدھ میں آگئی تو اس نے فائر کر دیا۔ گولی نے شیرنی کے دل کا بالائی حصہ پھاڑ کر دیا اور وہ مر گئی۔ اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے۔

"میں اس غلطی کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی اتنا ہی توہم پرست ہوں جتنا کہ میرے ساتھی شکاری۔ میں نے ایک سال کے اندر تین طویل المیعاد عرصوں میں شیرنی پر فائر کرنے کا موقع تلاش کیا جس کی خاطر میں نے سخت محنت کی، مگر کامیابی میسر نہیں ہوئی اور اب انڈے ملنے کے چند منٹ بعد میری تقدیر بدل گئی۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۹۲)

---

[1] دی مین ایٹنگ لیپرڈ آف رُودر پریاگ۔ ص ۸۹۔ [2] دی ٹیمپل ٹائیگر اینڈ مور مین ایٹرس آف کماؤں ص ۱۴۲۔ [3] دی ٹیمپل ٹائیگر اینڈ مور مین ایٹرس۔ ص ۱۴۱

کانڈا کا آدم خور شیر مارنے سے پہلے اس نے ایک نیرہ چودہ فٹ زہریلے سانپ (HAMADRYAD) کو ہلاک کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے لکھا ہے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ شکاری دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ توہم پرست ہوتے ہیں۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شکاری اپنے توہمات کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست جب بھی درندوں کا شکار کھیلنے کے لیے جاتے ہیں تو وہ ہمیشہ پانچ کارتوس اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ میرے ایک دوسرے دوست سات کارتوس لے جاتے ہیں۔ میرے ایک اور دوست جو شمالی ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور شکاری تھے، جاڑوں میں شکار کھیلنے کا اس وقت تک آغاز نہیں کرتے تھے جب تک وہ ایک مہاشیر مچھلی کا شکار نہ کر لیتے۔ میری اپنی توہم پرستی کا تعلق سانپوں سے ہے۔ یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ میں آدم خور شیر یا گلدار کا تعاقب کرنے میں کتنی ہی جدوجہد کروں میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ایک سانپ کو ہلاک نہ کر لوں۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۴۴)

توہم پرستی کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ وہ چھٹی حس یا "نگہبان فرشتہ" کے وجود کا قائل تھا جو اس کو بروقت خطرے سے آگاہ کر دیتا تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں ایسے کئی واقعوں کا ذکر کیا ہے جب اچانک اس کے دل میں خطرہ کا احساس پیدا ہوا اور وہ آدم خور شیر یا گلدار کی غیر متوقع موجودگی سے باخبر ہو گیا جس کے نتیجے میں اس نے مزید احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور خود شکار ہونے سے بچ گیا۔ اس کا یہ وہم بھی اس حد تک حقیقت پر مبنی تھا کہ نتیجہ کبھی غلط برآمد نہیں ہوا یعنی اس کو جب بھی خطرہ کا احساس ہوا تو فی الواقع خطرہ موجود تھا جس کی تصدیق بعد کو ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

"میں نے کسی دوسری جگہ بھی اس حس کا ذکر کیا ہے جو مجھے آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیتی ہے اور میں اس موضوع پر اس سے زیادہ لکھنے کی زحمت نہیں کروں گا کہ یہ حس بالکل حقیقی ہے اور چونکہ میں اس کیفیت سے ناواقف ہوں میں یہ نہیں بتا سکوں گا کہ اس کا محرک کیا ہے۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۸۸)

جم کاربٹ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ریلوے میں فیول انسپکٹر کی اسامی پر ملازم ہو گیا۔ اس نے ڈیڑھ برس تک یہ خدمت انجام دی۔ اس زمانے میں (۱۸۹۴ء) ریل کے انجنوں میں لکڑی جلائی جاتی تھی۔ اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اس نے ایک سال تک ریل کے محکمے میں مختلف جگہوں پر کام کیا۔ اس نے ریلوے انجن چلائے، گارڈ بنا، نائب اسٹور کیپر رہا اور نائب اسٹیشن ماسٹر کی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد اس کو موکامہ گھاٹ میں ٹرانس شپمنٹ انسپکٹر نیز ہینڈلنگ کنٹریکٹر کی ملازمت مل گئی۔ اس نے یہ خدمت ۲۱ برس تک انجام دی۔ اس نے پہلی جنگ عظیم میں شامل ہو کر وزیرستان اور فرانس میں فوجی خدمت انجام دی۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں بھی حصہ لیا۔ وہ بیرونجات کے فوجی افسران کو جنگل میں لڑنے کا فن سکھاتا تھا۔ اس کا عہدہ کرنل کا تھا۔ حکومت کی طرف سے اس کو "فریڈم آف فارسٹ" کا اعزاز حاصل تھا یعنی وہ سرکاری جنگلات میں بلا اجازت شکار کھیل سکتا تھا۔

جم کاربٹ کی دوامی شہرت کا باعث تین امور ہیں (۱) وہ ایک عظیم شکاری تھا (۲) وہ بہترین قصہ گو تھا (۳) وہ غریب پہاڑی عوام کا خادم تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جم کاربٹ ایک عظیم المرتبت شکاری تھا اور اس کے کارنامے شکاریات کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے جس کا اندازہ گزشتہ اوراق کے مطالعے سے بھی ہوا ہوگا۔ حقیقت میں کسی علاقے میں شیر یا گلدار کا آدم خور بن جانا قہر خداوندی سے کم نہیں ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوگا جو جم کاربٹ کو چمپاوت میں سنایا گیا تھا:

"چمپاوت کی سڑک چند میل تک پہاڑی کے جنوبی رخ کے متوازی وادی سے پچاس گز کی بلندی پر واقع ہے۔ لگ بھگ دو ماہ ہوئے بیس آدمیوں کی ایک جماعت چمپاوت کے بازار کی طرف دوپہر کے وقت اس سڑک پر آ رہی تھی۔ ہم نشیبی وادی میں

اک انسان کی درد بھری چیخیں سن کر چونکے۔ جوں جوں یہ دَرد
چیخیں قریب تر آتی گئیں ہم لوگ سڑک کے کنارے اکٹھا ہو کر کھڑے
ہو گئے اور مارے خوف کے سکڑنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت ایک
شیر نمودار ہوا جو ایک ننگی عورت کو لیے جا رہا تھا۔ شیر کی ایک
جانب عورت کے بال زمین پر گھسٹ رہے تھے اور دوسری جانب
اس کے پاؤں۔ شیر نے عورت کی پشت اپنے منھ میں جکڑ لی تھی۔
عورت اپنا سینہ کوٹ رہی تھی۔ وہ کبھی خدا کو اور کبھی انسانوں کو مدد
کے لیے پکار رہی تھی۔ ہماری جگہ سے پچاس گز کے فاصلے پر ہماری نظروں
کے سامنے سے شیر اپنا بوجھ لے کر گزرا۔ جب یہ دوری آوازیں آنا
بند ہو گئیں ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۲)

ایسے ہولناک واقعات سے متاثر ہو کر لوگ گھروں کے باہر نہیں نکلتے
تھے اور کبھی کبھی علاقہ خالی کر کے دوسری جگہ چلے جاتے تھے۔ پہاڑی علاقہ
میں لوگوں کا ذریعہ سفر ان کے پاؤں ہیں اور ان کی معاش کا بیشتر دارو
مدار کھیتی پر ہے جانوروں کے لیے چارا اور گھروں میں جلانے کے لیے
ایندھن جنگل سے فراہم کیا جاتا ہے۔ ضرورت کی دیگر اشیا گاؤں کے
بازار میں ملتی ہیں۔ لہٰذا جب آدم خور شیر یا گلدار ان کے علاقے میں
موت کی طرح منڈلاتا ہے ان کی زندگی مصیبت بن جاتی ہے جم کاربٹ
نے رُدر پریاگ کے آدم خور گلدار کی تباہ کاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"رُدر پریاگ کے آدم خور گلدار نے جیسا کرفیو نافذ کیا تھا ویسا کرفیو
نہ اتنی شدت کے ساتھ کبھی نافذ ہوا اور نہ ہی بے کم و کاست
بجالایا گیا۔" (ص ۹)

اس نے تھاک کی آدم خور شیرنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تھاک اپنی سیکڑوں سال کی زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز
سے گزرا لیکن اپنی طویل تاریخ میں کبھی اس کو خالی نہیں کیا گیا تھا
جیسا کہ اب ہوا...... اس کے تو یا اس سے زیادہ باشندوں نے
اپنے پالتو جانوروں سمیت راہ فرار اختیار کی۔ میں نے گاؤں
میں صرف ایک بلی کو دیکھا جس نے نہایت گرم جوشی سے میرا
استقبال کیا۔ لوگوں نے اس قدر عجلت میں گاؤں کو خالی کیا
تھا کہ بہت سے گھروں کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔
میں نے گاؤں کی ہر پگڈنڈی پر، گھروں کے آنگن میں اور دروازوں
کے سامنے خاک دھول میں شیرنی کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۸۹)

ایسے الم ناک و اعصاب شکن پس منظر میں جم کاربٹ کا تن تنہا آدم خور
شیر و گلدار کا تعاقب کر کے ہلاک کرنا غیر معمولی کارنامہ معلوم ہوتا ہے
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس کار عظیم کے لیے ہی پیدا کیا گیا تھا۔
دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی کو بار بار خطرے میں ڈالنا
غیر معمولی انسانوں کا ہی کام ہے۔

جم کاربٹ کی شہرت کا دوسرا سبب اس کی تصنیفات ہیں۔
اس نے پانچ کتابیں لکھی ہیں:

(۱) مین ایٹرس آف کماؤں (۲) دی مین ایٹنگ لیپرڈ
آف رُدر پریاگ (۳) دی ٹیمپل ٹائیگر اینڈ مور مین ایٹرس
آف کماؤں (۴) جنگل لور (۵) مائی انڈیا۔

ان میں اوّل الذکر تین کتابیں اس کی ایسی مہموں پر مبنی ہیں جن
کا تعلق آدم خور شیروں و گلداروں کے شکار سے ہے۔ ان میں پہلی کتاب
اس کی شہرت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کتاب کے طبع ہوتے ہی وہ
ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ جنگل لور کو اس کی بالواسطہ سوانح
عمری کہا جا سکتا ہے۔ مائی انڈیا کے بیشتر مضامین دوسرے
کرداروں پر مبنی ہیں جیسے چماری، سلطانہ ڈاکو، کنور سنگھ وغیرہ۔ جم
کاربٹ کی شکاریات پر مبنی کہانیوں کے ماحول میں یکسانی ملتی ہے
وہی جنگل ہے سال یا ہلدو کا، اونچی گھاس یا خار دار جھاڑیوں کا پہاڑ
کے اوپر یا پہاڑ کے دامن میں، ایک ہی طرح کے جنگل ہیں جو خطرے
کا اعلان کرتے ہیں۔ چیتل، بندر، مور وغیرہ۔ ایک ہی طرح کی مشکلات
ہیں، کہیں نشیب تو کہیں فراز، راستہ کبھی ہموار تو کبھی ناہموار، خشک
تر نالے ندیاں، روشنی کی کمی، برق و باراں، موسم کی شدت وغیرہ
ایک ہی طرح کا پس منظر ہے۔ ساکت و خاموش جس کے سناٹے میں
موت و زندگی کا ڈراما کھیلا جاتا ہے۔ ایک ہی طرح کے افراد ہیں،
مفلس و نادار مگر محنتی و ایماندار جن کو آدم خور شیر و گلدار بالخصوص

عموماً شکار کرتے ہیں۔ وہی آدم خور شیر وگلدار ہیں جو انسان کے ظلم کا شکار ہو کر، بڑھاپے کی وجہ سے یا قدرتی غذا نہ ملنے کی وجہ سے آدم خور بن جاتے ہیں اور لوگوں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں اور وہی ایک شکاری ہے جو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر بے آواز قدموں سے آدم خور شیر یا گلدار کا تعاقب کرتا ہے یا کسی پیڑ پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتا ہے۔ آدم خور شیر یا گلدار کی مکاریاں ایک سی ہیں اور شکاری کو درپیش آنے والے خطرات بھی ایک سے ہیں۔ کہانی کا انجام وہی ایک ہے، آدم خور شیر یا گلدار مارا جاتا ہے اور شکاری کی فتح ہوتی ہے۔ مگر ماحول، پس منظر اور انجام کی یکسانی کے باوجود اس کی کہانیوں میں غضب کا ڈرامہ ہے۔ کہانیوں کو پڑھتے وقت کبھی قلب کی رفتار تیز ہو جاتی ہے تو کبھی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور جب کہانی اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے تو قلب کو سکون ملتا ہے، کچھ ایسا ہی سکون جو جم کاربٹ کو آدم خور شیر یا گلدار کو ہلاک کرنے کے بعد ملا ہوگا۔

جم کاربٹ کی کہانیوں میں جنگل کی زندگی کا عمیق مطالعہ بھی ملتا ہے۔ جس کو اس نے بالارادہ پیش نہیں کیا بلکہ وہ قصہ کے ضمن میں خود بخود آجاتا ہے کیونکہ اس کی کہانیوں کا پس منظر جنگلات ہیں جن سے وہ بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ وہ تمام افراد جو جنگل کی زندگی کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے جم کاربٹ کی کتابوں میں ایسا مواد بھی محفوظ ہے جو ان کے مذاق کے بموجب ثابت ہو سکتا ہے۔ ان خصوصیات کے علاوہ جم کاربٹ کی کہانیوں میں اس کا جذبۂ ہمدردی بھی پوشیدہ ہے جو قاتل اور مقتول دونوں کے لیے یکساں ہے۔ اس نے جہاں اس تباہی کا ذکر کیا ہے جو آدم خور شیر یا گلدار کی وجہ سے وسیع علاقوں میں گھر گھر وبا کی طرح آجاتی تھی وہاں انہوں نے ان سے اظہارِ ہمدردی بھی کیا ہے، وہ لکھتا ہے :

" ایک آدم خور شیر وہ شیر ہے جو ایسے حالات کے دباؤ میں آکر جو اس کی قدرت کے باہر ہوں ایسی غذا کھانے لگتا ہے جو اس کے لیے اجنبی تھی۔ دس میں سے نو موقعوں پر اس کا باعث زخم ہوتے ہیں اور دسواں موقع بڑھاپا۔ لاپرواہی سے نشانہ لے کر گولی چلانا اور پھر زخمی شیر کا تعاقب کر کے اسے ہلاک نہ کرنا ہی اس کو آدم خور بنا دیتا ہے۔ شیر کو خارپشت کا شکار کرتے وقت بھی زخم لگتے ہیں اگر وہ اس وقت غصہ میں بھر جائے . . . . . زخمی شیر یا وہ شیر جو تازہ شکار کے پاس ہو یا وہ شیرنی جس کے چھوٹے بچے ہوں خلل اندازی کے موقع پر بھی آدمی کو مار ڈالتے ہیں . . . . . میں نے اپنی عمر کے کم و بیش ۳۲ برس آدم خور جانوروں کے مستقل تعاقب میں گزارے ہیں اور حالانکہ میں نے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ پتھر دل بھی رو پڑتے مگر میں نے ایک بھی ایسا واقعہ نہیں دیکھا جب کہ شیر نے جان بوجھ کر ظلم کیا ہو یا اس نے محض خون کی پیاس بجھانے کے لیے بدون اشتعال آدمی کو ہلاک کیا ہو یا اس نے اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کی ضرورت سے زیادہ شکار کیا ہو . . . . . شیر میں وسیع القلب انسان کی سی شرافت اور اس کے ساتھ غیر معمولی جرأت مندی ہوتی ہے اور جب اس کی نسل ختم ہو جائے گی، جیسا کہ رائے عامہ ہموار نہ ہونے کی شکل میں خطرہ ہے، تو ہندوستان کو اپنا سب سے اعلیٰ جانور کھو کر پشیمانی ہوگی "۔

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ مصنف کا افتتاحی نوٹ)

جم کاربٹ کی شہرت کا تیسرا راز ہندوستان کے غریب عوام سے محبت میں پوشیدہ ہے جس کا اظہار اس کی ہر کتاب میں بالعموم اور مائی انڈیا میں بالخصوص ملتا ہے۔ وہ مائی انڈیا کے مقدمے میں لکھتا ہے۔

" میرا ہندوستان جس کی دیہی زندگی اور سرگرمی کے یہ خاکے پیش کیے گئے ہیں اس سے مراد ملک کے وہ وسیع خطے ہیں جن کو میں اپنی ابتدائی زندگی کے زمانے سے جانتا ہوں اور جہاں میں بھی سرگرم عمل رہا ہوں۔ وہ سادہ مزاج عوام جن کے کردار و اطوار کی تصاویر اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے ستر برس سے زیادہ گزارے ہیں "۔

اس نے مائی انڈیا میں جن افراد کے خاکے پیش کیے ہیں وہ موتی، کنور سنگھ، سلطانہ، بدھو، لالاجی، اور چماری ہیں۔ وہ ان سب سے واقف تھا۔ وہ ان کو ویسا ہی پیش کرتا ہے جیسا کہ وہ سب تھے۔ وہ ان کی اچھی خصوصیات کو بھی بیان کرتا ہے اور ان سے اظہار ہمدردی

کرتا ہے۔ وہ سلطانہ کے متعلق لکھتا ہے۔

"سوسائٹی کا تقاضہ ہے کہ اس کو مجرموں سے بچایا جائے اور سلطانہ ایک مجرم تھا۔ اس پر ملک کے قانون کے تحت مقدمہ چلا، وہ سزایاب ہوا اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔ مگر میں اس چھوٹے سے آدمی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے تین سال تک حکومت کی طاقت کو حقیر بنائے رکھا اور اپنے اچھے چلن سے جیل میں اپنے محافظوں کی تعریف کا سزاوار ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کو نرم سزا دی جاتی کیونکہ اس کو پیدائشی مجرم گردانا گیا اور سنبھلنے کا موقع نہیں دیا گیا اور جب طاقت اس کے ہاتھ میں تھی اس نے غریبوں پر ظلم نہیں کیا۔ جب میں اس کا تعاقب کرتا ہوا برگد کے پیڑ تک پہنچ گیا تھا اس نے میری اور میرے دوستوں کی جان بخش دی (سلطانہ اسی برگد کے پیڑ پر چھپا ہوا تھا) اور آخر میں جب وہ فریڈی ینگ سے ملاقات کرنے کے لیے گیا تو اس کے ہاتھ میں چاقو یا ریوالور نہیں تھا، تواضع کے لیے ایک تربوز تھا۔" (ص - ۱۳۰ - ۱۳۱)

وہ چماری پر مضمون ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہمارے عیسائی عقیدے کے مطابق چماری لامذہب تھا اور اچھوت جاتیوں میں سب سے نیچی جات کا آدمی لیکن اگر مجھے وہاں جانے کا اختیار مل جائے جہاں چماری مرنے کے بعد گیا ہے تو میرا قلب مطمئن ہو جائے گا۔" (ص ۱۰۳)

لہٰذا اس کو غریبوں سے بہت محبت ملی۔ خاص طور پر کمایوں و گڑھوال کا غریب طبقہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کو "سفید سادھو" کہتے تھے۔ اس نے مائی انڈیا میں لکھا ہے۔

"... . کھیا کی بیوی نے میرے لیے کھانا تیار کیا جس کو اس کی لڑکیوں نے پیتل کی تھالیوں میں میرے سامنے لاکر رکھا۔ وافر اور پسندیدہ کھانا کھانے کے بعد — میں نے اس دن کھانا بالکل نہیں کھایا تھا۔ میں نے تھالیوں کو قریب کے چشمے میں دھونے کے خیال سے اٹھایا۔ یہ دیکھتے ہی تینوں لڑکیاں دوڑی دوڑی آئیں اور تھالیاں چھین لیں اور انھوں نے سر کو جھٹکا دیکر ہنستے ہوئے کہا کہ ان تھالیوں کے دھونے سے جن میں سفید سادھو نے کھانا کھایا ہے ان کی جات ختم نہیں ہو جائے گی۔ لڑکیاں برہمن تھیں۔" (ص ۱۲)

دراصل یہی وہ اپنائیت کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ ہردلعزیز ہوا۔ محبت و خدمت تو فاتح عالم ہے۔ اس نے غریبوں سے محبت کرکے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوکر اور اپنی زندگی کو بار بار خطرے میں ڈال کر ان کی خدمت کی۔ یہی سبب ہے کہ لوگوں نے اس کو فراموش نہیں کیا ہے۔ گذشتہ سال اس کی صد سالہ برسی منائی گئی ہے جس کے سلسلے میں کالاڈھونگی کے باشندوں کو نینی تال کے اس بنگلے میں آنے اور تقریب میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی جس میں ۱۰۰ برس قبل وہ پیدا ہوا تھا۔ کالاڈھونگی کے مکان کو اس کی یادگار میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ کاربٹ نیشنل پارک تو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ رُدرپریاگ میں جہاں اس نے ۲ مئی ۱۹۲۶ء کو آدم خور گلدار ہلاک کیا تھا، ایک سفاری لاج بنانے کا پروگرام ہے۔ نارتھ ایسٹرن ریلوے نے ترائی ویکلی اکسپرس کو، جو لکھنؤ اور کاٹھ گودام کے درمیان چلتی ہے، اس کے نام سے معنون کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کی کتابوں کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ ہو تاکہ عوام اس کے خیالات اور کارناموں سے واقف ہوں۔ ہلدوانی سے رام نگر جانے والی بن سڑک کا نام جم کاربٹ مارگ رکھ دیا جائے (اگر ہنوز اس سڑک کا کوئی نام نہ رکھا گیا ہو) کیونکہ یہ وہ سڑک ہے جس کے چپے چپے پر اس کے قدموں کے نشانات ہیں۔ ان جگہوں پر جہاں اس نے آدم خور شیر و گلدار ہلاک کیے ہیں یادگاری پتھر نصب کرا دیے جائیں۔ مختلف درجات کے انگریزی کے نصاب میں اس کے قصے یا ان کا خلاصہ شامل کیا جائے تاکہ ہمارے بچے نہ صرف اس سے واقف ہوں بلکہ ان کے دل میں جنگل کی زندگی کے تحفظ کا خیال پیدا ہو۔

جم کاربٹ نے مرنے سے پانچ چھ برس پہلے نیروبی (کینیا۔ مشرقی افریقہ) میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں وہ دمہ کے مرض میں مبتلا ہوکر بہ عمر ۸۰ سال بہ مقام نیری ۱۹ اپریل ۱۹۵۵ء کو فوت ہوا۔

★

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

غریبی کے خاتمے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی ضروری ••• انسان کی بقا کے لیے کنبہ بندی ناگزیر ••• خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دینا ریاستی حکومت کے ملازمین کے فرائض میں شامل ••• خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں محکمۂ تعلیم کا سب سے بڑا حصہ ••• نس بندی آپریشنوں میں ریاست بھر میں ضلع مظفر نگر سرِ فہرست ••• خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے سلسلے میں گاؤں سبھاؤں کا تعاون حاصل کرنے کی ہدایت ••• کانپور کے دیہات میں دو دن کے اندر ۸۵۰ سے زیادہ نس بندی آپریشن ••• کمزور طبقوں کو گھریلو صنعتوں کے قیام کے لیے مالی امداد ••• اعظم گڈھ میں کمزور طبقوں کو دو کروڑ روپیہ کے بینک قرضے ••• اخباری نامہ نگاروں کو بسوں میں مفت سفر کی سہولتیں ••• اترپردیش میں ۱۵۰۰ کیلومیٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کا تیز رفتار پروگرام ••• سرکاری ملازمین کے تبادلے کے سلسلے میں سیاسی دباؤ پر کابینہ کا اظہارِ برہمی

وزیرِ اعلا شری نرائن دت تیواری نے آگاہی دی کہ آبادی میں اضافہ کی موثر روک تھام کے بغیر غریبی دور نہیں کی جا سکتی ہے۔

وزیرِ اعلا نے پیلی بھیت میں آیورویدک کالج میں ایک خاندانی منصوبہ بندی کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ پیداوار میں ڈھائی گنا اضافہ ہوا ہے، لیکن اس کے تناسب سے فی کس آمدنی نہیں بڑھ رہی ہے جس کا سبب آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہے۔

شری تیواری نے بتایا کہ ریاست میں ڈیڑھ کروڑ "اہل افراد" ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ سماج کے تمام طبقے منصوبہ بندی اور ترقی کے فائدے اٹھائیں تو آئندہ پانچ چھ برسوں میں ان اہل افراد کی نس بندی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی مذہب میں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ جو لوگ مذہب کے نام پر خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں افواہیں پھیلاتے ہیں وہ دراصل غریبی دور کرنے کی ہماری کوششوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

وزیرِ اعلا نے ان سات کارکنوں کو ٹرانسسٹر تقسیم کیے جنھوں نے ضلع میں خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج کے سلسلہ میں قابلِ تعریف کام کیا ہے۔

پیلی بھیت کے ضلع مجسٹریٹ شری آر۔ کے ماتھر نے وزیرِ اعلا کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ ضلع میں اب تک ۳۹۳۶ نس بندی آپریشن کیے جا چکے ہیں۔

⁂

وزیرِ اعلا شری نرائن دت تیواری نے علی گڈھ میں اعلان کیا کہ کنبہ بندی ملک کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گئی

ہے۔ انھوں نے کہا کہ کنبہ بندی پروگرام پر آج دنیا کے تمام ترقی پذیر ملکوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔ شری تیواری نے آگاہی دی کہ اگر ہم اضافہ آبادی کی روک تھام نہیں کرتے تو غریبی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

شری تیواری نے واضح الفاظ میں کہا کہ کنبہ بندی کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس ضرورت کو عوام کے ذہن نشین کرنا اور اس پروگرام میں تعاون دینے کے لیے انھیں آمادہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ نس بندی کے بجائے اسے "نو بندی" کہنا چاہیے کیونکہ اس کا مقصد کنبہ کو محدود کرنا ہے۔

شری تیواری ضلع علی گڈھ کے ملکھان سنگھ اسپتال میں خاندانی منصوبہ بندی کے دس بہترین کارکنوں کو انعامات تقسیم کرنے کے بعد تقریر کر رہے تھے۔ انعام پانے والوں میں ڈاکٹر این کے سکسینہ (سرجن)، ڈاکٹر آر۔ اے سنگھ (پیتھالاجسٹ)، شری داؤ دی شرما (ضلع اطلاعات افسر) شری گوری شنکر سنگھ چودھری (بی ڈی او) شری سراج الملک (نائب تحصیلدار)، شری نیک رام سنگھ (سینیٹری انسپکٹر)، شری نند لال سنگھ (سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) شری امر سنگھ (گرام سیوک) شری کھنیچپر ل گوت (لیکھ پال) اور شری کرن سنگھ سرلنگی (سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) شامل ہیں۔

❋ ❋ ❋

ریاستی حکومت نے ایک مقررہ تعداد میں لوگوں کو خاندانی منصوبہ بندی پروگرام اپنانے کے لیے راغب کرنا ریاستی حکومت کے ہر ملازم کے لیے فرائض کا ایک جز قرار دیا ہے جیسا کہ یو۔ پی سرکاری ملازمین (خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خصوصی ضوابط) قواعد، ۱۹۷۶ء کے قاعدہ ۱۱ کے تحت بندوبست ہے۔

اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو بعض اخبارات میں، جن میں پاینیر بھی شامل ہے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ "صرف محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کے ملازمین کے لیے خواہ وہ اہل ہوں یا نہ ہوں یہ ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دیں، کیونکہ یہ ان کے فرائض میں شامل ہے۔" یہ خبر صحیح نہیں ہے اور نہ محکمۂ علاج وصحت کے سکریٹری نے یہ بات کہی ہے۔ اس سے ایک غیر ضروری الجھن اور غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔

❋ ❋ ❋

ریاست میں نس بندی آپریشنوں کی کل تعداد اب تک ۴۲۶۰۸۷ تک پہنچ گئی ہے جو ریاست کے لیے مقررہ قومی نشانہ کے ۱۰۶ فی صد سے زیادہ ہے۔

گزشتہ ۳۰ دنوں کا نس بندی کا یومیہ اوسط ۹۷۵۶ ہے۔

اس سلسلہ میں محکمۂ تعلیم کا فی صد سب سے زیادہ ہے جس نے ۱۰۰۸۳۶ نس بندی آپریشن کرائے۔ مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں کارگزاری کے فی صد کے اعتبار سے محکمۂ مال دیگر تمام محکموں سے آگے ہے جس نے ۹۰ فی صد سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔

❋ ❋ ❋

ضلع مظفر نگر نے جہاں گزشتہ ۱۷ اکتوبر کو یعنی صرف ایک دن میں ۱۳۲۷ نس بندی آپریشن کیے گئے، ریاست کے دیگر اضلاع پر اپنی سبقت کو برقرار رکھا۔ اس ضلع میں نس بندی آپریشنوں کی تعداد ۵۳۶۳۲ تک پہنچ گئی ہے اور یہ اپنے قریب ترین حریف ضلع میرٹھ جہاں ۹۱۴۴۵ نس بندی آپریشن کیے جا چکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۱۴ نس بندی آپریشنوں سے سبقت لے گیا ہے۔ ریاست میں نس بندی آپریشنوں کی کل تعداد ۴۲۷۱۵۹ تک پہنچ گئی ہے جس میں مردوں کے ۴۲۰۷۲ نس بندی آپریشن شامل ہیں۔ یہ تعداد ۴ لاکھ نس بندی آپریشنوں کے قومی نشانہ کی

۱۲۳ء۱۷ فی صد۔ ۱۰، ریاست کے ۱۵ لاکھ کے نشانہ کی
۲۲۳ء۸۴ فی صد ہے۔ مظفر نگر اور میرٹھ کے علاوہ دیگر پانچ
اضلاع جو اس پروگرام میں پیش پیش ہیں یہ ہیں ۔ گورکھپور
(۱۶۲۰۶ نس بندی آپریشن)، لکھنؤ (۱۴۹۲۰)، الہ آباد
(۱۴۷۷۳)، کانپور (۱۴۴۳۸) اور آگرہ (۱۳۶۳۱)۔
ریاست میں نس بندی آپریشنوں کا یومیہ اوسط بڑھ کر
تقریباً ۶۰۰۰ ہے۔

***

اترپردیش کے زرعی پیداوار کمشنر شری کرپا نرائن سریواستو
نے ریاستی محکمۂ پنچایت کو ہدایت کی ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ
بندی کے قومی پروگرام کے سلسلہ میں گاؤں سبھاؤں کے پردھانوں
سرپنچوں، بلاک پرمکھوں اور سماجی کارکنوں کا تعاون حاصل کرے۔
انھوں نے کہا ہے کہ مذکورہ افراد کا تعاون حاصل کرنے
کے لیے بلاک کی سطح پر سمیلن منعقد کیے جانا چاہییں اور ان
سمیلنوں میں خاندانی منصوبہ بندی نمائش اور خصوصی نس بندی
کیمپوں کا اہتمام بھی کیا جانا چاہیے۔ ان کیمپوں میں صرف ان
لوگوں کی نس بندی کی جانا چاہیے جنھیں غیر سرکاری کارکنوں نے
ترغیب دی ہو۔
انھوں نے مزید ہدایت کی کہ محکمہ میں ایسے پردھانوں
سرپنچوں اور پرمکھوں کی ایک باقاعدہ ہفتہ وار فہرست تیار
کی جانا چاہیے جو نس بندی کرائیں۔

***

وزیر ہریجن و سماجی بہبود ڈاکٹر چرن سنگھ کے ۱۱ اور
۱۲ اکتوبر کے دو روزہ دورہ میں کانپور (دیہات) میں ۸۵۰
نس بندی آپریشن کیے گئے جو بجائے خود ایک ریکارڈ ہے۔
ڈاکٹر چرن سنگھ نے اپنے دورہ کے دوران بلہور،
ڈیرہ پور، اکبرپور، بھوگنی پور (پکھرایاں)، گھاٹم پور اور
بدھنو کے خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں کا معائنہ کیا۔
انھوں نے متعدد عوامی جلسوں سے بھی خطاب کیا جن میں انھوں نے
ملک کی معاشی ترقی کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت واضح کی اور اُسے
اپنانے پر زور دیا۔ ڈاکٹر چرن سنگھ نے توہمات اور شرارت
آمیز افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف عوام کو خبردار کیا۔
بلہور میں نس بندی کرانے والوں کو قرعہ اندازی کے
ذریعہ انعامات دیے گئے۔ ان انعامات میں گھاس کاٹنے کی
ایک مشین۔ دو سلائی مشینیں، تین ٹرانزسٹر (دو کمبل) اور
ایک سائیکل شامل ہے۔ اس کے علاوہ اکبرپور میں
نس بندی کرانے والوں کو دیگر ترغیبی سہولتوں کے علاوہ ایک
ایک دھوتی بھی دی گئی۔

***

ریاستی حکومت نے ڈی نوٹی فائڈ قبیلوں کو گھریلو
صنعتیں قائم کرنے کے لیے مالی امداد دینے کی غرض سے ایک
لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔ اس کے علاوہ تسلیم شدہ
اداروں میں قبائل مندرجہ فہرست کے طلباء کو نویں اور
دسویں درجوں میں مفت تعلیم حاصل کرنے کی سہولت
دینے کے لیے ۱۰۰۰۰ روپے کی رقم بھی منظور کی گئی ہے۔
مزید برآں مذکورہ بالا قبائل اور خانہ بدوش قبیلہ کے
افراد کی بحالی کے لیے تین لاکھ روپیہ اور اقوام مندرجہ فہرست
کی بحالی اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے ۲۵۰۰۰
روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

***

یونین بینک آف انڈیا نے ضلع اعظم گڑھ میں کمزور طبقوں
کی امداد کے لیے دو کروڑ روپیہ کے قرضے دیے ہیں۔ ان میں سے
اب تک تقریباً ۵۰ فی صد قرضے ترجیحی پروگراموں کے لیے اور
پسماندہ علاقوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔
ان قرضوں سے مستفید ہونے والے ۲۸۷۶ افراد کو ۴
فی صد سالانہ کی تفریقی شرح سے سود ادا کرنا ہوگا۔ اس کے
علاوہ ۳۲۱۶ چھوٹے کسانوں کو ٹریکٹر و ٹیوب ویلوں، پمپنگ
سیٹوں، سور پالنے، ڈیری اور گوبر گیس کے چھوٹے پلانٹ لگانے

کے لیے بھی قرضے دیے گئے ہیں۔ مزید یہ آں ۱۰۹ چھوٹے دکانداروں نیز خود اپنا کاروبار کرنے والے ۱۴۶۲ افراد اور ۱۳۳۴ نئے زمین مالکوں کو بھی قرضے دیے گئے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی کابینہ نے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کی صدارت میں منعقدہ اپنے ایک جلسہ میں ریاستی حکومت کے صدر مقام پر تسلیم شدہ اخباری نامہ نگاروں کو ہر سال کے لیے اترپردیش ریاستی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسوں کے ذریعہ ... ۵ کیلو میٹر تک کے مفت سفر کی سہولتیں فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

حکومت اترپردیش نے ریاست میں ۲۰ کروڑ روپیہ کی تخمینی لاگت سے ۱۵۰۰ کیلو میٹر سے زیادہ لمبی کچی سڑکوں کی از سر نو تعمیر اور انھیں پختہ کرنے کے لیے ایک تیز رفتار پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شری بلدیو سنگھ آریہ وزیر تعمیرات عامہ اور غذا و رسد نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام کے تحت جن سڑکوں کی تعمیر کی جائے گی وہ سب کی سب اس سے قبل امدادی کاموں اور تیز رفتار پروگراموں کے تحت تعمیر کی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ ان سڑکوں کو پختہ کرنے کا کام آئندہ مارچ تک مکمل ہو جائے گا۔

شری آریہ نے کہا کہ ان میں سے ۸۱ کیلو میٹر سڑکوں کی تعمیر اور انھیں پختہ کرنے کا کام ریاست کے لوک سبھا کے ۸۵ انتخابی حلقوں میں سے ہر حلقہ میں کیا جائے گا۔ وزیر موصوف نے اس اثناء میں محکمۂ تعمیرات عامہ کے افسروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تمام لوازمات مکمل کر لیں اور پروگرام کو مقررہ مدت کے اندر پورا کرنے کے لیے سرگرم کار ہو جائیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اترپردیش کابینہ نے اپنے جلسہ میں فیصلہ کیا ہے کہ ایسے سرکاری ملازمین کے اعمالنامہ میں ناموافق اندراجات کیے جائیں گے جو اپنے تبادلے کے معاملہ میں سیاسی دباؤ کا استعمال کریں گے۔

کابینہ نے سرکاری ملازمین کے تبادلوں کے سلسلہ میں ڈالے جانے والے سیاسی دباؤ کو ایک سنگین معاملہ تصور کرتے ہوئے اس بات پر اظہار تشویش کیا کہ سرکاری احکام جاری ہونے کے باوجود سیاسی دباؤ کے زیر اثر تبادلے کرانے کا رجحان اب بھی برقرار ہے۔

کابینہ نے اس سلسلے میں یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم اپنے تبادلہ کے احکام مل جانے کے بعد حسب قاعدہ منظور شدہ وقفہ میں اپنے نئے منصب کی ذمہ داری نہیں سنبھالتا ہے تو اس کی غیر حاضری کو ناجائز تصور کیا جائے گا اور اسے اس مدت کی تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ جو سرکاری ملازمین اپنی تعیناتی کے نئے مقامات پر نہیں پہنچیں گے انھیں کوئی پیشگی سفر بھتہ نہیں دیا جائے گا۔

★

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

تذکرۂ معاصرین: مالک رام۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۷۴ء
جسامت: ۲۲×۱۴ سینٹی میٹر۔ ضخامت: ۳۴۲ صفحات
قیمت: پندرہ روپے۔

جناب مالک رام کی شخصیت اردو داں طبقے کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بلند پایہ محقق اور ادیب ہیں۔ "غالبیات" کے سلسلے میں ان کے تحقیقی کارنامے ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ تذکرہ معاصرین' مالک رام کی ان تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو وفیات کے عنوان سے علمی مجلس' دلی کے سہ ماہی جریدے تحریر میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران وفات پانے والے چھ درجن سے زائد ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ محدود وقت میں بہ عجلت رسالے کے لیے سپرد قلم کی جانے والی تعزیتی تحریروں میں تحقیق کے اعلا معیار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے تذکرۂ معاصرین کو جو قارئین اپنی بے جا توقعات کے تحت تحقیقی کارنامہ سمجھ بیٹھے انھیں مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ مرحومین کے بارے میں تعزیتی اور تاثراتی تحریروں میں تحقیق کے بلند معیار کا مطالبہ کرنا فضول ہوگا۔

زیر تبصرہ کتاب کو ادیبوں اور شاعروں کے ہلکے پھلکے سوانحی خاکوں کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ابھی بہت زیادہ ترقی یافتہ صنف نہیں۔ ان حالات میں ہمیں ان چند گنے چنے صاحبانِ قلم کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے جو اردو خاکہ نگاری جیسی کمزور صنف کو توانائی بخش کر اسے اس کے تاریک ماضی اور دھندلے حال سے نکال کر ایک روشن مستقبل سے ہمکنار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

تذکرہ معاصرین کے یہ خاکے کہیں مفصل ہیں اور کہیں مختصر۔ ظاہر ہے کہ محدود وقت میں ہر مرحوم شاعر یا ادیب کے حالات کی فراہمی میں یکساں طور پر کامیابی نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ کتاب میں شامل درجنوں ادیب یا شاعر ایک ہی درجے کے بھی نہیں۔ شخصیتوں کے حالات ان کے مدارج کے اعتبار سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ قدر اوّل کی کسی مرحوم ہستی کے بارے میں جتنا لکھا جائے گا معمولی درجے کا شاعر اس کا مستحق نہیں ہوگا۔

زیر تبصرہ کتاب میں ہمیں اپنے درجنوں شاعروں کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی مل جاتا ہے۔ ان شاعروں میں ایسے بھی ہیں جن کا نمونۂ کلام ہم میں سے بہت سے لوگوں نے اسی کتاب میں پہلی بار دیکھا ہے لیکن ان میں ایسے شاعر بھی ملتے ہیں جن کے کلام کے مطبوعہ مجموعے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ جن شعرا کا کلام ہمیں آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے ان کی منظومات کو کتاب میں شامل کرنا درست ہے یا نہیں تو اس کا فیصلہ ہمیں زیر تبصرہ کتاب کے نام کو ملحوظ رکھ کر کرنا ہوگا۔ کتاب کا نام تذکرۂ معاصرین ہے اور ظاہر ہے کہ تذکرہ صرف حالات ہی کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ تذکرہ دراصل حالات اور کلام کا نام ہوتا ہے۔ عہدِ قدیم سے اب تک لکھے جانے والے فارسی اور اردو تذکرے اس قول کی تائید کرتے ہیں۔

تذکرہ معاصرین کے خاکوں میں کسی تحقیقی کتاب کی طرح شعرا کے حالات کے لیے ہر جگہ حوالوں کا مطالبہ کرنا یا ماخذ کو تلاش کرنا بھی بے سود معلوم ہوتا ہے کتاب کے تعارف (صفحہ ۶) میں مولف نے اپنے ماخذ کی جانب ان الفاظ میں خود اشارہ کردیا ہے کہ "... میں نے بالعموم مرحومین کے پسماندگان اور دوست احباب سے بھی استمداد کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ بے عیب اور غلطی سے مبرا ذات تو صرف خدا کی ہے اس لیے کاملاً صحت کا دعوا غلط ہوگا..." چناں چہ خود مولف کے اعتراف کے مطابق کتاب تسامحات سے بری نہیں تاہم اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب کار آمد فہرستوں اور اشاریوں سے آراستہ ہے جن سے اس کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت تسلی بخش ہے جس کے لیے مکتبہ جامعہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ تذکرہ معاصرین افادیت کے اعتبار سے یقیناً ایک ایسی کتاب ہے جو خریدنے اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ امید ہے کہ جناب مالک رام آئندہ بھی ادبی حلقوں کے لیے ایسی مفید کتابیں منظر عام پر لاتے رہیں گے جن کی مدد سے ہم عصر حاضر کے مرحوم شعرا کے حالات و کلام سے واقف و روشناس ہوتے رہیں گے۔

— کاظم علی خاں

جلد ۳۲ نمبر ۱۰

جنوری ۱۹۷۸ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: بال کرشن چترویدی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ

مضمون رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

صدیوں کا سفر ہمیں ۱۹۸۰ء میں لے آیا ہے۔ انسان بنیادی طور پر رجائیت پسند ہوتا ہے اور امید کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑتا۔ اسی لیے نگاہیں بہتر سے بہتر حالات کی متمنی ہوتی ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ہم امید کرتے ہیں کہ خوب سے خوب تر کی منزلوں کی جانب قدم بڑھانے کے لیے ۱۹۸۰ء کا سال زیادہ سے زیادہ سازگار اور خوشگوار ماحول ہمیں دے گا جو ہماری آرزو اور تمنا ہے تاکہ ہم اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ سکیں اور ایک ایسے خوشحال اور مثالی سماج کی تعمیر کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکیں جہاں نہ کوئی اونچ نیچ ہوگی، نہ غربت اور بیکاری۔ وہ سماج جہالت، تنگ نظری، فرسودہ اور ضرر رساں رسومات، مذہبی، نسلی اور لسانی عصبیت، فرقہ وارانہ جھگڑوں اور ذات پات کی تفریق سے بالکل پاک ہوگا۔ جہاں انسانی حقوق کے حصول کے لیے کسی کو جدوجہد کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اس سماج پر مساوات، اتحاد اور اعلا انسانی و اخلاقی قدروں کی حکمرانی ہوگی۔ یہ عظیم سچائی کہ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" اس طرح ہر شخص کے ذہن نشین ہو جائے کہ پھر کہیں اور کبھی فرقہ وارانہ تصادم نہ ہو سکے۔ سب ایک دوسرے کے مذاہب کا دل سے احترام کریں اور کوئی اختلاف کہیں ہو بھی تو وہ نفاق کی بنیاد نہ بن پائے۔

ایسے معاشرہ کی تعمیر کا خواب نیا نہیں ہے۔ انسان صدیوں سے یہ خواب دیکھ رہا ہے۔ تاریخ کے مختلف نشیب و فراز اور بحرانی ادوار سے گزر کے یہ خواب آج بھی زندہ ہے۔ اور اب اس کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی منزل کچھ زیادہ ہی قریب محسوس ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنے اس احساس کو بھی جوان رکھنا ہے، کیونکہ اسی سے ہمیں آگے بڑھنے اور عزم و عمل کی تحریک ملے گی۔

ہمیں یقین ہے کہ ۱۹۸۰ء کا سال اپنے ساتھ بے پایاں مسرتوں کا پیغام لے کر آیا ہے جس سے ہر گھر اور ہر دل روشن ہو اٹھے گا، ہر صبح امنگوں کی صبح ہوگی اور ہر شام محبتوں کی شام ہوگی۔

ہماری دعا ہے کہ یہ سال انسان کو انسان کے ظلم و استحصال سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلانے، رنگ و نسل کا امتیاز مٹانے اور سب کو انسانی رشتوں میں منسلک ایک قوم، ایک ذات یعنی صرف انسان کہلانے اور انسان سمجھے جانے میں سنگ میل ثابت ہو۔

اس مثالی سماج کی تعمیر کے لیے ہمیں ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ جدوجہد کرنا ہوگی۔ صرف آرزو کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عمل بھی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ ہماری آرزو ہے کہ ۱۹۸۰ء عالمی اور دائمی امن کا سال بن جائے اور سارے عالم میں ایک ایسی فضا پیدا کر دے جس میں کسی طرح کے تشدد اور جنگ کا تصور بھی محال ہو جائے۔ اور ہم بین الاقوامیت کی جانب تیزی سے گامزن ہو جائیں۔

ہماری تمنا ہے کہ نیا سال عزم و عمل کا سال ثابت ہو اور قارئین نیا دور نیز ہر اہل وطن کو مبارک ہو!! ہمیں یقین ہے کہ نیا سال ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک نئے دور کا نقیب ہوگا۔

——— ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

قومی جھنڈا اور قومی ترانہ

ہر آزاد اور خود مختار ملک کا اپنا ایک جھنڈا ہوتا ہے۔ وہ اس ملک اور قوم کی عزت، وقار اور فخر کا نشان ہوتا ہے۔ جب تک وہ ملک آزاد ہے، اس میں طاقت اور حوصلہ ہے اس ملک کا جھنڈا شان کے ساتھ لہراتا اور اپنی طاقت، عظمت، جاہ و جلال اور تمکنت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھاتا رہتا ہے۔ جب وہ ملک کمزور، پست حوصلہ اور غلام ہو جاتا ہے تو اس ملک کا جھنڈا بھی جھک جاتا ہے اور کسی دوسرے طاقتور ملک کا جھنڈا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ عالمی انقلابات کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ جھنڈے کے جھکنے اور ہٹائے جانے کا مطلب ہے اس ملک کی شکست، اور اونچے لہراتے رہنے کا مطلب ہے اس ملک کی فتح۔ جھنڈا بلند کرنے کا حق صرف آزاد ملک کو ہوتا ہے غلام ملک کو نہیں۔

ہمارے ملک بھارت کا بھی اپنا ایک جھنڈا ہے جسے ہم قومی جھنڈا کہتے ہیں۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہمارا پیارا ملک آزاد ہوا تب یہ ترنگا جھنڈا ہمارے ملک میں بلند کیا گیا۔ آسمان میں لہراتا ہمارا یہ جھنڈا بھارت کی آزادی اور خود مختاری کی علامت ہے۔ ہمارا ملک آزاد ہے۔ یہ جھنڈا بھی ہماری عزت اور وقار کا نشان ہے جس طرح اس نے قوتوں سے ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں میں لہرا کر سب کے دلوں پر ہمیشہ اپنا سکہ جمایا ہے، مستقبل میں بھی اسی طرح یہ ہمارا لوہا منواتا رہے گا۔

اگر ہم اس جھنڈے کی مختصر تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جن بیش بہا پھولوں سے اس گلدستہ کو سجا سجا کر یہ آخری شکل دی گئی ہے، اس کے پس پردہ کتنے راز پنہاں ہیں جن کی بنیاد ملکی اتحاد، باہمی میل جول، محبت، حب الوطنی اور جذبۂ حریت پر رکھی گئی ہے جو اس مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے جسے ہندستانی تہذیب کہتے ہیں۔ اس میں ہندو مسلم اور دیگر تمام مذاہب و مسالک کو برابر کا حق حاصل ہے۔ اسی سے تعصب، تنگ نظری اور فرقہ واریت کی تمام جڑیں کھوکھلی ہوتی نظر آتی ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۸۸۵ء میں قیام سے لے کر ۱۹۱۵ء تک اس کی ہر تقریب میں 'یونین جیک' ہی لہرایا جاتا رہا اس لیے کہ اس وقت تک کوئی قومی جھنڈا متعین نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار ۶-۱۹۰۵ء میں بیرونی ممالک میں رہنے والے ہندستانی نوجوانوں نے غلامی کے نشان 'یونین جیک' کی جگہ تین رنگ کے قومی جھنڈے کا خاکہ تیار کیا۔ اوپر زعفرانی رنگ جس میں آٹھ تارے بنے تھے، بیچ میں سفید رنگ جس پر 'وندے ماترم' لکھا تھا اور نیچے ہرا رنگ جس میں داہنی طرف سورج اور بائیں طرف چاند بنا ہوا تھا۔

قومی جھنڈا وضع کرنے کی دوسری کوشش ۱۹۱۶ء میں محترمہ اینی بیسنٹ نے کی۔ ان کے جھنڈے میں دو رنگ تھے۔ لال ہندوؤں کا اور ہرا مسلمانوں کا نشان۔ اس جھنڈے میں پانچ سرخ اور چار ہرے رنگ کی پٹیاں تھیں اس میں ایک طرف سات ستارے اور دوسری طرف 'یونین جیک' بنا ہوا تھا۔

تیسری کوشش پنجاب کے لالہ ہنس راج نے کی۔ ان کے جھنڈے میں لال اور ہرے ہندو اور مسلمانوں کے نشان کے صرف دو رنگ تھے جس میں بعد میں گاندھی جی نے دیگر مذاہب کے نشان سفید رنگ کو درمیان میں جوڑ دیا۔ اس جھنڈے میں گاندھی جی کا چرخا جو ہندستانی کسانوں اور مزدوروں کا نشان تھا، بنا ہوا تھا۔ عملی طور سے ۱۹۳۱ء تک یہی کانگریس کا جھنڈا رہا۔

اگست ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے قومی جھنڈے میں اوپر کا حصہ زعفرانی، درمیان کا سفید اور نیچے کا ہرا رکھنا طے کیا۔ اس میں بیچ کی سفید پٹی پر نیلے رنگ کا چرخا بنا ہوا تھا۔ حصول آزادی کی تاریخ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک یہی جھنڈا ہندستان کی جنگ آزادی کا جھنڈا برقرار رہا۔ البتہ ۱۵ اگست ۴۷ء کو بھارت کے آزاد ہونے پر قومی جھنڈے کی شکل میں اسی جھنڈے کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن چرخے کی جگہ چکرورتی بادشاہ اشوک کی شیر کی لاٹ کے دائرے (چکر) کو جگہ دی گئی جس سے دوسری جانب چرخے کے الٹے ہونے کی مشکل ختم ہو گئی۔ پھر دائرہ یا چکر تو ہماری پرانی تہذیب، کلچر اتحاد اور فخر کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں 'حرکت ہی زندگی ہے' کا پیغام بھی سناتا ہے۔ اب یہ جھنڈا ہمارا ہے، ہم سب کا یعنی پوری قوم کا ہے۔ اس قومی جھنڈے کا جیسے ہمارا آئین تسلیم کر چکا ہے، احترام اور ملک کی بقا و حفاظت کا اہتمام ملک کے ہر فرد پر یکساں واجب ہے۔

قومی ترانہ

قومی جھنڈے کی طرح قومی گیت بھی ہمارے ملک کی روح کی علامت ہے جو ہمیں اپنے ملک کی عظمت اور اہمیت کی یاد دلاتا ہے۔

ٹیگور نے ۱۹۱۲ء میں بنگلہ زبان میں اس کی تخلیق کی تھی۔ یہ گیت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آدھی رات کے وقت مجلس آئین ساز (پارلیمنٹ) کے تاریخی اجلاس میں گایا گیا تھا۔ پارلیمنٹ نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کے قومی ترانہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہ قومی ترانہ تنہا ہندوؤں کا نہیں، مسلمانوں کا نہیں، بنگالیوں کا نہیں بلکہ سب کا ہے، سب کے لیے ہے۔ ہر اس فرد کا ہے جو آزاد بھارت میں سانس لیتا ہے اور اپنے بھارت کو لافانی پیار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کسی زبان یا رسم الخط کی تخلیق صرف اسی تک محدود نہیں ہوتی۔ قومی ترانہ سے ملن کی خوشبو اور اتحاد کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ایک ہی جھنڈے اور ترانہ کے گلزار میں مذاہب کے رنگا رنگ گلدستوں کو سجا کر ملک کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ اسی لیے یہاں کے رہنے والے ہر فرد کے لیے اس کا احترام ضروری ہے۔

قومی گیت سے متعلق چند قابل غور باتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ قومی گیت کے گانے کی مناسب تربیت اصولی طور پر ہونا چاہیے۔

۲۔ قومی ترانہ کی نغمگی ایک مخصوص قسم کی ہے۔ لہذا اسی مقررہ لے میں اسے گانا چاہیے، حسب پسند طریقے پر نہیں۔

۳۔ قومی گیت اجتماعی طریقے سے گانا چاہیے۔

۴۔ جب اور جہاں قومی ترانہ گایا جا رہا ہو، ہمیں خاموش اور ساکت ہو کر اٹنشن کی حالت میں کھڑے ہو جانا چاہیے اور اس کے تئیں مناسب احترام، عزت، محبت اور عقیدت کا اظہار کرنا چاہیے۔

۵۔ قومی جذبہ سے لبریز اور سبھی تعلیم یافتہ ذہین افراد اور ایسے سبھی لوگوں کو جو قومی ترانہ سے متعلق اصول کی پابندی سے ناواقف ہیں، ضروری واقفیت کرانے کے ساتھ ساتھ قومی ترانے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالنا چاہیے۔

ایک اتنا مختصر ترانہ، جس میں ماضی کی تاریخ سے مستقبل تک کے تمام امکانات موجود نظر آتے ہیں اور جو جذبۂ حب وطن سے لبریز ہے، اس سے وہ سرشاری، وہ کیفیت وہ سرور پیدا ہوتا ہے کہ دل وجد کرنے لگتا ہے اور بار بار پڑھنے کو طبیعت چاہتی ہے۔

قومی ترانہ حسب ذیل ہے:

جن گن من ادھنایک جے ہے بھارت بھاگیہ ودھاتا

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

سید اطہر حسین

غزل

سارے ہنگامے ہیں یہ پردے کے اُٹھ جانے تک — ہر جگہ بھیڑ ہے کعبے سے صنم خانے تک

کیا عجب ہے کہ تپِ عشق جلا ڈالے مجھے — شمع کی آگ پہنچ ہی گئی پروانے تک

کچھ چمن تک نہیں محدود یہ فیضانِ بہار — آتشِ گُل کی لپک جاتی ہے ویرانے تک

کتنے افسانے حقیقت میں بدلتے دیکھے — ہم حقیقت تھے مگر رہ گئے افسانے تک

کتنے طوفانوں نے دروازے پہ دستک دی ہے — آندھیاں آئی ہیں کتنی مرے کاشانے تک

حُسنِ نیرنگ سے تھی تاب و تپِ بزمِ حیات — ہم کو سو روپ ملے خاک میں مِل جانے تک

حال نرگس کا چمن میں یہ ہوا تیرے بغیر — حسرتِ دید میں تکتی رہی مرجھانے تک

کسی اُمید کی بھٹکی ہوئی شاید ہے کرن — روشنی آ ہی گئی میرے سیہ خانے تک

نگۂ ناز نے کچھ ایسی ادا سے دیکھا — مر مٹے اہلِ جنوں، لُٹ گئے فرزانے تک

سوز و درد اتنا تھا روداد میں میری اطہر
اپنے تو اپنے ہیں، غمگیں ہوے بیگانے تک

جمیل مہدی

فردِ عمل کا حساب

فردِ عمل کے ذریعہ فردا کا حساب کرتے رہنے کی عادی قوم کو اقبال نے دستِ قضا میں شمشیر کی صورت بتایا ہے۔ انھوں نے اپنی زبردست خلاقانہ قوت کے ذریعہ ایک ایسی صداقت کو شعری جامہ پہنایا ہے، جسے تاریخ کی حرکت اور مزاج کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے، جو قوم ماضی سے روشنی حاصل کر کے مستقبل کے راستوں کو روشن کرنے کی عادی ہو، اپنی غلطیوں، لغزشوں اور خامیوں کا حساب باقاعدگی سے رکھ کر آئندہ کے لیے ان غلطیوں سے محتاط رہنے کے عزم کے ساتھ آگے بڑھتی رہے وہ زوال اور کمزوری کا شکار بنے رہنے سے بچی رہتی ہے، قوموں کے طلوع ہو کر غروب ہو جانے کے اسباب ملکوں اور خطوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہ ایک سبب ہمیشہ مشترک رہتا ہے کہ انھوں نے اپنی ترقی اور تنزلی کا احساس تازہ رکھا یا وہ اس احساس کو فراموش کر گئیں۔

ہندستان نے بھی فردِ عمل کا حساب رکھنے کے تاریخی تقاضے کو اٹھارویں صدی کے آغاز سے فراموش کرنا شروع کر دیا تھا اس لیے وہ انیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے نہ صرف اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھا بلکہ ایک ایسی سامراجی قوم کے پنجۂ غلامی کا اسیر ہو گیا جو اس کے طول و عرض کے سولہویں حصہ سے بھی کم علاقے پر حکمراں تھی، اور سات سمندر پار کر کے یہاں تجارت کے لیے آئی تھی۔

ہندستان کی انگریزی سلطنت کے قیام کے بارے میں ایک انگریزی سیاح نے بڑی عبرت ناک بات کہی تھی اور وہ یہ کہ "ہندستان میں انگریزی حکومت کا قیام تاریخ کا حیرت ناک واقعہ ہے، اور بظاہر یہ بات ناقابل یقین دکھائی دیتی ہے کہ کسی قوم نے اپنے خون کے ایک قطرے کی قربانی دیے بغیر ہی محض ہندستانی کالوں کی مدد سے ایک عظیم سلطنت قائم کر دی ہو۔"

اس سیاح کے مشاہدے نے جس بات کو حیرت انگیز بتایا تھا، اس کا خطرہ ہندستان میں اب تک بنا ہوا ہے، سب سے پہلی بات جو ہندستانی قوم کے یاد رکھنے کی ہے، اور کسی لمحہ فراموش کرنے کی نہیں ہے وہ یہی بات ہے کہ پھوٹ سے بچنا چاہیے۔ پھوٹ ہی وہ زہر آلود پھل ہے، جسے کھانے کے ہم عادی رہے ہیں۔ وہ اس کا خمیازہ ایک صدی کے قریب کی غلامی کی صورت میں بھگت چکے ہیں، پھوٹ ہی ایک ایسی منفی قوت ہے جو یہاں کے سورماؤں، قومی خدمت گزاروں اور عظیم قومی سپوتوں کی محنتوں اور خوابوں کو چکنا چور کرتی رہی ہے۔ ہندستان میں میر صادق، میر جعفر، پورنیہ اور ایسے ہی دوسرے لوگ ہمیشہ تعداد میں کم ہی رہے ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسے لوگوں کی سازش اور خفیہ ریشہ دوانیوں کے سامنے مضبوط ترین اور متحد قومی قوتیں جو فی الواقعہ سنگین فصیلوں کی حیثیت رکھتی تھیں، ریت کی دیواروں کی طرح بیٹھتی چلی گئیں اور کسی کے بنائے کچھ نہ بن سکا۔

ہندستان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے جنگ آزادی کی سربراہی کے لیے ایسے رہنما میسر آ گئے، جو تاریخی واقعات اور ہندستانی سماج کے اندر پائی جانے والی مضرت رساں

خرابیوں کا گہرا شعور رکھتے تھے، اسی لیے وہ انگریزوں کے ساتھ طاقت آزمائی اور کشمکش کے دور میں اتنے محتاط اور بیدار رہنے میں کامیاب رہ سکے کہ انگریزی سامراج کی پھوٹ ڈالنے کی ساری چالیں ان کی جانبازانہ جدوجہد اور دانش مندی کے سامنے بیکار ہو کر رہ گئیں۔ اس وقت جبکہ ملک ایک بار پھر یوم جمہوریت کے موقع پر اپنی آزادی اور دستور سازی کی سال گرہ منانے جا رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان نازک مراحل کی یاد تازہ کر لی جائے جن سے محفوظ طور پر گزر کر ہی ہندستانی قوم کا کارواں منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔

ہندستان کی بیداری کی تاریخ در اصل ۱۹۱۹ء کے جلیانوالہ باغ کے سانحے سے شروع ہوتی ہے جبکہ جنرل اوڈائر نے بے مثال سنگدلی اور بے رحمی کے ساتھ ایسے پر امن اور نہتے شہریوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جو ایک پارک میں احتجاجی جلسہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے، بربریت اور شقاوت کا یہ مظاہرہ اتنا خوفناک اور لرزہ انگیز تھا کہ پوری ہندستانی قوم کا ضمیر نفرت اور احساس ذلت سے انگریزوں کے خلاف بھر گیا۔ اس واقعہ نے اس مشہور تحریک خلافت کے لیے پس منظر کا کام کیا۔ جو ۱۹۲۰ء میں ایک ایسا طوفان بن کر کھڑی ہو گئی کہ اس کی بپھری ہوئی موجوں کے سامنے انگریزی اقتدار کا جہاز ڈانواڈول ہو کر چکراتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ۲۰ سے ۲۲-۲۳ تک کا زمانہ ہندستانی قوم کے بے نظیر اتحاد، رفاقت، یگانگت اور ہم آہنگی کے لحاظ سے ایک ایسا زمانہ تھا جو مثالی کہا جا سکتا ہے، ایک ایسا زمانہ جس کا فی الحال ہم خواب ہی دیکھ سکتے ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندستان میں کوئی ہندو، کوئی مسلمان، کوئی سکھ نظر نہ آتا تھا سب ہندستانی ہو گئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان گلال عبیر کے ساتھ ہولی کھیلتے اور سوامی شردھانند جامع مسجد دہلی کے منبر سے مسلمانوں کے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، اور پگڑیوں، داڑھیوں اور چوٹیوں سے ملا جلا رنگ برنگ مجمع چوراہوں پر بدیشی مال، مصنوعات اور کپڑوں کو نذر آتش کرنے کے بعد یا نہ دو میں بازو ڈال کر ناچتا گاتا نظر آتا تھا۔

اتحاد اور یگانگت کی اس فضا میں فرق پڑا تو اسی پھوٹ کی بدولت، انگریزوں کی چال کامیاب ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی حالت اس ملک میں جاگ پڑی کہ نہرو رپورٹ، شدھی سنگھٹن تبلیغ اور طرح طرح کے اختلافات کا شکار ہو کر پوری قوم ایک دوسرے کے ساتھ دست گریباں دکھائی دینے لگی۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے پر آمادہ اور ایک سنگین دیوار بن کر انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے پر کمر بستہ تھے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اتحاد کو دیکھ کر جو انگریز اس ملک سے اپنے اقتدار کی بساط تہہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے وہ اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ حکومت کرنے لگے، خلافت تحریک ناکام ہوئی لیکن اس کا سب سے بڑا حاصل یہ نکلا کہ ملک کو گاندھی جی کی شکل میں ایک ایسا لیڈر مل گیا جس کی قیادت میں بالآخر ہندستان نے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

۱۹۲۹ء میں کانگریس کا لاہور میں اجلاس ہوا اس میں اختلاف اور باہمی پھوٹ کی شکار ہندستانی قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو از سر نو متحد اور مجتمع کرنے کی کوشش کی، آزادی کامل کی تجویز پاس ہوئی، نہرو کی صدارت میں ہندستان مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا، نہرو رپورٹ دریائے راوی میں غرق کر دی گئی اور ۲۶ جنوری کو ایک یادگار قومی تہوار کی حیثیت سے منانے کا فیصلہ ہوا۔ کھلی ہوئی کمریں پھر سے کس گئیں، بیدلی اور مایوسی کا دور خاتمہ کے قریب پہنچا، پست ہمتی کو چھوڑ کر پوری قوم نئے عزم و ہمت کے ساتھ جنگ آزادی کے نئے معرکہ میں حصہ لینے کے لیے سفر پر روانہ ہوئی۔ اس نشاۃ الثانیہ کے امکان اور اتحاد کے خطرہ کو انگریزوں نے ایک بار بروقت محسوس کر لیا اور کمیونل ایوارڈ کے نام سے ایک نیا پانسہ سیاسی میدان میں پھینکا۔ اس پانسہ کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان از سر نو اتحاد کی امید ختم ہوئی اور ایک بار پھر اختلاف نے سر ابھارا، اس بار انگریزوں نے صرف

ہندو مسلم اختلافات تک اپنی کوششوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ ہریجن
ہندو تفرقہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ ڈاکٹر امبیدکر کی سرکردگی میں
ہریجن ایک الگ قوم ہیں کا نیا نعرہ بلند ہوا، گاندھی جی نے شروع
ہی میں اس نعرے کے تباہ کن انجام کو سوچ کر اس کا سد باب
کرنے کی برمحل کوشش کی اور اس کوشش میں اپنی جان کو داؤں
پر لگا دیا، انھوں نے غیر معین عرصہ کے لیے مرن برت رکھ کر قوم کو
مجبور کر دیا کہ وہ اس نئے اور زہر آلود نعرے کے تباہ کن مضمرات
کو سمجھے اور اس سے محفوظ رہے۔

گاندھی جی کی اس بے مثال جد و جہد کے باعث ہندو
ہریجن تفرقہ کا پودا تناور درخت تو نہ بن سکا لیکن اس کی تخم ریزی
ضرور ہو گئی جو مستقبل کے لیے خدشوں اور خطروں کو بنائے رکھے
اور قوم کو زیادہ سے زیادہ محتاط رہنے اور اس بیج کے دوبارہ
بار آور ہونے کے امکان سے باخبر رہنے کا مسلسل سبق دیتی رہتی
ہے۔ ہریجن ہندو تفرقہ کی کوشش میں ناکام رہ کر انگریز ڈپلومیٹوں
نے جو ۱۹۳۰ء کے عظیم الشان اتحاد کے مظاہرے سے خوف زدہ
اور ایسے حالات ہرگز پیدا نہ ہونے دینے کے فیصلہ پر اٹل تھے،
۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعہ نیا قانون اور محدود خود اختیار
حکومت ہندستانیوں کو دے کر نئے فتنوں اور اختلافات کے
نئے شوشوں اور نئے امکانات کی جستجو کا ڈول ڈالا اور ۱۹۳۷ء
کی صوبائی حکومتوں کے دور میں ہندو مسلم خلیج کو زیادہ سے زیادہ
وسیع کرنے پر اپنی ساری عیاری اور محنت اور میسر وسائل کو
صرف کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے درمیان کا فاصلہ
بڑھتے بڑھتے اتنا زیادہ ہو گیا کہ ۱۹۴۰ء میں تقسیم ہند کی تجویز
کی صورت میں دونوں قوموں کے سفر کی سمتیں اور منزلیں تک
الگ الگ ہو گئیں۔

گاندھی جی ۱۹۴۲ء میں، عالمی جنگ میں الجھے ہوئے انگریزوں
سے آخری میدان لینے کی کوشش کی اور ہندستان چھوڑو کے نعرے
کے ساتھ پوری قوم کو، ہندو اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ نصب العین
پر اکٹھا کرنے کا خاکہ بنایا لیکن انگریزوں نے ان کی یہ کوشش
اسی بربریت اور تشدد کے ذریعہ ناکام بنا دی جس کا نمونہ ۱۹۱۹ء
میں جلیانوالہ باغ میں پیش کر چکے تھے، کانگریس کے صدر مولانا آزاد،
گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور دوسرے سبھی نمایاں لیڈر گرفتار
کر لیے گئے، پورا ملک ایک ایسے وسیع قید خانے میں تبدیل ہو گیا
جس میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی سرگرم اور متحرک نہیں ہو سکتا تھا
جنھیں انگریز سرگرم اور متحرک رکھنا چاہتے تھے۔ کانگریس کو خلاف
قانون جماعت قرار دے دیا گیا، کانگریس کے وہ سارے کارکن
جو گرفتاری سے بچ نکلے تھے خفیہ طور پر تحریک چلانے پر مجبور ہو گئے،
ان کا رشتہ عوام سے مکمل طور پر کاٹ دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء سے
۱۹۴۵ء تک کے پورے تین سال تک انگریزوں کو اپنی حکمت
عملی اور ڈپلومیسی کے پھندوں کو کسنے کا سنہری موقع حاصل رہا،
انھوں نے اس عرصے میں تقسیم ہند کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ ان کی
پوری کوشش اور تمنا یہ تھی کہ برصغیر میں ایسی دو حکومتیں قائم
ہو جائیں جو مذہبی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ برسرِ
پیکار رہنے پر مجبور رہیں، ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے نام
سے ہندستان کے علاقوں کی علیحدگی اور وہاں مذہب کی
بنیاد پر حکومت قائم ہونے کا فطری اور قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ
ہندستان میں بھی مذہب کی بنیاد پر حکومت قائم ہو جائے گی
اور یوں برصغیر میں مذہبی منافرت کی فضا ہمیشہ قائم رکھ کر اقتصادی
سیاسی طور پر نہ سہی اور دوسری صورتوں میں یہاں موجود رہ کر
ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل رہے گا۔

ان کی اس خواہش اور پروگرام کو ناکام بنایا ان لیڈروں نے
جو اس کی تہ میں چھپے ہوئے خوفناک عزائم کو پوری طرح سمجھ گئے
تھے، اور اپنی دور اندیشی کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ مذہبی
بنیاد پر منافرت کا مقابلہ سیکولر اور نامذہبی ریاست کے قیام کے
سوا کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں۔ اسی لیے انھوں نے ایک ایسے
اشتعال انگیز اور نازک وقت میں بھی کہ ہندستان اور پاکستان
کی سڑکوں پر انسانی خون بہہ رہا تھا اور مذہبی جنون سے نیم دیوانگی
کی حد تک پہنچے ہوئے لوگ اپنے ہی جیسے انسانوں کو موت اور ہلاکت

کے گھاٹ اتارنے میں مصروف تھے۔ اس ملک میں بلا امتیاز مذہب و ملت مساوی حقوق و اختیار اور مساوی فرائض و آزادی کے ساتھ جمہوری حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اقتدار اعلیٰ عوام کو سونپ کر دستور اور قانون کی بالادستی کو امتیاز رنگ و نسل سے بالاتر قرار دے کر ایسے جمہوری اداروں کی تشکیل و تاسیس کر دی جو سارے ہندستان کے باشندوں کو نہ صرف ایک قوم کے رشتہ میں مربوط رکھنے میں معاون ثابت ہوں بلکہ مشکل وقتوں میں جمہوری نظام کے تحفظ اور دفاع کا فریضہ بھی کامیابی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا، انگریز اس ملک سے دست بردار ہو کر رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوئے لیکن وہ یہاں کی سماجی اور سیاسی تہہ کے نیچے ایسے ٹائم بم چھپا کر رکھ گئے جو وقتاً فوقتاً پھٹ کر یہاں کی فضا کو دھماکوں اور ہلچل سے لبریز کرتے رہتے ہیں۔ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ آزادی کے حصول کی منزل آنے تک ہندستان کے تجربہ کار اور آزمودہ رہنماؤں کا پورا قافلہ زندہ اور موجود رہا اور انھوں نے ماضی کی تاریخ اور اس کے سبق کو پوری طرح ذہن میں رکھ کر ہندستان کے مستقبل اور اس کی تصویر کو بنانے میں اپنی دانش مندی، دور اندیشی، تدبر، اخلاص اور محنت کا پورا سرمایہ خرچ کر کے اس ملک کی بنیادوں کو اپنے خون اور پسینہ سے مضبوط کیا، گاندھی جی نے اپنی جان قربان کر کے، ہندو مسلم تعلقات کی تقدیر ایسے پائیدار قلم سے کندہ کر دی کہ اس تحریر کو کھرچ کر کوئی نئی تحریر لکھے جانے کا امکان ہی باقی نہ رہا، سردار پٹیل نے سیکڑوں کی تعداد میں پھیلی ہوئی، نیم خود مختار ریاستوں کو ملا کر جو سیکڑوں پیچیدہ مسائل اور لاتعداد خطروں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے تھیں، ایک متحد اور عظیم الشان ملک میں تبدیل کرنے کا حیرت ناک کارنامہ انجام دیا، مولانا آزاد نے اپنی فکر و ذہن کا سرمایہ اس ملک کی خارجی اور داخلی حکمت عملی کے خد و خال بنانے میں خرچ کیا، جواہر لال نہرو نے اس کی مشہور عالم غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی مرتب کی اور اس ملک کو جو ایک صدی کی بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں افلاس کی آخری پستیوں تک پہنچ چکا تھا ایک جدید اور صنعتی ملک بنانے کے لیے سترہ برسوں تک خواب و خور اپنے اوپر حرام کیے رکھا۔

ان لوگوں کی بے مثال خدمت، لاثانی جد و جہد اور ان تھک محنتوں کے طفیل یہ ملک آج ترقی پذیر ملکوں کی صف میں نمایاں مقام کا مالک بنا ہوا ہے لیکن خطروں سے باہر نہیں ہے، وہ ٹائم بم جو اس کی آزادی کے اولین دور میں اس کی تہوں میں چھپا کر رکھے گئے تھے ابھی تک ختم اور ناکارہ نہیں ہوئے ہیں، وہ جنگوں، تصادم تفریق و منافرت کی شکل میں وقفہ وقفہ سے پھٹتے رہتے ہیں، وہ جمہوریت بھی ابھی تک اندیشوں اور خدشوں سے آزاد رہ کر بے خوف و خطر پھولنے پھلنے اور بے فکری کے ساتھ نشو و نما کے مراحل سے گزرتے رہنے کی قوت پوری طرح حاصل نہیں کر سکی ہے، جسے ہندستان کے ان عظیم رہنماؤں اور مادر وطن کے سچے سپوتوں نے اس کی تقدیر کے طور پر متعین کیا تھا۔ حال ہی کے واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسے محدود و مقید کرنے کی کوششیں ہو سکتی ہیں، وقتی طور پر ایسی کوششیں کامیاب بھی ہو سکتی ہیں، اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ خطرے موجود ہیں اور کسی بھی وقت کسی بھی طرف سے آ سکتے ہیں۔

ایک ناگوار اور تاریخ آزادی ہند کا افسوس ناک دور ابھی ختم ہوا ہے اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہندستان کے عوام کی اپنی بیداری، خودداری، خود شناسی اس دور کے خاتمہ کا باعث بنی ہے جس نے جمہوریت کے بنیادی اداروں، عدلیہ، مقننہ، انتظامیہ اور رائے عامہ کے شعبوں کو بڑے سنجیدہ خطروں سے دوچار کر دیا تھا، لیکن محض اس اعتماد پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا کافی نہیں ہے کہ عوام بیدار ہیں اور اپنی تقدیر اور جمہوریت کے تحفظ کی ذمہ داری کو بخوبی محسوس کر سکتے اور نبھا سکتے ہیں، اصل ضرورت چوکنے اور محتاط رہنے کی ہے اور ردعمل کا حساب کرتے رہنے کی عادت کو برقرار رکھنے کی ہے، اور بڑے مقاصد کو نظر انداز کر کے چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل میں الجھنے سے بچنے کی ہے، انتظامیہ کو چاق و چوبند اور

چوکس رکھنے کا مسئلہ ہے، رائے عامہ کا جذباتی، گروہی اور فرقہ وارانہ کے بکھیڑوں سے پاک رکھنے کا مسئلہ ہے، ماضی کی غلطیوں، لغزشوں کے اسباب پر نظر رکھنے اور مستقبل میں ان سے محفوظ رہنے کی تدبیروں کا مسئلہ ہے، مذہبی منافرت اور فسادات کے امکان کو مسدود رکھنے کا مسئلہ ہے، ہتر کن ہند و تفریق اور ہندو مسلم تعلقات میں خرابیوں سے محفوظ رہنے کا مسئلہ ہے یہ مسائل ماضی میں سر ابھار کر ہندستان کی آزادی کو کتنے ہی خطروں اور مشکلات میں گرفتار کر کے اپنی اہمیت اور مضرت کو ثابت کر چکے ہیں، سب سے اہم ضرورت ایک فلاحی ریاست کے قیام اور اقتصادی اعتبار سے خود کفیل ملک کی تعمیر کی ضرورت ہے، اقتصادی کمزوری وہ واحد سبب ہے جو فرقوں، گروہوں، برادریوں اور علاقوں کے درمیان مسابقت اور آویزش کو پیدا کرتا ہے، اور اقتصادی بدحالی کا نشانہ سب سے پہلے امن و انتظام کے ادارے بنتے ہیں، ایک پُرامن انقلاب کے ذریعہ جمہوریت کی بحالی کی ضرورت پوری ہو چکی ہے، لیکن جمہوریت کو خطرہ صرف آمریت سے ہی نہیں ہوتا، بدامنی، پھوٹ اور فتنہ و فساد اصل روگ ہیں جو اس نظام کی جڑ کو کھوکھلا کر کے اسے اتنا کمزور کر دیتے ہیں کہ عملی طور پر اس کی گرفت سماج اور سیاست دونوں پر سے ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

یوم جمہوریت کے موقع پر ماضی کا حساب اور مستقبل کا اندازہ کرنا بھی اس یادگار دن کے اصل تقاضے اور مقصد کو پورا کرتا ہے، اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہم ماضی کی گہرائیوں میں جا کر ان کوتاہیوں ان اسباب اور غلطیوں کا پتہ لگائیں، اور ان کو دہرانے سے باز رہیں جنھوں نے ملک کو کمزور اور اس کی رفتار کو دھیما کرنے میں حصہ لیا ہے بلکہ ہمیں اپنے چاروں طرف کی دنیا کو بھی دیکھنا چاہیے، اور ان حالات کی نوعیت سے واقف ہونا چاہیے جو آئے دن مختلف ملکوں میں جمہوریت کے خاتمہ کا باعث بنتے رہتے ہیں، آزاد ہونا اور ترقی کے راستہ پر گامزن رہنا کافی نہیں ہے، زوال کے اسباب اور قومی تنزل کو لاحق خطروں سے خبردار رہنے کی ضرورت سب سے زیادہ اہم اور شدید ضرورت ہے، یہ خطرے استنے نامعلوم طور پر دبے پاؤں آ کر معاشرت اور قومی سرگرمیوں میں داخل ہو جاتے ہیں کہ بعض اوقات قوموں کو ان کی موجودگی کا اس وقت تک احساس نہیں ہوتا جب تک وہ ان کی دفاعی قوت کو مکمل طور پر مفلوج کر کے سطح پر نمایاں نہیں ہو جاتے۔

جمہوریت کے تحفظ کے لیے صرف سیاسی اور حکومتی سطح پر چوکسی کافی نہیں ہوتی، سماج، معاشرت، تعلیم اور نظم و ضبط کے شعبوں کی نگرانی بھی ضروری ہے، کوئی ایک شاخ سوکھنے لگے تو درخت کی طرف سے بے فکری کسی طرح درست نہیں ہے، ذرا سی غفلت، ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سی بے تدبیری پورے درخت کے وجود کو خطرے میں ڈال سکتی ہے، ہر ہندستانی کو اس حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے۔

★

قارئینِ نیا دورؔ کو

سالِ نو

مبارک ہو

حضور سہسوانی

نونہالانِ وطن

یوں نئی دنیا بسائیں نونہالانِ وطن ہند کو جنت بنائیں نونہالانِ وطن

تیرگی کے خوف کا نام و نشاں جاتا رہے روشنی ایسی دکھائیں نونہالانِ وطن

اس قدر مضبوط ہوں عزم و عمل کے حوصلے بارِ غم ہنس کر اٹھائیں نونہالانِ وطن

منزلِ مقصود کی دشواریاں جاتی رہیں راستہ ایسا دکھائیں نونہالانِ وطن

زندگی کے راستے میں اک نئے انداز سے زندگی کو دیں صدائیں نونہالانِ وطن

ہر کلی ہر پھول حسنِ گلستاں بن کر رہے اس طرح گلشن سجائیں نونہالانِ وطن

جذبۂ ہستی کو دے کر عزمِ نو کی روشنی عظمتِ ہستی بڑھائیں نونہالانِ وطن

غفلتوں سے دور ہو کر جذبۂ بیدار کے دیدہ و دل میں سمائیں نونہالانِ وطن

وقت کی رفتار کو شرمندگی محسوس ہو ہر قدم ایسا بڑھائیں نونہالانِ وطن

پیکرِ تعمیر بن کر شورشِ تخریب سے دامنِ ہستی بچائیں نونہالانِ وطن

ان غموں کی دھوپ میں جلتے ہوئے سنسار پر ابرِ رحمت بن کے چھائیں نونہالانِ وطن

شادمانی خود قدم چومے گی بڑھ کر راہ میں عزمِ محکم کو بڑھائیں نونہالانِ وطن

زندگی کے درد کا احساس تک شوکت نہ ہو
اس طرح خوشیاں لٹائیں نونہالانِ وطن

شوکت بنارسی

سالِ نو کا جشن منائیں

ہر اک غم کو دل سے بھلا کر
روٹھی ہوئی خوشیوں کو منا کر
سب کو اک مرکز پر لا کر
اچھلیں، کودیں، ناچیں، گائیں
سالِ نو کا جشن منائیں

بھوک کا ہر احساس مٹا دیں
غربت کی دیواریں ڈھا دیں
غم کے اوپر خوشیاں لادیں
پھر ہم محفل محفل چھائیں
سالِ نو کا جشن منائیں

مرہم رکھ کر زخمِ دل پر
دکھ کی سطح سے اوپر اٹھ کر
بھول کے یہ، ہم ہیں اک بے زر
جاتے برس کو دل سے بھلائیں
سالِ نو کا جشن منائیں

سال خدایا، آنے والا
کاش کرے خوشیوں کو دوبالا
پھیلائے ہستی میں اجالا
سب کی امیدیں بر آئیں
سالِ نو کا جشن منائیں

اب نہ کسی کو بھوک ستائے
پاس کسی کے رنج نہ آئے
کوئی یہاں دکھ درد نہ پائے
غم کے منارے سب ڈھ جائیں
سالِ نو کا جشن منائیں

تسنیم فاروقی

میرے وطن کی دھرتی

خم گاہِ کہکشاں ہے میرے وطن کی دھرتی
فردوسِ دلبراں ہے میرے وطن کی دھرتی

ہر ذرّے میں یہاں کے اک دل دھڑک رہا ہے
آرام گاہِ جاں ہے میرے وطن کی دھرتی

لکھنے کے سو طریقے سو رنگ بولیوں کے
گنجینۂ زباں ہے میرے وطن کی دھرتی

ایثار کے لہو سے زرخیز کی گئی ہے
محنت کی داستاں ہے میرے وطن کی دھرتی

خوشبو میں اس کی ایسی قومی یگانگت ہے
ناقوس ہے، اذاں ہے میرے وطن کی دھرتی

گل ریز ہے کسان اور مزدور کا پسینہ
اک گلشنِ جواں ہے میرے وطن کی دھرتی

سو رنگ اس کے بدلے سو انقلاب آئے
صدیوں کی پاسباں ہے میرے وطن کی دھرتی

ہر پھول میں چھپا ہے اک دردمند چہرا
یادوں کا گلستاں ہے میرے وطن کی دھرتی

چلیے یہ بات مانی آکاش چھوڑ دیجیے
اور سب یہ آسماں ہے میرے وطن کی دھرتی

ہر وادیٔ سفر میں آنکھیں بچھائیں اس نے
پابوسِ کارواں ہے میرے وطن کی دھرتی

رنگین اس کے موسم شاداب اس کی فصلیں
خوش رنگ و بے خزاں ہے میرے وطن کی دھرتی

شامل رہی ہے اکثر میری مسرّتوں میں
ہر غم کی رازداں ہے میرے وطن کی دھرتی

اپنے تو پھر ہیں اپنے اپنوں کا ذکر ہی کیا
غیروں پہ مہرباں ہے میرے وطن کی دھرتی

ہندو ہوں یا کہ مسلم عیسائی ہوں کہ سکھ ہوں
گلزارِ دوستاں ہے میرے وطن کی دھرتی

ہندوستاں کے باہر کہتے ہیں ہند والے
کیا ہو گئی کہاں ہے میرے وطن کی دھرتی

تسنیم یوں تو سب کے اپنے وطن ہیں لیکن
انسانیت کی ماں ہے میرے وطن کی دھرتی

مرزا جعفر حسین

میر علی محمدؐ عارفؔ

خانوادۂ انیسؔ تقریباً دو سو برس تک علم و فضل، شعر و ادب، اخلاق و کردار، شرافت و انسانیت بالخصوص خودداری و عالی ہمتی کا گہوارہ رہا تھا جہاں سے بڑی بڑی ہستیاں آسمان علوم و فنون پر رخشندہ اور درخشندہ ستاروں کی طرح چمکیں اور دنیا کی نظروں کو خیرہ کرکے اپنا اپنا مشن انجام دے گئیں۔ انھیں عدیم المثال فنکاروں میں انیسؔ کے کمالات کا آفتاب اپنی تابانی سمیت اس طرح چمکا تھا کہ قدر دانوں کی آنکھوں نے اس کی چکاچوند میں پھر اُن کے اسلاف یا اخلاف کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ آخری دور میں میر علی محمد عارفؔ کی ذاتِ گرامی تھی جن کو ہم بجا طور پر مجموعۂ کمالات کہہ سکتے ہیں لیکن اپنی اس بدنصیبی کو کیا کہا جائے کہ اتنی جلیل القدر ہستی پر بھی اب تک کوئی قابلِ لحاظ تصنیف ہمارے سامنے نہیں آئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کوتاہی و ناقدر شناسی کے اسباب میں ہماری غفلت پسندی کے علاوہ اردو ادب کی محرومیاں بھی ہیں جو اس ملک میں ایک مدت سے اس غریب زبان کے شاملِ حال ہیں۔

میر علی محمد عارفؔ خاندانِ انیسؔ کی آخری یادگار تھے جن کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم جمع ہوگئی تھیں جن کے لیے انیسؔ اور ان کے اسلاف مشہور و ممتاز تھے، اس زمانہ میں حسب و نسب سے انسان کی شرافت پرکھی جاتی تھی۔ اس معیار سے دیکھا جائے تو عارفؔ اپنی والدۂ محترمہ کی طرف سے میر خورشید علی نفیسؔ کے نواسے تھے، نفیسؔ میر انیسؔ کے نہ صرف صاحبزادے تھے بلکہ اُن کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ "بیٹا وہی قدم بہ قدم ہو جو باپ کے" اور یہ خاندان گھرانا موسوی تھا جس کا براہِ راست رشتہ امامِ موسیٰ کاظمؑ سے منسلک ہوتا تھا۔ اپنے والد بزرگوار کی جانب سے عارفؔ کی رگوں میں ساداتِ بارہہ کا خون موجزن تھا۔ سید مبارک علی رئیس و زمیندار بارہہ مراجعت کرکے لکھنؤ آگئے تھے۔ انکے صاحبزادے سید محمد حیدر ذہین، طباع، علم و ادب کے پرستار اور شستہ و شائستہ نوجوان تھے کہ ان کو شعر و سخن کا ذوق بھی پیدا ہوا۔ انیسؔ کے تلمذ کا ذوق دل میں آتشِ شوق کے مانند ایک مدت سے دبائے ہوئے تھے۔ مشہور تھا کہ انیسؔ کسی کو شاگردی کا شرف مرحمت نہیں فرماتے لیکن ان کا ستارہ عروج پر تھا۔ انیسؔ کی نظر انتہا نے ان کا جوہر پرکھا اور نہ صرف شاگردی میں قبول کرکے جلیسؔ تخلص مرحمت فرمایا بلکہ عزت افزائی کو معراجِ کمال تک پہنچا کر ۱۲۷۲ھ میں اپنی چہیتی پوتی کا عقد مناکحت بھی انھیں کے ساتھ کرا دیا۔ اسی ازدواج مسعود سے ۲ جمادی الاول ۱۲۷۶ھ میں ایک فرزند ایسے طالع لے کر پیدا ہوا کہ اس نے آنکھ کھول کر سب سے پہلی صورت انیسؔ کی دیکھی اور سب سے پہلی آواز انیسؔ کی سنی۔ اس کے کانوں میں اذان انیسؔ نے دی اور اس کا نام علی محمد رکھا۔

اس کو بدنصیبی کہا جائے یا خوش نصیبی کہ یہ فرزند موسومہ علی محمد ابھی نوخیز تھا اور سن و شعور کو پہونچا بھی نہیں تھا کہ اُس کے والد میر جلیس کا انتقال ہوگیا۔ یتیمی یقیناً ایک عظیم مصیبت ہے اور اولاد بالخصوص کم سن بچے کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جانا اُس کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے لیکن اس ہونہار اور خوش بخت لڑکے کو فی الفور نعم البدل مل گیا۔ نفیس کی آغوش تربیت میں پرورش پائی، انیس کی نگرانی میں پرداخت ہوئی اور انھیں دونوں بزرگوں کے ماحول تہذیب معدن اخلاق میں نشو و نما پاکر پروان چڑھے۔ اس زمانہ میں بچوں کو بہت کم عمری میں تعلیم پر لگا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس ہونہار فرزند نے پہلے زانوے ادب ملا سید طاہر کے ایسے عالم و فاضل کے آگے تہہ کیا اور ابتدائی صرف و نحو کا درس حاصل کیا۔ فطرتاً ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، بہت جلد ترقی کرکے فارسی کی اعلا تعلیم کی طرف مائل ہوے۔ اس منزل میں بھی خواجہ عزیزالدین عزیز کا ایسا شاعر و ادیب استاد مل گیا جس کی فیض صحبت میں علم و ادب کے ساتھ شعر گوئی کا شوق بھی اجاگر ہوا۔ اب طبیعت کو ایک ایسے ماہر فن کی رہبری اور رہنمائی کی ضرورت تھی جو فطری صلاحیتوں کو مذاق سلیم سے وابستہ کر دے چنانچہ نفیس نے عروض و قافیہ کا درس دینے کی ذمہ داری خود قبول فرمائی اور علی تخلص بھی مرحمت فرمادیا، ابھی عہد طفلی شباب تک نہیں پہنچا تھا کہ شاعر ہوگئے اور ابتداء غزل گوئی سے کی۔

عہد قدیم میں ارباب فضیلت کے نزدیک علم و ادب میں کمال اور شعر و سخن میں مہارت بغیر تکملۂ تعلیم ناکافی سمجھی جاتی تھی۔ علوم میں علمِ طب سے اچھی واقفیت اور بعض فنون کا جاننا بھی ضروری تھا چنانچہ علی محمد نے علمِ طب کی متعدد و بلند پایہ کتابیں شہر کے مقتدر اور محترم طبیب حکیم محمد جی مرحوم کے چھوٹے بھائی حکیم شیخ علی محمد مرحوم سے پڑھ کر اس فن میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ اُن کو طب سے اتنی دلچسپی تھی کہ خود اپنے مجربات کی ایک ضخیم کتاب تیار کر لی تھی۔ مریضوں کا کامیاب علاج کرتے تھے اور شعراء میں اُن کے سب ہی شاگرد حالت مرض میں انھیں سے رجوع کرتے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں میں خوشنویسی کا ہنر بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اُن کا خط بہت اعلا درجہ کا تھا اور ان کا شمار بہترین خوشنویسوں میں ہوتا تھا۔ خاندانِ انیس میں سپہ گری کا فن بھی مقبول تھا۔ انیس کے مراثی کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خود فن سپہ گری پر پوری مہارت رکھتے تھے جس کا بیان اُن کی نظم کردہ لڑائیوں میں تمام ضروری وضاحتوں کے ساتھ ملتا ہے۔ اس لیے علی محمد نے اگر سپہ گری میں کمال حاصل کر لیا تھا تو وہ گھر ہی کا فیض تھا البتہ خوشنویسی اور بنوٹ میں استاد ہونا خود انھیں کا رجحان کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں فن انھوں نے شہر کے ممتاز استاد آغا شاب سے سیکھے تھے جو اُس زمانے میں محلہ منصور نگر میں اُس مقام پر رہتے تھے جہاں آج شیعہ یتیم خانہ قائم ہے۔

انیس اور اُن کے صاحبزادے نفیس دونوں نے فن مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کی تھی لیکن انیس کی بعض غزلیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اچھے غزل گو بھی تھے، نفیس کی کوئی غزل راقم کی نظر سے نہیں گزری البتہ اس خانوادہ کے چشم و چراغ علی محمد علی نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی اور بہت جلد بحیثیت غزل گو کے ممتاز ہو گئے تھے۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور اساتذہ سے خراج تحسین پاتے تھے۔ اُن کی غزلیات سے چند اشعار نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں:-

تھم تھم کے جو اُس نے تیغ پھیری — دم بھی نکلا ٹھہر ٹھہر کے
وصفِ خد و خال یار کیا ہو — دیکھا ہی نہیں نگاہ بھر کے

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے — بچھاؤں پھول کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر
زمانہ ٹھوکریں کھلوا کے اوج دیتا ہے — اُٹھی جو گرد قدم سے تو آئی ہو سر پر

فراقِ یار میں کس کو دل و جگر کی خبر — اٹھا ہے درد کہیں اور کہیں بتاتا ہوں
یہ شوق وصل میں کہتا ہے جل کے پروانہ — کہ خاک ہو کے میں اپنی مراد پاتا ہوں

مدعا مد نظر اے دلِ ناشاد رہے — نالۂ غیر سے ملتی ہوئی فریاد رہے
تو نہ پوچھے جسے پھر خلق میں پوچھے اُسے کون — جو تجھے یاد نہ آئے وہ کسے یاد رہے

صرف انھیں چند اشعار سے اُن کے مذاقِ سخن اور ذوقِ سلیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خیال میں رفعت و بلندی ہے اور زبان و بیان میں لطافت و رنگینی بھی۔ عوام و خواص میں مقبولیت و پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ اُن کی غزلیں پیام یار اور رشک نگارِ نظر کے ایسے مقتدر رسالے حاصل کر کے شائع کیا کرتے تھے اور شہر کے تمام اساتذہ اُن کی بہت

زیادہ قدر دانی کرتے تھے۔ ممتاز ادیبوں اور رئیسوں میں حامد علی خاں بیرسٹر جو تحسین گنج میں رہتے تھے اور نواب اصغر حسین فاخر آف نوہٹی اُن کے کلام کے پرستاروں میں تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے یہاں کوئی ایسی نشست یا کوئی ایسا مشاعرہ نہیں ہوتا تھا جس میں علی محمد علی کی شرکت لازمی قرار نہ پاتی ہو اور وہ اپنی غزل نہ پڑھتے ہوں۔

غزل کے میدان میں مشق سخن کا یہ سلسلہ اگر جاری رہا ہوتا تو آج علی محمد علی کی جگہ لکھنؤ کے غزل گو شعراء کی صف اول میں یقیناً قائم ہو گئی ہوتی لیکن ماحول و وراثت کے تقاضے اس سے مختلف تھے۔ علی محمد علی کو مشاعروں میں شرکت کا ذوق بڑھتا جا رہا تھا اور چونکہ مشاعرے رات کے وقت ہوتے تھے اس لیے راتوں کو گھر سے غیر حاضری رہنے لگی اور اگر واپسی ہوتی تب بھی بہت تاخیر سے آتے۔ یہ طریقہ خاندان کے چلن کے منافی تھا اور یقیناً اُن کے نانا نفیس کو بہت ناگوار ہوتا رہا ہوگا۔ انیس کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور اب نانا ہی بزرگوں میں اکیلے باقی رہ گئے تھے۔ ایک مرتبہ یہ اتفاق پڑی کہ کسی مشاعرہ سے واپس ہو کر صبح ہوتے گھر پہنچے تو اُن کی آواز پر کسی ملازم کی آنکھ نہیں کھلی اور میر نفیس جاگ پڑے۔ وہ خود اٹھے اور دروازہ کھول کر نواسے کو گھر میں داخل کیا لیکن اتنا کلمہ زبان سے کہہ بھی دیا کہ "علی تم دوزخ میں گھر بنا رہے ہو" انھوں نے اس تہدیدی فقرے کو سُنا اور اتنا اثر قبول کیا کہ اسی وقت مشاعروں میں شرکت کرنے سے اجتناب کا عزم کر لیا اور پھر کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں فرمائی۔ غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا یا ختم ہو گیا اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اُن کا ایک غیر مطبوعہ دیوان خود انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا اُن کے ورثاء کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ اُن کو غزل سے لگاؤ تھا اس کے ثبوت میں یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ موصوف نے اپنی وفات سے چند برسوں قبل اپنے صاحبزادے سید ظفر حسین المعروف بہ بابو صاحب فائق کی غزل کا یہ مطلع بڑے ذوق و شوق سے راقم کو سنایا تھا جس کے بارے میں پورے اطمینان سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پر کچھ نہ کچھ اُن کی اصلاح تھی ؎

لرزتا ہے نشانہ باندھنے میں ہاتھ قاتل کا
اثر کچھ پڑ گیا شاید مری بیتابیٔ دل کا

متذکرۂ بالا واقعہ کے بعد گھر سے باہر نکلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں چند روز گزارے تھے اور اُن کی اس تکلیف کا احساس شفیق نانا کو بھی ہوا ہوگا کہ دفعتاً ایک روز نفیس نے ان کو طلب کیا اور یہ فرمائش کی کہ رباعی کہو جس کا ایک مصرع یہ ہو:—
"تن شمع صفت صرف زباں ہوتا ہے"۔ انھوں نے تعمیل ارشاد کی۔ جاڑے کا موسم تھا۔ نفیس لکڑی کے مونڈھے پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے، صبح کا وقت تھا، علی محمد نے وہ پرچہ جس پر رباعی تحریر تھی حاضر خدمت کر دیا۔ انھوں نے رباعی پڑھی اور اس وقت کچھ نہیں کہا، البتہ وہ پرچہ اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُن کے پڑھنے کی ایک مجلس منعقد ہونے والی تھی۔ نفیس نے مرثیہ کے قبل اُسی رباعی کو پڑھا، بہت تعریف ہوئی اب انھوں نے علی محمد علی کو جو منبر سے قریب تھے اشارہ کر کے کھڑا کرایا اور حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ رباعی میری نہیں ان کی ہے۔ علی محمد علی اپنے بزرگوں یعنی انیس و نفیس کی مجالس میں برابر پیش خوانی کیا کرتے تھے اور انیس و نفیس کا کلام پڑھا کرتے تھے لیکن آج وہ دن تھا کہ نفیس نے مرثیہ کی پیش خوانی میں اپنے نواسہ کی رباعی پڑھی تھی۔ وہ رباعی یہ تھی:—

یوں جوہر طبع کب عیاں ہوتا ہے
پانی ہر ایک استخواں ہوتا ہے
راتوں کو گھلاتی ہے مجھے فکر سخن
"تن شمع صفت صرف زباں ہوتا ہے"[1]

اس واقعہ کے بعد نفیس نے اُن کو مرثیہ گوئی کی طرف راغب کر دیا اور ان کا تخلص علی کے بجائے عارف مقرر کیا۔

میر علی محمد عارف کی طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوئی تو ابتدا میں حسب دستور رباعیاں اور سلام کہتے تھے، نفیس اصلاح دیتے تھے اور انھیں کی مجلسوں میں عارف پیش خوانی میں اپنی رباعیاں اور

---

[1] اس رباعی کا چوتھا مصرعہ "تن شمع صفت صرفِ زباں ہوتا ہے" میر نفیس کا اور اوپر کے تین مصرعے عارف مرحوم کے ہیں، یہ رباعی اس وقت کے مشہور و معروف خوشنویس سید نور الحسن کے ہاتھ کی لکھی بہ شکل وصلی عارف کے ورثاء کے پاس موجود ہے۔

سلام پڑھتے تھے، رفتہ رفتہ مرثیہ بھی کہنے لگے۔ ان مرثیوں پر بھی نفیس کی اصلاح ہوتی تھی۔ ایسے پانچ مرثیے نفیس کی وفات تک مکمل ہو چکے تھے ان مرثیوں کے مطلعے درج ذیل ہیں:-

(۱) ناموسِ مصطفیٰؐ سے ہے رخصت حسینؑ کی

(۲) اے زباں خوبیِ تقریرِ دلآویز دکھا

(۳) گرداب ہے سفینہ مرے دریائے سخن کا

عکسِ تحریر: میر علی محمد صاحب عارف

(۴) ہے رایتِ جنودِ معانی قلم مرا

(۵) آئینہ ہے جوہرِ شمشیرِ زباں کا

قرینہ یہی ہے کہ یہ مراثی اسی ترتیب سے کہے بھی گئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کتنے مراثی تصنیف کیے اُن کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ اُن کے بعض شاگردوں کے قول کے بموجب انھوں نے جملہ چوبیس مرثیے کہے تھے لیکن اُن کے ورثا کے پاس خود انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صرف سولہ مرثیے محفوظ ہیں اور یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مجموعی تعداد چوبیس ہو یا سولہ دونوں میں تذکرۂ بالا پانچوں مرثیے شامل ہیں۔ بقیہ گیارہ مرثیوں کے مطلعے ہیں:-

(۶) ہے شمعِ شبستانِ فصاحت سخن مرا

(۷) زینت دہِ کاشانۂ دل حسنِ وفا ہے

(۸) نیرنگِ بوستانِ جہاں ہے بہار پر

(۹) رن میں افلاکِ امامت کے قمر آتے ہیں

(۱۰) پھر ہے شمشیرِ زباں معرکہ آرائے سخن

(۱۱) ہے گلشنِ شبابِ سخن پھر بہار پر

(۱۲) میداں میں آمد آمدِ اکبرؑ کی دھوم ہے

(۱۳) پھر آج باغِ سخن میں بہار آتی ہے

(۱۴) گلچینِ خیابانِ سخن ذہنِ رسا ہے

(۱۵) پھر مدِّ نظر صیقلِ شمشیرِ زباں ہے
(۱۶) دے ساقیِ الست شرابِ ولا مجھے

یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جن گیارہ مرثیوں کے مطلعے اوپر درج ہیں اور جو عارفؔ کے پوتے سید علی احمد زیدی سلمہٗ کے پاس محفوظ اور موجود ہیں اُن کی تصنیف میں ترتیب کا پتہ لگانا بے حد دشوار ہے البتہ یہ امر یقینی ہے کہ نفیسؔ کی وفات کے بعد چھٹا مرثیہ وہی کہا تھا جس کا مطلع ہے "نیرنگِ بوستانِ جہاں ہے بہار پر" کیونکہ اس سے مرثیہ کے چہرہ میں نفیسؔ کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے۔

عارفؔ کی مرثیہ گوئی کیسی تھی اُس کی وضاحت کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہونا چاہیئے کہ ایسے مرثیہ گو کی شاعرانہ عظمت کون بیان کرسکتا ہے جس نے خدائے سخن انیسؔ کے آغوشِ علم و فضل میں تربیت پائی ہو اور نفیسؔ کے ایسے سخنور سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ انیسؔ نے اپنی زبان کی تعریف میں متعدد بار فرمایا تھا کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے، عارفؔ کا بھی وہی گھر تھا جو انیسؔ کا تھا اس لیے انھو نے بھی جو کہا وہ اپنے گھر ہی کی زبان میں فرمایا تھا۔ وہ زبان کیسی تھی ملاحظہ ہو :۔

پھولوں کی لفظ لفظ سے بو آشکار ہو
حُسنِ صنوبرِ لبِ جو آشکار ہو
خوبانِ گُل کی خوبُیِ رُو آشکار ہو
پتّی سے رگ تو رگ سے لہو آشکار ہو
سُرخی سے اس کی قلبِ خزاں داغ داغ ہو
سینچا ہے جس کو خونِ جگر سے وہ باغ ہو

مضموں یہ صاف صفحۂ کاغذ سے ہو عیاں
شفاف و دلکشا ہو یہی صحنِ بوستاں
کیا عقلِ سادہ اسکی لطافت کرے بیاں
آنکھیں بچھائے دیکھے اگر نرگسِ جناں
تنویر مہر و ماہ کی توام ورق پہ ہو
رُخسارۂ صبیح کا عالم ورق پہ ہو

مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ، رخصت، سراپا، رجز، تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، لڑائی اور شہادت داخل ہیں۔ ہر مرثیہ کسی ایک شہید کے حال میں ہوتا ہے اور کم سے کم رخصت، لڑائی اور شہادت کے اجزا کا نظم ہونا مرثیہ میں ضروری ہے۔ یہ ترتیب انیسؔ کا عطیہ ہے اور اس میں ہر مقام پر انھوں نے کئی کئی بار اور بہتر سے بہتر طریقہ پر نظم فرمایا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیسؔ نے کوئی گوشہ اور کوئی مقام ذکر اپنے بعد آنے والے مرثیہ گو شعراء کے لیے نہیں چھوڑا تھا۔ انھیں خیالات و واقعات اور اسی تصویرکشی و عکاسی کو ان کے ہونہار فرزند نفیسؔ نے پھر پیش کیا۔ اس طرح عارفؔ کے لیے زبان کھولنا بہت دشوار ہوگیا تھا مگر انھوں نے اپنے بزرگوں کے نقش پر مشق سخن کی اور اپنا ایک علحدہ بلند مقام حاصل کرکے مرثیہ گوئی میں گراں قدر کامیابی حاصل کی۔ ایک مختصر مضمون میں کسی شاعر کے فکر و فن پر سیر حاصل تبصرہ کرنا یا دوسرے اساتذہ کے کلام سے کسی جلیل القدر شاعر کے فرمودات کا موازنہ کرنا امر محال ہے۔ لہٰذا عارفؔ کے ایک مرثیہ سے مثالاً چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت عباس جو لشکر حسینی کے سپہ سالار تھے امام حسین سے اذنِ جہاد حاصل کر رہے ہیں۔ یہ وقت وہ ہے جب امام اور اُن کے اٹھارہ برس کے فرزند علی اکبر کے علاوہ رفقا اور اعزہ میں کوئی باقی نہیں ہے۔ سب جامِ شہادت نوش کر چکے۔ امام اپنے عزیز بھائی عباس کو رخصت کرتے ہیں :۔

....

بولے شہِ مظلوم کہ مجبور ہیں بہتر!
دیکھیں ہمیں فرقت میں قرار آتا ہو کیونکر
تیرہ ہے جہاں داغِ جدائی سے نظر میں
لو درد تو ہونے لگا بازو دُکمر میں

....

ہے بعد تمھارے علی اکبر کی بھی باری
تھوڑے سے پس و پیش کی حجت تھی یہ ساری
غم پیاس کا ہے نے الم فاقہ کشی ہے
اللہ یہ ایک ایک کو مرنے کی خوشی ہے

اس کے بعد حضرت عباس اہلِ حرم سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس مقام پر بیوی بچوں سے جدائی کی مصیبت عظیم ہے۔ بیوی کے لیے فراق ناگوار ہے۔ عباس قبر پر کرنے کی اجازت تو دیتے ہیں لیکن بحیثیت انسان کے یہ غم ناقابل برداشت ہے، جلد از جلد میدان قتال میں جانا بھی ہے۔ اب اس مقام کو عارفؔ اس طرح نظم کرتے ہیں :۔

کہنے لگی وہ زخمیِ تیغِ غمِ فرقت
جیتی ہوں تو آنکھوں سے کروں گی یہ خدمت
اس وقت بگڑنے میں بنی واہ ری قسمت
بے مانگے ہوئے دے چلے آپکی اجازت

کیوں کڑھتے ہو یہ لال تو یزدان پڑھیں گے
جو غیر کو جھاڑوں گی یہ قرآن پڑھیں گے

ان درد کی باتوں سے پھرا قلب پہ خنجر صدمہ ہوا سجاد تو لگے کانپنے تھر تھر
آنے لگے آنسو رخِ شفاف پہ ڈھل کر نزدیک یہ تھا گر پڑیں غش کھا کے زمیں پر
ٹھہریں تو تڑپ کر دلِ مضطر نکل آئے
جلدی سے جگر تھام کے باہر نکل آئے

عباس علمدار میدان کارزار کا رُخ کرتے ہیں۔ اس مقام پر گھوڑے کا ذکر آجاتا ہے۔ گھوڑے کی جیسی جیسی تعریف انیسؔ کر گئے ہیں اس کا جواب کسی مرثیہ گو کے یہاں نہیں ملتا۔ یہ کہنا یقیناً حقیقت سے دور ہوگا کہ عارفؔ نے علحدہ ہو کر گھوڑے کی تعریف کی ہے لیکن پھر بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انیسؔ کے بعد جس سادگی، شستگی اور صفائی سے عارفؔ گھوڑے کی تعریف کرتے ہیں وہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

یہ وہ نہیں رہوار کہ چلنے میں جو اڑ جائے آنکھ اس کی نہ جھپکے جو نظر شیر سے لڑ جائے
سایہ کہیں قمچی کا رد ادر میں جو پڑ جائے پھر دفعتاً اسوار اسے روکے تو بگڑ جائے
تیزی ہو جو ایسی تو ہوا کیوں نہ قدم لے
جب تک کہ زمیں پاؤں کے نیچے ہو نہ دم لے

گھوڑا ایسا تھا تو اسوار کی شان بھی دیکھئے۔ اسی ترجمانی کو سراپا نظم کرنا کہتے ہیں۔ صرف ایک بند پیش کر دینا کافی ہوگا:۔

شانِ احدی حُسن سراپا سے عیاں ہو پھولوں کی لطافت رُخِ زیبا سے عیاں ہو
اندازِ صنوبر قدِ رعنا سے عیاں ہو ہیں نورِ خدا جسمِ مصفّا سے عیاں ہو
اس نور کے شائق ملک و جن و بشر ہیں
کیونکر نہ ہوں دریائے امامت کے گہر ہیں

عباس بن علی کا مقابلہ جس لشکر سے تھا اُس میں ہزاروں کی تعداد بتائی جاتی ہے۔ انھوں نے تن تنہا مقابلہ کر کے لڑائی کے جوہر دکھلائے تھے۔ عارفؔ اس لشکر کا تذکرہ اور عباسِ دلاور کی ثابت قدمی اور شجاعت کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

مرقوم ہو کیا کثرتِ افواجِ ستمگر مضموں ہے یہ گنجائشِ تحریر سے باہر
پھیلا تھا کئی کوس تک اس طرح وہ لشکر سایہ کسی طائر کا نہ پڑتا تھا زمیں پر
تھا حبس ہوا ہونٹوں پہ ذی روحوں کا دم تھا
ذرّے کو بھی اڑنے کا ٹھکانا نہ بہم تھا

قربانِ دلیریِ علمدارِ وفادار جچتا نہیں نظروں میں ذرا لشکرِ کفار
لاکھوں ہیں پیادے تو ہزاروں ہی ہیں اسوار لشکر کی سیاہی ہے کہ ہے روزِ شبِ تار
گو حد سے سوا مجمعِ افواجِ ستم ہے
اس پر بھی مگر جرأتِ عباس سے کم ہے

اس قہار لشکر کا اثر عباس کے ایسے بہادر پر کیا پڑتا ہے:۔

کچھ غیظ تصور نے وغا کے جو بڑھایا اک جوش لہو نے تنِ جرّار میں کھایا
موقع تھا ابھی تیغ زنی کا جو نہ آیا چابے کبھی ہونٹ اور کبھی گردن کو ہلایا
شمر و بن سعدِ ستم آرا پہ نظر کی
گہہ فوج کو دیکھا کبھی دریا پہ نظر کی

عباس میدان جنگ میں نہ صرف لڑائی لڑنے بلکہ پیاسے بچوں کے لیے پانی لینے بھی گئے تھے۔ پہلے جنگ کرنا پھر دریا پر قبضہ کر کے پانی بھرنے کا ارادہ تھا۔ گھاٹ کو لشکر گھیرے ہوئے تھا تاکہ کوئی بہادر لڑتے لڑتے وہاں جا کے پانی نہ حاصل کر سکے۔ اس تاریخی پس منظر میں "گہہ فوج کو دیکھا کبھی دریا پہ نظر کی" پڑھتے جائیے اور سر دھنتے رہیئے۔

اسی مقام پر ایک بار پھر یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ کوئی نکتہ، کوئی گوشہ اور کوئی مقام واقعہ کربلا سے متعلق ایسا نہیں تھا جس منزل سے انیسؔ انتہائی کامیابی کے ساتھ نہ گزرے ہوں لیکن پھر بھی عارفؔ نے اپنے لیے ندرتِ خیال کی راہیں تلاش کر لی تھیں۔ مثال کے طور پر تلوار کی تعریف انھوں نے انیسؔ سے بالکل علحدہ ہو کر کہی تھی اور ایسی کہی جو خود اپنا ہی جواب ہے۔ راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ عارفؔ کا یہ بند زبان زدِ خواص و عوام ہو گیا تھا اور جس مجلس میں انھوں نے یہ مرثیہ پڑھا تھا اُس مجلس کے تذکرے کم سے کم سال بھر تک ہوتے رہے تھے۔ گھر گھر اور محلے محلے اس بند کے چرچے ہوتے تھے اور روسا و شرفا کی نشستوں میں آئے دن یہ بند ہر ایک کی زبان پر ورد تھا۔

یہی ہے تیغ دو سر آسماں سے آئی ہوئی بنی بنائی ہوئی اور سجی سجائی ہوئی
خدا کی بھیجی ہوئی مصطفےٰ سے پائی ہوئی علی سے صفدر و غازی کی آزمائی ہوئی

بسر فاقت حیدرؔ میں اس نے راتیں کیں
نذر تھی ایسی کہ شبیرؔ خدا سے باتیں کیں[1]

ایک طرف تو اتنا سجا سجایا اور بلند پایہ بند اور دوسری طرف عارفؔ کا پڑھنا' ہزاروں کے مجمع میں وہ سماں بندھ گیا تھا اور وہ کیفیت طاری ہو گئی تھی جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ البتہ ایک مدت

۱۵ محرم سنہ ۱۳۱۶ ہجری ام
یکشنبہ
عزت و افتخار خردان جناب امی جان صاحبہ جیو سلمہا اللہ تعالیٰ

تسلیم گزارش ہے کہ کمترین بدعا آداب من جمیع مامان
بخیریت ہی اور خیر و عافیت آپکی درگاہ خدا سے مطلوب و مسئول
بفضلہ آپکی دعا سے یہاں کی کل امور میرے متعلق اچھی ہیں
اور آئندہ بھی انشاء اللہ اچھی نظر آتے ہیں نواب صاحب
اور بیگم صاحبہ کی شفقت بدستور بلکہ زائد ہے

میری سرا ہونے کی ممانعت وہ سب فتنہ پرداز
کا رند نکل تھی بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کا ہرگز منشا نہ تھا ۳

عارفؔ کا خط حیدرآباد سے اہلیہ میر نفیسؔ کے نام

مدید گزر جانے کے بعد آج تک اُس کا احساس دماغ و دل میں محفوظ ہے۔

عارفؔ کی خوانندگی کے بارے میں بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ خانوادۂ انیسؔ کے چشم و چراغ اور اپنے اسلاف کے کامل ترین جانشین تھے۔ انیسؔ کی خوانندگی کے سلسلے میں جن لوگوں نے ان کو سُنا تھا وہ یہ کہتے تھے کہ انیسؔ پڑھتے نہیں تھے بلکہ منبر پر چشم و ابرو کے اشاروں سے جادو کرتے تھے۔ راقم الحروف کے والد محترم کو اُن کی مجلسوں میں شرکت کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ "مرثیہ پڑھنے کا کیا ذکر انیسؔ کی طرح منبر پر بیٹھنا کسی کو نہیں آیا' یہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے اوپر تشریف فرما نہیں ہیں بلکہ منبر ہی سے اُگ کر باہر نمودار ہو گئے ہیں" عارفؔ مرحوم کی بخثرت مجالس سننے کا راقم الحروف

۴ گرمیں تنہا آؤں۔ بحمد اللہ مجلسیں اچھی ہوئیں۔ آج سے
نواب محبوب یار جنگ بہادر کے یہاں شروع ہیں۔
پانچ مجلسیں مقرر ہوئی ہیں۔ انشاء اللہ گیارھویں سے
مولوی افضل حسین صاحب کے یہاں عشرہ شروع ہوگا
اور انشاء اللہ تعالیٰ حسب معمول میں چہ تی پانچویں
صفر تک حاضر ہونگا زیادہ ادب
دولہا صاحب اور لڈن صاحب بھی ماشاء اللہ خیریت سے ہیں۔

معروضہ
علی محمد عارفؔ عفی عنہ

کو فخر حاصل ہے اور وہ بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے کہ وہ زیب منبر تھے۔ اُن کا تمام چہرہ بُشرہ' بڑی بڑی آنکھیں' بلند پیشانی' گورا رنگ' میانہ قد و قامت اور تنومند جسم دیکھ کر یہ رائے قائم کر لینا بہت آسان تھا کہ قدرت نے ان کو ایک متوازن سانچے میں ڈھال کر منبر و خوانندگی کے لیے پیدا ہی کیا تھا۔ انھوں نے مرثیہ کہنے اور پڑھنے میں اپنے بزرگوں کی تقلید ہی نہیں کی تھی بلکہ طرز خوانندگی میں "بتانے" کا چلن رائج کیا تھا جس کے وہی موجد تھے اور جس کو اُن

---

[1] یہ بند عارفؔ کے اس مرثیے میں ہے جس کا مطلع ہے ' پھر آج باغِ سخن میں بہار آتی ہے' اور جو شہادت امام حسینؑ کے حال میں نظم کیا گیا ہے۔ بندوں کی تعداد چونسٹھ ہے۔

کے اور عروج کے علاوہ کوئی اور اپنا نہیں سکا۔ عروج بہر حال اُن کے ماموں تھے گو کہ عمر میں چھوٹے تھے اور مرثیہ خوانی و مرثیہ گوئی کے افق پر عارف کے مدارج کمال طے کرنے کے بہت بعد جلوہ افگن ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ منبر پر رونق افروز ہو کر عارف جسمانی اشاروں سے مصوری فرماتے تھے اور سامعین کو چشم و ابرو نیز آواز کے اتار چڑھاؤ سے مسحور کر لیتے تھے خوانندگی کے کمال کا یہ عالم تھا کہ ہر مجلس کے بعد اُن کا پڑھا ہوا کوئی نہ کوئی مصرع زد زبان ہو جاتا تھا اور اُس زمانہ میں ایسے بہت سے مصرعے یا ابیات زبان زد ہو گئے تھے۔ منجملہ ان ابیات کے صرف ایک بیت مثالاً پیش کی جاتی ہے جس کا دوسرا مصرع عارف نے اس طرح پڑھ دیا تھا کہ مجلس میں شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ یہ مرثیہ حضرت قاسم کے حال کا تھا جو امام حسینؑ کے بھتیجے تھے اور وقت شہادت اُن کی عمر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے غالباً نو برس کا سن تھا۔ میدان جنگ میں جانے کے لیے یہ بچہ جنگ کے اسلحہ زیب تن کرتا ہے۔ عارف فرماتے ہیں ؎

کچھ مسکرا کے زیورِ جنگی سنوار کے ڈالا گلے میں پر تلا ہیکل اتار کے

انھیں چند اشعار و ابیات کا دقیق مطالعہ جو مثالاً پیش کیے گئے ہیں واضح کرتا ہے کہ عارف مرحوم بلند پایہ شاعر تھے اور مدارج علیہ پر بھی فائز تھے۔ اُن کی بالغ نظر میں فقہ، اصول اور بہت سے دوسرے علوم مشرقیہ سمائے ہوئے تھے۔ درس و تدریس سے بھی شغف تھا۔ ایک زمانہ میں ایک مدرسہ موسومہ 'مدرسۂ علویہ' قائم کیا تھا جس کی نگہداشت اور ترقی کی اُن کو بہت فکر رہتی تھی۔ غالباً ان کی حیات تک برقرار تھا۔ اس مدرسے کے تلامذہ میں سید محمد عباس صاحب آصف، ملا مرزا محمد طاہر صاحب، محمد میرزا صاحب مہذب، تقی مرزا صاحب اور خود ان کے صاحبزادگان بابو صاحب فائق، محمد ہادی صاحب لائق اور یوسف حسین صاحب شائق کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح غزل اور مرثیہ گوئی میں بھی اُن کو اصلاح دینے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ مرثیہ گوئی میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خان تخلص بہ محب والیٔ ریاست محمود آباد کو جو خود بھی ایک گراں قدر شاعر اور مرثیہ گو تھے، انھیں سے تلمذ حاصل تھا۔ علم و فضل اور فکر و فن میں اعلا درجہ کا کمال رکھتے ہوئے وہ شرافت و انسانیت اور اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ بھی تھے۔ بیحد مہذب و شائستہ، خوش گفتار و بذلہ سنج اور مقدس و متشرع تھے، اُن کی بذلہ سنجی میں سنجیدہ ظرافت بھی تھی لیکن اس کا مظاہرہ صرف بے تکلف دوستوں کی نجی صحبتوں میں ہوتا تھا۔

ایسے دوست قریب قریب سب ہی جلیل القدر علما و فضلا تھے جن میں خصوصیت کے ساتھ مولانا سید محمد رضا صاحب اور حکیم سید امیر حسین کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ اعزا و احباب سے بیحد رفق و مدارا سے پیش آتے تھے اور لکھنؤ کے عمائدین میں ہوتے ہوئے ان کی سرشت میں وضعداری اسی طرح شامل تھی جو اس ممتاز شہر کا عہد قدیم میں طرۂ امتیاز تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ ایسا یاد آرہا ہے جس کا تعلق براہ راست راقم الحروف سے ہے۔

میرے والد مرحوم آخر عمر میں مستقل طور پر شہر فیض آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں میری والدہ مرحومہ نے انتقال فرمایا۔ عارف مرحوم نے تعزیت کا انتہائی پرخلوص خط والد مرحوم کو لکھا اور یہ فرمائش کی کہ مجلس چہلم کی تاریخ سے ان کو ضرور مطلع کر دیا جائے چنانچہ مجلس کا رقعہ ان کو بھیجا گیا لیکن والد مرحوم نے اصرار کرتے ہوئے لکھا کہ آپ زحمت نہ فرمائیں، ضعیفی اور علالت ہے کہیں خدانخواستہ طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔ آپ کی محبت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ نے تعزیت فرما دی۔ لیکن اس مشورہ کا انھوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور وہ فیض آباد مولانا سید محمد رضا صاحب مرحوم کے ہمراہ تشریف لائے۔ مولانائے ممدوح کے تلمذ کا شرف راقم الحروف کو حاصل تھا اور میں نے اصرار کر کے مولانا کو دو روز قیام کرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ عارف صاحب مرحوم نے بھی انھیں کے ہمراہ قیام فرمایا اور ان کے قیام فرمانے کی وجہ سے صرف ان سے ہم کلام ہونے اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے لیے بعض دیگر علما و مشاہیر بھی دو روز تک مقیم رہے۔ یہ سارا وقت علمی مباحث اور دلچسپ گفتگو میں گزرا۔ عارف صاحب مرحوم ہی برابر صدر نشین انجمن رہے اور شاید ہی کوئی موضوع ایسا زیر بحث آیا ہو جس میں براہ راست

بالواسطہ اُن کی شرکت نہ رہی ہو۔

عارفؔ مرحوم کے اوقاتِ زندگی میں بے انتہا سادگی اور باضابطگی تھی۔ صبح کو زنان خانہ سے برآمد ہوتے تو قدردانوں اور شاگردوں کا مجمع لگ جاتا تھا۔ ان شاگردوں میں سید ابوالحسن عرف ابو صاحب لکھنوی اور نواب صابر حسین موہانی مرثیہ خوانی سیکھتے تھے اور فن شاعری کے تلامذہ میں سید مہدی حسن احسنؔ، مرزا کاظم حسین محشرؔ، پرنس افتخار مرزا ہنرؔ، سید عابد حسین کاشفؔ، سید نواب حسن عرف منّے صاحب سلیمؔ، چھنگا صاحب حسینؔ، زین العبا عاقلؔ، منّے آغا صاحب فاضلؔ، سید زوّار حسین زائرؔ، سید علی احمد واصفؔ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان صاحبان کے علاوہ دولھا صاحب عروجؔ اور ان کے صاحبزادے لڈّن صاحب فائزؔ بھی صفِ تلامذہ میں شامل تھے۔ بہت سے دوسرے مشق سخن کرنے والے بھی بغرض اصلاح حاضر ہوا کرتے تھے اور انھیں اوقات میں سعادت حاصل کرتے تھے۔ یہ نشست ہر روز طولانی ہوتی تھی جس کا سلسلہ دوپہر تک چلتا تھا۔ اس کے بعد گھر میں داخل ہو جاتے اور باقی تمام اوقات اندرون خانہ کتب بینی یا مرثیہ گوئی میں صرف ہوتی تھی۔ اگر کوئی خاص مقرب یا بے تکلف اور عزیز دوست آجاتا تو مجبوراً پھر باہر آجانا پڑتا تھا۔ زندگی کے ان ضروریات و لوازمات کے علاوہ طبیعت بہلانے یا سیر و تفریح کے کسی شغلہ سے ان کو دلچسپی نہیں تھی بے ضرر اور شرعاً جائز دل بستگی کے وسائل کو بھی لہو و لعب قرار دے کر اجتناب فرماتے تھے۔ اُن کے لیے دل بہلانے کے کسی مخصوص ذریعہ کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ وہ عزیزوں، دوستوں اور اہل و عیال سے ظریفانہ گفتگو کر کے اپنی اس ضرورت کو پورا کر لیتے تھے۔ البتہ اس ظریفانہ گفتگو اور مزاج میں بھی سختی کے ساتھ یہ لحاظ رکھتے تھے کسی کو بری بات پر بھی اس طرح نہ ٹوکا جائے کہ اُس کو ملال ہو۔ اعزا اور کو کسی نامستحسن فعل پر ٹوکنا مقصود ہوتا تو کسی دوسرے سے اس کے روبرو چند چنندہ فقرے اس طرح کہہ دیتے کہ شخص متعلق کو تنبیہ ہو جائے۔ یہی اسلوب اس زمانہ کی تہذیب کا تھا۔

عہد قدیم میں حفظانِ صحت کے اصول ہی رائج نہیں تھے اور بہت کم لوگ اپنی صحت کے بارے میں سوچتے اور فکرمند ہوتے تھے۔ علالت کی حالت میں ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق علاج کرتا تھا۔ اس دور میں ایلوپیتھک کا چلن بہت کم تھا۔ انگریز ڈاکٹر خال خال تھے اور ان سے اسی وقت رجوع کیا جاتا تھا جب مرض لاعلاج ہو جاتا یا کسی رئیس کی حالت بگڑنے لگتی۔ بڑی بیماریاں عمائدین کو یوں بھی کم ہوتی تھیں اور ہر رئیس کے یہاں طبیب ملازم رہتے تھے۔ عارفؔ صاحب مرحوم ایک گراں قدر اور ممتاز گھرانے کی فرد تھے اس لیے اُن کی خدمت کے لیے کوئی بڑے سے بڑا طبیب بھی تساہلی نہیں کر سکتا تھا۔ شہر کے بلند پایہ طبیبوں میں حکیم میر باقر حسین اور حکیم امیر حسین مرحوم ان کے مخصوص دوستوں میں تھے۔ پھر بھی ان کی کسی قابل ذکر علالت کا پتہ اُن کی جوانی تک نہیں چلتا البتہ وفات سے تخمیناً پندرہ برس قبل ان کو دردِ سر کے شدید دورے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ جب تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو شہر کے ماہر امراض چشم ڈاکٹر اینڈرسن سے رجوع کیا۔ اینڈرسن اس وقت سول سرجن بھی تھے۔ انھوں نے گلاکوما کا مرض اور علاج بذریعہ آپریشن تجویز کیا لیکن اپنے مریض کی عزّت و حرمت، ان کے عادات و اطوار اور ان کے مزاج و نفاست کی خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں کے مکان پر آکر آپریشن کیا جو کامیاب رہا اور عارفؔ صاحب شفایاب ہوئے اس شفایابی پر انھوں نے فارسی میں ایک قطعہ تاریخ نظم کیا جس کا انگریزی ترجمہ مع اصل قطعہ کے ایک خوبصورت فریم میں ڈاکٹر موصوف کو انھوں نے اظہار تشکر و امتنان میں پیش کیا تھا جس کو وہ اپنی سبکدوشی کے بعد اپنے ہمراہ لندن لے گئے۔ اس قطعہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

مرضے داشتم گلاکوما — کس مبیناد ایں چنیں دشمن
مستعد چوں شدم بہ استعلاج — گشت توفیق حق رفیق بہ من
قدح گردید ہر دو چشم آخر — ساعت دو زنے بچشم زدن
ایں عمل کرد اشہرِ آفاق — صاحب باوقار اینڈرسن
فخر او نیست گر نظر بکنیم — بودنِ کرنل و سول سرجن
نہ بود خالی از چنیں گوہر — جیب ہند و ولایت لندن
بعدِ صد شکر گفت عارفؔ سال — دل ما شاد و چشم ما روشن
۱۳۲۰ھ

"بجھا چراغ دل ماشاد" ایک قدیم شکل تھی جس کو پلٹ کر اپنا قطعہ کہا
تاکہ آمد کا قافیہ بہ آسانی نظم ہو جائے۔ اور اس سے اپنی صحتیابی
کی تاریخ نکال لینا عارف مرحوم کی ذہانت، ذکاوت اور مصرع تاریخ
میں حسن تلاش کی بہترین مثال ہے۔

اس آپریشن کے بعد آنکھوں میں بصارت آگئی، کاروبار زندگی
حسب معمول چلنے لگا اور بعد میں تقریباً چودہ برس تک بقید حیات رہے
لیکن ان کی وضعداری اور معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی
زمانہ میں تذکرۂ بالا فیض آباد کا سفر بھی کیا تھا اور شہر نیز بیرونجات
میں کچھ مجالس بھی اپنے طرز کو برقرار رکھتے ہوئے پڑھی تھیں۔ جو آخری
مجلس وہ پڑھ سکے اس کا انعقاد ۱۹۱۶ء کے ماہ رجب میں بمقام امام باڑہ
ناظم صاحب واقع وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ہوا تھا۔ بڑی معرکۃ الآرا
مجلس پڑھی تھی لیکن اس وقت کسی کو یہ نہ معلوم تھا کہ ان کے پڑھنے کی
وہ آخری مجلس تھی۔ صرف پانچ مہینے کے بعد جب وہ ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء
کو اپنے ماموں دولھا صاحب عروج کے یہاں جو محلہ وزیر گنج میں اس
وقت مقیم تھے، مجلس پڑھنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تو تھوڑا ہی
فاصلہ طے کرنے کے بعد موت کا پیغام آگیا۔ اصغر علی محمد علی تاجر عطر
کے کارخانے کے عقب گلی میں درد دل شروع ہو گیا قریب ہی
سید آغا حسن کا مکان تھا وہاں ٹھہر گئے۔ کچھ دوا علاج بھی ہوا پھر
لوگوں نے مشورہ دیا کہ گھر واپس چلیے۔ غیور طبیعت نے اس وقت بھی
کسی دوسرے کا سہارا قبول کرنا گوارا نہیں کیا، از خود کھڑے ہو گئے
اور ایک قدم آگے بڑھایا مگر دوسرا نہ بڑھ سکا اور انتقال فرما گئے۔
مصرعہ مادۂ تاریخ یہ ہے 'عارف انیس عہد ہمہ سال نفیس بود'

دوسرے سال یعنی ۱۹۱۷ء میں امام باڑہ سید تقی صاحب واقع
عقب مسجد تحسین علی خاں چوک لکھنؤ کی سالانہ ماہ رجب والی مجلس
میں دولھا صاحب عروج نے اپنا معرکۃ الآرا مرثیہ پڑھا جس کے
چہرہ میں عارف مرحوم کی علالت اور وفات کا مفصل حال تھا
اس مقام پر حسب ذیل بند عارف مرحوم کے حال میں اپنی جگہ پر خود
ایک دلخراش مرثیہ ہے:

چلے بھی اٹھ کے، قدم بھی بڑھا کے اک رکھا ہوا وہ درد جگر جس سے زور چل نہ سکا
زبان بند ہوئی ڈھل کے رہ گیا منکا نہ پاؤں دوسرا لیکن جگہ سے اپنی ہلا
تعلق ان کو نہ پھر کچھ جہانِ زشت میں تھا
قدم تھا ایک یہاں دوسرا بہشت میں تھا

★

قومی جھنڈا اور ترانہ: صفحہ ۴ کا بقیہ

پنجاب سندھ گجرات مراٹھا دراوڑ اتکل بنگا
وندھیا ہماچل یمنا گنگا اچھل جلدھی ترنگا
تو شبھ نامے جاگے تو شبھ آشش مانگے
گاہے تو جے گاتھا
جن گن منگل دایک جے ہے بھارت بھاگیہ ودھاتا
جے ہے جے ہے جے ہے جے جے جے جے ہے

قومی ترانہ کا مفہوم

"اے بھارت کے بھاگیہ ودھاتا! قوم کے نشان ترنگے!
تم بھارت کے فرد فرد کے سب کے رہنما ہو۔ تمھاری جیت
(فتح) ہو۔ تمھارا نام پنجاب، سندھ، گجرات، مہاراشٹر
اتکل اور بنگال کے باشندوں کے دل میں امنگ پیدا
کرتا ہے۔ وندھیاچل اور ہمالہ میں تمھارا ہی نام گونج رہا
ہے۔ گنگا اور جمنا کی لہروں میں تمھارا نغمہ (شر) بھرا ہوا
ہے۔ بحر ہند کی اچھلتی لہریں تمھارا ہی نام لے رہی ہیں۔ یہ سب
تمھاری ہی دعا کے طالب ہیں، تمھیں سے بھلائی کے طالب
ہیں اور تمھاری فتح کے گیت گا رہے ہیں، اے بھارت
کے بھاگیہ ودھاتا قسمت جگانے والے اور خوشی عطا
کرنے والے تمھاری فتح ہو، تمھاری فتح ہو۔"

★

وصی سیتاپوری

ہمارا دیش

سوندھی مٹی گیانی پربت دانی ساگر والا دیش
سارے جگ میں کوئی نہیں ہے میرے بھارت جیسا دیش

پربت وہ جس کے چرنوں میں شانتی سکوں اور گیان ملے
اس کے شکھر کو جو بھی چھولے دنیا میں سمان ملے
اس کے جھرنے چاندی اُگلیں پھولوں کو مُسکان ملے
یہ پربت جس کا رکھوالا، وہ ہے میرا اپنا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی، ساگر والا دیش

کنٹھ کنٹھ جس کا پوجا جائے اس مٹی کا کیا کہنا
سونا جس کا مول چکائے اس مٹی کا کیا کہنا
پھولوں کو جو ناز سکھائے اس مٹی کا کیا کہنا
ایسی مٹی جس کی دولت وہ ہے اپنا نیارا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

وید پُران کے نغمے جس کی انگنائی میں گونجے تھے
گیتا کے اشلوک بھی جس کی مہاسُن کر جاگے تھے
صرف ہمیں اک جاگ رہے تھے دنیا والے سوئے تھے
دنیا کے اتہاس میں دیکھو وہ ہے بھارت پہلا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

اس دھرتی پر جانے کتنے مسجد اور شوالے ہیں
گیان کی دھوپ انھیں سے پھیلی دور و قریب اُجالے ہیں
جُگ جُگ کی تہذیب پہ یہ وشواس کا پردہ ڈالے ہیں
شنکھ اذان کی آوازوں پر سب کے سیس نواتا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

اس کے سپوتوں کے دل دیکھو سب اچھے انسان ہوئے
تلسی، وارث، ٹھاکر، خسرو، سور، کبیر مہان ہوئے
لکشمی بائی، ٹیپو، نانا، ماتا پر قربان ہوئے
شکتی اور بھگتی کی مہما میں ڈوبا یہ سارا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

قطب، الورا، اس کے پتھر اور کہیں یہ تاج محل
میرا کے بھجنوں کا جادو اور کہیں غالب کی غزل
شوخ کلا کی سنگت پاکر بن جاتے ہیں پھول کمل
گنگا جمنی بھاشاؤں کا صدیوں سے رکھوالا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

امرت کی بھنڈار تلیاں اور کنوؤں کا میٹھا پن
آم اور جامن کے سائے میں اٹھلاتی بدہوش پون
جیٹھ کبھی ہے پوس کبھی ہے اور کبھی ہنستا ساون
سورگ کے دامن کی چھایا میں گیت بسنتی گاتا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

گود میں اس کی جو بھی آیا ماتا جیسا پیار دیا
اپنا کہہ کر، اپنا سمجھ کر اس کے من کو جیت لیا
اس پر اس نے بن مانگے ہی اپنا دھن قربان کیا
بھید بھاؤ سے دور رہا جو، وہ ہے کتنا اچھا دیش
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش

جنگ غریبی کی جاری ہے کھیتوں میں کھلیانوں میں
ایک نراشا سی پھیلی ہے اسمگلر دھنوانوں میں
اور جوانوں کی طاقت کھنچ آئی ہے شرمدانوں میں
انوشاسن پہرہ دیتا ہے دفتر اور دوکانوں میں
راشٹریہ بھاؤنا جاگ رہی ہے مزدوروں کے گاؤں میں
سوندھی مٹی، گیانی پربت، دانی ساگر والا دیش
سارے جگ میں کوئی نہیں ہے میرے بھارت جیسا دیش

آفتاب نقوی

چھبیس ۲۶ جنوری

اک نئی صبح کی آج پھوٹی کرن
ظلمتِ عہدِ ماضی فسانہ بنی
ذوقِ حسنِ عمل کا نشانہ بنی
جاگ اُٹھا لیکے انگڑائی اپنا وطن

آج پوری ہوئی قوم کی آرزو
رہبری کے لیے ایک دستور ہے
زندگی کیسے گزرے یہ مسطور ہے
قیمتی ہے بہت حاصلِ جستجو

راستہ ہم نے اپنا بنایا ہے خود
اب کسی رہنما کی ضرورت نہیں
مشورہ کوئی دے یہ اجازت نہیں
بار کاندھوں پہ اپنا اُٹھایا ہے خود
اِک نئے عزم سے بڑھ چلا کارواں
گرد ہو جائے گی ایک دن کہکشاں

ودود سیفی

غزل

لو، کل میں اور آج میں سب کچھ بدل گیا
اک میں ہی بیوقوف تھا وعدوں پہ ٹل گیا

پہنچا جب انتظار کا سورج عروج پر
میں کول تار بن کے سڑک پر پگھل گیا

کرکے طلوع صبح کو پیالی سے چائے کی
سگریٹ کا دھواں تھا کہ میں گھر سے نکل گیا

تخریب میں بھی رکھتے ہیں تعمیر کا شعور
ہم کیا گرے کہ سارا زمانہ سنبھل گیا

کھوٹے، کھرے میں کون تھا کرتا جو امتیاز؟
سکے کی مانگ تھی جو چلایا وہ چل گیا

غزل

ڈاکٹر نجم الدین نقوی

جانے کیوں نظریں پھیرے ہیں کچھ جانے پہچانے لوگ
جانے کیوں اچھے خاصے ہو جاتے ہیں بیگانے لوگ

عشق ہمارا شیوہ ٹھہرا۔ دل شکنی غیروں کا کیش
طعنے دینے، فقرے کسنے۔ نکلیں پاپ کمانے لوگ

شب کا جاگا دن کو سوئے۔ دن کا تھکا شب میں سستائے
تجھ سے جن کی آنکھ لگے کیا سوئیں وہ دیوانے لوگ

جانے ہیں دیوانہ تیرا ضد کا اپنی پکا ہے
پھر بھی جیسے شکل بنا کر آتے ہیں سمجھانے لوگ

ہم کو پردہ داری لازم۔ دل پر جو گزرے گزرے
کیسے جائیں محفل میں جب لگتے ہیں شرمانے لوگ

دل کا قصہ جب سے اُلجھا کوئی اُسے سلجھا نہ سکا
اُلجھن دونی ہو جائے جب آتے ہیں سمجھانے لوگ

آتشِ ہجراں ہی کیا کم تھی خاکستر کرنے کے لیے
آئے ہیں جو ناصح جیسے اور اُسے بھڑکانے لوگ

موسمِ گل میں داغِ جنوں سے ہے گا چراغاں چار طرف
شمع جلائی دل کی ہم نے آنے لگے پروانے لوگ

ہم سے دل کا قصہ بھی تو پوری طرح کہا نہ گیا
جانے کیسے گڑھ لیتے ہیں آئے دن افسانے لوگ

بسترِ گل پر کروٹ لے کر آنکھ جو کھولی اُس گل نے
ایسا لگا جیسے سب کے سب جانے لگے میخانے لوگ

جب سے اُن کی آنکھوں سے ہم جام پیالے پینے لگے
نشک و خرد سے جھنجھلا جھنجھلا توڑ چلے پیمانے لوگ

بخیہ گری و رخنہ گری و فتنہ گری میں فرق ہی کیا
دورِ خرد کی باتیں نقوی کرتے ہیں فرزانے لوگ

جوہر بجنوری

جب زمانے پہ کوئی تازہ ستم ہوتا ہے
سب سے پہلے مرا دل مائلِ غم ہوتا ہے

آہ، وہ دل کہ جو لذّت کشِ بیداد نہ ہو
ہائے، وہ عشق جو محتاجِ کرم ہوتا ہے

گریۂ عشق میں کچھ اور ہی شے ہوتی ہے
ورنہ دامن کہیں اشکوں سے بھی نم ہوتا ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے شکوہ طرازِ غمِ دل
ستمِ دوست بہ اندازِ کرم ہوتا ہے

خود بخود مائلِ سجدہ جہاں ہوتی ہے جبیں
وہ کہیں بھی ہو ترا نقشِ قدم ہوتا ہے

اُس تخیّل سے مجھے شعر میں ہے سخت گریز
جو مری وسعتِ ادراک سے کم ہوتا ہے

جس کا ہر عزم ہو بیباک و جواں اے جوہر
کب اُسے راہ میں لٹ جانے کا غم ہوتا ہے

عبدالقوی دسنوی

علامہ اقبال اور بمبئی

علامہ اقبال نے لاہور سے غالباً پہلی بار قدم اس وقت باہر نکالا جب وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان تشریف لے جارہے تھے، پہلی ستمبر ۱۹۰۵ء کو وہ لاہور سے روانہ ہوئے اور ۲؍ستمبر کی صبح کو دہلی پہنچے، ایک دن کے قیام کے بعد ۳؍ستمبر کو بمبئی کے لیے اپنے احباب سے رخصت ہوئے جہاں سے ۷؍ستمبر کو انگلستان کے لیے جہاز پر سوار ہوئے، اور یورپ میں تقریباً تین سال قیام کرکے اور اعلیٰ تعلیم سے فراغت پاکر بمبئی اور دہلی ہوتے ہوئے واپس لاہور آئے۔ اس کے بعد اپنی زندگی کے مختلف حصّوں میں مختلف ضرورتوں سے ہندستان کے مختلف شہروں، علی گڑھ، شملہ، کشمیر، پٹنہ، مدراس، بنگلور، میسور، سرنگاپٹم، حیدرآباد، الہ آباد، بھوپال اور پانی پت وغیرہ آتے گئے لیکن اقبال کے کسی سوانح نگار نے تفصیل یا اختصار کے ساتھ اُن تمام شہروں کا ایک ساتھ تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ اگر ذکر آیا ہے تو کچھ شہروں کا وہ بھی اس قدر سرسری کہ علامہ کے سفر کی غرض وغایت اور اُن شہروں میں علامہ کے قیام کے دوران کے حالات وواقعات سے کوئی خاص واقفیت نہیں ہوتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ جن شہروں میں علامہ اقبال کی آمد ورفت رہی ہے یا مختصر یا زیادہ مدت تک قیام رہا ہے اقبال کے تعلق سے اُن شہروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلی کام کیا جائے، تاکہ اقبال کی زندگی کا کوئی حصّہ اوجھل نہ رہے، خوشی کی بات ہے کہ ادھر چند برسوں میں بھوپال[1]، حیدرآباد[2]، کشمیر[3] اور دہلی[4] سے متعلق تفصیلی مقالات شائع ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ بعض شہروں سے متعلق بھی چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف رسائل کے ذریعہ منظر عام پر آچکے ہیں گویا اس طرح اقبال سے دلچسپی رکھنے والے کچھ حضرات اس قسم کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ میرا یہ مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں علامہ اقبال کی بمبئی میں آمد ورفت اور قیام کے سلسلے میں ان سے متعلق حالات، واقعات اور تاثرات جس قدر مجھے دستیاب ہوسکے ہیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علامہ کا یہ پہلا طویل سفر تھا جس میں دہلی کے بعد بمبئی جیسے عظیم شہر میں انھیں چار دن رہنے کا موقع ملا۔ بمبئی وہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۵ء کو پہنچے تھے جہاں ایک انگلش ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس سفر کی تفصیل کہیں نہیں ملتی، البتہ خود علامہ اقبال نے اس شہر کے تاثرات، ہوٹل کے قیام، لوگوں سے ملاقات اور دوسرے تجربات کو نہایت تفصیل سے اپنے طویل خط بنام مولوی انشاء اللہ خاں میں لکھا ہے۔ اس خط کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"۳؍ستمبر (۱۹۰۵ء) صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۴ کو خدا خدا کرکے اپنے سفر کی پہلی منزل میں پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم ہوا

---

[1] علامہ اقبال بھوپال میں از عبدالقوی دسنوی، ۱۹۶۷ء۔ بھوپال اور اقبال از صہبا لکھنوی ۱۹۷۳ء۔

[2] اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدرآبادی ۱۹۶۱ء۔

[3] اقبال اور کشمیر از جگن ناتھ آزاد ۱۹۷۷ء۔

[4] اقبال اور دہلی از عبدالقوی دسنوی (زیر طبع)۔

کہ یہ ہوٹل ہندستانی طلبا ر کے لیے جو ولایت جاتے ہوں نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے، گھاٹ یہاں سے قریب ہیں، ٹامس کُک کا دفتر یہاں سے قریب غرض ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے۔ صرف تین روپیہ یومیہ دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کر لو۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آجاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا پیدا نہیں ہوتا کارلائل نے کیا خوب کہا ہے :

محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے

میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہو گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا، اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی۔ جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اس کا شوق کرو ذرا مسکرایا اور کچھ پیے بھی تھا بولا :

سراب شوک پینے سے سبھی گم دور ہو جاے

میں نے سن کر کہا، واہ رے بڈھے، خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کھینت باڑی میں بکتا پھرے[1] "

اسی ہوٹل کا ایک اور واقعہ علامہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

" اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا، جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا، میں نے ایک روز اس سے پوچھا، تم کہاں سے آئے ہو؟ بولا چین سے آیا ہوں، اب ٹرانسوال جاؤں گا، میں نے پوچھا، چین میں کیا کام کرتے تھے؟ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے سن کر دل میں کہا ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو، شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ، ابھی تم، آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے، ہاں ہم ہندستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سرِ نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمانوں کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں! مولوی صاحب میں بے اختیار ہوں لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے، کیا کروں؟ اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے[2] "

آگے دو نوجوان ترک کے متعلق نہایت دلچسپ انداز میں بتلاتے ہیں :

" ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آبیٹھے، شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یوزپین ہیں فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے آخر جب کھانا کھا کر اُٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی۔ جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح اُن سے ملاقات ہو، دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں، یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا، میں نے پوچھا، فارسی جانتے ہو بولا، بہت کم، پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی۔ لیکن وہ نہ سمجھتا تھا [illegible] مجبوراً

---

[1] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۷۹ -

[2] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۸۰ -

ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔
یہ نوجوان ترک، ینگ ٹرک پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا کمال بے (ترکی کا سب سے بڑا مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں، کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے، سب کے سب نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کے ہجو میں تھے، اُن میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں:

ظلم و جور ن توسفو جہ برستے محو ایلیورہ
آدمیت ملک و ملت دشمن عبدالحمید

یعنی کہیں ظلم و جور نے قوم کو مٹا دیا ہے عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو، انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، کیونکہ جس طریق سے رعایا انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولٹیکل حقوق حاصل کیے ہیں وہ طریق سب سے عمدہ ہے بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت و خون کے ہوجانا یہ کچھ خاک انگلستان کا ہی حصہ ہے[1]۔"

علامہ اقبال نے اپنے اس طویل خط میں اسلامیہ مدرسہ (بمبئی) کے ایک طالب علم سے گفتگو کو بھی نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے جس سے علامہ اور بمبئی کے اس اسکول کے طالب علم کے سوچنے اور غور و فکر کرنے کے انداز کا پتہ چلتا ہے لکھتے ہیں:

"..... ایک روز شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے وہاں اسکول گراؤنڈ میں مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے، ہم نے اُن سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی کیا فنڈ نہیں ہے یا اور کوئی وجہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہوسکتا ہے کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سود اگر موجود ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبا پڑھنے کے لیے نہیں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم اُن میں ہوتی ہے ویسی سردست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے ہیں۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا، میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ اُن میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں[2]۔"

اس کے بعد علامہ اقبال شہر بمبئی کے متعلق نہایت بچے تُلے الفاظ میں اپنے تجربات و تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجیب شہر ہے بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ اُن سے خیرہ ہوتی ہے، بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہوجاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے یورپ، امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز، طلب کرو، فوراً ملے گی البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی یعنی فراغت[3]۔"

ایک اور جگہ بمبئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے، ہمارے ہوٹل کا حجام ہندستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا، گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا میں نے اس سے پوچھا نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے بولا "مجور کالوں کے لیے لڑتا ہے۔" ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے میں نے ایک روز اُن سے پوچھا تم اُردو پڑھ سکتے ہو کہنے لگے نہیں، سمجھ سکتے ہیں، پڑھنا نہیں جانتے ہیں"

---

[1] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۸۲۔
[2] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۸۳۔
[3] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۸۴۔

وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی نے گزشتہ ۲۹ اکتوبر کو
امرتسر شہر کی چار سو سالہ بنیاد کی تقریب کے موقع پر امرتسر
کے گولڈن ٹمپل میں حاضری دی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیر داخلہ شری چرن سنگھ ۲۸ اکتوبر ۷۷ ۱۹ء کو واگہ سرحد
(امرتسر) پر پاکستانی فوج کے ایک لیس نائک سے
مصافحہ کرتے ہوئے

گورنرشری جی۔ڈی تپاسے
چندر بھان گپتا

گورنرشری گنپت راو دیوجی تپاسے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے عالمی
یوم کفایت شعاری کے موقع پر ریاست کے نام اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے

ہندستان میں چین کے سفیر ش
رام نریش یادو سے ۸ نومبر

گورنرشری جی۔ڈی تپاسے، ۲ اکتوبر ۷۷ کو سرسوتی ششو مندر
(نرالانگر) کے بچوں سے گفتگو کرتے ہوئے
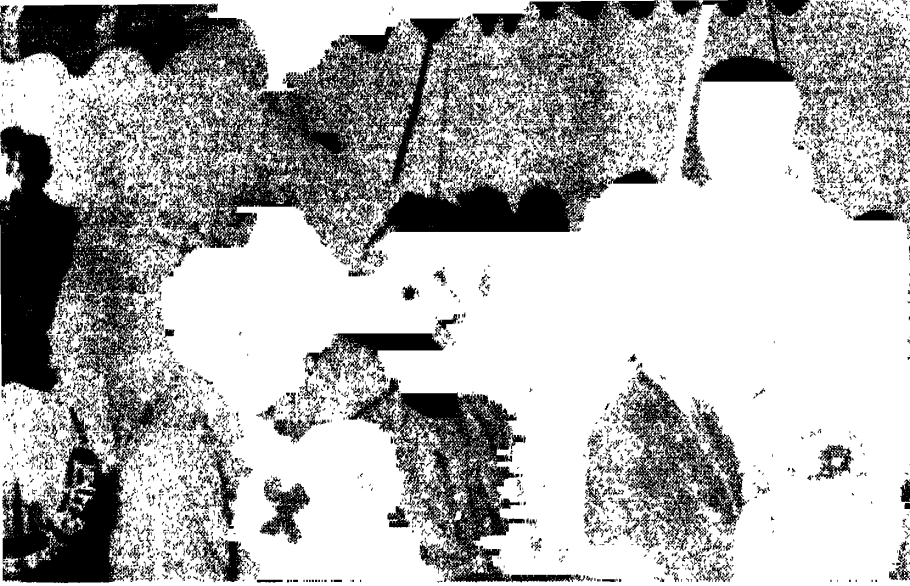
شری اودھیش پرشاد وزیر ریاست محکمۂ اطلاعات یو۔پی ۲۳ اکتوبر ۷۷ء کو سرتھراگاؤں (بارہ بنکی) میں کشتی جیتنے والے پہلوانوں کو انعام دیتے ہوئے

ج بھون میں شری

شری اودھیش پرشاد وزیر ریاست محکمہ اطلاعات اتر پردیش ۲۶ اکتوبر ۷۷ء کو لکھنؤ میں والمیک جی کے یوم پیدائش کی تقریبات کے موقع پر ان کی تصویر کی نقاب کشائی کر رہے ہیں

، نے وزیر اعلا شری
ر تے ہوئے

چیف سکریٹری اتر پردیش شری کرپا نارائن ۵ رنومبر ۷۷ء کو دیوہ شریف (ضلع بارہ بنکی) میں حاجی شاہ وارث کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے
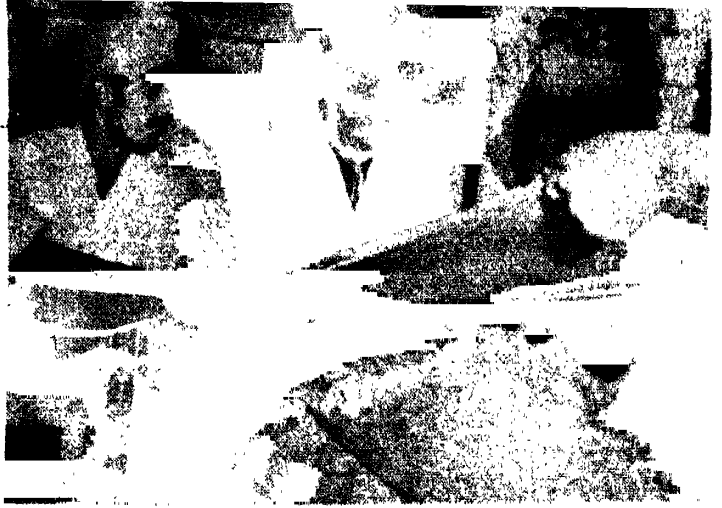
بال سنگھرالیہ لکھنؤ میں ۳ رنومبر ۷۷ء کو منعقدہ مصوری کے مقابلہ میں ایک بچہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہے

بال سنگھرالیہ لکھنؤ میں ۳ رنومبر ۷۷ء کو منعقدہ مصوری کے مقابلہ میں مختلف اسکولوں کے بچے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے

نے پوچھا جب مولوی تمہارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا
ہے۔ مسکرا کر بولا "اردو!" یہاں پر ہر کوئی اردو سمجھ سکتا ہے اور
ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (دہی بوتل والا
پیر مرد) کبھی ہندستان نہیں گیا مگر اُردو خاصی بولتا ہے[1]۔"

اسی خط میں پارسی قوم کے متعلق نہایت اچھی، سچی اور سلجھی ہوئی رائے کا اظہار
کیا ہے:

"یہاں پارسیوں کی آبادی اسی نوّے ہزار کے قریب ہے۔ مگر
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے اس قوم کی صلاحیت
نہایت قابل تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ۔ مگر
اس قوم کے لیے کسی اچھی فیوچر (FUTURE) کی پیشین گوئی نہیں کرسکتا۔
یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی
چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے
علاوہ اس کے نہ کوئی اُن کی زبان ہے نہ اُن کا لٹریچر ہے اور طرہ یہ
کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں افسوس! یہ لوگ
فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں
عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ زردشتی رنگ اس کے
رگ و ریشہ میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دار و مدار ہے میں
نے اسکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا
چستی کی مورتیں تھیں، مگر تعجب ہے ان کی خوبصورت آنکھیں اسی فیصدی
کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک
پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی
ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے[2]۔"

اور بمبئی سے روانگی کا حال بھی نہایت دلچسپ انداز سے بیان کرتے
ہیں:

"میں بمبئی یعنی باب لنڈن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں،
خدا جانے لنڈن کیا ہوگا، جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے،
اچھا دیدہ خواہد شد۔ ۱ ستمبر کو ۲ بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (گھاٹ)
پر پہنچے جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر! یہاں
کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سینکڑوں کشتیاں [illegible]
ہیں کھڑی ہیں اور مسافروں سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے
نہ ڈرو خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح وسلامت منزل مقصود پر پہنچا دیں گے۔
خیر طبی معائنہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا، لالہ دھنپت رام وکیل
لاہور اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اس روز حسن اتفاق
سے بمبئی میں تھے۔ میں ان کا نہایت سپاس گزار ہوں کہ یہ دونوں عنایتاً
مجھے رخصت کرنے کے لیے ڈاک پر تشریف لائے۔ بہت سے اور لوگ
بھی جہاز پر سوار ہوئے اور ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کا
ایک ہجوم ڈاک پر تھا۔ کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے
دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے
گئے[3].....

اس طرح علامہ نے خود ہی بمبئی اور اس کے حالات، تجربات اور
تاثرات کو قلم بند کرکے ایک بڑی کمی کو پوری کردی ہے لیکن جب تقریباً تین سال
بعد ۱۹۰۸ء کے وسط میں ولایت سے واپسی ہوئی تو بمبئی میں ان کا قیام رہا
یا نہیں اس بارے میں کہیں کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری ہے ممکن
ہے کہ خطوط یا اخباروں میں کہیں کچھ یا بہت کچھ درج ہو اور کسی تحقیق
کرنے والے کی منتظر ہو۔

حکومت برطانیہ نے ہندستان کے سیاسی مسائل کو سلجھانے کے لیے
اکتوبر ۱۹۳۱ء میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس بلائی تھی، جس
میں شرکت کے لیے وائسرائے ہند کی طرف سے جن مندوبین کے نام
دعوت نامے جاری ہوئے تھے اُن میں علامہ اقبال، مولانا شوکت علی،
مولانا شفیع داؤدی، سر آغا خاں وغیرہ بھی تھے، ۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء تک
لندن پہنچنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔

علامہ اقبال اس کانفرنس میں شرکت کے علاوہ ممالک اسلامی کی سیر
کی خواہش بھی بہت زیادہ تھی۔ نذیر نیازی صاحب کو ۱۹ اگست کو

---

[1] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۸۵۔

[2] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ۸۴۔

[3] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ۸۶۔

لکھتے ہیں:

" میں غالباً یکم ستمبر کی شام کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور ۵ ستمبر کو بمبئی۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی بڑی آرزو ہے۔ مگر یہ سب کچھ روپیہ پر منحصر ہے۔[1]"

لیکن علامہ ۱ ستمبر کو کسی وجہ سے بمبئی کے لیے روانہ نہ ہو سکے بلکہ ۸ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دہلی ہوتے ہوئے ۱۰ ستمبر کو بمبئی پہنچے جہاں خلافت ہاؤس میں قیام رہا۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کا ملازم علی بخش بھی تھا۔ علامہ ایک خط بنام منشی طاہرالدین میں لکھتے ہیں:

" بمبئی پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوقی قنصل افغانستان مقیم بمبئی نے دعوت دی۔ ان کے ہاں پُرلطف صحبت رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر ہیں۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف ہیں۔ علوم دینی میں بھی کافی دسترس رکھتے ہیں۔ ہرات کے قاضی رہ چکے ہیں، ان کے دولت کدہ پر مرزا اطلعت یزدی نے جو بمبئی میں دس سال سے مقیم ہیں ایرانی لہجے میں اپنے اشعار سُنائے۔ جو آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے۔ اسی شام عطیہ بیگم صاحبہ کے ہاں سماع کی صحبت رہی جہاں اہلِ ہوس بار نہیں پا سکتے:

بر سماع راست ہر تن چیرہ نیست
طعمہ ہر مرغکی انجیر نیست[2]"

یہاں شام سے مراد سہ پہر کی اس دعوت سے ہے جو ۱۰ ستمبر کو علامہ اقبال کے اعزاز میں محترمہ عطیہ فیضی اور مسٹر رحیمن فیضی نے ایوان رفعت میں دی تھی۔ اس دعوت میں شہر کے معززین اور اہل علم حضرات شریک ہوئے تھے جن میں مرزا علی اکبر خاں، ڈاکٹر محی الدین صوفی، مولانا محمد عرفان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ضیاء الدین احمد برنی بھی اس دعوت میں موجود تھے وہ لکھتے ہیں:

"یہ ٹی پارٹی لان میں دی گئی تھی۔ جس میں پھولوں کی پر بہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دلآویزی پیدا ہو گئی تھی۔ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا تاکہ بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹاؤں۔ اتفاق یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو پہنچنے میں دیر ہو گئی، بیگم صاحبہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ

موٹر لیکے جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ۔

ابھی چند ہی فرلانگ گیا ہوں گا کہ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آرہے ہیں ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ

آپ کا وہاں بڑی شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ

میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا:

یہ کام تو آپ پھر بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ہیں انھیں آپ کس مد میں ستا رہے ہیں؟

بہرحال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضامند ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم ایوان رفعت پہنچ گئے۔"

دروازے پر عطیہ فیضی اور رحیمن فیضی نے استقبال کیا، اور محترمہ عطیہ فیضی شکوہ شکایت کرتے ہوئے اقبال کو اس جگہ لے آئیں جہاں ٹی پارٹی ہونے والی تھی۔

ضیاء احمد برنی صاحب لکھتے ہیں انھوں نے علامہ اقبال کو اس قدر مسرور اور خوش کبھی نہیں دیکھا تھا، جس قدر وہ اس ٹی پارٹی میں نظر آرہے تھے۔ عطیہ فیضی سے مختلف موضوعات پر نہایت شگفتگی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے کبھی کبھی چست جملے بھی کستے جاتے تھے۔ ایک بار عطیہ بیگم نے کہا:

اقبال یاد رکھو بچے کے لیے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔

تو ڈاکٹر اقبال نے ہنس کر پوچھا:

اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔

چائے پینے کا سلسلہ ختم ہوا تو عطیہ فیضی نے اپنے معزز مہمان ڈاکٹر اقبال کا تعارف کرایا اور اُن سے گزارش کی کہ وہ کچھ پیغام دیں جس کے جواب میں علامہ اقبال نے ایک مختصر تقریر کی اور فارسی کا ایک شعر سناتے ہوئے کہا کہ میرا یہی پیغام ہے:

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

[1] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۴۷ [2] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۰۳-۲۰۴

فارسی داں حضرات تو اس شعر سے بہت لطف اندوز ہوئے لیکن وہ حضرات جو فارسی سے نابلد تھے ان کا اصرار ہوا کہ علامہ اس شعر کا مطلب انگریزی میں لکھ دیں چنانچہ علامہ نے اسی وقت ترجمہ لکھ دیا

LIVE SO BEAUTIFULLY THAT IF DEATH IS THE END OF ALL GOD HIMSELF MAY BE PUT SHAME FOR HAVING ENDED THY CAREER.

پھر لان سے حاضرین کو ہال میں لے جایا گیا، جہاں تھوڑی دیر موسیقی پھر رقص کی محفل جمی، جس میں ایک کالی کلوٹی عیسائی عورت نے کمالات دکھائے ۔ اس دوران میں علامہ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا منگایا جس پر ذیل کے تین فارسی شعر لکھ کر عطیہ بیگم کو پیش کیا:

ترسم کہ تو می رانی زورق سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
بر کشت و خیابان پیچ بر کوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت دلآویزے از زخمہ مطرب نیست
مہجور جہاں حورے نالد بہ رباب اندر!

اور پھر کچھ دیر بعد ذیل کا مشہور شعر علامہ نے لکھ کر عطیہ فیضی کی طرف بڑھا دیا:

" پرائیویٹ

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں
محمد اقبال

بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

اس کے بعد علامہ نے حاضرین سے ہاتھ ملایا اور " ایوان رفعت " سے رخصت ہوئے[1] ۔

بمبئی سے روانگی سے پہلے بمبئی کرانیکل کے نمائندے نے اقبال سے انٹرویو لیا اور مختلف موضوعات سے متعلق سوالات کیے ۔

ابتدا میں اقبال نے فرمایا کہ

" میں کسی بھی قوم یا فرقہ سے متعلق تعصب نہیں رکھتا میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ اسلام کو اپنی ابتدائی سادگی کے ساتھ اختیار کیا جائے ۔ میں ہندستانیوں کو پُرامن دیکھنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر فرقے کو اپنی تہذیب اور انفرادیت برقرار رکھنے کی اجازت ہو "

نمائندہ کرانیکل نے سوال کیا :

" کیا آپ برطانوی شہنشاہیت کو مذہبی تصور کرتے ہیں "

علامہ اقبال نے جواب دیا :

" تمام ریاستیں جو استحصال کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں غیر مذہبی ہیں "

نمائندہ کرانیکل :

" کیا آپ شاہی اداروں کے برقرار رکھنے سے متفق ہیں

علامہ اقبال :

" میں ان اداروں کے حق میں نہیں اور نہ ہی دل سے جمہوریت کا حامی ہوں، میں جمہوریت کو اس لیے قبول کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں "

نمائندہ کرانیکل :

" آپ قومیت کے مخالف کیوں ہیں ؟ "

علامہ اقبال :

" میں اسے اسلام کی اعلیٰ اقدار سے متصادم پاتا ہوں ۔ اسلام محض اعتقادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی ضابطہ ہے، اسلام نے رنگ کا مسئلہ حل کر دیا ہے یہ انسانی ذہن کو ایک خاص رخ پر موڑ دینا چاہتا ہے یہ درحقیقت بنی نوع انسان کی روحانی مساوات اور یک جہتی کا علمبردار ہے ۔ قومیت جیسا کہ اس پر عمل کیا جاتا ہے ان اقدار کی مخالف ہے ۔ اسی لیے اس کا مخالف ہوں "

---

[1] ایوان رفعت کی یہ تمام روداد عظمت رفتہ از ضیاء احمد برنی ص ۴۲ ۔ ۲ سے اختصار کے ساتھ لی گئی ہے ۔ دسنوی

نمائندہ کرانیکل

"کیا آپ گول میز کانفرنس کے بعد واپسی میں کسی اسلامی ملک کا دورہ کریں گے؟"

علامہ اقبال:

"میری خواہش یہ ہے کہ تمام یا جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ اسلامی ملکوں کا دورہ کروں لیکن فنڈ کی کمی کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ بہت سے اسلامی ممالک کا دورہ کروں .... تمام اسلامی ممالک کا دورہ اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا جا سکے میرا ارادہ THE MODERN WORLD OF ISLAM کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کا ہے۔ لیکن یہ بھی اس رقم پر منحصر ہے جو مجھے اس سفر کے دوران ملے گی۔ اس موقع پر قطعیت سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔"[1]

۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء کو علامہ اقبال تقریباً ایک بجے "ملوجا" نامی جہاز سے انگلستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر علامہ اقبال ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو "پلنا" جہاز سے بمبئی پہنچے۔ کسٹم کے بعد غلام رسول مہر اور شفیع داؤدی کے ساتھ صبح دس بجے دار الخلافت پہنچے۔ جہاز پر لینے کے لیے مولانا محمد عرفان اور دوسرے احباب تشریف لائے تھے۔

اس مرتبہ بھی محترمہ عطیہ فیضی اقبال کے اعزاز میں "ایوان رفعت" میں دعوت دینا چاہتی تھیں لیکن علامہ اقبال اور غلام رسول مہر بلا تاخیر بمبئی پہنچنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر علامہ نے دار الخلافہ میں آرام کیا۔ شام کے وقت کسی دوست کے ساتھ "ایوان رفعت" پہنچے۔ قریب چھ بجے غلام رسول مہر بھی معذرت کے لیے ایوان رفعت پہنچے۔

علامہ اقبال نے آدھ گھنٹہ "ایوان رفعت" میں قیام کیا پھر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ گاڑی کی روانگی کا وقت، بجکر ۲۰ منٹ تھا۔ احباب خلافت اور دوسرے حضرات اسٹیشن پر موجود تھے۔ شاہجہاں ہوٹل کے مالک سید فضل شاہ بھی اسٹیشن پر موجود تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ علامہ کا قیام ان کے ہوٹل میں ہو لیکن علامہ ایسا نہ کر سکے جس کی وجہ سے سید فضل شاہ وہاں علامہ سے شکایت کر رہے تھے کہ انھوں نے نہ ان کے ہوٹل میں قیام کیا اور نہ ہی دعوت قبول کی۔ گاڑی ٹھیک وقت پر بمبئی سے روانہ ہوئی۔

علامہ کے بمبئی میں اس طرح تین بار قیام کا پتہ چلتا ہے۔ ممکن ہے ان کا یہاں آنا اور بھی ہوا ہو، لیکن مجھے ان کے علاوہ علامہ کے بمبئی کے کسی سفر کا علم نہیں ہو سکا ہے۔

[1] یہ انٹرویو اختصار کے ساتھ سفرنامہ اقبال از محمد حمزہ فاروقی (ص ۱۹-۲۰) سے لیا گیا ہے۔ دسنوی

مرے وطن ترے صدقے ترے نثار کروں
مری نگاہ میں ہے شاہکار رنگ و بو

وہ تیرے کھیتوں میں دہقاں حیات اگاتے ہوئے
وہ کارخانے ترے زندگی سجاتے ہوئے

یہ سچ کہ تیرے گلوں سے ہے پیار بھی مجھ کو
عزیز ہیں ترے گلشن کے خار بھی مجھ کو

وہ سرحدوں پہ جوانوں کے مورچے تیرے
وہ آسماں میں جہازوں کے سلسلے تیرے

وہ تیرے گاؤں کے پنگھٹ، وہ گوریوں کی بہار
وہ تیرے شہر، وہ شہروں کے خوشنما بازار

بڑے خلوص سے بیحد ادب سے کہتے ہیں
فسانہ تیری بہاروں کا سب سے کہتے ہیں

ترا وقار ترا مرتبہ رہے قائم
یہ نکہتیں یہ بہاریں یہ رنگ ہوں دائم

بسنت کمار بسنت

شام اور سویرا

(۱)
غم و اندوہ کا وہ تلخیٔ دوراں کا سماں
زندگی جیسے سقر، جیسے کوئی بارِ گراں
جبر و بیداد کا وہ دور وہ ہر اک حیراں
اپنی قسمت سے ہر اک آدمی نالاں گریاں

(۲)
ہم پہ جو گذری ہے وہ بات نہیں کہہ سکتے
اُف! وہ آلام وہ حالات نہیں کہہ سکتے
سرگذشتِ غمِ جذبات نہیں کہہ سکتے
دن کو جب کہنا پڑا رات، نہیں کہہ سکتے

(۳)
ہم پہ بیداد ہوئی ایسی نہ سہنے پائے
چین سے امن و تحفظ سے نہ رہنے پائے
اشک اُمنڈ آئے تو آنکھوں سے نہ بہنے پائے
اپنی رودادِ غمِ زیست نہ کہنے پائے

(۴)
دورِ ماضی کوئی تصویرِ اَلم ہو جیسے
کسی معصوم کی رودادِ ستم ہو جیسے
کسی مفلس کی قبا اشک سے نم ہو جیسے
ظلم سے سر کسی مجبور کا خم ہو جیسے

(۵)
خوش ہو یارانِ چمن شکوۂ پیہم نہ کرو
خوش ہو اربابِ وطن غم نہ کرو، غم نہ کرو
گلِ افسردہ کو تم دیکھ کے ماتم نہ کرو
قصۂ غم نہ سنو، آنکھ کو پُرنم نہ کرو

(۶)
خوش ہو اے اہلِ وطن ظلمتِ شب ختم ہوئی
شاد ہو تم کہ اَلم پوش سیہ رات گئی
آہنی دور گیا مٹ گئی بیدادگری
ذہن و دل شاد ہوئے اب نہیں حیراں نظری

(۷)
صبحِ نو آئی ہے گلشن میں لیے جلوۂ نور
شادماں ہیں وہ جو کل تک تھے پریشاں رنجور
آج ہر کوئی نظر آتا ہے ہر سُو مسرور
نغمہ زن آج گلستاں میں ہیں ہر سمت طیور

(۸)
ہے وہ عالم کہ مہک اُٹھا ہے اپنا گلشن
وہ چراغاں ہے کہ ہر گوشہ ہے تاباں روشن
اب نہیں ظلم کہیں اب نہیں کوئی اُلجھن
غنچہ و گل سے بھرا ملتا ہے سب کا دامن

(۹)
کس سلیقہ کی چمن میں چمن آرائی ہے
ہر طرف اک نیا انداز ہے رعنائی ہے
کہکشاں آج تو دھرتی پہ اُتر آئی ہے
کیا تماشہ ہے کہ ہر ایک تماشائی ہے

(۱۰)
کوئی کعبہ کا پرستار، کوئی دیر نشیں
سرزمینِ چمنِ ہند ہے کس درجہ حسیں
سبزہ و گل میں کہیں اب کوئی تفریق نہیں
یہ گلستاں ہے ہمارا کہ ہے فردوسِ بریں

ڈاکٹر محمد یٰسین

دہلی کا لال قلعہ

ہندستان میں اسلام کی آمد محض ایک تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک انقلاب کا نقیب بھی ہے۔ اس کی آمد کے بعد ہندستان میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ہمارا دیس ہندو دھرم اور اسلام کے دو تیز دھاروں کا حسین سنگم بنا اور ہماری تہذیب رنگا رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ بن گئی۔ دو تہذیبوں کے اس اشتراک نے فنِ تعمیر کی تاریخ میں بھی ایک نئے دور کا آغاز کیا اور ہندو مسلم طرزِ تعمیر کی آمیزش سے اس نئے اسلوب کی بنیاد پڑی جسے ہم ہند۔اسلامی یا ہند۔مسلم فنِ تعمیر کہتے ہیں۔

تاریخی نقطۂ نظر سے ہندستان میں ہند۔مسلم فنِ تعمیر کی تاریخ ۱۱۹۳ء اور ۱۲۰۶ء کے مابین شمالی ہند کی مسلم تعمیرات سے شروع ہوتی ہے۔ پرانی دہلی کے کھنڈروں پر ایک شہر ابھرا جو مسجدوں، محل سراؤں اور میناروں سے مزین تھا اور جس کو ہندو معماروں نے ایک ایسے طرز پر تعمیر کیا تھا جو بنیادی طور پر ہندوانہ لیکن جس پر ہلکا سا اسلامیت کا پردہ تھا۔

شاہ جہاں کی تخت نشینی سے ہند۔مسلم فنِ تعمیر کا "دورِ تغزل" شروع ہوا۔ اکبر اعظم کی طرح شاہ جہاں بھی عمارت سازی کا لامحدود حوصلہ رکھتا تھا لیکن شاہ جہاں کا عہد سنگ سرخ کے دور کے برخلاف سنگ مرمر کا دور تھا۔

آگرہ میں گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد شاہ جہاں کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ دہلی کو اپنی راجدھانی بنائے۔ چنانچہ شہر شاہ جہاں آباد کی بنیاد ۱۶۳۸ء میں ڈالی گئی۔ قلعۂ معلّٰی یا لال قلعہ اس شہر کی امتیازی خصوصیت تھی۔ دہلی کا لال قلعہ مشرق میں بلکہ غالباً ساری دنیا میں سب سے شاندار محل سرا ہے۔ اس کے خاکے کا ہر ہر خد و خال انتہائی سلیقہ مندی نظم و ضبط اور ہم آہنگی کا آئینہ دار ہے۔ اس کا زیادہ حصہ شکل میں مربع ہے۔ پورے خاکے میں شاید ہی کوئی آڑی ترچھی لکیر ملتی ہے۔ یہ قلعہ چار دروازوں، دو کھڑکیوں اور اکیس برجوں پر مشتمل ہے۔ قلعہ کی مجموعی لمبائی تین ہزار فیٹ اور چوڑائی ایک ہزار آٹھ سو فیٹ ہے۔ یہ قلعہ نو سال، تین مہینہ اور کچھ دنوں میں بن کر تیار ہوا۔ شاہ جہاں کے وقت میں قلعہ کو قلعۂ مبارک یا قلعہ شاہ جہاں آباد کہتے تھے۔

ہم قلعہ میں لاہوری دروازہ سے داخل ہوتے ہیں جو چاندنی چوک کے متصل ہے۔ قلعۂ معلّٰی کا پُرشکوہ جنوبی دروازہ جس کو دہلی دروازہ، اکبری دروازہ اور رہتیا پول بھی کہتے ہیں، سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور جا بجا مناسب مقامات پر سنگ مرمر کی پچی کاری کی ہوئی ہے۔ اس دروازے کے سامنے کوئی اوٹ نہ تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اس دروازہ کے آگے ایک اور چوک بنوایا اور دروازہ کا منہ مغرب کی طرف ہو گیا۔ جب شاہ جہاں نے جو حالت نظر بندی میں تھے، یہ سنا تو اورنگ زیب کو لکھا کہ اے فرزند! تم نے قلعہ کو دولہن بنایا ہے اور اس کا گھونگھٹ نکالا ہے۔

دیوان عام کا بڑا ہال صحن کے مشرقی حصہ کی خاص چیز ہے۔ اس صحن میں نوبت خانہ سے داخل ہو سکتے ہیں۔ ہال کا اندرونی حصہ ستونوں کے ذریعہ تین بازوؤں میں منقسم ہے۔ اس کے سامنے کا مغربی حصہ دس ستونوں سے آراستہ ہے۔ عقبی دیوار کے وسط کی ایک خالی جگہ میں سنگ مرمر کا ایک قبہ جڑا ہوا ہے جس کو "نشیمن ظلِ الٰہی" کہتے ہیں۔ اس جگہ پر تقریبات کے موقع پر شہرۂ آفاق تخت طاؤس رکھا

جاتا تھا۔

امتیاز محل یا رنگ محل، شاہی حرم کا سب سے بڑا محل تھا عبدالحمید لاہوری اس محل کے بارے میں لکھتا ہے:

"خوبی اور رتبہ میں تختِ ہشت طبق آسمان سے برتر ہے اور رنگ و نور میں بہشت موعودہ کے محلوں سے فزوں تر ہے۔"

رنگ محل کی ایک خصوصیت نہرِ بہشت ہے جو اس سے ہوکر گزرتی ہے۔ اس کا وقوع اور بناوٹ اپنے آس پاس کی عمارتوں کی تعمیراتی خصوصیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس نہر کے اندر فرش پر سنگ مرمر کا ایک کم گہرا حوض ہے۔ اس حوض کے وسط سے چاندی کا بنا ہوا کنول کا نازک تنہ نکلتا ہے۔ اس تنے کے اوپر کنول کے پھول سے معطر پانی کے فوارے چھوٹتے ہیں۔ حوض کی وضع ایک بہت بڑے کنول کے پھول جیسی ہے یا بقول سرسید" بعینہ مثلِ کفِ دست دلبرانِ دلبر با معلوم ہوتا ہے۔" اس کی پنکھڑیاں ایک سوراخ دار ڈھانچہ کے اندراتنے حسن و نفاست سے بنائی گئی ہیں کہ اس سے متاثر ہوکر سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں لکھا ہے:

"پیالہ کی لبوں پر سے پانی کا گرنا اور اس حباب آب میں سے گل بوٹوں کا لہراتا ہوا دکھائی دینا ایک عالم طلسمات ہے۔"

شاہ جہاں کے محل خاص میں ہم "میزان عدل" بنا ہوا پاتے ہیں یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شاہ جہاں کو انصاف کتنا عزیز تھا "میزان عدل" کے پس منظر میں ساری کائنات ہے۔ سورج ہے، چاند ہے اور ستارے ہیں۔ جب بادشاہ ہر صبح خواب سے بیدار ہوتا تھا تو سب سے پہلے اس کی نظر میزان عدل پر پڑتی تھی۔ میزانِ عدل اگر دیوانِ عام یا دیوانِ خاص میں ہوتا تو اس کی اتنی اہمیت نہ ہوتی جتنی کہ خاص محل میں۔ میزانِ عدل کی خوبصورتی ابھری ہوئی جالیوں کی وجہ سے اور بھی زیادہ دیدہ زیب ہوجاتی ہے۔

دیوان خاص کو شاہ محل بھی کہا جاتا تھا۔ فرگوسن کا خیال ہے کہ اگر یہ عمارت شاہ جہاں کی تمام عمارتوں میں حسین ترین نہیں تو سب سے زیادہ مزین یقیناً ہے۔ یہ نسبتاً دہلی اور آگرہ کے مقابلے میں آرائش میں یقیناً زیادہ دلکش اور پُر شکوہ ہے۔ اس ہال کی چھت کے چاروں طرف سونے کے پانی سے یہ مشہور شعر لکھا ہوا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

قلعہ معلیٰ کے اندر جو موتی مسجد ہے وہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے تین خوشنما در ہیں اور دو چھوٹے چھوٹے مینار اور تین سنہرے گنبد ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگ اس کو سنہری مسجد بھی کہتے ہیں۔

باغِ حیات بخش یقیناً روح کو تازگی اور دل و دماغ کو سکون مہیا کرتا ہے۔ باغ کے دو کناروں پر آمنے سامنے ساون بھادوں ہے جہاں چراغوں کے اوپر سے پانی کا گرنا اور اُچھلنا عجیب سماں پیدا کرتا ہے۔

احساسات کی رفعت اور بلند تخیل شاہ جہاں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ شاہ جہاں کی عمارتوں میں حسن ہے، رعنائی ہے۔ یہ حسن و جمال کی پیکر معلوم ہوتی ہیں۔

دہلی کا لال قلعہ ہند۔ مسلم فن تعمیرات کے چند جواہرات میں سے ایک ہے لیکن آج اکثر عمارتوں کے صحن موجود نہیں اور نہ انھیں جوڑنے والے دالان ___ نہ آب رواں ہے اور نہ شگفتہ باغات۔ وقت اور ارضی اور سماوی آفات نے انھیں تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود ؎

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

دہلی کا لال قلعہ صرف ایک تعمیراتی شاہکار نہیں ہے بلکہ ہماری پوری قومی زندگی اور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے۔ جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا تو لال قلعہ ہماری آخری پناہ گاہ تھا۔ عظمتِ رفتہ کی آخری نشانی۔ یہی وہ قلعہ ہے جہاں آخری تاجدار سلطنت مغلیہ بہادر شاہ ظفر نے آزادی کی جنگ لڑی۔ اور یہی وہ قلعہ ہے جہاں سے یوم آزادی کے موقع پر ہم آزاد ہندستان کا پرچم ہوا میں لہراتے ہیں۔

★

ویریندر پرشاد سکسینہ

تذکرہ شعرائے بدایوں

بدایوں صدیوں سے علم و فضل کا مرکز رہا ہے اور ہندستان کا ایک تاریخی شہر ہونے کی حیثیت سے بھی یہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی اور امیر خسرو کے استاد شہاب الدین مہمرہ کی جنم بھومی ہونے کا فخر بھی بدایوں کو حاصل رہا ہے۔ اکبری عہد کے مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی بھی بدایوں ہی کے تھے جنھوں نے سلطنت مغلیہ کے جاہ و جلال کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ ان کی تالیف منتخب التواریخ ان کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ بدایوں میں اردو ہندی اور فارسی کے کم سے کم دو سو سے زیادہ قابل ذکر شاعر ہوئے ہیں۔ آج اس مقالہ میں دس ایسے شعراء کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور جن کو ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے بالکل بھلا دیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: منشی عنایت اللہ روشن بدایونی، مولانا ضیاء احمد بدایونی، منشی مجید الدین احمد عیش بدایونی، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی، ماسٹر سبطین احمد بدایونی، مولانا نظام الدین حسین نظامی بدایونی، مولانا علی احمد خاں اسیر بدایونی، مولوی محمد یعقوب حسین ضیا القادری، مولوی رضی احمد رضی دشتر یہ اور مولوی رفیع احمد عالی بدایونی۔

عنایت اللہ روشن بدایونی

عنایت اللہ روشن بدایونی ۲۱ر فروری سنہ ۱۸۶۰ء کو بدایوں کے ایک اعلیٰ ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے چچا مولانا شہاب الدین فارسی اور اردو میں عالمانہ نظر رکھتے تھے اور آپ کے بڑے بھائی مولوی سلیم اللہ سلیم شعر و سخن کے متوالے تھے اور بدایوں کے قابل ذکر شعراء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ روشن بدایونی ۲۵ سال تک مشن اسکول بدایوں میں ہیڈ مولوی رہے امریکن اور انگریز پادریوں میں اردو کا عام مذاق پیدا کیا۔ مشن اسکول بدایوں نے آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تاحیات آپ کی ادبی پنشن مقرر کر دی تھی۔ ۷ر دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء کو انتقال فرمایا۔

ابتدا میں نواب عبدالعزیز خاں بریلوی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اس کے بعد حضرت امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد ہو گئے اور تاحیات دونوں استادوں کے عقیدت مند رہے۔ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

امیر اب ہے۔ نہ عبدالعزیز خاں روشن
یہ لوگ وہ تھے کہ ہر وقت یاد رہتے ہیں

آپ کا ایک مختصر دیوان دیوان روشن کے نام سے مطبع شانتی پریس بدایوں سے سنہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ تعلیم فارسی ماہ مارچ سنہ ۱۸۹۶ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا جو فارسی کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے روشن بدایونی نے تالیف کیا تھا۔ مثنوی خورشید روشن مطبع نولکشور پریس لکھنؤ سے سنہ ۱۸۹۲ء میں طبع ہوئی ہے ایک اور دوسری مثنوی قصہ راجا بلوان مل و چتر سین مطبع نامی پریس لکھنؤ سے سنہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہو کر مقبول

ہو چکی ہے اس مثنوی کے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں کتاب میں رقمطراز ہیں:

"مثنوی گلشن عشق (قصہ راجا بلوان مل و چتر سین) کے مصنف عنایت اللہ روشن بدایونی کی ایک اور مثنوی خورشید روشن بھی ہماری نظر سے گذری ہے یہ سال تصنیف ۱۳۱۷ھ۔ مطبع نامی لکھنؤ سے دوسری بار ۱۹۰۴ء میں ۱۶ صفحوں پر مع غزلیات مصنف طبع ہوئی۔ اس میں عشق کا ایک عامیانہ قصہ بیان کیا گیا ہے لیکن لطف زبان کے لحاظ سے یہ مثنوی گلشن عشق پر فوقیت رکھتی ہے۔"

جناب روشن بدایونی کا شمار بدایوں کے کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا تھا۔ غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ امیر مینائی کے بدایونی شاگردوں میں حضرت عیش بدایونی اور روشن بدایونی زیادہ مشہور ہوئے۔ آپ کے اردو کلام کے سلسلے میں مولوی علی احمد خاں اسیر بدایونی مرحوم پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے:

"مولوی عنایت اللہ روشن تخلص اس زمانہ کے شعرا میں ایک خاص شخص تھے آپ کا موجودہ کلام جو دیوان روشن کے نام سے موسوم ہے اس کا اکثر حصہ جستہ جستہ میں نے پڑھا ہے۔ ہر حیثیت سے بہتر ہے۔ مضامین فنا و بقا، عالم کی بے ثباتی، زمانہ کا انقلاب، گردش آسمانی کے اثرات کو حسنِ تعلیل و مراعات النظیر کی پابندی کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ بندش صاف ہے شاعر کے مافی الضمیر کے ظاہر کرنے کے لیے اس کے الفاظ بے تکلف ایک روشن آئینہ کا کام دیتے ہیں۔"

اب کلام کا کچھ انتخاب ملاحظہ فرمایئے:

کبھی نہ اوج پہ آیا مرا ستارۂ بخت
ہزار بار زمانہ کو انقلاب ہوا

قفس سے پہونچے چمن تک نہ موسم گل میں
یوں ہی گزر گئی فصلِ بہار آنکھوں میں

تری گلی میں ترے جاں نثار بیٹھے ہیں — نگاہِ لطف کے امیدوار بیٹھے ہیں
زمیں پہ سر کو جھکائے ہوئے تصور میں — مثالِ نقشِ قدم خاکسار بیٹھے ہیں
فراق میں دلِ مضطر کا اضطراب نہ پوچھ — جگر کو تھامے ہوئے بیقرار بیٹھے ہیں

ذرہ ذرہ میں ترا نور ہے اللہ اللہ — پتا پتا شجرِ طور ہے اللہ اللہ

پھولا ہے لالہ زار دلِ داغدار کا — فصلِ خزاں میں لطف ہے فصلِ بہار کا

جو رونقِ چمن تھے نہ وہ گل نہ خار ہیں
کچھ کچھ مٹے ہوئے سے نشانِ مزار ہیں

مولانا ضیاء احمد بدایونی

نام ضیاء احمد نسباً شیخ صدیقی وطن بدایوں، ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ آپ کے والد ماجد جناب مولوی رفیع احمد صاحب عالی وکیل، صاحب دیوان تھے جو فارسی و عربی میں دستگاہِ کامل اور تحقیق لغت و ادب میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ آپ کے نانا مولوی امانت حسین منصف اپنے عہد کے عالم باعمل اور فاضل بے بدل تھے۔ حضرت مرحوم ایک نادر کتب خانہ کے مالک اور کئی فارسی کتابوں کے مصنف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو گھر کا ماحول علمی و ادبی پایا۔ قرآن مجید اور ابتدائی فارسی درسیات کی تعلیم حسب رواج گھر پر ہوئی۔ پھر دارالعلوم شمس العلوم بدایوں میں داخل ہو کر کئی سال تک فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کا درس لیا۔ اساتذہ عربی میں جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب اور حضرت مولانا محب احمد صاحب (جو علامۂ زماں حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے) قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دو بار حضرت مولانا عبدالمقتدر صاحب قبلہ سے بھی سبق پڑھنے کا آپ کو شرف حاصل ہوا نیز حضرت مولانا سید یونس علی صاحب سے سند

حدیث لی۔ اسی زمانہ میں آپ کو انگریزی تعلیم کا شوق ہوا۔ چنانچہ اسکول
اور کالج میں ہمیشہ امتیاز سے کامیاب ہوئے۔ بی۔ اے میں بریلی کالج
سے اول آنے پر طلائی تمغہ پایا اور ۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے
ایم۔ اے (فارسی) میں فرسٹ ڈویژن پاس کیا جس کے بعد دو سال
تک یونیورسٹی مذکور میں علمی تحقیق کے کام پر مامور رہے۔
مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۲۶ء میں لیکچرر، اور پھر ریڈر رہ کر
۱۹۵۸ء میں پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی کی حیثیت سے سبکدوش
ہوئے۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو ہند میں اردو لغت کی تیاری کے
کام میں نگراں کی حیثیت سے مدد دی۔ اور پھر دہلی یونیورسٹی
میں ایک اردو لغت کی تیاری کے کام کی نگرانی کرتے رہے اور
تقریباً دس سال اس کام میں آپ نے محنت کی۔ دو سال سے
علی گڑھ میں مقیم تھے اچانک گر پڑے اور دماغ پر چوٹ آئی اور
۱۷ اور ۱۸ جولائی ۱۹۷۳ء کی درمیانی شب میں انتقال کیا۔

(۱) شرح دیوان مومن کا پہلا اڈیشن شانتی پریس الہ آباد
سے ۱۹۳۴ء میں دوسرا ۱۹۴۷ء میں اور تیسرا ۱۹۵۷ء میں
شائع ہوا۔ محققانہ مقدمے اور فاضلانہ شرح کے ساتھ اردو
کے نازک خیال استاد مومن دہلوی کے دیوان کا یہ صحیح ترین
اڈیشن ہے جو ۱۹۳۴ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا اور ملک کے
ممتاز مشاہیر اہل قلم کی نظر میں موجب تحسین و ستائش قرار پایا۔
اس میں تین باتیں قابل ذکر ہیں:

(ا) یہ تمام موجودہ نسخوں سے صحیح تر ہے کیونکہ مومن کی زندگی
اور عہد قریب کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے اس کا مقابلہ
کیا گیا ہے۔

(ب) شروع میں مومن کی زندگی اور خصوصیات کلام پر
مفصل اور مدلل تبصرہ ہے جو کہیں اور نہیں ملتا۔

(ج) چونکہ مومن کے اشعار کافی پیچیدہ ہیں اور فلسفہ و تصوف
اور فارسی تراکیب کی کثرت نہ ہونے پر بھی مشکل ہیں لہذا اکثر
ذی علم پروفیسر تک الجھ جاتے ہیں۔ اس لیے فٹ نوٹ
میں ہر غزل کے مشکل اشعار کی نکتہ سنجانہ شرح کر دی گئی ہے
اور محاسن شعری بھی ظاہر کر دیے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ مولانا
نیاز فتح پوری مرحوم نے کسی کو جواب دیتے ہوئے نگار میں
لکھا تھا:

"لوگ غالب و ذوق کی شرح کر لیں لیکن مومن کی شرح
آسان نہیں ہے کبھی میں ہی قلم اٹھاؤں گا۔" جب انھوں
نے یہ شرح دیکھی تو تعجب اور خوشی کا اظہار کیا۔

(۲) شرح قصائد مومن۔ مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ، اب
دستیاب نہیں ہے۔ اس میں صحت اشعار، مکمل تبصرہ اور شرح
اشعار کی پابندی کی گئی ہے۔ یہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ قصائد
میں اکثر حکیمانہ اشکال اور علمی اصطلاحات کا استعمال ہے۔ شرح
کرتے وقت ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ عام نسخوں میں جو
اغلاط و اختلافات ہیں ان کو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے۔

(۳) یادگار عالی۔ مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں ۱۹۳۷ء۔ یہ
حضرت مولوی رفیع احمد صاحب عالی وکیل بدایونی کے دو دیوانوں کا
انتخاب ہے جن کے شروع میں مرحوم کے سوانح حیات خصائل و
اخلاق، شاعری اور تصانیف پر ایک مبسوط اور عالمانہ مقدمہ
مولانا یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی کے قلم سے ہے۔ جناب
عالی ایک کہنہ مشق استاد، ایک ذی علم محقق ایک بلند پایہ
شاعر گذرے ہیں۔ یادگار عالی کے مرتب مولانا ضیاء احمد
بدایونی مرحوم ہی تھے۔

(۴) لمعات۔ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۴۷ء
حضرت رضی بدایونی کی غزلیات کا انتخاب ہے اس کے مرتب مولانا
ضیاء احمد مرحوم تھے جس میں حسب ذیل تحقیقی اور ادبی شہ پارے
بھی شامل ہیں۔ تعارف از حضرت جگر مرادآبادی مرحوم، تقریب از
پروفیسر آل احمد سرور، تذکرہ از مولوی ظفر حسن جام بدایونی،
تذکرہ از پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔

حضرت رضی ملک کے نہایت ممتاز شاعر اور استاد فن تھے
اور اپنے معاصرین میں ذہانت و فراست میں بے مثل مانے جاتے
تھے۔ لمعات انھیں کی غزلیات، خصوصیات کلام اور سوانح حیات

پر مشتمل ہے ۔ اس ضمن میں بہت سے مفید اور دلچسپ ادبی نکات و اشارات بھی آ گئے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔

(۵) تجلیات ۔ مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی ۔

(۶) تذکار دسلف ۔ مطبوعہ علی گڑھ پرنٹنگ ورکس، شائع کردہ انٹر کالج لٹریری سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔

یہ دونوں کتابیں ضیاء احمد صاحب کے متعدد قطعات پر مشتمل ہیں جو تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات سے متعلق ہیں اور جو علامہ شبلی کی پیروی میں حضرت اکبر الہ آبادی کے اشارے سے لکھے گئے اور وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز جرائد میں شائع ہو چکے تھے ۔

(۷) کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے ۔ یہ ایک علمی مقالہ ہے جس میں تصوف کی اصل و ماخذ پر بحث کی گئی ہے اور اس کے عقائد و افکار کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ بیت المصنفین علی گڑھ نے اس کو شائع کیا تھا ۔

(۸) مکتوبات ۔ اس کتاب میں معاصرین کے خطوط مولانا ضیاء احمد کے نام ہیں اور اس کا پیش لفظ بھی اُن کے قلم سے ہے جو پڑھنے کے قابل ہے ۔ یہ مکتوبات کا مجموعہ ۱۹۶۷ء میں خواجہ پریس دہلی سے طبع ہوا تھا ۔

(۹) مسائل و مباحث ۔ یہ مولانا کے مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے جس پر اردو اکیڈمی یو ۔ پی نے ۱۹۷۳ء میں انعام دیا تھا ۔ اس مجموعے میں ادبی موضوعات کے علاوہ مذہبی مضامین بھی شامل ہیں ۔

اس کے علاوہ آپ کے بکثرت ادبی و علمی مقالات ہند و پاک کے ممتاز رسائل میں شائع ہوئے ہیں ۔

جناب ضیاء احمد مرحوم کا شمار ہمارے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے شعر و سخن کا ذوق بچپن سے ہی تھا چنانچہ کبھی کبھی غزل یا نظم کہنے کا اتفاق بھی ہوتا تھا ۔ اپنا کلام ہمیشہ آپ نے حضرت رضی بدایونی مرحوم کو دکھایا اور تاریخ اسلام سے متعلق قطعات کا سلسلہ حضرت اکبر الہ آبادی کے ایماء پر شروع کیا ۔ ۲۲ جولائی ۱۹۷۳ء کے ہماری زبان میں پروفیسر آل احمد سرور رقمطراز ہیں:

"مولانا ضیاء احمد بھی شعر کہتے تھے اور ان کی بعض غزلوں اور نظموں میں پختگی اور رچاؤ ہے مگر در اصل وہ عربی فارسی اور اردو ادب کے بڑے بلند پایہ عالم تھے اور اس دور میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جن کی نظر ہمارے کلاسیکل سرمایہ پر اتنی گہری ہو ۔"

تغزل کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے :

حیرت جلوہ کا تو کیا ذکر — حیرت جلوہ گاہ نے مارا
ہو ہی جاتے ستم کے خوگر ہم — کرم گاہ گاہ نے مارا

اللہ اللہ ترے جلوے کی حیرت اثری — نہ تماشے کا پتہ ہے نہ تماشائی کا

کس روز آئینے کو لگایا انھوں نے منھ
یہ سادہ لوح، کاہے یہ مغرور ہو گیا

ناز والے ہیں آج وقف نیاز — دیکھنا عشق کے نشیب و فراز
تم نے چھیڑا تو گونج اٹھی محفل — میری ہستی تھی ساز بے آواز

کہاں تھی دلکشی یہ جلوۂ حسن خود آرا میں
مری رنگینیٔ ذوق نظر معلوم ہوتی ہے
دوائے درد دل نے زہر کی تاثیر پیدا کی
غرض مشکور سعیٔ چارہ گر معلوم ہوتی ہے

یہ مانا کہ ہے مختصر سعیٔ ہستی — میں اس سے بھی کچھ مختصر چاہتا ہوں

ضیاء احمد صاحب محض نقاد ہی نہیں بلکہ بڑے اچھے ادیب بھی تھے ۔ عربی فارسی و اردو کے عالم ہونے کے علاوہ انگریزی ادب پر بھی آپ کی گہری نظر تھی ۔ زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے آپ کے مضامین بڑے دلکش ہوتے تھے ۔ آپ مغربی اور مشرقی فن تنقید پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ آپ نے شرح دیوان مومن کو دور حاضر کے فن تدوین و ترتیب کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے ۔ آپ کی یہ شرح اردو ادب میں ایک مستند حیثیت رکھتی ہے ۔ پروفیسر

آل احمد سرور نے ہماری زبان علی گڑھ کے ۲۲ جولائی ۱۹۷۳ء
کے شمارہ میں مولانا پر اپنا مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا ہے:
"موتمن سے اس قدر شغف کے باوجود انھوں نے موتمن
کے تجزیے میں نیاز فتح پوری کی طرح طرفداری سے کام
نہیں لیا بلکہ سخن فہمی کا خاصا ثبوت دیا۔ ان کے خیالات
میں الجھن نہ ملے گی۔ اُن کی تحریر میں لفاظی یا خطابت
نہیں ہے یہ سیدھی سادی علمی نثر ہے اور اپنے مقصد
میں کامیاب۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی علم وادب
کی خدمت میں گزار دی۔ اس دور میں جب علم وادب
کی ہی نہیں زندگی کی ساری قدریں اتھل پتھل ہو رہی
ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم مولانا ضیاء احمد جیسے اہل نظر
عالم، ادیب اور نیک نفس انسانوں کے کارناموں کو یاد
رکھیں کیونکہ ان لوگوں نے جس طرح علم کے چراغ روشن
رکھے ہیں اور جس طرح ادب اور اس کے آداب سکھائے
اور بتائے ہیں وہ ان کا ایسا احسان ہے جس سے ہم
سبکدوش نہیں ہو سکتے۔"

مجتہد الدین احمد عیش بدایونی

مجتہد الدین احمد عیش ۸ رشعبان ۱۲۸۷ھ کو بدایوں کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے
تھے۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور ان زبانوں
میں وہ ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ تحصیل دھام پور ضلع بجنور
سے قبل از وقت رجسٹرار قانون گو کے عہدے سے پنشن لے لی
تھی۔ پنشن کے بعد اپنی ساری زندگی اپنے وطن بدایوں میں علم و
ادب کی خدمت میں گزار دی۔ آپ کی شاعری کی ابتدا ۱۳۰۲ھ
سے ہوتی ہے۔ حضرت امیر مینائی مرحوم کے شاگرد تھے اور شاعری
میں شعرائے متقدمین لکھنؤ کے پیرو رہے۔ ۱۹۵۴ء میں بدایوں میں
انتقال فرمایا۔ چھ دیوان، پانچ مثنویاں، پانچ مسدس اور بکثرت
رباعیات آپ کی یادگار ہیں۔ عیش صاحب کا ایک قصیدہ بہت
مشہور رہا ہے جو یکم اگست ۱۹۳۰ء کو موجِ تضمین کے نام سے شائع
ہوا ہے۔ شہنشاہ نامۂ اسلام کو دو حصوں میں منظوم کیا تھا
جس کا پہلا حصہ ۱۳۵۴ھ میں ہاشمی پریس بدایوں سے طبع ہوا تھا۔
اس کے بارے میں جناب مشیر علی صدیقی اپنی کتاب صحیفۂ نشاط
میں بدایوں کے تین شاعر مقالہ میں رقمطراز ہیں:
"عیش کی تمام نظموں میں سب سے اہم ان کی مثنوی شہنشاہ نامہ
ہے۔ یہ مثنوی حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کی تقلید
میں لکھی گئی ہے۔ ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے لیکن اس کا اور
شاہنامہ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ شاہنامہ کی روانی، صفائی،
اور برجستگی اور قادرالکلامی شہنشاہ نامہ میں مفقود ہے
لیکن پھر بھی اردو مثنویات میں یہ ایک اضافہ ہے۔"
پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم موجِ تضمین پر اپنے پیش لفظ
میں ایک جگہ عیش مرحوم کے بارے میں فرماتے ہیں:
"یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ طرز قدیم کے ایک کامیاب استاد
اور امیر مینائی کے ممتاز شاگرد ہیں۔ اُن کا عشقیہ و نعتیہ
کلام بار بار ارباب ذوق سے خراج تحسین وصول کر چکا
ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں شہرت و اشاعت
پا چکا ہے۔"
ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

سمجھنا چاہیے عشاق کی طرز بیاں پہلے
مناسب ہو تو سن لیں آپ میری داستاں پہلے

جمع احباب کہے ہیں کہ ذرا دل ٹھہرے
آپ بھی آئیں تو محفل مری محفل ٹھہرے
دل کے آئینے میں ہو اتنی صفائی اے عیش
وہ بھی مونہہ دیکھ لیں جب ان کے مقابل ٹھہرے

پانی لیتا ہوں وضو کے لیے پیمانے میں
میں ہوں مسجد میں، ہے نیت مری میخانے میں
شیخ یہ کالی گھٹا اور فضا بھی دیکھی
آپ آئے تو برستے ہوئے میخانے میں

اب ہمیں پینے پلانے سے تو کچھ کام نہیں
جھومتے رہتے ہیں بیٹھے ہوئے میخانے میں

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی ۱۸۱۵ء

کو اپنے آبائی وطن سہسوان ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ مثنویات کے مصنف امیر احمد علوی نے آپ کا نام دھوکے سے اس کتاب میں انوار احمد لکھا ہے لیکن دراصل آپ کا نام انوار حسین ہی تھا۔ آپ کے والد منشی احتشام الدین مراد آباد میں وکالت کرتے تھے اور وہاں کے ممتاز وکلاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت تسلیم کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہوئی اور اُس کے بعد فارسی و اردو و ادب کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی۔ مراد آباد میں عدالت دیوانی کے امین رہے لیکن اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۵۸ء میں ملازمت کی طرف سے آپ کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور پھر اپنے وطن سہسوان چلے آئے۔ ۱۸۶۳ء میں لکھنؤ چلے گئے اور اودھ اخبار کے اسٹاف میں شامل ہو گئے اور یہ سلسلہ ۱۸۷۷ء تک قائم رہا۔ ۹ مئی ۱۸۹۲ء کو ان کی شمع حیات گل ہو گئی۔ آپ اردو میں مصحفی کے شاگرد، علی بخش بیمار کے شاگرد تھے۔ فارسی میں آپ کی مثنوی تاج الکلام بہت مشہور ہے جو آپ نے نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال کی مدح میں لکھی تھی۔ آپ کے شاگردوں میں راجا کشن کمار وقار زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔

منشی انوار حسین تسلیم فارسی و اردو نظم و نثر میں یکساں قدرت رکھتے تھے اور اردو کے اساتذۂ سخن میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ اردو فن تاریخ گوئی میں آپ کے مقابلے میں کوئی اردو شاعر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ آپ کے اردو کلام میں مرزا غالب کے کلام کی جھلک نظر آتی ہے۔ تسلیم کے متعلق لالہ سری رام داس نے خمخانۂ جاوید جلد دوم میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

"آپ فن سخن میں مشاہیر میں سے تھے۔ تاریخ گوئی میں ایسا ملکہ رکھتے تھے کہ ان کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی صنائع و بدائع سے آپ کی تاریخیں مملو ہوتی تھیں ...... شعر اچھا کہتے تھے۔ عاشقانہ اور تشبیہ دونوں طرزیں ملی جلی ہیں، سادگی اور صفائی بھی موجود ہے۔ اُن کے پختہ مشق اور مشّاق سخنور ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے!"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ہجرِ آتش سوز سے سینے میں دل بے تاب ہے
اشک کا ہر ایک قطرہ پارۂ سیماب ہے

دیر و حرم میں بیٹھنے دیتا نہیں کوئی
اُٹھ کر تمھارے در سے کہیں کا نہیں رہا

اوراق گلوں کے ہیں پریشان چمن میں
غنچوں سے چھپایا نہ گیا رازِ تبسم

کہنے کو یوں تو رات کہیں دن کہیں رہا
جز آستانِ یار کہیں دل نہیں رہا

یہ تری راہ میں آزار سے راحت پائی
خار ہم نے نہ کفِ پا سے نکالا کوئی

درد فراق نے یہ کیا ناتواں مجھے
پھرتا ہے ڈھونڈتا مرا وہم و گمان مجھے

مانندِ ابر اشک سے دامن بھگوئیں کیوں
اک بوند آبرو ہے اسے ہم ڈبوئیں کیوں

نازک مزاج مجھ سا ہوا ہے نہ ہوئے گا
روحِ سبک بھی اپنی ہے بارِ گراں مجھے

ماسٹر سبطین احمد بدایونی

ماسٹر سبطین احمد بدایونی بدایوں کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں علم و ادب کا چرچا چلا آتا تھا۔ آپ نے بی۔ اے تک تعلیم پائی تھی اور حافظ اسلامیہ انٹر کالج

بدایوں میں ۲۵ سال تک استاد کی حیثیت سے نیک نامی کے ساتھ درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ آپ نام و نمود اور شہرت سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے۔ آپ نے ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ آپ کی چار کتابیں ہندستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، انگلستان کی کہانی معاصرین کی زبانی، اردو قواعد اور خس و خاشاک شائع ہو چکی ہیں۔ خس و خاشاک آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ایک مترجم کی حیثیت سے بھی سبطین صاحب کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ علامہ شبلی کی کتاب سیرۃ النبی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کو بدایوں کے بندگانِ دین سے بڑی عقیدت تھی اس لیے حضرت شہاب الدین مہرہ اور ضیاء الدین تحبتی کے مزار جو شکستہ حالت میں تھے ان کی مرمت کروائی۔ اور اُن پر کتبے لگوائے۔ ۲۵ اگست ۱۹۷۱ء کو کراچی میں انتقال فرمایا۔ ہندستان اور پاکستان میں ہزاروں آپ کے شاگرد ہیں۔ حضرت روش صدیقی مرحوم نے شعر و شاعری میں آپ سے استفادہ کیا تھا، سبطین مرحوم کی ایک نظم ملاحظہ فرمایئے:

دکھیاری کی چکی

میں ان سے کیا بچھڑ گئی ‏ ‏ بنی ہوئی بگڑ گئی
عزیز بے وفا ہوئے ‏ ‏ قریب سب جُدا ہوئے
میں نامراد رہ گئی ‏ ‏ کہانی یاد رہ گئی
اُجڑ چکا ہے راج سب ‏ ‏ ہے تیرے ہاتھ لاج اب
مری رفیق بےکسی ‏ ‏ تجھے نہ بھولوں گی کبھی
میں تجھ سے شرمسار ہوں ‏ ‏ تری وظیفہ خوار ہوں
سکھی ری تیز چل ذرا ‏ ‏ سحر بہت قریب ہے

مرے چمن کی یادگار ‏ ‏ وہ میرا مژدۂ بہار
فنا ہوں جس کی چاہ میں ‏ ‏ بھٹک گیا تھا راہ میں
میں خاک چھانتی پھری ‏ ‏ کمائی ہے یہی مری
سہارا یوگی کا ہے ‏ ‏ بہانہ زندگی کا ہے
کچہری تھی کہ دور دور ‏ ‏ بدن تھا سارا چور چور
کچھ ایسی پڑ کے سو گئی ‏ ‏ کہ آج دیر ہو گئی
سکھی ری تیز چل ذرا ‏ ‏ سحر بہت قریب ہے

وہ زندگی کا مشغلہ ‏ ‏ وہ مجھ دکھی کا آسرا
نڈھال تھا کچھ اس قدر ‏ ‏ کہ سو گیا ہے بےخبر
اُٹھا تو جان کھوئے گا ‏ ‏ بلک بلک کے روئے گا
اسے میں کیا کھلاؤں گی ‏ ‏ کہاں سے پیٹ بھر لاؤں گی
غریب کو نہ دیں اُدھار ‏ ‏ غریب کا نہ اعتبار
پسیری[1] میری پیس دے ‏ ‏ تو مل رہیں گے کچھ ٹکے
سکھی ری تیز چل ذرا ‏ ‏ سحر بہت قریب ہے

مولانا نظام الدین حسین نظامی بدایونی[2]

حسین نظامی ۱۸۷۲ء میں بدایوں کے اُس معزز و مشہور خاندان میں پیدا ہوئے جو سلاطین مغلیہ کے زمانہ سے متولی خاندان کہلاتا ہے۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم آپ کے والد مرحوم مولانا فخر الدین بدایونی کی نگرانی میں ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ تلاش معاش نے سرکاری ملازمت پر مجبور کیا مگر آزاد طبیعتیں بندگی و بے چارگی کی دشواریاں نہیں برداشت کر سکتیں۔ سات آٹھ سال بعد مستعفی ہو گئے۔ بدایوں میں نظامی پریس کھولا اور ۱۹۰۳ء میں اپنا اخبار ذوالقرنین نکالا۔ اس وقت یہ پریس اور اخبار دونوں مرحوم کے فرزند رشید مولوی احمد الدین نظامی کے زیر نگرانی خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں۔ ۸ رجون ۱۹۴۷ء کو مولانا نے ۷۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

مولانا نظامی بدایونی کے کلام کے دو مجموعے تجلیات سخن اور لمعات نظامی شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ آپ نے ایک کتاب

---

[1] پسیری یا پسیر مقامی لفظ پان سیر یا پانچ سیر۔
[2] منقول از تعارف۔ مندرجہ لمعات نظامی۔

قاموس المشاہیر خود تالیف کرکے شائع کی تھی اس میں تمام مشاہیر کے حالات دو جلدوں میں درج ہیں۔ متعدد کتابیں بچوں کے لیے خود تصنیف کرکے شائع کیں اور ملک نے ان کتابوں کو بڑی قدر سے دیکھا۔

آپ کے مجموعۂ کلام لمعات نظامی پر حضرت جگر بریلوی نے آپ کے کلام کے سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

"اس مجموعہ میں غزل سے لے کر نعتیہ، قومی، سیاسی، اخلاقی، اصلاحی، سہرے، نوحے، وغیرہ وغیرہ ہر رنگ کی نظمیں ہیں اور ہر صنف سخن میں ہیں۔ غزل میں محض قافیہ پیمائی نہیں، اخلاقی نکات ہیں، تغزل بھی ہے لیکن اعتدال لیے ہوئے۔ نظموں میں بیشتر حالی کا سا مصلحانہ رنگ ہے۔ میں نے جستہ جستہ اس مجموعے کو دیکھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی خلوص ہے یعنی شاعر نے وہی کہا ہے جو اُس نے محسوس کیا ہے جس پر اُس کا ایمان ہے جس پر اُس کا عمل ہے۔ کلام میں استادانہ پختگی، صفائی اور روانی ہے۔"

نمونۂ کلام

بنی ہے جان پر کیا چارہ گر کبھی دیکھتے جاتے
وہ تاثیر علاج بے اثر بھی دیکھتے جاتے
جو پیچھے رہ گئے تھے تھک کے اُن پر کیا گزرتی ہے
ذرا اے قافلے والو ادھر بھی دیکھتے جاتے

یار کے گھر بلائے جاتے ہیں آج روٹھے منائے جاتے ہیں
پوچھتے کیا ہو ان کے ناز و نیاز سارے جھگڑے چکائے جاتے ہیں

جی بھر کے خوب ظلم و ستم مجھ پہ ڈھائیے
چھریوں کو تیز کیجیے خنجر منگائیے
نکلے زباں سے اف تو زباں کاٹ لیجیے
سرتابی گر کروں تو مرا سر اڑائیے
میں جان سے گیا یہی مرضی خدا کی تھی
کہتا ہے کون آپ سے آنسو بہائیے

بھولیں کبھی نہ آپ نظامی کے قول کو
دشمن کے سبز باغ سے دھوکا نہ کھائیے

"بدایوں سے خطاب" ایک نظم میں نظامی صاحب فرماتے ہیں:

اے بدایوں ہو نہ کیونکر تو زیارت گاہ عام
معرفت کا ہند میں روشن ہوا ہے تجھ سے نام
تجھ میں اہل اللہ گزرے ہیں بہت عالی مقام
فیض ہے ان سب کا جاری ہند سے تا روم و شام
شہر پیراں نام تیرا ہند میں مشہور ہے
اولیاء اللہ کے تو نور سے معمور ہے

اے بدایوں کیا ہوئیں تیری مقدس ہستیاں
جسم ہے موجود لیکن روح تجھ میں اب کہاں
آج کل غافل نظر آتے ہیں تیرے نوجوان
ڈر ہے اک دن مٹ نہ جائیں تیرے دھندلے سے نشاں
جان و دل اپنا فدا سب تجھ پہ ہے حق کی قسم
فخر ہے ہم کو بھی کہلاتے بدایونی ہیں ہم

مولانا علی احمد خاں اسیر بدایونی

مولانا علی احمد خاں اسیر کے آبا و اجداد بریلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد جنگ باز خاں بڑے بہادر انسان تھے۔ علی احمد خاں اسیر ۱۸۵۲ء میں بریلی ہی میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۴ء میں آپ کے والد نے بدایوں میں سکونت اختیار کر لی اس لیے مولانا اسیر کی ابتدائی زندگی بدایوں ہی میں گزری اور یہی اُن کا وطن مالوف قرار پایا۔ مولانا اسیر کی ابتدائی تعلیم فارسی میں ہوئی۔ اس کے بعد مولانا اسیر مدرسہ عالیہ رام پور پہنچے اور مولانا عبدالحق خیرآبادی سے منطق اور فلسفہ کی تعلیم کی تکمیل کی۔ مولانا اسیر نے ۱۸۸۷ء میں مطبع نسیم سحر مولوی امتیاز احمد تاثر کی شرکت میں بدایوں میں قائم کیا لیکن چند ہی سال کے بعد یہ مطبع بند ہو گیا۔ ۱۸۸۱ء میں مولانا اسیر محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور بدایوں کے تحصیلی اسکول میں مدرسی سے ۱۹۱۳ء میں پنشن پائی۔ اس کے بعد سینٹ جانس کالج میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا۔ ۲۰ر جولائی ۱۹۲۷ء

کو مدینہ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تصنیفات میں آئینۂ حدود اقلیدس، قواعد اردو، شجرۂ خاندان نقشبندیہ، نظم جہاں افروز، نظم المعراج، مثنوی شیریں خسرو، حیات شیخ اور حیات ملا عبد القادر بدایونی شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا اسیر بدایونی مولوی علی امجد حسین امجد بدایونی کے شاگرد تھے لیکن مولانا ضیاء القادری مرحوم نے مقدمہ منقبت خواجہ ولی ھند مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں جون ۱۹۲۸ء میں آپ کو دھوکے سے غالب کے شاگردوں میں لکھ دیا ہے جو غلط ہے۔ مولانا اسیر نے کبھی غالب سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ مولانا اسیر تمام زندگی مداح رسولؐ رہے اور ان کی شاعری نعوت و منقبت میں ایک مرتبہ رکھتی ہے۔ مثنوی نظم المعراج میں سے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اِدھر شوق لقا میں کوئی بے تاب اُدھر کوئی ہے نقش بستر خواب
اِدھر ملنے کا کوئی آرزومند اُدھر تھیں آنکھیں خواب ناز سے بند
یکایک حضرت جبریل آئے پیام دلربائے وصل لائے
مودب دست بستہ سر جھکا کر جبیں کو پائے انور سے لگا کر
شب اسریٰ کے دولہ کو جگایا زباں بن کر کسی کو یہ سنایا
براق برق دم مرغ سبک بال ہراک بڑھتی ہوئی دولت کا اقبال
سواری کے لیے حاضر ہے در پر کہ پر اُس کے ہیں گویا نور کے پر
چلا جب لے کے اُس جان جہاں کو بنایا لامکاں دم میں جہاں کو
نہ شعلہ تھا نہ وہ برق و شرارہ کسی کی آنکھ کا تھا اک اشارہ
براق برق وش کی سیر کا طور صدائے گنبد گردوں کا تھا دور
خرام ناز نے جوہر دکھایا نگہ کی مثل جا کر لوٹ آیا
عجب جانا تھا اُس کا طرفہ آنا کہ آنا اور جانا کچھ نہ جانا

مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری

مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری ۳ جون ۱۸۸۳ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد شیخ یاد حسین بدایوں کے ملا خاندان کے ایک فرد تھے۔ مولانا ضیاء القادری چار سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے اس لیے آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت آپ کے خالو مولوی علی احمد خاں اسیر کے زیر سایہ ہوئی اور مثل فرزند کے اسیر صاحب نے آپ کو پالا۔ ۱۸۹۷ء میں اردو مڈل کا امتحان بدایوں کے تحصیلی اسکول سے پاس کیا اور ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک محکمۂ سروے میں برما میں ملازم رہے۔ واپسی پر ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۶ء تک پرائمری اسکول (میونسپل بورڈ بدایوں) میں ٹیچر رہے پھر ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک ڈسٹرکٹ بورڈ کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ بعد ازاں ۱۹۱۳ء کے آخر میں کلکٹری بدایوں میں ملازم ہو گئے اور ضلع بدایوں کی چار تحصیلات گنور، بسولی، سہسوان اور داتا گنج میں ملازمت کا زیادہ حصہ گذرا۔ ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو رجسٹرار قانون گو کے عہدہ سے پنشن پائی۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے اور کراچی میں زندگی کا زیادہ حصہ شعر و ادب کی خدمت میں گزارا۔ وہیں ۱۵ اگست سنہ ۱۹۷۰ء کو انتقال ہو گیا۔

مولانا ضیاء القادری علی احمد خاں اسیر کے شاگرد رشید تھے اور انھوں نے اپنے استاد کی طرح ساری زندگی نعت و منقبت میں لگا دی۔ مالک رام صاحب رسالہ تحریر، دلی جلد ۴ شمارہ ۴، ۱۹۷۰ء میں آپ کی وفات پر مضمون لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کہ بہ لحاظ کمیت ان سے بڑا نعت گو اردو تو در کنار کسی اور زبان میں بھی مشکل ہی سے ہوا ہوگا۔"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

سر میزاں مرے پلّہ پہ جو آ جائیں حضور
کوہ عصیاں ہو تو پاسنگ ترازو ہو جائے

دل میں وہ صاحب قرآں آیا آج کعبہ میں شبینہ ہوگا

اے ہادی کل اے ختم رسل ہے نام خدا کا نام ترا
قائم رہے رہتی دنیا تک اللہ کرے اسلام ترا

جب آپ نے انا بشر متکلم کہا انساں کو احترام کے قابل بنا دیا

ہے نزد قوسین جلوہ آرا وہ بدر کا چاند ماہ پارا
ہلال اب دائرہ کی صورت چمک کے ماہ تمام ہوگا

شب اسرا ہوئے مائل بہ وضو حبیب سرکار
آب تسنیم سے جبریل نے دھارے عارض

کھلا یہ رازِ فراز و نشیب کون و مکاں
ہے عرش گنبد خضرا، بہشت کوئے رسولؐ

رخ غوث پاک کا آئینہ ہے جمال قادر و مقتدر
وہی اک حقیقت خود نما ہے ہر ایک شکل مجازی میں

ملے وہ اپنے خدا سے اس امتیاز کے ساتھ
کہ جان نذر میں دی سجدۂ نیاز کے ساتھ

مولوی رضی احمد متخلص بہ رضیؔ وشترؔ

وشترؔ بدایوں کے ایک علمی خاندان کے فرد تھے۔ آپ کی ولادت ۱۶رستمبر ۱۸۷۰ء کو بدایوں ہی میں ہوئی۔ آپ کے والد مولوی رفیع احمد عالیؔ وکیل اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر ہوئے ہیں۔ رضیؔ صاحب نے قرآن مجید اور ابتدائی کتابیں ملا الٰہی بخش صاحب سے پڑھیں اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخل ہوگئے اور ۱۸۹۸ء میں انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد الہ آباد ٹریننگ کالج میں داخل ہوگئے اور پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر آپ کا تقرر ہو گیا اور ۲۸ سال بعد اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۷رجون ۱۹۳۹ء کو ۶۱ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ کی غزلیات کا ایک انتخاب لمعات ۱۹۴۷ء میں پروفیسر ضیاء احمد مرحوم نے مرتب کرکے مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے طبع کرادیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک داسوخت جذبات رضیؔ ضیاء احمد صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے مرتب کرکے ستمبر ۱۹۶۳ء میں یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے شائع کرادی ہے۔ لمعات پر پیش لفظ لکھتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور رضیؔ مرحوم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"رضیؔ کی شاعری مشاعروں کے لیے نہیں تھی اس کا لطف ایک مدھم خوشگوار اور شیریں لَے کا لطف ہے۔ یہاں شعریت جوش کے سے شوخ رنگوں میں بہائی جانے والی طوفانی ہواؤں اور تیز و تند موجوں کی یاد نہیں دلاتی۔ نہ یہ اس پگھلانے والی آنچ کی یاد دلاتی ہے جو میرؔ کے یہاں ہے۔ اس کلام میں داغؔ کی سی بھرپور کا فرادا، قاتل جوانی کا ذکر بھی نہیں ہے۔ یہاں وہ شعریت ہے جو پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ اسالیب سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنی شعریت سے پورا پورا لطف حاصل کرنے کے لیے اپنے قدیم سرمایے سے واقفیت اور ادبی اسالیب سے آگاہی درکار ہے۔ یہ ادبیت رضیؔ کے کلام کو خواص میں ہمیشہ مقبول رکھے گی اور اس ادبیت کی وجہ سے ان کا کلام ہمیشہ لطف و انبساط کا باعث ہوگا۔"

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

تیری نظر بدلتے ہی دنیا بدل گئی
گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں

وہی نصیب کی گردش تھی ہم جہاں پہنچے
کہیں زمیں نہ ملی دور آسماں سے الگ

فضائے دہر ہے محدود میرے نالوں کو
بلند اور ذرا بام آسماں ہوتا

تنکے ابھی دو چار نشیمن میں ہیں باقی
اے برق بلا تھوڑی سی تکلیف کرم اور

پاس وحشت میں بھی ہے حسن کی رسوائی کا
ہاتھ رک جاتا ہے آ آ کے گریباں کے قریب

صدہا مذاقِ حسن سے بیگانہ رہ گئے
یہ امتیاز معنی و صورت لیے ہوئے
رسوا مذاقِ عام پسندی سے ہو گئی
اک شانِ امتیاز جو دار و رسن میں تھی
رعنائیاں ہیں سب مرے حسنِ خیال کی
اپنے کو دیکھتا ہوں رخِ یار دیکھ کر
کوئی چھپ کر کبھی نمایاں نظر آتا ہے مجھے
ہر گل اک شعلۂ عریاں نظر آتا ہے مجھے
اک مرا عشق کہ پنہاں ہے مگر رسوا ہے
اک ترا حسن کہ عریاں ہے مگر راز میں ہے
زبانِ حال نے شرحِ حدیثِ آرزو کر دی
اسے کہتے ہیں خاموشی کا معنی آفریں ہونا
ہر جنبشِ نظر میں تھی اک داستانِ شوق
دل آپ ترجمانِ زبانِ خموش تھا

مولوی رفیع احمد عالی بدایونی

مولوی رفیع احمد عالی جون ۱۸۵۷ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام مولوی کمال احمد تھا۔ بچپن میں قرآن مجید کی تعلیم پانے کے بعد مشن اسکول بدایوں میں داخل ہو گئے اور یہاں سے چہارم درجہ کا امتحان پاس کیا جو آج کل کے ساتویں کلاس کے برابر تھا اس کے بعد بدایوں کے ممتاز اساتذہ سے فارسی اور عربی دینیات کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ وکالت کی سند ۱۸۹۵ء میں حاصل کی۔ چند ماہ بسولی میں وکالت کا کام شروع کیا۔ بعد میں بدایوں میں پریکٹس کی۔ فتح گڑھ، شاہجہاں پور، قنوج اور قائم گنج میں بھی پریکٹس کرنے کے سلسلے میں قیام پذیر رہے۔ بعد ازاں گنّور ضلع بدایوں چلے آئے اور ۴۰ سال تک وکالت کرتے رہے۔ آپ کا شمار یہاں کے بااثر اور نامور وکلاء میں ہوتا تھا۔ ۸ر فروری ۱۹۳۴ء کو ۷۹ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کا ایک دیوان آپ کی حیات میں عروس نظم ۱۳۲۶ھ میں آگرہ سے طبع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تصحیح اللغات کے نام سے ۱۳۴۶ھ میں ایک کتاب نظامی پریس بدایوں سے طبع ہوئی۔ اس میں عالی صاحب نے صحت تلفظ کے بارے میں چند مختصر اور اہم نکات بیان کیے ہیں۔ اس کتاب پر مولانا احسن مارہروی کے قلم سے تعارف ہے۔ پروفیسر ضیاء احمد مرحوم نے آپ کے دو دیوان کا انتخاب یادگارِ عالی کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۳۷ء میں عثمانی پریس بدایوں سے شائع کیا تھا۔

عالی مرحوم منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔ آپ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن آپ حقیقی معنوں میں غزل کے شاعر ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

داغِ دل مٹ گیا دیکھا جو ترے گیسو کو
سامنے کالے کے جلتا نہیں لے جو چراغ
سچ ہے مثلِ حباب ہے دنیا — دیکھ لو نقشِ آب ہے دنیا
دن کاٹتا ہوں ابروے قاتل کی یاد میں
کشتیِ عمر چلتی ہے خنجر کی دھار پر
پروانے جب گئے تو ہوئیں جمع بلبلیں
گل ہو کے بن گیا ہے چراغِ مزار پھول
ہجر کے دن تو گزر جائیں گے ذکرِ عالی
یہ تو بتلاؤ سحر ہوں گی یہ شامیں کیونکر
دشمن ہوا جس سے کی محبت — اب نام نہ لوں گا دوستی کا
دیر و کعبہ دونوں میں ملتے نہیں — کیا کوئی اب اور گھر پیدا کیا
بے تابی میں دشمن ہے دوا پوچھ رہا ہوں
اللہ کرے دردِ محبت کا بُرا ہو

خواب میں شکل بھی نہ دکھنے دی — بختِ خفتہ جگا دیا تو نے

کچھ نہ خوفِ خدا کیا اے بت — کعبۂ دل کو ڈھا دیا تو نے

رازِ الفت سب پہ افشا ہو چکا — سامنے اب آؤ پردا ہو چکا

غزلیں

شارب لکھنوی

منزل بھی راستہ بھی یہیں نقشِ پا بھی ہے
لیکن خلوصِ دل سے کوئی ڈھونڈتا بھی ہے

تنہا قدم اٹھائے تو محسوس یہ ہوا
جیسے ہمارے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے

دنیا کا تو جنوں میں بھی احساں نہیں لیا
پھاڑا بھی ہے ہمیں نے گریباں سیا بھی ہے

آئے بہار پھول کھلیں سب کے واسطے
کہنے کی بات ہے کبھی ایسا ہوا بھی ہے

محفل میں دوستوں کی گدا بن کے آئے ہیں
دیکھیں کہ اب ہمیں کوئی پہچانتا بھی ہے

واعظ پتے کی بات بتاتے تو ہیں، مگر
ان سے یہ پوچھئے کہ خود اپنا پتا بھی ہے

انساں کے واسطے کوئی منزل نہیں ہے دُور
ہمراہ آرزو کے اگر حوصلہ بھی ہے

دیکھا انھیں ضرور مگر خود نظر اٹھی
مجرم بھی ہم نہیں ہیں ہماری خطا بھی ہے

شارب یہ دوستوں کے عمل نے بتا دیا
اس وقت ایک نام وفا کا جفا بھی ہے

نظیر صفی پوری

دل میں ترا خیال نہ ہو اور تو نہ ہو
ممکن نہیں ہے پھول تو ہو رنگ و بو نہ ہو

کیوں دل کا نام دیں اسے پتھر نہ کیوں کہیں
جس دل میں تیرا درد تری جستجو نہ ہو

دل پر نقوش چھوڑے گا کیسے کوئی کلام
جذبات کی زباں میں اگر گفتگو نہ ہو

اے شیخ منع کیجیے ہم کو شراب سے
لیکن کچھ اس طرح سے کہ اس میں غلو نہ ہو

رنگِ قلم سے ہم نے مہذب کیا اسے
گر ہم نہ ہوں تو تذکرۂ لکھنؤ نہ ہو

کیوں اپنے عکس سے ہی بہلنے لگا ہوں میں
اس آئینے میں سوچ رہا ہوں کہ تو نہ ہو

چاہوں تو میں انھیں کو میں چاہا کروں نظیر
اس آرزو کے بعد کوئی آرزو نہ ہو

غزلیں

کیلاش بہاری موج (علیگ)

درد میں ڈوبے ہوئے ارض و سما مانگے ہے
دل فقط چند ہی لمحوں کی بقا مانگے ہے

طنز و تنقید کا شیدا ہے زمانہ لیکن
وقت اک جذبۂ تسلیم و رضا مانگے ہے

جو مری ذات سے وابستہ رہا ہے ہر دم
اب وہ سایہ تری زلفوں کی فضا مانگے ہے

ایک ناداریِ اخلاص کے عالم میں کوئی
مجھ سے سرمایۂ احساسِ وفا مانگے ہے

پھول بھیگے ہیں پسینے میں کہ دم گھٹنے لگا
موسمِ گل ترے آنچل کی ہوا مانگے ہے

دور تک جس نے مرا ساتھ دیا غربت میں
پھر مرا ذوقِ سماعت وہ صدا مانگے ہے

شیشۂ دل کی نزاکت پہ بھروسا تھا جسے
آج پتھر سے وہی حرفِ دعا مانگے ہے

موج اس دور میں بیچارگیِ انساں کا
جسم عریاں ہے جو پھولوں کی قبا مانگے ہے

تکمیل رضوی

رنگ و بو سے کاوشِ افکار تک جانا پڑا
پھول کی سیجوں سے اٹھ کر دار تک جانا پڑا

کیا ضروری ہے کہ منزل تک پہنچ جائیں وہ لوگ
تھک کے جن کو سایۂ دیوار تک جانا پڑا

جب نگاہوں کو خلوصِ دل کی طاقت مل گئی
حُسن کو خود طالبِ دیدار تک جانا پڑا

میں وہ گلچیں ہوں بتاؤں کیا تجھے اے باغباں
جستجوئے گل میں نوکِ خار تک جانا پڑا

وقت کچھ ایسے بھی آئے زندگی کی راہ میں
بڑھ کے جب خود جادۂ دشوار تک جانا پڑا

اوّل اوّل ذہن میں کچھ حُسن کے خاکے بنے
آخر آخر گیسو و رخسار تک جانا پڑا

گنگناتے ہیں غزل میری یہ زمانے کے بعد
مجھ کو بھی تکمیل کے افکار تک جانا پڑا

ہمسر قادری

جب غمِ غمگسار ہوتا ہے
دل بہت بیقرار ہوتا ہے

ان کا جب انتظار ہوتا ہے
ہر نفس دل پہ بار ہوتا ہے

میری قربت پہ برہمی کیسی
گل کے پہلو میں خار ہوتا ہے

جو زمانے کی زد سے دور رہے
وہ بڑا ہوشیار ہوتا ہے

ظرف میں ہوتی ہے کمی جن کے
غم انھیں ناگوار ہوتا ہے

آنکھوں آنکھوں میں ہوتی ہیں باتیں
دل کو جب دل سے پیار ہوتا ہے

آئینے کا لحاظ رکھیے گا
آئینہ راز دار ہوتا ہے

کاش وہ ایسے مہرباں ہوتے
جیسے پروردگار ہوتا ہے

حاصلِ فصلِ گل ہے یہ ہمسر
پیرہن تار تار ہوتا ہے

قلک راج گوسوامی

بیگم حضرت محل

ہندستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں اودھ کی بیگم حضرت محل کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ ان کی ہمت بہادری اور قوت تنظیم کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا مقابلہ مہارانی الہیہ بائی، چاند بی بی اور جھانسی کی مہارانی لکشمی بائی سے کیا جا سکتا ہے۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ نے انھیں افتخار النسا

واجد علی شاہ

کے لقب سے سرفراز کیا تھا۔ انگریز مورخ رسل نے بیگم حضرت محل کے شاندار کردار کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ یوں رقم طراز ہے۔

"بیگم شجاعت اور قابلیت کا مجسمہ نظر آتی ہے، اس نے ہمارے خلاف زبردست جنگ کا اعلان کر دیا ہے اس کی قابل رشک ہمت کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محل سرا کے اندر رہ کر بھی اس نے اپنے اندر زبردست قوت ارادی اور ناقابل تسخیر ہمت پیدا کر لی ہے۔"

بیگم حضرت محل کے والدین اور ان کے ایام طفولیت کے متعلق کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش فیض آباد کے ایک غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔

(ریذیڈنسی)

جوان ہونے پر وہ بطور رقاصہ نواب واجد علی شاہ کے محل میں شامل کی گئیں۔ نواب نے اپنی ڈائری "محل خانہ شاہی" میں لکھا ہے کہ ایک دوشیزہ بطور رقاصہ رکھی گئی، بعد میں ان کی دلکش شخصیت اور رقص و موسیقی میں خاص دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں "مہک پری" کا خطاب دیا گیا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ نواب کی بیگم بن گئیں اور جب ان کے بطن سے شہزادہ مرزا برجیس قدر

تولد ہوئے تو انھیں "حضرت محل" کے خطاب سے نوازا گیا۔

گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے اپنی شاطرانہ پالیسی کے تحت فروری ۱۸۵۶ء میں نواب واجد علی شاہ پر نا اہلیت کا الزام عائد کرکے انھیں اودھ کے تخت سے محروم کرکے اودھ کو انگریزی عملداری میں شامل کرلیا اور بدنصیب نواب کو کلکتہ کے فورٹ ولیم میں نظر بند کرلیا۔ حضرت محل کے دل میں اپنے شوہر کے ساتھ کیے گئے اس ناروا سلوک سے انگریزی حکومت کے خلاف زبردست غم و غصہ پیدا ہوا۔ اور انھوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اس بے عزتی کا انتقام لے کر رہیں گی چنانچہ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا اور اودھ کے متعدد محب وطن اور جانباز راجاؤں اور زمینداروں اور عوام کو قومی بغاوت کے لیے تیار کرنا شروع کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیگم کی آواز اور ان کے وزیر علی نقی خاں کی پکار پر ہزاروں ہندو نے گنگا جل لے کر اور مسلمانوں نے قرآن پاک لے کر قومی جنگ میں شرکت کرنے اور انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لیے قسم کھائی۔ اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے دھن دولت کی کمی نہ تھی۔ ہزاروں رئیسوں اور تعلقداروں نے اس کام کو سرانجام دینے کے لیے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیے۔ بیرک پور سے پشاور تک اور لکھنؤ سے تارا تک ہزاروں فقیر اور سنیاسی گھوم گھوم کر جنگ آزادی کا پرچار کرنے لگے۔ بقول رسل پورے اودھ میں عوامی انقلاب کا بگل بج اٹھا اور مولوی احمد شاہ، راجہ رام بخت سنگھ رانا، بینی مادھو، موہانہ کے راجہ درگیہ وجے سنگھ، شاہجہانپور کے خان علی خاں اور نرپت سنگھ جیسے بہادر اور باہمت لوگ بیگم کی قیادت میں نکل کھڑے ہوئے۔

میرٹھ اور دہلی پر انقلاب پرستوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ ان کی اس کامیابی کی خبر مورخہ ۱۴ر مئی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ پہنچی۔ اور کچھ ہی دنوں بعد اودھ کی فوج نے انگریز حکمرانوں پر حملہ کردیا۔ بڑی تیزی سے پورا شہر بغاوت کی لپیٹ میں آگیا "فرنگیوں ہندوستان چھوڑو" کے فلک شگاف نعرے گونجنے لگے اور عمارتوں پر یونین جیک کی جگہ آزادی کے سبز پرچم لہرانے لگے۔ شہزادے برجیس قدر کو تخت پر بٹھایا گیا۔ چونکہ شہزادہ ابھی نابالغ تھا۔ اس لیے حکومت کی دیکھ بھال کا کام بیگم حضرت محل خود کرنے لگیں۔ اس کے علاوہ جنگ آزادی کی تنظیم بھی انھیں کے ذمہ تھی

اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر ہنری لارنس اپنے سپاہیوں کے ہمراہ باغیوں کو دبانے کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن باغیوں کے سامنے اس کے پاؤں جم نہ پائے۔ سینکڑوں سپاہی اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ۲۹ر جون کو آزادی کے متوالوں نے لکھنؤ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر چنہٹ کے مقام پر انگریزی چھاؤنی پر حملہ کردیا۔ ایک زبردست گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر میں ہار کر ہنری لارنس کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز اپنی کئی توپیں میدان میں چھوڑ کر لکھنؤ کی ریذیڈنسی کی عمارت میں جا چھپے اور اس طرح تقریباً [illegible] انگریز از خود محصور ہوگئے۔

۲۰ر جولائی کو آزادی کے پرستاروں نے ریزیڈنسی کی عمارت پر زبردست حملہ کردیا۔ کئی دنوں تک دونوں طرف سے خوب گولہ باری ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک حریت پسند کی گولی سے ہنری لارنس مارا گیا اور اب میجر بینڈکس نے اس کی جگہ لے لی لیکن کچھ ہی گھنٹوں بعد وہ بھی گولی کا شکار ہوگیا۔ اس اثنا میں بریگیڈیر انگلس کو اطلاع ملی کہ جنرل ہیولاک اپنی فوج کے ہمراہ کانپور سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہوچکا ہے۔ لیکن ہیولاک کے پہنچنے کے قبل ہی انقلابیوں نے ایک مرتبہ پھر ریذیڈنسی پر حملہ کردیا۔ یہاں تک کہ ریذیڈنسی کی عمارت کا ایک بہت بڑا حصہ توپ کے گولوں سے مسمار ہوگیا۔ ہیولاک دریائے گنگا کو عبور کرکے جوں ہی اودھ کے علاقے میں داخل ہوا اسے معلوم ہوگیا کہ لکھنؤ تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اودھ کی چپہ چپہ زمین کے لیے سخت معرکے سے گزرنا ہوگا۔

اسی اثنا میں بٹھور میں نانا صاحب پیشوا کو اطلاع مل چکی تھی کہ ہیولاک لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا ہے چنانچہ انھوں نے فوراً اپنا ایک ایلچی حضرت محل کے پاس روانہ کیا اور جنگ آزادی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ حضرت محل کو جوں ہی نانا صاحب کا

پیغام ملا انھوں نے اپنے ایک معتمد راجہ جے لال سنگھ کو ان کے خیر مقدم کے لیے بھیجا۔ لکھنؤ پہنچنے پر نانا صاحب کا شاندار استقبال ہوا۔ ان کے اعزاز میں گیارہ توپیں داغی گئیں۔ نواب واجد علی شاہ کے شیش محل میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ اب ہیولاک کو ایک طرف اودھ اور دوسری طرف نانا صاحب کی افواج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی درمیان جنرل اوٹرم اور انگریزوں کے سپہ سالار اعظم کالن کیمپ بل بھی لکھنؤ پہنچ گئے اور ایک بار پھر ریزیڈنسی میں لڑائی شروع ہو گئی۔ جنرل نیل اور جنرل کوپر کے بعد کیمپ بل ریزیڈنسی کی حفاظت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن زبردست گولہ باری کی تاب نہ لاکر اسے عالم باغ میں پناہ لینی پڑی۔ شہر سے باہر عالم باغ میں انگریزی فوج تھی اور شہر کے اندر حریت پسندوں کے تیس ہزار سپاہی اور تقریباً پچاس ہزار رضاکار جمع تھے۔ کیمپ بل کی زیر نگرانی چالیس ہزار سپاہی تھے۔ ہر گلی کوچہ اور بازار مورچہ بن گیا تھا۔ لکھنؤ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ بقول سر ہوپ گرانٹ خود بیگم حضرت محل زرہ بکتر پہن کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں اتر آئی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے حریت پسندوں میں بدنظمی کے آثار رونما ہونے لگے جس کو دیکھ کر انگریز سپاہیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ پورے جوش کے ساتھ دلکشا، قدم رسول، شاہ نجف اور بیگم کوٹھی پر حملے کرنے لگے۔ اور کافی کشت و خون کے بعد انگریزوں کا ان جگہوں پر قبضہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ کا پورا علاقہ ان کے قبضے میں آ گیا۔ آخر انگریزی فوج شاہی محل میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ یہاں تک کہ بیگم حضرت محل، نانا صاحب، شہزادہ برجیس قدر اور مولوی احمد شاہ کو شہر چھوڑنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

لکھنؤ میں قتل عام اور عبرت ناک مظالم

لکھنؤ کے زوال کے بعد انگریزوں نے شہر میں لوٹ مار اور قتل عام کا بازار گرم کر دیا۔ انگریزوں کے انسانیت سوز مظالم کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ لکھتا ہے "کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور انھیں بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ ایک باغی کو مکان سے گھسیٹ کر باہر ریتیلے میدان میں لایا گیا۔ کچھ انگریز سپاہیوں نے اس کے منھ اور جسم میں سنگینیں بھونک دیں اور کچھ سپاہیوں نے ایک چھوٹی سی چتا تیار کرنے کے لیے ایندھن جمع کیا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تب اس بدنصیب کو زندہ ہی اس میں پھونک دیا گیا۔ یہ ظلم اس وقت انتہا پر پہنچ گیا جب اس بدبخت نے نیم مردہ حالت میں بھاگنے کی کوشش کی! اچانک ہمت کر کے وہ چتا سے نکل کر کود پڑا۔ اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ چند ہی قدم دوڑا تھا کہ پکڑ لیا گیا۔ اسے واپس لایا گیا۔ ایک بار پھر آگ میں جھونکا گیا اور جب تک وہ

(شہید اسمارک)

پوری طرح بھسم نہ ہو گیا اسے سنگینوں سے دبائے رکھا گیا۔"

انگریز قیدیوں کے ساتھ بیگم حضرت محل کا سلوک بالکل اس کے برعکس تھا۔ انقلاب کے شروع کے دنوں میں کئی انگریز قیدی بنا لیے گئے تھے۔ مرد قیدیوں کو تو حریت پسندوں نے مار دیا تھا لیکن انگریز عورتوں کو بیگم نے اپنے محل میں پناہ دی تھی۔ ان کی انھوں نے پوری حفاظت کی۔ چارلس بال لکھتا ہے کہ انگریز عورتوں کے تئیں بیگم کا سلوک قابل تعریف تھا۔ زنانخانے

میں جس طرح بیگم نے ان عورتوں کی حفاظت کی اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کا یہ کام خواتین کے وقار کو چار چاند لگانے والا تھا۔

انقلاب کے دیوانے نیپال میں

لکھنؤ چھوڑنے کے بعد بیگم حضرت محل، نانا صاحب، برجیس قدر مولوی احمد شاہ اور کچھ دیگر لوگ شاہجہانپور آ گئے۔ کالن کیمبل کافی کوشش کے باوجود مولوی احمد شاہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ مولوی صاحب جانتے تھے کہ کیمبل کسی بھی وقت شاہجہانپور پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ لہذا آنے والے خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے مولوی احمد شاہ نے بیگم حضرت محل کی مہر لگا کر ایک پیغام ایک قریبی ریاست پون کے راجہ جگن ناتھ سنگھ کو بھیجا۔ راجہ نے فوراً مولوی صاحب کو اپنے یہاں بلا لیا۔ احمد شاہ اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر پون پہنچے۔ دونوں کی آپس میں بات چیت ہو رہی تھی کہ راجہ کے چھوٹے بھائی نے دھوکے سے مولوی صاحب پر گولی چلا دی زخم کافی گہرا تھا۔ اس لیے کچھ ہی لمحات کے بعد مولوی صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ راجہ جگن ناتھ سنگھ نے مرحوم مولوی صاحب کا سر کاٹ کر نزدیک کے انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔ انگریزوں نے کٹا ہوا سر شاہجہانپور کی کوتوالی کے سامنے لٹکا دیا۔ راجہ کو اس کے صلہ میں ایک جاگیر مل گئی۔ یہ کٹا ہوا سر اس عظیم حریت پسند کا تھا جس کے متعلق ایک انگریز یوں رقم طراز ہے:-

"مولوی صاحب ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ان کی صلاحیت کے متعدد ثبوت موجود ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مولوی صاحب ایک سچے اور مادر وطن کے مایہ ناز سپوت تھے۔ انھوں نے کبھی کسی شخص کا چھپ کر قتل کر کے اپنی تلوار کو داغ نہیں لگایا۔ انھوں نے بہادر کی طرح کھلے میدان میں ڈٹ کر ان بدیشیوں سے مقابلہ کیا جنھوں نے ان کا ملک ہڑپ کر لیا تھا۔ ہر محب وطن کو اس مرد مجاہد کو عزت سے یاد کرنا چاہیے۔"

شاہجہانپور پر انگریزوں کا قبضہ ہونے سے بیشتر ہی نانا صاحب بیگم حضرت محل، شہزادہ برجیس قدر اور کچھ دوسرے لوگ نیپال پہنچ گئے۔ انگریزوں نے نیپال کے مہاراجہ جنگ بہادر پر سخت دباؤ ڈالا کہ وہ ان لوگوں کو انگریزی سرکار کے حوالے کر دیں۔ لیکن بیگم کی حفاظت کرنا مہاراجہ نے اپنا فرض اولین سمجھا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے بیگم حضرت محل کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ انگریزی حکومت کی اطاعت قبول کر لے تو اسے معاف کر دیا جائے گا اور ساتھ ہی پنشن اور جاگیر بھی ان کو دی جائے گی لیکن بیگم کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا جب ملکہ وکٹوریہ نے بغاوت میں حصہ لینے والے باغیوں کو معاف کرنے کا اعلان کیا تو بیگم حضرت محل نے بڑی شان کے ساتھ اس اعلان کا جواب دیا۔ بیگم نے اپنے اعلان میں کہا تھا۔"

"ہم اپنے عوام سے کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان پر یقین نہ کریں عوام کو چاہیے کہ وہ انگریزوں کی چال کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان چال باز انگریزوں نے پہلے بھرت پور کے راجہ کو اپنا بیٹا بنایا اور پھر اس کا راج چھین لیا لاہور کے راجہ (شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا دلیپ سنگھ) کو لندن لے گئے اور پھر کبھی اسے ہندوستان واپس ہونے نہیں دیا۔ نواب شمس الدین کو انھوں نے پھانسی پر لٹکا دیا اور بعد میں اسے اپنا نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا۔ پیشوا کو انھوں نے پونا سے نکال دیا اور بیٹھور میں رہنے پر مجبور کیا۔ بنارس کے راجہ کو انھوں نے آگرے میں قید کر دیا، ہمارے ساتھ کیے گئے سمجھوتے کو بھی انھوں نے بالائے طاق رکھ دیا۔"

بیگم حضرت محل نے اپنی زندگی کے آخری ایام نیپال میں ہی گزارے۔ ۱۸۷۹ء میں کھٹمنڈو میں ہماری پہلی جنگ آزادی کی اس عظیم شخصیت نے رحلت فرمائی۔ بیگم حضرت محل ہمارے ملک کی وہ عظیم ہستی تھی جس نے زندگی بھر کبھی بھی ہمت اور غیرت کا دامن نہیں چھوڑا اور جس نے اپنے شاندار کارناموں سے بنت حوا کو ایک نیا وقار بخشا۔

★

فرحت قادری

انسانیت کا ترانہ

تمھیں ہے زمانے کو اپنا بنانا — ہر انسان کو ایک مرکز پہ لانا
پیامِ محبت جہاں کو سُنانا — زمانے پہ ہے تم کو اک روز چھانا
سُناؤ تم انسانیت کا ترانہ

دلوں سے یہ بغض و عداوت نکالو — یہ چھوٹی بڑائی، یہ نفرت نکالو
یہ ظلم و تعصب کی عادت نکالو — اٹھو اور راہِ محبت نکالو
اب آیا ہے انسانیت کا زمانہ

کہاں سے کہاں تک ہے پروازِ انساں — ستاروں میں گونجی ہے آوازِ انساں
زمیں سے فلک تک ہے اعجازِ انساں — ابھی تو ہوا ہے یہ آغازِ انساں
ابھی اور انساں کو ہے دور جانا

حقیقت کا ہر راز کہنا پڑے گا — ہر انساں کا دکھ درد سہنا پڑے گا
تمھیں سب سے مل جل کے رہنا پڑے گا — محبت کے دھارے میں بہنا پڑے گا
تمھیں ہے دلوں کو دلوں سے ملانا

یہاں کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا ہے — ہر انساں کا انسانیت مرتبہ ہے
کسی کو بھی کم تر سمجھنا بُرا ہے — فقط رنگ یا روپ سب کا جدا ہے
مگر ابنِ آدم کا ہے اک گھرانہ

اٹھو اور نفرت کی دیوار ڈھاؤ — مٹاؤ یہ آپس کے جھگڑے مٹاؤ
شرافت کے رستے پہ انساں کو لاؤ — جلاؤ چراغِ محبت جلاؤ
اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے زمانہ

اکڑنے کا اب یہ زمانہ نہیں ہے — کسی کو دبانا تماشہ نہیں ہے
نہیں ہے یہ نفرت کی دنیا نہیں ہے — یہاں کوئی انساں پرایا نہیں ہے
یہاں سب کو فرحت گلے سے لگانا

ہماری جمہوریت

نصیر ناطقی

کیوں نہ ہوتی کامراں جمہوریت
دے چکی ہر امتحاں جمہوریت
بخشش کے امن و اماں جمہور کو
بن گئی آرامِ جاں جمہوریت
ذرہ ذرہ مہر تاباں ہو گیا
کس قدر ہے ضو فشاں جمہوریت
سرزمینِ ہند ہے ایسا چمن
ہے حقیقت میں جہاں جمہوریت
رہبروں کی نیک طینت کے طفیل
بن گئی جنت نشاں جمہوریت
ہم نے پائی ہے یہاں یکسانیت
ہم نے دیکھی ہے یہاں جمہوریت
اپنی نظروں پر یقیں آتا نہیں
ہو گئی کتنی جواں جمہوریت
ٹیوب ویل اور اس کی نہریں ہیں گواہ
چومتی ہے آسماں جمہوریت
اب ہمیں خوف و خطر کوئی نہیں
ہے ہماری پاسباں جمہوریت
کارگر ہو کس طرح سازش کوئی
ہے حجاب درمیاں جمہوریت
اتحادِ باہمی کے فیض سے
آج ہے رطب اللساں جمہوریت
راز افشا ہو نہیں سکتا کبھی
قوم کی ہے رازداں جمہوریت
اس میں شامل شوق سے ہو جائیے
ہے عوامی کارواں جمہوریت
گیت اس دن گائیں گے ہم بھی نصیرؔ
ہو گا جب سارا جہاں جمہوریت

سالِ نو مبارک

نثار چنگیزی

نیا سال اہلِ وطن ہو مبارک
ترقی کا عزمِ حسن ہو مبارک
بہارِ گلِ یاسمن ہو مبارک
نگارِ چمن در چمن ہو مبارک
تجلّیِ گل پیرہن ہو مبارک
درخشاں یہ صبحِ وطن ہو مبارک
نئی صبحِ خاور مگن ہو مبارک
نئی روشنی کی کرن ہو مبارک

نئے سال کا خیر ہو، خیر مقدم
نئی زندگی کی پھبن ہو مبارک
نیا سال لایا پیام محبت
محبت کی سچی لگن ہو مبارک

مسرت بداماں نیا سال آیا
نئے سال کا بانکپن ہو مبارک
مناؤ نئے سال کا جشنِ ارماں
تمھیں رسم و راہِ کہن ہو مبارک

نیا سال دیتا ہے درسِ مشقت
مشقت کا یہ تم کو دھن ہو مبارک
امیری غریبی گلے مل رہی ہے
نئے سال کا یہ ملن ہو مبارک

نئے سال کو دو اخوت کا ساماں
اہنسا کا تم کو چلن ہو مبارک
نیا ساز لے کر نیا سال آیا
مسرت کا دیوانہ پن ہو مبارک

نیا سال ہر دکھ کا درماں بنے گا
تمھیں یہ مرا حسنِ ظن ہو مبارک
نثارؔ آج اس سالِ نو کی خوشی میں
تمھیں یہ پیامِ سخن ہو مبارک

سید علی زیدی

ساقیا جام اُٹھا ساقیا مے پلا رات ڈھلتی رہے دور چلتا رہے
رند مدہوش ہو ہو کے گرتے رہیں پینے والوں کا ارماں نکلتا رہے

تلخیِ زیست کچھ اس قدر بڑھ گئی تلخیِ مئے کا میں نے سہارا لیا
ورنہ تھی اتنی فرصت کسے دہر میں یوں بہکتا رہے اور سنبھلتا رہے

اے نظامِ تمدن ذرا تو بتا تیرے انصاف کو آج کیا ہو گیا
سیج پر کوئی پھولوں کی سوتا ہے کوئی کانٹوں پہ کروٹ بدلتا رہے

میرے نالے غمِ آشیاں میں نہیں باخبر اہلِ گلشن کو کرتا ہوں میں
دامنِ گلستاں تک نہ آنچ آسکے جل رہا ہے نشیمن تو جلتا رہے

آج دنیا مخالف اگر ہے تو ہو سوئے منزل بڑھو لے کے اک عزمِ نو
راہزن راستہ روکتے ہی رہیں کارواں عزمِ محکم کا چلتا رہے

دیکھ کر زیدیؔ زلفوں کو رخسار پر ہو گئی یہ تمنائے قلب و جگر
یوں ہی عارض پہ زلفیں مچلتی رہیں چاند چھپ چھپ کے یونہیں نکلتا رہے

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔
پبلشر: مصنف صفحات: ۱۰۴
قیمت: چار روپے

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ اردو کے منجھے ہوئے ادیبوں میں گنے جاتے ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور مقالے بھی، لیکن خاص طور پر بنگلہ ادب کو اردو حلقوں سے متعارف کرانے میں انھوں نے جو رول ادا کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں بھٹاچاریہ صاحب نے گزشتہ پچیس تیس سال کے دوران مغربی بنگال میں شائع ہونے والی اردو تصانیف اور جرائد کا مختصر تعارف کرایا ہے۔

"آزادی کے بعد مغربی بنگال سے شائع شدہ اردو تصانیف" کے تحت مصنّف نے بنگال میں اردو ادب کے عصری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے تنقیدی اور تحقیقی ادب، افسانے اور ناول، شعری کاوشوں اور دیگر اصنافِ سخن کی ادبی تخلیقات پر روشنی ڈالی ہے۔ وحشت کلکتوی کے مکاتیب، سید لطیف الرحمٰن کی "ناسخ سے وحشت تک"، عبدالرزاق ملیح آبادی کی "ذکرِ آزاد" اور جاوید نہال کی "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی جانبداری اور تعصب نہیں برتا گیا۔ ل احمد اکبر آبادی کے افسانوں کو مجموعی طور پر مصنّف نے سراہنے کی کوشش کی ہے۔ شعرا کے ہجوم میں پرویز شاہدی، جمیل مظہری، حرمت الاکرام، محمود سکندرپوری، جرم محمد آبادی، مضطر حیدری، رابعہ سلطانہ، سید ناظر الحسینی، قیصر شمیم اور رونق نعیم کے مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو صحافت": اردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا اور یہیں سے اردو کا پہلا ماہنامہ "نورِ بصیرت" عبدالغفور شہباز کی زیر ادارت ۱۸۸۴ء میں نکلا۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد کا "الہلال" اور رزاق ملیح آبادی کا ہفت روزہ "ہند" بھی اسی سرزمین سے شائع ہوتا تھا۔ اردو صحافت کی دیرینہ خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنّف نے فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی بنگال سے شائع ہونے والے موجودہ اخبارات و رسائل کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے آخر میں "بنگلہ زبان میں اردو ادب کا تذکرہ" کرتے ہوئے بھٹاچاریہ صاحب نے لکھا ہے کہ عام طور پر ایک زبان سے دیگر زبان والوں میں اسی وقت نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جب زبان میں سیاست شامل ہو جائے اور زبان ایک "سیاسی مسئلہ" بن جائے۔ جب کسی ایک زبان کی ترقی یا نشو و نما سے دیگر زبانوں کو کوئی خطرہ لاحق ہو، مثلاً بنگلہ دیش میں اردو سے نفرت کا جذبہ ——— مغربی بنگال کے عوام میں اردو سے نفرت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ بنگال میں "لسانی فراخدلی" کے لیے اتنا ثبوت کافی ہے کہ مرزا غالبؔ، الطاف حسین حالیؔ، سر سید احمد خاں اور اقبال کے متعلق کئی تصانیف بنگلہ زبان میں موجود ہیں اور بنگلہ کے کئی اخبارات و رسائل میں عصرِ جدید کے اردو ادیبوں اور شعرا کی تخلیقات آج بھی وقتاً فوقتاً بنگلہ کے قالب میں ڈھل کر سامنے آتی رہتی ہیں۔

مجموعی طور پر بھٹاچاریہ صاحب کی یہ تصنیف معلوماتی اور صحافتی درجے کی ہے۔ کتابت اور طباعت اوسط سطح کی ہونے کے باوجود کتاب بہرحال قابلِ مطالعہ ہے کیونکہ اس کا موضوع نیا اور توجہ کا طالب ہے۔

——— سید نظر برنی

کینسر وارڈ

مصنف۔ الیگزنڈر سولنیٹسن۔ مترجمین۔ گوپال متل، جلیس عابدی۔ صفحات ۶۶۸۔ سائز $\frac{22 \times 18}{}$
قیمت: اٹھارہ روپے۔ پتہ: نیشنل اکاڈمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ دہلی

کینسر وارڈ نوبل انعام یافتہ ادیب الیگزنڈر سولنسٹین کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ ہے۔

کینسر وارڈ ۱۹۶۸ء میں پہلی بار روس کے باہر لندن میں شائع ہوا۔ یہ ناول روس کے ایک کینسر کے اسپتال کی اصل کیفیت اور حالت کے متعلق ہے جس میں اسپتال کے مریضوں، ڈاکٹروں، عملے نیز دوسرے متعلقین اور آنے جانے والوں لوگوں کی بڑی کامیاب کردار نگاری اور تصویر کشی کی گئی ہے، جس سے وہاں کی زندگی، قول و فعل کے تضاد، ذہنی کشمکش اور ماحول کی گھٹن کا بڑی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیز فرد، سماج اور حکومت کی کیفیتوں میں یہ بات اس کتاب سے

کافی حد تک معلوم ہوسکتی ہے۔

اردو میں چھپنے والی بیشتر غیر معیاری، سطحی اور انتہائی معمولی ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے بدرجہا بہتر ہے کہ اسی طرح کی دوسری زبانوں کے اچھے معیاری ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ تاکہ ہمارے عام پڑھنے والے لوگ اچھی کتابوں کی خوبیوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کتاب کے مترجمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب کی کتابت، طباعت اور کاغذ سب اچھے ہیں۔ ذکی کاکوروی

ادبی اقدار

مصنف :۔ دوّر آفریدی۔
ناشر :۔ اردو ریسرچ اکاڈمی، گھیر عثمان خاں، رام پور (یو۔ پی)

ضخامت :۔ ۹۶ صفحات

قیمت :۔ تین روپے

ادبی اقدار :۔ دوّر آفریدی کے دس مضامین کا مجموعہ ہے جسے موصوف نے "لسانیات"، "تحقیق، ثقافت اور تنقید" کے زیر عنوان تقسیم کیا ہے۔ لسانیت کے تحت اردو املا کے متعلق چند تجاویز اور اردو "تلفظ" کے سلسلے میں کچھ نئی رائیں دی ہیں۔ اردو رسم الخط کی برتری پر ایک پُرمغز اجمالی بحث کی ہے۔

باب تحقیق میں دوّر آفریدی نے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں ــــ دیوان غالب بخط غالب ــــ گو کہ اس سلسلے میں کافی بحث ومباحثے ہوچکے ہیں مگر ابھی تک کسی کی نگاہ اس گوشے تک نہیں پہنچی تھی۔ دیوان کے نقلی اور جعلی ہونے کے ثبوت میں دوّر آفریدی نے اس مخطوطے کی ایک یادداشت کی طرف ذہنوں کو منتقل کرلیا ہے جس کی بنیاد پر اس نسخے کو بخط غالب تسلیم کیا گیا ہے۔ فاضل نامہ نگار نے اس بنیادی یادداشت کو ہی سرے سے جعلی اور غلط قرار دیا ہے۔ موصوف نے کافی عرق ریزی سے کام لیا ہے امید ہے کہ ان کی یہ کاوش اہل علم کی توجہ کامرکز بنے گی۔ باب ثقافت اور تنقید کے تحت بھی اچھے معلوماتی مضامین [illegible] ہیں انھیں اور تفصیل سے لکھنا

کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ (ڈاکٹر فضل امام)

قند شیراز

نام کتاب :۔ قند شیراز۔
مصنف :۔ احسن مفتاحی

ضخامت :۔ ۱۲۸ صفحات

قیمت :۔ آٹھ روپے

تقسیم کار :۔ عثمانیہ بکڈپو۔ ۴۲/۱۰ اپر چیت پور روڈ۔ کلکتہ ۔ ۳،

قند شیراز :۔ حافظ شیرازی کے ۳۳۴ منتخب اشعار کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ، بادی النظر میں کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شعر کا ترجمہ شعر ہی میں کرنا، اور وہ بھی اس طرح کہ اصل شعر کی لطافت وکیفیت پوری طرح قائم رہے۔ بہت ہی عرق ریزی اور محنت کا کام ہے۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ فارسی زبان اور رسم الخط ہی ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے اردو زبان وادب کے سوتے پھوٹے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام تر ارتقائی منازل کو طے کرنے کے باوجود اردو کے الفاظ میں وہ ہمہ گیری پیدا نہیں ہوسکی ہے جو فارسی کے لفظوں میں پائی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں حافظ کے شعروں کا ترجمہ اور وہ بھی اس کوشش کے ساتھ نہ صرف شعروں کی تمام تر داخلی اور خارجی کیفیات برقرار رہیں بلکہ طنز کی لطافت، استعاروں کی نزاکت، تشبیہات کی دلکشی اور اور انداز بیان کو شگفتگی بھی پوری طرح باقی رہے، احسن مفتاحی کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

آج کے دور میں جبکہ فارسی دانی کا تو ذکر ہی کیا، اردو داں حضرات کی تعداد بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ جناب احسن مفتاحی کی یہ سعی جمیل، اس قابل ہے کہ ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرے۔

دورنگے خوبصورت سرورق، عمدہ کاغذ اور خوبصورت کتابت و طباعت سے "قند شیراز" کا ظاہری حسن بھی کافی نکھرا ہوا ہے۔

ساحر لکھنوی

★

جلد ۳۳ | نمبر ۱۱

۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: بال کرشن چترویدی

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرائس پبلک افادیشن و پبلک لیٹیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

چندہ بھیجنے کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے متفق ہو۔

نوٹ: اس شمارے کو فروری کا شمارہ تصور کیا جائے اسکے بعد ہمارا مارچ کا شمارہ شائع ہوگا۔

اپنی بات

ہمارے ملک کی تاریخ میں ۲۶ جنوری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۲۰ سال قبل اسی مبارک دن ہم نے ہندستان کو ایک عوامی جمہوریہ بنانے کا اعلان کیا تھا۔ اس جمہوریت کو مزید مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے اس سال دستور میں اہم ترمیمات کی گئیں۔ پہلی بار عوام کے حقوق کے ساتھ ان کے فرائض کا بھی تعین کیا گیا۔ مزید برآں سیکولرزم اور سوشلزم کے قیام کو بھی ملک کے آئین کا ایک اہم جز قرار دیا گیا۔ ان ترمیمات سے ہندستان کی جمہوریت کے مزید استحکام میں یقیناً مدد ملے گی۔ ہماری ریاست اترپردیش میں جمہوریت کا ۲۷واں سال بڑی مستعدی، لگن اور ہمہ گیر ترقیاتی سرگرمیوں کا سال تھا جس میں ایمرجنسی اور ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کے فوائد کو مربوط اور مستقل بناکر دستور ہند کے بنیادی اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ عوام بالخصوص غریب اور کمزور طبقے کے لوگوں کو سماجی اور اقتصادی انصاف دلانے کے لیے دوررس اقدامات کیے گئے۔ حکومت اور عوام کے درمیان قریبی رابطہ پیدا کرنے کے لیے کابینہ کی منطقائی ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ عوام کی شکایتوں کو دور کرنے پر خصوصی زور دیا گیا۔ زرعی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہوا اور گیہوں نیز دھان کی ریکارڈ وصولی ہوئی۔ آبپاشی کی صلاحیت میں بھی خاصا اضافہ ہوا اور دستیاب سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے انتظامات عمل میں لائے گئے۔ ہریجنوں، بے زمینوں اور کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے۔ جہیز مخالف قانون کو زیادہ سے زیادہ سخت بنانے کے لیے اقدام کیا گیا۔ تیز رفتار شجرکاری مہم کے تحت سال رواں میں دو کروڑ درخت لگانے کا نشانہ بھی پورا کر لیا گیا۔ بجلی کی پیداوار کا بھی ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ زراعت اور صنعت دونوں کے لیے بجلی کی فراہمی کی گئی۔ صنعتی ترقی کی رفتار میں مزید اضافہ ہوا۔ نوجوان صنعت کاروں کو مزید مراعات دی گئیں۔ صنعتی ترقیاتی مرکزوں کو فروغ دینے کے لیے کمپلیکسوں کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ ہینڈلوموں کی جدید کاری اور ہینڈلوم صنعت کی بھرپور ترقی کے لیے اسکیمیں شروع کی گئیں۔ کارخانوں کی انتظامیہ میں مزدوروں کی شرکت کی اسکیم مزید صنعتی کارخانوں اور اداروں میں شروع کی گئی۔ اس کے علاوہ پردیش کے لیے اس سال کے مقررہ چار لاکھ نس بندی کے نشانے کے مقابلے میں اب تک آٹھ لاکھ سے زیادہ نس بندی آپریشن ہو چکے ہیں اور توقع ہے کہ اس سال ۱۵ لاکھ نس بندیاں ہو جائیں گی۔ مختصر یہ کہ ہمارا پردیش ترقی کے ہر میدان میں تیزی کے ساتھ گامزن ہے۔ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام میں ۵ نکات کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ آئیے ۲۶ جنوری کے اس مبارک موقع پر ۲۵ نکاتی معاشی پروگرام کو کامیاب اور ایمرجنسی اور ۲۵ نکاتی پروگرام کی کامیابیوں کو مستحکم اور مستقل بنانے کے لیے انتھک کوشش کرنے کا عہد کریں۔

وفیات

مولانا عبدالماجد دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار ان چند بلند پایہ ادیبوں اور عظیم دانشوروں میں کیا جائے گا جنھوں نے اپنے بیش بہا علمی اور ادبی کارناموں سے علم و ادب کے خزانے کو مالا مال کر دیا ہے۔ وہ بیک وقت ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ ادیب، ایک نقاد اور ایک صاحب طرز انشاپرداز ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہت بڑے مفسر قرآن اور ممتاز صحافی بھی تھے۔ ان کی جیسی جامع صفات اور پہلودار شخصیت ہمیں مولانا حالی، علامہ شبلی، اور مولانا ابوالکلام کی یاد دلاتی ہے۔ خدائے سخن میر تقی میر کا یہ شعر مولانا کی ہستی پر پوری طرح صادق آتا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ادبی حیثیت سے وہ ایک بہت بڑے نثر نگار اور صاحب طرز انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے طنز نگار بھی تھے۔ ان کا ادبی اور شعری ذوق نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہ اکثر ایک جملے یا ایک شعر اور بعض اوقات ایک ہی لفظ سے ایسا تاثر پیدا کر دیتے ہیں جو دوسرے ادیبوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں شوخی بھی ہے اور سرمستی بھی، زہر کی تلخی بھی اور شہد کی مٹھاس بھی۔ ان کے پاس معلومات کا اتنا بڑا خزانہ تھا کہ وہ اشاروں اور کنایوں میں دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ ان کی طرز تحریر میں مولانا محمد حسین آزاد کی شوخی، علامہ شبلی کی علمیت، مولانا حالی کی سادگی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت پائی جاتی ہے۔ وہ ایک متنوع شخصیت کے حامل تھے اور اسی تنوع کی بنا پر مولانا عبدالماجد کو علامہ شبلی اور حالی کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

ادب کے ساتھ فلسفہ اور مذہب پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ انھوں نے مشرقی علوم اور مغربی علوم کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ لکھنا پڑھنا تو ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اوائل عمر میں ہی ان کو تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور ان کا یہ ذوق آخر دم تک قائم رہا۔ انھوں نے فلسفہ، منطق، تصوف، ادب، مذہب اور تفسیر کے موضوعات پر کم و بیش چالیس مستقل تصانیف چھوڑی ہیں۔ مذہبی تصانیف میں قرآن مجید کی تفسیر ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے جو تفسیر ماجدی کے نام سے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔

ان گوناگوں صفات کے علاوہ مولانا ایک اعلا پایہ کے صحافی بھی تھے۔ وہ خود اپنا ایک ہفتہ وار اخبار "سچ" نکالتے تھے جو بعد میں "صدق" اور "صدق جدید" کے نام سے موسوم ہوا۔ وہ یہ اخبار باوجود ہزار دشواریوں اور مشکلوں کے آخر دم تک وقت پر شائع کرتے رہے۔ "صدق جدید" میں "سچی باتیں" ان کا صحافتی کالم تو پورے برصغیر میں مشہور تھا۔

مولانا عبدالماجد کی جیسی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت کہیں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی موت سے علمی، ادبی اور صحافتی دنیا میں ایک ایسا

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

پچھلے پہر

نازش پرتاپ گڑھی

رات کی زلفِ سیہ اور سنورتی ہی گئی
اور کھمبوں کی سلگتی ہوئی آنکھوں سے پرے
اپنوں بیگانوں کی سفاک نگاہوں سے پرے
شاہراہوں پہ مری زیست بکھرتی ہی گئی

۲

تارے نکلے تو یہ جانا کوئی پیغام آیا
چاند اُبھرا تو مسیحا نفسی یاد آئی
مجھ کو اک شوخ کی بیباک ہنسی یاد آئی
جذبۂ شوق بھی لیکن نہ مرے کام آیا
نہ سجی بزم نہ ہاتھوں میں کوئی جام آیا
صرف کھمبوں کی سلگتی ہوئی آنکھوں سے پرے
میں کہ پھرتا ہی رہا خاک بسر، آوارہ
دور مرکز سے ہو جس طرح کوئی سیارہ

۳

ناچتا ہی رہا محور پہ وہ پیلا مہتاب
اور ہر سمت اسی گردشِ پیہم کا خروش
اور پھر رہ نہ گیا رقص کے انداز میں جوش
رہ گیا پھر مری آنکھوں میں کوئی درد، نہ خواب
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی نہ گنتی، نہ حساب
خواب گوں، نرم فضاؤں کا فسوں ٹوٹ گیا
دھڑکنیں دل کی ہیں مدھم تو نگاہیں خاموش
ذہن میں ٹک نہ سکی کوئی حقیقت، نہ سراب

۴

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں نے کہا لوٹ چلو
تھرتھراتی ہوئی نظروں کا بھروسہ کیا ہے
تیز طوفان میں تنکے کا سہارا کیا ہے
مجھ سے کچھ دور کوئی چیخ اٹھا لوٹ چلو
دور تک کوئی ٹھکانہ بھی نہیں در بھی نہیں
وقت یہ وہ ہے کہ سجدہ بھی نہیں سر بھی نہیں
کون پوچھے گا کہ دیوانے کو کہنا کیا ہے
دیر سے سسکیاں بھرتی ہے ہوا۔ لوٹ چلو

۵

میں کہ پھرتا ہی رہا خاک بسر، آوارہ
رات کی زلفِ سیہ اور سنورتی ہی گئی
شاہراہوں پہ مری زیست بکھرتی ہی گئی
اپنوں بیگانوں کی سفاک نگاہوں سے پرے
اور کھمبوں کی سلگتی ہوئی آنکھوں سے پرے
بحرِ ظلمات میں بجھتا رہا اک انگارہ
کس کو معلوم وہ تارا تھا کہ تھا سیارہ

عشرت علی صدیقی

دستور ہند میں ۴۴ ویں ترمیم کی ضرورت و اہمیت

پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے ۴۴ ویں اور پاس ہونے والے ۴۲ ویں دستور ترمیمی بل میں بعض ایسی باتوں کو جو غیر واضح تھیں واضح کر دیا گیا ہے اور اس بل کے ذریعے جو ریاستی اسمبلیوں کی مقررہ تعداد کی منظوری اور صدر جمہوریہ کی مہر تصدیق کے بعد اب دستور میں شامل ہو گئی ہے بعض ایسی رکاوٹوں کو دور کر دیا گیا ہے جو دستور کے منشا کو پورا نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ ہندستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے شروع ہی سے ایک جمہوری سوشلسٹ اور سیکولر مملکت کا تصور رکھتے تھے۔ یہی تصور آزادی کے بعد دستور سازوں کے پیش نظر تھا۔ اور اگرچہ دستور کی تمہید میں انھوں نے "با اقتدار جمہوری ریپبلک" کے الفاظ استعمال کیے تھے اور "قوم کے اتحاد" پر زور دیا تھا لیکن اتحاد میں سالمیت کا عنصر شامل تھا اور پالیسی کے ہدایتی اصولوں کو مرتب کرتے وقت سوشلزم اور سیکولرزم کے نظریوں سے رہنمائی حاصل کی گئی تھی۔

ان نظریوں کا نام البتہ نہیں لیا گیا تھا اور یہ کوئی فروگذاشت نہیں تھی پھر بھی جو لوگ سرمایہ دارانہ نظام سے فائدہ اٹھا رہے تھے وہ سوشلسٹ نوعیت کے اقدامات کو دستور کے منافی قرار دینے لگے اور ملی جلی معیشت کی درمیانی منزل کو منزل مقصود بنانے نیز ایسے سوشلزم کی مخالف سمت میں موڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی طرح جو افراد اور گروہ فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دے کر سیاسی فائدہ اٹھا رہے تھے اور اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور سرمایہ نہیں تھا وہ کچھ لوگوں کو سیکولرزم کے تقاضوں کی خلاف ورزی پر اکسا رہے تھے اور کچھ میں سیکولرزم کے متعلق بے اعتباری پیدا کر رہے تھے۔ ایسی حرکتیں اگر کچھ عرصہ اور جاری رہتیں تو نہ صرف سیکولرزم اور سوشلزم کو بلکہ خود دستور کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچ جاتا اور عوام کی نظروں میں اس کی افادیت مشکوک ہو جاتی۔ یہی نہیں، اس ملک میں جمہوریت کی جڑیں بھی کمزور ہو جاتیں۔

پارلیمنٹ کا اختیار

تمہید میں ترمیم کی جس طرح مخالفت کی گئی اس سے اس معمولی ترمیم کی غیر معمولی اہمیت اجاگر ہو گئی۔ مخالفت کا خاص مقصد یہ تھا کہ سماجی اور معاشی حالات اور استحصال کے موقعوں کو جوں کا توں قائم رکھا جائے۔ اسی مقصد کے تحت یہ کہا گیا کہ پارلیمنٹ کو دستور میں کوئی بڑی ترمیم کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے لیے ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) ہونا چاہیے یا پھر نئی دستور ساز اسمبلی طلب کی جانی چاہیے۔ ان دونوں باتوں کا دستور کے اس مسودے میں جو سنہ ۱۹۴۹ء میں منظور اور سنہ ۱۹۵۰ء میں نافذ ہوا تھا کوئی ذکر نہیں ہے اور خود اس دستور نے پارلیمنٹ کو ترمیم کا اختیار دے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ دستور ساز اسمبلی جیسا کہ اس زمانے کے وزیر قانون ڈاکٹر امبیدکر نے کہا تھا اتنی نمائندہ نہیں تھی جتنی کہ پارلیمنٹ جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام کے براہ راست ووٹ سے منتخب ہوئی تھی۔

دراصل ہندستان کی پارلیمنٹ دستور میں ترمیم کے متعلق اپنے اختیار کو اس سے پہلے ۴۲ بار استعمال کر چکی تھی۔ اس اختیار کو پہلی بار سنہ ۱۹۶۷ء میں سپریم کورٹ کے ۱۱ ججوں کی ایک بنچ نے صرف ایک کی اکثریت سے محدود کر دیا جب گولک ناتھ کے مقدمے میں دستور میں درج بنیادی حقوق کا سوال اٹھا تھا۔ بنچ کے ۵ ججوں نے کہا کہ پارلیمنٹ دستور کی دوسری دفعات کی طرح بنیادی حقوق سے متعلق دفعہ میں بھی ترمیم کر سکتی ہے لیکن چھ ججوں نے رائے دی کہ ان حقوق میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سوال اس سے پہلے بھی دو بار سنہ ۱۹۵۱ء اور سنہ ۱۹۶۵ء میں دو مقدموں کے سلسلے میں اٹھا تھا۔ پہلی بار شنکری پرشاد کے مقدمے میں ۵ ججوں کی بنچ نے متفقہ طور پر بنیادی حقوق میں تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کو با اختیار قرار دیا تھا اور دوسری بار سجن سنگھ کے مقدمے میں ۵ میں سے ۳ ججوں نے یہی اور دو نے اس کے خلاف رائے دی۔ اس طرح گولک ناتھ کے مقدمے کو ملا کر تینوں مقدموں میں مجموعی طور سے ۱۲ ججوں نے کہا کہ پارلیمنٹ بنیادی حقوق میں ترمیم کر سکتی ہے جب کہ ۹ ججوں نے کہا کہ پارلیمنٹ کو ایسی ترمیم کا اختیار

نہیں ہے۔

گولک ناتھ کے مقدمے میں سپریم کورٹ نے جو نئی نظیر قائم کی تھی اسے اسی عدالت نے کیشونند بھارتی کے مقدمے میں اپنے فیصلے سے رد کر دیا۔ اس فیصلے میں بنیادی حقوق میں تبدیلی کے متعلق پارلیمنٹ کے اختیار کو تسلیم کرایا گیا۔ لیکن ۸ ججوں نے کہا کہ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور ۴ ججوں نے کہا کہ دستور کا کوئی بنیادی ڈھانچہ ہے ہی نہیں۔ جن ججوں نے بنیادی ڈھانچے کا تصور پہلی بار پیش کیا تھا انھوں نے بھی اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی اور اگرچہ ان کے فیصلے سے ایک گتھی سلجھ گئی مگر ایک دوسری گتھی پیدا ہو گئی۔ اسی اثنا میں کئی اور الجھنیں اور سماجی انصاف میں کئی اور رکاوٹیں ان مقدموں کی وجہ سے پیدا ہو گئیں جن میں عوام کو ایسا انصاف دلانے والے قوانین عدالت میں چیلنج کر دیے گئے۔ انہی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے دستور کی ۴۲ ویں ترمیم میں جہاں ایک طرف ترمیم کے لیے پارلیمنٹ کو پوری طرح با اختیار قرار دیا گیا وہاں دوسری طرف معاشی اور سماجی انصاف والے بعض معاملات اور اقدامات کو عدالتوں کے دائرہ اختیار سے باہر کر دیا گیا ہے۔

عدلیہ کا منصب

ایک ترقی پسند اور ترقی پذیر معاشرے میں معاشی اور سماجی انصاف کا تصور بدلتا رہتا ہے مثلاً غلامی جو پہلے جائز تھی اب ناجائز ہو چکی تھی اسی طرح ذخیرہ اندوزی کو پہلے کھلی چھوٹ حاصل تھی مگر اب ذخیرہ اندوز بھی اس حرکت کو نامناسب سمجھتے ہیں۔ عدالتیں صرف دستوری، دیوانی اور فوجداری قانونوں کے الفاظ کو دیکھتی ہیں جن کو قابل وکیل نت نئے معنی پہناتے رہتے ہیں۔ لیکن سماجی و معاشی انصاف سے اس قسم کا کھلواڑ روا نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بات خود عدلیہ کے منصب اور وقار کے منافی ہے کہ اس کی آڑ میں سماج دشمن سرگرمیاں جاری رہیں اور ستائے ہوئے عوام کو حقیقی انصاف ملنے میں دشواری ہو۔

دستور میں عدالتوں کا دائرہ کار متعین اور واضح کر دیا گیا ہے اس میں بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی شکایتوں کی سماعت کرنے اور مختلف نوعیتوں کے رٹ جاری کرنے کا اختیار شامل ہے۔ ریاستی قوانین کے دستوری جواز کو متعلقہ ہائی کورٹ میں اور مرکزی قوانین کے آئینی جواز کو سپریم کورٹ میں بدستور چیلنج کیا جا سکے گا۔ البتہ فیصلوں کو باوقار بنانے کے لیے بنچ کی دو تہائی اکثریت ضروری قرار دے دی گئی ہے۔ جو انتخابی، معاشی اور انتظامی امور عدالتوں کے دائرہ سماعت سے نکال کر ٹربیونلوں کے سپرد کیے گئے ہیں ان میں بھی ٹربیونل کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ سے چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔

بنیادی حقوق پر پالیسی کے ہدایتی اصولوں کو ترجیح تازہ ترمیم سے پہلے ہی مل گئی تھی۔ اور یہ بندوبست اس وجہ سے معقول ہے کہ بنیادی حقوق ایک جامد عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ ہدایتی اصول کو متحرک عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی حق کے بنیادی بننے سے پہلے اسے "حق" بنا چاہیے اور کوئی حق جو دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کرتا ہو قابل احترام اور ناقابل تغیر نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر جائداد رکھنے کا حق اگر دوسروں کے استحصال کے لیے استعمال ہو تو اسے عدلیہ کا تحفظ نہیں ملنا چاہیے۔ اسی طرح تحریر، تقریر اور انجمن سازی کے حق کو قوم دشمن سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنے والوں کو بنیادی حقوق کے نام پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ چونکہ ماضی میں بعض اوقات ایسی اجازت عارضی یا مستقل طور پر ملتی رہی ہے اس لیے اب صاف لفظوں میں اس کی ممانعت کر دی گئی ہے اور اس طرح عدلیہ کے وقت کی بربادی اور اس کے ناجائز استعمال کی روک تھام ہو گئی ہے۔

یہ ناجائز استعمال کوئی مفروضہ نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے اور ماضی ہی نہیں حال کی تاریخ میں بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ زمینداری کے خاتمے، بیمہ کاری اور بنک کاری کے کاروبار کے قومی ملکیت میں لیے جانے، سابق والیان ریاست کے صرف خاص اور خصوصی مراعات کے ختم کیے جانے اور ابھی حال ہی میں نظام قبضۂ آراضی میں اصلاح کیے جانے کے قوانین پر عملدرآمد کو روکنے کے لیے دولت مند طبقے نے ہتھکنڈے وکیلوں کی مدد سے عدالت کا سہارا لیا۔ اور ان قوانین کے نفاذ کو عرصے تک روکے رکھا۔ اس طرح عدلیہ کو انصاف دلانے کے بجائے سماجی انصاف میں رکاوٹ ڈالنے کا آلہ بنا لیا گیا۔

قوم دشمن سرگرمیاں

قوم دشمن سرگرمیوں کے معاملے میں کچھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اسمگلنگ اور غیر قانونی سرگرمیوں اور تنظیموں کی روک تھام کے قوانین موجود تھے مگر ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے بنیادی حقوق کے نام پر بعض اوقات سزا سے بچ جاتے اور زیادہ تر ضمانت پر چھوٹ جاتے تھے۔ قوم دشمن سرگرمیوں اور تنظیموں کی صراحت بھی دستور میں پوری طرح نہیں کی گئی تھی۔ اب تازہ ترمیم کے ذریعے یہ کمی دور کر دی گئی ہے۔ اس زمرے میں وہ حرکتیں اور تنظیمیں آتی ہیں جو ہندوستان کے کسی حصے کی اس سے علاحدگی کی تلقین یا تائید کریں۔ ملک کے اقتدار اعلا، سالمیت اور سلامتی کو خطرے میں ڈالیں۔ قانون کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت کو تشدد کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کریں۔ بدامنی یا سرکاری خدمات میں انتشار پھیلائیں۔ یا مختلف مذہبی لسانی، نسلی یا علاقائی گروہوں ذاتوں یا برادریوں میں اختلاف اور تعصب کو ہوا دیں۔

دستور کے اس آرٹیکل کے استعمال کو آسان بنانے کے لیے کہا گیا ہے کہ قوم دشمن سرگرمیوں اور تنظیموں کی روک تھام اور ممانعت کے لیے جو قانون بنائے جائیں گے انھیں کسی عدالت میں اس بنا پر چیلنج نہیں کیا جا سکے گا کہ ان سے دستور کے آرٹیکل ۱۴، ۱۹، یا ۳۱ میں دیے جانے والے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے لیکن دوسری طرف اس آرٹیکل کے بے جا استعمال کو روکنے کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے تحت قانون کوئی ریاستی مجلس قانون ساز نہیں بنا سکے گی۔ صرف پارلیمنٹ کو ایسا قانون بنانے کا حق ہوگا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ حکومت پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کے بل پر اس قانون سے سیاسی فائدہ اٹھانے لگے گی، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے ممبر ایک مقررہ مدت کے بعد بدل بھی سکتے ہیں۔ اسی طرح حکومت بھی بدل سکتی ہے۔ ان تبدیلیوں کا امکان تانا شاہی اور من مانی کے خلاف اور احتیاط و توازن کے حق میں ایک بڑی ضمانت ہے۔

بنیادی فرائض

جمہوریت سوشلزم اور سیکولرزم کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت خود ملک کے عوام ہیں۔ اگر وہ ان بنیادی فرائض کی پابندی کریں جو دستور میں شامل کر دیے گئے ہیں تو قوم دشمن سرگرمیاں اور جمہوری آزادی کی خلاف ورزیاں پنپنے نہیں پائیں گی۔ ان فرائض میں جنگ آزادی کے بنیادی محرکات و جذبات کی پابندی، قومی جھنڈے اور قومی ترانے کا احترام، ملک کے اتحاد اس کی سلامتی اور اس کی سرحدوں کا تحفظ، بھائی چارے اور یک جہتی کا فروغ، قومی املاک اور مشترکہ کلچرل ورثے کی حفاظت، تشدد سے اجتناب، سائنسی نقطہ نظر کا حصول، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اعلا معیار کی پابندی، جنگلات اور ان کے جانوروں، نہروں، جھیلوں، ندیوں اور سب جان داروں کی مناسب دیکھ ریکھ شامل ہے۔

ابھی تک دستور میں محض حقوق کا تذکرہ تھا اور اگرچہ قانوناً اور اخلاقاً حقوق کے ساتھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں توازن آتا ہے لیکن فرائض کا ذکر دستور میں ابھی تک بالواسطہ اور ضمناً تھا اب یہ صراحتاً ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی میں جو تاخیر ہوئی ہے اس کی وجہ سے بنیادی فرائض کے صریحی تذکرے کو اور اس سلسلے کی بعض باتوں کو کچھ لوگوں نے عجیب و غریب قرار دیا ہے لیکن کسی مذکورہ فرض کو نامناسب ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل ابھی تک نہیں پیش کی گئی ہے۔

فرائض کا ذکر دستور میں اس توقع کے ساتھ کیا گیا ہے کہ لوگ رفتہ رفتہ ان کو محسوس کرنے لگیں گے۔ ان کو نظر انداز کرنے یا ان کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں کوئی سزا نہیں تجویز کی گئی ہے۔ لیکن ان کی تعلیم اور تشہیر ٹھیک طرح سے کی جائے اور اگر دستور کی تمہید میں جو منزل بیان کی گئی ہے اس کے حصول کے لیے پالیسی کے ہدایتی اصولوں پر ٹھیک سے عمل کیا جائے تو فرائض کی اہمیت اور ان کے احساس میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ روزمرہ زندگی کا جز اور عام عادت بن جائیں گے۔

جو مراعات یافتہ طبقے اپنی سیاسی، معاشی اور سماجی اغراض کے

لیے قومی زندگی میں ٹیڑھا پن لانے اور بڑھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں انھوں نے دستور کی سابقہ ترمیموں کی طرح حالیہ ترمیموں کی بھی مخالفت کی ہے۔ اس لیے کہ ان ترمیموں سے ناجائز طور پر حاصل کیے جانے والے مفادات پر آنچ آتی ہے اور ان مفادات کے تحفظ کے لیے کی جانے والی کوششوں میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ کبھی عدلیہ اور مقننہ کو جو ایک دوسرے کی حلیف ہیں ایک دوسرے کا حریف ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ کبھی بنیادی حقوق کے نام پر لوٹ کھسوٹ کے حق کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی اور کبھی دستور کے "تقدس" کے نام پر اسے جامد بنانے اور اس کا لوچ ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

بنیادی خصوصیات

دستور ملک کے لیے آگے بڑھنے کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ کوئی دستور سو پچاس نہیں دس پانچ برس بعد بھی رونما ہونے والے حالات و واقعات کی پیش بندی نہیں کرسکتا۔ اس لیے حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ دستور کی تبدیلی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر دستور کا لوچ اور اس میں تبدیلی کی گنجائش ختم ہو جائے تو ایک منزل ایسی آسکتی ہے جب عوام کی ابھری ہوئی امنگیں اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات دستور ہی کو ختم کردیں۔ ترمیم کی گنجائش باقی رہنے اور حالات کی مناسبت سے دستور میں ترمیم ہوتے رہنے سے دستور میں استحکام آتا ہے اور اس میں ملک کو آگے لے چلنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ دستور کا تقدس باقی رکھنے کے لیے بھی اس میں ترمیم کی گنجائش باقی رکھنا ضروری ہے اس لیے کہ عوام کا وسیع تر مفاد ہر چیز سے زیادہ مقدس ہے۔

دستور سازوں نے اسی مقصد کے تحت دستور کا آرٹیکل ۳۶۸ مرتب کیا تھا اور سنہ ۱۹۷۶ء کی ترمیم اسی آرٹیکل کے تحت منظور کی گئی ہے۔ "بنیادی ڈھانچے" کی بات مبہم انداز میں اٹھائی گئی تھی اور اسے مذموم اغراض کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ "بنیادی ڈھانچے" کے بجائے بنیادی خصوصیات کی بات کرنا زیادہ معقول ہے اور ہندستان کے دستور کی بنیادی خصوصیات کو موٹے طور سے تین شقوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ (۱) پارلی منٹری نظام اور مرکز اور ریاستوں کے مابین فرائض منصبی کی تقسیم (۲) بالغ رائے دہی اور انتخابات اور (۳) مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین بنیادی تعلق۔ یہ خصوصیتیں تازہ ترمیم کی وجہ سے مدھم پڑنے کے بجائے پہلے سے زیادہ نمایاں ہوگئی ہیں۔ عوام کا مفاد ان سب چیزوں سے بالاتر ہے اور اس ترمیم سے اس مفاد کا تحفظ آسان ہوگیا ہے۔ ایمرجنسی کے دوران منظور اور نافذ ہونے والی اس ترمیم سے ان حالات کی روک تھام بھی آسان ہوگئی ہے جو ایمرجنسی کے اعلان کا باعث بن گئے تھے۔ جن لوگوں نے یہ حالات پیدا کیے تھے ان کی طرف سے اس ترمیم کی مخالفت میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ مخالفت برائے مخالفت ہی نہیں برائے شرارت بھی ہے۔

★

اجالا دکھائی دے

چاروں طرف وطن میں اجالا دکھائی دے
خوابوں میں جیسے نور کا دریا دکھائی دے

وہ انقلاب ہے کہ گلستاں بدل گیا
صحرا بھی اب بہار کا نقشہ دکھائی دے

مزدور اور کسان کا عالم نہ پوچھیے
ہر شخص جیسے صبح تمنا دکھائی دے

دفتر ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
گاندھی کا دیس روپ بدلتا دکھائی دے

قدموں کے ساتھ ساتھ ستاروں کی رہگزر
سورج نئے ارادوں میں ڈھلتا دکھائی دے

اتنے چراغ کس نے جلائے ہیں اے وقار
راتیں کہاں کہ اب تو سویرا دکھائی دے

وقار خلیل

شوکت پردیسی

تصویرِ احساس

شفق کی اوٹ سے جب شام کا سورج نکلتا ہے
اندھیرا جب چراغوں کی پناہوں میں مچلتا ہے
ہوائیں چلنے لگتی ہیں جب آہستہ خرامی سے
قدم جب خود بخود رکتا ہے اپنی تیز گامی سے
زمانہ جب فضا کی خامشی میں ڈوب جاتا ہے
فسونِ خواب جب اک اور ہی منظر دکھاتا ہے
فضائے کہکشانی جب نشاط انگیز ہوتی ہے
فلک سے آکے شبنم خود بخود موتی پروتی ہے
طلسماتی فضا میں روح سے سرگوشیاں کرتا
اتر کر آسماں سے فرشِ گیتی پر قدم رکھتا
کوئی جیسے نگاہِ منتظر کے پاس آتا ہو
طلسماتی فضا کو اور بھی دل کش بناتا ہو
مجھے لگتا ہے ایسا ایک موجِ نور کی صورت
بصد ناز و دلآویزی جناں کی حور کی صورت
کوئی چپکے سے آکر کہہ رہا ہو مجھ سے خلوت میں
اٹھو، اور اٹھ کے لے لو مجھ کو آغوشِ محبت میں
میں اُس وقت اپنی تنہائی کا عالم بھول جاتا ہوں
یہ کربِ عہدِ حاضر، شورشِ غم بھول جاتا ہوں
بدل جاتی ہے ناکامی، نشاطِ کامرانی سے
لہک اٹھتا ہے چہرہ جیسے رنگِ شادمانی سے
یکایک روشنی سی پھیل جاتی ہے سوئے منزل
ہزاروں قمقموں سے جگمگاتی ہے مری محفل
محبت کا تقدس جھوم اٹھتا ہے نگاہوں میں
سمٹ جاتا ہے جب کوئی تصور کی پناہوں میں

ساحر لکھنوی

استقبالِ جمہور

لہلہاتی ہوئی فصلوں نے سلامی دی ہے
گنگناتی ہوئی ندیوں نے سلامی دی ہے
نئے باندھوں، نئی جھیلوں نے سلامی دی ہے
نئی سمتوں، نئی راہوں نے سلامی دی ہے
اب کی آیا ہے بڑی شان سے یوم جمہور
بے زمینوں نے بھی پائی ہے زمیں اب کے برس
رُوئے مزدور پہ ہے نورِ یقیں اب کے برس
ملک بھر میں کہیں بیگار نہیں اب کے برس
جگمگا اٹھی ہے بھارت کی زمیں اب کے برس
اب کی آیا ہے بڑی شان سے یوم جمہور
قرض خواہوں کو ملی سود کے بندھن سے نجات
مسکرانے لگی مجبور کے ہونٹوں پہ حیات
ہوگئی ختم غم و یاس و الم کی ہر رات
لے کے آئی ہے ہر اک صبح خوشی کی سوغات
اب کی آیا ہے بڑی شان سے یوم جمہور
فرقہ وارانہ تعصب کا جنوں ختم ہوا
نفرت و بغض و عداوت کا فسوں ختم ہوا
وہ جو ماحول میں تھا زہر، فزوں ختم ہوا
ملک اور قوم کا احوالِ زبوں ختم ہوا
اب کی آیا ہے بڑی شان سے یوم جمہور
آیئے مانگیں دعا اب یہی انداز رہے
"ایک ہم سب ہیں" ہمہ وقت یہ آواز رہے
زندگی یونہی سدا زمزمہ پرداز رہے
یہی نغمات رہیں اور یہی ساز رہے
اب کی آیا ہے بڑی شان سے یوم جمہور

محمد نعیم صدیقی ندوی

خسرو کی ہندی شاعری کی اساس ماں اور مرشد

ماں اور مرشد خسرو کی ہندی شاعری کی اساس ہیں۔ ماں کے معنی یہاں وسیع تر ہیں۔ وہ جنم دینے والی سایہ دار ہستی ہی نہیں، مادر وطن کا جسمانی روپ بھی ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے سبب زندگی کی جن قدروں کو انھوں نے اپنے گھر آنگن میں مہکتے ہوئے دیکھا وہ تمام تر ننھیال یا مادری تہذیب پر مشتمل تھیں۔ انقلاب زمانہ کے طفیل اپنے مرحوم وطن کا تصور ان کے لیے ایک ایسے سپنے سے زیادہ نہ تھا جو سہانے پن سے عاری ہو۔ لہٰذا انھوں نے تمام ہندستان کو اپنے گھر کا آنگن سمجھا اور اس کی مداحی اس خلوص سے کی جس کی نظیر قلی قطب شاہ، تلسی داس اور نظیر اکبرآبادی کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ خصوصیات ہندستان (مثلاً پان، آم، پھول، عورت، فنون لطیفہ) کا ذکر ان کے ہاں جس فنکارانہ رچاؤ کے ساتھ کیا گیا ہے وہ اپنائیت اور تہذیبی عقیدت مندی کی بہترین مثال ہے۔ دلی کو "قبۃ الاسلام" اور "بہشت بریں" کہہ کر خسرو نے مذہبی تصورات اور زمینی لذات دونوں کو عظمت و مناسبت دیدی۔ ذہن و عقیدہ کی یہ ہم آہنگی انھیں اپنی ماں یا ننھیال سے ملی اور نظام الدین اولیاء نے اس کو پختہ تر کر دیا۔ ذات پات، چھوت چھات اور ناقدری کے ستائے ہوئے ہندستانی عوام کو ان کو اپنی زبان میں دین سے روشناس کرانا اور تعلیم یافتہ ذہین طبقہ کے دلوں میں وجودی فلسفہ کے اسرار اتارنا، نظام المشائخ کا آدرش تھا۔ لہٰذا محض فارسی کی متصوفانہ شاعری ان کی ضروریات کو پورا نہ کر سکتی تھی۔ فرید گنج شکر کے سچے شاگرد کی حیثیت سے خیالات کو عبادت کے ہندی (اس وقت اس زبان کا یہی نام تھا) گیتوں کے قالب میں ڈھالنا اور موضوعی مناسبت کے ساتھ ہندستانی راگوں میں ادا کرنا انھیں ضروری محسوس ہوا۔ اظہار کے ان مقامی وسیلوں کے سہارے عوام الناس خود کو نہ صرف عشق رسول کے جذباتی بہاؤ کے سپرد کر دیتے تھے، بلکہ مساوات کے انسیکھے روپ کا درشن بھی کرتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے خسرو کی صلاحیتوں کو چمکایا بھی اور ان سے کام بھی لیا۔ فرید کی پنجابی شاعری کی طرح نظام الدین اولیاء کے مرید خسرو نے دلی میں بیٹھ کر ویسے ہی ہندی گیت لکھے جیسے خانقاہی ماحول میں مقبول ہو سکتے تھے۔ ان میں جذبے کی وہ کشش ہو سکتا ہے نہ ہوتی ہو جو فرید جیسے پہونچے ہوئے بزرگ کے کلام میں تھی۔ لیکن خسرو چونکہ اس عالم جذب میں شاعری و موسیقی کے دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا ادبی مرصع کاری کا انھوں نے اسی طرح زیادہ لحاظ رکھا جس طرح کہ درد کے مقابلے میں میر نے اہتمام کیا تھا۔ خسرو کی بیشتر فارسی شاعری کی تخلیق میں بجائے مرشد کے درباری ماحول کا دخل زیادہ تھا۔ لیکن ان کی ہندی شاعری جو فارسی قصیدہ گوئی کے پھیکے پن سے ماورا جن لہروں پر مشتمل ہے، گھر اور مرشد کے حجرے کی دین ہے۔

تغلق کی لاٹ کے سایے میں جب (۱۲۵۳ء - ۱۳۲۴ء) نے اپنی توتلی زبان میں کھڑی بولی بولنی شروع کی تو برصغیر کا لسانی انقلاب اپنے آخری مراحل میں تھا۔ عوامی ادب کی نمائندہ تخلیقات (کمان راسو، پرتھوی راج راسو، بیل دیو راسو، آلھا اودل یا کلام فرید) میں ظاہری و باطنی ساخت کے لحاظ سے جداگانہ انداز اختیار کرنے لگی تھی۔ مثلاً جگ نک (بارہویں صدی) کی آلھا اودل اور فرید گنج شکر (۱۱۷۳ء - ۱۲۶۵ء) کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ اب دوہے کے قدیم سانچے کی جگہ مقامی یا فارسی کے نئے آہنگ کو آزمانے اور برج الفاظ کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی، ہریانوی اور پنجابی کے الفاظ کو اپنانے میں جھجک نہیں رہی تھی۔

خسرو سے پہلے جو تخلیقی روایت اس ملک میں موجود تھی اس میں کسی نہ کسی مذہبی یا تہذیبی نقطہ نظر کو غیر مبہم انداز میں اور جذباتی

روئیے کے ساتھ بیان کرنا اور خیر کی بلندی کا اظہار کرنا زیادہ اہمیت رکھتا تھا جہاں تک اظہار کی ظاہری وضع قطع کا تعلق ہے برج کے ظاہری اثر کے ساتھ ساتھ کچھ سنسکرت اور کچھ ہمسایہ پراکرت الفاظ کو دوہے کے پیرایے میں ادا کیا جاتا تھا۔ جو متفرق، مختصر اور منتشر خیالات کی ادائگی کے لیے بڑی موزوں شعری ساخت ہے اور برصغیر میں سدا مقبول رہی ہے۔ سو ہوا یہ کہ نوجوانی میں فارسی اساتذہ کے کلام کی رہبری میں حسب عسرو "نو آموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینے کے سامنے مشق سخن" کرنے اور فارسی غزل گوئی کا ذوق پیدا کر لینے کے بعد ہندی شاعری کی طرف مڑے تو ساخت کے لحاظ سے انھیں دونوں میں ایک یکسانیت سی نظر آئی اور جب انھوں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ سراپا کی طرح وہ بھی تخلیق کا غیر مبہم جذباتی رویہ رکھتے تھے۔ اور فارسی کی اظہاری پیچیدگیاں ان کو بھی مرغوب نہ تھیں۔

چنانچہ ان کی تمام تر سنجیدہ شاعری، جس کی کائنات بڑی مختصر ہے۔ دوہوں یا گیتوں پر مشتمل ہے اور ہلکے پھلکے، استعاراتی انداز میں دل کے رنگوں کو چھلکاتی رہتی ہے۔ اس طرح ان کی غزل فارسی اور ہندی دوہوں میں ایک طبعی مناسبت پائی جاتی ہے اور اسی لیے ان دونوں میں ہی ان کی شاعری کے اصل جوہر کھلتے ہیں۔ ہندی دوہے مقابلتہً اس لیے اہم ہیں کہ ان کے ذریعہ خسرو نے ہندستان کی شعری محفل میں پہلے پہل خیال کا سنگھار کیا، یہاں کی سرزمین میں تصوراتِ تصوف کی قلم لگائی اور ہندی شاعری کے معیار کو ان دیکھی بلندیوں تک پہونچا دیا۔ اس کے برخلاف اپنی تمام اہمیتوں کے باوجود فارسی شاعری میں انھیں یہ تاریخی مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے عہد کے اہم فارسی شاعر ضرور مانے جاتے ہیں لیکن اضافتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غالب کی طرح خسرو کی بھی اردو شاعری کا مقام بلند تر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس شاعری کا صحیح عرفان نہ خسرو کو ہوا تھا اور نہ ہنوز ہم کو ہوا ہے۔

متعدد مسرتوں اور نعمتوں کی طرح خسرو کی یہ ہندی شاعری بھی ان کے مرشد کی دین ہے۔ جو وہ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ انھوں نے ایک مہتم بالشان موضوع اور مقامی اظہار کا رسیلا پن دیا۔ خاص جلسوں میں فارسی غزلیں لطف دے سکتی تھیں اور قوالی کا سماں پیدا کر سکتی تھیں۔ لیکن مرشد کے دیوان عام میں جہاں صرف ہندی سمجھنے والے غریب غرباء کی کثرت ہوتی تھی، اور جہاں موسیقی کی نازک لہروں کے علاوہ دلوں کی دھڑکنیں بھی الفاظ کے ساتھ سنگت کرتی تھیں، مقامی شاعری ہی کام آ سکتی تھی۔ اسی لیے خسرو کی اس شاعری کے مختلف زاویے مرشد کی ذات سے روشن دکھائی دیتے ہیں۔

مثلاً "رات" کی علامت کو لیجئے۔ کلام خسرو میں اس کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ رات طلوع ہوتی ہے تو ان کا دل جاگ اٹھتا تھا۔ درباداریوں میں نسبتاً پھیکا دن گزار دینے کے بعد "رات" ان کے لیے مرشد کی قربت کا سندیسہ لے کر آتی تھی۔ ان کے حجرے میں پہونچ کر وہ دنیا کے جھمیلوں سے دور راز و نیاز میں ڈوب جاتے تھے اور اپنے آپ پر رشک کرنے لگتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سوائے خسرو کے دنیا کا کوئی اور متنفس سلطان المشائخ کی ان خلوتوں اور عبادتوں میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ "رات" ان کی شاعری میں نئے نئے روپ دھارتی ہے:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیہو دونو بھئے اک رنگ

پورا دوہا اعلیٰ شاعری کا نادر نمونہ ہے۔ اپنے تن کو محبوب کے من جیسا بنا دینا معنوی لحاظ سے اس قدر رچی ہوئی بات ہے کہ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ انسان کو تن یعنی مظہر یا برقرار دنیا اور محبوب کو من یا قدر کہنا تصوف کے نظریۂ عشق کا بڑا کامیاب اظہار ہے۔ اپنے من کی نفی کر کے شاعر نے مسئلہ جبر و اختیار کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ اور یہ بات بھی کہہ دی کہ:

دل کہاں گم کیجے ہم نے مدعا پایا

کیفیت جذب کے بیان کے لیے یک رنگی کی بات تو ایک عام شاعر کر سکتا ہے لیکن اس عالم کو "سہاگ" کہنا، خیال انگیز بھی ہے اور بلند تر تخلیقی جوہر کا ثبوت بھی۔ اس لفظ کے کئی معنی ہیں، خوش قسمتی، شادی، پیار، اور آراستہ عورت کا اپنے شوہر سے ملاپ۔ اور یہاں یہ تمام

معنی صادق آتے ہیں۔ بہت کم شاعروں نے الفاظ کو اس قدر معنوی وسعت کے ساتھ استعمال کیا ہوگا۔ الفاظ کا ذکر چھڑ گیا تو یہ گزارش بھی کرتا چلوں کہ مروجہ ہندی شاعری کے مقابلہ میں خسرو نے اپنے آپ پر کچھ پابندیاں لگائی تھیں۔ سنسکرت کے اجنبی اور پراکرت کے ناہموار الفاظ سے کتراتے ہوئے انھوں نے صرف ایسے الفاظ پر تکیہ کیا جو حسن سماعت کے ساتھ ساتھ معانی کی سفارت کا کام انجام دے سکتے تھے اور بعید از فہم نہ تھے۔ لفظ "سہاگ" کا ذکر آچکا ہے۔ اب اس معنوی پس منظر میں "سہاگن" کو دیکھئے۔ ذکر مرشد کا ہے اور چونکہ گیت کے پیرایے میں ہے، لہٰذا دوہے کی جامعیت اور گمبھیرتا کی جگہ نرم نرم وضاحتی لہجہ پیدا ہو گیا ہے:

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے
چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے
بل بل جاؤں میں تورے رنگ رجوا
اپنی سی کر لینی ری موسے نیناں ملا کے
خسرو انجام کے بل بل جاؤں
موہے سہاگن کینی ری موسے نیناں ملا کے

اس عہد کی ہندوستانی معاشرت میں سہاگن اور طریقت میں خسرو کے مقام کی موزونیت جو استعاراتی حسن رکھتی ہے، اعلا فن کاری کی مثال ہے۔ مقام فنا تصوف کا وہ موضوع ہے جسے فارسی و اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے نظم کیا ہے لیکن ہندی کی علامات سے کام لے کر خسرو نے اپنے اسلوب کو سب سے الگ تھلگ کر لیا ہے۔ اس علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے گیتوں میں ارتقائے خیال اور نظمیت پائی جاتی ہے۔ یہاں آپ کو عظمت اللہ خاں اور میرا جی کے نظم نما گیت یاد آئیں گے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ان دونوں کو مغربی نظم کی نظمیت سے آگہی تھی۔ جبکہ خسرو کی فتوحات ان کی اپنی اپج کا نتیجہ ہیں۔ ان کے زمانے میں ہندی، سنسکرت سب کا دامن ایسے گیتوں سے خالی تھا

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہندی شاعری میں ویدانت کا اتنا دلار نہیں کیا گیا جتنا اردو یا فارسی شاعری میں تصوف کا۔ لیکن یہاں اردو بھی اپنی مختلف محرومیوں کے سبب خسرو کے ذرا پیچھے رہ گئی ہے۔ پہلی محرومی اقدار کے صحیح سالم نہ رہنے سے ہوئی۔ عقلی نظریات کے پھیلاؤ نے میر اور غالب سے عقیدہ کی وہ توانائی چھین لی جو خسرو کو حاصل تھی۔ خسرو اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے کہ انھیں ذہنی آسودگی کی عظیم نعمت میسر تھی۔ اور تشکیک کے خلجان نے انھیں ستایا نہ تھا۔ ان کے برخلاف غالب کو دیکھئے تو "یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟" کی رٹ لگاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور میر مقام جذب تک پہونچنے کے بجائے مقام حیرت کی ابتدائی منزل پر کھڑے ہوئے خود بینی اور انسانی انا میں گھرے ہوئے پائے جائیں گے۔

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے لائق
کہ اک عالم ہمکتے ہے عالم تصویر بھی آخر (میر)

اس لحاظ سے درد اور اصغر ذرا خوش قسمت رہے۔ لیکن انھیں دوسری محرومی نے آلیا۔ ان کی اظہاری و تخلیقی صلاحیتیں ان کے جذبے کی شدت کا ساتھ نہ دے سکیں اور ان کی شاعرانہ بلندی ان حدود سے آگے نہ بڑھ سکی:

حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہی
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا (درد)
ردائے لالہ و گل، پردہ مہ و پروین
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے (اصغر)

اب خسرو کی طرف دیکھیے تو عقیدہ و تخلیق کا وصال نظر آئے گا کیونکہ اوّل تو خانقاہی فضا میں آنے سے قبل وہ تخلیقی مدارج کی بلندیوں کو طے کر چکے تھے اور دوم یہ کہ انھوں نے "ہونی" کو بیان کیا ہے۔ مسائل تصوف بیان نہیں کیے ہیں۔ یہ موضوع شعر ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ آدرش ہے۔ ان پر جو کچھ گذرتی رہی ہے وہ اس گذرتے رہنے کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے کلام سے مبتلا ہونے اور سپردگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہماری شاعری کا یہ نقش اوّل ہی ہنوز آخر ہے۔

خسرو کی شخصیت جس حد تک ہمارے پیش نظر ہے اس کی رو سے وہ ہستی جس میں ان کے محبوب کی مکمل جھلک دکھائی دیتی ہے،

کسی خاتون یا حسن سحری کی نہیں ہے، بلکہ مرشد کی ہے۔ دوہوں میں انھیں کی پرچھائیاں بکھری ہوئی ہیں اور گیتوں میں جہاں خطاب ہے انہی سے ہے۔ وہ عموماً رسولؐ یا خدا سے مخاطب نظر نہیں آتے جیسے ان کی عظمت اور اپنی کم مائیگی کا خیال کر کے حوصلہ نظر نہ آتا ہو۔ قربت مرشد نے البتہ انھیں خطاب کی ہمت دلادی۔ گردیوا جنم جنم کا ساتھ اور تڑپن کا بیان انھوں نے ایسے استعاراتی انداز میں کیا ہے جو بعد میں ہماری شاعری کا طرّہ امتیاز بن گیا:

پنکھا ہو کر میں ڈلے ، ساتھ تیرے جاؤ
ڈولت مجھ کو جنم گیا تیرے پیچھے باؤ

یہ دوہا ایک روشنی سی پھیلا دیتا ہے جس میں کبیر، رحیم خاں خاناں ولی اور میر اس استعاراتی انداز کو فروغ دیتے نظر آتے ہیں۔ ان سب کے یہاں اپنی شاعری کو فارسی سے آزاد کرا کے مقامی آب و رنگ دینے کا جو شعور پیدا ہوا خسرو کی اس شاعری کی اساس پر ہی پیدا ہوا۔ ادھر کبیر اور رحیم نے خسرو ہی کی تقلید میں اپنی شاعری کو سنسکرت کی چھاپ سے نجات دلا کر حسن نغمہ سے آراستہ کیا۔

مشرق وسطیٰ سے لائے ہوئے عقیدہ کو ملکی سرزمین میں فنی پیرائے میں نمو پذیر کرنے کا جو انداز خسرو نے اختیار کیا، حسب ذیل گیتوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پہلے گیت کا تعلق مرشد سے ہے اور دوسرے کا میلاد النبیؐ سے ہے:

(۱) نکے بچھی بھئے باورے
کیسی بین بجائی سانورے
جھوم رہے ہیں سب بن کی ڈاری
پنگھٹ کی پنہاری ٹھاری
بولی خسرو بچھیا بھرن کو

(۲) سب گھر آنند بدھاوا
لاری مالنیا پھولن دا سہرا
سب جگ میں بھوا جیارا
جب ہجرت جنم پایو
سب منگل گایو

آخر میں اس عظیم دوہے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو خسروؔ نے اپنے مرشد کی قبر پر پہونچ کر کہا تھا۔ اس دوہے کو اپنی تمام غیریت بھلا کر ہندی اور اردو دونوں ادب سدا اپناتے رہیں گے

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوندیس

موضوع جس قدر عالمگیر نوعیت کا ہے، خسرو کا اظہار اتنا ہی انفرادی ہو گیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے یہ ان کی خود نوشت سوانح عمری کی آخری عبادت ہو۔

جیسے ایک لڑکا دن بھر میلے کی سیر کے بعد سانجھ سمے خوش خوش گھر واپس جا رہا ہو۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ "وصال" کے ظاہر متصوفانہ پس منظر میں اس نے شعر کی فضا کو سوگوار نہیں بنایا بلکہ سیج، گوری، مکھ، کیس کے ذریعہ سیرابی کا تاثر پیدا کیا ہے یہ سیرابی ان یادوں کو روشن کرتی ہے، جو نظام الدین اولیاء کی توجہ سے ان کے دل کو نصیب ہو گئی تھی۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ سیج، گوری اور کیس کے رنگوں کی ترتیب کیسی مکمل کشش پیدا کر رہی ہے۔ اور پھر غور فرمائیے کہ موت سے نیند، رات سے زلف، اور سورج سے چہرہ مراد لینا کس قدر عام روش ہے لیکن ان عام استعاروں سے خسروؔ نے کیسا خاص تاثر پیدا کیا ہے اور اپنی محبت کی شدت نیز دونوں دنیاؤں کی صوفیانہ حیثیت کا بیان کس جامعیت سے کر دیا ہے۔ ذیل میں خسروؔ کا ایک فارسی شعر ملاحظہ فرمائیں جو اسی موقع پر کہا گیا ہے یعنی مزار مرشد پر:

ایں مکانیست کہ منزل گہہ جاناں بوداست
راہ آمد شد ایں سرو خراماں بودہ است

دونوں میں معنوی، جذباتی، استعاراتی، اور صوتی حسن کے لحاظ سے جو واضح فرق موجود ہے وہ ہندی اظہار کی برتری کی روشن مثال ہے۔

اردو شاعری کے حصے میں دو ہجرت یافتہ ترک شاعر آئے خسروؔ اور غالبؔ۔ دونوں فارسی پر اتراتے رہے لیکن ہوا یہ کہ انھیں اردو شاعری سے اور ان سے اردو شاعری کو عزت ملی۔ ★

تسنیم فاروقی

تین گیت

(وزیر اعظم کے بیس نکاتی معاشی پروگرام کے سلسلے میں)

مزدوروں کے لیے نئے منصوبے اور حصہ داری

لکھی ہے تعمیر ہمارے ہاتھوں میں
دیش کی ہے تقدیر ہمارے ہاتھوں میں
ہم مزدور پسینے والے دھوپ ہمیں نہلاتی ہے
محنت کے سائے سائے مٹی سونا بن جاتی ہے
کیاری کیاری کھل اٹھتی ہے ہریالی لہراتی ہے
وقت کی ہے تصویر ہمارے ہاتھوں میں
لکھی ہے تعمیر ہمارے ہاتھوں میں
نئے سویرے کے سورج نے ہم کو یہ پیغام دیا
دیش ہماری پرچھائیں میں جاگا ایسا کام دیا
ہم منصوبوں کے داتا ہیں ہم کو یہ انعام دیا
سب کچھ ہے تحریر ہمارے ہاتھوں میں
لکھی ہے تعمیر ہمارے ہاتھوں میں
پہلے اپنا دن بجا تھا رات پرائی ہوتی تھی
پھر بھی شیا مو چلاتا تھا رادھا بھوکی سوتی تھی
آج وہاں پونم چھلکی ہے کل جو دھرتی روتی تھی
ہے ایسی تاثیر ہمارے ہاتھوں میں
لکھی ہے تعمیر ہمارے ہاتھوں میں

بے زمین اور غریب عوام کو رہائشی آسانیاں

ایسے بھی نردھن تھے یہاں جو مرنے کو جیتے تھے
پانی سے پیاسے رہتے تھے اور آنسو پیتے تھے
رہنے کو دیوار پرائی اور تپنے کو دھوپ
تن کے کپڑے پھٹے پرانے بدلا رویا روپ
اب ان کو گھر بار ملے گا جن پر دکھ بیتے تھے
ایسے بھی نردھن تھے یہاں جو مرنے کو جیتے تھے
جو چہرے کمھلائے ہوئے تھے انشا اب ملیں گے
ان کی غریبی دور ہوئی ہے سکھ کے پھول کھلیں گے
کل تک جو کانٹوں کی مدد سے زخموں کو سیتے تھے
ایسے بھی نردھن تھے یہاں جو مرنے کو جیتے تھے
اپنا اپنا جیون ہوگا اپنا اپنا ٹھکانہ
گیا دور اب زور ظلم کا بدل گیا وہ زمانہ
بھوکے ننگے بھیڑ بنے تھے زر والے چیتے تھے
ایسے بھی نردھن تھے یہاں جو مرنے کو جیتے تھے

برقی ترقیات

مرے دیش کی دھرتی پہ ہے سونے کی بوچھار
گیت اکتا کے گاتے ہیں گھر آنگن دیوار
نگر گاؤں جگمگ جگمگ ہر کھیتوں میں ہریالی ہے
دن میں ہولی کی برکھا ہے رات یہاں دیوالی ہے
کچھ ایسا بجلی نے کیا ہے دھرتی کا سنگار
میرے دیش کی دھرتی پہ ہے سونے کی بوچھار
پلانٹ کلیں پروجیکٹ مشینیں سب کی جان ہے بجلی
جس کے بن جینا مشکل ہے وہ سامان ہے بجلی
بجلی کی طاقت سے جواں ہیں سارے کاروبار
میرے دیش کی دھرتی پہ ہے سونے کی بوچھار
کہیں اجالا کہیں اندھیرا اب وہ دور نہیں ہے
محنت کے ہاتھوں کا مالک کوئی اور نہیں ہے
اپنا آج ہے اپنا کل ہے اپنا ہے سنسار
میرے دیش کی دھرتی پہ ہے سونے کی بوچھار
کہیں اجالا کہیں اندھیرا اب وہ دور نہیں ہے
محنت کے ہاتھوں کا مالک کوئی اور نہیں ہے
اپنا آج ہے اپنا کل ہے اپنا ہے سنسار
میرے دیش کی دھرتی پہ ہے سونے کی بوچھار

عبدالمجیب سہالوی

ہمارا جمہوری نظام

جمہوری نظام ہندستان کے لیے کوئی نیا نظام نہیں۔ آریوں کے آنے کے قبل یہاں کے قدیم باشندے دراوڑوں میں گاؤں پنچایتوں کا رواج تھا۔ یہ پنچایتیں گاؤں کے چنے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ گاؤں کے وہ تمام کام جو گاؤں والوں کے عام مفاد میں ہوتے تھے یہی پنچایتیں انجام دیتی تھیں۔ یہ گاؤں پنچایت کا کام چلانے اور گاؤں سے متعلق دوسرے کاموں کے لیے گاؤں کے لوگوں سے محصول بھی وصول کرتی تھیں۔ شمالی ہند میں جب آریہ آئے تو انھوں نے بھی گاؤں پنچایت کے نظام کو کچھ ترمیم کے ساتھ برقرار رکھا جنوبی ہندستان میں گاؤں پنچایتیں اندرونی طور پر بالکل آزاد ہوتی تھیں، وہاں ۱۸ ویں صدی تک ان پنچایتوں کا رواج رہا۔ یہ مال گذاری وصول کرنے کا بھی کام انجام دیتی تھیں، مال گذاری کی رقم وہ خود مقرر کرتی تھیں اور گاؤں کے رہنے والوں سے وصول کرکے شاہی خزانے میں جمع کردیتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات کا فیصلہ کرنا بھی انھیں کا کام تھا۔ ایسے کام جو کئی گاؤں سے متعلق ہوتے تھے وہ مختلف گاؤں کی پنچایتیں مل کر انجام دیتی تھیں۔

جنوبی ہند میں مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بھی یہ پنچایتیں کسی نہ کسی شکل میں اپنا کام انجام دیتی رہیں۔ انگریزوں کے عہد میں ان کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی۔ انگریزی نظام میں مرکزیت پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور تمام اختیارات گاؤں کے بجائے ضلعوں اور پرگنوں میں مرکوز کردیے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتظام میں عوام کی براہ راست شرکت کم ہوتی چلی گئی اور تمام اختیارات سرکاری ملازمین کے ہاتھوں میں منتقل ہوتے چلے گئے جو گاؤں سے دور ہونے کی بنا پر نہ تو گاؤں کے مسائل اور نہ گاؤں والوں کی دشواریاں اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ مال گذاری کی ادائگی براہ راست ادا کیے جانے کے بجائے حکومت کے ایجنٹوں یعنی زمین داروں اور تعلقہ داروں کے ذریعہ وصول کی جانے لگی۔ حکومت اور کسانوں کے بیچ میں اس درمیانی طبقے کے پیدا ہوجانے سے گاؤں والے لوٹ کھسوٹ کا شکار ہونے لگے۔ کھیت کا مالک کھیت کا جوتنے والا کاشت کار نہ رہا بلکہ یہ درمیانی طبقہ مالک بن بیٹھا۔ وہ جس کو چاہتا زمین کاشت کے لیے دیتا اور جب چاہتا نکال لیتا۔ اس غیر یقینی صورت حال سے کاشت کار زمین کی دیکھ بھال اور اس کی ترقی کے لیے وہ دل چسپی نہ لے سکا جو اسے لینا چاہیے تھا۔ اس کا خراب اثر پیداوار پر پڑنے لگا۔ گاؤں کی معاشی حالت بگڑتی گئی اور چونکہ ہندستان کی تقریباً ۸۰ فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور اس کا ذریعہ معاش بھی زمین اور کھیت ہے اس لیے ملک کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

اس صورت حال کا پورا پورا احساس ہمارے لیڈروں کو تھا چنانچہ گاندھی جی نے ہمیشہ گاؤں اور گاؤں والوں کی طرف توجہ دینے پر زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ملک کی ترقی چند شہروں کی ترقی سے نہیں ہوسکتی اور نہ کچھ اِنے گنے لوگوں کے مال دار ہوجانے سے ملک مال دار ہوسکتا ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں کامیابی کے بعد ہمارے لیڈروں نے جو جمہوری نظام بنانے کا بندوبست کیا اس میں گاؤں اور گاؤں پنچایتوں کو بنیاد بنایا تاکہ پچھڑے اور پس ماندہ عوام کی حالت درست ہوسکے۔

آئین سازی۔ اسی لیے دستور سازی کا اہم کام

ایک ایسے شخص کے سپرد کیا گیا جو ماہر قانون ہونے کے ساتھ
ساتھ پچھڑے ہوئے عوام کے مسائل ان کی دشواریوں اور
معذوریوں سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ اس کا تعلق خود
اسی طبقے سے تھا۔ آزاد ہندستان کے جمہوری نظام کا مسودہ
تیار کرنے کے لیے سات ممبروں پر مشتمل جو سب کمیٹی بنائی
گئی اس کا سربراہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کو مقرر کیا گیا۔ سب
کمیٹی نے کافی غور و خوض، صلاح و مشورہ اور دنیا کے مختلف
ملکوں کے دستوروں کو سامنے رکھ کر آئین کا مسودہ تیار کیا اور
اسے ۲۶ر جنوری ۱۹۴۹ء کو شائع کر دیا۔ اس مسودے کے متعلق
ماہرین قانون نے اپنی رائیں ظاہر کیں ان میں جن خامیوں
کی طرف اشارہ کیا گیا انھیں مسودہ سازوں نے اپنے ذہن میں
رکھا۔ ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد اسے دستور ساز اسمبلی
کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ آزاد ہند کے جمہوری نظام کو
جمہور کے نمائندے ہی آخری شکل دیں۔ دستور ساز اسمبلی
میں مسودہ دستور پر سیر حاصل بحث ہوئی، مختلف پارٹیوں
اور نقطۂ خیال کے نمائندوں نے کھل کر مباحثے میں حصہ لیا۔
آئین سازی کے اہم کام میں دو سال گیارہ ماہ اور اٹھارہ
دن لگے۔ اسے آئین ساز اسمبلی نے ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء میں
منظور کر لیا۔ اس کے بعد ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کا نفاذ
کر دیا گیا۔ آئین میں ۳۹۵ دفعات اور ۸ جدول ہیں۔ یہ
دنیا کا سب سے بڑا اور ضخیم دستور ہے۔ اس کی تیاری پر ۶۳
لاکھ ۹۶ ہزار ۷ سو ۲۹ روپئے خرچ ہوئے۔ اس میں وفاقی
واحد اکائی، پارلیمانی اور صدارتی طرز کے دستوروں کی
اچھی باتوں کی آمیزش کی گئی ہے۔ ہمارے دستور میں اختصار
سے کام نہیں کیا گیا ہے اور ایک بڑے ملک کے حالات کے
پیش نظر اختصار سے کام لیا بھی نہیں جا سکتا تھا جبکہ ملک
میں مختلف مذاہب رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے
لوگ پائے جاتے ہیں، ان سب کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے
جو دستور بنایا گیا تھا وہ ظاہر ہے مختصر نہیں ہو سکتا۔

اس کی خاص چیزیں اس کے رہنما اصول اور بنیادی
حقوق ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک
لچکدار دستور ہے۔ آئین کے ماہرین کے نزدیک اچھا دستور
وہی خیال کیا جاتا ہے جو جامد نہ ہو اور بدلتے ہوئے حالات
کے مطابق عوام کی ضرورتوں، خواہشوں اور امنگوں کو پورا
کر سکے اس معیار پر ہمارا دستور پورا اترتا ہے۔ چنانچہ نئے تقاضوں
کو پورا کرنے کے لیے اب تک اس میں بہت سی ترمیمیں کی جا چکی
ہیں۔ ۴۴ ویں ترمیم ابھی حال ہی میں کی گئی ہے تاکہ سماج
دشمن عناصر کی سرگرمیوں سے موثر طریقہ پر بلا تاخیر نپٹا
جا سکے۔ حقوق کے ساتھ عوام کو ان کے فرائض کی طرف
بھی توجہ دلائی جا سکے اور احساس دلایا جا سکے کہ فرائض
کی ادائیگی ہی سے حقوق سے فائدہ اٹھانے کا جائز استحقاق
پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ آئین میں ترمیم پر ناک بھوں چڑھاتے
ہیں اور اسے آئین کے تقدس کے خلاف خیال کرتے ہیں۔
لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ آئین عوام کے مفاد کے لیے بنایا
جاتا ہے، عوام کو اس کے بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا ہے۔
سماج دشمن عناصر قانون کے زد سے بچنے کے لیے بنیادی حقوق
کی دفعات کا جا و بیجا سہارا لے کر عدالتوں سے حکم امتناعی
حاصل کر لیا کرتے تھے جس کی بنا پر ان کے خلاف فوری اور موثر
کارروائی کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی اس رکاوٹ
کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی
نے آئین میں ۴۴ ویں ترمیم کرنے پر زور دیا تاکہ ایک طرف
سماج دشمن عناصر سے اچھی طرح نپٹا جا سکے دوسری طرف
دبے اور پچھڑے عوام کو ضروری سہولتیں فراہم کرنے کے لیے
تیزی سے اقدامات کیے جا سکیں۔ شروع میں عدلیہ کی جانب سے
آئین میں ترمیم کی مخالفت کی گئی لیکن خوشی کی بات ہے کہ
عدالتوں نے بھی جلد ہی اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ آئین
عوام کے لیے ہے نہ کہ عوام آئین کے لیے۔

بدلتی ہوئی فضا۔ اس سال ۲۸ واں یوم جمہوریہ

خوشگوار بدلی ہوئی فضا میں بنایا جا رہا ہے۔ انتشار اور افراتفری کی فضا ختم ہو گئی ہے۔ لوگ پُرسکون فضا میں تعمیری کاموں کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے، دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات بڑھ رہے ہیں، برآمدات میں حوصلہ افزا ترقی ہو رہی ہے، نظم و ضبط میں چوکسی آ رہی ہے، معاشی جرائم میں خاطر خواہ کمی ہوئی ہے، اسمگلنگ کا قریب قریب خاتمہ کر دیا گیا، ٹیکس چوری کی روک تھام موثر طریقہ پر کی جا رہی ہے، چھپا ہوا کالا دھن برابر برآمد کیا جا رہا ہے۔ صنعتی اور تعلیمی اداروں میں ہڑتالوں اور ہنگاموں کی فضا ختم ہو گئی ہے، امتحانات وقت سے ہو رہے ہیں، اور کام مستعدی سے کیا جا رہا ہے دفتروں میں حاضری اور کارکردگی بڑھی ہے۔ ریلوں کی آمد و رفت میں باقاعدگی پیدا ہو گئی ہے۔ پچھڑے اور دبے ہوئے لوگوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ بیگار کا رواج ختم کر دیا گیا ہے۔ پابند مزدوری کی بھی روک تھام کر دی گئی ہے، غریب لوگوں کو قرضے کے بار سے نجات دلانے کے لیے کارروائی کی گئی ہے، بے کھیت مزدوروں کی حالت درست کرنے کے لیے فاضل اراضی کی صحیح تقسیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ چھوٹا کاروبار کرنے والوں، رکشے والوں اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کو قرض دینے کی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔ اور جگہ جگہ بنک کھولے گئے ہیں۔

اب تک غریب آدمیوں کو انصاف حاصل کرنا اتنا گراں اور مشکل تھا کہ وہ حق پر ہونے کے باوجود اپنا حق حاصل نہ کر پاتے تھے اور مال دار لوگ ان کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر انھیں اپنے جائز حق سے محروم کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ غریبوں کو قانونی امداد فراہم کرنے کی ضرورت کو عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ اب اس کے لیے تیزی کے ساتھ ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ دیہی علاقوں کے عوام کی سہولت کے لیے بعض عدالتوں کو ضلعوں سے تحصیلوں میں منتقل کیا جا رہا ہے تاکہ انصاف حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو زیادہ دور نہ جانا پڑے۔ دیہی علاقوں میں سڑکیں اور پل بنوانے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے تاکہ آنے جانے کی دشواریاں دور ہو جائیں، اسی طرح گاؤں میں بجلی اور پانی کی فراہمی کی طرف پوری توجہ کی جا رہی ہے تاکہ وہ ترقی کر سکیں اور وہاں کے رہنے والوں کا معیار زندگی بلند ہو سکے، ان کے علاج و معالجہ کے لیے ہر پانچ میل کے اندر ایک اسپتال کھولنے کا بندوبست کیا گیا ہے، گشتی اسپتالوں کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے، تعلیم کو عام بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ اسکول دیہی علاقوں میں کھولے جا رہے ہیں۔

ان اقدامات کا خوشگوار اثر ہو رہا ہے۔ معیار زندگی میں تبدیلی آ رہی ہے اور آزادی کے بعد ملک میں ہونے والی ترقی سے اب صرف ایک مخصوص طبقہ ہی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے بلکہ اس کا فائدہ عوام تک پہنچنے لگا ہے ان کے اندر سے احساس کمتری دور ہو رہا ہے وہ اپنے کو برابر کا شہری محسوس کرنے لگے ہیں اور یہی جمہوریت کی صحیح نشانی ہے۔

★

اوم پرکاش بجاج

غزل

کیف جو بے خودی سے ملتا ہے — وہ کہاں آگہی سے ملتا ہے
آ گئے ہو تو دل کی بات کہو — کیا تمھیں بے رخی سے ملتا ہے
یوں ہی جلتے نہیں ہیں پروانے — کچھ تو دل کی لگی سے ملتا ہے
جان و دل تک نثار کرتا ہوں — جب مرا دل کسی سے ملتا ہے
زندگی رنج و غم بھی دیتی ہے — چین بھی زندگی سے ملتا ہے
واہ وا خوب کی صدائیں ہیں — اور کیا شاعری سے ملتا ہے

جانتے ہیں بجاج کو ہمدم
وہ عجب سادگی سے ملتا ہے

متین عمادی

خوشی کا سویرا

(۲۰ نکاتی پروگرام کے سلسلے میں)

خیال و فکر میں چمکی ہے روشنی دیکھو
شعور و ذہن میں جاگی ہے آگہی دیکھو
مٹی ہے آج زمانے سے تیرگی دیکھو
فسردہ ہونٹوں پہ آنے لگی ہنسی دیکھو
جمود اور تعطل کا دور ختم ہوا
بدل رہا ہے پرانے نظام کا ڈھانچہ

نئی بہار کی آمد ہے صحن گلشن میں
نئی کرن کا اجالا ہے سب کے دامن میں
نئی سحر کا تبسم ہے اپنے خرمن میں
نئی خوشی کا سویرا ہے دل کے آنگن میں
نئے ارادوں کی قندیل جگمگاتی ہے
نئے اصول کی تصویر مسکراتی ہے

یہ سب اصول ہیں تعمیر زندگی کے لیے
یہ سب تقاضۂ فطرت ہیں آدمی کے لیے
یہ سب ضروری ہیں انسان میں آگہی کے لیے
یہ سب طریق ہیں ہر فرد کی خوشی کے لیے
کوئی نہ دیکھے کسی کو ذلیل نظروں سے
ذلیل کوئی نہ ہو اب رذیل نظروں سے

نہ کوئی آقا نہ کوئی غلام کہلائے
کسی کی ذات پہ کوئی نہ حرف پہنچائے
کوئی غریب نہ اب بے کسی کا غم کھائے
یہ زر پرستی کا ماحول ختم ہو جائے
کوئی شکار یہاں اب کسی ہوس کا نہ ہو
اجارہ داری کسی کی کسی نفس نہ ہو

اسی خیال کی تائید میں نکتے ہیں
برابری کے مساوات کے یہ تحفے ہیں
مرے سماج میں کمزور جتنے طبقے ہیں
معاشیات میں اپنی جو سب سے پیچھے ہیں
سہارا دے کے انھیں اب ہمیں اٹھانا ہے
اس اونچ نیچ کی دیوار کو گرانا ہے

شکیلہ واحدی

ہمارا وطن

ساری دنیا سے یکتا ہمارا وطن
سربلندی ہمالہ کی سایہ فگن
ذرہ ذرہ ہے اس کا کرن ہی کرن
آبشاروں کا دیکھے کوئی بانکپن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

مخزن حسن فطرت ہے جنت نشاں
گنگا جل میں نہایا ہوا گلستاں
اس کے دامن میں پھولوں کے ہیں کارواں
دیوتاؤں نے چومے ہیں اس کے چرن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

پھول کی داستاں اس کی رعنائیاں
پنکھڑی کی زباں اس کی پرچھائیاں
اس کی ندیوں کا ترنم اس کی انگڑائیاں
دست فطرت نے پہنایا ہے پیرہن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

اس کے سینے میں معدن کے مخزن بھرے
اس کے کھیتوں میں سونے کے خرمن بھرے
اس کے صحرا ہرے اس کے گلشن ہرے
گود میں اس کے گنگ و جمن نغمہ زن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

تاج محل کا اس جہاں میں کہاں ہے بدل
حسن لو اور اجنتا ہے اس کی غزل
کاشی اجمیر متھرا ہیں اس کے کنول
ایک سے بڑھ کے ہیں ایک اس کے رتن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

اس کی دھرتی پہ گوتم نے رکھا قدم
اس کی حرمت کی نانک نے کھائی قسم
یہ بنا مسکن چشتی محترم
اس نے روحانیت کا سکھایا چلن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

اس کے منتک میں تلسی کی پرواز ہے
اس کے نغموں میں ٹیگور کا ساز ہے
اس کی محفل میں غالب کی آواز ہے
اس کی مٹی سے اگتے ہیں فنکار و فن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

کلکتہ اس کی دانش کا گلزار ہے
دلی ماتھے کی بندی کا پندار ہے
بمبئی اس کی پائل کی جھنکار ہے
سر پہ کشمیر کا تاج ہے ضو فگن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

گرجا گھر گردواروں کی عزت یہاں
مسجدوں کی اذانوں کی برکت یہاں
مندروں اور شوالوں کی عظمت یہاں
سب مذاہب کے پیرو یہاں ہیں مگن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

درس انسانیت اس نے جگ کو دیا
جو بھی آیا یہاں اس کو اپنا لیا
زہر کا گھونٹ بھی ان کی خاطر پیا
پھر بھی چھوڑا نہ اپنا کوئی علم و فن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

عید کی بھی مہک اس کی نکہت میں ہے
رنگ ہولی کا بھی اس کی صورت میں ہے
دعوت اتحاد بھی اس کی الفت میں ہے
ہیت اس کے انوکھے ہیں بانکے چلن
یہ نرالا چمن ہے ہمارا وطن

(افسانہ)

ضیاء حسنی

مہارنیا

اسے ٹیپوا کی سادہ لوحی سمجھی جائے یا عجیب سا مذاق تصور کیا جائے کہ وہ اپنی لڑکی کو مہارانی کہنے لگا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ گاؤں کے قدآور لوگ اسے مہارانی کہہ کر خواہ مخواہ اپنے ذہن کو کیوں بوجھل بنائیں گے۔

اور یہی ہوا کہ انھوں نے اسے مہارنیا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے پہلی بار جب اسے دیکھا تو اس کی جوانی کی شام تھی۔ ایک ایسی شام جسے دیکھتے ہی ایک چمکیلی خوش گوار صبح کا تصور جگنو کی طرح نگاہوں کے سامنے چمکنے لگتا۔ وہ جب کبھی ہری ساری میں ملبوس ماتھے پر سرخ بندی لگائے بال سنوارے سامنے سے گزرتی تو دل اس کی طرف کھنچنے لگتا اور اسے قریب سے دیکھنے کو جی چاہتا۔ میرے ذہن میں ایسی بات بار بار ابھرتی اور پھر اس کے کسی گوشے میں دب کر رہ جاتی۔ میں سوچنے لگتا کہ اگر میں بڑھ کر اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کروں گا تو گاؤں کے باسی مجھے نشانہ ملامت بنائیں گے اور میں تو صرف اس کی زندگی کا جائزہ لے کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا کہ جب مہارنیا کے آغاز شباب کی باتیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ چند بے فکر نوجوان آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے میں بھی وہاں جا بیٹھا۔ اس ٹولی میں ایک پچاس سالہ شخص جے سنگھ نامی بیٹھا ہوا تھا اگرچہ اس کی جوانی کا جھٹپٹا تھا لیکن وہ جیسے ہی نوجوانوں کے قریب پہنچتا اس کی بیتی جوانی کی ساری شوخیاں سمٹ کر زبان کی نوک پر آ جاتیں اور وہ حاشیہ لگا کر انھیں خوب بیان کرتا تھا۔ آج بھی اس نے اس امنڈتی ہوئی جوانی کی داستانیں سناتے ہوئے مہارنیا کی بات چھیڑی تو میں نے کان کھڑے کیے۔ وہ کہنے لگا کہ جب مہارنیا کی دل کش جوانی کسی تیز رو ندی کی طرح بہہ رہی تھی تب میں نے ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس میں ہاتھ دھویا تھا اور پھر تو مجھے اس سے ایسا دلی لگاؤ ہو گیا کہ جس دن وہ مجھے نہ ملتی تو میں اس کی تلاش میں اس طرح حیران اور سرگرداں گھوما کرتا تھا کہ ان دنوں میری محبت ضرب المثل بن گئی تھی۔ جب وہ مجھے مل جاتی اور مسکرا کے باتیں کر لیتی تب ہی میرے سینے کی آگ ٹھنڈی ہوتی تھی یہ آگ دہکتی اور بجھتی رہی اور اب اس آگ کی ایک بے جان سی چنگاری دل میں باقی رہ گئی ہے جب وہ کبھی سر ابھارتی ہے تو میں پچھلی باتوں کو دہرا کر اسے ٹھنڈی کر دیتا ہوں۔

غرض مہارنیا نے اس گاؤں میں ٹیپوا کے یہاں جنم لیا تھا جس کے قبضے میں ایک بسوہ زمین بھی نہ تھی۔ ہاں! مہر خاں نے اسے پھوس کی جھونپڑی بنانے کے لیے تھوڑی سی زمین ضرور دیدی تھی اور وہ اس سے اس کا معاوضہ بھی لے لیتا تھا۔ جب وہ دونوں فصلوں میں مال گزاری کی تحصیل کے لیے شہر سے آتا تو اس کی بیوی جھبریا اور لڑکوں کو اس کے یہاں بے گار ضرور کرنی پڑتی تھی۔ گاؤں

میں ایسی بات بھی مشہور تھی کہ مہاریتا، مہر خاں کی بیٹی ہے اس لیے کہ اس کے چہرے کے نقوش مہرالنساء سے ملتے ہیں۔

نیپوا کو جب میں نے دیکھا تو وہ اس وقت کسی طرح پینسٹھ سال سے کم نہ تھا لیکن وہ ہر دن پابندی سے ایک ٹاٹ کا ٹکڑا کاندھے پر ڈالے، ایک ٹینا جھولا ہاتھ میں لیے کھانستا ہوا نہر کی پٹری سے گزرتا ہوا سڑک پر آجاتا اور پیپل کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر راہ گیروں کے جوتے گانٹھتا تھا۔ کبھی کوئی شوقین پالش بھی کرا لیتا۔ ان دنوں عام دنوں میں اسے آٹھ آنے سے زیادہ نہ ملتے ہاں! بازار کے دنوں میں ضرور سوا روپیہ سوا دو روپیہ مل جاتا تھا۔ بازار کی زائد آمدنی ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے نیپوا تن ڈھانکنے کا کام لیتا تھا پھر بھی میں نے اسے اور جھریا کو ہمیشہ میلے کپڑے ہی پہنتے ہوئے دیکھا۔ ان دنوں مہرینا سسرال میں رہتی تھی۔ اس کا بھائی بندا کان پور میں کسی جوتے کے کارخانے میں نوکر تھا جہاں سے اسے چالیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ وہیں اس نے شادی کر لی تھی اور نیپوا کو بالکل بھلا دیا تھا۔ اسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ دوسرا لڑکا کلوا گاؤں کے اوباش لڑکوں کے ساتھ رہ کر بد اطوار ہو گیا تھا۔ وہ کئی بار چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر سلاخوں کے پیچھے جا چکا تھا۔ آخری بار وہ جیل سے چھوٹ کر آیا تو اس نے دوسرے دن ہی کیلاش مہاجن کے یہاں نقب لگائی اور دو ہزار روپے نقد اور کئی سونے کے زیور لے کر غائب ہو گیا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے سڑک پر نیپوا سے جلدی جلدی باتیں کیں اور دوران گفتگو دو سو روپے اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے دو سو روپے کے دونوں نوٹوں کو اس کے منہ مارتے ہوئے کہا۔

"حرامی! تو پیدا ہوتے ہی کاہے مر نہیں گوا؟! اتنے روپے کہاں سے چرا لاوا؟ جب تک تو گاؤں میں رہت ہے ہمو کا تنگ کرت ہے۔"

"نہ پوچھو باپو! یہ کہاں سے ملے؟ بس یوں سمجھو کہ بھگوان نے دیے ہیں۔ انھیں رکھ لو سمے پر کھرچ (خرچ) کرنا۔"

"ابے ہمو کا جوار کی روٹی اور چٹنی ہی بہت ہے تو اپنا رستہ لے۔"

شام کو نیپوا، کلوا کے کرب ناک مستقبل کی پرچھائیاں دیکھتا، ڈرا سہما ہوا مہاجن کے دروازے سے گزرا تو سے وہاں ایک وردی پہنے سپاہی دکھائی دیا۔ وہ آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ کانسٹبل نے غراتے ہوئے کہا۔

"ابے! کلوا کہاں ہے؟ اس نے مہاجن کے یہاں نقب لگائی ہے اور کافی سامان چرا لے گیا ہے۔"

"ہمو کا نہیں پتہ وہ کہاں گوا سرکار!"

کانسٹبل نے اس کے قریب پہنچ کر تڑاتڑ دو ہنٹر جما دیے۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑا اور رو رو کر کہنے لگا۔

"مالک! مورا کوئی دوش نہیں ہے، ہمو کا یہ نہیں پتہ وہ کہاں گوا۔"

تھانیدار نے سپاہی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"بڈھا مر جائے گا۔ اسے کیوں مارتے ہو۔ کلوا سالے کو ڈھونڈو۔"

کلوا ایسا غائب ہوا کہ وہ پھر کبھی گاؤں میں دکھائی نہیں دیا۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں ہے۔ اچھا ہی ہوا، جب تک وہ گاؤں میں رہا نیپوا کو کوئی نہ کوئی دکھ پہنچاتا ہی رہا اور چلتے چلتے بھی نیپوا نے اس کے کارن ایسی مار کھائی کہ وہ دو دن سڑک تک نہیں جا سکا اور اپنی جھونپڑی میں پڑا کراہتا رہا۔ جھریا نے اس کی چوٹ پر ہلدی چونا لگایا اور دھیرے دھیرے بدن دابتی رہی۔ روکھی سوکھی روٹیاں کھلاتی رہی، دلاسا دیتی رہی اور وہ غریب کر ہی کیا سکتی تھی؟ دو دنوں کے بعد وہ بولی۔

"اب گھر میں ایک دانہ نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے سڑک تک چلے جاؤ۔ چار آٹھ آنے مل جئے ہیں کچھ کام چل جائی۔"

پھر وہ اسی طرح دل لگا کر کام کرنے لگا۔ جتنے پیسے ملتے انھیں جھریا کو دیتا وہ اسے بجھرے یا جوار کی روٹی کے ساتھ لہسن مرچ کی چٹنی کھلا دیتی

اور جس دن وہ دال یا آلو کی سبزی بنا دیتی تو وہ کھانے کو اتنا سراہتا کہ جھریا ہنس پڑتی اور اس سے کہتی۔

"تم روکھی سوکھی روٹی اور دال کو ایسی چاہ سے کھاتے ہو جیسے یہ حلوہ پوری ہو۔"

"پگلی! ہم گریبوں (غریبوں) کو یہی مل جائے تو بہت ہے۔"

غرض جب تک جھریا جیتی رہی، بپتوا اپنے اندھیرے جیون میں روشنی کی ایک لو سی لپکتی ہوئی دیکھتا اور ایک دن وہ بھی بجھ گئی۔ گاؤں میں طاعون کی وبا پھیلی۔ لوگ اپنے مکانوں کو چھوڑ کر گاؤں سے دور جھونپڑیوں میں رہنے لگے بپتوا اور جھریا نے اپنی جھونپڑی نہیں چھوڑی۔ طاعون نے پہلے بپتوا کو جکڑ لیا۔ جھریا اس کی سیوا کرتی رہی۔ اس کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا اور وہ "پانی" "پانی" کی صدا لگائے جا رہا تھا۔ کسی نے جھریا سے کہا تھا کہ اسے پانی بالکل نہ دینا اس لیے اس نے پانی چھپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ رات کو کسی وقت اٹھا اور مٹی کے تیل کی آدھی بوتل غٹ غٹ پی گیا اور جو صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو وہ مسکرا رہا تھا لیکن اب جھریا کو بخار آ گیا تھا اور وہ کتھری اوڑھے بے چینی سے کروٹ بدل رہی تھی۔ تھوڑی دیر وہ جھریا کے پاس بیٹھا رہا اور تسلی دیتا رہا پھر اس نے چولہا اٹھایا تو جھریا نے کراہتے ہوئے کہا۔

"آج تم کہیں نہ جاؤ۔ میں بچوں نہیں۔"

اور یہی ہوا کہ اس نے تیسرے پہر آخری ہچکی لی اور بپتوا کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر چل بسی۔ ان دنوں میں الہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ اے فائنل میں تھا۔ پتاجی بھی اسی مرض میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ اس جانکاہ حادثے کی خبر سن کر میں گاؤں آیا تو اپنے گھر کو سوگ میں ڈوبا ہوا پایا۔ دو دن میں گاؤں میں رہا لیکن پتاجی کی یادیں سوئی بن کر میرے ذہن میں رہ رہ کر چبھتی رہیں اور میں گھبرا کر فوراً ہی الہ آباد روانہ ہو گیا۔ سڑک پر آیا تو بپتوا غم و اندوہ کی تصویر بنا ہوا بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اظہار افسوس کیا تو وہ بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا اور مجھے اس کی سسکیوں میں تنہائی کا غم چھپا ہوا دکھائی دیا میں نے اسے مشورہ دیا۔

"مہارنیا کو بلا لو وہ تمہاری سیوا کرے گی۔"

"بابو! لڑکی کا کا بھروسا؟"

اب میں گاؤں آتا تو بپتوا کے یہاں مہارنیا دکھائی دیتی۔ وہ اپنے شوہر رام کرشن کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔ وہ بپتوا کی جگہ کام کرنے لگا اور مہارنیا اپنی ساس کے ساتھ برسوں رہ کر مشاق دایہ بن گئی تھی۔ وہ عورتوں کی بیماریوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور کئی مجرب نسخے اس کی زبان پر رہتے تھے، جنھیں وہ متعدد گھرانوں میں آزما کر اندھیرے میں اجالا کر چکی تھی۔ اس نے گاؤں میں آتے ہی کئی معرکے کے علاج کیے جس سے اس کی شہرت قریبی دیہاتوں میں بھی ہو گئی تھی۔ غرض وہ آ گئی تو بپتوا سکھ کی نیند سونے لگا کبھی وہ مہارنیا کی خدمت گزاری سے متاثر ہو کر اتنا خوش ہوتا کہ کہہ اٹھتا۔

"بٹیا! لڑکے تو مورے کام نہ آئے تو بٹیا ہو کر مو کا اتنا سکھ دے رہی ہے۔"

"بابو! تم کچھ نہ سوچا کرو، تمھیں جیون بھر سکھ نہیں ملا۔ بڑھاپے میں تو تم کا آرام مل جائے یہی میں چاہت ہوں۔"

"بھگوان تو کا سکھی رکھے۔"

بپتوا زیادہ دنوں سائے میں بیٹھ کر آرام نہیں کر سکا، مفلسی نے اس کے جوڑ جوڑ کو ہلا دیا تھا۔ مہارنیا نے شکستہ عمارت کو سنبھالنے کی کافی کوشش کی۔ اس نے ایک بکری پال لی تھی اس کا دودھ پلاتی دونوں وقت شکم سیر رکھتی لیکن وہ عمارت جو بنیاد سے ہل گئی تھی ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے زمین پر آ گری۔ ایک دن بپتوا سو کر اٹھا تو اس کا بدن جل رہا تھا۔ مہارنیا بولی۔

"بابو! تمھیں آج بخار ہے۔"

"کھانا نہ دیو۔ ٹھیک ہو جائی۔"

نہ جانے اس نے کس ساعت سے یہ بات کہی تھی کہ وہ پھر

ایک لقمہ بھی کھا نہیں سکا اُس دن ڈوبتے ڈوبتے اس نے دم توڑ دیا۔ بسنتو کی موت نے مہا رنیا کو بالکل نڈھال کر دیا وہ سوچ کی گہرائی میں ڈوبنے لگی۔

"باپو کے دم سے میں یہاں رہتی ہوں۔ اب مو کا باپ کی چاہت کو دیمک لگ گئی؟ ہو سکتا ہے گاؤں والے مو کا یہاں سے بھگا دیں۔ پھر ان لڑکوں کا کیا ہو گی۔ دونوں لڑکے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ بڑا لڑکا رام داس آٹھویں میں ہے اور چھوٹا کسوری پانچویں میں۔ سرکاری سہایتا سے پڑھتے ہیں۔ سسرال میں ان کی پڑھائی میں رکاوٹ ہو جائی۔"

وہ اسی طرح سوچا کرتی اور فکر مند رہتی تھی اسی دوران میں مجھے سنٹرل سکریٹریٹ سے اپر ڈویژن اسسٹنٹ کا آرڈر مل گیا اور میں اپنے چھوٹے بھائی اُمیش کو گاؤں میں چھوڑ کر دہلی چلا گیا۔ چلتے چلتے میں نے اس سے کہا تھا۔

"پتا جی ہمیں سبکھیے کھیت چھوڑ گئے ہیں، تم کھیتی کرو اور مجھے پردیس جانے دو۔ گاؤں میں دونوں سکھی جیون نہ بتا سکیں گے۔"

میں اُمیش پر تنہائی کا بوجھ ڈال کر دہلی چلا آیا اور دل دہی سے دفتر کے کاموں میں لگ گیا۔ ایک سال گزر گیا میں گاؤں کبھی نہیں گیا۔ اُمیش میری فیملی کو پہنچانے دہلی آیا تو میں نے گاؤں کے سبھی لوگوں کو فرداً فرداً پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔

"سبھی اچھے ہیں کوئی و شیش سماچار نہیں ہے۔"

"مہا رنیا کس حال میں ہے اُمیش!"

"مکھیا نے مہا رنیا کو گاؤں سے نکالنے کی ٹھان لی تھی اور اس کا سامان نکال کر باہر پھینک دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہا رنیا کی جھونپڑی کو گرا کر وہاں اپنے جانور باندھنے لگے لیکن رمضانی اور بھدار کانے اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔"

"دونوں میں انسانیت ہے۔"

"بھدار کا نے کہا "تم مہا رنیا کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ وہ گاؤں کو آنا کھا ہے پھر اس نے یہیں جنم لیا ہے اور

اسے یہاں رہنے کا پورا ادھیکار ہے۔ تم یہ نہیں سوچتے کہ کسی گھر میں لڑکا پیدا ہوا تو کون آڑے وقت کام آئے گا۔"

"یہ سن کر خوشی ہوئی کہ بدوار کا نے مہا رنیا کو سہارا دیا۔"

"مکھیا! اس کا تو پانی بھی بند کر دیا گیا تھا۔ امر ناتھ نے ایک دن اس سے للکارتے ہوئے کہا۔ خبردار! جو اب تم کنوئیں کی جگت پر دکھائی دی۔ پھر وہ دو فرلانگ دور ایک کنوئیں سے پانی لاتی۔ دور سے پانی لانے میں اس کی سانس کی دھونکنی تیز چلنے لگتی۔ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ میں نے اسے اپنی زمین میں کنواں بنوانے کی اجازت دے دی۔"

"اچھا کیا تم نے۔"

اس کے بعد مجھے اپنے گاؤں کا کوئی حال معلوم نہیں ہوا۔ مجھے سفیر کے نجی اسٹاف میں شامل کر کے کابل بھیج دیا گیا۔ میری خواہش بھی تھی کہ میں دنیا کے دوسرے ملکوں کو بھی اپنی نگاہوں سے دیکھوں۔ کابل میں میں دو برس رہا اس کے بعد مجھے تہران، جدّہ اور قاہرہ بھی کئی کئی سال رہنا پڑا۔ اُمیش کو میں برابر خط لکھتا، روپے بھیجتا، لیکن میں گاؤں نہیں گیا حالانکہ میں اکثر خوابوں میں گاؤں کے کھیتوں، کھلیانوں اور دوستوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اسی دوران میں میں ایک بار ہندوستان بھی آیا لیکن تھوڑے دنوں دہلی میں قیام کر کے پھر ملک سے باہر چلا گیا۔

دس برس بیت گئے۔ اب میرا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اپنے گاؤں جاؤں۔ میں دو مہینے کی چھٹی لے کر دہلی آیا اور وہاں دو دن ٹھہر کر اپنے گاؤں پہنچا۔ اب کی گاؤں میں خوش گوار تبدیلی دکھائی دی۔ ایک درجن سے زیادہ ٹیوب ویل چل رہے تھے جن کے سہارے بجلی بھی گاؤں میں پہنچ گئی تھی۔ دس برس اُدھر دن ڈوبتے ہی گاؤں کی گلیاں ویران ہو جاتی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب گئی رات تک قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ کسان بہار مصروف رہتے ہیں۔ کھیتوں کو سیراب کیا جا رہا ہے۔ ٹیوب ویل چل رہے ہیں

اناج کم جا رہا ہے۔ کبھی کبھی کرشن رات میں آتا ہے تو سبھی کام
بات میں ہو گئے ہیں۔ گانوں اور قہقہوں کے ساتھ رات
گزاری جاتی ہے۔ کچے مکانوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ سبھی نے
دھان، سرسوں، سبزیاں اور گنّے بیچ بیچ کر پختہ مکان بنوا لیے ہیں۔
اگلے دن جب میں اپنے کھیتوں پر جانے لگا تو جہاں مہارنیا
کی جھونپڑی تھی وہاں ایک کمرہ اور اس کے آگے برآمدہ بنا
ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اس کے پڑوسی سے پوچھا۔

"یہ کس کا مکان ہے؟"

"مہارنیا کا۔"

میں اس کے یہاں چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ کافی
بوڑھی ہو گئی تھی چہرے پر جھریاں تھیں۔ گردن کی کھال تک
لٹک آئی تھی۔ بال سپید ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"اچھی تو ہو مہارنیا!"

"بھگوان کی دیا ہے بابو!"

اس نے عینک کو آنکھوں پر ٹھیک سے جماتے ہوئے کہا۔

"رام کرشن کہاں ہے؟ لڑکے کیسے ہیں؟"

"وہ گجر گئے۔ رام داس باندہ میں منصف ہے۔ کسوری
گاؤں میں رہت ہے۔ اوکے پاس سات بیگھے جمین
ہے اور دو بھینسیں بھی۔ کھیتن سے اناج مل جات
ہے اور دودھ سے اوپر کا کھرچ چلت ہے۔ یہ کمرہ بنوا لے
ہیں کہ جی ہو گئی ہوں پر رام داس ہر مہینے دو سو روپے
بھیجت ہے جس سے کھرچ پٹ رہا ہے۔"

"اچھا ہوا اب تم آرام سے رہ رہی ہو۔"

"ابھی ایک گھٹنا اور ہو گئی رہے بابو!"

"وہ کیا؟"

"نور خاں نے چھپر اکھاڑ کر موہرے گورو بھگا دیے تھے۔
بھینسیں جنگل کی اور بھاگ گئی رہے دوسرے دن ملی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

میں پردھان کے دوارے جا کر بہت روئی۔ پردھان جی
نور خاں کو بلا کر بہت سمجھائن پر وہ نہیں مانے۔ پردھان
کہن "رپٹ لکھا دو مہارنیا۔"
پھر کسوری رپٹ لکھا آوا۔ دار وگہ جی آئے نور خاں کو کھوب ڈانٹن
نور خاں اسی سمے اپنا سامان اور گورو ہٹا لے گئے۔

"اب چھینا جھپٹی نہیں چل سکتی مہارنیا!"

"پر پہلے ہم جور منئی کو دب جانا پڑت رہے۔"

وہ دن گزر گئے کہ جب کوئی طاقت ور کسی کمزور کو جھنجھوڑ کر
ہنستا تھا۔ قہقہے لگاتا تھا۔ اب وہ دن کبھی نہ آئیں گے
مہارنیا!"

★

اماں کی چھاؤں

تابش کرامی

خوشا نصیب کہ تدبیر کار کی محفل
سجائے جانے کا رنگیں زمانہ آ پہنچا
خوشا نصیب کہ آج اپنے کارناموں کا
زمانے بھر کے لبوں تک فسانہ آ پہنچا

عمل کا جامہ پنہاؤ تم اپنے خوابوں کو
کہ تم پہ آج یہ گاندھی کا دیس ناز کرے
اٹھو کہ صنعت و حرفت کا نام ہو روشن
اٹھو کہ ارضِ وطن تم کو سرفراز کرے

ہر ایک گھر میں یقیں کا چراغ جلنے لگا
خوشی کے گیت ہر اک لب پہ مسکرانے لگا
وطن سے بھوک کی ظلمت کا دور ختم ہوا
اماں کی چھاؤں میں ہر کھیت لہلہانے لگا

تمہیں بھی اہلِ وطن احتیاط کرنا ہے
پلٹ کے آئے دوبارہ نہ "قحط سامانی"
غلط قدم نہ اٹھاؤ کہیں نہ چھن جائے
تمہارے بچوں کے ہونٹوں سے نور افشانی

جبینِ چرخ پہ خورشید و ماہ کی صورت
ستارے کب ہوا کرتے ہیں روشنی کے لیے
مزہ تو جب ہے امیدیں بہار بن جائیں
کھلیں جو پھول چمن زارِ زندگی کے لیے

غزل

سیفؔ بجنوری

اس عمر کو اب نذرِ تجاہل نہ کریں ہم
اے خانہ خرابی! ہوسِ گُل نہ کریں ہم

احساس تو باقی رہے چہرہ بھی کبھی تھا
اب یوں بھی بہت مشقِ تبدّل نہ کریں ہم

محسوس کریں خود کو کہ ہیں ہم بسرو چشم
یہ درد کا صحرا ہے یہاں غل نہ کریں ہم

ہو گی جو ہوا تیز تو اڑ جائیں گی راہیں
راہوں سے گزرنے میں تساہل نہ کریں ہم

وحشت ہو وہی سر میں وہی دل میں تحمّل
دنیا کے شدائد سے تغافل نہ کریں ہم

لگتا ہے کہ بھٹکے ہیں سرِ موجۂ طوفاں
کیوں گھر سے نکلنے میں تامّل نہ کریں ہم

دنیا جسے کہتے ہیں بھیانک ہے ابھی سیفؔ
برباد ابھی شہرِ تخیّل نہ کریں ہم

غزل

جوہرؔ بجنوری

دل جب سے گامزن ہے محبت کی راہ میں
دنیا سمٹ کے آ گئی حدِّ نگاہ میں

اکثر ترے خیال میں محسوس یہ ہوا
بیٹھا ہوا ہوں جیسے تری جلوہ گاہ میں

اب فکرِ دو جہاں نہ غمِ روزگار ہے
کیا کیا سکوں ملا ہے محبت کی راہ میں

جن سے سراغ پائیں گے منزل کا اہلِ دل
ایسے نقوش چھوڑ چلا ہوں میں راہ میں

دو چار گام اور ذرا اے شکستہ پا
منزل نہ چھپ گئی ہو کہیں گردِ راہ میں

جوہرؔ کسی کی یاد سے ہو جس کو واسطہ
وہ دل بہت عزیز ہے میری نگاہ میں

غزل

واحدؔ پریمی

(نذرِ غالبؔ)

جنوں میں ہنس دیے ہیں آپ اپنے چاکِ داماں پر
وہ نازک دور بھی گزرا ہے اربابِ گلستاں پر

بہ فیضِ جذبۂ کاملِ خواہش کے سمندر میں
مری کشتی چلی ہے سوئے ساحل موجِ طوفاں پر

اسیرانِ جنوں اب دیکھئے کیا گل کھلاتے ہیں
کہ ابرِ موسمِ گل چھا رہا ہے آج زنداں پر

دلِ سوزاں کی جو حالت ہے مجھ سے پوچھئے کیا ہو
نگاہیں کیوں نہیں پڑتیں تمھاری شمعِ سوزاں پر

عجب نیرنگیٔ عالم ہے جو کل تک مسلط تھی
وہ ظلمت آج بھی سایہ فگن ہے بزمِ دوراں پر

فضائیں رقص میں ہیں اور ستارے جھوم اٹھے ہیں
ہوا ہے کون یہ نغمہ سرا سازِ رگِ جاں پر

کسک رہتی ہے جس کی زندگی بھر ایک حالت میں
اک ایسی چوٹ بھی لگتی ہے واحدؔ قلبِ انساں پر

منتشر علی صدیقی

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر کا اگست ۱۹۷۶ء کے تیسرے ہفتہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات سے جدید اردو شاعری کی تاریخ کا ایک زریں صفحہ الٹ گیا۔ ان کی عمر تریسٹھ سال کی تھی۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں گوالیار میں ہوئی تھی، جہاں ان کے والد مضطر خیرآبادی ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے جد اعلیٰ مولانا فضل حق خیرآبادی جید عالم اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کا ادبی مذاق رکھتے تھے اور مرزا غالب کے قریبی دوست تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں نے ان کو کالے پانی کی سزا دی تھی۔

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاں نثار اختر علی گڑھ آئے اور وہاں ان کا ساتھ ایسے نوجوان شعرا اور ادبا سے ہوا جو مستقبل میں آسمان ادب کے چاند اور ستارے بننے والے تھے۔ میری مراد حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، معین احسن جذبی، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس اور شاہد لطیف سے ہے۔ اس سلسلے میں ایک نقاد لکھتے ہیں:

"علی گڑھ وہ ایسے وقت میں پہنچے جب وہاں نوجوان باغیوں اور منکروں کی ایک نسل آئین اسٹیلن کے سائنسی نظریات، مارکس کے فلسفے، انقلاب روس کی گونج، اقبال کے آہنگ، جوش کے طنطنے، آزادی ہند کے ولولے، جواہر لال نہرو کی تقریریں، انگریزی کے آزاد پسند رومانوی شعرا کے کلام اور روسی ادب کی حقیقت پسندی کے ملے جلے منظر سے آنکھیں سینک رہی تھی۔ ۱۹۴۰ء تک انھوں نے یہیں گزارے اور یہیں سے زاد سفر لیا۔"

میں نے جولائی ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایم۔ اے (پریوس) میں داخلہ لیا تھا۔ جاں نثار اس وقت اردو میں بی۔ اے (آنرز) کر چکے تھے اور ایم۔ اے فائنل کی تیاری کر رہے تھے۔ ایم۔ اے پریوس اور فائنل کا ایک گھنٹہ مشترک ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کلاس فیلو بھی ہوگئے۔ میں اردو سیمینار لائبریری کا انچارج مقرر کیا گیا۔ اس طرح ایم۔ اے کے دونوں درجات کے طلبہ سے براہ راست رابطہ قائم ہوگیا۔ جاں نثار "تہذیب الاخلاق" اور سرسید پر ایک مقالہ تیار کر رہے تھے اور اس کے لیے سیمینار میں کتابیں دیکھنے اور لینے کے لیے وہ اکثر آتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اپنی تازہ نظمیں سنانے لگے۔ پہلا [illegible] کی نظمیں "بھولا فسانہ"، "برسات"، "بیزاری" اور [illegible] ان سے سیمینار میں ہی سنی تھیں۔ اس زمانہ میں ان کی ایک نظم "گرلس کالج کی لاری" بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ اسی سلسلہ کی ایک دوسری نظم "بے گانے ہو نے لگت" "علی گڑھ میگزین" کے اس سال کے تعطیلات نمبر میں شائع ہوئی اور انھوں نے اس کو بھی مجھے سنایا۔ بہرحال ملاقات یگانگت میں تبدیل ہوگئی اور جاں نثار اختر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۰ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد میں نے بی۔ ٹی میں داخلہ لے لیا۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ اب آفتاب ہوسٹل میں رہنے کے بجائے نصر اللہ ہوسٹل میں رہنے

گا۔ جاں نثار کا قیام زیادہ تر میرس ہوسٹل میں ہوتا تھا۔ اس طرح ملاقات کے اور زیادہ ذرائع فراہم ہوئے۔ لیکن اپریل ۱۹۴۱ء میں بی۔ ٹی کے امتحان سے فارغ ہو کر میں بسلسلۂ ملازمت جھانسی چلا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں ان سے ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات ٹرین میں ہوئی جبکہ وہ شکوہ آباد کے ایک مشاعرے سے واپس آرہے تھے۔ کئی نئی نظموں کے متعلق انھوں نے بلیغ اشارے کیے۔ کچھ سال بعد وہ وکٹوریہ کالج گوالیار میں اردو کے لیکچرار مقرر کر دیے گئے۔ اور میں بھی ترقی پا کر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھانسی میں اردو کا لیکچرار ہو گیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۴۷ء کا سالانہ مشاعرہ جھانسی کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ میرے اصرار پر وہ جھانسی آئے اور مشاعرے میں شرکت کی۔ ان کی نظمیں "کارواں" اور "مسافر" اس مشاعرے میں بہت پسند کی گئیں۔ واپس ہونے کے بعد مجھے گوالیار سے خط لکھا،

پائیگاہ
گوالیار۔ یکم فروری ۱۹۴۷ء

محب مکرم

آپ سے رخصت ہو کر بعافیت گوالیار پہنچا۔ آپ کی میزبانی اور خلوص کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ جھانسی میں بہت اچھا وقت گزرا۔ آپ کا مشاعرے میں انتظام دیکھ کر علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے سیمینار لائبریری کا زمانہ یاد آگیا۔ آپ نے مشاعرے کے پمفلٹ کے لیے تازہ کلام کی فرمائش کی تھی۔ دو نظمیں بھیج رہا ہوں۔ ان میں سے ایک "ویرانہ" قدرے طویل ہے۔

آپ کے خلوص کا ایک مرتبہ پھر شکریہ۔

مخلص

جاں نثار اختر

عرش ملسیانی[2] نائب مدیر "آج کل" دہلی کی فرمائش پر میں نے جاں نثار اختر کی شاعری پر ایک تفصیلی مضمون لکھا جو جولائی ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں ضمناً میرس ہوسٹل میں منعقد ہوئے ایک مشاعرے کا ذکر آگیا تھا۔ جاں نثار اختر نے اس میں اپنی نظم "گرلس کالج کی لاری" پڑھی تھی۔ مضمون کا یہ حصہ ان کو پسند نہ آیا۔ اور انھوں نے بمبئی سے مجھ کو خط لکھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ بھوپال میں حمیدیہ کالج میں کچھ عرصہ کے لیے صدر شعبۂ اردو ہو گئے تھے اور صفیہ اختر بھی اسی کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئی تھیں۔ لیکن جاں نثار ۱۹۵۰ء میں بمبئی چلے گئے۔ یہ خط ۱۹۵۳ء کا ہے:

بمبئی۔ ۸
بائیکلا۔ ۱۴ر اپریل ۵۳ء

محبی

"آج کل" میں تمہارا مضمون دیکھا۔ ابتدائی حصہ پسند نہ آیا۔ میرس ہوسٹل کے مشاعرے کا تم نے INTERPRETATION غلط کیا ہے نظم "گرلس کالج کی لاری" اس سے بہت پہلے ساقی دہلی میں چھپ چکی تھی۔ بہرحال اب اگر نظر ثانی کرو تو اس حصہ کا نکال دینا مناسب ہوگا۔ میں ابھی تک بمبئی میں مکمل طور پر سیٹل (SETTLE) نہیں ہو سکا ہوں۔

امید ہے کہ تم بعافیت ہوگے اور ادبی مشاغل میں منہمک۔

مخلص

جاں نثار اختر

میرا اس دوران میں مرادآباد کا تبادلہ ہو گیا۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو صفیہ کا انتقال ہو گیا۔ جاں نثار نے صفیہ کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "زیر لب" کے نام سے بمبئی سے شائع کیا۔ اسے پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ صفیہ کے خطوط کا پہلا مجموعہ "حرف آشنا" اس سے قبل شائع ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے "زیر لب" کے خطوط پر ایک مضمون لکھا اور اس خیال سے کہ جاں نثار کو پھر کہیں کسی حصہ سے اختلاف نہ ہو، میں نے مضمون کا مسودہ ان کے پاس دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ لیکن وہ بہت مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ مضمون واپس کرتے ہوئے انھوں نے مندرجۂ ذیل خط بھیجا:۔

---

[1] مصنف کی تصنیف "ایک متعلم کی خود گزشت" صفحہ ۱۱۳ تا ۱۱۴ [2] عرش ملسیانی بعد میں "آجکل" کے مدیر بھی ہو گئے تھے۔

21, ARCADIA BLDG,

BYCULLA, BOMBAY. 8 DT. 8-4-55

محبّی، آپ کا خط اور مضمون مجھے مل گیا تھا۔ تاخیر جواب کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ مضمون واپس بھیج رہا ہوں بہرکیف اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہو۔ آپ نے زیادہ تر خطوط کے اقتباسات سے کام لیا ہے۔ مجھے اندیشہ اس کا ضرور تھا کہ کسی واقعہ کا کوئی غلط INTER-PRETATION نہ ہو۔ آپ کے موجودہ مضمون میں اس قسم کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ رہا اس مضمون کے بارے میں جو آپ نے میرے بارے میں لکھا تھا، میں کبھی آپ کو مفصل لکھوں گا "جاودان" ابھی تک شائع نہیں ہوسکی۔ ہمارے کاتب صاحب کو اپنے وطن مالوت گئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا۔ کتاب کے ایک سو بارہ صفحے چھپ کر رکھے ہیں۔ سنا ہے اس ہفتہ تشریف لے آئیں گے۔

آپ کا مزاج کیسا ہے؟ اور کیا عرض کروں۔

مخلص

جاں نثار اختر

نوٹ: ہاں "آج کل" میں غالباً ایک مضمون صفیہ مرحومہ کے بارے میں عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنا مضمون کسی اور رسالہ کو بھیج دیں تو یہ زیادہ اچھا ہوگا۔

چنانچہ میں نے اپنا مضمون رسالہ "کردار" بھوپال کو بھیج دیا جو اس کے قریبی شمارے میں شائع ہوا۔ جاں نثار اختر نے نظم رباعی اور غزل تینوں اصناف میں طبع آزمائی کی اور معیاری نمونے پیش کیے۔ ان کے مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ سلاسل۔ جاوداں۔ گھر آنگن۔ خاکِ دل اور پچھلے پہر۔ پاکٹ بک سیریز میں تارِ گریباں مشہور ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے بھی ان کی نظموں کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔

آخری زمانہ میں ان کا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہوگیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک نقاد لکھتے ہیں:

"جاں نثار اختر کا شعر

شعر و فن کی سجی ہے نئی انجمن
ہم بھی بیٹھے ہیں کچھ نوجوانوں کے بیچ

پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنے ترقی پسند معاصرین سے قطع تعلق کرکے جدید شعرا سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ یہ گمان پچھلے چند سال سے ہونے لگا ہے۔ ان کی نئی غزلیں ("پچھلے پہر" میں شامل غزلیں) اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی ہیں اور محسوس ہو رہا ہے کہ جاں نثار اختر فکری و فنی اعتبار سے ترقی پسندوں کے حلقہ کو توڑ کر زندگی کی کڑی دھوپ میں "ننگے سر ننگے پیر" آنکلے ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ آج بھی عملی سطح پر ترقی پسندوں کے ساتھ ہی دکھائی دیتے ہیں..... باقر مہدی کا خیال ہے "جاں نثار اختر کی انفرادیت نے پہلی بار جنم لیا ہے اور وہ بھی "پچھلے پہر" میں۔ جاں نثار اختر سے پہلے کسی ترقی پسند شاعر نے اتنی بیباکی سے عقائد کی شکستگی کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ باقر مہدی "پچھلے پہر" کو شعری تاریخ میں ایک واقعہ قرار دے کر بطور مثال جاں نثار اختر کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمن اربابِ ہنر لگتی ہے"

نقاد جو چاہیں ان کا جدید ادب میں درجہ متعین کریں، راقم الحروف تو ان کا ایک دوست اور ہم جماعت ہونے کے رشتہ سے ان کا یہ شعر پڑھ کر ان کے لیے دعائے خیر کرتا ہے:

دور بیگانہ کرو ہم سے غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمہیں چاہنے والوں کی طرح

٭ رسالہ "فن اور شخصیت" بمبئی نے ابھی حال میں جاں نثار اختر نمبر شائع کیا تھا لیکن باقر مہدی کا یہ اقتباس ان کے مضمون (رسالہ "اظہار" شمارہ ۱۵) سے ماخوذ ہے۔

رضا امروہوی

شاہکار حیات

مہک رہی ہے فضا، گنگنا رہی ہے بہار
نئی ادا سے شگوفے کھلا رہی ہے بہار

نہ تشنگی ہے نہ چہروں پہ گردِ محرومی
نشاط و رنگ لیے مسکرا رہی ہے بہار

خزاں کا جور و ستم ہے نہ جبر و استبداد
خوشی کے ساز پہ نغمے سنا رہی ہے بہار

نظر نظر میں نئی مشعلیں فروزاں ہیں
قدم قدم نئے دیپک جلا رہی ہے بہار

نئی سحر کے اجالے سلام کہتے ہیں
نئی حیات کا پرچم اڑا رہی ہے بہار

جبینِ وقت پہ ابھرا ہے پھر نیا سورج
بہ تبسمِ گل جگمگا رہی ہے بہار

ہر ایک خانۂ دل میں چراغ روشن ہیں
تجلیوں کے خزانے لٹا رہی ہے بہار

اب اس مقام پہ ہے کاروانِ عزم و عمل
ہر ایک جادے کو منزل بنا رہی ہے بہار

شکست خوردہ اندھیروں پہ خندہ زن ہو کر
بنامِ عید، دیوالی منا رہی ہے بہار

شعور و فکر میں رخشندہ ہے بہارِ حیات
سجا سجا نظر آتا ہے لالہ زارِ حیات

امید و بیم کی جو کشمکش تھی ختم ہوئی
جو کل نہیں تھا مگر آج ہے قرارِ حیات

عجیب رنگ سے موجِ بہار آئی ہے
مہک رہا ہے گلابوں سے خارزارِ حیات

نوید لایا ہے خوشیوں کی کامرانی کی
جدید عصر میں بدلا ہوا شعارِ حیات

کہیں نظر نہیں آتا ہے ظلمتوں کا ہجوم
ضیا فگن ہے زمانہ میں اب وقارِ حیات

بشر کو پھر نئی منزل ملی ہے جینے کی
دلیلِ فکر ہے رضاؔ رنگِ شاہکارِ حیات

ظفر صہبائی

بیس رنگ کی چنری

بیس رنگ کی چنری اوڑھے ناچے بھارت نار
نکھرا نکھرا لاگے اس یووَن روپ سنگھار
شہری بابو گاؤں کے چھیلا سب جتلائیں پریت
اتر دکھن، پورب پچھم سب ہیں اس کے میت
اس کی بولی پیار کی بولی جیون کا سنگیت
اپنوں کو پھولوں سے لاگے بیری کہیں کٹار
بیس رنگ کی چنری اوڑھے ناچے بھارت نار

رنگوں کی چنری لہرائی، رنگ اٹھے متوالے
ساتھ پون کے بالیں جھومیں کھیت بنے ہریالے
گاؤں نے چھوڑا دھول اڑانا گھر گھر ہوئے اجالے
پیچ کے روپ میں یگ یگ دیکھوں سپنوں کا سنسار
بیس رنگ کی چنری اوڑھے ناچے بھارت نار

انساؤں کے رکت سے جن کے چہرے تھے گلال
کاٹ رہی تلوار سمے کی ان کا مایا جال
ایک ہی جیون اب تو جئیں گے راجہ اور کنگال
سب کے آنگن میں آئے گی رنگوں بھری بہار!
بیس رنگ کی چنری اوڑھے ناچے بھارت نار

اپنے بل پر جینے کا احساس جگایا سب میں
کتنا انتر آیا کل کے جیون میں اور اب میں
جینے والے سوچ رہے ہیں ایک نرالے ڈھب میں
گیان کی جیوتی بانٹ رہی ہے سرسوتی ہر دوار
بیس رنگ کی چنری اوڑھے ناچے بھارت نار

وصی سیتاپوری

اندرا ہے اک نشانِ زندگی

اندرا باہوش و باتدبیر ہے
اندرا تنویر ہی تنویر ہے

عزمِ گاندھی حکمتِ آزاد و نہرو
خوابِ نہرو کی یہی تعبیر ہے

کہکشاں سے دستِ قدرت نے لکھا ہے
اندرا وہ سرخروئے تحریر ہے

دل میں مظلوموں کے جو گھٹتی رہی
اندرا اس آہ کی تاثیر ہے

اندرا جمہوریت کی پاسباں
اندرا ہی ملک کی تقدیر ہے

جس میں جکڑے ہیں سبھی چھوٹے بڑے
اندرا وہ پیار کی زنجیر ہے

اندرا ہے بے زبانوں کی زباں
اندرا ہے آنسوؤں کی ترجماں

اس کی نظریں ہیں کہ برقِ بے اماں
اندرا سرمایہ داروں پہ گراں

صبح کے پرنور ماتھے کی دمک
شمع وہ جس سے اندھیرے بدگماں

ڈھل رہا ہے جو تصور میں ابھی
اندرا ہے وہ نیا ہندوستاں

جگمگایا جس نے راہِ انقلاب
اندرا ان جگنوؤں کا کارواں

اندرا کا ہر قدم فکر و عمل
زندگی کی اک مکمل داستاں

اندرا معصوم دل کیفِ سحر
حاصلِ نظارہ فردوسِ نظر

صاف گو بیباک خود دار و نڈر
تیرگی کی سازشوں سے باخبر

اس کا مقصد ہے پیامِ جانفزا
کتنا سادہ کتنا جامع مختصر

منزلیں ہیں جس کے قدموں کا نشاں
کامرانی کامیابی ہمسفر

پتھروں پر آہی جائے گی جلا
ملک ہے آئینہ وہ آئینہ گر

عہد میں حال و مستقبل ترتیب
ہر زمانے کی نظر میں معتبر

اندرا ہے اک نشانِ زندگی

ڈاکٹر محمد کمال الدین

اثر لکھنوی بحیثیت قصیدہ نگار

اثر لکھنوی نے غزل، نظم اور تنقیدی و تحقیقی مضامین کے علاوہ قصیدے بھی لکھے ہیں لیکن ان کے تمام قصیدے ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں سبھی قصائد نعت رسول اور مدح ائمہ میں ہیں اور وہ ائمہ وغیرہ کے یوم پیدائش کے مواقع پر لکھے گئے۔ یہ قصیدے چونکہ صرف ثواب آخرت اور لکھنؤ کی مجالس مقاصدہ کے لیے لکھے گئے اور بعض قصیدے تعمیل فرمائش میں بھی تخلیق کیے گئے اس لیے اثر ان کی طرف خاطر خواہ توجہ مبذول نہ کر سکے۔ مذہبی تقریبات کے موقع پر پڑھے گئے اور پھر تہہ کر کے رکھ دیے گئے۔

اثر کی قادر الکلامی، فنی بصیرت اور علمی وقار کا سکہ جس طرح غزلوں، نظموں اور مضامین کی دنیا میں جاری و ساری ہے اسی طرح وہ قصیدے کے بھی مرد میدان تھے۔ ان میں اعلا درجہ کی قصیدہ گوئی کی صلاحیت تھی ان قصائد کا چرچا صرف اس طرح مجالس تک محدود رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی طبع آزمائی کا میدان بھی دوسری اصناف کو بنایا یہی وجہ ہے کہ اثر کو غزل نگار، نظم نگار اور نقاد کی حیثیت سے تو سبھی جانتے ہیں لیکن ایک قصیدہ نگار کی حیثیت سے چند افراد ہی جانتے ہیں، حالانکہ ان کے عہد میں خود ان کے استاذ عزیز لکھنوی، نظم طباطبائی، اقبال سہیل اور صفی لکھنوی وغیرہ کے قصیدے ادبی بلند قامتی کے ضامن ہیں۔

صنف قصیدہ کے اجزائے ترکیبی میں تشبیب ایک ایسا جزو ہے جس میں قصیدہ نگار مضمون کے سلسلے میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ اس میں رنگا رنگ مضامین پیش کر کے اپنی جولانی طبع اور قادر الکلامی کے جوہر دکھاتا ہے۔

اثر میں نظم نگاری کی شعری استعداد قابل لحاظ تھی مگر وہ اپنی اس صلاحیت کا مظاہرہ قصیدے میں نہیں کر سکے۔ ان کی تشبیبوں میں تنوع نہیں ہے۔ زیادہ تر عشقیہ اور غزلیہ تشبیبیں ہیں۔ کچھ تشبیبوں میں صبح کا سماں اور شام کے مناظر بھی ہیں۔ تنوع کی کمی کی وجہ سے قصیدوں کی قلت ہو سکتی ہے، ان کی غیر مطبوعہ بیاض میں غزلوں کا حصہ زیادہ ہے۔ قصیدے صرف دس ہیں۔ کچھ نعتیہ غزلیں اور قطعات بھی ہیں۔

اثر شاعری میں عزیز کے شاگرد تھے۔ ان کے قصیدوں پر بھی عزیز کے "قصیدۂ غزل طور" کا پرتو ہے۔ لیکن عزیز نے اپنی زور طبیعت اور قادر الکلامی کی بدولت اسے قصیدے کا ایک جزو بنا دیا۔ اثر اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکے۔ ان کی غزلیہ تشبیبوں کے متعلق وہ تمام باتیں صادق آتی ہیں جو ان کی غزل کے متعلق کہی گئی ہیں۔ "اثرستان" کے دیباچے میں ان کے استاد عزیز لکھنوی اس طرح رقمطراز ہیں:

"اثر کی شاعری میں زبان کا عنصر زیادہ ملے گا، مگر تخیل کے ساتھ۔ ... اثر کا کلام حسن و عشق کے جذبات کا آئینہ ہے ابتذال اور سوقیانہ انداز بیان سے پاک و صاف۔ فلسفہ، اخلاق و تصوف و معرفت کی جھلک بھی اکثر میں ہے۔ متانت و سنجیدگی اور سادگی قدم قدم پر نمایاں ہے۔"[1]

فلسفہ، تصوف و معرفت کے اظہار میں انھوں نے علامہ اقبال کی کامیاب پیروی کی ہے پیرایۂ اظہار میں جوش و طنطنہ بھی ہے جو قصیدے کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ قصیدہ در نعت سرور کائنات کی تشبیب کے چند

---

[1] اثرستان (دیباچہ) ص ۱۲

اشعار ملاحظہ ہوں:

رنگِ شکستہ پر نہ جا شور وہ میرے سر میں ہے
قربِ ہزار جبرئیل نالۂ بے اثر میں ہے

حدِ تعینات سے کب کا گذر چکا ہوں میں
اٹھے جدھر بھی اب قدم تیری ہی رہگذر میں ہے

میرے مذاقِ عشق میں ننگ ہے غیر کا خیال
تو ہی مری نظر میں تھا تو ہی میری نظر میں ہے

دولتِ فقر مل گئی دل ہے غنی نگاہ سیر
صولتِ صد سکندری عشق برہنہ سر میں ہے

میرے گدازِ دل میں ہے شعلۂ مہر کا طراز
لعل میں آب و رنگ ہے موج ضیا گہر میں ہے

تیری ہی گرد راہ سے وضع ہوئی ہے کہکشاں
تیرا ہی عکسِ نقشِ پا ناصیۂ سحر میں ہے

سینۂ موج پر حباب ٹوٹتے وقت کہہ گیا
اتنی ہی جلد ہے شکست جتنا غرور سر میں ہے

شورشِ ما ومن سے کیا تجھ کو نجات ہو بھلا
تو تو ابھی گھرا ہوا حلقۂ خیر و شر میں ہے

بندِ خودی کو توڑ کر عشق کو رہ نما بنا
موت میں بھی حیات ہے نفع یہاں ضرر میں ہے

ان کی تشبیبوں میں معرفت و تصوف کے علاوہ حسن و عشق کے کوائف اور بادہ و ساغر کی دلربائیاں بھی ملتی ہیں۔ وہ کہیں عاشق صادق تو کہیں رند بلا نوش بن کر سامنے آتے ہیں اور ہر رنگ میں اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ قصیدہ در مدح امیر المومنین کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ میکش ہوں کروں توصیف گر صہبائے احمر کی
پیامِ دورِ ساغر ہو صدا اللہ اکبر کی

وہ میکش ہوں کہ جس کا ہر نفس پیمانہ مے ہے
وہ میکش ہوں کہ دورہ خون کا گردش ہے ساغر کی

جنونِ عشق ہے اور مرحلہ ہے دشت پیمائی کا
مرا ذوقِ طلب اک سلسلہ ہے نارسائی کا

حریفِ شوخیٔ جلوہ نگاہِ بے محابا تھی
مری آنکھوں میں وہ نقشہ ہے جذبِ نارسائی کا

کاہشِ ہجر رہے اور نہ سودائے وصال
اس قدر درد سے مانوس ہو درماں ہو جائے

میں نے زاہد سے کہا وہ تو سمجھتا ہی نہیں
کفر بھی کفر نہیں ہے اگر ایماں ہو جائے

(قصیدہ در نعت)

ان کی غزلیہ تشبیب کے اشعار غزل کے بہترین شعر ہیں۔ لیکن انھیں قصیدے کا شعر کہنے میں تامل ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی وارداتوں اور عشق حقیقی کی رمز شناسیوں میں معنویت کی گہرائی بااوقات عزیز سے زیادہ اور ناصری سے بہت زیادہ ہے۔

آثر کو اگر غزل نگاری پر قدرت حاصل تھی تو وہ ایک اچھے نظم نگار بھی تھے۔ جدید قصیدے کی تشبیبوں میں نظم نگاری کی صلاحیت بروئے کار لاکر قصیدہ نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے اس صلاحیت سے بڑا فائدہ اٹھایا اور اپنے "قصیدہ جریدہ عبرت" میں قصیدہ کو حالات حاضرہ کی عکاسی کے لیے موثر انداز میں استعمال کیا ہے۔ اے کاش اگر اس ڈگر پر دوسرے شعرا بھی چلتے! قصیدہ در مدح امیر المومنین میں آثر نے صبح کا منظر پیش کر کے اپنی صلاحیت نظم نگاری کا فائدہ اٹھایا ہے مگر امید سے بہت کم۔ صبح و شام کے مناظر میر انیس کے مرثیوں اور عزیز کے قصیدوں میں بھی ملتے ہیں۔ اس تشبیب پر ان دونوں باکمالوں کے اثر پڑے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سحر جب نور بکھراتی ہوئی اٹھتی ہے بستر سے
چمن میں تازگی کی روح چھنکتی ہے نئے تیور سے

نظارے کا جوبن ہو حلقۂ آغوش میں آئے
لدی ہے ڈالی ڈالی اس طرح پھولوں کے زیور سے

کچھ اس انداز سے مسکرائیں منہ بند بھی کلیاں
صدا نکہت ہوئی شرما کے آغوشِ گل تر سے

شعاعِ مہر کی سبزے سے سرگوشی غنیمت تھی
مگر یہ تو ستم ہے اڑ گئی شبنم کے ساغر سے

صباح عید کی رنگینیوں کی عکاسی قصیدے کا دلچسپ موضوع رہی ہے. سیدے کی صبح اپنے دامن میں رنگا رنگ خوشیاں سمیٹ لاتی ہے۔ اس لیے .اس کے بعد میخواروں کو شراب و شاہد کی کھلی آزادی مل جاتی ہے۔ ذوق کا وہ نصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرہ عام
حلال دختر رز بے نکاح روزہ حرام

یں بھی نہ تو دہلی کی عید کی منظر کشی ہے اور نہ خود ذوق کی عید کی ہی بلکہ س میں شراب و شاہد کی عکاسی ہے۔ اگر اسی کو مولانا اسماعیل میرٹھی وضوع بناتے تو وہ ارضیت کی خوشبو سے معطر کر دیتے جیسا انہوں نے "عید شب برات" میں کہا ہے۔ اثر کے بھی ایک قصیدہ در مدح امام زمانہ کی تشبیب میں روایتی انداز کی ہی صبح عید نمودار ہوتی ہے البتہ بعض پیکر تراشیاں جدت بداماں ہیں۔ چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوجیے:

صباح عید ہے اتنا دلوں میں جوش و سرور
کہ جس کو دیکھیے وہ بے پیے نشے میں چور
خیال مست، نگہ مست، دیدہ و دل مست
حواس و ہوش ہیں مدہوش عقل میں ہے فتور
ہجوم شوق میں آتی ہے کھچ کے سینے سے
بجائے موج نفس موج بادۂ انگور
سواد دیدۂ بینا ہے نقش حیرانی
خلل پذیر ہوا ہے دماغ اہل شعور
زمیں پہ بکھری ہیں یوں نسترن کی پنکھڑیاں
کہ جیسے جام کسی مست کا ہو چکنا چور
نسیم بھر گئی کچھ ایسے کان پھولوں کے
جھکا جو غنچہ گلے ملنے کہہ دیا بس دور
بہک کے نشہ میں زاہد شمار کرتا ہے
بجائے دانۂ تسبیح دانۂ انگور

تشبیب میں اثر نے تشبیہات و استعارات کے ساتھ شوکت الفاظ و معنی جو قصیدے کا فرسودہ اور روایتی اسلوب تھا اس کو مد نظر رکھا ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔ وہ جو منظر پیش کرتے ہیں اس میں صفائی اور خوش گواری ہوتی ہے اور حتی الوسع جدت و ندرت کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ وہ خواہ عشقیہ اشعار کہیں یا بہاریہ اور رندانہ، رکاکت و ابتذال کے قریب بھی نہیں جاتے۔ ان کی زبان میں نرمی اور لہجہ میں لوچ ہے۔ غزل میں انھوں نے میر کا انداز بیان اپنایا۔ اس کا اثر ان کے قصیدوں پر بھی پڑا ہے۔ غزل میں وہ میر کی شان تو پیدا نہیں کر سکے مگر قصیدے بلا شبہ میر سے زیادہ شگفتہ اور بامزہ ہیں۔ میر کے قصیدوں جیسی گھٹی گھٹی فضا نہیں ہے۔ انھوں نے قصائد کو لفظی طومار سے بھی بچایا۔

اثر کے زمانے میں سامع کو اتنا موقع کہاں نصیب تھا کہ وہ لمبی تشبیبوں اور طویل گریزوں کو انگیز کر سکتے۔ غالباً اسی وجہ سے گریز کے میدان میں اثر نے اپنے استاد عزیز لکھنوی کی پیروی کی ہے۔ اس کے علاوہ اثر کے لیے طویل گریزوں کا نباہنا آسان نہ تھا۔ صرف ایک قصیدہ در مدح حضرت علیؓ کی گریز میں انھوں نے مکالمہ کا اہتمام کیا ہے۔ اس میں ایک آئینہ پیکر سے باتیں ہوتی ہیں۔ ترکی بہ ترکی سوال و جواب ہوتے ہیں۔ بات چیت میں نیاز و ناز اور شوخی و شگفتگی نے قدرے دل کشی پیدا کر دی ہے ورنہ اس قسم کی گریزیں سکۂ رائج الوقت کا درجہ رکھتی تھیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے سر سودازدہ کو ذوق سجدہ ہے
کہا، کچھ ہوش ہے؟ تیری جبیں اور خاک اس در کی
کہا میں نے مجھے کیوں لطف سے محروم رکھا جائے
کہا، میں کیا کروں برگشتگی تیرے مقدر کی
کہا میں نے کوئی درد محبت کا بھی درماں ہے
کہا خود درد درماں ہے، قسم ہو تیرے ہی سر کی
کہا میں نے تری دیوار کا دم کار تکیہ ہے
کہا یہ بھی ہوش ہوگی جگہ کچھ بھی ہے بستر کی
کہا میں نے کہ تیرا نام کیا ہے اے مہ خوبی؟
کہا اے بے خبر تمثال تیرے حُبّ حیدرؓ کی

بیسویں صدی کے قصائد میں اکثر تشبیب سے زیادہ مدح کے اشعار ہوتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ثواب حاصل کرنے کے مواقع مدح میں زیادہ ہیں۔ لیکن اثر کے قصیدوں میں مدح

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

آفتابِ نو

خالد شفائی

کبھی دل شکن ہیں نالے، کبھی دل نشیں ترانہ
یہی میری زندگی ہے، یہی ہے مرا فسانہ

مرے ہر نفس میں مضمر، ہے حیاتِ جاودانہ
میں ہوں رازدارِ فطرت، مرا ذوق فاتحانہ

مری جرأتوں کے آگے، بھلا بحر و بر یہ کیا ہیں؟
مرے حوصلوں سے لرزاں، ہے غرورِ قیصرانہ

مجھے کیا ڈرا سکے گی، یہ رکاوٹوں کی آندھی!
رہِ غم میں بڑھ رہا ہوں، بہ نگاہِ کامرانہ

یہاں سیکڑوں ہیں موسیٰ، اسے توڑ دیں گے بڑھ کر
یہاں چل سکے گا ہرگز نہ طلسمِ ساحرانہ

چلو ساتھیو چمن میں، نئے عزم زندگی سے
نہ ہو برق کے جو بس کا، وہ بنائیں آشیانہ

گیا دور تیرگی کا، نیا آفتاب نکلا
چلو مل کے گائیں خالدؔ طرب آفریں ترانہ

غزل

اقبال ماہر

نغمۂ مطرب سے ہے معمور ایوانِ طرب
محفلوں میں ہیں بہم سب ساز و سامانِ طرب

اہلِ دل کو مل رہی ہے ہر طرف دادِ وفا
آج پورے ہو رہے ہیں عہد و پیمانِ طرب

لالہ و گل کے لبوں پر گنگناتی ہے بہار
جھومتے ہیں صحنِ گلشن میں نہالانِ طرب

کشت زاروں میں نظر آنے لگا جوشِ نمو
ٹوٹ کر برسا ہے اب کے ابرِ بارانِ طرب

سبزہ زاروں کو ملی ہے ایک تازہ زندگی
وادی و صحرا میں بھی جاری ہو فیضانِ طرب

آشیاں پر اب نہیں ہے یورشِ برقِ تپاں
خطرۂ صیاد سے باہر ہیں مرغانِ طرب

کون کر سکتا ہے اب تفریقِ شیخ و برہمن
جمع ہیں بزمِ محبت میں رفیقانِ طرب

ہر مریضِ وہم کو ملتا ہے پیغامِ شفا
ہے مسیحِ وقت کے ہاتھوں میں درمانِ طرب

کارگاہِ زندگی ہے جنتِ اہلِ ہنر
فن کدے میں ہیں مہیا ساز و سامانِ طرب

لفظ و معنی سے بنا کر اک سراپائے جمال
دے دیا ماہرؔ غزل کو ہم نے عنوانِ طرب

مصطفیٰ فطرتی

سرنگوں پرچمِ کردار کو کر جاتی ہے
خواہشِ نفس اگر حد سے گزر جاتی ہے

لاکھ تاریک سہی بطنِ صدف کا ماحول
سچے موتی کی کہیں آب اتر جاتی ہے

اس طرح چھلکے ہوئے ہیں ترے جلوے ہر سو
چاندنی چاند کی جس طرح بکھر جاتی ہے

پاسِ احساسِ تقرب کی قسم کھاتا ہوں
فطرتاً اپنے کی اپنے پہ نظر جاتی ہے

جس کی نظروں میں ہر اک لمحۂ ہستی ہو عظیم
زندگی بس اسی انساں کی سنور جاتی ہے

صرف دنیا میں وہ ہے غنچہ و گل کی دنیا
اوس پڑنے پہ جو کچھ اور نکھر جاتی ہے

جس قدر اچھی بری سے میں رہا کرتا ہوں دور
اس قدر آن گری میرے ہی سر جاتی ہے

صرف انسان کا انسان روادار نہیں
زندگی پھولوں کی کانٹوں میں گزر جاتی ہے

دیکھتا کوئی نہیں اپنا گریباں فطرتیؔ
میرے دامن پہ مگر سب کی نظر جاتی ہے

احمد جمال پاشا

آخری اسمگلر سے ملاقات

جب وزیر اعظم اور محبوب رہنما مسز اندرا گاندھی کا بیس نکاتی معاشی پروگرام بجلی بن کر اسمگلروں پر گرا تو بڑے بڑے اسمگلر خاک ہو گئے۔

اس عام پکڑ دھکڑ میں پیارے اسمگلروں کی بے پناہ دولت، اُن کے الف لیلوی محلات، اُن کی عیاشیوں اور نقشے بازیوں پر سے ایک ایک کر کے پردے اٹھنے شروع ہو گئے، جنھیں سُن سُن کر اور پڑھ پڑھ کر نہ مجھے کسی اسمگلر کو دیکھنے بلکہ اُسے ملنے کا شوق چرایا۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں اسمگلر کو کم از کم پانچ گز کے فاصلہ پر ضرور دیکھ لوں۔

اپنی اس خواہش کا دبے دبے میں نے اظہار اپنے بوجھ بجھکڑ دوست ڈاکٹر ہرلِش سے کیا۔

یوں تو ہرلِش بہت اچھا دوست اور سیدھا سادہ آدمی تھا مگر شومیٔ تقدیر ڈاکٹر ہونے کے بعد وہ کچھ آرٹا ترچھا رہنے لگا تھا۔ ہر چیز اور ہر بات میں وہ دخل دیتا تھا۔ جس چیز کے بارے میں جتنا کم جانتا اتنا زیادہ بتاتا۔ چنانچہ حال یہ تھا کہ موضوع تھا "کشمیری سیب کی صنعت اور غیر ملکی زرِمبادلہ کی بحث" اور وہ دھواں دھار بولے: "شال کی صنعت میں کشمیر کا حصّہ" پر۔ چنانچہ پورے موضوع میں صرف "کشمیر" ایک ایسا لفظ تھا جس کو بے تعلق نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ چونکہ سننے والے ماہرین سب غیر ملکی تھے اور آپ خالص پنجابی میں تقریر فرما رہے تھے اس لیے جیسے ہی کشمیر کا لفظ آتا زور زور سے تالیاں بجتیں۔ ترجمان بے چارہ بے حد سہما ہوا تھا اس لیے وہ جب ان کا مطلب سمجھاتا تو پھر "شال" کو "سیب" میں تبدیل کر دیتا اور اپنی طرف سے پتے کی باتوں کا اضافہ کر دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پھر زوردار تالیاں بجتیں مگر بس ڈاکٹر ہرلِش میں ایک خوبی تھی وہ یہ کہ برابر بولتے چلے جاتے تھے۔ اور اگر ڈھیل چھوڑ دی جاتی تو گھنٹوں چلاتے رہتے۔

چنانچہ ہم سیدھے ڈاکٹر ہرلِش کے پاس پہنچے۔ وہ چائے کی پیالی تیار کر چکے تھے جو ہم نے انتہائی بے تکلفی سے اٹھائی وہ ہمارا منہ دیکھ رہے تھے اور ہم ان کی چائے پی رہے تھے۔ چائے کو اپنے نام رجسٹرڈ کر کے یعنی جھوٹا کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئے اور بہت ہی آزمایا ہوا حربہ استعمال کیا یعنی بجائے ہرلِش "ڈاکٹر صاحب کہا" جس سے وہ گل گل ہو گئے۔ اور ہم پر نے قربان ہوتے ہوئے بولے "فرمایئے؟" ہم نے کہا بات در اصل یہ ہے کہ ہم اسمگلر دیکھنا چاہتے ہیں۔ "ڈاکٹر ہرلِش" نے بہت تعجب سے کہا "مگر تم کسی اسمگلر سے مل کیسے سکتے ہو؟ سب تو اندر ہیں۔" ہم نے کہا تب تو اور بھی آسانی سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ انھوں نے پوچھا وہ کیسے؟ ہم نے کہا ڈاکٹر تم چلو نے تو اور ہم تم دونوں ایک ساتھ "زو چلیں" زو یعنی زندہ عجائب گھر۔ ہرلِش نے کہا "مگر یہ جانور عجائب گھر میں نہیں پایا جاتا۔" ہم نے کہا ابھی تک کوئی ایسا جانور دریافت نہیں ہو سکا ہے جو عجائب گھر میں نہ مل جائے۔ ڈاکٹر تو لا تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ ہم نے کہا اچھا کرتے ہیں

ڈاکٹر بولا دیکھو ایک بات اچھی طرح سمجھ لو اسمگلر کو عجائب گھر نہیں جیل میں بند کیا جاتا ہے۔ ہم نے کہا چلیے مان لیا" تو چلیے جیل کی سیر کر آئیں۔" ڈاکٹر نے بُرا مان کر گھوڑے کی طرح بھڑکتے ہوئے کہا جیل جائیں آپ کے دشمن۔ ہم نے الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا ہم کچھ نہیں جانتے تم ہم کو فوراً کسی اسمگلر سے ملا دو ورنہ ......

ہرِیش نے جلدی سے پوچھا "ورنہ ؟ ہم نے کہا ورنہ یہ کہ ہم خود ہی ڈھونڈھنے نکل پڑیں گے۔ ہرِیش نے اپنا ٹائم ٹیبل دیکھتے ہوئے کہا کل صبح آپ آجایئے پھر ہم دونوں کسی اسمگلر کی تلاش میں نکلیں گے۔ ہم نے کہا منظور۔ اور واپس آئے دوسرے دن تڑکے نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر تیار تھا۔ اس نے موٹر نکالی اور ہم چل پڑے۔

سب سے پہلے ایک کسٹم افسر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ اپنا پُرانا یار نکل آیا۔ اس نے بڑی حیرت سے اسمگلر سے ملنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے بات بتاتے ہوئے کہا:" دراصل ہم اسمگلروں کے سماجی پس منظر اور ان کی اجتماعی نفسیات کا خصوصی مطالعہ کر رہے ہیں اس سلسلے میں کتابوں میں بہت پڑھا ہے اب کم از کم ایک آدھ اسمگلر سے انٹرویو بھی ضروری ہے۔" اس نے بہت مایوسی کے ساتھ کہا:" دراصل سارے اسمگلر ہم پکڑ کر بند کر چکے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو جیل میں اجازت حاصل کرنی ہوگی۔" کسٹم افسر سے مایوس ہو کر ہم آگے بڑھے۔ ایک ایکسائز افسر کے بنگلے پر جا دھمکے۔ ہم تو اسے نہ جانتے تھے مگر وہ اتفاق سے ڈاکٹر کا شاگرد نکلا۔ اس نے لپک کر ڈاکٹر کے پاؤں چھو لیے۔ ڈنڈوت کرنے کے بعد اپنے گرو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ہم نے اس سے بھی وہی سب باتیں دہرائیں اس نے انتہائی مایوسی سے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:" ایسی قسمت کہاں کہ اب کہیں کوئی اسمگلر مل جائے ملے بھی کہاں سے جتنے تھے سب تو پکڑے جا چکے ہیں اگر اسمگلر کی بو بھی پالیں تو اسے پکڑ کر اپنی ترقی نہ کرالیں۔"

وہاں سے ہم لوگ بہت مایوس ہو کر آگے بڑھے۔ اتنے میں ایک سی۔ بی۔ آئی کا افسر یاد آیا۔ کبھی ہم دونوں ایک ساتھ تیرا کرتے تھے۔ ہم نے کہا" ہرِیشو! چلو سی بی آئی والے سوہن کے پاس چلو۔" ہرِیشو اچھل پڑے۔ بھنّائے" بڑی دور دور کی کوڑیاں لا رہے ہو، سوہن تو بالکل حلوہ سوہن ہے ذرا میں پگھل جائے گا۔"

سوہن بجھ بجھ گیا۔ وہ ہماری بھابی سے ہمیں ملانے کے لیے بے تاب تھا اور ہم اسمگلر سے ملنے کے لیے۔ اس کو بھی سب وہی باتیں بتائی گئیں۔ وہ ایک ہندستان کا نقشہ میز پر سجا کر بولا دیکھو ملک بھر کے اسمگلر ان ان جیلوں میں بند ہیں اور اگر کسی جیل میں آپ کسی اسمگلر سے ملے بھی تو ہمارے آدمی آپ کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔" ہم نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا:" یاد رکھو سوہن ہم بلا اسمگلر سے ملے گھر واپس نہیں ہو سکتے ہیں۔"

اچانک سوہن خود بخود اچھل پڑا اور بولا:" ویری گڈ" آپ آخری اسمگلر سے مل سکتے ہیں۔ وہ آپ نے مترے روڈ کراسنگ کے پاس پیٹرول پمپ دیکھا ہے اس کے سامنے جو کالی کوٹھی ہے اس میں آخری اسمگلر ہے آپ مل سکتے ہیں مگر اس شرط پر کہ آپ واپسی میں کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے اور اگر اسمگلنگ کے بارے میں وہ کچھ بھی بتائے تو آپ مجھے بتا دیں گے۔ دیکھیے یہ جیبی ٹیپ ریکارڈ ہے اس کا مائک اپنے سوئٹر میں فٹ کرکے اس کی ڈبیا جیب میں ڈال لیجیے جب اس سے بات چیت کیجیے گا تو اسے زور سے دبا دیجیے گا۔ بات چیت ختم ہونے پر پھر زور سے دبا دیجیے یہ بند ہو جائے گا۔ میرا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے اصل بات معلوم ہو جائے گی۔"

ہم بہت شکریہ ادا کرکے مترے روڈ کراسنگ پیٹرول پمپ کے سامنے والی کالی کوٹھی پر پہنچے اور لازم ہے کہ

کہ "حاجی صاحب سے ملنے آئے ہیں"۔ تھوڑی دیر میں ہم اندر بلا لیے گئے۔ ایک بے حد نورانی قبر رسیدہ بزرگ ہمارے سامنے تھے ہم نے پوچھا "معاف کیجیے گا آپ آخری اسمگلر ہیں"؟ بزرگ بولے "بندۂ گنہگار کو حاجی کنستر والا، ڈھکن والا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پیشہ اسمگلنگ ترک کر چکا ہوں اور آخری اسمگلر اس اعتبار سے ضرور ہوں کہ سب سے آخر میں پکڑا گیا تھا۔" اس کے بعد انھوں نے نہایت اطمینان سے پوچھا کہ "معاشی جرائم کی خفیہ کے کس شعبہ سے آپ دونوں افسروں کا تعلق ہے"؟ ہم نے بڑے رعب سے جواب دیا "یہ باتیں بتانے کی نہیں ہوا کرتیں"۔ ہم نے پوچھا "آپ چھوڑ کیسے گئے؟ یا باہر کیسے ہیں"؟ انھوں نے کہا "نہ چھوڑا گیا ہوں نہ باہر ہوں، جوان بیٹی کی موت پر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر پیرول پر ہوں"۔ ہم نے کہا "دیکھنے میں تو آپ کہیں سے بھی اسمگلر نہیں معلوم ہوتے؟" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

"بس یہی پہچان اسمگلر کی ہے"۔ ہم نے کہا "پھر پتہ کیسے لگتا ہے"؟ وہ دوسری ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے: "پتہ تو سات پردوں میں لگا لیتے ہیں"۔ ہم نے پوچھا "اب آپ پرانا دھندا کب چالو کرنے جا رہے ہیں"؟ وہ بولے: "دھندے کا سوال ہی نہیں، ہم پھر کچھ دن میں جیل میں ہوں گے"۔

ہم سوہن کے پاس خوش خوش لوٹے اور کہا: "واقعی یہ اسمگلر بڑے خطرناک ہوتے ہیں، ان کو جیلوں میں بند رکھنے سے ملک اور قوم کی دوسری کوئی بڑی خدمت ممکن نہیں ہے۔"

★

اثر لکھنوی بحیثیت قصیدہ نگار —— (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

کے حصے تشبیب سے زیادہ نہیں ہیں۔ صرف ایک قصیدہ در نعت خطابیہ ہے۔ ان کی مدحوں میں مبالغہ آرائی، تصنع و تکلف اور دور از کار تشبیہات و استعارات کا جال نہیں ہوتا بلکہ بڑی سادگی اور صفائی سے ممدوح کے اوصاف اور کارناموں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ممدوح کی جلالت و عظمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عقیدت و محبت کے اظہار میں والہانہ پن ہے۔ لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ حفظ مراتب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ تلمیحات پر بہت زور نہیں دیتے۔ عزیز کی طرح قرآن وحدیث کے ٹکڑوں کا استعمال نہیں کرتے اور نہ ان کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ وہ عربی اقوال اور ضرب الامثال بھی نہیں پیش کرتے۔ وہ ممدوح کے آفاقی اوصاف کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ عزیز اور ناصری وغیرہ کی طرح نعت رسول میں بھی مدح ائمہ کو غلط ملط نہیں کرتے۔ بیان ولادت جو اثر کے زمانے میں خوب رائج تھا، ان کے یہاں نہیں ہے۔ ان کی مدحوں میں اثر بھی ہے اور جاذبیت بھی۔

اثر نے بعض مترنم اور رواں بحروں کا انتخاب کر کے قصیدہ نگاری کو نغمگی اور لے بخشی۔ جیسے:

رنگ شکستہ پر نہ جا شور رہ وہ میرے سر میں ہے
قرب ہزار جبرئیل نالۂ بے اثر میں ہے

سحر جب نور بکھراتی ہوئی اٹھتی ہے بستر سے
چمن میں تازگی کی روح پھنکتی ہے نئے سر سے

اک لغزش مستانہ کونین کو حاصل ہو
اے ذوق جبیں سائی وہ سجدۂ مستانہ

اثر کے قصیدے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان و بیان کی چاشنی اور تصوف کی جلوہ آرائی کے علاوہ شگفتگی اور ایزاد لطف ہے۔ انھیں پڑھ کر اکتاہٹ اور کوفت نہیں ہوتی۔ البتہ بعض جگہ ان کا خالص غزلیہ انداز بیان اور بے حد سادگی قصیدے کے فن کو مجروح کرتی ہے۔ وہ اپنے معاصروں میں قصیدہ گوئی کی قابل لحاظ استعداد کے مالک تھے مگر انھوں نے اس طرف خاطر خواہ توجہ صرف نہیں کی۔

★

جزّار چھولسی

جہیز کی لعنت

شعلوں کا گلستاں ہے نمائش جہیز کی
رسوائیٔ حیات ہے خواہش جہیز کی
ادبارِ مستقل بھی ہے لعنت کا طوق بھی
یہ کثرتِ جہیز نمائش جہیز کی
ہر شخص ہوشیار رہے باخبر رہے
اب سر اٹھانے پائے نہ شورش جہیز کی
لوگوں پہ اب تو رکھنی پڑے گی کڑی نگاہ
کرنے نہ پائے کوئی گزارش جہیز کی
اس سوزِ مستقل کو مٹانا ہے دوستو!
ہو خواہشِ جہیز نہ کوشش جہیز کی
بربادیاں کہیں ہیں تو رسوائیاں کہیں
کیا گل کھلا رہی ہے گزارش جہیز کی
ہو بیٹیوں کا بیاہ بڑی سادگی کے ساتھ
ہونے نہ پائے اب کوئی سازش جہیز کی
اس کو معاشرہ ہی سے باہر نکال دو
لے آئے جو زباں پہ ستائش جہیز کی
لعنت کا طوق بن گئی ہے کثرتِ جہیز
طرفہ ستم ہے اس پہ نمائش جہیز کی
مجبورِ خودکشی ہیں ہزاروں جوانیاں
کیا خوب قوم پر ہے نوازش جہیز کی
طوفان بن کے سینکڑوں گھر کر دیے تباہ
کب تک رہے گی ملک میں بارش جہیز کی
خوددار زندگی کا تقاضا تو ہے یہی
ہرگز نہ ہونے پائے ستائش جہیز کی

خوابِ جہیز دیکھنا جزّارؔ چھوڑ دو
رسوائیٔ حیات ہے خواہش جہیز کی

م۔ح۔ شاہین ڈمراوی

غزل

گلستاں میں چہک رہی ہے رات
لمحہ لمحہ مہک رہی ہے رات

یہ نزاکت یہ شوخیاں یہ ادا
شاخِ گل سی لچک رہی ہے رات

پھیلی ہر سمت پیار کی خوشبو
رفتہ رفتہ مہک رہی ہے رات

مے کشو! آؤ پی لو جی بھر کے
مے کدے میں چھلک رہی ہے رات

ہر طرف رنگ و نور کی بارش
اپنی زلفیں جھٹک رہی ہے رات

پھول ٹوٹے بکھر گئیں کلیاں
چپکے چپکے سسک رہی ہے رات

سو گیا چاند کھو گئے تارے
تیرگی میں بھٹک رہی ہے رات

شعلہ بن کر دلوں میں اے شاہینؔ
جانے کب سے بھڑک رہی ہے رات

اشرف مالوی

بہار آئی

چمن میں بیں نکاتی بہار آئی ہے
گلوں نے آج متاعِ حیات پائی ہے

ہے پیداوار کی نکہت کسی کے دامن میں
ہے اتحاد کی دولت کسی کے دامن میں
بسی ہے فکر کی ندرت کسی کے دامن میں
سماج واد کی عظمت کسی کے دامن میں

مہک رہی ہے فضا زیست مسکرائی ہے
چمن میں بیں نکاتی بہار آئی ہے

بدل رہا ہے نظامِ حیاتِ انسانی
نہ آج بھوک ہے رقصاں نہ ذکرِ عریانی
سبھی کے رخ پہ نظر آ رہی ہے تابانی
چلی ہے جب سے وطن میں ہوائے ارزانی

کھلے ہیں دل کے کنول روح مسکرائی ہے
چمن میں بیں نکاتی بہار آئی ہے

جو مضطرب تھے میسر ہے ان کو کیف دوام
ہوا کے دوش پہ آئے مسرتوں کے پیام
ہر ایک ہاتھ میں شیشہ ہر ایک ہاتھ میں جام
بدل گیا ہے کچھ اس طرح میکدے کا نظام

بہ فیضِ ساقی گھٹا میکدے پہ چھائی ہے
چمن میں بیں نکاتی بہار آئی ہے

خزاں کے نقشِ قدم مٹ رہے ہیں گلشن سے
چھلک رہی ہے نشاطِ حیات دامن سے
نفس نفس ہوئے آزاد آج بندھن سے
برس رہی ہے نئی فکر ابرِ ساون سے

اٹھاؤ جام گھٹاؤں نے مے لنڈھائی ہے
چمن میں بیں نکاتی بہار آئی ہے

مرزا احسن ناصر

شہزادیِ چرخ زُہرہ

ایک عظیم الشان بردار خلائی طیارہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو پہلی بار وینس یا زہرہ کی سطح پر کامیابی کے ساتھ آہستہ سے اترا اور اس پردہ نشین سیارے کی سطح کی نایاب تصاویر بہ ذریعے ٹیلی ویژن اور اس کے متعلق کئی اہم اطلاعات بذریعے سگنل فراہم کیں۔ یہ طیارہ سوویت روس کا "وینس نمبر ۹" تھا جو ۸ جون ۱۹۷۵ء کو زہرہ کی جانب چھوڑا گیا تھا اور ۱۳۶ دن کی لمبی پرواز کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ در اصل یہ دو حصوں سے مل کر بنا تھا۔ ان میں سے ایک حصہ طیارے سے جدا ہو کر خود کار پیرا شوٹ نظام کے ذریعے سطح زہرہ پر اترنے لگا اور اس درمیان اس نے سیارے کے کرۂ باد و گھنگھور گھٹاؤں کے بارے میں نہایت اہم سگنل بھیجے۔ سطح پر آہستہ سے اترنے کے بعد بھی وہ ۵۳ منٹ تک وہاں کی زمین کی تصاویر اور اس کی بناوٹ کے متعلق سنسنی خیز خبریں ارسال کرتا رہا جس کے بعد شاید شدید گرمی اور دباؤ کے باعث اس کے آلات نے کام کرنا بند کر دیا۔ طیارے کا دوسرا حصہ سیارے کا مصنوعی چاند اول بن کر اس سے لگ بھگ ڈیڑھ ہزار کلو میٹر کی بلندی پر گردش کرتے ہوئے تقریباً دو دن میں ایک چکر مکمل کر رہا ہے۔ اس نے بھی سیارے کے بادلوں کے بارے میں اہم معلومات دستیاب کرائی ہیں۔

روس کا ہی ایک دوسرا خلائی جہاز "وینس نمبر ۱۰" بھی جو پہلے جہاز کے چھ روز بعد داغا گیا تھا، ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو زہرہ پر پہنچا۔ اس کا بھی ایک حصہ جدا ہو کر سطح پر آہستہ سے اترا اور اترتے ہوئے ۷۲ منٹ تک سیارے کے بادلوں سے متعلق اور پھر اس کے بعد سطح پر اترنے کے ۶۵ منٹ بعد تک سطح سے متعلق اہم اطلاعات و تصاویر فراہم کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کے آلات بھی بیکار ہو گئے۔ دوسرا حصہ سیارے کے دوسرے مصنوعی چاند کے روپ میں گردش کر رہا ہے۔

مذکورہ بالا خلائی طیاروں کے ذریعے فراہم کی گئی تصاویر و دیگر اطلاعات سے بادلوں کے کشادہ پردے میں پوشیدہ اس پردہ نشین سیارے کے کئی اسرار افشا ہونے کی توقع ہے۔ مثلاً ابھی تک ماہرین فلکیات کا یہ نظریہ تھا کہ زہرہ کی سطح ریتیلی ہونی چاہئے لیکن ان طیاروں نے اس نظریہ کو بدلنے پر مجبور کر دیا ہے، کیونکہ سطح زہرہ کی تصاویر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ دراصل چٹانی ہے۔ پتھریلے ریگستان کے مانند۔

ان دونوں طیاروں سے قبل بھی روس کے آٹھ "وینس" یا "وینیرا" اور امریکا کے ۳ "میرینر" نامی طیارے زہرہ کی سمت بھیجے جا چکے تھے۔ مگر کوئی بھی سطح کی تصاویر ارسال نہ کر سکا تھا۔ امریکا کے یہ تینوں خلائی طیارے دور سے ہی محض سیارے کے بادلوں کے فوٹو لے سکے تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحقیقات میں روس آگے نکل گیا ہے۔

حسن و عشق کی دیوی کے نام سے موسوم زہرہ سیارہ حقیقتاً شہزادیِ چرخ کہلائے جانے کا پوری طرح سے مستحق ہے۔ ازل سے ہی یہ حسین و جمیل و دلکش سیارہ انسانی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے

یہ منور ترین سیارہ ہے اور ماہ و شمس کے سوا دیگر تمام اجرام فلکی اس کے سامنے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ جب یہ اپنے پورے شباب پر ہوتا ہے تو دن میں بھی چشم عریاں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ دیکھنے والے کو کرۂ فلک میں اس کی جگہ کے بارے میں صحیح معلومات ہوں۔

آفتاب سے دوری کے لحاظ سے ہمارے نظام شمسی کا یہ دوسرا سیارہ ہے اور آفتاب سے تقریباً ۱۰۸ ملین کلو میٹر کے اوسط فاصلے پر ۳۵ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اس کی گردش کرتے ہوئے ۲۲۵ دن میں ایک چکر پورا کرتا ہے۔ جسامت میں یہ زمین[1] سے کچھ ہی چھوٹا ہے۔ اس کا اوسط قطر ۱۲۱۷۵ کلو میٹر ہے۔ کمیت اور کثافت (DENSITY) میں بھی یہ زمین سے کچھ کم ہی ہے۔ کمیت زمین کا ۰.۸۲ گنا اور کثافت آب کی ۵.۲ گنا ہے۔ اسی یکسانیت کی بنا پر زہرہ اور زمین کو کبھی کبھی جڑواں بہنیں بھی کہتے ہیں۔

مدار زہرہ آفتاب اور مدار ارض کے بیچ میں اور تقریباً اسی سطح میں واقع ہے۔ جس کے باعث ہمیں وہ آفتاب کے مشرق اور مغرب میں دولن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا کرنے میں وہ کبھی شام کو سورج غروب ہونے کے بعد اور کبھی علی الصباح نظر آتا ہے۔ اسی لیے یہ ستارۂ شام اور ستارۂ صبح کے ناموں سے بھی اکثر پکارا جاتا ہے۔ (حالانکہ یہ ستارہ نہیں ہے) دوربین سے یہ ہم کو چاند کی طرح گھٹتا بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور تب اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

زمین سے زہرہ کا فاصلہ ۴۱ اور ۲۵۸ ملین کلو میٹر کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کی ظاہری جسامت بھی بدلتی رہتی ہے یعنی وہ کبھی چھوٹا اور کبھی بڑا دکھائی پڑتا ہے۔

زہرہ کا کرۂ باد ہمیشہ ابر آلود رہتا ہے جو کہ غازات و گرد سے بنے ہوئے ہیں اور سطح سے لگ بھگ ۳۰ کلو میٹر کی بلندی تک چھائے رہتے ہیں، حالانکہ اس کا کرۂ باد سیکڑوں کلو میٹر کی اونچائی تک پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا ان کی سطح کو ان بادلوں کی وجہ سے زہرہ سے آسمان اور ستارے وغیرہ کبھی نظر نہ آئیں گے۔ آفتاب کی ہلکی روشنی سطح تک پہونچتی ہے۔ اور اس لیے وہاں دن رات ہوتے ہوں گے، مگر دن ہمارے کسی گھنگھور ابر آلود دن کے مانند اور رات بھیانک روپ سے تاریک ہوتی ہوگی۔ انہی بادلوں کی بدولت زہرہ ہمیں اس قدر روشن نظر آتا ہے۔

ان بادلوں پر کسی قسم کے مستقل نشان یا دھاریاں نہ ہونے کے سبب سے ابھی تک یہ صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ زہرہ اپنے محور پر کتنے عرصے میں چکر لگاتا ہے۔ ابھی تک خلائی طیاروں کے ذریعے جو تحقیق ہوئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شاید یہ عرصہ ۲۴۳ دن کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر ہیئت دانوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے محور پر یا تو لگ بھگ ایک ماہ میں اور یا ۲۲۵ دن میں ایک مرتبہ گھوم لیتا ہے۔ اب وینس ۹ اور ۱۰ اس پہلو پر نئی روشنی ڈالیں گے ایسی توقع ہے۔

زہرہ کے کرۂ باد کا دباؤ زمین کے مقابلے میں تقریباً ایک سو گنا زائد ہے۔ اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تکثر ہے۔ اور آب کی بھاپ اور آکسیجن نام کو ہی ہے۔ اس کی سطح کا درجۂ حرارت پانچ سو ڈگری سنٹی گریڈ کے آس پاس رہتا ہے۔ ایسے حالات اور فضا میں وہاں پر کسی نوع کی زندگی جیسا کہ ہم اس کے بارے میں جانتے ہیں توقع نہیں کی جاتی۔

جسامت، کثافت، کمیت، حجم اور قوت کشش میں بڑی مناسبت ہونے کے باوجود بھی زہرہ اور زمین کے کرۂ باد اور سطحوں کی کیفیات میں اتنا زائد فرق کیوں ہے؟ دراصل اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ زہرہ زمین کے مقابلے میں آفتاب سے ۳۰ فی صدی نزدیک واقع ہے جس کے سبب سے اس کا درجۂ حرارت اتنا

---

[1] زمین کا قطر ۱۲۷۴۲ کلو میٹر اور اوسط کثافت پانی کی ۵.۵۲ گنی ہے۔

زیادہ ہے جبکہ زیادہ تمازت آفتاب سے شاید زہرہ کی چٹانوں کے کاربونیٹس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس جدا ہو کر وہاں کے کرۂ باد میں جمع ہوتی گئی۔

کاربن ڈائی آکسائیڈ آلود کرۂ باد کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ آفتاب کی تمازت کی شعاعوں کو سطح تک تو آسانی پہونچ جانے دیتا ہے لیکن ان کے اور دیگر لمبی شعاعوں کے پھر خلا میں واپس بھاگنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں سطح کا درجۂ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے۔ سائنسی زبان میں اسے "گرین ہاؤس افیکٹ" کہتے ہیں۔ زہرہ کے معاملے میں یہ بات پوری طرح لاگو ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قدر شدید گرم ہے کہ بدقسمتی سے اگر زمین زہرہ کی جگہ واقع ہوتی ہو تو غالباً وہ بھی زہرہ کے مثل ہی شدید گرم، ابر آلود اور تمام اقسام کی زندگی سے محروم ہوتی۔

زہرہ کا کوئی قدرتی چاند نہیں ہے لیکن جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے اب اس کے گرد مختلف محوروں میں دو مصنوعی چاند چھوڑے جا چکے ہیں۔ سوویت روس کے ذریعے چھوڑے گئے، یہ چاند بے جان ہوتے ہوئے بھی بذات خود اچھے سائنس داں ہیں جو سیارے کے متعلق بیش قیمت و اہم اطلاعات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ کتنے راز ہائے زہرہ عیاں ہوتے ہیں۔؟

★

وجیہہ الدین خادم متین

وطن (سانیٹ)

وطن کی فضاؤں میں ہے نور و نکہت
چمکتے جہاں رات دن مہر و اختر
ہوائیں جہاں کی گلوں سے معطر
ہمارا وطن کیوں نہ ہو رشکِ جنت
ہمارے وطن کے حسیں پاک طینت
شرافت میں ان کا نہیں کوئی ہم سر
وفاؤں میں ان سے نہیں کوئی بڑھ کر
محبت کی کرتے ہیں وہ قدر و عزت
سدا اس زمیں پہ ہے علم و حکمت
نہ ہوں کس لیے یہ تصوف کے خوگر
کہ ہوں گے یہی رہنما خضر بن کر
انھیں سے ملے گی جہاں کو مسرت
ہمارا ہو جو ہر محبت وطن کی
کہ جیسے ہو بلبل کو الفت چمن کی

انتقام الحسنین منتقم

اندرا گاندھی

گاندھی کا روپ نہرو کی صورت ہے اندرا
عورت ہے اور مردِ سیاست ہے اندرا
ہم کیا کہیں جو وقت کی لہریں پکار اٹھیں
ہندوستاں کو تیری ضرورت ہے اندرا
بھارت کی ڈوبتی ہوئی نبضیں ابھار دیں
جو کچھ ہے آج تیری بدولت ہے اندرا
بکھرے گا کل جو رنگ وہ مدِ نظر ہے آج
دنیا کو تیری عقل پہ حیرت ہے اندرا
جو کہہ دیا زباں سے عمل بھی وہی کیا
وعدوں میں بھی تو رنگِ صداقت ہے اندرا
بھارت رتن خطاب جواہر کی لاڈلی
سب کچھ خدا کی دی ہوئی عزت ہے اندرا
تاریخ میں مثال یہ پہلی ہے منتقم
رہبر جسے چنا ہے وہ عورت ہے اندرا

فرحت امیر

غزل

دل کی راہوں میں بھی دنیا کے طلبگار ملے
صبح کے رنگ میں بھی شام کے آثار ملے

جانے کیا حال ہوا اب رسمِ جنوں کا یارو
دشتِ دل میں ہمیں دیوانے بھی ہشیار ملے

سربلندی کوئی دیکھے تیرے دیوانے کی
تیرے کوچہ سے جو نکلے تو سرِ دار ملے

ایسی مستی ہو عطا پائے جنوں کو یارب
مسکراتے ہوئے ہر دم رہِ دشوار ملے

یوں سما جا کہ نظر خود ہی نظارہ بن جائے
میری نظروں کو جو دیکھے ترا دیدار ملے

اظہر علی فاروقی

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور ضلع ہردوئی

سیاسی تنظیم۔ اس وقت ضلع ہردوئی تو آئین اودھ کے نظم ونسق کے مطابق دو سرکاروں (صوبوں) پر منقسم تھا (۱) سرکار لکھنؤ، اودھ کے ۵۵ محالوں میں سے ضلع ہردوئی کے حسب ذیل محال اس سرکار میں شامل تھے جو ادنیٰ تغیر کے ساتھ آئین اکبری کے نظم سے مطابقت رکھتے ہیں (۱) سندیلہ (۲) کچھونا (۳) ملانواں (۴) گونڈوا اور (۵) بلگرام (۲) سرکار خیرآباد جس میں یہ محال شامل تھے (۱) گوپامئو بشمولیت مہولی ضلع سیتاپور (۲) باون (۳) ساندی (۴) پالی (۵) پہانی بینڈرہ محال یہ ایک وسیع محال تھا جس میں ضلع کا شمالی مغربی حصہ اور ضلع کھیری کا جنوبی مشرقی حصہ بھی شامل تھا۔

پس منظر۔ کپتان سلی من (SLEE MAN) نے ۱۸۴۹ء میں جب اس ضلع کا دورہ کیا تو انھوں نے ٹور ان اودھ جلد ۲ صفحہ ۱ پر یہاں کے جاگیرداروں کے بارے میں تفصیلی طور پر اس طرح لکھا ہے کہ "اس وقت ضلع کے تعلق دار اس درجہ بارعب اور طاقت ور تھے کہ انگریز افسر اُن کی اراضی کی پیمائش یا آمدنی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کرتے تھے محض اس خیال سے کہ وہ کھلم کھلا باغیانہ اقدام نہ کر بیٹھیں کچھ اور نہ سہی صرف بدامنی نہ پھیلادیں اور لوٹ کھسوٹ شروع ہوجائے"

فیض آباد اور لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہ انگریزوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کر رہے تھے کچھ تو ان کے اثرات سے اور کچھ اپنے ذاتی جذبات کی بنا پر پہراون کے بَیس، ٹھاکر، اٹوا اور ریروا کے نکمبھ ٹھاکر، رودا منو کے رائے کوآر راجپوت مجاہدانہ جذبات رکھتے تھے۔ برطانوی نظم ونسق کے خلاف کارروائیاں کرنے میں ان سب کا بڑا اتفاق تھا۔ اس جذبے کا پہلا مظاہرہ یہ ہوا کہ ان جاگیرداروں نے یا تو مال گزاری دینا بند کر دیا یا اپنے علاقے کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم دینے لگے۔ اس مسئلے میں ان کی ایک لیگ سی بن چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی رسالے اس درجہ کمزوری دکھاتے تھے کہ ان جاگیرداروں کی اشیاء کی درآمد و برآمد کی نقل وحرکت پر باربرداری کا روپیہ بھی نہ وصول کر پاتے اور نہ کوئی مزاحمت کرتے تھے۔

پہلی مزاحمت اور شکست۔ ان میں خصوصیت سے اٹوا کا جاگیردار بھگونت سنگھ پیش پیش رہا ہے جس نے گوپامئو کے قریب موضع اہروری کو اپنا فوجی مرکز بنا رکھا تھا۔ جب ۱۸۴۱ء میں کپتان ہولنگ HOLLING نے دوسری بٹالین کی اودھ لوکل انفنٹری کی تین کمپنیوں کے ساتھ حملہ کیا تو اس بری طرح شکست ہوئی کہ جان بچانا دوبھر ہوگیا۔ اور اسی سال قصبہ پہانی کے پچھم طرف کپتان موصوف سے ایک جھڑپ ہوئی اور نتیجہ وہی رہا۔ بردن۔ سوائچ پور کے سوم ونشی راجپوت اور رنجیت سنگھ کٹیار نے بھی اس قسم کا اقدام کیا۔ دھرم پور میں کٹیار راجپوتوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا جس کی حفاظت کے لیے، توپیں اور ایک مسلح فوج رہتی تھی۔ نوابی فوج نے ۱۸۴۷ء میں شکست دے کر گنگا پار بھگا دیا تھا لیکن فتح گڑھ کے حکیم مہدی علی خاں کی مدد سے پھر کٹیاری ریاست پر قبضہ ہوگیا۔ یہ ضلع برطانوی سامراج کے خلاف ہمیشہ پیش قدمی کرتا رہا یہاں تک کہ ایک بار ریزیڈنٹ کا کیمپ بھی لوٹ لیا گیا۔

الحاق۔ یہ حالت دیکھ کر فروری ۱۸۵۶ء میں اس کا الحاق ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں کر لیا گیا اور ہردوئی ایک مستقل ضلع بنا لیا گیا جو پہلے محض ایک پرگنہ تھا اور جس کا تعلق ضلع رائے بریلی سے تھا، اگرچہ اس کا صدر مقام ملانواں قرار دیا گیا جہاں ایک فوجی رسالہ بھی رہنے لگا، جو سیتاپور رجمنٹ سے وابستہ تھا۔ پہلے ڈپٹی کمشنر مسٹر ڈبلیو سی

لہ ٹور ان اودھ جلد ۲ صفحہ ۱۵-۲۲

(CAPPER) ہوئے وہ از سر نو اس کی سیاسی تنظیم کر رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی وجود میں آئی۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ اگرچہ اس کے آثار ۱۷۰۲ء سے تحریک ولی اللٰہی اور شاہ عبدالعزیز کے زمانے سے پیدا ہو چکے تھے اور مولانا شاہ احمد اللہ فیض آبادی سے لکھنؤ ۱۹ فروری ۱۸۵۷ء اور وہاں سے ان کے ہمراہ ملیح آباد، ۲ مئی ۱۸۵۷ء کو پہنچ چکے تھے۔ ہمارے ضلع میں ملیح آباد کے اثر سے پہلی نشانی سندیلہ میں نمودار ہوئی۔ سر ہنری لارنس نے کپتان گلڈ ویسین فوجی پولیس سپرنٹنڈنٹ کو ان مقامات پر امن قائم رکھنے کے لیے روانہ کیا ان کے ساتھ پولیس کے ڈلری کا ایک رسالہ اور ا دھ دار رگولر ان فینٹری لمز، کی ایک کمپنی تھی۔ اس وقت کپتان ہوچنسن (HUTCHINSON) کو حکم ہوا کہ وہ ۴۸ ویں لوکل ان فنیٹری اور ۷ ویں کے ڈلری کے چار سو سپاہی ساتھ لے کر شمال مغرب کی طرف کوچ کریں۔ پہلی جون ۱۸۵۷ء کو یہ فوجی رسالہ سندیلہ پہنچا۔ جہاں معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں خلفشار پیدا ہو گیا ہے۔ ملیٹری سکریٹری کپتان ہوچنسن نے اپنے فوجیوں کی تنخواہیں خزانے سے برآمد کیں۔ ۲ جون ۱۸۵۷ء کو ڈپٹی کمشنر ملانواں نے اطلاع بھیجی کہ باغی (مجاہدین آزادی) مادھو گنج آ گئے ہیں چنانچہ کپتان موصوف نے حسب الحکم شمال مغرب کی طرف کوچ کرنے کے بجائے ملانواں کی طرف مارچ کیا، جہاں خزانے کی حفاظت کے لیے سیتاپور کی ۴۱ ویں لوکل ان فنیٹری کی ایک کمپنی تعینات تھی۔ ادھر یہ خبر آئی کہ لکھنؤ ریزیڈنسی کے مورچے میں بہت سے افسر اور جوان مارے گئے، صرف لفٹیننٹ ٹولاش (TULLOCH) اور ڈاکٹر ڈربی (DARBY) ۲۰ سکھ جوان میجر میری کاٹ (MARRICOT) ۸ جون کو ملانواں پہنچ سکے۔ یہاں کی حالت بہت خراب تھی کچہری نذر آتش ہو چکی تھی۔ خزانہ لٹ چکا تھا اور فوجی رسالہ برائے نام رہ گیا تھا۔ اس لیے مجبور ہو کر موہان کے راستے سے پھر لکھنؤ واپس آ گئے اور لفٹیننٹ انگلیس (INGLIS) سے ملے جو وہاں خزانے کی حفاظتی کمپنی کے کمانڈر تھے۔ ملانواں میں جو کچھ غارت گری ہوئی وہ راجا رونیا، رودامئو کے رائے کو آر ٹھاکروں، بردن اور مادھو گنج کے معافی دار جاگیرداروں سے سخت ڈبھیٹر کا نتیجہ تھی۔ یہ حالت سن کر پورے ضلع میں بدامنی پھیل گئی۔ قریب قریب سبھی تعلقدار ضلع کی آزاد فوج (انگریزوں کی اصطلاح میں باغی) کے ساتھ ہو گئے یہاں تک کہ سندیلہ کے تعلقدار چودھری حشمت علی بھی آزاد فوجیوں کے ساتھ ہو گئے اگرچہ ان کا رسالہ سر کولن کیمپ بل (COLIN CAMPBELL) کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا کر پسپا ہوا۔

ضلع کے شمالی مغربی حصے پر مولانا احمد اللہ شاہ (مولوی فیض آبادی) کے پے در پے حملے ہوتے رہے انھوں نے محمدی کو اپنا صدر مقام بنا لیا اور وہاں سے شاہ جہاں پور، میران پور کٹرا، فرخ آباد اور ہردوئی فوجی رسالے بھیجتے رہے، رونیا کے راجا ان کے ساتھ رہے۔

سانڈی پر قبضہ۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۸ء کو لفٹیننٹ کلارک کمشنر فتح گڑھ سکریٹری چیف کمشنر اودھ کو اس کی اطلاع اس طرح دیتے ہیں۔

"میں نے سانڈی پر مولوی فیض آبادی کے قبضے کی خبر بذریعہ تار کل دے دی ہے۔ آج ڈائری بھیجی جا رہی ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا

لہ مآثر دلاوری پروفیسر محمد ابراحسین فاروقی صفحہ ۱۹۲

"کہ غالباً نرپت سنگھ روئیا اس کے ساتھ شریک ہوگیا ہے اور وہ ساںڈی میں نہ صرف لوگوں کو بھرتی کرا رہا ہے بلکہ بردن کے سورج بنشی راجپوت باستثنا رام دھن سنگھ باغی فوجوں میں شریک ہو گئے ہیں"[1]

اور غالباً اسی قسم کی جھڑپوں کو روکنے کے لیے زوال لکھنؤ کے بعد جنرل وال پول (WAL POLE) کو یہ حکم ہوا تھا کہ دریں اثنا پور کنڑ اجنرل پینی (PENNY) کی دو آبہ فوج اور جنرل سیٹن (SEATON) کی فوج سے فتح گڑھ میں ملیں اور وہاں سے براہ بھوج پور اگھاٹ روہیل کھنڈ کا رُخ کریں اور گھاٹ پر باغیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہیں اور مقابلے کے لیے فوج تیار رکھیں چنانچہ وہ مندرجہ ذیل عسکری دستوں کے ساتھ ۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو روانہ ہوئے۔

میجر ٹومب کی رائل ہارس آرٹیلری ریمنگٹن کی بیٹری کی ۲۳ ویں کمپنی رائل انجینئر بڑی میدانی بیٹری بنگالی کان کن ۹ ویں لین سر، دوسری پنجاب کیولری ۴۲ ویں، ۷۹ ویں، ۹۳ ویں، ہائی لینڈر اور چوتھی پنجاب رائفل۔ دوسرے ہفتے کے کوچ کرنے تک ۱۵ اپریل کی صبح کو وہ روئیا کے قلعے پر پہنچے مجاہدین آزادی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مشرق کی طرف ۴۲ ویں ہائی لینڈر کمپنی اور مغرب کی طرف چوتھی پنجاب سکھ رائفل کمپنی کے چھکے چھڑا دیے اور بہت نقصان پہنچایا۔ آنریبل بریگیڈیئر آرڈین ہوپ (ARDAIN HOPE) سامنے آتے ہی گولی کا نشانہ بن گئے۔ پانچ افسر اور تیئیس دوسرے انگریز مقتول ہوئے۔ دو افسر اور باون دوسرے انگریز زخمی ہوئے مقتولین رودامئو میں دفن کیے گئے بریگیڈیئر ہوپ، لفٹیننٹ ڈگلس، جیننگس بر آم لی لفٹیننٹ ہرنگٹن بھی مارے گئے مگر ان کے نام کتبے پر نہیں ہیں۔[2]

سرسا پر برطانوی قبضہ ۔ ۱۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو دال پول نے کوچ کیا اور رام گنگا کے کنارے آباد سرسا پر قبضہ کر لیا۔ تین سو مجاہدین آزادی مارے گئے۔ وہاں سے شاہ جہاں پور پہنچ کر سر کولن کیمپ بل کی کمپنی کے ساتھ ۲۷ اپریل کو گڑی اور اللہ گنج پہنچ کر جنرل پینی کی فوجی کمک ساتھ لی۔ مگر پورا ضلع جوش آزادی سے بھڑک اٹھا تھا اور جگہ جگہ پر مجاہدین آزادی کام کر رہے تھے۔

پالی پر حملے ۔ اس کا ذکر اس طرح ملتا ہے۔

" مولوی کے سواروں نے بل بھدر سنگھ کی ناک کاٹ لی اور آس پاس کے زمینداروں کو طلب کیا، سورج بنشی راجپوت قبیلے کے سردار کیول سنگھ کو حکم دیا کہ وہ ساںڈی اور نکٹورا سے انگریزی حکومت کے تھانے داروں کو نکال دے۔ . . . " جی۔ براڈ فورڈ کمشنر فتح گڑھ

ساںڈی کا دوسرا مورچہ ۔ سر کولن کیمپ بل کی نگرانی میں کرنل ہال اور بریگیڈیئر جونس (JONES) سے مڈبھیڑ ہوئی اور مجاہدین نے پسپا ہو کر ساںڈی اور نکٹورا انگریزوں کے حوالے کر دیا اور خود شاہ آباد کی راہ سے شاہجہاں پور کا قصد کیا۔

شاہ آباد پر برطانوی قبضہ ۔ کرنل ٹیلر (TAYLOR) نے مجاہدین آزادی کے رسالوں کا تعاقب کیا اور شاہ آباد میں بڑا سخت مورچہ ہوا۔ مجاہدین آزادی نے بڑی بہادری سے کئی دن مقابلہ کیا۔ مجبوری سے سامان حرب روک دیے جانے کے سبب سے شکست ہو گئی اور شاہ آباد پر برطانوی قبضہ ہو گیا۔

درگا گنج کا مورچہ ۔ ساںڈی اور بلگرام کے درمیان واقع درگا گنج جہاں مولانا احمد اللہ شاہ (مولوی فیض آبادی) کا ایک رسالہ اپنا قبضہ جمائے تھا سیاپو رجمنٹ کی کمپنیوں کی فوجی کمک نے رسالہ تتر بتر کر دیا۔

ملانواں پر دوبارہ انگریزی اقتدار ۔ فیروز شاہ جو حسین گنج ضلع اناؤ سے ملانواں کی طرف بڑھ رہا تھا پولیس بٹالین افسر مسٹر پی۔ کا نیکی نے روکا اور بریگیڈیئر ای ولی (EVELLI) نے مورچہ لیا۔ مگر فیروز شاہ کو بری طرح پسپائی ہوئی اور ملانواں مجاہدین آزادی سے خالی ہو گیا۔

سنڈیلہ کا مورچہ ۔ اس ضلع میں یہ سب سے بڑا مورچہ رہا ہے۔ ۲۰ جولائی ۱۸۵۸ء کو کپتان ڈاسن (DAWSON) نے ملیٹری پولیس بٹالین سے

---

[1] ہردوئی گزیٹیئر ۱۹۰۴ء [2] مآثر دلاوری پروفیسر ابرار حسین فاروقی

سندیلہ میں مجاہدین آزادی کے قلعہ پر حملہ کر دیا اور مسمار کر دیا۔ سی کاوناگ (KAYANAGH) نے کنیاری کے تعلقدار کی فوجی کمک سے مجاہدین آزادی کو شکست فاش دی اور سندیلہ پر برطانوی اقتدار ہوگیا۔

مگر اکتوبر کے مہینے میں مجاہدین آزادی نے پھر یورش شروع کر دی۔ ہری چند نے گومتی پار کر کے سندیلہ سے صرف دس میل فاصلے پر ۲ ہزار پیدل سپاہیوں اور آٹھ توپوں سے حملے کی کوشش کی۔ ۲ اکتوبر کو کپتان ڈاسن نے ہری چند سے ایک مورچہ لیا ان کے ساتھ ۲۰۰ مسلح پولیس، دوسری ان فنٹری لیوی اور ۵۰۰ جوان ایر ریگولر انفنٹری کے تھے۔ کپتان موصوف نے ہری چند کے جوانوں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ اتنے میں حسین گنج ضلع اناؤ سے میجر مارڈ ۸۸ ویں رجمنٹ دو توپوں، ۲۵ پولیس کیولری اور ۶۰۰ پیدل جوانوں کے ساتھ مورچے پر پہنچ گئے۔ گھمسان مقابلہ ہوا۔ ہری چند کے جوان بڑی بہادری سے ڈٹے رہے۔ آخر کار پیر اکھڑ گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے سندیلہ سے ۴ میل دور پر موضع جامن (JAMUN) تک بھگا دیا، جہاں ہری چند نے ایک مضبوط قلعہ بنوا لیا تھا۔ پھر بھی سندیلہ برطانوی قبضے سے دور تھا اسی درمیان میں ۵ اکتوبر کو لارڈ کلائڈ کی اسکیم کے تحت بریگیڈیر ٹروپ (TROUP) کو شاہ جہاں پور سے بریگیڈیر ہال کو فتح گڑھ سے اور بریگیڈیر بارکر کو لکھنؤ سے سندیلہ پہنچنے کا حکم ہوا چنانچہ ان سب نے مل کر ۸ اکتوبر کی شام کو دھاوا بول دیا۔ سخت مقابلے کے بعد مجاہدین آزادی کو مورچے سے ہٹنا پڑا اور سندیلہ پر برطانوی تسلط ہوگیا۔ اب سندیلہ ایک بنیادی فوجی مرکز بن گیا اور یہیں سے ۱۲ اکتوبر کو بروا فوجیں روانہ کی گئیں اور ایک طوفانی حملے نے مجاہدین آزادی کے قدم اکھاڑ دیے سخت نقصان ہوا۔ بریگیڈیر ہال نے ۱۵ اکتوبر کو سانڈی اور پالی پر اور ۱۸ اکتوبر کو بریگیڈیر بارکر نے روئیا، رودامئو، مادھو گنج اور اس کے مضافات سے ہندوستانیوں کو نکال کر قبضہ کر لیا۔ بریگیڈیر بارکر نے بانگر مئو تک ان کا تعاقب کیا۔ پھر دو دن بعد کچھونا، بینی گنج، گونڈوا پر تسلط جما کر خیرآباد کی طرف کوچ کیا۔ اس طرح ضلع ہردوئی اکتوبر ۱۸۵۸ء کے آخری ہفتے میں برطانوی اقتدار میں آگیا۔

اب ملانواں کے بجائے ہردوئی کو صدر مقام بنایا گیا۔ ۱۸۵۹ء سے اس نئے ضلع کا آغاز ہوا۔

★

بسنت کمار بسنت

عزمِ جمہور

لیے قلب میں ایک عزمِ درخشاں
ہر اک بزم میں ہم کریں گے چراغاں
ہر اک راہ تاریک ہوگی فروزاں
ہر اک دشت و صحرا بنے گا گلستاں

نفاق اب رہے گا، نہ افلاس و حسرت
جہاں غم ہے اس جا ملے گی مسرت

نہ غربت رہے گی نہ اب تنگ دستی
نہ احساس کلفت، نہ رفعت، نہ پستی
ہر اک شے ضرورت کی اب ہوگی سستی
کہیں اب رہے گی، نہ فرقہ پرستی

ہر اک شے کو پیدا کرو اب زیادہ
یہی اندرا کا ہے محکم ارادہ

ہو دستور محنت سے پیسہ کمانا
ہے لازم مشقت سے روٹی کا کھانا
وطن سے ہے بے روزگاری مٹانا
ہے سب کو ہمیں کام سے اب لگانا

کہیں کوئی بیکار رہنے نہ پائے
ہر اک طفل و پیر و جواں مسکرائے

بڑھے ملک کی صنعت و دستکاری
مٹے مفلسی، ظلمت و آہ و زاری
سکوں آئے مفقود ہو بے قراری
چلے جھومتی گاتی بادِ بہاری

چمن کھیت کھلیان سب لہلہائیں
ہر اک کو بہاروں کا مژدہ سنائیں

(افسانہ)

اخلاق حسین عارف

بلائے جاں

درگا پوجا کی تعطیلات کی وجہ سے ریل میں کافی بھیڑ تھی پھر بھی مجھے ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھنے کی جگہ مل ہی گئی۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے ریزرویشن کرانا ممکن نہ ہوا۔ اس کا خمیازہ بھگتنا ہی تھا۔ سامان میں میرے پاس ایک مختصر ہولڈال اور بریف کیس تھا اس لیے کچھ زیادہ قباحت نہیں ہوئی۔

شام ہوتے ہوتے ایک بڑے اسٹیشن پر کچھ لوگ اترے تو میں نے ہولڈال کھول کر سیٹ پر پھیلا دیا اور لیٹ کر میگزین دیکھنے لگا۔ رات ہوئی تو اس پر دراز ہو گیا۔ سردیوں کا آغاز تھا اس لیے کمبل کھول کر پیروں پر ڈال لیا اور تھوڑی دیر بعد سو گیا۔

رات کا خاصا حصہ بیت چکا ہوگا کہ میں نے اپنے پیروں میں کوئی گدگدی سی چیز لگتے ہوئے محسوس کی ایسا لگا جیسے میرے پیروں کی طرف کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اسی خیال سے اخلاقاً میں نے پیر ذرا سمیٹ لیے۔ غنودگی میرے اوپر طاری تھی مگر میں نے دوبارہ محسوس کیا کہ کمبل کا حصہ میرے پیروں پر نہیں ہے اور کوئی نرم سی چیز مسلسل پیروں میں لگ رہی ہے۔ میری نیند اچٹ چکی تھی مگر بغیر کسی قسم کی حرکت کیے خاموشی سے آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے میرے دونوں پیر اپنی زانوں پر رکھ کر انھیں کمبل سے ڈھانک لیا۔

صبح ہوتے ہوتے میں بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان عورت ہے جس کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں تو اس کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بغیر کسی تعارف کے بڑے خندہ پیشانی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"بڑی غافل نیند ہے آپ کی۔!"

بھلا میں اس کو کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا اور ذہن پر مسلسل زور دیتا رہا کہ شاید اسے کہیں دیکھا ہو۔ مگر کچھ یاد نہ آیا۔ میں اس خیال سے خاموش رہا کہ اس کے کسی شناسا سے میری شباہت ملتی جلتی ہوگی اس لیے اسے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے لیے بہر حال وہ اجنبی تھی۔ نئی شکل، نیا سراپا۔ میں نے یقیناً اسے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ محترمہ ہیں کون اور مجھ پر اس قدر التفات و کرم کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ابھی میں یہ غور ہی کر رہا تھا کہ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کمبل کا ایک سرا گھسیٹ کر اپنے اوپر ڈال لیا اور رسمی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ کون ہوں۔ کیا ہوں۔ کہاں سے آ رہا ہوں۔ کہاں جاؤں گا۔ کیا شغل ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بے سروپا جوابات دیے۔

دن خاصا نکل آیا تھا۔ صبح کا دلفریب منظر، ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا۔ ریل فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار میں ایک خاص لطف و آہنگ تھا۔ کچھ مسافر ابھی سو رہے تھے۔ کچھ جاگ کر آنکھیں مل رہے تھے۔ کچھ سگرٹ کا کش لے رہے تھے۔ ہم دونوں اوٹ پٹانگ باتوں میں مصروف تھے۔ اتنے میں ریل ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ سودے والوں نے آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ قلیوں کی بھاگ دوڑ، مسافروں کی گھبراہٹ

کوئی جلدی جلدی اتر رہا ہے۔ کوئی ڈبہ میں زبردستی گھسا چلا آرہا ہے۔ کوئی بستر گول کر رہا ہے۔ کچھ لوگ ریل سے اتر کر پائپ کی طرف لپکے چلے جا رہے ہیں۔ بوکھلاہٹ کا ایک منظر ایسا دیکھنے میں آیا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ایک بنگالی بابو دوسرے سیٹھ صاحب چھتریاں بغل میں دابے گھبرائے ہوئے جگہ کی تلاش میں قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ بنگالی بابو کا منھ انجن کی طرف سیٹھ صاحب کا دوسری سمت آپس میں ہلکی سی ٹکر ہوئی پھر دونوں اپنی اپنی طرف بڑھنے لگے تو دونوں کی چھتریوں کے دستے ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے۔ بنگالی بابو اپنی طرف اور سیٹھ صاحب اپنی جانب کھینچ رہے ہیں اور تماشا دیکھنے والے ہنسی سے بیتاب ہوئے جا رہے ہیں۔ پلیٹ فارم پر سیکڑوں آدمی ہیں سب کو اپنی اپنی دھن سوار ہے۔

میں نے بھی اٹھ کر ہاتھ منھ دھویا۔ محترمہ بھی ایسی انگڑائی لیتی ہوئی اٹھیں جو مردہ دلوں کو بھی حیات تازہ بخش دے۔ ہلکی اودی ساڑی زیب تن کیے جس کے کنارے پر چوڑا بارڈر لگا ہوا۔ اودی بلاؤز۔ کھڑے ہوتے وقت ساڑی کا پلو سرکا۔ شباب کی بلندیوں سے نظریں دوچار ہوئیں تو انھوں نے لجاتے ہوئے ساڑی کے آنچل کو درست کیا اور باتھ روم میں جا کر فراغت کر کے پھر اسی جگہ فروکش ہو گئیں اس وقفہ میں نے چائے ناشتہ منگوا لیا تھا اخلاقاً ان کو بھی شریک کر لیا۔ گاڑی چھوٹنے والی ہوئی تو مسافروں کی ہڑبونگ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ انجن نے سیٹی دی اور ریل نے رینگنا شروع کر دیا۔

ابھی پلیٹ فارم ختم نہ ہوا تھا کہ یک کر ایک ٹی۔ ٹی۔ آئی نے ہمارے ڈبہ میں قدم رنجہ فرمایا اور لگے ٹکٹ چیک کرنے حتیٰ کہ وہ ہمار سیٹ تک آ گئے۔ پہلے محترمہ سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی جن سے انھوں نے ٹکٹ طلب کیا انھوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پھر ٹکٹ مانگا اس بار ایک خاص انداز سے انھوں نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی نے مجھ سے ٹکٹ مانگا میں نے اپنا ٹکٹ نکال کر اسے دے دیا۔ ٹکٹ ہاتھ میں لے کر مجھ سے محترمہ کا ٹکٹ مانگا۔ میں نے کہا وہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے محترمہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "ان کا ٹکٹ" میں نے جواب دیا، مجھے کیا معلوم۔ ان سے طلب کیجئے" اس پر وہ ہنسنے لگی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی نے ان کو دیکھا پھر مجھے ایک خاص انداز سے دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگا۔ محترمہ منھ پر رومال رکھ کر مستقل ہنستی رہیں۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی مقابل والی سیٹ پر ٹک گیا اور مجھ سے برابر ان کے ٹکٹ کے لیے اصرار کرتا رہا۔ بعض وقت وہ مسکرا دیتا بعض اوقات اس کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار نمایاں ہوتے۔ وہ اپنی جگہ پر یہی سمجھتا رہا کہ محترمہ ٹی۔ ٹی۔ آئی کے ساتھ کالج کے لڑکوں والی ایکٹنگ کر رہی ہیں۔ اس کی ہنسی اور ٹی۔ ٹی۔ آئی کی کیفیت دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میرے ہنسنے پر ٹی۔ ٹی۔ آئی بگڑ کر بولا۔ دیکھیے صاحب! آپ لوگوں کے مذاق سے میرے کام میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ محترمہ بولیں اچھا آپ بقیہ مسافروں کے ٹکٹ دیکھ لیجئے ہم چلتی گاڑی سے کود کر فرار نہیں ہوں گے۔ سب کے ٹکٹ دیکھ کر ٹی۔ ٹی۔ آئی صاحب پھر نازل ہو گئے۔ محترمہ مجھ سے بولیں اب مذاق ختم انھیں ٹکٹ دکھا دیجئے۔ میں نے کہا وہ تو میں پہلے ہی دکھا چکا ہوں۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی بولا مذاق نہ کیجئے جلدی سے ٹکٹ دکھا دیجئے۔ محترمہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کبھی ہنستی کبھی مجھ سے کہتی دکھا دیجئے۔ اسی تو تو میں میں ریل ایک اسٹیشن پر رکی۔ اب ٹی۔ ٹی۔ آئی نے پینترا بدل کر قدرے ترش لہجہ اختیار کیا۔ وہاں اس نے اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کو بلوا لیا۔ دیکھتے دیکھتے میرے ڈبہ کے سامنے مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ میری عجب حالت تھی۔ سب مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ جتنے منھ اتنی باتیں جو لوگ بھیڑ میں پیچھے کھڑے تھے وہ سامنے والوں کو ہٹا کر ہم لوگوں کو دیکھتے۔ ہر شخص نئی بات کہتا۔ میرے خلاف کمپارٹمنٹ والوں نے بھی شہادت دی۔ ایک بولا دونوں میاں بیوی ہوں گے۔ دوسرا بولا اسی لیے کل رات دونوں ایک ہی کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ تیسرا بولا۔ صبح دونوں نے ساتھ ناشتہ کیا چائے پی۔ ہر چند میں یقین دلاتا رہا کہ یہ باتیں تو اخلاقاً سرزد

ہوئیں ویسے میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں مگر میری کوئی نہیں سنتا۔

میں نے پریشان ہوکر کہا اچھا اگر یہ میرے ہمراہ ہیں تو ان سے میرا نام پوچھیے۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس سے سوال کیا تو جھٹ بولی۔ کیا خوب! بھلا میں ان کا نام کیسے لے سکتی ہوں!!

ٹی۔ ٹی۔ آئی نے کتاب نکالی۔ رسید بنا کر اسٹیشن ماسٹر کو دیتے ہوئے بولا: اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ انھوں نے پولیس والوں کو حکم دیا کہ دونوں کو ریل سے اتار لو۔ اس موقع پر میری پریشانی کی انتہا نہ تھی۔ پولیس والوں نے ریل سے اترنے کو کہا۔ اب میں کیا کروں کیا نہ کروں۔ آخر کار میں نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ میں چارج دینے کو تیار ہوں مگر سفر قطع نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی۔ مسافر منتشر ہوکر اپنے اپنے ڈبوں کی طرف لپکے۔ اسٹیشن ماسٹر نے رسید ٹی۔ ٹی۔ آئی کو واپس کرتے ہوئے کہا یہ چارج دینے کے لیے تیار ہیں راستہ میں ان سے لے لیجئے گا۔

گاڑی چل دی۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی دوبارہ فاتحانہ ڈبہ میں سوار ہو گیا۔ میں نے اسے ایک مرتبہ پھر بڑی صلاحیت سے سمجھایا کہ آپ میری بات کا یقین کیجئے۔ میرا ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ میرے ساتھ نہیں ہیں۔ آپ کی یہ سراسر زیادتی ہے کہ ان کے بلاٹکٹ سفر کرنے کا خمیازہ آپ مجھ سے بھگتوا رہے ہیں۔ مگر اس نے باور نہ کیا بلکہ بگڑ گیا۔ محترمہ نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ڈبہ کے مسافر بھی اس کا ساتھ دینے لگے تو مجھے بھی غصہ آگیا۔ اول تو میری سچی بات کو سب جھوٹ سمجھ رہے تھے۔ دوسری بیٹھے بٹھائے میرے اوپر دوران سفر میں مفت کی چیت۔ میں نے ٹی۔ ٹی۔ آئی سے بگڑ کر کہا جو بغیر ٹکٹ ہوگا وہ چارج دے گا۔ میں تو نہیں دوں گا۔ مجھ سے مطلب؟ اس بات پر میرے اس کے درمیان بڑی دیر تک ردوقدح ہوتی رہی۔ اس وقفہ میں وہ برابر ہنستی رہی۔ بیچ بیچ میں مجھ ہی کو سمجھاتی رہی۔ مجھے اس کی حرکت پر غصہ آگیا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بستر سے اٹھا دیا۔ اس نے میری اس حرکت کو پہلے ہنسی میں ٹالا پھر رونی شکل بنا کر کہنے لگی آخر ٹی۔ ٹی۔ آئی کا غصہ میرے اوپر کیوں اتارتے ہیں۔ میں نے بجائے اُسے کوئی جواب دیے ٹی۔ ٹی۔ آئی سے کہا آپ ان سے کرایہ وصول کیجئے یا جیل بھجوا دیجئے مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ اس جھائیں جھائیں میں چند مسافروں کو خاصا دلچسپی کا سامان مہیا ہوگیا تھا۔ وہ اس بکھیڑے میں خوب لطف لے رہے تھے۔ محترمہ رونی صورت بنا کر ٹی۔ ٹی۔ آئی سے خوشامد کرنے لگی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی چارج دلا دوں گی۔ یہ سننا تھا کہ میں جھنجھلا گیا۔ میں تمھارے رشتہ ناطہ کا کون ہوں جو چارج دلا دو تم خود کیوں نہیں دے دیتیں۔ اس پر وہ ظالم مجھے سمجھانے لگی چند مسافر بھی سمجھانے لگے کہ جھگڑا طول دینے سے بہتر ہے کہ آپ چارج دے دیجئے۔

یہ بکھیڑا بہت لمبا ہو گیا تھا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ چارج ادا کیے بغیر دوسرا چارہ کار نہیں۔ میری پوزیشن اس معاملہ میں بڑی نازک ہو چکی تھی چنانچہ میں نے رسید لے کر روپے ادا کر دیے۔ آپ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے یہ میرے ساتھ نہیں ہیں ان کا بھگتان بلاوجہ میں بھگت رہا ہوں میں نے کہا۔ اس سلسلہ میں اب بات چیت فضول ہے۔ ٹی۔ ٹی۔ آئی بولا۔ اس کے بعد ہم خاموش ہو گئے۔

چارج میں نے اسی اسٹیشن تک کا دیا تھا جہاں وہ ہم دونوں کو اتار رہا تھا گویا کہ محترمہ اب پھر بلاٹکٹ سفر کر رہی تھیں۔ یہ قضیہ تو اس وقت ختم ہو گیا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ جس جگہ اس ٹی۔ ٹی۔ آئی کی ڈیوٹی ختم ہوگی وہاں دوبارہ خلفشار کھڑا ہوگا۔ یہ مجھے پھر بے وقوف بنائے گی۔

دوسرے اسٹیشن پر ریل رکی تو ٹی۔ ٹی۔ آئی کی میں نے چائے وغیرہ سے تواضع کی تھوڑی دیر میں ہماری اس سے گاڑھی دوستی ہو گئی اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جس جنکشن پر اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی اس نے وہاں سے آگے جانے والے ٹی۔ ٹی۔ آئی سے میرا تعارف بڑی گرمجوشی سے کرا دیا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ تھا کہ ہمارا ہر طرح خیال رکھا جائے۔

ریل چھوٹی، میں سوچنے لگا کہ اگر یہ میرے ساتھ اسی طرح

چپکی رہی تو کیا ہوگا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر میرے کئی شناسا ہیں، دیکھیں گے تو کیا کہیں گے شدہ شدہ گھر تک بات پہنچ گئی تو بیگم تہلکہ مچا دیں گی۔ ایک نئی آفت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ تمام باتیں یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں اٹھتی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ مجھ سے باتیں بھی کیے جاتی تھی۔ ہنستی جاتی تھی اور باتوں باتوں میں بیباک بھی ہوتی جاتی تھی۔ ایک طرف مجھے اس کی باتیں اچھی بھی معلوم ہوتی تھیں لیکن اس کے بیوقوف بنانے پر انتقامی جذبہ بھی بیدار ہو جاتا تھا۔ کبھی سوچتا اس کے بیوقوف بنانے کا کچھ بدلہ لینا چاہیئے۔

یہ تمام باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔ آخر کار میں نے سوچا ڈھائی سو میل پر میں اپنا سفر بریک کر سکتا ہوں کیوں نہ راستہ ہی میں کہیں اتر کر اس بلائے جاں سے نجات حاصل کر لوں پھر تھوڑے وقفہ بعد دوسری گاڑی پکڑ لوں؟ کافی دیر غور و خوض کے بعد اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ پختہ کر لیا۔ چند گھنٹوں بعد جب ریل ایک جنکشن پر رکی تو میں نے بستر لپیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بولی۔ یہ کیا؟ یہاں اتر رہا ہوں۔ میں بولا۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا سامان پلیٹ فارم پر اتار لیا۔ اتفاقاً ٹی ٹی آئی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اس سے کہا میں یہاں اتر رہا ہوں محترمہ بلا ٹکٹ سفر کر رہی ہیں ان کو راستہ میں چارج کر لیجیے گا۔ اس نے میری بات کو مذاق سمجھا ہنسنے لگا اور کھڑکی میں منھ ڈال کر محترمہ سے کہنے لگا دیکھیے آپ کے صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ صرف مسکرا دی۔

میں نے ویٹنگ روم میں اپنا سامان رکھوایا۔ ہاتھ منھ دھویا اور کرسی پر دراز ہو کر ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں محترمہ یہاں بھی نازل ہو گئیں۔ میں نے دریافت کیا یہاں کیسے رونق افروز ہو گئیں کہنے لگی تم اتر گئے اس لیے میرا بھی وہاں تنہائی میں جی نہ لگا۔ میں سخت پریشان ہوا کہ یہ بلائے جاں یہاں بھی نازل ہو گئی۔ میں نے بات بنائی میری تو طبیعت خراب ہو گئی۔ اس نے جواب دیا میری بھی طبیعت خراب ہے۔ میں نے سخت سست کہنا شروع کیا۔ اس نے کہا اگر اب کچھ کہو گے تو میں زور زور سے رونے لگوں گی لوگ جمع ہو جائیں گے تمہاری سبکی ہوگی اس لیے بہتر ہے حالات سے سمجھوتہ کر لو۔ میں بالکل عاجز آچکا تھا مجھ خاموش رہنا پڑا۔

اس نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ میری درشتی نرمی میں تبدیل ہو گئی۔ شب میں ہم لوگوں نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا اور ویٹنگ روم ہی میں سو رہے۔

صبح چار بج کر دس منٹ پر ایک گاڑی لکھنؤ کے لیے ملتی تھی۔ ویٹنگ کے بیرا کو سر شام میں نے الگ بلا کر خوب سمجھا دیا تھا اس نے مجھے چپکے سے جگا دیا اور میں بڑی خاموشی سے اٹھ کر شب خوابی کے لباس میں پہننے کے کپڑے اور بریف کیس ہاتھ میں لیے ہوئے ریل میں سوار ہو گیا۔ اس طرح اس بلا سے مجھے چھٹکارا ملا۔ آئی گئی ہولڈال پر ہوئی کیونکہ وہ بستر پر سوتی رہی جو مجھے مجبوراً اس کی نذر کرنا پڑا۔

★

ترانۂ جمہور

سید علی شبر حسینی کرانی

یوم جمہور ہے اک گیت سنا دے ساقی
میری آواز میں آواز ملا دے ساقی

بزم رنداں بھی ہے اور مست گھٹائیں بھی ہیں
آکے سیراب ہو ہر ایک صدا دے ساقی

ہند کو دوسرے ملکوں سے بھی آگے لائیں
راستہ ہم کو ترقی کا دکھا دے ساقی

اپنی ہر ایک ضرورت کے ہوں ہم خود ہی کفیل
ملک کو ایسے ہنر بھی تو سکھا دے ساقی

چاند تک ہی تو پہنچنا نہیں منزل اپنی
راہ کچھ اور ستاروں کی دکھا دے ساقی

جو روایات کے بستر پہ ہیں اب تک سوئے
اُن کو نغمات حسینی سے جگا دے ساقی

کمبھ

دنیا کا سب سے بڑا میلہ

پریاگ میں جنوری۔ فروری ۱۹۷۷ء میں ہونے والا کمبھ میلہ دنیا کی عظیم ترین مذہبی اور ثقافتی تقریب ہے۔ اس میں تقریبًا دو کروڑ افراد شرکت کر رہے ہیں۔ دریائے گنگا کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے کچھار اور قرب وجوار کے مقامات پر شامیانوں اور چھپروں کا ایک عارضی شہر بن گیا ہے جو ۱۹ جنوری ۱۹۷۷ء کو مونی اماوس کے دن شاید ملک کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہوگا۔

پریاگ میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے کنارے ملک کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے تیرتھ یاتری، سادھو، سنت، امیر وغریب، اعلا اور ادنیٰ سبھی طبقوں کے افراد جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملاکر آگے بڑھ کر سنگم میں نہاتے ہیں اور اس مقدس زمین پر ملک کی رنگا رنگ تہذیب کا جلوہ دیکھ کر نئے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں۔

کمبھ میلے کی تاریخ بہت قدیم ہے متسیہ پران کے مطابق دنیا کی تخلیق کے وقت دیوتاؤں کو ایک رشی کا شراپ (بددعا) ملنے کی وجہ سے ان کی طاقت کم ہوگئی تھی۔ اپنی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ برہما کے پاس پہنچے۔ برہما نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ سمندر کو متھیں اور اس سے نکلنے والے امرت کو پی کر اپنی طاقت کو دوبارہ حاصل کرلیں۔ دیوتا چونکہ کمزور تھے اس لیے وہ اکیلے سمندر کو نہیں متھ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آسُروں سے مدد مانگی۔

دیوتاؤں اور آسُروں کو سمندر متھنے پر بہت سی قیمتی اشیاء ملیں اور آخر میں دھن ونتری امرت سے بھرا ہوا سونے کا کمبھ (گھڑا) لیے ہوئے ظاہر ہوئے۔ آسُروں اور دیوتاؤں میں اس امرت کمبھ کو حاصل کرنے کے لیے لڑائی ہونے لگی۔ اس درمیان اِندر کے بیٹے جینت کمبھ لے کر سوَرگ چلے گئے۔ سوَرگ تک جانے میں انھیں بارہ برس لگے اور چار مقامات پر انھوں نے آرام کرنے کے لیے کمبھ رکھا۔ یہ چار مقامات تھے۔ ہردوار، پریاگ، اُجین اور ناسک، ان چاروں مقامات پر ہر تین سال کے بعد کمبھ میلہ منعقد کیا جاتا ہے۔

لیکن گرُوڑ پران میں کہا گیا ہے کہ امرت لے کر بھاگتے ہوئے آسُروں کا جب دیوتاؤں نے پیچھا کیا، اس وقت کچھ امرت کمبھ سے چھلک کر ان چاروں مقامات پر گر گیا۔

یہی وجہ ہے کہ ان چاروں مقامات کی مقدس ندیوں پر لاکھوں سادھو زمانہ قدیم سے اس کمبھ تقریب کے موقع پر جمع ہوتے ہیں۔ ہردوار میں گنگا، پریاگ میں گنگا جمنا اور سرسوتی کے سنگم، ناسک میں گوداوری اور اُجین میں چھپرا تٹ (ساحل) پر ان میلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

کمبھ میلے میں دور افتادہ علاقوں میں رہنے والے سادھو اور مہاتما آتے ہیں اور عوام کو اپنے روحانی تجربات سے فائدہ پہونچاتے ہیں۔ مختلف نظریات کے لوگ ان سادھو مہاتماؤں کے کیمپوں میں جاکر روحانی موضوعات پر بات چیت کرتے ہیں اور علم حاصل کرتے ہیں۔ اس موقع پر ان مہاتماؤں کے درشن کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو ہمالیہ کے غاروں میں تنہا زندگی گزارتے ہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے پریاگ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ یہاں پر تین مقدس دریا آکر ملتے ہیں۔ اس لیے اسے تیرتھ راج بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سنگم پر برہما نے بہت سے یگیہ کیے۔ یہیں پر بھردواج رشی کا آشرم تھا جہاں شری رام چندر، لکشمن اور سیتا جی نے کچھ دیر قیام کیا تھا۔ متسیہ اور پدم پُران میں بھی پریاگ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بھارت دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف نظریات اور مذاہب نے جنم لیا۔ یہاں مذہبی آدرشوں کو زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے یہاں مذہبی قوانین پر مضبوطی اور فرض شناسی

کے ساتھ عمل کرنے کی روایت رہی ہے۔ سنتوں اور مہاتماؤں کو کمبھ کے موقع پر روحانی اور انسانی اقدار کا پرچار کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

کمبھ میلہ ایک مہینے تک چلتا ہے ان دنوں مختلف اکھاڑوں (منٹھوں) کے سادھو سنت سنگم نہانے کے لیے آتے ہیں۔ اسی موقع پر ان سادھو سنتوں کے درشن کے لیے مرد اور عورتوں کا ایک کثیر مجمع ان کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ عوام کو ان سادھو، سنتوں کے بعد ہی نہانے کا موقع ملتا ہے۔

پریاگ میں اس سال اہم تقریبات ۵، ۱۴، اور ۱۹ جنوری اور ۴ فروری ۱۹۷۷ء کو ہوں گی۔ اس بار کمبھ میلے کے موقع پر ستاروں کا مخصوص اجتماع ہو رہا ہے جو ۱۴۴ برس کے بعد ممکن ہوا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ ایک کروڑ سے بھی زیادہ افراد اس موقع پر آئیں گے۔

پریاگ میں گنگا ندی کا ساحل بہت وسیع ہے جو تیرتھ یاتریوں کے لیے ایک نعمت ہے۔ اس کے علاوہ اس بار اہم دھارا دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور دونوں دھاروں کے درمیان ایک جزیرہ سا بن گیا ہے جس سے یاتریوں کو نہانے میں آسانی ہو گی۔

یہ میلہ ۲۵۰۰ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہو گا۔ ریاستی سرکار نے میلے کے انتظامات کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مساوی عہدے کے ایک میلہ افسر کو متعین کیا ہے۔ ان کی مدد کے لیے متعدد اعلا اور تجربہ کار افسر بھی متعین کیے گئے ہیں۔

میلہ پر کل چھ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے خرچ آنے کا اندازہ ہے۔ جس میں سے ڈھائی کروڑ روپے الٰہ آباد شہر کے علاقے میں یاتریوں کو مختلف سہولتیں فراہم کرنے کے مقصد سے خرچ کیے جا رہے ہیں۔

گنگا کے دونوں دھاروں پر پیپے کے کئی پل بنائے گئے ہیں۔ جن کے ذریعہ دھاروں کے بیچ بن جانے والے جزیرے پر بھی جایا جا سکتا ہے۔ ان پلوں کے ذریعہ دارا گنج اور جھوسی کے کناروں کو جوڑنے سے مسافروں کو ایک طرف سے دوسری طرف جانے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ نقل و حمل، نظم و نسق، طبّی امداد، کھانے پینے کی اشیاء اور مواصلات کی سہولتیں بہم پہونچانے کے لیے خاطر خواہ انتظامات بھی کیے گئے ہیں۔ (بشکریہ پی ٹی آئی)

★

قلم

ظہیر غازی پوری

خوش نوا اور خوش بیاں قلم
فکر و فن کا ہے ترجماں قلم

میرے سر پر بھی کوئی چھت ہوتی
کاش بن سکتا سائباں قلم

دانش و فکر اس پہ ناز کرے
جس پہ ہو جائے مہرباں قلم

میری ہستی بس ایک مشتِ غبار
اور رتبے میں آسماں قلم

زندہ رکھتا ہے اہلِ دانش کو
یہی بے جان، بے زباں قلم

میں نے تکریم لفظ و معنیٰ کی
بن گیا میرا پاسباں قلم

میں ہوں مہمان میزباں اپنی
ساتھ ہے میرا میزباں قلم

وقت کی انگلیوں کو ہے معلوم
کس قدر ہے لہو لہاں قلم

محمد مشتاق شارق میرٹھی

حامد اللہ افسر میرٹھی

افسر میرٹھی کو اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں کلاسکل عظمت حاصل ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں بچوں کے لیے اردو کا جو کورس مرتب کیا گیا، اس میں افسر کی نظمیں ضرور شامل کی گئیں۔ افسر جب ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوئے تو ان کے سامنے ان کے ہم وطن مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا تیار کردہ درسی نصاب تھا۔ انھوں نے اسی کا مطالعہ کیا اور اس کی نظموں سے اتنا کیف و سرور حاصل کیا کہ ان نظموں کا اثر نقش دوام بن کر ان کے دل و دماغ پر ثبت ہوگیا۔ لہٰذا جب سنِ شعور کو پہنچے اور انھوں نے شاعری کی ابتدا کی تو اس کی بنیاد اسی انداز پر قائم کی۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے محاسن شعری دو عناصر سے ترکیب پاتے ہیں۔ ایک سادگی اور معصومیت اور دوسرے مقامی فضا کی عکاسی اور جذبۂ حب الوطنی کی نمائش۔ افسر کے یہاں بھی یہی دو خوبیاں بدرجۂ غایت ملتی ہیں۔

افسر کا تعلق مفتیان میرٹھ کے ممتاز خاندان سے تھا۔ ان کا نام حامد اللہ اور تخلص افسر تھا۔ والد کا نام محمد عصمت اللہ تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم مدرسہ اسلامیہ عربیہ میرٹھ میں حاصل کی۔ وہ مشرقی اور جدید تعلیم دونوں کے پروردہ تھے۔ فن شعر میں رسا ان کے استاد تھے[1] ۱۹۲۰ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے انھوں نے انڈین پریس الہ آباد کی ملازمت سے اپنی معاشی زندگی کا آغاز کیا۔[2] اس سلسلے میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا بیان دیکھیے جس سے افسر کے حلیے اور ان کی شائستگی کا اندازہ ہوتا ہے:

"جب میں ایم۔ اے میں پڑھتا تھا تو کبھی کبھی ایک صاحب گورے چٹے، پستہ قد، لمبی شیروانی پہنے چلتے پھرتے الہ آباد میں سڑکوں پر نظر آتے تھے۔ عموماً سائیکل پر سوار ہوتے، شاذ و نادر پیدل مل جاتے۔ ان کی شریف صورت اور لباس کی باقاعدگی نے میرے دل میں ان سے ملنے کی گدگدی پیدا کی۔ لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ کسی نے کچھ نہ بتایا۔ اس لیے کہ میں صرف حلیہ بتاتا تھا اور پوچھتا بھی طالب علموں سے تھا۔ ایک دن میں نے کلاس میں ضامن صاحب سے دریافت کرنے کی ہمت کی۔ انھوں نے مسکرا کر کہا 'افسر صاحب ہیں'۔ میں نے فوراً کہا 'صاحب وہ افسر نہیں معلوم ہوتے، نہ چپراسی ساتھ ہوتا ہے، نہ موٹر پر چلتے ہیں۔ وہ عموماً سائیکل پر دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو پیدل بھی چلتے دیکھا ہے'۔ انھوں نے ہنس کر کہا 'بے وقوف میرا مطلب حامد اللہ افسر سے ہے۔ اردو کے شاعر ہیں، انڈین پریس میں ملازم ہیں'۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں نے تو رسالوں میں ان کا کلام بھی دیکھا ہے۔ اچھے خاصے شاعر ہیں۔ ان سے ملنا چاہیے۔ دو بدو گفتگو کا

---

[1] مکتوب تاجور نجیب آبادی بنام اظہار الحسن وکیل غازی آباد مطبوعہ نقوش مکاتیب نمبر ص ۶۹۹ (نوٹ) رسا رام پوری، سکندرہ آباد ضلع بلند شہر کے باشندے تھے۔ حیات بخش نام تھا۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔

[2] اس سے پہلے وہ ایک پرچہ نوبہار کے نام سے نکال چکے تھے۔ الخلیل میرٹھ کے دفتر میں بھی کچھ دن کام کیا۔

موقع غالباً ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں ملا۔ چائے کا دور چل رہا تھا افسرؔ صاحب ایک جگہ تنہا کھڑے دکھائی دیے میں فوراً لپک کر اُن کے قریب ہو گیا۔ ہم دونوں ایسے ملے جیسے برسوں کی ملاقات ہو۔[1]

اس کے بعد انھوں نے معلمی کے پیشے کو اختیار کیا اور وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۲۷ء سے لکھنؤ کے ایک ہی ادارے جُبلی کالج میں عرصۂ ملازمت گزارا۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ ریٹائر ہوئے۔

افسرؔ میرٹھی بہت متین اور مہذب تھے۔ انھوں نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اس سلسلے میں جناب خورشید احمد صاحب مدیر 'نیا دور' کا بیان دیکھیے جو انھوں نے افسرؔ کی وفات کے بعد دیا:

"راقم حروف کو بھی جُبلی کالج میں حضرت افسرؔ میرٹھی سے فیض حاصل کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کبھی وہ اپنے کسی شاگرد سے ترش روئی سے پیش آئے ہوں۔ گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ اس میں تحکّم یا تکبّر کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ اپنے شاگرد سے نہیں کسی برابر والے سے محوِ گفتگو ہیں۔ مرحوم اپنے شاگردوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کا ایک خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ صلح پسندی آپ کے مزاج کا خاصہ اور ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنا آپ کی افتادِ طبع تھی۔ اسی لیے آپ نے ادبی معرکہ آرائیوں سے خود کو ہمیشہ الگ ہی رکھا۔"[2]

ادب افسرؔ میرٹھی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی انھیں ادب سے شغف رہا۔ ان کی عمر کے آخری دو تین سال بیماری کی حالت میں گزرے اور ان کے قویٰ نے جواب دیا۔ بالآخر ۸۰ سال کی عمر میں ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء کو بعارضۂ تپ جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ (خدا غریقِ رحمت کرے) اپریل ۱۹۷۴ء کو قدیم اطبائے لکھنؤ کے خاندانی قبرستان محلہ جھوائی ٹولہ میں مدفون ہوئے۔

افسرؔ بڑے خوش گو شاعر تھے۔ اپنے پیش رو حالیؔ اور آزادؔ کی طرح افسرؔ بھی قدیم فرسودہ غزل سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری نئے نئے موضوعات کی جلوہ گری کی حامل ہے۔ ان کی شاعری کی ابتدا لوریوں اور گیتوں سے ہوئی۔ اس کے ساتھ انھوں نے ہیئت کے بھی نئے نئے تجربے کیے[3] اور اردو شعر کو نئے نئے بحروں سے آشنا کرایا۔ بحروں کے یہ نمونے بڑے مترنم اور رواں دواں ہیں۔ الفاظ و خیالات کی سادگی نے ان کی اس انداز کی نظموں کو ایک انوکھی شگفتگی عطا کی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی یہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ دولت مندجوگی، شب تاریک، تربینی، اور دنیا جنت ہے میرا وطن ہے۔ ان میں موسیقی کی رواں دواں زیریں لہر نے عجیب اثر آفرینی پیدا کر دی ہے۔ اس سے ان نظموں میں بڑی کشش پیدا ہو گئی ہے جس سے دل و دماغ کو ایک خاص قسم کا اہتزاز حاصل ہوتا ہے۔

افسرؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں مناظرِ قدرت کی عکاسی کے نہایت کامیاب نمونے پائے جاتے ہیں۔ فطرت سے متعلق معمولی معمولی چیزوں میں وہ ایسے پہلو تلاش کرتے ہیں جن تک عام نگاہوں کی رسائی نہیں۔ اس خوبی سے ان کی نظموں میں بڑی دلکشی اور انوکھا پن پیدا ہو گیا ہے۔ بہار کے دن، ابرِ بہار، چاند، سکوتِ شام وغیرہ اسی رنگ کی خاص نظمیں

---

[1] عصرِ حاضر کی چند ادبی شخصیتیں از ڈاکٹر سید اعجاز حسین مطبوعہ مشرب پاکستان 'تاریخ اردو ادب نمبر'

[2] اداریہ 'نیا دور' بابتہ ماہ مئی ۱۹۷۴ء [3] ۲۱ جون ۱۹۲۷ء کے مرقومہ ایک خط بنام تمکین کاظمی میں محمد عظمت اللہ خاں افسرؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں "حامد اللہ افسرؔ ذہین آدمی ہیں اور خوب کہتے ہیں بس ذرا محنت اٹھا کر پرانی عروض کے جوے سے اپنے کو آزاد کر لیں تو میرا خیال ہے کہ اس نئے رنگ میں خوب کریں گے۔" ماہنامہ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم۔

ہیں۔ ان کی اسی قسم کی نظموں میں تازگی، شادابی، سادگی اور ترنم سب کچھ ملتا ہے۔

خیال اور اسلوب کی سادگی ان کی شاعری کا ایک اور وصف ہے۔ اس وصف میں انھیں کمال حاصل ہے۔ بچوں کے لیے اسمٰعیل اور اقبال نے بھی بڑی سادہ نظمیں لکھی ہیں مگر سادگی میں دلکشی کے انداز افسر ہی کے یہاں نظر آتے ہیں۔

نظم کہنا اور اُسے پڑھنا دو الگ الگ وصف ہیں۔ افسر کیسا کہتے ہیں اور کس انداز سے پڑھتے تھے اسے شوکت تھانوی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے :

"بچوں کے نہایت کامیاب شاعر ہیں اور مشاعروں کے شاعر قطعاً نہیں، اس لیے کہ نہایت ہولناک انداز میں پڑھتے ہیں۔ البتہ وہی نظم یا غزل وہ خود نہ سنائیں تو پڑھ کر پڑھنے والے کو زیادہ لطف آتا ہے۔"[1]

جب کرنل ہالرائڈ کی تحریک پر حالی اور آزاد نے جدید شاعری کی ابتدا کی تو اردو نئے نئے موضوعات سے آشنا ہوئی۔ ان میں ایک موضوع 'حب الوطنی' کا بھی ہے۔ حالی، آزاد، اسمٰعیل اور اقبال نے اس جذبے کو ابھارنے کی کوششیں کیں اور اردو کو اس موضوع پر اچھی اچھی نظمیں دیں مگر مقامی رنگ کی جو فضا افسر کے یہاں ملتی ہے وہ ان کے ہم عصروں کے یہاں ناپید ہے۔ افسر، اقبال سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ خیالات کے اعتبار سے ان کی بہت سی نظمیں صدائے اقبال کی بازگشت نظر آتی ہیں مگر انھوں نے اپنی نظموں کے نقوش میں جس انداز سے مقامی رنگ بھر دیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا۔

(۱)

پربت جو اک یہاں ہے
ہم دوش آسماں ہے
کیا عجب سماں ہے
ایسی زمیں کہاں ہے
کیا شکر ہو الٰہی، سب کچھ عطا کیا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

(۲)

کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے روح ہماری جانوں میں
گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو دی تھی مے وہ اب تک ہے پیمانوں میں
نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں

(۳)

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رت ہر اک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سہانا کیسا سندر پیارا دیش ہمارا ہے
دکھ میں سکھ میں ہر حالت میں بھارت اپنا سہارا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے
پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکشا کرتا ہے یہ بھارت کا رکھوالا ہے
لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں لاکھوں نالوں والا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

ان نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظمیں عام جذبات و خیالات کی آئینہ دار ہیں مگر طرز ادا نے ان میں انفرادیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ فکر و خیالات اور تقلید سے ان نظموں کی اہمیت کم ہوگئی ہے مگر بقول ڈاکٹر کلیم الدین احمد "پھر بھی افسر میں یہ خوبی ہے کہ وہ بے معنی گرج، فضول چیخ پکار نہیں کرتے۔ ان کی آواز نرم اور آہستہ ہے اور پھر خوش آہنگ، دل کش اور میٹھی بھی ہے۔ ان کی سطح دل نشیں ترنم بھی ہے اور کیفیت ریز بھی ہے"[2]

[1] لکھنؤ کا ایک دور، مطبوعہ نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد اوّل ۱۹۵۵ء [2] اردو شاعری پر ایک نظر حصہ دوم تیسرا ایڈیشن ص ۲۳۵۔

کہیں کہیں اختر کی نظموں میں انگریزی خیالات کی چھاپ بھی نظر آتی ہے مگر یہ ان کی شاعری کا عیب نہیں۔ انھوں نے انگریزی کے بلند خیالات کو اردو میں عام کیا۔ اس سے اردو شاعری کی رفعت کم نہیں ہوئی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی۔ ان کے یہاں جو جذبہ بھی شعر کی شکل اختیار کرتا ہے اُس میں خلوص اور صداقت کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے منظر کشی کے انداز انگریزی شاعری سے مستعار لیے مگر انھیں رنگین بنایا اپنے خونِ دل سے۔ ان کی نظموں میں فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کا جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ قاری کو کچھ دیر کے لیے مبہوت بنا دیتا ہے۔ یہ وصف ہمہ گیر طور پر اُن کے یہاں ہر نظم میں ملتا ہے یہاں تک کہ اُن کی غزلیں بھی اس اثر سے خالی نہیں۔ ذیل میں درج ذیل اشعار کو دیکھیے کتنے پاکیزہ اور فطری معصومیت لیے ہوئے ہیں:

صبح نے کھول کے اپنا خزانہ گھر گھر سونا بانٹ دیا
پتّہ پتّہ سونے کا تھا کونپل کونپل سونے کی
موتی ہی موتی بکھرے پڑے تھے سارے کھیت کے پیتوں پر
گویا کھیت میں سونے کی تھی فصل یہ موتی بونے کی

کسی کا مشہور شعر ہے:

آج کیا جانے کیا ہے ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ کیفیت اختر کے یہاں اکثر جگہ ملتی ہے۔ اختر کی جذباتی نظموں میں معصومیت، نرمی اور سادگی کے ساتھ جذبے کی گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیا کہوں ہوتا ہے اکثر اس قدر دل بے قرار — چاہتا ہے خود بخود رونے کو جی بے اختیار
یہ نہیں معلوم کیوں کس بات پر روتا ہوں میں — یہ خبر ہے ہاں کہ پہروں بیٹھ کر روتا ہوں میں

سوچتا ہوں دل میں بستر پر کہ یہ کیا بات ہے
نیند آنی چاہیے اب تو کہ آدھی رات ہے

اختر کی شاعری کا ایک اور بڑا وصف یہ ہے کہ اُس کے اندر امید و رجا کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی کے روشن پہلو کو دیکھتے ہیں۔ تاریک پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری قنوطیت کے اثرات سے بالکل پاک ہے۔

اختر کی شاعری پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، وہ کچھ اس قسم کے ہیں:[1]

۱۔ اختر کے یہاں جوش کی کمی ہے۔
۲۔ اُن کا تخیل عمیق و بلند پرواز نہیں۔
۳۔ قافیہ پیمائی اور بند پیمائی ہے۔
۴۔ نظموں میں تعمیری کمی ہے۔
۵۔ نظموں میں تعمیری یکسانی نہیں۔

اختر نے جس قسم کی نظمیں لکھی ہیں اُن میں جوش دکھانے کا موقع ہی نہیں ہے۔ انھیں تو نرم و سبک لب و لہجہ کی ضرورت تھی اور اختر کے یہاں اس وصف کی کمی نہیں۔ بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی جاتی ہیں ان میں عمق کی ضرورت نہیں۔ جو نظمیں بڑوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ان میں تخیل کی گہرائی ملتی ہے باقی کے تین اعتراضات، عام ہیں یہ صرف اختر کے لیے مخصوص نہیں۔ اختر نے تو روایت سے بغاوت بھی کی ہے۔ وہ کسی حد تک ہی کیوں نہ ہی۔

اخیر میں ان کی ایک نظم بعنوان فلسفۂ کامیابی ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں فلسفۂ امید و رجا کی جھلک نمایاں ہے۔ زندگی کو ایسی ہی حوصلہ افزا نظموں کی ضرورت ہے:

جو سب سے بدتر تھے اس جہاں میں — ہیں ان کے وارث ہی سب سے بہتر
رکاوٹیں جس قدر ہوں پیدا — اسی قدر کامیاب ہوں گے
یہ چھاؤں جس سے گزر رہے ہو — ثبوت بیّن ہے دھوپ کا خود
شکست کا لطف پا چکے ہو — تو ایک دن فتح یاب ہو گے
خزاں اجاڑے گی جس چمن کو — بہار آئے گی اُس چمن میں
اُسے خوشی بھی نہ ہو گی حاصل — جسے کبھی غم نہیں رہا ہے
خدا رسیدہ بزرگ ہونا — اسی سے ممکن ہے اس جہاں میں
گناہ گاروں میں جو یہاں کے — کسی سے کچھ کم نہیں رہا ہے

---

[1] پروفیسر کلیم الدین احمد۔ اردو شاعری پر ایک نظر حصہ دوم۔ تیسرا ایڈیشن ص ۲۲۹

جو بے بسی میں گرے ہیں اختر وہی تو گہرائی سے ہیں واقف

جو دل سے نکلا ہے کوئی نالہ فلک پہ وہ با اثر رہا ہے

بلندیوں پہ وہی چڑھے گا نشیب میں جو اتر سکے گا

جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ وہ گھاٹیوں سے گزر رہا ہے

اُردو شاعری کے رواج کے مطابق اختر نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ ان کی غزل گوئی کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک روایتی غزل گوئی اور دوسری ایسی غزل جس میں تازگی، توانائی اور جدّت کے عناصر اپنی انتہائی خوب صورتی کے ساتھ نمایاں ہیں اور جس میں اخلاق و تصوّف کی چاشنی بھی موجود ہے فطرت سے ہم آہنگی ان کی غزل کو زندگی سے قریب کر دیتی ہے۔ اس میں سادگی، نرمی اور معصومیت کی انوکھی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض جگہ ان کی غزل نظم سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ذیل میں اُن کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ہزار نیرنگیوں کے مالک مجھے بتا دے یہ کیا ستم ہے
کہ تیرے کعبہ میں رہنے والا کبھی خدا ہے کبھی صنم ہے

مجھے بتانا تھا حال کچھ تو، وہ پوچھتے تھے کہ حال کیا ہے
مگر بے اختیار اختر، یہ کہہ اٹھا "آپ کا کرم ہے"

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

رو رو کے انتظار کی گھڑیاں گزار دیں یہ بھی خطا ہوئی ترے اُمیدوار سے

صدائیں آتی ہیں دھیمے سروں میں گانے کی اب آج پھر نہیں اُمید نیند آنے کی

جب خوشی کا خیال آتا ہے دلِ مایوس کانپ جاتا ہے

چاہتے ہیں اب تو یہ سودائیانِ جستجو کاش منزل پر کوئی کہہ دے کہ یہ منزل نہیں

جہاں بھر میں ہیں تنکے کہاں کہاں سے جنوں مبارک کر دیا کیا حال آشیانے کا

خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

نہ سمجھا جب حقیقت کو کسی نے خدا پیدا کیا ہر آدمی نے

نظموں میں ان کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ پیامِ روح (۱۹۲۷ء) اور جوئے رواں (۱۹۴۵ء) مگر اب یہ دونوں نایاب ہیں۔

اب تک آپ نے اختر کا مطالعہ بحیثیت شاعر کیا ہے لیکن جہاں وہ اچھے شاعر تھے وہیں وہ ایک اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔ نثر میں انھوں نے درسی مضامین بھی لکھے اور تنقیدی مضامین بھی افسانے بھی لکھے اور ڈرامے بھی۔ ان کی نثر سادہ، شگفتہ اور دل کش ہوتی ہے۔ وہ عبارت آرائی اور مشکل الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک اچھے معلّم تھے اس لیے وہ ہر گتھی کو سلجھاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ طرزِ بیان کی سادگی مفہوم کو آسان اور زود اثر بنانے میں بہت مدد کرتی ہے۔ جہاں انھوں نے نظم گوئی میں حالی سے فیض حاصل کیا ہے وہیں ان کے اندازِ نثر نگاری کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ حالی کی طرح ان کی نثر بھی سادگی اور صفائی کی آئینہ دار ہے۔

نثر میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

(۱) افسانوں کے مجموعے۔ ڈالی کا جوگ (۱۹۲۷ء)، پرچھائیاں (۱۹۴۵ء)، آنکھ کا نور (۱۹۴۰ء)

(۲) ڈراموں کا مجموعہ۔ چار چاند (۱۹۴۰ء)
ہفت منظر (۱۹۴۲ء)

(۳) ادبی مضامین کا مجموعہ۔ نورس (۱۹۳۸ء)

(۴) تنقید۔ نقد الادب (۱۹۳۵ء)

(۵) درسی مضامین کا مجموعہ۔ کتابوں کی جنگ (۱۹۳۸ء)

کچھ کتابیں اِن کے علاوہ بھی لکھیں۔ جیسے پندرہ اگست ہمارا جھنڈا، تاریخ تحریک آزادی، حکایت گاندھی، الیوسٹ کی کہانی وغیرہ۔ ان میں نقد الادب ان کی اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے افلاطون کے وقت سے لے کر اس وقت

تک کے تنقیدی نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے انگریزی تنقید کی مشہور کتابوں سے استفادہ کیا ہے خصوصی طور پر ہڈسن اور درسفولڈ کی کتابوں کا اخذ و ترجمہ زیادہ ملتا ہے۔ کتاب اپنی جگہ مفید اور کارآمد ہے۔ اس میں تنقید کے جو اصول پیش کیے گیے ہیں وہ مسلم ہیں۔ ان کی روشنی میں اگر اردو شاعری کو پرکھا جاے تو اچھا ہوگا، لیکن اختر کا اپنا نظریۂ تنقید کیا تھا، یہ اس کتاب سے نہیں معلوم ہوتا۔ نقد الادب پر مولوی عبدالحق تبصرہ کرتے ہوے لکھتے ہیں :

" جناب حامد اللہ کی یہ تالیف خاص اس فن (تنقید) پر ہے اس میں انھوں نے مغربی اور مشرقی خیالات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں یہ مختصر کتاب درسفولڈ کی کتاب کا چربہ ہے البتہ قابل مؤلف نے اردو ادبیات کی مناسبت سے کہیں کہیں تصرف کر دیا ہے۔"

افسر کے شعری اور نثری کارناموں کے پیش نظر، یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ وہ اعلیٰ پایے کے نثر نگار اور باکمال شاعر تھے۔ ان کا چھوڑا ہوا ادبی سرمایہ ہر زمانے میں وقیع سمجھا جاے گا اور آنے والی نسلیں اُس سے اسی طرح مستفیض ہوتی رہیں گی جس طرح مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے ادبی سرمایے سے۔

رباعیات

سید مظفر الدین خاں صاحب حیدرآبادی

(۱)

بے مہریٔ کائنات ہم سے پوچھو
کم ظرفی التفات ہم سے پوچھو
سر ڈھانکتے ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں
بے مائیگی حیات ہم سے پوچھو

(۲)

ہر کام تو ہر چند نہیں کر سکتے
اوروں کو بھی پابند نہیں کر سکتے
ہم اپنا عمل ٹھیک رکھیں کافی ہے
گو خلق کا منھ بند نہیں کر سکتے

(۳)

جامِ مئے گلفام سے جل جاتے ہیں
اک آتش بے نام سے جل جاتے ہیں
ہیں دل میں نہاں داغِ جدائی جتنے
تاروں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

(۴)

عظمت ہی جدا جرأت خود کوش میں ہے
کچھ لطف سوا آتش خاموش میں ہے
کیوں کرتے ہو دنیا پہ گماں جنت کا
گل بھی تو یہاں خار کے آغوش میں ہے

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

لفظوں کی لکیریں (مجموعۂ کلام) غلام حسین ایاز — ملنے کا پتہ "عشرت کدہ" ۔ اے / ۲۹ ۔ پام ایونیو ۔ کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱۹

"لفظوں کی لکیریں" غلام حسین ایاز کا پہلا مجموعۂ کلام ہے لیکن اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کی برسہا برس کی کد و کاوش کا عملی نتیجہ ہے ۔ انتخاب کلام کرتے وقت شاعر نے جس طرح اپنی ذہنی لیاقت اور فراست کا مظاہرہ کیا ہے اس کی روشنی میں زیر نظر کتاب کو "مجموعہ کلام" کے بجائے "انتخاب کلام" کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

شاعری در اصل سماجی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے، اور گوناگوں مسائل حیات کی وسعتوں اور گیرائیوں کو ناپنے تولنے کے لیے اسے قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید ادبی قدروں کا حامل ہونا چاہیے ۔ اگر کلاسیکی روایات سے عصر حاضر کی مسائل انگیز زندگی کا رشتہ ٹوٹ جائے تو شاعری بے اثر ہو جائے گی ۔ ایاز کے کلام میں ہمیں اس فکر آمیز احساس کا شائبہ نظر آتا ہے ۔ ان کی غزلوں کا رچاؤ، نظموں کا آہنگ اور قطعات و رباعیات کا بانکپن دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو روایت کی کورانہ تقلید کرتے ہیں اور نہ "سرحد امکان" سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کی شاعری ادبی بے راہ روی کی قائل نہیں ہے، بلکہ ایاز نے ماضی، حال اور مستقبل کے میل ملاپ سے ایک ایسی درمیانی راہ ڈھونڈھ نکالی ہے جسے قدیم، متوسط اور جدید کا سنگم کہنا چاہیے ۔ زیر نظر مجموعہ زبان و بیان کی لطافت، سادگی، سلاست، روانی اور نفاست کے علاوہ دلکشی شیرینی اور چاشنی سے بھی مزین ہے ۔

عمدہ کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، نفیس سرورق، حسن ترتیب و تزئین اور لاجواب انتخاب کلام نے مجموعہ میں چار چاند لگا دیے ہیں ۔

خار نغمہ (مجموعۂ کلام) کیف صدیقی (سلطانپوری) ملنے کا پتہ : نہرو پبلشرز، لکھنؤ ۔۳

دبستان لکھنؤ کے زوال کے بعد سرزمین لکھنؤ پر نمودار ہونے والے شعراء کی طویل فہرست میں کیف صدیقی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے ۔ حالانکہ ان کی شاعری کی عمر ابھی مختصر ہے، لیکن ان کے پہلے مجموعہ کلام خار نغمہ کو دیکھ کر "بزرگی بعقل است نہ بسال" کا قائل ہو جانا پڑتا ہے، بقول ؎

چند تنکوں کی سلیقہ سے اگر ترتیب ہو
بجلیوں کو بھی طواف آشیاں کرنا پڑے

حالانکہ کیف صدیقی کی ذہنی و فکری کاوش ابھی زندگی کے اسرار و رموز کی تلاش میں ہے، ان کی شاعری ابھی عبوری دور میں ہے ۔ لیکن ان کے صالح ادبی نظریات، جذبہ کے انہماک اور قدروں کی جستجو میں غرق ہو کر عمیق سمندر کی تہہ سے موتی تلاش کرنے کے ذوق میں یقیناً ان کے روشن مستقبل کے اشارے چھپے ہوئے ہیں ۔ کیف صاحب کی طبیعت، فکر اور شاعری میں تکلف کا وجود کہیں نظر نہیں آتا ۔ وہ اپنی بات کو صاف اور سادہ انداز میں کہنے کے عادی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قاری یا سامع کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے ۔

خار نغمہ کو کتابت اور طباعت کی خوبیوں سے آراستہ کر کے عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ صاف ستھرے انداز میں پیش کرنے کا سہرا نہرو پبلشرز کے سر ہے ۔

(ڈاکٹر سلمان عباسی)

آتش خاموش : مصنف : مطرب نظامی ۔ صفحات : ۱۱۲ قیمت : پانچ روپے ناشر ۔ شفاعت بکڈپو ۔ حافظ بلڈنگ ۔ مولوی گنج ۔ لکھنؤ ۔

مطرب نظامی صاحب، لکھنوی شعراء کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کو آج باقیات الصالحات ہی کہا جا سکتا ہے ۔ ان حضرات کی گفتگو کا مہذبانہ لب و لہجہ، مزاج کی شائستگی اور نشست و برخاست کی تہذیبی علامتیں زبان حال سے اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ اس نسل کے بعد دبستان لکھنؤ کی اس روایتی تہذیب کو ختم ہی سمجھیے جو لکھنؤ کا طرۂ امتیاز رہی ہے ۔

مطرب صاحب ادبی حلقوں میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں لیکن ان کا زیر نظر شعری مجموعہ آتش خاموش ایک ایسا انکشاف ہے جس کے مطالعے کے بعد مطرب صاحب کی وہ شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے جس نے حصول آزادی کی جنگ میں نہ صرف یہ کہ انگریزوں کے ظلم و جبر کا مقابلہ کیا بلکہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ۔ ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش کے طور پر اور ریل کی پٹریاں اکھاڑنے کے جرم میں وہ ۲۱ دن حوالات میں رہے اور اس کے بعد چھ ماہ کے لیے جیل بھیج دیے گئے ۔ ان کے مسلسل جوش عمل اور مختلف قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہنے کے سلسلے میں ہفتہ وار سرروش بمبئی نے لکھا تھا کہ "قابل رشک ہیں ایسے نوجوان جو پولیس کے ڈنڈے کھا کر اور سختیاں جھیل کر بھی معافی نہیں مانگتے"

ماحول کی بے رحمی اور حالات کی سختیوں نے نہ صرف ان کی شخصیت کے کندن کو چمکایا بلکہ گردو پیش سے متاثر ہو کر انھوں نے جو نظمیں کہیں اس کے لیے ہفت روزہ چترا لاہور نے اپنے سالنامہ ۱۹۴۳ء میں ان کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا "مطرب لکھنوی ایک عظیم فن کار ہیں ۔ وہ ادب کے افق پر ابھرتے ہوئے ایسے سورج کے مانند ہیں جس کی کرنوں میں ہزاروں کہکشائیں رقص کر رہی ہیں"

ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا، لیکن مطرب صاحب کی نگاہ میں

۱۹۴۲ء ہی میں افق ہند پر طلوع ہوتے آزادی کے تابناک سورج کو دیکھ رہی تھیں۔ جیل کی سختیوں سے وہ ہراساں نہیں تھے بلکہ کہہ رہے تھے۔

سب کو ہے یقیں اب ہیں اندھیرے ہی اندھیرے
ہم کہتے ہیں تسخیر سحر ہو کے رہے گی

ماہ و سال کے طویل وقفے نے مطرب صاحب کے مجاہدانہ جوش عمل کے نقوش پر گردیہ حالات کی تہیں اس طرح جمادیں کہ ان کی قومی شخصیت غزل گو شاعر کے مقابلے میں مخفی ہو کر رہ گئی تھی۔

آتش خاموش نے جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک کی ان کی قومی نظموں کا انتخاب ہے، طبع ہو کر، مطرب صاحب کی سیاسی، وطن پرست اور قومی شخصیت کو اُبھارا ہے ساتھ ہی ساتھ یہ ثبوت بھی پیش کیا ہے کہ اردو کا شاعر ہر دور میں وطن کے تحفظ کے لیے پیش پیش رہا ہے۔

امید ہے کہ مطرب صاحب کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

—— ساحر لکھنوی

تعمیر وطن : مصنف۔ سید آل نبی زیدی۔ صفحات۔ ۸۰ (غیر مجلد) قیمت۔ درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ: سید آل نبی زیدی بڑودہ۔ ضلع میرٹھ

تعمیر وطن، زیدی صاحب کے ان تاثرات اور محسوسات کا عکس ہے جو وقتاً فوقتاً نظموں کا لباس پہن کر صفحۂ قرطاس پر رقص کرتے رہے ہیں۔ زیدی صاحب کا ذہن ایک حساس ذہن ہے اور ان کے پہلو میں ایک ایسا دردمند دل ہے جس میں وطن کی محبت اور بے پناہ عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

زیدی صاحب نے اگر ایک طرف ملک میں ہونے والی ہر اچھی تبدیلی کو خوش آمدید کہا ہے تو دوسری جانب ہم وطنوں کی تکلیفوں اور زبوں حالیوں پر بھی ان کا قلم حرکت میں آیا ہے۔ اس پورے شعری مجموعے میں جو قومی نظموں پر مشتمل ہے جا بجا ان تاثرات کی چھاپ نظر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ، زیدی صاحب کا زیر نظر نظموں کا مجموعہ، شعری عیوب سے قطع نظر، ان کے جذبات کا عکاس ہے۔ کتابت اور طباعت غنیمت ہے۔

—— ساحر لکھنوی

اپنی بات (صفحہ ۲ کا بقیہ)

زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کو کچھ ہی دن گزرے تھے اور ان کا غم تازہ ہی تھا کہ ہمیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سانحۂ ارتحال کی الناک خبر ملی۔ یہ نیا سال اردو دنیائے علم و ادب کے لیے نہایت ہی منحوس ثابت ہوا۔ دس ہی دن کے اندر اندر ہم اپنے دو ممتاز اور منفرد ادیبوں، دانشوروں اور انشا پردازوں سے محروم ہو گئے۔ یہ دونوں عظیم شخصیتیں صرف علمی و ادبی اکتسابات اور انشا پردازی کے لیے ہی مشہور نہیں تھیں بلکہ ہماری بہترین تہذیبی قدروں کی یادگار بھی تھیں۔ رشید احمد صدیقی نے ۱۵ر جنوری کو علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔

پروفیسر رشید صاحب ۱۸۹۲ء میں ضلع جونپور کے قصبہ مڑیاہوں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہاں سے ہائی اسکول کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے اور فارسی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ۱۹۲۲ء میں لکچرر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۲۵ء میں ریڈر اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی وائس چانسلرشپ کے زمانے میں پروفیسر ہو گئے اور اسی عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ علی گڑھ ہی میں مرتے دم تک قیام پذیر رہے جہاں سے ان کو اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی ایک والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کے گرانقدر ادبی کارناموں میں مضامین رشید، کاروان، خنداں، گنج ہائے گرانمایہ اور ذاکر صاحب، غالب پر ان کے نظام لکچرس، عزیزان علی گڑھ اور جدید غزل ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ان کی انہیں ادبی خدمات کے صلے میں حکومت ہند نے ان کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازا تھا۔ ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ان کو ملا تھا۔ ان کو علی گڑھ کے بعد جس شخصیت سے والہانہ محبت تھی وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی تھی جن کو وہ "مرشد" کے نام سے اپنے مضامین میں خطاب کرتے ہیں۔

پروفیسر رشید نہ صرف ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ادیب ہی تھے بلکہ طنز نگاری کے امام، مسلم یونیورسٹی کے شیدائی اور اس کی روایات کے علمبردار نیز ایک مشفق استاد بھی تھے۔ طنز و مزاح کے میدان میں انھوں نے ایسے گل و بوٹے کھلائے ہیں اور اس کو ایسی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے جہاں اردو کا کوئی دوسرا ادیب اب تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ اسلوب کی دلکشی اور مرقع نگاری نے ان کی انشا پردازی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اردو کے بیشتر ادیب اور طنز نگار ان کے شگفتہ اور شائستہ اسلوب سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک پوری نسل کی آبیاری کی ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت سے فیض پانے والے اس وقت سیکڑوں ادیب اور نقاد ہند و پاک کی مختلف درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں شعر و ادب اور علم و دانش کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں۔

رشید صاحب کی موت ہمارے طنزیہ ادب کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ ان کی موت سے اردو دنیا ایک بلند پایہ صاحب طرز انشا پرداز ادیب، بے مثل طنز و مزاح نگار، ادیب اور معلم سے محروم ہو گئی۔ ادارہ نیا دور اردو دنیا کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

—— ایڈیٹر

۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء